PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----◈◈◈◈◈◈◈◈◈◈◈-----
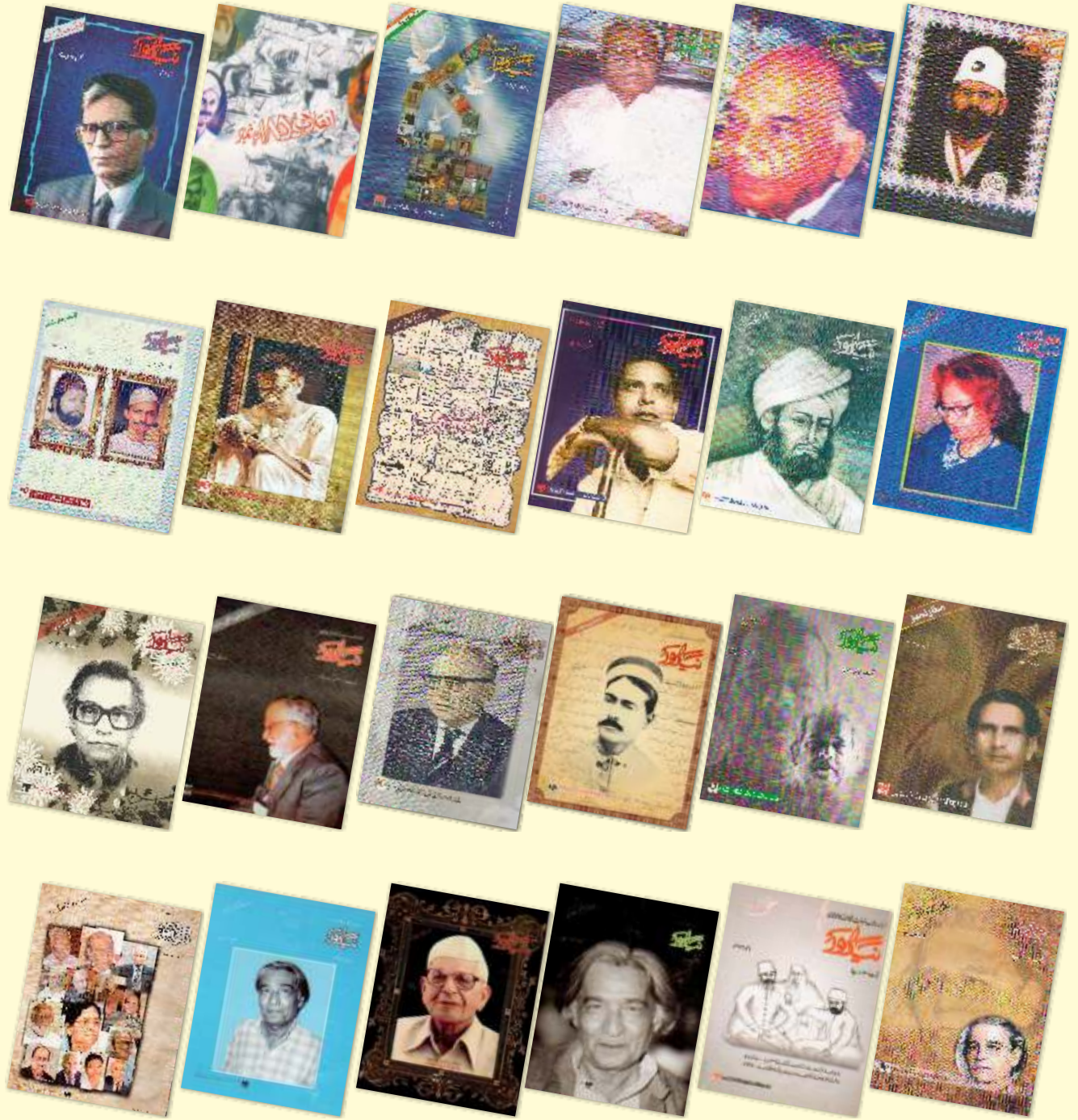
''نیا دور'' کی موجودہ ادارت میں (۲۰۰۴ سے تا حال) نکلنے والے خصوصی نمبر

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

جلد (۷۱) شمارہ (۷، ۸، ۹)

اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۶ء

پبلشر: سدھیش کمار اوجھا

upsoochna@gmail.com

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

:- ایڈیٹوریل بورڈ :-

ڈاکٹر آر ایس پانڈے • سید امجد حسین

غزال ضیغم • سہیل وحید

:- ایڈیٹر :-

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

فون:- 9415007698

Ph. No. 2239132 Ext. 121

E.mail: nayadaurmonthly@gmail.com

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس گولہ گنج، لکھنؤ

:- شائع کردہ :-

محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

زر سالانہ: ایک سو دس روپئے

:- ترسیل زر کا پتہ :-

ڈائرکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ۔ اتر پردیش، لکھنؤ

Please send M.O/Bank Draft in favour of Director, Information & Public Relations Department, U.P. Lucknow.

:- خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

:- بذریعۂ رجسٹری :-

ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

سوچنا بھون اتر پردیش، لکھنؤ

کاتب - امتیاز احمد

عنوانات

دیدھائے رنگا رنگ

چیدہ وچُنیدہ

❖❖❖

اپنی بات

توفیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر (میر انیس)

میں نے اپنی بات کا آغاز میر انیس کے ایک مشہور زمانہ مرثیہ کے مطلع کے دوسرے مصرعہ سے کی ہے اس کی ایک خاص وجہ ہے چونکہ میر انیس اس مصرعہ میں فیاض ازل سے اپنے معراج سخن کے لیے خالق لوح و قلم سے استعانت و معاونت کے لیے التجا گزاری فرماتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لہٰذا میں بھی میر انیس پر اس خاص نمبر کے پایۂ تکمیل کے لیے اس کی استعانت اور مدد کا طلبگار تھا جو الحمدللہ آج یہ کام اپنی منزل مقصود سے استوار ہوا اور آپ کے ہاتھوں میں چار سو صفحات پر مشتمل میر انیس نمبر موجود ہے یہ الگ بات ہے کہ اس کام کو انجام دینے میں بڑی جگر کاوی اور دماغ سوزی کرنی پڑی۔ چونکہ نیا دور ایک سرکاری رسالہ ہے اور آپ یہ بات مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ سرکار کی کفالت میں نکلنے والے رسائل و جرائد میں مدیران کو کتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے بالخصوص کسی نمبر کی اشاعت یہ ایک ناگزیر عمل ہے۔ میر انیس نمبر سے پہلے بھی میں نے بہت سے خاص نمبر نکالے ہیں لیکن ان میں مجھے اتنی دشواریوں کا سامنا کرنا نہیں پڑا جتنا کہ اس نمبر کی اشاعت میں مجھے دشواریاں پیش آئیں۔ جب میں نے میر انیس نمبر نکالنے کے لیے اس کا لائحہ عمل ترتیب دیا اور اس کا پرپوزل حکومت کے سامنے پیش کیا تو مجھے بہت سے مسائل سے دوچار ہونا پڑا اس کے باوجود اس نمبر کی اشاعت کی مجھے کیسے اجازت ملی یہ میں خود نہیں جانتا لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر اس کام میں توفیقات الٰہی شامل حال نہ ہوتی تو یہ قطعی ممکن نہیں تھا لہٰذا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ؂

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

لیکن ایک بات میرے لیے حیرت و استعجاب کا سبب ضرور ہے کہ اس سے پہلے نیا دور کی ادارت کی ذمہ داری اردو ادب کی ایک سے بڑھ کر ایک قد آور شخصیتوں کے ہاتھوں میں رہی اور ان مدیران نے نیا دور کو ایک ادبی وقار ضرور عطا کیا اور ان میں سے بہت سے مدیران نے عام شماروں کے ساتھ خاص نمبر بھی نکالے لیکن کسی نے میر انیس جیسے عظیم شاعر پہ اتنی توجہ نہیں دی جس کے وہ حقدار تھے اس کی کیا وجہ تھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید یہ سعادت میرے نام سے منسوب تھی جو مجھے آج حاصل ہوئی۔

میر انیس نمبر کی تدوین و ترتیب میں برادرم شاہد کمال میرے دست و بازو بنے رہے میں ان کی اس محنت کو فراموش نہیں کر سکتا اور جن اہل قلم حضرات نے میری درخواست پہ میر انیس سے متعلق اپنی اہم نگارشات مجھے ارسال کیں میں ان کا بھی شکر گذار ہوں۔

میں اس ضمن میں یہ بات عرض کرتا چلوں کہ مجھے موصول ہونے والی تمام قلمی نگارشات بغیر کسی تقدم و تاخر کے مختلف ابواب کے تحت شامل کی گئی ہیں اور یہ بات بھی یاد رہے کہ اس نمبر کی اشاعت میں پیش آنے والے مسائل کی بنیاد پر اس کی عاجلانہ تدوین بغیر کسی حفظ مراتب کے محض مضامین کے عنوان کے تحت کی گئی ہے لہٰذا اہل قلم حضرات ہماری اس کوتاہ دستی کو فروگذاشت فرمائیں گے ۔۔۔۔ دوسری بات یہ کہ مضامین کی کثرت کی وجہ سے بعض اہل قلم کے مضامین اس میں شامل نہ ہو سکے چونکہ اس کے صفحات پہلے سے ہی متعین کئے جا چکے تھے جن کی وجہ سے وہ مضامین اس میں شامل نہیں ہو سکے جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں لیکن وہ مضامین جو اس میں اشاعت پذیر ہونے سے رہ گئے ہیں انھیں پس انداز نہیں کیا جائے گا ان شاء اللہ انھیں عام شماروں میں اسی اہتمام کے ساتھ شائع کیا جائے گا۔

خدائے سخن میر انیس پر شائع ہونے والا یہ خاص نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ مجھے امید ہے کہ گذشتہ نمبروں کی طرح آپ اس کی بھی پذیرائی فرمائیں گے۔ میں اپنی بات کا اختتام میر انیس کے اس شعر پہ کرنا چاہتا ہوں ؂

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

اَخلاق و اَسلاف

سید یوسف حسین شائق
اے ۔ ۲۸۰ ایچ نارتھ ناظم آباد، کراچی پاکستان ۳۳

میر انیسؔ کا سلسلۂ خاندانی

جو اُن کے قلمی مخطوطے سے نقل کیا گیا

میر انیسؔ صاحب اعلی اللہ مقامہ کا سلسلۂ خاندانی بیان کرنے کے لیے ہم ان کے دادا میر حسن کے قلمی کلیات سے ایک عبارت نقل کرتے ہیں جو خود انھوں نے اپنا سلسلۂ خاندانی بیان کرنے کے لیے دیوان کے مقدمہ میں تحریر فرمائی ہے۔ یہ قلمی مخطوطہ سنہ ۱۲۳۱ھ کا برادر بزرگ ہادی صاحب لائق کے پاس ہندوستان میں موجود ہے۔

"اما بعد۔ بر سخنوران شاطر و دانشوران ماہر مخفی نماند کہ اصل ایں مولف ابن میر غلام حسین ابن میر عزیز اللہ ابن میر برات اللہ ابن میر امامی موسوی از شاہجہان آباد از ہرات آمدہ بہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردیدند۔ فاضل متبحر و فقیہہ بے مثل بودند گاہ گاہ بحث تفریح فکر شعر ہم می نمودند کہ افکار معاد فرصت بے فائدہ گوئی نمی بخشند پس ایں عاجز سخن را سر رشتۂ شاعری اجداد نیست تا امروزی ...... الخ

میر حسن نے میر امامی موسوی کو لکھا ہے جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم ؑ کی اولاد میں تھے لیکن میر حسن کے بیٹے اور میر انیسؔ کے والد میر خلیقؔ کو موسوی الرضوی لکھتے تھے۔ میر انیسؔ کی ایک بہن ہرمزی بیگم کا نکاح نامہ جو سید زوار حسین زائر صاحب کے ذخیرے میں تھا اس میں میر مظفر حسین ضمیر اور میر مستحسن خلیقؔ کے دستخط بہ طور گواہ کے تحریر ہیں اس میں خلیقؔ نے اپنے کو موسوی الرضوی تحریر کیا ہے۔ بہرحال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر خلیق اور ان کے بزرگ امام رضا اور موسیٰ کاظم کی اولاد میں تھے میر خلیقؔ کا ذکر عمداً ترک کیا جاتا ہے۔

میر انیسؔ کا مقام پیدائش

میر ببر علی مرحوم ۱۲۱۶ھ میں محلہ گلاب باڑی شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلیٰ میر امامی موسوی ہرات سے آئے اور پرانی دہلی میں آباد ہوئے۔ میر حسنؔ کی پیدائش بھی دہلی میں ہوئی۔ صاحب تذکرہ "گلزار ابراہیمی" لکھتے ہیں کہ "میر حسنؔ دہلی میں کھچیل مسجد کے پاس رہتے تھے اور حکیم قدرت اللہ خاں قاسم تحریر فرماتے ہیں کہ میر حسن کی ولادت محلہ سید واڑہ میں ہوئی جو پرانی دہلی کا ایک محلہ تھا۔

لکھنؤ دار السلطنت مقرر ہونے سے پیشتر میر حسنؔ کا خاندان دہلی چھوڑ کر فیض آباد میں سکونت پذیر ہوا مختلف تذکروں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ آخر میں فیض آباد اور لکھنؤ دونوں شہروں کو میر انیسؔ مرحوم کے حالات سے تعلق ہے۔

آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو مستقل دار الریاست قرار دیا تو میر ضاحک اور میر حسنؔ کی آمد و رفت تعلقات شاہی کی وجہ سے لکھنؤ میں جاری ہوئی مگر مستقر فیض آباد ہی کو سمجھنا چاہئے۔ یوں تو

سعادت علی خاں کے زمانے کے معرکوں سے ثابت ہوتا ہے کہ میر ضاحک مرحوم جرأت، انشاء، مصحفی وغیرہ کے دور میں لکھنؤ میں موجود تھے کے مناظرے کا طوفان بھی اسی وقت کا ایک قصہ ہے۔ آصف الدولہ کے عہد میں میر حسنؔ مثنوی ''بدر منیر'' کی تصنیف میں مصروف تھے اس وقت کے آمد سخن سے گھبرا کر اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے ہونہار فرزند کی اصلاح کلام شیخ مصحفی سے متعلق کر دیا تھا چنانچہ شیخ صاحب نے اپنے تذکرہ میں بھی ان کی شاگردی کا حال بڑے فخر و مباہات سے بیان کیا ہے اور اس وقت میر خلیقؔ کی عمر ۱۹ سال کی تھی۔ صاحب ''گلزار ابراہیمی'' تحریر فرماتے ہیں کہ میرے تذکرے کے لیے جو میر صاحب نے اپنا کلام لکھنؤ سے روانہ کیا ہے اس کے ساتھ ایک تحریر بھی ہے جو بعینہ درج تذکرہ کی جاتی ہے۔

''از سائر ابیات مدونہ من بست ہزار بیت است
تذکرہ در ریختہ ہم نوشتہ و اصلاح سخن از میر ضاحک
گرفتہ ام مدتے ست کہ از دہلی وارد لکھنؤ با نواب سالار
جنگ و مقرب الشان ملقب بہ نوازش علی خاں سرفراز
جنگ بہادری گذارم ...''

میر حسنؔ نے یکم ماہ محرم ۱۲۰۱ھ میں لکھنؤ میں انتقال فرمایا اور محلہ مفتی گنج میں نواب قاسم علی خاں کے بڑے باغ کے پچھواڑے دفن ہوئے۔ شیخ مصحفی کی تاریخ سے سن وفات معلوم ہوتا ہے۔

چوں حسن آں بلبل خوش داستاں
رو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بس کہ شیریں بود نطقش مصحفی
شاعر شیریں زباں تاریخ یافت (۱۲۰۱ھ)

میر حسنؔ صاحب مرحوم کی قبر کے بارے میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ اپنی کتاب ''اسلاف میر انیسؔ'' کے صفحہ ۷۹۔۸۰ پر رقم طراز ہیں کہ:

''راقم حروف نے ۱۱ر نومبر ۱۹۶۴ء کو سید محمد ہادی صاحب لائق کے ہمراہ میر حسنؔ کے مزار کی زیارت کی۔ قبر شکستہ حالت میں مفتی گنج کی ایک وسیع افتادہ آراضی کے مغربی سرے پر واقع ہے یہاں کبھی نواب قاسم علی خاں کا باغ تھا اگر قبر کی مرمت نہ کی گئی تو کچھ مدت کے بعد اس کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ ایسے لوگ بھی اب بہت کم رہ گئے ہیں جن تک سینہ بہ سینہ یہ روایت پہنچی ہے کہ یہ قبر میر حسنؔ کی ہے۔''

(ماخوذ از ''اسلاف میر انیسؔ'' مطبوعہ ۱۹۷۰ء)

لکھنؤ میں موجود میرے بھتیجے سید علی احمد دانش سلمہ نے اطلاع دی ہے کہ جس بات کا خدشہ جناب ادیبؔ کو تھا وہی ہوا یعنی وہ بڑا باغ ٹکڑے ٹکڑے کرکے فروخت کر دیا گیا۔ میر حسنؔ صاحب کی قبر جس زمین پر تھی اسے تاشر قیصر جونپوری صاحب نے خرید کر عالی شان مکان بنوالیا ہے۔ اب قبر ان کے گھر میں شامل کر لی گئی ہے میرے والد میر علی محمد صاحب عارفؔ فرماتے تھے کہ میر انیسؔ نے ۷۲ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ مگر میر خورشید علی نفیسؔ نے اپنے ضعف و ناتوانی کا ذکر کرتے ہوئے ایک روز میر حسن علی صاحب (احسنؔ لکھنوی کے والد) سے فرمایا کہ ''میر حسن علی میری عمر اسّی سال ہے میں اپنے والد سے عمر میں پانچ سال زیادہ ہوں۔ اس لیے اب میرا کیا اعتبار۔ چراغ سحری سمجھو کیونکہ ہر خاندان میں عمروں کو ایک گونہ مطابقت ہوتی ہے۔

اس اعتبار سے میر انیسؔ کی عمر ۷۵ سال قرار پاتی ہے ۱۲۹۱ھ میں میر انیسؔ کا سال وفات بھی ہے اور اس سال سے ۷۵ کم کرنے سے ۱۲۱۶ سال پیدائش نکلتا ہے۔ زمانۂ امجد علی شاہ میں جب ان کے والد میر خلیقؔ نے فیض آباد چھوڑ کر مستقل لکھنؤ کی سکونت اختیار کی تو میر انیس بھی صاحب اولاد ہو چکے تھے۔ میر نفیسؔ اور ان کی دو بہنوں کی پیدائش بھی فیض آباد میں ہوئی صرف ایک صاحبزادی آغائی بیگم جو لکھنؤ میں پیدا ہوئیں مگر وہ بھی فیض آباد میں قاضی محمد عابد کو منسوب ہو گئیں ان کی نسل میں نیھے صاحب تھے جن کا ۱۹۱۹ء میں انتقال ہو گیا ان کے فرزند قمرؔ فیض آبادی تھے۔ ان کا بلا کا حافظہ تھا۔ راہ چلتے ہر موضوع پر شعر سنا دیتے تھے۔ ان کی غزل کا یہ شعر خوب ہے۔

میں بے ثمر ہی سہی شجر سایہ دار تو ہوں
مجھے نہ کاٹ مسافر کا اعتبار تو ہوں

عام طور پر فیض آباد کے لوگ انھیں ببو صاحب کہتے تھے وہاں ان کی عزت اس لیے تھی کہ وہ ایک ذی علم گھرانے یعنی کہ قاضی القضات خاندان کے فرد تھے اور ان کا ننہالی سلسلہ میر انیسؔ جیسے عظیم شاعر سے بھی تھا۔ انیسؔ کی غزل کا یہ شعر انھوں نے یہ کہتے ہوئے سنایا تھا کہ سنئے یہ میرے نانا کا شعر ہے۔

غافلو موئے سفید آئیں جو رخساروں پر
آخری دھوپ سمجھنا انھیں دیواروں پر

لوک آیکت جسٹس مرتضیٰ حسین فیض آبادی مرحوم نے راقم السطور سے بتایا کہ ”میں نے سید عباس حسین عرف نھے صاحب فیض آبادی کو جواہر علی خاں کے امام باڑے میں مرثیہ پڑھتے سنا تھا جب وہ منبر پر تشریف لے جاتے تھے تو پہلے ذرا ہکلاتے تھے۔ چند لمحوں میں ان کی زبان صاف ہو جاتی تھی۔ سرخ و سفید بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ آواز پاٹ دار تھی جنگ اور بین بہت اچھے انداز میں ادا کرتے تھے وہ اپنے بزرگوں یعنی خاندانِ انیسؔ کا کلام پڑھتے تھے۔ بعد انتقال بڑی درگاہ فیض آباد میں دفن کئے گئے۔

میر انیسؔ کا حلیہ

سانولا رنگ، قد مائل بہ درازی، نقشہ خوشنما، ورزشی جسم ظاہر میں ایک قوی اور فربہ نہ معلوم ہوتے تھے مگر چوڑا سینہ اور سڈول بازو، جسم کی کساوٹ پر دلالت کرتے تھے ورزش میں مگدر پابندی سے چلاتے تھے۔ گھر کے اوپری حصہ میں جانب مشرق جو صحنچی تھی وہی ان کی ورزش کی جگہ تھی۔ گھر کے مردانہ حصہ میں روزانہ سپہ گری کی مشق بھی کرتے تھے جس میں ان کے استاد امیر علی صاحب تھے لوگ جنھیں سفید پوش کہتے تھے داڑھی بہت باریک کترواتے تھے۔ نہاتے وقت آپ کثیر استعمال کرتے تھے جو بڑے مٹکوں میں بھرا جاتا تھا غسل کے بعد غوطے کے لیے مردانہ حصہ کے حوض میں اتر جاتے تھے۔ خود فرمایا ہے۔ عادی ہوں طہارت آپ کثیر کا اور زرد رنگ کا گھیتلا جوتا پہنتے تھے۔

ڈھیلی مہری کا پاجامہ اور بارہ کلی کا کرتا پہنتے تھے۔ ان کا کرتا اتنا لمبا چوڑا ہوتا تھا کہ اس پر انگرکھا پہننے کی ضرورت نہ تھی کرتے کی آستین چنی ہوتی تھی پنج گوشیہ ٹوپی پہنتے تھے جس کے ہر گوشہ میں صراحی کنٹھا یا چاند اور چھوٹے پھول بنے ہوتے تھے۔ ان کے پاس کئی ٹوپیاں تھیں جس وقت جو پسند آتی اسے زیب سر کر لیتے تھے جب تک چاروں چولوں سے درست نہ ہو جاتے گھر کے باہر قدم نہ نکالتے تھے ننگے بدن رہنا بہت معیوب سمجھتے تھے۔ ان کو سادہ اور سفید لباس زیادہ پسند تھا۔ جامدانی یا ڈھاکے کی ململ اودے اور گہرے سبز رنگ پسند تھے۔ گھر میں اسی رنگ کے کپڑے زیب تن کرتے تھے۔ سبز ریشمی شروع کا پاجامہ پہنتے تھے مغربین کی نماز پڑھنے کے لیے کاندھے پر چھالٹین کا رومال ڈال کر مسجد تحسین علی خاں تشریف لے جاتے تھے۔ ان کے پاس بہت عمدہ سروقی اور جریب کی چھڑیاں تھیں۔ وہ جب کسی سے ملنے جاتے تو ان چھڑیوں میں سے اس وقت جسے پسند فرماتے اسے ہاتھ میں لیتے اور باہر چلے جاتے تھے۔

علمی استعداد

میر انیسؔ کے پاس تقریباً ڈیڑھ ہزار کتابیں تھیں جو مختلف موضوعات پر تھیں۔ ان کے انتقال کے کافی عرصہ کے بعد کتابوں میں سیلن اور دیمک کے اثرات سے خراب ہونے لگیں تو عارفؔ صاحب مرحوم نے بہت سی کتابیں لکھنؤ کے قدیم مدارس کو دے دیں اور قلمی اثاثہ اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ شاہنامہ فردوسی مطلّا اور بعض خاندانی کتابیں بھی اپنے پاس رکھ کر ان کی حفاظت کی۔

میر انیسؔ نے ابتدائی درسیات کی کتابیں مولوی حیدر علی فیض آبادی اور میر نجف علی سے پڑھی تھیں۔ یہ دونوں اس وقت کے عالم متبحر تھے۔ اس زمانے میں مسلک کی کوئی قید نہ تھی۔ شیعہ بچے سنّی علماء سے درس لیتے تھے اور اہل سنت حضرات کے بچے شیعہ علماء سے منطق و فلسفہ پڑھا کرتے تھے۔ دونوں طرف رواداری کا

(بقیہ صفحہ پر)

رئیس حسین
۲۸ غازی منڈی، وکٹوریہ اسٹریٹ، لکھنؤ۔۳
8799414666

مرثیہ اور خاندانِ انیس

مشہور محقق جناب مالک رام نے اپنے ایک نجی خط میں جو انھوں نے آلِ انیس کی ایک فرد کے نام لکھا تھا اس میں اس خانوادے کی علمی و ادبی خدمات کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے، ایک طویل عرصے تک اس خدمت کا ذکر جو خاندانِ انیس کے اسلاف و اخلاف نے انجام دی اسے بہت سراہا گیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی اور کسی بھی زبان میں کسی ایک خاندان کے افراد نے نسل در نسل اتنے زمانے تک اس تواتر اور تسلسل سے یہ خدمت نہیں انجام دی ہے۔ انھوں نے خاندانِ انیس کی جس فرد کو یہ خط لکھا تھا اسے انیس کی گیارہویں نسل قرار دیا ہے اور یہ خط دانش صاحب کی تحقیقی کاوش "ادبی میراث" میں موجود ہے اور دیکھا جا سکتا ہے۔

آج بھی میرانیس کی نسل اپنے نامور بزرگوں کی اس روایت یعنی پرورشِ لوح و قلم اسی خلوص و انہماک سے کر رہی ہے اس کا تذکرہ قدرے اختصار سے آگے آئے گا۔

۱۸۵۶ء کی جنگ آزادی کے بعد لکھنؤ کی سابق شان و شوکت کو انگریز غاصبوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ قتل و غارت گری کے علاوہ شاہانِ اودھ کی املاک پر قابض ہو گئے تھے۔ حکومت جو پہلے ہی ان کی باج گزار تھی اور مظالم برداشت کر رہی تھی اسے ان غاصبوں نے اس طرح برباد کیا کہ پھر آباد نہیں ہو سکی۔ خاندانِ شاہی کی بربادی کے علاوہ وہ روساء اور امراء جہاں نوبت اور نقارے بجا کرتے تھے دروازوں پر ہاتھی جھوما کرتے تھے وہاں ان ڈیوڑھیوں اور محلوں میں چراغ جلانے والے نہیں رہ گئے تھے۔ شامِ اودھ کی وہ شہرۂ آفاق رنگینیاں غاصبوں کی مہیب توپوں اور بارود کے کثیف دھوئیں میں کہیں گم ہو گئیں چونکہ خود شاہانِ اودھ اور اکثر روساء کی تعداد فرقۂ امامیہ سے تعلق رکھتی تھی لہٰذا عزاداری کے حوالے سے مراسمِ عزاء کی انجام دہی میں وہ لوگ شاہانہ فیاضیاں کرتے تھے اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ ان مرثیہ گویوں کو وہ لوگ تحفے تحائف کے علاوہ ان کی خدمت میں بھاری رقمیں پیش کرتے تھے۔ سقوطِ سلطنتِ اودھ کے بعد ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ اچانک ٹوٹ گیا۔ ایسے دورِ ابتلا اور بہت شکن حالات میں

یوسف حسین شائق نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ وہ کئی زبانیں جانتے تھے اور ان کے علم و ادب پر عمیق نظر رکھتے تھے اور وہ تو بقول شخصے ان کی ڈیوڑھی کی غلام تھی ظاہر ہے کہ اس کے باریک نکات ان کی نظروں سے کیسے چھپے رہ سکتے تھے چنانچہ شاعری سے متعلق ہر ایک صنف پر ان کی غیر معمولی گرفت تھی۔

باوجود بے سروسامانی کے یہاں کے لٹے پٹے عوام نے مراسمِ عزا میں کوئی کمی نہیں کی۔ جہاں تک لکھنؤ کی عزاداری کا معاملہ ہے تو یہ احسن فریضہ کچھ فرقۂ امامیہ کے منانے پر ہی منحصر نہیں تھا بلکہ یہاں کے تمام فرقے اور مسالک اپنے اپنے طریقے سے اسے مناتے تھے اور اس طرح

اس وقت شہدائے کربلا کی یاد میں ڈوب جاتا تھا۔ اسی وجہ سے لکھنؤ کے محرم کا شہرہ چار دانگ عالم میں تھا۔ ان اہل ہنود اور حضرات اہل سنت والجماعت کے شہدائے کربلا سے عقیدت اور خلوص کے گواہ ان کے بنائے ہوئے امام باڑے اور کربلائیں لکھنؤ میں اب بھی موجود ہیں۔ بقول شخصے جس کام کی بنا صرف خلوص نیت پر ہوا سے زوال کا ڈر نہیں ہوتا چنانچہ آج بھی ان عبادت گاہوں میں مثل سابق مراسم عزا اسی شان و شوکت سے انجام دی جاتی ہیں۔

سلطنت اودھ پر غاصب انگریزوں کے قبضہ کے بعد اہل لکھنؤ پر بہت برے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کی تہذیب و تمدن، رہن و سہن، زبان و بیان۔ غرض زندگی کے تمام اشغال میں ایک انحطاط سا پیدا ہو گیا تھا مگر ایسے نامساعد حالات میں بھی وہ مظلوم کربلا کی یاد اور ماتم و مجلس اسی والہانہ انہماک سے کرتے رہے۔ وہ مرثیہ نگار اور مرثیہ خواں (بشمول سوز خواں) جو عہد شاہی میں فکر معاش کی طرف سے آسودہ رہتے تھے زمانہ بدل جانے سے اب وہ خود پریشان حال ہو گئے تھے ورنہ ماضی میں ان کو خدمت عزا سے اس قدر آمدنی ہدیہ کے طور پر ہوتی تھی کہ وہ خود دوسروں کی مدد کر دیا کرتے تھے چنانچہ دبستان دبیر، دبستان عشق، دبستان انیس، اور ان کے علاوہ بھی ایک کثیر تعداد بہترین مرثیہ گو شعراء کی ہے جو اس خدمت میں لگی ہوئی تھی۔ بالخصوص خاندان انیس نے اس وقیع کام کو منقطع نہیں ہونے دیا۔ وہ ہر حال میں عزاداری ادب کے لحاظ سے اردو ادب کی خدمت مرثیہ نگاری کی شکل میں کرتے رہے۔ فرداً فرداً ان کے نام اور کام کے بارے میں اگر یہاں لکھوں تو یہ مضمون صرف اسکی تکمیل کی نذر ہو جائے گا کیونکہ ان کے اخلاف ہند و پاک ہی میں خدمت عزا نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ دنیا کے دور دراز ملکوں میں بھی میر انیس کی آفاقی شاعری اور ان کی اعجاز بیانی کے ساتھ ساتھ خود بھی اپنے خون جگر سے ترتیب دئے ہوئے مرثیے پڑھ رہے ہیں لہٰذا اختصار کے مدنظر خاندان انیس کے افراد کے ناموں کو حذف کرتے ہوئے ان کے خاندان کے ایک فرد کے کارناموں کا ذکر کروں گا۔۔۔۔ ان کا نام یوسف حسین اور تخلص شائق تھا۔ وہ ۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے کے وقت پاکستان ہجرت کر گئے تھے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ یہ میر انیس کی دسویں پشت میں تھے، بقول مالک رام صاحب کے۔۔۔۔۔

یوسف صاحب نے بڑی محنت اور جاں سوزی سے میر انیس کی چاروں جلدوں کی تصحیح کی ہے۔ ان چاروں جلدوں کو لاہور کے مشہور پبلشر شیخ غلام علی نے چھاپا تھا ان کے مرتب نائب حسین نقوی امروہوی تھے۔ مرثیے سے متعلق انھوں نے بڑی محنت کی ہے مراثی انیس کی تفہیم اور قرأت کے لیے اور قارئین کی آسانی کے لیے انھوں نے ایک لغت ترتیب دی تھی۔ یہ لغت اپنے طرز کی اردو میں پہلی لغت ہے۔ اسے پڑھنے کے بعد مرثیے کے سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ خاندان انیس کی ایک اہم فرد ہادی صاحب لائق کے داماد تھے۔ لائق صاحب شائق صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ ان سے بڑے فائق صاحب تھے۔ یہ تینوں بھائی عارف صاحب کے بیٹے تھے عارف صاحب میر خورشید علی نفیس کے نواسے تھے۔ میر نفیس خدائے سخن میر انیس کے بڑے فرزند تھے۔

یوسف حسین صاحب شائق نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں وہ کئی زبانیں جانتے تھے اور ان کے علم و ادب پر عمیق نظر رکھتے تھے۔ اردو تو بقول شخصے ان کی ڈیوڑھی کی غلام تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے باریک نکات ان کی نظروں سے کیسے چھپے رہ سکتے تھے چنانچہ شاعری سے متعلق ہر ایک صنف پر ان کی غیر معمولی گرفت تھی وہ شاعری کے رموز و اوقاف سے کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے بہترین شعری ذوق کے ساتھ ساتھ شعر فہمی کا ایک ملکۂ خاص ان کو حاصل تھا جس کا بہترین مظاہرہ میر انیس کے مرثیوں کی چاروں جلدوں کی تصحیح میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان جلدوں میں سیکڑوں مراثی ہیں اور ہزاروں اشعار، ان کو چھان پھٹک کر خام مال الگ کرنا اور ڈیڑھ سو برس پہلے کے طرز سخن شعری اسالیب کو سمجھنا۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ ایک دقت طلب کام تھا مگر وہ ایک خاص لگن کے تحت اس کی تکمیل میں لگے رہے اور کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچایا۔ انھیں اس کام کی انجام دہی میں کتنی مشکلات پیش آئیں آپ ان کے ایک خط سے اندازہ لگائیں جو انھوں نے مراثی کی تکمیل کے بعد بڑے بھائی

ہادی صاحب لائق کو لکھنؤ بھیجا تھا۔ اس کا اقتباس میں اپنے لفظوں میں دے رہا ہوں منجملہ دیگر باتوں کے انھوں نے لکھا تھا کہ "بھائی صاحب اس کام میں میں نے دن رات ایک کر دئے تھے اتنی محنت اور جاں سوزی کرنی پڑی کہ آنکھوں کی روشنی جاتی رہی" افسوس کہ ان کی محنت شاقہ کا کوئی صلہ ان کو نہیں ملا اور وہ تمام جلدیں ابھی تک چھپ نہیں سکی ہیں اور پاکستان میں کسی قدردان کی منتظر ہیں۔

ان کا تصحیح شدہ ایک مرثیہ مشہور محقق جناب ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کشمیری کی نظر سے گذرا۔ اور انھوں نے متاثر ہو کر ان کی کاوش کی بڑی تعریف کی میں حیدری صاحب کی وہ تحریر یہاں پیش کر رہا ہوں ملاحظہ فرمائیں ساتھ ہی تصحیح شدہ مرثیہ بطور نمونہ پیش ہے چنانچہ سید یوسف حسین صاحب شائق لکھنوی کے سلسلے میں پروفیسر اکبر حیدری کشمیری کا بیان ہے کہ:۔

"۔۔۔ مجھے سید یوسف حسین سے کوئی تعارف یا واقفیت نہیں تھی البتہ ان کا غائبانہ تعارف "ماہ نو" کے میر انیس نمبر اور پاکستان کے بعض اخباروں سے ہوا جن میں ان کے مضامین چھپتے تھے اور یہ مضامین میری نظر سے گذرے ہیں میں نے ۱۹۷۶ء میں میر انیس کا ایک قلمی اور غیر مطبوعہ مرثیہ جس کا مطلع یہ ہے۔

'یارب عروس فکر کو حسن و جمال دے'

ضمیر اختر نقوی کو پاکستان میں شائع کرنے کے لیے بھیجا تھا مرثیہ بڑا شاندار اور معرکہ آرا تھا اس کا کوئی دوسرا نسخہ دستیاب نہیں تھا اس لیے اس کی ترتیب دینے میں بڑی دشواری پیش آئی تھی۔ بیچ بیچ میں الفاظ کرم خوردہ تھے اور کہیں کہیں لفظیں چھوٹ گئی تھیں بعض مصرعوں کے قافیے غلط لکھے گئے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ کاتب صاحب نے بھی بہت سی غلطیاں کی تھیں۔ ضمیر صاحب کو مرثیہ بہت پسند آیا انھوں نے یوسف حسین صاحب کی خدمت میں اسے پیش کیا۔ موصوف اس زمانے میں میر انیس کی مطبوعہ جلدوں کی غلطیاں درست کر کے فارغ بیٹھے تھے۔ انھوں نے پورے مرثیے کو تندہی کے ساتھ ابتدا سے آخر تک ملاحظہ فرمایا اور متعدد غلطیوں کی نشاندہی کی۔ یوسف حسین صاحب خاندان انیس کی یادگار تھے اور خاندانی زبان کے رموز اور مرثیے کی موشگافیوں سے کما حقہ واقف تھے۔ مرثیے کی صحت دیکھ کر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں ہے کہ یوسف حسین اردو مرثیے میں ایسی استادانہ اور ماہرانہ مہارت رکھتے تھے جس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی ہے۔ انھوں نے مرثیے کی تصحیح اس طریقے سے فرمائی کہ معلوم ہوتا ہے گویا اس کے وہی مصنف تھے۔ ان کی تصحیح سے میر انیس کے اس فقرے کی تائید ہوتی ہے کہ "اردو ہمارے گھر کی زبان ہے"

ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

مطلع

یارب عروس فکر کو حسن و جمال دے

(۱۷۱ بند)

سید یوسف حسین شائق مرحوم نے اس مرثیے کی تصحیح کر کے ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری مرحوم کو ہندوستان بھیجا تھا۔ انھوں نے یہ مرثیہ یوسف صاحب کے حقیقی بھتیجے سید علی احمد دانش کو مرحمت فرمایا۔

ہم ان کے شکریہ کے ساتھ اسے شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

یوسف حسین صاحب کو انیس کے اس مرثیے کی جو نقل دیکھنے کو ملی اس میں حسب ذیل غلطیاں نظر آتی ہیں۔

اگلے صفحات پر تفصیل کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں۔

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
۱	۲	۲	دریائے فکر سے گہر بے بہا کہا +	یہ مصرعہ دو لخت ہے۔ دونوں فقروں کو ملا کر کوئی مفہوم نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ مصرعہ یوں پڑھا جائے کہ:- دریائے فکر کے گہر بے بہا کہا۔ تو یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ تو نے دریائے فکر سے جو گہر بے بہا نکالے ہیں ان کو دکھا مصرع میں "سے" غلط اور "کے" صحیح ہے۔
۲	۳	۱	جب رن میں دُرخشاں وُرقِ آسماں ہوا +	یہ مصرع ناموزوں ہے۔ صحیح لفظ "درفشاں" ہے
۳	۴	۳	کوسوں نشاں تھا نور کا یا ابر خشک و تر +	دوسرے فقرے کو پہلے فقرے سے کوئی ربط نہیں ہے میرے نزدیک درست مصرع یہ ہے:- کوسوں نشاں تھا نور کا بالائے خشک و تر
۴	۵	۶	جانیں لڑی ہوئی ہیں عروس بہار سے +	اس بند کے پہلے پانچوں مصرعوں میں فعل ماضی کا استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا اس مصرع میں بھی فعل ماضی "تھیں" بجائے "ہیں" کے ہونا چاہئے درست مصرع ہوگا "جانیں لڑی ہوئی تھیں عروس بہار سے"
۵	۷	۴	باندھی صفیں سبھوں نے بصد عز و افتخار +	"باندھی" کے بجائے "باندھیں" ہونا چاہئے۔ کیونکہ "صفیں" جمع ہے۔
۶	۷	۵	اس دم زباں پہ تھا ہر اک دل ملول کی +	اگر "زبان" میں نون کا اعلان کیا جائے تو تو مصرع موزوں رہتا ہے ورنہ ناموزوں ہوتا ہے۔ میرے خیال میں صحیح مصرع یوں ہے "اس دم زباں پہ تھا یہ ہر اک دل ملول کی" اس طرح اشارہ واضح بھی ہو جاتا ہے۔
۷	۱۳	۴	کٹ جائے خنجر براں سے یہ گلا +	مصرع ناموزوں ہے۔ صحیح مصرع یہ ہوگا:- "کٹ جائے آج خنجر براں سے یہ گلا"
۸	۱۴	۵	ہے تحط آب فاطمہ کے لال پر +	یہ مصرع ناموزوں ہے۔ اس مصرع کے آگے (کذا) لکھا ہے جس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلمی نسخہ میں مصرع اسی طرح لکھا ہوا دیکھا گیا ہو سکتا ہے لکھنے والے سے ایک لفظ چھوٹ گیا ہو۔ میرے نزدیک صحیح مصرع یہ ہے "ہے قحط آب فاطمہ زہرا کے لال پر"
۹	۱۵	۱	کیا منہ بشر سے وصف جو ہوئیں ترے ادا +	اس بند کے چاروں مصرعوں میں ترے ردیف ہے اور ادا۔ مسا۔ کبریا اور سوا قافیہ ہیں۔ لہٰذا پہلا مصرعہ یہ ہونا چاہئے۔ "کیا منہ بشر سے وصف جو ہوئیں ادا ترے"
۱۰	۱۵	۲	غربت میں لطفِ عام صبح و مسا ترے +	ترے جمع ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ "لطف عام ہے" کا فقرہ

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
				غلط ہے صحیح مصرع یوں ہے۔ "غربت میں لطف عام ہیں صبح و مسا ترے"
۱۱	۱۷	۳	واقعی ہوں میں اسیر ہوں گر فاطمہ کی آل +	آل کا لفظ واحد استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا "اسیر ہوں" کے بجائے "اسیر ہو" ہونا چاہئے۔
۱۲	۱۹	۱	فوج گراں ادھر ہو تو ہو کچھ نہ اس کا غم +	"کچھ نہ اس کا غم" ناقص فقرہ ہے۔ لہٰذا نحوی اعتبار سے غلط ہے۔ میرے نزدیک درست مصرع یوں ہے۔ "فوج گراں ادھر ہے تو ہو کچھ نہیں ہے غم"
۱۳	۱۹	۲	یا باگیں پھیر لیں گے جو تیغیں ہو ویں علم +	اس مصرع میں "ہو ویں" کے بجائے "ہوئیں" ہو تو مصرع موزوں ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ "یا" کے کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے جب تک اس کے ساتھ دیگر صورت کا اظہار نہ ہو کہ اگر باگیں نہ پھیریں تو پھر کیا کریں گے اس کا کہیں آگے کے مصرع میں اظہار نہیں ہے لہٰذا "یا" بے معنی ہے۔ میرے نزدیک صحیح مصرع یوں ہوگا۔ "سب باگیں پھیر لیں گے جو تیغیں ہوئیں علم"
۱۴	۱۹	۵	مغرور و بدخصال سپہ بدشعور ہے +	اس مصرع میں اول تو سپہ اضافت کے ساتھ ہونا چاہئے۔ دوسرے "بدشعور" خلاف زبان ہے۔ بے شعور بولا جاتا ہے۔ لفظ بدخصال کے ساتھ مصرع موزوں رکھنے کے لیے سپہ کو بلا اضافت کے پڑھنا پڑتا ہے ورنہ ناموزوں ہو جائے گا۔ میرے نزدیک صحیح مصرع یہ ہے "مغرور و بے حیا سپہ بے شعور ہے"
۱۵	۲۰	۵	لشکر پہ جا پڑیں گے ارادے غضب کے ہیں +	اگر "غضب کے ہیں" کو ردیف مانا جائے تو قافیے ارادے اور تیور ہوں گے جو نہیں ہو سکتے لہٰذا یہ ردیف نہیں ہے بلکہ ردیف "کے ہیں" ہے لہٰذا صحیح پانچواں مصرع ہے "لشکر پہ جا پڑیں گے ارادے یہ کب کے ہیں" اب قافیہ ہوئے 'سب' اور 'غضب'،
۱۶	۲۰	۶	چتون قہر کی ہے یہ تیور غضب کے ہیں +	چھٹے مصرع میں لفظ "قہر" "بسکون ہا" درست ہے۔ "بکسر ہا" غلط ہے۔ اس کے بعد بھی مصرع ناموزوں ہے۔ یہ مصرع صحیح یوں ہے کہ:- "چتون جو قہر کی ہے تو تیور غضب کے ہیں"
۱۷	۲۱	۱	ایک ایک سرفروش ہیں ایک ایک جاں نثار +	ایک ایک کے بعد "ہیں" خلاف زبان ہے۔ صحیح مصرع یہ ہوگا

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
				" ایک ایک سرفروش ہے ایک ایک جاں نثار "
۱۸	۲۲	۵	تیغ و الم سے میرا جگر چاک چاک ہو +	اول تو یہ کہ 'تیغ و الم' کا عطف غلط اور بے معنی ہے۔ یہاں اضافت ہے یعنی "تیغِ الم" ہے دوسرے ردیف "ہو" نہیں بلکہ "ہے" ہے۔ لہٰذا مصرع یہ ہوا۔ "تیغِ الم سے میرا جگر چاک چاک ہے"
۱۹	۲۲	۶	چھوٹے جو یہ رفیق تو دنیا پہ خاک ہو +	اس مصرع میں بھی "خاک ہو" کے بجائے "خاک ہے" ہونا چاہئے
۲۰	۲۷	۲	جو اقتل الحسین کی ہونے لگی پکار +	اقتل صیغہ امر واحد ہے۔ اقتلو صیغہ امر جمع ہے۔ املا کی غلطی ہے اقتلوالحسین ہونا چاہئے۔
۲۱	۲۷	۶	بھڑنے لگے صفوں سے سپاہی جمے ہوئے +	لفظ "بھڑنا" غلط ہے صحیح املا "بڑھنا" ہے لہٰذا مصرع درست یہ ہے "بڑھنے لگے صفوں سے سپاہی جمے ہوئے" میں نے بہت سے قلمی نسخوں میں بڑھنے اور چڑھنے کا املا غلط دیکھا ہے جسے انھوں نے بھڑنے اور چھڑنے لکھا ہے۔
۲۲	۳۳	۲	غصے سے کانپتے ہوئے اٹھے وہ نوحہ گر +	یہ بیان مادر جناب قاسم کے متعلق ہے۔ چوتھے مصرع اور بیت پر غور کیجئے کہ یہ الفاظ کس کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ صحیح مصرع یہ ہوگا "غصے سے کانپتی ہوئی اٹھی وہ نوحہ گر"
۲۳	۳۴	۳	فضہ سے رو کے کہنے لگی وہ نکو سیر +	یہ مصرع بھی مادر قاسم سے متعلق ہے لہٰذا یوں ہونا چاہئے۔ "فضہ سے رو کے کہنے لگی وہ نکو سیر"
۲۴	۳۹	۴	یوں ہوتا ہے خوش کوئی وقتِ امتحاں +	میرے نزدیک مصرع یوں ہے۔ "ہوتا ہے یوں خوش کوئی وقتِ امتحاں" لکھنے والے سے ترتیب الفاظ بدل گئی ہے۔
۲۵	۴۳	۶	درپیش آج صبح سے منزل ہے قہر کی +	پانچویں مصرع میں قافیہ "صبر" ہے۔ اس کا قافیہ "قہر" نہیں ہو سکتا اصل قافیہ "قبر" ہے لہٰذا مصرع یوں ہے۔ "درپیش آج صبح سے منزل ہے قبر کی"
۲۶	۴۴	۱	مادر سے رو کے ابن حسن نے یہ تب کہا +	"تب کہا" کے بعد وہ الفاظ ہونا چاہئے تھے جو کہے گئے لیکن دوسرا مصرع ظاہر کرتا ہے کہ جو بات جناب قاسم پہلے کہہ چکے ہیں اسے سن کر وہ سر جھکا کے رہ گئی۔ لہٰذا صحیح مصرع یہ ہے " مادر سے رو کے ابن حسن نے یہ جب کہا " یعنی

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
				وہ بات جو گذشتہ بند میں بیان ہوئی۔
۲۷	۴۵	۶	میں آپ دلائے دیتی ہوں رن کی رضا تمہیں +	مصرع ناموزوں ہے۔ صحیح مصرع یہ ہے "میں اب دلائے دیتی ہوں رن کی رضا تمہیں"
۲۸	۴۷	۴	بلوے میں سر کھلنے کا بس آگیا خیال +	مصرع ناموزوں ہے۔ صحیح مصرع یہ ہے۔ "بلوے میں سر کے کھلنے کا بس آگیا خیال"
۲۹	۵۱	۴	مجبور ہوں نہ بس ہے کچھ اپنا نہ اختیار +	"ہوں" کے بجائے "ہیں" فصیح تر ہے
۳۰	۵۱	۶	پھر کیا کریں اجل کے گریباں میں ہاتھ ہے +	"پھر" بے معنی ہے "پر" ہونا چاہئے لیکن کے معنی میں دوسرے "اجل کے گریباں" غلط ہے۔ دراصل اپنے گریبان میں اجل کا ہاتھ ہے۔ لہٰذا "اجل کا" ہونا چاہئے۔ صحیح مصرع یہ ہے "پر کیا کریں اجل کا گریباں میں ہاتھ ہے"
۳۱	۵۲	۵	تعریف ہر زباں میں ہے اس رشک ماہ کی +	"زبان میں" خلاف زبان ہے "زبان پہ" ہونا چاہئے صحیح مصرع یوں ہوگا "تعریف ہر زباں پہ ہے اس رشک ماہ کی"
۳۲	۵۵	۶	روکے نہ گر تو وہ خود جہیائے جنگ تھی +	مصرع ناموزوں ہے۔ دوسرے یہ کہ مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ اگر لوگ اسے نہ روکتے تو وہ خود جنگ کرنے کو تیار تھی۔ اس مفہوم کے لیے "روکے" کا لفظ درست نہیں ہے۔ صحیح مصرع یوں ہے "روکیں نہ گر تو خود وہ جہیائے جنگ تھی"
۳۳	۵۶	۳	اب تا کجا کہ ظلم کے صدمے اٹھائیں ہم +	لفظ "کہ" بے معنی ہے۔ مصرع یوں ہوگا۔ "اب تا کجا، یہ ظلم کے صدمے اٹھائیں ہم"
-X-	۵۸	۱	سر جھکا کے نہ آہ و بکا کرو +	یہ مصرع بھی ناموزوں ہے۔ غالباً "للہ سر جھکا کے نہ آہ و بکا کرو"
۳۴	۶۰	۱	جس دم سنی دلہن نے یہ باتیں بچشم تر +	یعنی "بات سنی" اور "باتیں سنیں"، لہٰذا صحیح مصرع یہ ہوگا "جس دم سنیں دلہن نے یہ باتیں بہ چشم تر"
۳۵	۶۳	۳	کیوں کر بھلا جگر یہ نہ ہو صدمۂ تعب +	صدمہ اور تعب کے درمیان عطف ہونا چاہئے۔ اضافت غلط ہے لہٰذا صدمہ و تعب ہونا چاہئے۔
۳۶	۶۳	۴	سہرا بندھا نہ تھا کہ اجل نے کیا غضب +	پہلے مصرع میں غضب کا قافیہ آچکا ہے لہٰذا ایطائے جلی ہوتا ہے۔ یہ مصرع دراصل یوں ہوگا۔ "سہرا بندھا نہ تھا کہ اجل نے کیا طلب"

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
۳۷	۶۴	۱	صاحب کنیز آپ کی الفت کی ہو فدا +	"الفت کے" یا "الفت پہ" ہونا چاہئے "الفت کی" غلط ہے
۳۸	۶۴	۳	پر خیر جائیے مجھے اتنی ہے التجا +	"مجھے التجا ہے" خلاف زبان ہے۔ کبھی یوں نہیں بولا جاتا۔ صحیح مصرع یوں معلوم ہوتا ہے۔ "پر خیر جائیے مگر اتنی ہے التجا"
۳۹	۶۴	۴	لاشہ جہاں ہو میں بھی وہیں ہو پڑے عزا +	"وہیں ہو" کے بجائے "وہیں ہوں" ہونا چاہئے۔
۴۰	۶۵	۶	شب کو جو دلہن تھی وہ صبح رانڈ ہو گئی +	مصرع ناموزوں بھی ہے اور لفظ "صبح" حرکت با کے ساتھ غلط ہے۔ صحیح مصرع یوں معلوم ہوتا ہے۔ "شب کو دلہن تھی صبح کو یں رانڈ ہو گئی"
۴۱	۶۷	۳	آئی کوئی برِ لشکرِ اعدا میں ہے پکار +	"آئے کوئی" ہونا چاہئے۔ یائے مجہول و معروف میں امتیاز رکھنا ضروری ہے۔
۴۲	۶۷	۴	بقرار ہے ہیں غیظ سے عباس ذی وقار +	"بقرار ہے" ہونا چاہئے ممکن ہے یہ قلم کی لغزش ہو۔
۴۳	۷۰	۶	صدقے گئی غلام بھی حاضر ضرور ہے +	مادر جناب قاسم حضرت سے بیٹے کو جنگ کی رضا دینے کی سفارش کر رہی ہیں اس موقع پر یہ کہنا کہ غلام بھی حاضر ہے ضرور کے لفظ کے ساتھ بے معنی ہے۔ اصل مصرع یوں ہے۔ "صدقے گئی غلام کی خاطر ضرور ہے" مراد یہ ہے کہ آپ کو غلام کی دل شکنی نہ کرنا چاہئے۔
۴۳	۷۳	۵	اب اس مریض غم کے پرستار آپ ہیں +	جناب قاسم اپنی ماں سے خطاب کر رہے ہیں لہٰذا "غم کی پرستار" ہونا چاہئے۔
۴۴	۷۳	۶	بیوہ کے اس الم میں مددگار آپ ہیں +	اسی طرح مراد یہ ہے کہ "بیوہ کی مددگار آپ ہیں" لہٰذا مصرع یہ ہوگا "بیوہ کی اس الم میں مددگار آپ ہیں"
۴۵	۷۴	۴	تنہا ہوا چلا وہ دلاور خیام سے +	مصرع دو لخت ہے۔ دونوں فقروں میں کوئی ربط نہیں ہے۔ یہ لفظ پڑھنے کی غلطی معلوم ہوتی ہے اصل مصرع یوں ہوگا۔ "تنہا ہوا چلا وہ دلاور خیام سے" دلاور کے لفظ کے ساتھ تنہا کے لفظ کو مناسبت ہے۔
۴۶	۷۵	۴	آگے بڑھی جلوس ظفر انتظام کو +	یہ لفظ جلوس نہیں ہے بلکہ "جلو میں" ہے۔ یہ بھی پڑھنے کی غلطی ہے۔ مصرع یہ ہے۔ "آگے بڑھی جلو میں ظفر انتظام کو"

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
۴۷	۷۵	۶	طبقۂ زمیں چرخ چہارم سے جا ملا +	لکھنے میں لفظ "کا" چھوٹ گیا ہے۔ مصرع یہ ہوگا "طبقۂ زمیں کا چرخ چہارم سے جا ملا"
۴۸	۷۶	۴	آنکھوں میں شب سے نیند کی چھایا ہوا خمار +	خمار مذکر ہے لہٰذا "نیند کا" ہونا چاہئے۔
۴۹	۷۶	۶	سہرے سے ہے عیاں کہ دولہا ہیں رات کے +	اول یہ کہ عیاں اعلان نون کے ساتھ جائز نہیں۔ دوسرے یہ کہ پانچویں مصرع میں فعل "تھا" ہے۔ اس کا التزام ہونا چاہئے۔ لہٰذا مصرع یہ ہوگا۔ "سہرے سے یہ عیاں تھا کہ دولہا ہے رات کا"
۵۰	۷۸	۵	بھالا ہلا رہے یہ حسرت وغا کی تھی +	مصرع ناموزوں ہے۔ غالباً "تھے" لکھنے سے چھوٹ گیا ہے۔ مصرع یہ ہے "بھالا ہلا رہے تھے یہ حسرت وغا کی تھی"
۵۱	۸۰	۵	کڑکیت یوں صفوف سے گھبرا کے رہ گئے +	اس مصرع میں "سے" نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے بجائے "میں" سے درست معنی پیدا ہوتے ہیں۔
۵۲	۸۱	۴	سینہ سے دل جدا تھے اور دل سے جگر جدا +	مصرع ناموزوں ہے۔ یہ مصرع اس طرح ہوگا۔ "سینے سے دل جدا تھا تو دل سے جگر جدا"
۵۳	۸۲	۶	ایسی ہوا چلی کہ سروں کو پتا نہ تھا +	اس مصرع میں "کو" کے بجائے "کا" ہونا چاہئے
۵۴	۸۳	۲	دریائے خوں میں تیرتی پھرتی تھی چار سو +	تیرنے اور پیرنے کے معنوں میں فرق ہے۔ تیرنا بیجان چیزوں کے سطح آب پر بہنے کو کہتے ہیں اور پیرنا ارادے کے ساتھ پانی میں حرکت کرنے کو کہتے ہیں۔ یہاں تلوار کو کیا ہے لہٰذا "پیرتی" درست ہے۔
۵۵	۸۵	۶	کانسے سروں کے تیرتے پھرتے تھے خون میں +	"کانسہ" نون غنہ کے ساتھ لکھنا غلط ہے۔ صحیح لفظ "کاسہ" ہے
۵۶	۸۶	۶	آؤ ادھر کہ فوج بھری ہے مزار میں +	یہ مصرع صحیح نہیں پڑھا جا سکا ہے۔ درست مصرع یہ ہے۔ "آؤ ادھر کہ فوج کی بھرتی ہے نار میں" (نار سے مراد دوزخ ہے)
۵۷	۹۰	۴	تلوار کھا کے کھولے ہوئے منہ قضا گری +	"کھا کے" غلط ہے۔ مصرع بے معنی ہوتا ہے۔ صحیح مصرع یہ ہوگا "تلوار کیا کہ کھولے ہوئے منہ قضا گری"
۵۸	۹۲	۱	ہلچل پڑا ہے رعب سے غازی کے ہر کہیں +	"ہے" کے بجائے "تھی" ہونا چاہئے۔ پیشتر کے بند میں بھی اور اس بند کے اگلے مصرعوں میں فعل ماضی آیا ہے۔
۵۹	۹۶	۳	شہرہ ہے ان کے جنگ جدل کا کہاں کہاں +	"کے" کے بجائے "کی" ہونا چاہئے۔ جنگ و جدل مونث ہے۔

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
۶۰	۹۶	۶	جائیں گے وہ جو خلعت و انعام پائیں گے +	"جو" غلط ہے۔ مصرع یوں صحیح ہے "جائیں گے وہ تو خلعت و انعام پائیں گے"
۶۱	۹۷	۳	آیا وہ بے حیا تو یہ بولا وہ بے ادب +	"آیا" غلط ہے "آئے" ہونا چاہئے۔ دوسرے مصرع اور چوتھے مصرع کے معنوں پر غور کیجئے۔ چوتھے مصرع میں چاروں سے خطاب ہے۔
۶۲	۱۰۰	۳	جس کی بساط خاک نہ ہوئی وہ کیا بڑھے +	"ہوئی" غلط ہے "ہوئے" درست ہے۔
۶۳	۱۰۰	۴	بجلی سے کب اماں کہ جو تیغ قضا بڑھے +	"کہ" بے معنی ہے۔ مصرع یوں ہوگا۔ "بجلی سے کب اماں ہے جو تیغ قضا بڑھے"
۶۴	۱۰۱	۴	رستم بھی گوشہ گیر ہو جیسے بشکل زال +	"جیسے" ملا کر لکھنا غلط ہوگا۔ "جس سے" ہونا چاہئے۔
۶۵	۱۰۵	۳	چارا جو ہاتھ دوڑ کے اس نیزہ فام کو +	"چارا" غلطی سے لکھ گیا ہے "مارا" ہے
۶۶	۱۰۵	۶	در آئی جسم نجس میں ترکش کو کاٹ کے +	"نجس" غلطی سے لکھ گیا ہے "نحس" ہے
۶۷	۱۰۶	۶	ان کو انتظار ہے نار جہیم میں +	"جہیم" غلط ہے۔ درست املا "جحیم" ہے
۶۸	۱۰۸	۶	گھوڑے سے ہو الٹ کے شقی منہ کے بھل گرا +	"ہو الٹ" مہمل ہے۔ صحیح مصرع یوں ہوگا۔ "رہوار سے الٹ کے شقی منہ کے بھل گرا"
۶۹	۱۱۱	۱	چاروں شیر جب ہوئے دوزخ میں ایک جا +	مصرع ناموزوں ہے "شیر" کے بجائے "شریر" ہونا چاہئے۔
۷۰	۱۱۲	۴	بیٹوں بغیر زہر ہے دنیا کا ناؤ نوش +	"ناؤ نوش" کے بجائے "نائے و نوش" ہونا چاہئے۔
۷۱	۱۱۴	۳	جوڑوں اگر بڑھ کے تیر +	یہ مصرع ناقص لکھا ہے۔ پورا مصرعہ یہ ہوگا۔ "جوڑوں اگر کمان کیانی میں بڑھ کے تیر"
۷۲	۱۱۸	۳	باغی جہاں میں ظلم کا ان کو ملا یہ پھل +	"باغی" کا لفظ یہاں بے معنی ہے۔ صحیح مصرعہ یہ ہے۔ "باغ جہاں میں ظلم کا ان کو ملا یہ پھل"
۷۳	۱۱۹	۱	گھبرانہ او شریرِ بد آئین و بد گہر +	شریر اور بد آئین کے درمیان اضافت غلط ہے۔ یہاں واؤ عطف ہونا چاہئے یعنی "شریر و بد آئین"
۷۴	۱۲۱	۲	سنبھلا ادھر سمند پر شبر کا یادگار +	"پر" سے مصرع ناموزوں ہوتا ہے "یہ" ہونا چاہئے۔
۷۵	۱۲۲	۵	گویا قوی پہ زور کہاں بدخصال میں +	"گویا" سے کچھ معنی نہیں پیدا ہوتے۔ مصرع یوں ہے۔ "گو ہے قوی پہ زور کہاں بدخصال میں"
۷۶	۱۲۳	۱	دیکھو غرور و خودی سے ہوتا ہے دم میں زیر +	مصرع ناموزوں ہے۔ یہاں "خودی" کے بجائے "کبر" ہوگا۔

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
۷۷	۱۲۳	۳	ہے بے حواس دیکھتا ہے شہ کو پھیر پھیر +	"شہ کو پھیر پھیر" بے معنی ہے۔ صحیح مصرعہ یہ ہے۔ "ہے بے حواس دیکھتا ہے منہ کو پھیر پھیر"
۷۸	۱۲۴	۴	یہاں سے ہٹ پر چڑھ کے تازی پہ رواں ہوا +	مصرع ناموزوں ہے۔ اصل مصرع یوں ہو گا۔ "یاں سے ہٹ پہ تازی پہ چڑھ کر رواں ہوا"
۷۹	۱۲۴	۶	پڑھتے تھے فتح آیۂ نصرت قریب سے +	"پڑھتے تھے" سے مصرع کا مفہوم غلط ہوتا ہے۔ درست مصرع یوں ہے "پڑھتی تھی فتح آیۂ نصرت قریب سے" مراد یہ ہے کہ فتح خود آیۂ نصرت پڑھتی تھی۔
۸۰	۱۲۵	۳	وہ سم کہ ہر قدم پہ ہلا ہل فلک نثار +	"ہلاہل فلک" مہمل ہے۔ درست "ہلا ہل فلک" ہے۔
۸۱	۱۲۶	۳	دولہا کو حق نے دی تھی اسے فتح کی سند +	"دولہا کو" کہہ دینے کے بعد "اسے" کی ضمیر لانا عبث ہے۔ صحیح مصرع یوں ہے "دولہا کو دی تھی حق نے اسی فتح کی سند"
۸۲	۱۲۸	۶	آنکھیں ملا کے جنگ جدل کی نہر تو دیکھ +	اس بیت میں "کو دیکھ" ردیف ہے۔ لہٰذا قافیہ "ادھر اور ہنر" ہوں گے۔ مصرع یوں ہے "آنکھیں ملا کے جنگ جدل کے ہنر کو دیکھ"
۸۳	۱۲۹	۲	نیزے کے بھال دیکھ کے تھرا گیا جگر +	بھال مونث ہے لہٰذا "کے" نہیں "کی" ہونا چاہئے
۸۴	۱۳۲	۲	کاٹا سنان و تیغ و زرہ حلقۂ کمند +	چار چیزوں کے کاٹنے کا ذکر ہے لہٰذا کاٹے ہونا چاہئے
۸۵	۱۳۲	۴	دو تھا لیئم سر سے کمر تک مع سمند +	"مع" ہونا چاہئے۔ مع کا املا "معہ" یعنی "ہ" کے ساتھ غلط ہے۔ "مع" عربی لفظ جس کے معنی ہیں "اس کے ساتھ"
۸۶	۱۳۷	۱	بھیا کمال آپ سے مادر تھیں بے حواس +	"سے" بے معنی ہے "کی" ہونا چاہئے
۸۷	۱۳۷	۲	کیسی دعا یہ مانگ رہی تھیں وہ حق شناس +	"یہ" کا اشارہ بے محل ہے۔ صحیح مصرعہ یہ ہو گا۔ "کیسی دعائیں مانگ رہی تھیں وہ حق شناس"
۸۹	۱۳۹	۶	یہ سب مہم حضور کے صدمے سے سر ہوئی +	"صدقے" ہے غالباً نقطے سہواً چھوٹ گئے ہیں۔
۹۰	۱۴۶	۱	گرتے ہی خاک پہ شہ والا کو دی صدا +	"پہ" سے مصرع ناموزوں ہوتا ہے "پر" ہونا چاہئے
۹۱	۱۴۸	۴	جاتے ہیں رن کو لاش اٹھائے شہ زمن +	"اٹھائے" غلط ہے "اٹھانے" ہونا چاہئے۔
۹۲	۱۵۱	۴	اس پرورش پہ آپ کے صدقے یہ تشنہ کام +	"کے" کے بجائے "کی" ہونے سے مصرع فصیح ہوتا ہے۔ یوں بہتر ہے، "اس پرورش پہ آپ کی صدقے یہ تشنہ کام"
۹۳	۱۵۲	۶	کیوں کر اٹھوں کہ تیغوں سے ہر عضو چور ہیں +	"ہر" کے ساتھ "ہیں" غلط ہے۔ مصرع یوں ہو گا "کیوں کر اٹھوں کہ تیغوں سے سب عضو چور ہیں"
۹۴	۱۵۵	۴	بیٹا چچا کو کون اس آفت سے بچائے +	مصرع ناموزوں ہے۔ مصرع یہ ہو گا۔ "بیٹا چچا کو کون اس آفت سے اب بچائے"

نمبر شمار	بند نمبر	مصرع	غلط مصرع	یوسف حسین شائق کی تصحیح
۹۵	۱۵۶	۲	پٹیں یہ سر حرم کہ قیامت ہوئی بپا + اسی مرثیے کے بند عدد ۱۶۹ کا تیسرا مصرع دیکھئے۔	حرم مذکر استعمال ہوتا ہے جمع میں۔ مثال "کربلا میں شہ والا کے حرم لٹتے ہیں" لہٰذا مصرع یہ ہوگا "پیٹے یہ سر حرم کہ قیامت ہوئی بپا"
۹۶	۱۵۸	۲	آنکھوں سے سیل اشک ہوئے یک بیک رواں +	"سیل" مونث ہے لہٰذا "ہوئے" کی بجائے "ہوئی" ہونا چاہیے دوسرے یہ کہ سیل کی جمع نہیں آتی۔
۹۷	۱۵۸	بیت	کانپا جو پاؤں ضعف سے تیورا کے گر پڑے لاشہ جہاں تھا بس وہیں تھرا کے گر پڑے	مادر جناب قاسم کی حالت کا ذکر ہے لہٰذا فعل مذکر نہ ہونا چاہئے۔ بیت یوں ہوگی۔ کانپے جو پاؤں ضعف سے تھرا کے گر پڑی لاشہ جہاں تھا بس وہیں تھرا کے گر پڑی
۹۸	۱۵۹	۱	شانہ ہلا کے لاشہ کا بولے وہ تشنہ کام +	یہاں بھی "بولے" کے بجائے "بولی" ہونا چاہئے۔
۹۹	۱۵۹	۶	یہ کیا سبب کہ ہاتھ میں تیغ و سپر نہیں +	یہ مصرع یوں ہونا چاہئے:- "ہے کیا سبب کہ ہاتھ میں تیغ و سپر نہیں"
۱۰۰	۱۶۴	۱	کہہ دو پکار کر کوئی آنسو نہ بہائے +	مصرع ناموزوں ہے۔ غالباً "اب" لکھنے سے رہ گیا ہے۔ پورا مصرع یہ ہے "کہہ دو پکار کر کوئی آنسو نہ اب بہائے"
۱۰۱	۱۶۴	۲	بانو کہاں ہیں اُن کے دولہا کو دیکھ جائے +	دیکھ جائے کے ساتھ "کہاں ہیں" درست نہیں ہے۔ صحیح مصرع یہ ہوگا۔ "بانو کہاں ہے اُن کے دولہا کو دیکھ جائے"
۱۰۲	۱۶۶	۱	اک آہ کر کے بیٹھ گئے وہ جگر فگار +	"گئے" غلط ہے "گئی" ہونا چاہئے۔
۱۰۳	۱۶۸	۲	یہ درد وہ نہیں جس کی کوئی دوا کرے +	صرف الفاظ بے ترتیب ہونے سے مصرع ناموزوں ہو گیا۔ درست مصرع یہ ہے "یہ درد وہ نہیں کوئی جس کی دوا کرے"
۱۰۴	۱۶۹	۳	در تک گئے خیام سے سر پیٹتے حرم +	"سے" کے بجائے "در کے" ہونا چاہئے۔
۱۰۵	۱۷۱	مقطع	خاموش اے انیس ہوا مرثیہ تمام محشر بپا ہے بزم میں روتے ہیں خاص و عام گھبرا نہ اپنی زشتیِ قسمت سے صبح و شام کر دیں گے آپ تو تیری مدد سرورِ انام سب کچھ ملے گا فیضِ امامِ غیور سے لینی ہے داد قاسمِ صہبائے نور سے	

ھمراز جعفری
بزازہ۔ وکٹوریہ اسٹریٹ چوک لکھنؤ

میر انیسؔ از دیدگاہ بزرگاں

میرؔ، غالبؔ، انیسؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فراقؔ اور فیضؔ اردو شاعری کے اہم ترین نام ہیں انیسؔ نے مرثیہ کی صنف میں جس طرح اپنی خودساختہ صلاحیت کا لوہا منوایا ہے وہ مرتبہ کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔

میر انیسؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا اور کم عمری میں ہی اپنی صلاحیت کے جوہر دکھانے شروع کردیے تھے لیکن والد کی ہدایت پر کہ "اپنی آخرت کے لیے کچھ کرو" انیسؔ نے غزل کو خداحافظ کہا اور اپنا سارا کلام صحن کے حوض میں پھینک دیا جو یقیناً اردو شاعری پر ستم تھا۔ اس کے بعد انیسؔ نے ساری شاعری اہلبیت کے لیے وقف کردی اور پھر مڑ کر غزل کی طرف نہیں دیکھا یہی وجہ ہے کہ انیس کے مرثیوں میں تغزّل بدرجۂ اتم موجود ہے اور اسی چیز نے انیسؔ کے مرثیوں کو جلا بخشی ہے۔

میر انیس کی پیدائش کے حوالے سے دو روایات موجود ہیں پہلی یکم جنوری ۱۸۰۲ اور دوسری ۱۸۰۳ کی تاہم زیادہ تر محققین نے ۱۸۰۳ ہی کو درست قرار دیا ہے۔ انیس کے سن وفات پر تمام محققین کا اتفاق ہے اور ان کی وفات ۱۸۷۴ میں بہتر تہتر برس کی عمر میں ہوئی۔ میر انیس اتر پردیش کے ضلع فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی، میں پیدا ہوئے۔ انیسؔ کے والد میر خلیق اور دادا میر حسن (مثنوی سحرالبیان اور بدرِ منیر) کے خالق اپنے عہد کے معروف شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے مورث اعلا میر امامی شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے اور اپنے علم و فضل کی بنا پر اعلیٰ منصب پر فائز رہے ان کی زبان فارسی تھی لیکن ہندوستانی اثرات کے سبب دو نسلوں کے بعد ان کی اولاد فصیح و بلیغ اردو بولنے لگی۔

"مسعود حسن رضوی نے میر انیسؔ کا خاکہ یوں کھینچا ہے۔

"میر انیس قدرے دراز قامت، ٹھوس اور متناسب جسامت کے مالک تھے خوبصورت کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، صراحی دار گردن، ذرا بڑی مونچھیں اور باریک داڑھی کہ جو دور سے ترشی ہوئی محسوس ہو۔ میر انیسؔ کا یہ سراپا سامعین کو شعر کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا بھی گرویدہ بنا دیتا تھا۔ انیسؔ کا پسندیدہ لباس دو پلی ٹوپی، لمبا گھیردار کرتا اور شکن دار پاجامہ تھے کہ یہی اس زمانے کے شرفا اور ذی علم افراد کا لباس ہوا کرتا تھا۔"

انیسؔ کے بیٹے میر نفیسؔ کے نواسے میر عارفؔ کی ایک تحریری یادداشت سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ کے بعد انیسؔ نے محلہ سبزی منڈی چوک لکھنؤ کے عقب میں واقع رہائش گاہ میں ۱۹۷ بند یعنی ایک ہزار ایک سو بیاسی مصرعوں کا "یہ مرثیہ"

"جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" ایک ہی رات میں تحریر کیا۔ اور رگھ کے عشرہ میں پڑھا۔ جو انیس کے شاہکار مراثی میں سے ایک ہے۔

انیس نے اپنی آخری پناہ گاہ کے لیے ۲۳ جولائی ۱۸۷۱ کو ایک وسیع زمین گھر کے قریب ہی تدفین کی خاطر ۱۰۰ روپئے میں خریدلی تھی ۱۸۷۴ میں ۲۴ رمضان المبارک کو انیس بیمار ہوئے اور ابتدا میں ہونے والا بخار مرض الموت بن گیا اور اس طرح ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ کو بوقت مغرب یہ آفتاب شاعری ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ غفرانمآب کی امام بارگاہ میں سید بندے علی حسین نے انیس کی نماز جنازہ پڑھائی اور انھیں سبزی منڈی چوک میں اپنے ہی گھر کے باغ میں سپرد خاک کیا گیا۔ زندگی کے آخری ایام میں ایک رباعی یوں کہی۔

وہ موج حوادث کا تھپیڑا نہ رہا
کشتی وہ ہوئی غرق وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی کے انیس
جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑہ نہ رہا

دستور زمانہ کے مطابق انیس نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا۔ ان کے والد میر خلیق مرثیہ کی طرح غزل کے کے بھی استاد مانے جاتے تھے فیض آباد میں جب تک رہ ند اور رشک کے قیام کے باوجود میر انیس اپنی غزلوں پر اصلاح اپنے والد ہی سے لیتے تھے پہلے حزیں تخلص تھا۔ شیخ امام بخش ناسخ کی فرمائش پر تبدیل کر کے انیس اختیار کیا انیس فارسی نظم و نثر لکھنے پر بھی قادر تھے۔ عربی فارسی قرآن وحدیث اور تاریخ کے علاوہ فنون شہ سواری و سپہ گری کی تعلیم بھی نامی اور لائق اساتذہ مولوی حیدر علی اور مفتی محمد عباس سے حاصل کی۔

رخصت عباس زیدی ۱۴ دسمبر ۲۰۰۹ کے عالمی اخبار بلاگ میں یوں رقم طراز ہیں۔

" میر ببر علی انیس کے بارے میں میں صرف یہ کہوں گا کہ میں ان کا عاشق ہوں اور میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ انیس دنیا کے تمام شاعروں پر بھاری ہیں ان کے مرثیے تو لاجواب ہیں ہی اور ان پر کچھ لکھنا اتنی مختصر حیات میں ممکن نہیں لیکن میں آج ان کی غزلوں کے اشعار سے آپ کو باخبر کرنا چاہوں گا۔ سب سے پہلے ان کی زندگی کا وہ پہلا شعر پیش کر رہا ہوں جو انھوں نے آٹھ برس کی عمر میں اپنے والد کے دوست معروف شاعر شیخ امام بخش ناسخ کے سامنے سنایا جس پر ناسخ ششدر رہ گئے اور پیش گوئی کر دی۔ ایک دن آئے گا کہ انیس کی زبان اور شاعری کی عالمگیر شہرت ہوگی۔ یہ بچہ سلطنت شعر کا بادشاہ بنے گا"

دو شعر ملاحظہ فرمائیں

کھلا باعث یہ اس بیداد کے آنسو نکلنے کا
دھواں لگتا ہے آنکھوں میں کسی کے دل کے جلنے کا

محمد حسین آزاد انیس کی غزل گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں "ابتدا میں انھیں بھی غزل کا شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے اور غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ شفیق باپ تو سن کر بہت باغ باغ ہوئے مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کل رات کو کہاں گئے تھے انھوں نے حال بیان کیا۔ خلیق نے غزل سنی اور فرمایا اب اس غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زور طبع صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادتمند بیٹے نے اس دن سے قطع نظر کی اور غزل مذکورہ کی طرح میں سلام کہا"

(آب حیات صفحہ ۵۱۹ محمد حسین آزاد)

انیس کے کلام کی تعریف کس کے لب پر نہیں ہے ۱۸۴۳ء میں انیس چالیس برس کی عمر میں لکھنؤ آئے تھے

تو مرزا دبیر کا طوطی بول رہا تھا ہر جگہ دبیر کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے یہ بات بالکل قابل ذکر ہے کہ مرزا دبیر کے کلام کے سمجھنے کی صلاحیت کچھ خاص لوگوں تک محدود تھی جیسے علماء، اساتذہ، ادباء، طلباء یا وہ جو اردو فارسی اور عربی کا علم رکھتے ہوں۔ ایک سادہ عام آدمی ان کے کلام کو سمجھ نہیں سکتا تھا کیونکہ ان کی شاعری کے اندر بہت ہی سخت اور عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ملے جلے الفاظ پائے جاتے تھے۔

وہیں اس ماحول میں انیس نے جن الفاظ کا اپنے کلام میں استعمال کیا وہ عام فہم تھے۔ انیس نے پہلے لکھنؤ کا بھرپور جائزہ لیا اور پھر انھوں نے لکھنؤ کو مرثیہ کی شکل میں ایک نایاب اور بیش بہا تحفہ دیا۔ بعض لوگوں میں یہ مغالطہ پیدا ہو گیا ہے کہ انیس جب لکھنؤ آئے تو انھوں نے لکھنؤ کی زبان و ادب تہذیب و ثقافت سے کسب فیض کیا جبکہ یہ بالکل غلط ہے۔ میر انیس نے اپنے خاندان اور اپنے گھر کی زبان، طرز زندگی سب کچھ مرثیہ کی شکل میں اہل لکھنؤ کو بطور تحفہ عطا کیا جس کی وجہ سے آج لکھنؤ پہچانا جاتا ہے لکھنؤ یہ فخر نہ کریں کہ لکھنؤ نے انیس کو شناخت دی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انیس نے لکھنؤ کو ایک پہچان دی اور وہ سرمایہ جو وہ فیض آباد سے لائے تھے لکھنؤ کے سپرد کر دیا یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہئے کہ انیس چالیس سال کی عمر کے بعد فیض آباد سے لکھنؤ وارد ہوئے تھے۔ ان تمام باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا آزاد کچھ اس طرح بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

"جس طرح انیس کا کلام لاجواب تھا اسی طرح ان کا پڑھنا بھی بے مثال تھا۔ ان کے گھرانے کی زبان اردو معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی۔ ان کے ذریعہ ہماری نظم کو قوت اور زبان کو وسعت حاصل ہوئی۔ انیس کا کہنا تھا کہ نہ لکھنؤ کا ان کی زبان سے کوئی تعلق ہے اور ان کی زبان کا لکھنؤ سے کوئی تعلق ہے۔ ان کے گھر کی زبان ہے۔"

نجم سبطین اپنے ایک مضمون "شاعری اور کربلا" میں انیس کے معمولات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں

"انیس کا معمول تھا کہ شب بھر جاگتے اور مطالعہ و تصنیف میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے پاس دو ہزار سے زائد قیمتی اور نایاب کتب کا ذخیرہ موجود تھا نماز صبح پڑھ کر کچھ گھنٹے آرام کرتے بعد دوپہر بیٹوں اور شاگردوں کے کلام کی اصلاح کرتے تھے۔ محفل احباب میں عقائد اور علوم و عرفانیات پر گفتگو کرتے تھے میر انیس کے نواسے میر سید علی کا بیان ہے کہ میر انیس کے متعلق آئینہ لے کر مشق مرثیہ خوانی کرنے کی روایت بالکل غلط ہے نہ کہ کمال ادائگی دیکھ دیکھ کر کچھ لوگوں نے از خود یہ سمجھ لیا تھا کہ آئینہ کے روبرو مشق کرتے ہوں گے۔"

سعادت خاں ناصر میر انیس کی غزل کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں۔

"عالم شباب میں چندے مشق غزل گوئی رہی۔"

(تذکرہ خوش معرکہ زیبا ص ۳۰۵ سعادت خاں ناصر)

آزاد کے مذکورہ بیان کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب لکھتے ہیں۔

"اس جملے (اب اس غزل کو سلام کرو) کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس زمین میں سلام کہو اور دوسرے یہ کہ اب غزل گوئی ترک کرو۔۔۔

سعادت مند فرزند نے ان دونوں معنوں میں باپ کے حکم کی تعمیل کی۔ یہ کسی نے نہیں لکھا کہ وہ کون سی غزل تھی لیکن میر انیس کی ایک غزل کے چند اشعار اور اس طرح میں ایک سلام ملتا ہے۔ غزل کے اشعار حسب ذیل ہیں۔ ان

سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ وہی غزل ہو۔

اشارے کیا نگہ ناز دلربا کے چلے
ستم کے تیر چلے نیمچے قضا کے چلے
پکارے کہتی تھی حسرت سے لاش عاشق کی
صنم کدھر کو ہمیں خاک میں ملا کے چلے
مثال ماہی بے آب موج تڑپا کی
حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

اس طرح میں سلام کے چودہ اشعار ہیں ان میں سے چند بند ملاحظہ کیجئے۔

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے
خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
مقام یوں ہوا اس کارگاہ دنیا میں
کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آ کے چلے
ملا جنھیں انھیں افتادگی سے اوج ملا
انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے
ملی نہ پھولوں کی چادر تو اہل بیت کرام
مزار شاہ پہ لخت جگر چڑھا کے چلے

اس سلام کا مقطع بہت مشہور ہوا تھا۔

انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

(۱) انیسیات ص ۱۶۲۔۱۶۳ پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۱)

ڈاکٹر نیر مسعود نے بھی اپنی کتاب میں انھیں اشعار سے غزل اور سلام کا حوالہ دیا ہے جو انیسؔ کی غزل گوئی ترک کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ یہی میر انیس کی آخری غزل ہوگی۔ تاہم بقول ادیب صاحب۔

البتہ میر صاحب کے سلاموں میں ایسے بہت سے اشعار ملتے ہیں جو غزل کا باعث ہو سکتے ہیں۔"

دانیس ص ۴۲ پروفیسر نیر مسعود رضوی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی ۲۰۰۲)

ادیب صاحب کے آخری جملہ سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ انیسؔ کے بعض سلاموں میں تغزل کے اشعار شاید پہلے ان کی غزلوں کے اشعار رہے ہوں جنھیں بعد میں انھوں نے سلام کے پیکر میں ڈھال دیا ہو۔ اس خیال سے ابھرنے کا سبب یہ ہے کہ انیسؔ کے کئی سلام اس زمانے کی غزلوں کی طرح نظر آتے ہیں۔ ان غزلوں کے کئی اشعار سلام کے شعر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً

ہمراہ آہ سرد یہیں اشک گرم بھی
باراں کا لطف خوب ہے ٹھنڈی ہوا کے ساتھ

میر انیس کا ایک مشہور سلام ہے۔

بین اے مجرئی قاسم کی دلہن کیا جانے
بیاہی اک شب کی رنڈاپے کا چلن کیا جانے

اسی زمین میں طالب علی عیشی کی غزل ہے۔ اس غزل کا مقطع ہے۔

کیوں نہ کم رتبہ غزل اپنی سمجھو عیشی
نافے کی قدر کو آہوئے ختن کیا جانے

انیسؔ کے مصرعے سے بھی عیشی کی غزل کے مصرعوں کی طرح اچھے تغزل کے نمونے ہیں۔ مثلاً

چھد گیا کس کا جگر تیر فگن کیا جانے
مرغ بے بال بھلا سیر چمن کیا جانے

انیس کے زمانے میں شعر گوئی کے دو انداز عام تھے ایک انداز تو وہی قدیم تھا جس کی روش سے میر تقی میر کو "خدائے سخن" تسلیم کیا گیا تھا لیکن اس انداز کو دہلوی شعراء سے منسوب کیا جاتا تھا یعنی تغزل میں داخلی افکار کی پیش کش جسے عرف عام میں فصاحت کہا جاتا ہے لیکن دوسرا انداز وہ تھا جسے لکھنؤ میں ناسخ اور ان کے شاگردوں اور پیروکاروں نے شہرت کے بام عروج پر

پہنچایا تھا اور اس انداز میں الفاظ کی شعبدہ بازی اور صناعی کو زیادہ دخل حاصل تھا۔ انیس کے فن کو پوری طرح سمجھنے کے لیے یہ جاننا بےحد ضروری ہے کہ انیس کی شعری شخصیت اس دکھاوے کا ردعمل ہے جس شاعری کا اس زمانے میں لکھنؤ میں دور دورہ تھا انیس کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہے انیس کا رویہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ انیس صرف دعویٰ نہیں کرتے بلکہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔

یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال
معجزہ گر نہ اسے کہئے تو ہے سحر جمال

انیس کی غزلوں میں سلام کے اچھے اشعار کی نایابی اور سلاموں میں اچھے تغزل کے اشعار دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ میر انیس نے جب غزل چھوڑ دی تو اچھے مصرعے یا اشعار اپنے سلاموں میں کھپا لیے ہوں گے لیکن اس خیال کی کوئی دوسری شہادت موجود نہیں ہے اور راقم کا خیال بس خیال ہی ہے۔ میر انیس کی غزل گوئی چھوڑنے کی وجہ جو اوپر بیان کی گئی ہے یعنی والد صاحب کے حکم کی تعمیل لیکن اس کا اصل سبب بقول ادیب صاحب۔
وہ غیر معمولی ملکۂ شاعری تھا جس کا اظہار غالب نے یوں کیا ہے۔

بہ قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لیے

بعض غزل گو شاعروں کے سلسلہ میں میر انیس کے چند جملے جو آزاد کے حوالے سے درج کئے جاتے ہیں ملاحظہ کیجیے
ذوق کے بارے میں آزاد نے انیس کی رائے جاننا چاہی۔
انیس کا جواب تھا۔
"فرمایا کہ میاں سید میر کے بعد پھر دلی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے۔" (آب حیات ص ۵۲۸ محمد حسین آزاد)
آزاد ہی کا بیان ہے کہ انھوں نے میر انیس کے سامنے ذوق کا یہ مطلع پڑھا۔

کوئی آوارہ ترے پیچھے اے گردوں نہ ٹھہرے گا
مگر تو بھی اگر چاہے کہ میں ٹھہروں نہ ٹھہرے گا

میر انیس نے یہ مصرع دوبارہ پڑھوایا اور کہا۔
"صاحب کمال کی بات یہ ہے کہ لفظ جس مقام پر اس نے بٹھایا ہے اس طرح پڑھا جائے تو ٹھیک ہوتا ہے نہیں تو شعر رتبے سے گر جاتا ہے۔"
(آب حیات ص ۵۷۴۔ محمد حسین آزاد)
اس سلسلہ میں چند واقعات کا ذکر سید امجد علی اشہری نے بھی کیا ہے جسے من وعن نقل کیا جاتا ہے ملاحظہ کیجیے۔
میر قربان علی سالک شاگرد مرزا غالب اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ کی یادداشت لکھتے ہیں۔
"دو مہینے سے لکھنؤ میں وارد ہوں دلی میں مرزا غالب اور استاد ذوق کی ہوائیں دیکھتا سنتا تھا مگر یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہے۔ میرزا غالب کو یکتائے فن کے لفظ سے یاد کیا اور ذوق و مومن کی نسبت فرمایا ذوق شاہی دربار کے شاعر اور مومن اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں پھر حکیم مومن خاں کا یہ شعر پڑھا۔

کچھ نہ شوخی چلی باد صبا کی
بگڑنے میں بھی زلف اسکی بنا کی

پڑھنے کے بعد ایک چپ سی لگ گئی جیسے کوئی حسین صورت سامنے ہے اور ہوا اس کی زلف اڑا رہی ہے اور میر صاحب اس کو دیکھ کر کلام کے مزے لے رہے ہیں۔ ایک روز فرمانے لگے دلی کا کچھ کلام سناؤ۔ میں نے مرزا غالب کی یہ غزل پڑھی۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے
ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

پھر اپنی غزل پڑھی اس کا ایک شعر یہ ہے ۔

دنیا میں مجھے خاک اڑانے نے ڈبویا
ہر بار نکل آتا ہے دریا مرے آگے

اس شعر پر فرمایا خوب کہا ہے یہ کہہ کر فرمانے لگے لکھنؤ والے ''روکے ہے'' ''کھینچے ہے'' نہیں بولتے ہیں ۔

(حیات انیس ص ۲۵۵ ۔ ۲۵۶ ، امجد علی اشہری ۱۹۰۷)

انیسؔ نے ہر لفظ کو اس کے مقام استعمال پر رکھ دیا انھوں نے لفظ کو برمحل اور بہتر محل پر استعمال کیا ہے تب جا کے لفظ اور زیادہ بامعنی ہوگیا ہے ۔ منظر نگاری میں ان کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا ہے ۔ اہل زبان کو ان کے سامنے سر بسجود ہونا پڑے گا ۔ انیس اردو ادب کو برمحل استعمال کرنا بتا گئے ۔ الطاف حسین حالی انیس کو فردوسی کا ہم پلہ بتاتے ہیں ۔

''الفاظ کو خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کرنے کو اگر معیار کمال قرار دیا جائے تو بھی میر انیسؔ کو اردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا میر انیسؔ کے ہر نقطہ اور ہر محاورہ کے آگے ہر اہل زبان کو سر جھکانا پڑتا ہے اگر انیسؔ چوتھی صدی ہجری میں ایران میں پیدا ہوتے اور اسی سوسائٹی میں پروان چڑھتے جس میں فردوسی پلا بڑھا تھا تو وہ ہرگز فردوسی سے پیچھے نہ رہتے ۔''

سید شریف الحسن شریف العلماء کے ایک خط کا حوالہ سید مسعود حسن رضوی نے دیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

'' سید شریف العلماء اپنے خط مورخہ ۱۶ ذی الحجہ ۱۲۸۷ھ ۲۱ مارچ ۱۸۷۱ء میں لکھتے ہیں کہ حیدرآباد میں ایک دن میر انیسؔ نے میر تقی میرؔ کے یہ دو شعر پڑھے ۔

تیری گلی میں ہم نہ چلیں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندے کا کیا چلے

(۱) یہ شعر میرؔ کا نہیں درد کا ہے ۔ ادیب انیسیات ۱۶۴)

تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو

رونا ہے کچھ ہنسی نہیں ہے

اس موقع پر شریف العلماء کو سہو ہوا ہے پہلا شعر میر تقی میر کا نہیں بلکہ خواجہ میر درد کا ہے ۔

اس طرح کا ایک اور واقعہ میر انیس کے ایک معتقد مولوی میر حامد علی نے میر انیس کے سامنے یہ شعر پڑھا ۔

روشن ہے اس طرح دل ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

میر صاحب لیٹے تھے یہ سن کر اٹھ بیٹھے ایک اف کی اور فرمایا کہ اب میں بڑھاپے میں ایسے شعروں کی تاب نہیں لا سکتا اس سن میں ایسے تیر نہیں کھا سکتا پھر میر صاحب نے اس شعر کے سلسلہ میں فرمایا کہ پرانے زمانے میں جب کسی بستی پر شاہی عتاب نازل ہوتا تھا تو وہ بستی ویران کردی جاتی تھی اور اس میں کسی نمایاں مقام پر ایک چراغ جلا دیا جاتا تھا ۔'' (انیسیات ص ۱۶۴ ، ۶۵ سید مسعود حسن رضوی ادیب اترپردیش اردو اکادمی لکھنو ۱۹۸۱)

سید علی حیدر نظم طباطبائی شرح دیوان غالبؔ میں رقم طراز ہیں ۔

'' میر انیسؔ کے سامنے ایک صاحب نے یہ مصرعہ پڑھا ۔

چہچہے بلبل کی زباں سوکھ گئی

میر صاحب نے یہ مصرع لگایا

عرق گل ہے مناسب اسے دینا صیاد

اس کا چرچا لکھنو میں ہوا ۔ لوگوں نے طبع آزمائی کی ۔

(شرح دیوان غالب ۱۸۵ سید علی نظم حیدر طباطبائی ۔)

غالبؔ کے نزدیک مرثیہ گوئی میں میر انیسؔ اور دبیر جیسا کوئی پیدا نہ ہوا تھا نہ ہوگا ۔ کتنی دور اندیشی تھی غالبؔ کے اندر ۔ یہ بات اس دور میں خوب سمجھی اور پرکھی جاتی ہے غالبؔ چونکہ میر انیس سے پانچ سال بڑے تھے ۔ پھر انھوں

نے اس طرح کا اعتراف کیا ہے۔

"اردو زبان نے انیسؔ و دبیر جیسے مرثیہ گو پیدا نہیں کئے۔ ایسے مرثیہ گو نہ ہوئے ہیں نہ پیدا ہوں گے۔ انیسؔ کا مرتبہ نہایت بلند ہے۔" (یادگار غالبؔ اقوات انیس)

"میر انیسؔ کے مقابلہ میں کسی اور کا مرثیہ کہنا میر انیسؔ نہیں خود مرثیہ کا منہ چڑھاتا ہے۔ آج لکھنؤ اور دلی میں میر انیسؔ کی مرثیہ گوئی کو معجزہ کلام مانا جاتا ہے۔
(حیات انیسؔ امجد اشہری)

میر انیسؔ اور غالبؔ ایک دوسرے کے کلام سے خوب واقف تھے اور ایک دوسرے کے دلدادہ تھے میر انیسؔ عمر میں غالبؔ سے پانچ برس چھوٹے تھے اور ان کا انتقال غالب سے پانچ سال بعد ہوا۔ غالبؔ کے انتقال پر میر انیس کی ایک رباعی۔

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے
مرحوم ہوئے جوار رحمت میں گئے
مداح علی کا مقام اعلیٰ ہے
غالب اسد اللہ کی خدمت میں گئے

افضل حسین ثابت مصنف حیات دبیر نے اپنے خط بنام حامد علی بیرسٹر مورخہ ۱۶ راپریل ۱۹۱۲ میں میر انیس کا یہ مطلع نقل کیا ہے۔

نہ دو کا ہم کو پھولوں نے چلے خالی ہی گلشن سے
گلوں سے خار ہی بہتر کہ لپٹے آکے دامن سے
(یادگار حامد حسن ۱۸۹۴ افضل حسین ثابت)

یہ چند اشعار بھی بقول سید مسعود حسن رضوی میر انیسؔ سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

دل لے لیا ہے یار نے مٹھی میں بند ہے
کھلتا نہیں پسند ہے یا ناپسند ہے
جب مسیحا دشمن جاں ہو تو ہو کیوں کر علاج
کون رہبر ہو سکے جب خضر بہکانے لگے

دکھ کے منہ سو گئے ان آتشیں رخساروں پر
دل کو تھا چین تو نیند آ گئی انگاروں پر

مبصرین کا خیال ہے کہ شیکسپیئر کے زمانے میں وہ سہولتیں مہیا نہیں تھیں جو چار سو سال بعد برناڈ شا کے زمانہ میں عام تھیں اس لیے شیکسپیئر کے یہاں منظر کشی اس تفصیل کے ساتھ نظر نہیں آتی جو تفصیل برناڈ شاہ کے یہاں موجود ہے اس کے برعکس انیس کی منظر کشی برناڈ شاہ سے بڑھ کر ہے۔ تینوں کے یہاں کردار خود بولتے نظر آتے ہیں۔ مصنف بولتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

خواجہ حیدر علی آتشؔ کو اخلاقی شاعری کا بادشاہ کہا گیا ہے وہ ایسی سچائیوں کا آئینہ بنتے ہیں کہ سننے والوں نے انھیں حرز جاں بنایا ہے۔ آتشؔ جب بھی کسی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہیں تو محض سرسری طور پر نہیں بلکہ حقیقت بیانی سے کرتے ہیں جیسا کہ انھوں نے میر انیس کے بارے میں کہا۔

"کون بیوقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو واللہ باللہ تم شاعر گر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمہارے سر کے لیے موزوں بنایا گیا ہے خدا مبارک کرے بھئی اس میدان میں کوئی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انیسؔ کے مرثیہ پر سیکڑوں غزلوں کے دیوان صدقے کئے جا سکتے ہیں۔"
(اساتذہ کے تاثرات۔ ظفر جعفری)

میر انیس کا مقام مندرجہ بالا تمام افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نگاروں سے برتر ہے۔ اگر شاہیر ادب انیسؔ کا موازنہ فردوسی ہومر یا شیکسپیئر سے نہ کرتے تو ابوالکلام آزاد یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"دنیائے ادب کو اردو ادب کی جانب سے میر انیسؔ کے مرثیے اور مرزا غالبؔ کی غزلیں تحفہ تصوّر کی جائیں۔ ادبیات اردو اور اردو زبان کو قعر گمنامی سے نکال کر مراثی انیسؔ نے بین الاقوامی

سطح پر پہنچا دیا۔“

شمس العلماء امداد امام اثر ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اردو تنقید کی زبوں حالی کا احساس دلایا ان کی تنقیدی تحریریں اردو میں انقلابی نوعیت پیدا کی ہیں۔ انھوں نے روایتی ادب سے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔ اثر اخلاقیاتی شاعری میں بہترین شاعری تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں شاعری کو اخلاق آموزی کا ایک بہترین ذریعہ ہونا چاہئے لیکن وہیں جب میر انیس کی شاعری کی بات آتی ہے تو امداد اثر کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

”شعرائے نامی یعنی ہومر اور ورجل اور فردوسی میں ابوالشعراء ہومر ہی ہے جس کے ساتھ انیس کا موازنہ صورت رکھتا ہے ورنہ ورجل جو ہومر کا تتبع ہے انیس کا ہرگز ہم پایہ قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ان کی ہم پائگی کا استحقاق فردوسی کو حاصل ہے انیس کو فردوسی ہند کہنا انیس کی ایک بڑی ناقدر شناسی ہے۔ راقم کی دانست میں انیس کی کریکٹر نگاری ہومر کی کریکٹر نگاری سے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بلا شبہ و شک میر انیس وہ الہامی شاعر ہیں کہ تائید غیبی کے بغیر انیس کا کمال کوئی بنی آدم پیدا نہیں کر سکتا۔ انیس کا موید من اللہ ہونا ایک امر یقینی ہے۔“

اگر ہم غور و خوض کریں تو معلوم ہوگا کہ انیس کی شاعری کے دو اہم عناصر یہ ہیں کہ انھوں نے مرثیے کو مقامی رنگ میں رنگ دیا جس کی وجہ سے مرثیہ فن کے اظہار کا ذریعہ بنا اور صرف ایک مسلک کا نمائندہ بن کر محدود نہیں رہ گیا۔ دوسرا عنصر بھی شاید اسی کی توسیع ہے اور وہ یہ ہے کہ اگرچہ واقعہ کربلا ایک مخصوص دور میں پیش آیا مگر انیس کی شاعری نے اس واقعہ کے تمام افراد کو زمان و مکان کی قیود سے آزاد کر دیا۔ غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے اکبر الہ آبادی کہتے ہیں۔

”انیس کے کلام پر غور کرنا ذوق فہمی، نکتہ سنجی اور زبان شناسی کا فائدہ دیتا ہے۔“

انیس سے پہلے مرثیہ صرف مذہبی و اعتقادی صنف نظم سمجھا جاتا تھا۔ اس میں کوئی نمایاں ادبی حیثیت پیدا نہیں ہوئی تھی یہ فخر انیس کا حصہ ہے کہ اردو زبان میں ایسے نئے اور پر مغز باب کا ایسی قدرت اور حسن کمال سے اضافہ کیا مرثیے کی پیکری حیثیت سے جو قوت و اثر لطافت و تازگی سلاست و روانی انیس نے پیدا کر دی وہ اب تک متقدموں سے ممکن نہ ہوئی تھی۔ انیس کے اوپر خداوند کریم کا خاص کرم تھا۔ ان کے اوپر الہام ہوتا تھا جب شعر کہتے تھے یا پڑھتے تھے تو گویا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی ان سے کہہ رہا ہو کہ اے انیس اب یہ اس طرح کا شعر کہو اب اس طرح کے شعر کہو۔ انیس کو الہامی شاعر مانتے ہوئے ڈپٹی نظیر احمد کہتے ہیں۔

”حق تعالیٰ نے ایک اردو شاعر انیس کو کیسی قدرت عطا فرمائی اور اس کے قلب پاک کو کیا نور بخشا ہے کہ وہ خاصان خدا کے ارواح پاک کی باتوں کو اس پاک و صاف طریقے سے نظم کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے بلکہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہی ارواح پاک بول رہی ہیں اور یہ بات بغیر الہام کے ناممکن ہے اس لیے میری رائے میں اور شعراء دنیا میں آکر اپنے کسب علوم سے نامور ہوتے گئے لیکن میر انیس وہیں سے شاعر بنا کر بھیجے گئے تھے اور مدارج اعلا پر فائز ہوئے۔

بہر عنوان مناظر کی نقاشی، میدان جنگ کی مصوری محبت کے علاوہ جرأت، ایثار، شرافت انصاف حق پسندی، حق گوئی جیسے بلند انسانی جذبوں کی مرقع کشی کے باب میں انیس کے مرثیے ایلیڈ اینیڈ، رامائن، مہابھارت اور شاہنامہ

ترتیب وپیشکش

علی اسعد دانش

9839181230

نوبت رائے نظر

میر انیس صاحب مغفور اعلی اللہ مقامہٗ

"زیر نظر مضمون لکھنؤ کے ایک صاحب نظر شاعر ومصور وصحافی کئی رسالوں کے مرتب اور نہ جانے کن کن خوبیوں کے مالک تھے۔ افسوس کہ اس شاعر لکھنؤ کو عام طور سے لوگ نہیں جانتے۔ یہ اٹھارہویں صدی میں لکھنؤ میں موجود، مشاعروں اور مجلسوں کی زینت تھے، ظاہر ہے انھوں نے اس لٹے ہوئے لکھنؤ کو دیکھا تھا جسے انگریزوں نے تباہ کردیا تھا جسے انگریزوں نے تباہ کردیا تھا اور جان عالم واجد علی شاہ اختر خانہ قید کردئے گئے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ نظر کی اس کاوش کو بچایا جائے ہوسکتا ہے میر انیس پر کام کرنے والوں کو اس سے فائدہ پہونچے... یہ فروری ۱۹۰۸ء میں منشی دیانرائن کے رسالے 'زمانہ'، کانپور میں ۱۰۸ سال پہلے شائع ہوا تھا۔"

دانش بقلم خود

ہمارے نامور شعراء میں میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، شیخ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش اور مرزا اسداللہ خاں غالب، اپنے اپنے رنگ کے موجد اور فرد کامل تھے لیکن ان سب کملاء فن کی خوبیاں جس ذات واحد میں جمع ہوگئی تھیں وہ خدائے سخن انیس تھے۔ جنھوں نے مرثیہ کی ایک صنف میں تمام اصناف سخن کا جوہر کھینچ لیا تھا....

شاعری کی اس ضعیف صنف کی نسبت صدیوں سے یہ خیال آتا تھا کہ وہ زمین شور سے بدتر ہے لیکن نازک خیال شعرا اپنی فکر کی تخم ریزی سے اسے ہمیشہ محروم رکھتے تھے۔ لیکن میر انیس نے ثابت کردیا کہ ذہن رسا اور کمال فن وہ چیز ہے کہ ناقص سی ناقص زمین کو بھی آسمان سے بلند دکھا سکتا ہے۔ ان کی شاعری شاعری نہ تھی بلکہ ایک معجزہ تھا اور وہ بھی ایک مذہبی حد میں محدود جس میں بظاہر توسن خیال کو طرارے بھرنے کی وسعت نہ تھی اور تقدس واحترام کا تازیانہ حداد سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا تاہم میر انیس کا کلام دیکھ کر نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے اشہب فکر نے یہ مشکلات محسوس بھی کئے تھے یا نہیں جس مضمون کو لیا ایک دریا بہاتے چلے گئے اور دیکھنے والوں نے دیکھا تو اصول فن سے بال بھر ادھر ادھر نہیں۔ مضمون کی تازگی، جدت خیال، الفاظ کی برجستگی، تسلسل بیان اور زور نظم کے ساتھ زبان کی گھلاوٹ ایک ایسا لطف رکھتی ہے جو بیان سے باہر ہے۔

ان کی شاعری میں ایک اور صفت ہے اور وہ نہایت حیرت انگیز ہے۔ گہری نظر سے دیکھنے پر وہ بالکل وہبی معلوم ہوتی ہے لیکن غور وتعمق سے دیکھنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ہر مصرع مہینوں کی محنت کا نتیجہ ہے جس میں ہر لفظ

نگینے کی طرح جڑا ہے اور کوئی اعلا درجے کا صنّاع اپنی صنعت کے لیے اس سے زیادہ محنت نہیں کرسکتا۔ یہ کمال فن کی آخری معراج ہو جہاں وہبب اور کتب میں امتیاز نہیں ہوتا اور دقیقہ رس نگاہیں بھی محو حیرت ہو جاتی ہیں۔ میرانیسؔ کے کلام کی روانی دریا کی روانی نہیں ہے جس میں سیپ، گھونگے خس و خاشاک سب ہی بہتے نظر آتے ہیں بلکہ وہ اس نہر کی روانی سے مشابہ ہے جو بلور سے بنائی گئی ہو جس میں صاف کیا ہوا پانی آتا ہو اور نہایت خوش رنگ مچھلیاں تیرتی ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ التزامات کسب کمال سے تعلق رکھتے ہیں جس کے لیے میرانیسؔ نے نہایت ہی موزوں طبیعت پائی تھی۔ مگر فکر شعر کے وقت جو خیال ان کے دماغ میں آتا تھا اسے ان کی طبیعت خراد پر چڑھاتی تھی اور جب تک وہ پورے طور پر سڈول نہ ہو جاتا انھیں اطمینان نہ ہوتا تھا نہ اسے نظم کرتے تھے ۔ یہ عادت انھیں ابتدا ہی سے پڑی تھی بلکہ ان کی طبیعت کا خاصہ یوں ہی واقع ہوا تھا۔ ابتدائی مشق میں اکثر مصرعوں کی ادھیڑبن میں کئی کئی روز گذر جاتے تھے لیکن جب پوری مشق ہو جاتی تو ادنی فکر میں بھی یہ مشکل حل ہو جاتی تھی۔

ان کی شاعری کے تمام محاسن بیان کرنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے جس کی اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ وہ اپنے کلام میں لفظ نمی کو کمی اور بہن کو بھینا بے تکلفی سے نظم کرتے ہیں کہ ان الفاظ کی اصل ثقالت محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح مرثیے کی بہت سی خصوصیات ان کا خاندانی حصہ ہیں جو ان کے بزرگوں کے وقت سے سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں اور جن پر انھوں معتدبہ اضافہ کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ میرانیسؔ نے شاعری کی اس صنف کو جو بظاہر بالکل ضعیف معلوم ہوتی ہے ایک مستقل علم بنادیا اور اسے اس حد تک ترقی دی کہ اب اس پر کوئی اضافہ ناممکن نظر آتا ہے ۔

اس دعوے کے لیے غالباً یہ دلیل کافی ہوگی کہ ان کے بعد جتنے نامی مرثیہ گو ہوئے ان کے کلام کا سب سے اچھا حصہ زیادہ سے زیادہ میرانیسؔ کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ ان کے کلام پر فوق لے گیا ہو اور جس طرح ان کی موجودگی میں لوگ ضمیرؔ اور خلیق ایسے نامی گرامی مرثیہ گویوں کو بھول گئے تھے۔ کوئی میرانیسؔ کو آج زمانہ گزرنے کے بعد بھی فراموش نہ کرسکا۔ ہم نے ان کے فرزند رشید جناب نفیسؔ مرحوم کو ایک مدت تک سنا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ جس نے میرانیسؔ کو نہ سنا ہو وہ انھیں سن لے اور جس نے انھیں نہ دیکھا ہو انھیں دیکھ لے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے نامور باپ کا پورا مثنیٰ تھے لیکن بس اسی قدر۔ یہ نہیں کہ ان کے کمالات میں کوئی اضافہ کر سکے ہوں۔ حالانکہ میرانیسؔ وہ شخص تھے جنھوں نے اپنے والد میر خلیق اور اپنے دادا میر حسن کے کمالات کو بھی اپنے کمالات کے سائے میں لے لیا تھا اور یہ ان کی انتہائی معراج تھی۔ والمیک شیکسپیئر ہومر پر ڈرامہ اور مرثیہ خوانی کا فن نیز مرثیہ گوئی کا خاتمہ انیسؔ پر ہو گیا....

مرزا دبیرؔ جنھوں نے اس فن کو حاصل کیا تھا... کہتے کو وہ میر ضمیرؔ کے شاگرد تھے جو مرثیہ میں ایک طرز خاص کے موجد ہیں جو اس وقت سے لے کر آج تک مقبول عام ہے۔ یعنی مرثیے کا چہرہ باندھنا، سراپا لکھنا، تلوار اور گھوڑے کی تعریف، میدان جنگ کے سین اور جزوی واقعات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا۔ غرض کہ مرثیے کے تمام موجودہ خصوصیات انھیں کی ایجاد ہیں۔ لیکن شاگرد کو استاد سے اکتساب فن کا پورا موقع نہیں ملا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد ایسی ان بن ہو گئی کہ عمر بھر صفائی نہ ہوئی۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو ایک استاد ایک معمولی شاگرد کے ساتھ اتنی محنت نہیں کرسکتا جتنی باپ اپنے حقیقی بیٹے کے ساتھ۔ میرانیسؔ اور مرزا دبیرؔ میں اتنا ہی فرق ہے۔ اگر میر صاحب کی طرح وہ بھی کسی باکمال باپ کے بیٹے ہوتے اور اکتساب فن کا بھی اسی قدر موقع ملتا تو ناممکن تھا کہ اصول فن کی وہ نزاکتیں جن پر میرانیسؔ کی شہرت کی بنیاد قائم ہے مرزا دبیرؔ کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود نہ ہوتیں تاہم یہ نزاکتیں جس حد تک ان کے کلام میں موجود ہیں از بس غنیمت ہیں اور یہی ان کی شہرت کا راز ہے کیونکہ وہ بالکل خداداد ہیں۔ جو بغیر بتائے ہوئے حاصل ہوئی ہیں۔ میرانیسؔ کے متعلق ہم لکھ آئے ہیں کہ ان کے کلام کی روانی دریا کی روانی نہ تھی جس میں سیپ، گھونگے خس و خاشاک سب ہی

بیٹھتے نظر آتے ہوں حالانکہ ان کے کلام کی لطافت اکثر یہ دھوکہ دیتی ہے کہ وہ تکلفات نظم سے مبرا ہے اور روانی طبع کا ایک اعلا نمونہ ہے لیکن در حقیقت وہ تمام تکلفاتِ شعری سے آراستہ ہے اور اس قسم کی مصوری ہے جس کے خط و خال برسوں کی محنت میں جانچ جانچ کر کئے گئے ہوں بخلاف اس کے مرزا دبیر کے کلام کی روانی ان کی طبیعت کا زور انھیں فلک الافلاک تک پہنچاتا ہے اور اس آندھی میں سارا جہاں اڑتا نظر آتا ہے۔

میر انیسؔ اور مرزا دبیر کی شاعری میں اصلی تفاوت یہی ہے کہ اول الذکر نے طبع خداداد کے ساتھ نظر انتخاب بھی پائی تھی اور باقاعدہ تعلیم و تربیت نے انھیں عیوب و محاسن شعری سے آگاہ کر دیا تھا۔ مرزا دبیر صاحب میں یہ کمی خلقی طور پر پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے کلام کے عیب و صواب پر نظر نہیں رکھتے۔ اس کی بڑی وجہ تو وہی نقص تعلیم ہے تاہم ان کی خلقی کمزوری کو بھی ایک حد تک دخل ہے کہ اپنے کلام کے عیب و صواب آپ نہیں سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اعلیٰ درجہ کے شاعروں میں بڑا وصف یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنا کلام آپ پرکھنے کی قابلیت رکھتے ہیں اور کھوٹے کو کھرے سے علاحدہ کرتے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خالص جواہرات کا ڈھیر رہ جاتا ہے اور جوہریان فن کو محو حیرت کر دیتا ہے میر انیسؔ میں سب سے اعلا وصف یہی ہے حالانکہ اس کے ساتھ وہ اور بھی بہت اوصاف رکھتے تھے جو ان کی اعلا تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھے بہر حال اس ایک نقص کے علاوہ مرزا دبیر کے کلام میں بھی وہی خوبیاں پائی جاتی ہیں جو میر انیسؔ کے کلام میں فرق اتنا ہی ہے کہ ایک کے یہاں تمام خوبیاں ہی خوبیاں موجود ہیں دوسرے میں ان خوبیوں کے ساتھ چند نقائص بھی شامل ہیں لیکن صرف اتنی سی بات پر یہ کہنا کہ مرزا دبیر کو میر انیسؔ سے کوئی مناسبت ہی نہیں در حقیقت انصاف کا خون کرنا ہے۔ میر انیسؔ کی زبان وہی ہے جو ان کے والد میر خلیق کی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ ؏

حقا کہ یہ خلیقؔ کی ہے سر بسر زبان

یہیں سے یہ مسئلہ بھی حل ہوتا ہے کہ میر خلیق کس پایہ کے شاعر تھے اور ان کی زبان کیا مرتبہ رکھتی تھی خصوصاً مرثیہ گوئی کے میدان میں انھیں کون سی غیر معمولی عظمت حاصل تھی حالانکہ میر ضمیر کے ہمعصر تھے جو مرثیہ میں طرز جدید کے موجد ہیں اور انھوں نے بذاتِ خود ارکان مرثیہ میں کوئی اضافہ نہیں کیا لیکن ان کی طبیعت سوز و گداز کے رنگ میں ایک شمع تھی جو رونے رلانے میں اپنا مثل نہیں رکھتی تھی یہی مرثیہ کی علت غائی ہے۔ اس لیے فن مرثیہ کا اعلا مقصد ان کا حصہ تھا اس پر کسب کمال نے ان کے کلام میں وہ تمام خصوصیات بھی پیدا کر دی تھیں جن پر ان کے حریف میر ضمیر کو ناز تھا۔ بہر کیف وہ ایسے شاعر تھے جنھوں نے انیسؔ کو میر انیسؔ بلکہ خدائے سخن بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میر انیسؔ کو اپنے باکمال والد پر اس قدر ناز تھا کہ اپنی زبان کو ان کی زبان سے نسبت دینے میں فخر سمجھتے تھے حالانکہ خود انکی زبان وہ زبان ہے جس کی سارا ہندوستان آرزو رکھتا ہو۔

میر انیسؔ کے ابتدائی حالات بالکل نامعلوم ہیں۔ ان کے خاندان میں بھی اب کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جس نے یہ حالات بچشم خود دیکھے ہوں صرف تذکرہ "آبِ حیات" سے اتنا پتہ لگتا ہے کہ اوائل عمر میں ان کی طبیعت ان دنوں اپنے دادا میر حسنؔ کی طرح عشقیہ شاعری کی طرف مائل ہوئی تھی اور بعض مشاعروں میں شریک بھی ہوئے تھے لیکن بزرگ باپ کی اتنی نصیحت پر کہ "اس شاعری پر زور طبع صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہو" اور پھر عمر بھر غزل کی طرف نظر بھی نہیں اٹھائی بلکہ غزل کا کہنا اور سننا دونوں کو ترک کر دیا یہ میر انیسؔ کی سعادت مندی تھی کہ وہ مرثیہ خوانی و مرثیہ گوئی کو عطیہ مولا سمجھتے تھے۔

صغر سنی کے زمانے میں وہ اپنے والد کے ساتھ مجلسوں میں جاتے تھے اور ان کی پیش خوانی کرتے تھے۔ اس طرح نوجوانی کے عالم تک وہ ایک اچھے مرثیہ خواں ہو گئے اور ضعیف باپ کو سبکدوش کرنے کے لیے ان کے فرائض خود انجام دینے لگے تھے اب تک ان کا وطن فیض آباد تھا (جہاں ان کے مورث اعلیٰ میر ضاحک دہلی سے آکر سکونت پذیر ہوئے تھے) اور لکھنؤ میں صرف مجلسیں پڑھنے آیا کرتے تھے۔ گو فیض آباد کی بہ نسبت لکھنؤ ہی میں زیادہ قیام رہتا کیونکہ یہاں مجلس کے چرچے بے انتہا بڑھے ہوئے تھے

لیکن یہ قیام مسافرانہ تھا لکھنؤ میں مستقل سکونت کی جو وجہ ہوئی اس سے ان کے اخلاق و عادات پر ایک عمدہ روشنی پڑتی ہے فیض آباد میں مرزا محمد تقی خاں ترقی ایک عالی خاندان اور دولت مند رئیس تھے جنھوں نے میر حسن اور میر خلیق پر مربیانہ احسانات کئے تھے بلکہ یہی ایک سرکار تھی جس کا توسل اس خاندان کو فیض آباد کی سکونت پر مجبور کئے ہوئے تھا۔ اگلے وقت کی وضعداریاں اب خواب و خیال ہیں وہ لوگ کیسے وضعدار تھے کہ باپ کی وضع کو بیٹے اور پوتے تک نباہتے تھے حالانکہ میر خلیق اور میر انیس کے لیے لکھنؤ ایسا مقام تھا جہاں بادشاہ سے وزیر تک اور امیر سے غریب تک ہر شخص قدردانی کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا لیکن وہ اپنی پرانی سرکار سے قطع تعلق اپنی وضع کے خلاف سمجھتے تھے۔ ادھر نواب نے انتقال کیا (وہ ان دنوں لکھنؤ میں تھے اور رفور باڑی سعادت گنج میں اپنی قائم کردہ ہٹر واڑہ میں دفن ہوئے میر خلیق نے تاریخ کہی جو ان کی قبر پر کندہ ہوئی) تو ان کے بیٹے مرزا حیدر فیروز جنگ باپ کی وضع کو نباہتے رہے۔ مرزا حیدر بڑے خوش گو شاعر تھے اور شعراء کی قدردانی میں اپنے والد سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے متوسلین میں میر انیس کے علاوہ مرزا فتح الدولہ برق بھی پائے جاتے ہیں۔ مرزا حیدر صاحب نے ان کی اکثر مصرعے لگائے ہیں۔ یہ خمسیات برق کے دیوان میں موجود ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام انھیں خمسیات کی بدولت زندہ ہے۔

ایک مرتبہ ان کے فرزند نے میر انیس سے ہجو کی فرمائش کی شہزادے صاحب کا دل توڑنا بھی ممکن نہ تھا خصوصاً ان کی خلقی متانت اس طرز کی شاعری کی متحمل نہ تھی۔ ان کے انکار بھی وضع کے خلاف تھا۔ ان کا دل رکھنے کے لیے انھیں کے امام باڑے میں جب یہ مرثیہ پڑھا۔

جب لشکر خدا کا علم سرنگوں ہوا

تو اس کے درمیانی حصہ میں کچھ ایسے اشعار بھی پڑھے جو ان کے مزاج کا خاصہ نہ تھے جیسا کہ بزرگوں سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ امجد علی شاہ کے زمانے میں باقاعدہ اپنے وطن قدیم کو خیرباد کہہ کر چلے آئے ایک عرصہ کے بعد مرزا حیدر کا خاندان بھی لکھنؤ آ گیا۔ ان کے بیٹے مرزا والا جاہ مرحوم بھی ایک نامور شاعر تھے ان کا دیوان مطبع نولکشور سے چھپ گیا تھا اور غالباً ان کے خاندان میں اب تک موجود ہوگا۔ ہم نے بیس۲۰ برس ادھر دیکھا تھا۔ ایک غزل کے دو شعر اب تک یاد ہیں۔

خزاں کے ہاتھ سے گلشن میں خار تک نہ رہا
بہار کیسی نشان بہار تک نہ رہا
حساب روز جزا سے تجھے فراغت ہے
کئے وہ جرم کہ جن کا شمار تک نہ رہا

مرزا والا جاہ اکثر میر انیس کو یاد کرتے تھے بڑے میر صاحب نے ان کے یہاں بعض مجلسیں بھی پڑھی ہیں (جیسا کہ میں نے مندرجہ بالا سطور میں لکھا بھی ہے) وہ ان کو اپنا آقا اور ولی نعمت سمجھتے تھے جب ان کے یہاں جاتے اور نہایت فخر سے کہتے کہ حضور! غلام بھی حاضر ہے اور غلام زادے بھی ... حالانکہ میر انیس میں خودداری کا عنصر بھی ان کے کلام کی مناسبت سے موجود تھا اور بادشاہ وقت کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن اس خاندان کے گذشتہ احسانات کو وہ عمر بھر بھولنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی متانت و سنجیدگی کا یہ قدرتی نتیجہ تھا کہ وہ نہایت کم سخن اور دیر آشنا تھے۔ انھیں وجوہ پر بعض لوگ انھیں متکبر خیال کرتے تھے مگر جو بات کہتے وہ موتیوں میں تولنے کے قابل ہوتی تھی۔ ان کی طبیعت کو تمسخر سے ایک سخت نفرت تھی لیکن بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی جو اگلے شرفاء کے علم مجلس میں داخل تھی اس میں خود بھی ایک حد تک مشاق تھے۔ بہرحال ان کے کیرکٹر شریفانہ جذبات کی انتہائی حد تک پہونچے ہوئے تھے اور علم مجلس کے آداب ان کی خانگی زندگی میں بھی تمام تر دخل رکھتے تھے۔ وہ بد مزاج نہ تھے وضع کا خیال رکھتے اور اپنے کو لیے دئے رہتے تھے۔ اگر کسی سے کوئی ادنیٰ امر بھی خلاف مزاج ہوتا تو وہ خواہ کتنا بڑا رئیس کیوں نہ ہو آپ اس پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیتے تھے۔ ان کی نازک مزاجی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

ان کی مجلسوں میں جو شرفاء و عمائدین لکھنؤ تشریف لاتے تھے وہ اس بات کے متمنی رہتے تھے کہ وہ انھیں ہمہ تن گوش ہو کر سنیں مجلس میں بیٹھ کر آپس کی گفتگو کو وہ آداب مجلس کے خلاف سمجھتے تھے!

منبر پر ان کا رعب ایک شہنشاہ وقت سے کسی طرح کم نہ تھا۔ جب پڑھتے تو ہر بند کے اول چار مصرعوں پر ساری مجلس میں سناٹا رہتا۔ ادھر بیت کا شعر پڑھا ادھر دس ہزار آوازوں کا مجموعی شور آسمان تک پہنچ جاتا اور واہ واہ کے نعرے کئی منٹ گونجتے رہتے تھے۔ ان کے طرفدار عام اصطلاح میں انیسئے کہلاتے تھے ان کے کلام کی خوبیوں کی تفصیل بھی کرتے جاتے تھے حالانکہ وہ کسی تصریح کی محتاج نہ تھیں۔ سامعین میں سخن سنج اور نکتہ شناس لوگوں کی زیادہ کثرت ہوتی تھی خصوصاً مرزا دبیر کے مداح جو دبیرئے کہلاتے تھے ہر بند کو انتہائی غور کے ساتھ سنتے تھے جس سے محض نکتہ چینی مقصود تھی لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ سر مجلس کچھ کہہ سکے البتہ مجلس کے بعد سارے شہر میں چہ می گوئیاں ہوتیں اور دونوں پارٹیاں اپنا سارا زور ختم کر دیتی تھیں البتہ خواجہ آتش کبھی کبھی سر منبر ٹوک دیتے تھے مگر وہ دبیرئے تھے نہ ان کا ٹوکنا معمولی ٹوکنا تھا۔

میر انیس نے پہلی مجلس مصطفےٰ خاں نامے ایک بزرگ کے یہاں تحسین گنج میں پڑھی تھی۔ لکھنؤ کے مغربی حصہ کو کسی وقت میں وہی عظمت حاصل تھی جو آج ویسٹ لندن کو ہے لیکن غدر کے بعد اب یہ محلہ بالکل ویران ہو گیا اور اس مکان کی جگہ پر بھی ایک ٹیلہ رہ گیا ہے جہاں سے میر انیس کی شہرت کا آفتاب اول اول شروع ہوا تھا۔ اس مجلس میں جو مرثیہ انھوں نے پڑھا وہ ٹھیک طور پر نہیں بتایا جا سکتا لیکن اس کی شہرت دفعتہً تمام شہر میں پھیل گئی حتیٰ کہ دوسری ہی مجلس میں شیخ ناسخ مشتاقانہ آئے اور ان کا آنا کوئی معمولی آنا نہ تھا خواجہ آتش اس مجلس میں نہیں آئے لیکن ان کا یہ ریمارک کہ "میر خلیق کا یہ ہونہار فرزند آفتیں ڈھا رہا ہے ایک نومشق شاعر کے لیے استادی کی سیکڑوں سندوں سے کم نہ تھا۔ اسی وقت سے ان کی شہرت کے ساتھ ان کا شاعرانہ اعتبار سارے لکھنؤ میں قائم ہو گیا۔

میر صاحب کے اعتبار شاعری کے متعلق ایک روایت زبان زد خاص و عام ہے اور یہ اس زمانے کی نقل ہے جبکہ ان کا آفتاب شہرت نصف النہار تک پہنچ گیا تھا۔ شہر میں مجلسیں قریب قریب روز مرّہ ہوتی تھیں اور عزاداری امام کے چرچے سال بھر برابر قائم رہتے تھے ہر شخص ادنیٰ اور اعلیٰ اس نیک کام میں اپنی گاڑھی کمائی خرچ کرنا نجات دارین کا ذریعہ سمجھتا تھا حتیٰ کہ شرفائے شہر کا ہر گھر ایک امام باڑہ تھا جس میں مستورات ایک وقت معینہ پر ماتم کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتی تھیں۔ مرد سو کام چھوڑ کر مجالس میں شریک ہوتے اور انیس و دبیر کے کلام کی نزاکتیں خواہ سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر سننے ضرور جاتے تھے قصہ مختصر ایک مجلس میں میر انیس پڑھ رہے تھے سامعین میں ایک نابینا صاحب بھی تشریف لائے۔ مرثیے کا وہ حصہ جو اس وقت پڑھا جا رہا تھا زیادہ دلچسپ نہ تھا۔ نابینا صاحب نے نہایت آزادی سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور قریب تھا کہ ان کی آواز میر صاحب کی سمع مبارک تک پہنچ جائے۔ اتنے میں ایک صاحب نے ان کا زانو دبا کر کہا "چپ! میر انیس صاحب پڑھ رہے ہیں"، نابینا صاحب فوراً کہنے لگے "میر صاحب پڑھ رہے ہیں تو سبحان اللہ!"، اور اس وقت سے سبحان اللہ کا تار لگا دیا۔ ان کے اعتبار شاعری کی یہ انتہا تھی کہ بہت سے غیر متعلق شخص بیرون جات میں جا کر اپنے کو میر صاحب کے خاندان کا بتاتے اور سیکڑوں روپیہ کما لاتے تھے۔ اب بھی عام مرثیہ خواں اپنے کو اس گھرانے کا شاگرد بتانا فخر سمجھتے ہیں۔

کمال شاعری کے ساتھ ان کی مرثیہ خوانی بھی لاجواب تھی۔ منبر پر بیٹھتے تو ایک گلدستہ سا معلوم ہوتے تھے۔ اور آواز بھی اس قدر زوردار تھی کہ دس ہزار کے مجمع کو ایک سی سنائی دیتی تھی۔ اس پر ہر مضمون کو ہاتھ اور آنکھ کے اشارے سے ایسے ادا کرتے تھے کہ اس کی مجسّم تصویر نظر آ جاتی تھی۔ جب بین کا بیان ہوتا تو وہاں ان کی آواز میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا تھا اور رقت کا سماں بندھ جاتا تھا۔ مردوں کے علاوہ پردہ نشین عورتیں دہاڑیں مار مار کر روتی تھیں گو وہ ان سے بہت دور ہوتیں اور صرف چلمنوں سے دیکھتی تھیں لیکن یہ صرف ان کے پڑھنے کی ہی تاثیر نہ تھی بلکہ ان کے مرثیوں کے یہ مقامات اب بھی اپنی تاثیر میں لاجواب ہیں اور سخت سے سخت دل کو بھی پگھلا دیتے ہیں... اس صورت میں جو لوگ ان کا کلام ان کی زبان سے سنتے ہوں گے ان کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔

میر صاحب کے خصائص میں استغنا ایک خاص مرتبہ رکھتی تھی۔

اور یہ ان کی طبیعت کا ایک خاص جوہر تھا۔ وہ اکثر روسائے عظام ہی کے یہاں پڑھتے تھے لیکن مرثیہ خوانی کا صلہ کچھ نہیں لیتے تھے ناچار نذر امام کے نام سے کچھ رقم پیش کی جاتی اور چوں کہ سیادت کے لحاظ سے ان کا فرض تھا کہ اسے قبول کریں لہٰذا انکار نہیں کر سکتے تھے تاہم یہ طریقہ بھی انھیں ناپسند تھا اور اگر مذہبی مجبوری نہ ہوتی تو اعلانیہ انکار کر دیتے۔ لوگ ان کا لحاظ بھی اس حد تک کرتے تھے کہ یہ رقمیں پوشیدہ طور سے گھر بھیج دیتے تھے سر مجلس اس کا ذکر تک ناممکن تھا۔ غربا کی مجلس وہ بہت خوشی سے پڑھتے اور اس کی خاص طور پر پابندی کرتے تھے بعض مجلسیں ایسی تھیں جن کی تاریخیں مختص تھیں خواہ وہ ماہوار ہوں یا سالانہ۔ مثلاً ہر مہینے کی پندرھویں یا محض محرّم کی ساتویں تاریخ۔ ان مختص تاریخوں میں میر انیسؔ کسی بڑے سے بڑے رئیس یا بادشاہ وقت کی درخواست بھی قبول نہیں کرتے تھے اور اسی غریب کی مجلس پڑھتے تھے جو سال بھر آس لگائے رہتا تھا۔ اسی استغناء کی بدولت وہ زیادہ دولت مند نہیں ہوئے ورنہ لکھنؤ میں ان کے ماننے والوں کی اس قدر کثرت تھی اور وہ سب اتنے بڑے دولت مند تھے کہ میر انیسؔ کا گھر دولت سے لبریز ہو جاتا۔ شیکسپیئر کے قدردان اس وقت پیدا ہوئے جب اس کے انتقال کو چار صدیاں گذر چکی تھیں اور میر انیسؔ ان کی زندگی ہی میں ان پر قربان تھے۔ حالانکہ شیکسپیئر اس قوم کا آفتاب تھا جو کسی کو انسان ہی نہیں سمجھتی۔

اہل لکھنؤ کے علاوہ روساء بیرون جات بھی ان کے حد درجہ قدردان تھے لیکن وہ کہیں باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے حالانکہ ان روساء کی طرف سے ان کے بلانے کے لیے بیحد کوششیں ہوتیں اور بڑی بڑی رقمیں پیش کئے جانے کے وعدے کئے جاتے تھے لیکن دولت کی انھیں پروا نہ تھی۔ رہی داد سخن اس کی طرف سے انھیں اہل بیرون جات سے بالکل مایوسی تھی اور کہتے تھے کہ ”ہمارے کلام اور ہماری زبان کے جوہر اہل لکھنؤ ہی خوب پرکھتے ہیں۔ باہر والے اسے کیا سمجھیں گے“ در حقیقت جس کلام میں بلاغت کی روح کھینچ گئی ہو اور جس زبان میں فصاحت کے دریا موجزن ہوں اس کی داد کوئی معمولی داد نہ تھی جس کی اہل بیرون سے امید کی جا سکتی تھی بہرکیف جب تک لکھنؤ آباد رہا میر صاحب نے شہر سے باہر شاید ہی قدم نکالا ہو لیکن ادھر یہ تباہ ہوا ادھر وہ قدردان بھی پیوند خاک ہو گئے۔ غدر ۱۸۵۷ کی تباہی لکھنؤ کے لیے ایک آندھی تھی جو شہر کی رونق کے ساتھ دولت و حشمت سب اڑا کر لے گئی اور غبار بیٹھا تو کف دست میدان کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاہم میر انیس صاحب کے استغنا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور وہ اب بھی کہیں جانا پسند نہیں کرتے تھے اتفاقاً ان کے حریف مرزا دبیر صاحب عظیم آباد گئے اور وہاں ان کی شیوہ بیانی کے جھنڈے گڑ گئے ایک شاعر کے لیے یہ نہایت نازک موقع ہے اور طبیعت کی لاگ اسے مجبور کرتی ہے کہ اپنے حریف کے مقابلے میں اپنے جوہر بھی دکھائے اسی بنا پر دوسرے سال میر انیسؔ بھی عظیم آباد گئے وہاں جانا تھا کہ ہر طرف سے ان کی طلب کے پیام ٹوٹ پڑے لیکن ہر جگہ یہ لاگ کہاں تھی جو کھینچ لے جاتی دس بارہ برس تک کہیں نہیں گئے۔ لیکن آخری عمر میں حیدرآباد کا سفر کرنا ہی پڑا اور یہ بھی ایک سخت مروت کی وجہ سے جس کی تصریح ”آب حیات“ میں موجود ہے۔

کمال شاعری کے ساتھ ان میں اخلاقی قدریں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں اگر ان کے سامنے کسی کا شعر پڑھا جاتا تو وہ اس کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے اور خوب داد دیتے تھے ایک موقع پر ایک ہندو شاعر کے سلام میں ایک لاجواب شعر نکل آیا۔

کہتی تھی بانو الٰہی کیجیو وارث کی خیر
آج کیوں سر سے ڈھلی جاتی ہے چادر بار بار

جس وقت میر صاحب نے یہ شعر سنا ہے تو کہنے لگے کہ میں اپنے سب دفتر دینے کو تیار ہوں۔ خوشامدی لوگوں نے بھی انصاف کا خون کرنا چاہا اور کہنے لگے کہ حضور کے سامنے اس ہندو کی کیا حقیقت ہے لیکن میر صاحب نے صاف کہہ دیا کہ شاعری کسی کا خاص حصہ نہیں ہے اور اس میں ہندو مسلمان کی تخصیص فضول ہے۔

میر و مرزا میں اگرچہ حریفانہ لاگ بے انتہا بڑھ گئی تھی لیکن یہ وہ لوگ تھے جو تہذیب و شائستگی کے پیکر تھے اور اہل تہران سے تہذیب سیکھنے آتے تھے لہٰذا دونوں میں کبھی ایسی بے لفظی نہیں ہوئی جو خلاف تہذیب ہو، خصوصًا مرزا دبیر میر انیس کا بدرجۂ اتم احترام کرتے تھے اور حاضر و غائب کبھی کوئی کلمہ زبان پر نہیں لائے جو میر صاحب کے خلاف شان ہو۔ شاعرانہ نوک جھونک میں بھی وہ اس کا سخت لحاظ کرتے تھے چنانچہ میر صاحب کے ان اشعار کے جواب میں جو کسی قدر سخت اور اشتعال انگیز ہیں مرزا صاحب نے نہایت نرم جواب دئے ہیں۔

کیا فاختہ بحثے گی بھلا بلبل سے
پہلے صاف اپنا روز مرّہ تو کر لے

تو سنجیوں نے مری اے انیس
ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

میں باعث نغمہ سنجئ بلبل ہوں
کھولے نہ کبھی منہ جو زباں بند کرو

منبر پہ گیا میں نئے مضموں لے کر
ان کے لیے گویا من و سلویٰ اترا

لگا رہا ہوں مضامین تو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

بعض مضامین متواردہ کی نسبت جو دونوں کے کلام میں کثرت سے موجود ہیں لوگوں کا خیال ہے کہ مرزا صاحب نے میر صاحب کے کلام سے سرقہ کئے ہیں لیکن یہ ایک سخت غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو مضمون ایک حریف پیدا کرتا تھا دوسرا حریف اسے اپنے طور پر نظم کر کے اپنی طباعی کے جوہر دکھانا چاہتا تھا اسے سرقہ سے کیا تعلق یہ عمل طرفین سے یکساں جاری تھا اور کسی کو کسی پر تقدیم و تاخیر نہ تھی۔ مضمون آفرینی میں دونوں یکساں قدرت رکھتے تھے کبھی مرزا صاحب نے کوئی نیا مضمون پیدا کیا کبھی میر صاحب نے اور دونوں ان مضامین کو اپنے اپنے رنگ و مذاق کے مطابق نظم کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

انیسی اور دبیری اگرچہ بطور خود سخت جھگڑے کیا کرتی تھیں لیکن مرزا دبیر اور میر انیس کے ذاتی تعلقات کو ان فضولیات سے چنداں تعلق نہ تھا۔ مرزا صاحب کو میر صاحب کا ادب اس درجہ ملحوظ رہتا تھا کہ راہ میں ان کی سواری آتی ہوئی دیکھ کر اپنی فنس سے اتر پڑتے اور مودب طریقے سے سلام کرتے تھے۔

ایک مرتبہ ان کے ایک شاگرد رشید میاں مشیر نے میر صاحب کی ہجو کہی۔ مرزا صاحب کو معلوم ہوا تو سخت ناراض ہوئے اور انھیں بلا کے کہا کہ اپنے ساتھ مجھے بھی رو سیاہ بناتے ہو اس سے بھی زیادہ یہ کہ جب میر انیس صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے سیوم کی مجلس عالی شان مرزا دبیر ہی نے پڑھی تھی اور ان کی تاریخ وفات اس مصرعہ سے نکالی تھی۔

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس ۔ ۱۲۹۱ھ

اسی ایک مصرع سے ان کے خیالات کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے گو وہ لوگ اب نہیں رہے اور ان کے شاعرانہ ہنگامے بھی انھیں کے ساتھ ختم ہو گئے۔ ان میں سے کسی کو بھی تنگ خیالی کا مجرم قرار دینا ہمارے لیے ایک سخت و مذموم حرکت کا مرتکب ہونا ہے دونوں کی فراخدلی و روشن ضمیری روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ میر انیس صاحب کا کلام فصاحت کا ایک نہایت ہی نادر نمونہ ہے۔ مرزا دبیر کے کلام میں یہ سلاست شاذ و نادر ہے۔ اس لیے فصیح البیانی کا جوہر ان میں میر انیس کی مناسبت سے بہت کم ہے تاہم کلیتًہ مفقود نہیں اس مسئلہ کو زیادہ آسانی کے ساتھ یوں سمجھنا چاہئے کہ دونوں شاعر دو جداگانہ طبیعتیں رکھتے تھے اور دونوں ایک دوسرے کا عکس تھیں جیسا کہ نیچر کا خاصّہ ہے وہ ایک طبیعت کے دو شخص پیدا نہیں کرتا لہٰذا ایک کے کلام میں صفائی کے جوہر جو فصاحت سے تعلق رکھتے ہیں زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمک رہے ہیں۔

علی اسعد الش
9839181230

جس کی مجھے تلاش تھی......

لکھنؤ کے دبستان شاعری کی جن شعراء نے بنیادیں استوار کر کے اردو شاعری کا رفیع الشان قصر تعمیر کیا اور اسے عالمی ادب کی سطح پر عزت و وقار عطا کیا ان میں دو اہم شخصیتیں میر انیس اور مرزا دبیر کی ہیں جو نہ صرف اپنے عہد کے عدیم المثال مرثیہ گو تھے بلکہ آج بھی ان کا کلام ساری دنیا سے خراج تحسین وصول کرتا نظر آتا ہے۔ یہ دونوں شاعر ایک ایسے عہد زریں میں منصۂ شہود پر آئے جبکہ اہلِ علم اور اہلِ زبان کثیر تعداد میں موجود تھے اور فن شاعری کے قدردانوں سے ہندوستان کا طول و عرض چھلک رہا تھا۔

مالک اردو پبلشر جناب امیر علی جونپوری نے ۱۹۷۵ء میں انیس و دبیر کے کلام کا ازسرِ نو اشاعت کا بیڑہ اٹھایا، مرزا دبیر کے مراثی جو ان کے ذخیرہ میں محفوظ تھے انھیں ڈاکٹر اکبر حیدری کے سپرد کیا انھوں نے بہت جلد ایک کتاب "شاعر اعظم دبیر" لکھ ڈالی یہ کتاب دبیر پر کام کرنے والوں کے لیے بیش قیمت ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد بہ طور خود انھوں نے "جواہرات انیس" کے عنوان سے یکے بعد دیگرے دو جلدیں اپنے ادارے کی طرف سے شائع کیں۔ ان کتابوں کی تیاری میں سید نائب حسین نقوی امروہوی نے بہت تعاون کیا۔ انھیں اس سلسلہ میں کافی تجربہ تھا وہ خود میر انیس کے کلام پر مبنی چار جلدیں لاہور پاکستان سے شائع کرا چکے تھے۔ یہ جلدیں شیخ غلام علی اینڈ سنس انار کلی لاہور سے شائع ہوئی تھیں۔

اب میر انیس کے مراثی کی طباعت و اشاعت کا مرحلہ تھا۔ اکبر حیدری دبیر کے مراثی پر مبنی کتاب شائع ہونے کے بعد خالی تھے امیر علی ان سے مراثی انیس غیر مطبوعہ پر کام کرنے کی فرمائش کی جسے مرحوم نے بسر و چشم قبول کرتے ہوئے کام شروع کر دیا۔ انھوں نے کافی تلاش و جستجو کے بعد بہت جلد "باقیات انیس" کے نام سے ایک کتاب مرتب کر کے ان کے سپرد کر دی جسے انھوں نے بہت جلد شائع کر دیا۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئی حیدری صاحب نے کچھ زمانے کے بعد مزید اضافوں کے ساتھ اسی مسودے کو پاکستان بھیج دیا جسے انھوں نے بہترین طباعت کے بعد نومبر ۱۹۸۱ء میں لاہور سے شائع کر دیا دراصل یہ انیس نمبر، باقیات انیس لکھنؤ کا نقش ثانی ہے۔ اس سلسلہ میں محمد طفیل مدیر نقوش رقم طراز ہیں۔

"ایک دن سوچا میر، غالب اور اقبال کے بعد چوتھا بڑا شاعر کون ہے؟ ذہن نے جھٹ فیصلہ کر دیا "میر انیس"

اگر موضوع کی پاکیزگی اور بلندی کو دھیان میں رکھیں تو میر اور غالب بھی کٹ جاتے ہیں اقبال اور انیس میدان میں رہ جاتے ہیں۔

پہلے تین شاعروں پر ادارہ نقوش بساط بھر کام کر چکا ہے۔ تھوڑا بہت جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی ہو جائے گا۔

سب کچھ گرہ میں ہے صرف خونِ دل کی نمائش باقی ہو۔
باقی رہ گئے تھے میر انیسؔ۔ ان کے بارے میں کچھ کرنے کا خیال ضرور تھا مگر محض نمبر چھاپنا تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بڑی بات یہ تھی کہ کچھ ایسا نایاب مواد چھاپا جاتا جو زندہ رہنے والا ہوتا۔ لیجئے وہ آرزو بھی پوری ہوئی ایک صدی سے زیادہ عرصہ کی تحریریں مل گئیں اور کاغذ پر زندہ لفظوں کی سبیلیں لگ گئیں۔ آپ نے چیونٹی کو دیکھا ہوگا۔ وہ ریزہ ریزہ جمع کرتی ہے۔ جب برسات کا موسم آتا ہے تو وہ بربنائے احتیاط اپنا جمع جتھا بل کے سوراخوں سے نکال کر باہر ڈھیر کردیتی ہے تاکہ ضائع نہ ہو۔ غرض میری بھی زنبیل میں جو کچھ سجا رکھا ہے وہاں سے ایک لعل کو اٹھا کر، آپ کی نذر کر رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے بھی برسات سے ڈر لگتا ہے'' (محمد طفیل)

آگے رقم طراز ہیں کہ۔
''۔۔۔ میرے دل میں کاموں کا میلہ لگا ہے۔ لفظی دکانیں سجی ہیں لفظ میرا نام لے کر مجھے پکارتے ہیں مجھے رکنا پڑتا ہے۔ لفظ مجھ سے کہتے ہیں، ہمیں اپناؤ ہمیں اپناؤ۔ میں انسان ہوں۔ میرے بس میں سب کچھ نہیں اس لیے سارے لفظوں کا کہا نہیں مان سکتا۔ لہٰذا انھیں اپنے دل میں بسا لیتا ہوں۔ باری باری ان کے قریب جاکر بیٹھ جاتا ہوں۔ احوال سنتا بھی ہوں۔ احوال سناتا بھی ہوں۔ لفظ کہتے ہیں ہم ایک صدی سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم دو صدیوں سے!

احسان مندی کے جذبے سے میری گردن جھک جاتی ہے۔
ہاں ایک جو احوال سنا تو جسم کانپنے لگا۔ دل ڈوبنے لگا۔ میں نے لفظوں سے بار بار کہا۔ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔۔۔۔۔
مگر الفاظ بضد تھے سنو! سنو!

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ملکوتی آواز فردوسی وقت میر انیسؔ کی ہو جو وہی قوتوں کی طرح اثر انداز ہو رہی تھی۔ ذکر نواسۂ رسولؐ کا تھا۔ ذکر حضرت عباسؓ کا تھا، ذکر علی اصغرؓ کا تھا۔ ذکر حضرت زینبؓ کا تھا، ذکر حضرت کلثومؓ کا تھا۔ غرض وہ ذکر سنا نہ جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ کپکپی طاری ہو گئی۔

جب اپنے آپ کو سنبھالا تب وہ الفاظ جو میں نے سنے تھے، جو لفظوں کے نگینے تھے۔ انھیں یکجا کیا تاکہ دولتِ بیدار کو حق داروں کے حوالے کر سکوں۔
وہ تو ہو گیا۔۔۔۔۔
مگر ان الفاظ کو سننے میں جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی وہ آپ پر اس وقت طاری نہیں ہو سکتی جب تک کہ میری طرح، آپ بھی لفظوں کی کربلا میں نہ کھڑے ہوں۔۔۔
محمد طفیل

اکبر حیدری صاحب کے طویل مقدمہ کے بعد کچھ غیر مطبوعہ کلامِ انیسؔ بھی شامل کیا گیا جسے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے راجہ صاحب امیر احمد خاں بحر کے چھوٹے بھائی جناب مہاراج کمار صاحب جناب امیر حیدر خاں صاحب کے ذاتی مرثیوں سے فراہم کیا تھا۔ وہ تمام مرثیے میرے پیشِ نظر رہ چکے تھے کیونکہ یہ تمام مرثیے خاندان انیسؔ کے ایک فرد سید محمد عباس صاحب آصف کے پاس کوچۂ میر انیسؔ کے مکان میں موجود تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا تمام ذخیرہ ان کی اہلیہ نورجہاں بیگم نے محمود آباد ہاؤس بھجوا دیا تھا۔ ان مرحومہ کا مقصد صرف کلامِ انیسؔ کا تحفظ تھا۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی اس عظیم ذخیرے کا تحفظ کون کرتا؟

جناب مہاراجکمار صاحب مرحوم ایک بہترین شخصیت تھے۔ انھوں نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا جب تک حیات رہے رثائی ادب کے پرستاروں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انھوں نے ہر ایک محقق کی مدد فرمائی۔ حیدری صاحب مرحوم کے ساتھ بھی ان کا محبت آمیز رویہ تھا اسی بنا پر اللہ نے وہ موقع فراہم کر دیا اور انھوں نے وہاں بیٹھ کر

اور گھروں میں بھی مختلف شعراء کا کلام مرتب فرمایا جس میں میر تقی میر
نسخۂ محمود آباد بھی شامل ہے۔

زیر نظر نقوش کے انیس نمبر میں ڈاکٹر صاحب نے ۲۹ مرثیے شائع
کئے جو بہترین ہیں۔ اس یادگار نمبر میں حیدری صاحب نے میر انیس
کے قلمی اور تاریخی مرثیوں کی فہرست بھی پیش کی ہے جو حروف تہجی
کے مطابق ہے۔

میر انیس صاحب کے ہر دل عزیز شاگرد جناب میر سلامت علی
رضوی ساکن مفتی گنج لکھنؤ نے اپنے استاد کی حیات میں دعویٰ کیا
تھا کہ میں نے ان کا کل کلام جمع کر لیا ہے۔ ان کے جمع کردہ مرثیوں
کی وہ فہرست ہم نے بذریعہ سید ارتضیٰ عباس نقوی (مدیر جواہر، کراچی
پاکستان) فراہم کرلی ہے۔ جہاں تک سلامت علی صاحب کے دعویٰ
کا تعلق ہے ان کا یہ کہنا غلط تھا کہ انھوں نے سب مرثیے جمع کر لیے ہیں
سید سلامت علی رضوی کی قلمی فہرست آنے کے بعد میں نے باعتبار حروف
تہجی انیس کے مرثیوں کو یکجا کیا ہے جسے عنقریب شائع کیا جائے گا۔

پروفیسر ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری نے ۱۸۸ مرثیوں پر مشتمل مراثی
انیس کی نشاندہی کی جو انیس نمبر میں موجود ہے لیکن راقم السطور تقریباً
۳۰ سال سے جس مرثیے کی تلاش میں سرگرداں رہا اور جسے حیدری صاحب
نے اپنی مرتبہ فہرست میں مرثیہ ۲۹ کے تحت دکھایا ہے۔ اس کا
مطلع ہے۔ ع

تلف ہوئی جو شہہ خوش خصال کی دولت

مذکورہ مرثیے کو انھوں نے نا تمام یعنی اس نسخہ میں مقطع نہیں
ہے، میں نے خاندان انیس کے قلمی مرثیوں میں اسے تلاش کیا لیکن یہ
مرثیہ نہ مل سکا پھر امروہے والوں کی فہرستیں دیکھیں اس میں بھی
اس مطلع سے کوئی مرثیہ نہ ملا۔ نواب صاحب شمس آباد جناب محمد صادق
صفوی کو بھی خط لکھا تو موصوف نے اپنے ذخیرہ مراثی کی فہرست بھیج دی
اس میں بھی یہ مرثیہ شامل نہیں ہے یہاں تک کہ جناب دبیر صاحب
کے اخلاف میں جناب گوہر آغا سے رجوع ہوا لیکن وہ بھی مذکورہ مرثیے
کی نشاندہی میں قاصر رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ پھر میں نے ضمیر اختر
صاحب کی مرتب کردہ فہرستیں بھی دیکھیں جسے انھوں نے رسالہ "القلم"
میں شائع کردیا ہے اس میں بھی یہ مطلع نہیں ہے۔ میں نے اس عرصہ
میں نائب حسین نقوی، ڈاکٹر حیدری، نیر مسعود، ڈاکٹر طاہر حسین کاظمی
دہلی سے بھی گفتگو کی یہ لوگ بھی یہ بتانے سے قاصر رہے کہ یہ کس کا
تصنیف کردہ ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ گزرتا رہا اتفاق سے ایک دن پروفیسر
سید یوسف حسین موسوی کے یہاں جانا ہوگیا قریب ہی ان کی ایک
ہر دلعزیز شاگردہ تحریر جبین زیدی بھی قیام پذیر ہیں، ان سے بھی ذکر
کیا، ان کا تعلق نوابین اودھ کے پرانے گھرانوں سے ہے انھوں
نے اپنے گھر میں رکھے ہوئے کچھ مرثیے عنایت کئے۔ میں انھیں گھر
لے آیا۔ فرصت کے اوقات میں انھیں دیکھا تو ان میں میر انیس،
میر مونس، مرزا دبیر، میر نفیس، راقم، حسین، احسن، بہار اور
شبیب زید پوری وغیرہ کے مرثیے تھے۔ اس قلمی ذخیرے میں ایسی
وہ مرثیہ مل گیا جسے میں چالیس سال سے تلاش کر رہا تھا۔ اس کے
سرورق پر لکھا ہے۔

از بستۂ نواب اصغر علی خاں صاحب قبلہ

مرثیہ دبیر

تلف ہوئی جو شہہ خوش خصال کی دولت

صفحہ ۲ سے مرثیہ شروع ہوا ہے فی صفحہ چار بند تحریر کئے گئے
ہیں۔ نسخۂ محمود آباد میں ۳۱ بند ہیں اور زیر نظر نسخہ میں ۲۳ بند ہیں
نسخۂ محمود آباد تک میری رسائی ممکن نہ ہو سکی۔ گویا اس طرح میرے
سامنے موجود نسخہ میں ۸ بند کم ہیں۔ ظاہر ہے یہ تبدیلی پڑھنے والوں
کی وجہ سے ہوتی ہے کہ وہ انتخاب کلام پڑھ دیتے ہیں۔ یہ بات زیادہ
تر مطبوعہ مرثیوں میں ہمیں نظر آئی۔ مہذب لکھنوی نے بھی جو کلام شائع
کیا اس میں بھی یہی صورتحال موجود ہے۔ مرثیہ باعتبار بین لاجواب ہے
پتھر دل بھی ہو تو وہ بھی روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مرزا سلامت علی دبیر
رقم طراز ہیں کہ۔

لے تلف ہوئی جو شہہ خوش خصال کی دولت
عدو نے لوٹ لی اٹھارہ سال کی دولت
تباہ کی نبیٔ ذوالجلال کی دولت
ملا دی خاک میں زہرا کے لال کی دولت

نہ جان تن میں نہ بینائی چشم تر میں رہی
کہ اب رسولؐ کی تصویر بھی نہ گھر میں رہی

۲ مرقع نبوی موت نے مٹایا ہے
فلک نے خاک پہ خورشید کو گرایا ہے
چراغ شہ کا بجھایا ہے دل جلایا ہے
قضا نے خاک میں در نجف ملایا ہے
دعائیں بیٹی کی ماں کا ہر ایک سال کٹا
ثمر کی فصل جب آئی، تو یہ نہال کٹا

۳ جدا ہوئے ہیں عجب وقت دونوں عرش جناب
پدر کی عہد ضعیفی، پسر کا سن شباب
یہ درد دل ہے وہ زخم جگر سے ہیں بے تاب
حسینؑ تشنۂ دیدار ہیں، وہ تشنۂ آب
وہ راہوار پہ غش ہے جگر تڑپتے ہیں
یہ دل کو پکڑے ہوئے خاک پر تڑپتے ہیں

۴ وہ شمع گل ہوئی جس سے کہ نام روشن تھا
نبیؐ کی آل کا گھر صبح و شام روشن تھا
دل حسین علیہ السلام روشن تھا
مدینہ کیا کہ زمانہ تمام روشن تھا
نصیب بانو کے دل کو، جگر کا داغ ہوا
پکارتی تھی کہ ٹھنڈا مرا مزار ہوا

۵ خدا کے واسطے اکبر کو ڈھونڈ لاؤ کوئی
جگر میں آگ لگی ہے بجھاؤ کوئی
مرے جواں کی جوانی پہ رحم کھاؤ کوئی
نجف سے حیدر کرار کو بلاؤ کوئی
تڑپ کے منہ سے نکلتا ہے اب جگر میرا
چھٹا ہے پہلے پہل، نوجواں پسر میرا

۶ یہ میری آنکھوں کے آگے ہے کیا سیاہ سیاہ
یہ کیا جگر میں کھٹکتا ہے، جس سے دل ہے تباہ
حسینؑ امامؑ کہاں ہیں پکار لو للّٰہ
کدھر گئے علی اکبر انھیں علی کی پناہ
پسینہ آیا ہے اور جی نڈھال ہوتا ہے
پسر کے غم میں یہی سب کا حال ہوتا ہے

۷ کسی کی بن کے نہ یکبار یوں بگڑ جائے
بسی بسائی نہ بستی کوئی اجڑ جائے
کسی کی کوکھ پہ آفت نہ ایسی پڑ جائے
غضب ہے شیر جواں بانو سے بچھڑ جائے
قضا نے میرے کلیجے پہ ہاتھ ڈالا ہے
جگر کو کاٹ کے تحت جگر نکالا ہے

۸ کہو امام سے مقتل کچھ ایسا دور نہیں
پسر کو ڈھونڈتے کیوں سید غیور نہیں
حسینؑ کہتے ہیں آنکھوں میں میری نور نہیں
خدا گواہ ہے بانو مرا قصور نہیں
جو دل کا حال ہے اس دم سنا نہیں سکتا
پسر بلاتا ہے اور باپ جا نہیں سکتا

۹ یہ کہہ کے پاؤں جو بیساختہ بڑھانے لگے
گرے زمیں پہ تھرا کے اور غش کھانے لگے
حضور فوج ستم جا کے یہ سنانے لگے
بتاؤ جیتے ہیں اکبر و یا ٹھکانے لگے
جگر پہ مارے ہیں نیزے کہ دل پہ مارے ہیں
تمام ہو گئے یا منتظر ہمارے ہیں

۱۰ سنبھالتا ہوں بہت دل نہیں سنبھلتا ہے
جگر کو ہاتھوں سے رہ رہ کے کوئی ملتا ہے
بتاؤ جلد کدھر وہ لہو اگلتا ہے
کہ اب تو منہ سے کلیجہ مرا نکلتا ہے
جگر کی چوٹ سے بے دل ہوں بیقرار ہوں میں
لعینوں رحم کا تم سے امیدوار ہوں میں

۱۱ خدا کے واسطے پیغمبر خدا کے لیے
ترس کرو مرے رونے پہ مرتضیٰ کے لیے
بچھڑ رہا دین سے دنیائے بے وفا کیلئے
تڑپ رہی ہے مری روح دلربا کے لیے

یہ وقت وہ ہے کہ کافر بھی رحم کرتا ہے
حسینؑ مرتا ہے یارو حسینؑ مرتا ہے

۱۲
زباں سے مانگتے ہیں پانی یا اشارے سے
وہ دور ہیں کہ قریں نہر کے کنارے سے
ابھی خود اٹھتے ہیں یا غیر کے سہارے سے
ملاؤ مجھ کو مرے نوجوان پیارے سے
بتاؤ زخم جگر کا رفو کے قابل ہے
سنا ہے میں نے کہ نیزے کی نوک میں پھل ہے

۱۳
یہ کہہ کے شاہ چلے دشت کو بحال تباہ
عقاب لاش لیے آیا روبرو ناگاہ
حسینؑ بیٹے سے لپٹے تو بولا وہ ذی جاہ
غلام صدقے ہو خیمہ میں لے چلو یا شاہ
پھوپھی کو دیکھ لیں قدموں پہ سر کو پھوڑا دیں
جناب والدہ صاحب سے دودھ بخشا لیں

۱۴
حسینؑ بولے چلو میری جان بسم اللہ
پھوپھی بھی بہنیں بھی ماں بھی تڑپتی ہیں سر راہ
درِ خیام پہ لاشہ لیے جو پہونچے شاہ
پکاری بانو کے رستہ دو بیبیو للہ
بتول بال کھلے ساتھ ساتھ آتی ہے
علیؑ کے پوتے کی رن سے برات آتی ہے

۱۵
بچھاؤ مسند محبوب کبریا لوگو
لٹا دو دولہا کو آرام سے ذرا لوگو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں اوڑھ لو ردا لوگوں
کہیں گھر آتے ہی اکبرؑ نہ ہوں خفا لوگوں
امام جن و بشر ان کو جا کے لائے ہیں
یہ مجھ سے روٹھے تو حضرت منا کے لائے ہیں

۱۶
ہلا کے ہونٹوں کو اکبرؑ نے کچھ پھوپھی سے کہا
پھرا کے منہ کو بہت روئی دختر زہراؑ
کہا یہ بانو سے رو کر کہ بھابھی تم نے سنا
یہ جان بوجھ کے ہے ہے تمہیں نہیں دیکھا
یہ کیا غضب ہے اٹھاؤ اٹھاؤ چادر کو
اشارہ کرتا ہے اکبر کہ ڈھانپ لو سر کو

۱۷
تمہیں کو ان کی محبت ہے کیا پھوپھی کو نہیں
ہر ایک وقت کا موقع ہے اے ملول حزیں
ردا کے گرنے سے تھراتا ہے یہ ماہ جبیں
جگر کے زخم میں ہونے لگے نہ درد کہیں
اگرچہ پار ہیں دل سے مرے بھلے ہوئے
یہ کیسے بیٹھی ہوں پہلو جگر سنبھالے ہوئے

۱۸
یہ گفتگو تھی کہ دم توڑنے لگے اکبرؑ
کہا یہ بانوؑ نے زینبؑ سے دیکھئے تو ادھر
یہ سانس لیتے ہیں کیوں جلد جلد گھبرا کر
یہ آنسو آنکھ سے کیسے بہے ہیں عارض پر
سران کا تکیہ سے کیوں سرک گیا ہے ہے
مجھے گمان ہے من کا بھی ڈھل گیا ہے ہے

۱۹
رگوں کے کھنچنے سے لونڈی کا دل دھڑکتا ہے
پھرا کے پتلیاں قبلہ کو کیوں یہ تکتا ہے
یہ کیا سبب ہے کہ تالو بہت لپکتا ہے
اب ایک بال پلک کا نہیں جھپکتا ہے
جگر سے ہاتھ اٹھا کر جبیں پہ دھرتے ہیں
گذر ہوا ہے علیؑ کا سلام کرتے ہیں

۲۰
یہ کہہ رہے تھے جو رہ گیا بدن ہل کر
پھوپھی پکاری کہ لو جاں بحق ہوئے اکبرؑ
لپٹ کے لاش سے چلائی بانوئے مضطر
تمام ہو گئے تم ہائے میرے شیر پسر
ابھی تو کعبے کا اپنے نظارہ کرتے تھے
ردا اٹھانے کا ماں سے اشارہ کرتے تھے

۲۱
میں اوڑھ لیتی ہوں چادر خفا نہ ہو واری
کبھی نہ کھولوں گی اب سر خفا نہ ہو واری
لو عذر کرتی ہے مادر خفا نہ ہو واری
میں صدقے ہو گئی مادر خفا نہ ہو واری (بقیہ صفحہ ۹۴ پر)

آثار
و
اقدار

ڈاکٹر سید مشتاق حسین
۱۰۹۶ نارتھ بکسٹر بی، ایل، ایس، ڈی ڈولاس ٹیکساس ۵۲۱۸، یو ایس اے

خدائے سخن علامہ میر انیسؔ کی قیام گاہ

کوچۂ میر انیسؔ اور اس کے ماحولی تضادات

آئیے! اب آپ کو کوچۂ میر انیسؔ کی سیر کراتا ہوں
اگر آپ نخاس سے عبد العزیز روڈ پر تشریف لائیں تو آپ
کو ایک طویل و عریض ڈھال ملے گی یہ ڈھال جہاں ختم ہوتی ہے
وہاں سے دائیں جانب اکبری دروازہ ہے۔ اس کی خصوصیت
علاوہ در و محراب کے یہ ہے کہ اس دروازے میں
مٹی کے لاجواب کھلونے بکتے ہیں میں نے اسے
سنہ ۱۹۷۱ء تک تو دیکھا تھا۔ چوک کا یہ پہلا دروازہ
ہے اور دوسرے سرے پر گول دروازہ ہے۔ سنتے
ہیں کہ اکبری دروازہ شہنشاہ اکبر کی یادگار اہل لکھنؤ
نے تعمیر کرایا تھا۔ ان دروازوں کے درمیان لکھنؤ کا
بازار حسن چوک ہے اور بازار ضروریات زندگی
اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں طوائف کا پیشہ قانوناً
جرم نہیں تھا۔ خواتین کے کوٹھے
اوپر تھے جبکہ کاروباری حلقے نیچے سڑک کے
دونوں جانب تھے۔

مجھے ان انتظام امر کا پتہ حادثتاً چلا۔ ہوا
یوں کہ میں معتبر ذرائع سے اطلاع ملنے کے بعد کہ نخاس
میں ہنس کے بچے آئے ہوئے ہیں سائیکل سے وہاں گیا معلومات
حاصل کیں، جلدی تھی کہ جا کے امی سے اجازت لوں اور بطخوں کا جوڑا
لے آؤں۔ میری سائیکل ڈھال پر لڑھک رہی تھی دیکھا کہ سامنے
سے ابا کے دوست مولانا للّن صاحب قبلہ چلے آ رہے ہیں۔ میں
نے گاڑی روکی اترا اور ایک ہوائی آداب بجالایا۔ خیریت پوچھی
اور دھڑ پیڈل پر پیر۔ ابھی چلا بھی نہیں تھا کہ احساس ہوا کہ وعلیکم
آداب جاری ہے۔ گاڑی روکی پھر آداب کرنا شروع کیا پھر
رکنے کے بجائے طے کیا کہ اگر ایک آدھ اور ملنے والے مل گئے
تو کہاں میں اور کہاں بطخیں۔ دائیں ہاتھ مڑ کے
چوک سے نکلنے کا طے کیا سہ پہر کا سناٹا تھا جیسے
ہی چوک کی جانب جانے والی گلی میر انیسؔ لین
میں گھسا تو ایک ہنگامہ تھا۔ دس بارہ کتے
منسلک تھے اور نامراد بھونک رہے تھے اور
بچے سنگ باری میں مصروف تھے۔ میں یہ ہڑبونگ
دیکھ کر ڈر گیا اور بھاگ کر ایک کھلے دروازے
میں گھس گیا۔ اندر حالات اور گمبھیر لگے۔ ایک
پہلوان قسم کے آدمی چھری تیز کر رہے تھے۔
ایک معمر خاتون نے پوچھا۔ صاحبزادے آپ یہاں
کیسے؟ میں نے اشارتاً بتایا کہ باہر گڑبڑ ہے
وہ مسکرائیں اور پوچھا آپ کہاں رہتے ہیں؟ میں
نے بتایا..... میر صاحب کے گھر میں، انھوں
نے کہا جائیے اب ادھر نہ آئیے گا... پہلوان صاحب نے
کہا تو اس کو کہاں بھیج رہی ہیں؟
یہ انیسؔ ہاؤس چوک کی طرف سے آنے کا راستہ تھا۔
اگر آپ اکبری دروازے سے جھوائی ٹولہ کی طرف چلے جائیں تو

داستے میں ایک بڑا پتھر کا بورڈ نظر آتا ہے (اسے لوگ سرکٹا نالہ بھی کہتے ہیں) جس پر مکتوب ہے "کوچۂ میر انیس"، یہ گلی حکیم عبدالعزیز روڈ سے دائیں جانب مڑتی ہے (اب یہاں پر مدرسہ عالیہ عرفانیہ بن گیا ہے۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں مجرموں کو سزائے موت دی جاتی تھی، اسی لیے اسے سرکٹا نالہ کہا جاتا ہے۔ موڑ سے پہلے ایک وسیع میدان ہے (اب یہاں پر احمد حسین دلدار حسین تمباکو والوں نے نئی عمارت بنوالی ہے) جس کے دائیں جانب مولانا سید ابوالحسن صاحب عرف منّن صاحب کا قدیم مکان ہے اسی میں سیدالعلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ اور ان کے تمام بھائی رہتے تھے۔ اس سے متصل سید تقی صاحب قبلہ مجتہد کا امام باڑہ جنت مآب اور مسجد ہے۔ مسجد کی او کار پر جو پتھر نصب ہے اس پر لکھا ہے "مسجد اہلیہ مولوی سید عسکری صاحب"، یہ خاندان اجتہاد کے بزرگ علماء میں سے تھے۔ اس مسجد کی تعمیر میں ہمارے نانا میر عارف اور حکیم محمد علی عرف منے آغا صاحب فاضل بھی شامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی مسجد میں منے آغا فاضل لکھنوی ان کی اہلیہ اور ان کے بیٹے حکیم یعقوب عرف ننھے آغا صاحب برابر برابر دفن ہیں۔ زمانہ گزرنے کے بعد یہ مسجد بے توجہی کا شکار تھی جو ہم لڑکوں نے فٹ بال، کرکٹ کھیلنے کے بعد نماز پڑھنے کے لیے استعمال کی شروع کیا۔ مسجد اور امام باڑہ کے قریب "کالا پھاٹک" نام کا ایک مکان تھا جس کے مالک د وارث محمد عباس صاحب تھے جو آموں کے بڑے مخالف تھے مگر مجلس میں گریہ خوب کرتے تھے۔ ان کی اولاد میں شمن جو ہمارے دوست تھے تقسیم کے بعد کراچی آ گئے تھے اور اب یہیں موجود رہا۔

کوچۂ میر انیسؔ کا پتھر جو چوک سے داخلے والی گلی میں اب بھی موجود ہے۔ ۲۰۱۵ء

یہ علاقہ مسجد تحسین علی خاں چوک کی پشت پر ہے وہیں دائیں طرف میرے خالو محمد صالح، ان کی دو بیٹیاں کاظمی اور حسن بانو رہتی تھیں شیعہ مکانوں کے ہمراہ اہل سنت بھائیوں کے مکانات بھی تھے۔ اور دونوں مکاتب فکر کے لوگوں میں روایتی میل و محبت تھی۔ میرے نانا میر عارف مکان انیسؔ کے وارث و امین تھے اور اہل محلہ سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ وہ فلاحی کام اور خدمت خلق میں ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ انھوں نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔ انھیں علم طب میں بھی بڑا دخل تھا اس لیے وہ زبانی مختلف امراض کے دفع ہونے کے لیے سب کی مدد و اعانت کیا کرتے تھے۔

میر انیسؔ لین تقریباً ایک سے سوا کلو میٹر طریق پر ملتوی ہے لیکن اس میں سبزی منڈی والی بات کوئی نظر نہیں آتی ہے دو لوگ اس کو چوبداری محلہ جانتے ہیں، شاہی زمانے میں میر انیسؔ کے دور میں جو خطوط ان کے پاس آتے تھے ان پر دو محلہ سبزی منڈی چوک لکھنؤ درج رہتا تھا) علاوہ اس کے کہ حسینی بنئے کا تکیہ تھا جو ترکاری، پھل، ٹھنڈی سوڈے کی بوتلیں، گنّے، تل اور باجرے لڈو بیچتے تھے۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اسے ایسا ہی دیکھا تھا جیسا ہم نے دیکھا۔ اس کے بیوی بچے نہیں تھے۔ اس کے علاوہ وہ بکرے خصی اور بلیوں کو ٹڑی بے رحمی سے مار دیتے تھے ان کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک شیرازی کبوتر پلے ہوئے تھے جو بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ اس کے گھر کے پہلو میں قبرستان تھا جہاں لوگ پتنگ بازی کیا کرتے تھے۔ گلی کی طرف اس کے سرے پر نل تھا لہٰذا سب حصول آب کے لیے یہاں آتے اور پانی لے جاتے تھے حسینی بنئے کے چبوترے سے اگر آپ الٹے ہاتھ جائیں تو ایک پتلی گلی

چلتی بل کھاتی قبرستان میر انیسؔ " جسے اب لوگ مقبرہ میر انیس کہنے لگے" کے دروازے پہونچ جاتی ہے اس کا صدر دروازہ جو نو ہے کا ہے

یہ تصویر ۱۹۶۲ء میں کھینچی گئی تھی

مکان میر انیسؔ کا صدر دروازہ جس پر روسی اسکالر کے ساتھ خلف میر عارف سید محمد ہادی لائق نظر آرہے ہیں

ہم نے انہدام جدید تعمیر مقبرہ کے دوران ہجرت سے قبل دیکھا تھا۔ ہم سب بچے اپنے گھروں میں جانے کے لیے دیواریں پھلانگتے، کھڑکیوں میں کھڑکیاں بناتے..... اگر آپ سیدھے ہاتھ جائیں تو میر انیسؔ لین کا چوک کا راستہ ہے جس کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ دائیں ہاتھ کی طرف خاندان انیسؔ کے باقیات الصالحات کے مکانات ہیں... سیدھے ہاتھ کو پہلے میر علی محمد عارفؔ صاحب کا دیوان خانہ ہے جس میں حضرت فائق اور ہادی صاحب لائق رہتے تھے اور اب فی زمانہ ان کی اولاد جناب دانشؔ مع خوش خصال بھائیوں کے آباد ہیں۔ یہ ہمارے ماموں زاد بھائی ہیں۔

اس سے ملا ہوا محل سرائے انیس ہے جہاں میری والدہ ثریا بیگم ان کے بھائی سید یوسف حسین شائق اور دیگر اہل و عیال رہتے تھے۔ اسی مکان میں میری اور میری تمام بہنوں کی ولادت ہوئی۔ یہ تھے میر انیسؔ ہاؤس کے مکین... کوچے کا ایک کلچر تھا، ایک ثقافت تھی راستے میں دکھائی دینے والے چچا سے ہم لوگ اصل عزیزوں سے زیادہ ڈرتے تھے۔ ایک دفعہ چلے آرہے تھے اور بھنے چنوں کے پھنکے کھا رہے تھے۔ چچا نے کہا۔ بیٹا گھر میں کھانے کو نہیں ملتا۔ گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ایک دفعہ گریبان کا بٹن کھلا رہ گیا۔ ایک انکل بولے کہ جن کے لڑکے ہو وہ تو زندہ ہیں تم گریبان چاک کئے ہو۔

ہم بچوں نے اپنے اوپر گرد و نواح کے عزیزوں کے گھروں میں صدر دروازے سے داخل ہونا ممنوع قرار دے لیا تھا۔ صرف بڑے مکان (مراد مکان انیسؔ) اور ماموں سید محمد عباس ایم اے کے مکان مستثنیٰ تھے۔ ماموں نے مکان کی پشت پر میر انیسؔ کی بغیا جو قبرستان انیسؔ سے متصل تھی ایک چھوٹی کھڑکی تھی اس کی لوہے کی سلاخیں ہم لوگوں نے ٹیڑھی کر دی تھیں اور وہیں سے ہم لوگ مقبرے میں کھیلنے جاتے تھے۔ باقی تمام مکانوں میں ہم لوگوں نے چور دروازے بنا رکھے تھے (اشکال ۱، ۲ اور ۳) یا مکانوں کو ملانے کے لیے کھڑکیوں میں کھڑکیاں بنائی تھیں جو نا جائز تھیں ہم لوگ کھڑکیاں، دیواریں پھلانگتے ہوئے حکیم منے آغا صاحب فاضل (ابا جان) فرخ ماموں، چھوٹے ماموں، بڑے ماموں، لڈن چچا سید تقی صاحب قبلہ کے امام باڑے کی مسجد تک پہونچ جاتے تھے اور ہماری راہ قطعی راست نہیں ہوتی تھی۔ اس میں بہت سے فائدے تھے۔ وقت بچتا تھا، سڑک کے حادثات سے محفوظ رہتے تھے اور اس میں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ لذت قانون شکنی بھی ملتی تھی۔

بڑا مکان اور بغیا

۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد لکھنؤ اجڑا اور میر انیس نے متعدد جگہ قیام کے بعد محلہ سبزی منڈی (یہ جو بداری محلہ) لکھنؤ میں ایک وسیع و عریض مکان خریدا۔ اہل خاندان اس کو بڑا مکان کہتے ہیں۔ مکان کے قریب ایک وسیع باغ تھا جس کو لوگ میر انیسؔ کی بغیا کہتے تھے پہلے بغیا کا ایک وسیع حصہ قبرستان خاندان انیسؔ کی شکل میں ابھرا تھا ۱۹۶۳ء میں وہاں موجود ایک وسیع کمرے کو منہدم کر کے مقبرہ تو

کی تعمیر کی گئی جسے انیس میموریل کمیٹی لکھنؤ نے بنوایا اس کمرے میں جس کا ذکر کیا گیا اس میں انیسؔ، ان کی چھوٹی بہن، میر مونسؔ، اہلیہ انیسؔ فاطمہ بیگم، میر نفیسؔ، میر رئیسؔ، میر سلیسؔ، میر جلیسؔ، میر عارفؔ، بابو صاحب فائقؔ، ہادی صاحب لائقؔ، ان کے فرزند علی محمد عارف اور ان کی بڑی بیٹی دفن ہیں اس مقبرے کی چار بندی اور صدر دروازے کی تعمیر راجہ صاحب محمود آباد کے چھوٹے بھائی مہاراجکمار صاحب محمود آباد کے دست مبارک سے ہوئی تھی اس وقت غالباً ۱۹۵۴ء کا زمانہ تھا میں اس پروگرام میں بہ نفس نفیس موجود تھا اس میں شرکت کی تیاری میں میں نے خصوصیت سے خاکی زین کا پتلون سلوایا تھا اور اس پر خوب کلف کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر کلف ٹوٹ گیا تو نہ افتتاح ہوگا نہ مقبرہ بن سکے گا۔ میں اسوقت آٹھویں جماعت میں حسین آباد اسکول کا طالب علم تھا۔

مجھے میر انیسؔ کی بغیا بہت پسند تھی اور وہاں بڑا سکون ملتا تھا نہ قبرستان والی وحشت۔ میں نے کسی قبرستان کی زیارت کے بعد اپنی غزل میں چند اشعار لکھے تھے۔

نہ گل ہیں اور نہ شمعیں ہیں شکستہ چند قبریں ہیں
سبق آموزِ عبرت ہے زمیں گورِ غریباں کی

شکل نمبرا

کوچہ میر انیس کا وقوع اور حدود اربع

انیسؔ کی بغیا ایسی نہ تھی نہ ڈر، نہ خوف، سبزہ ہی سبزہ وارفتگی ہی وارفتگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے چپہ چپہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے جانے نہ جانے دل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ بغیا ہمارا کھیل اور شرارتوں کا میدان تھا۔ قبروں سے ہمیں بالکل ڈر نہیں لگتا تھا۔ بغیا کا اصل راستہ سڑک کی طرف سے تھا۔ دوسرا راستہ محمد عباس صاحب کے گھر سے ہو کر جاتا تھا۔ میں ایک دن صبح وضو کر کے گھر سے نکل کر ماموں محمد عباس کے گھر آیا اور وہاں سے گھر کی پھلانگ کر مزار انیسؔ پر پہنچا۔ میر انیسؔ کی قبر کے سرہانے دو رکعت نماز ادا کی اور مناجات لکھنا شروع کر دی۔

میرے اللہ مجھے چشم بصیرت ہو عطا
جو فلک بوس کرے مجھ کو وہ رفعت ہو عطا

ولولہ جوش و حق آگاہی و ہمت ہو عطا
راہِ ایماں پہ رہوں علم کی دولت ہو عطا

افق علم پہ چمکوں، مہ تاباں بن کر
دہر در راہِ رضا کامل ایمان بن کر

روشنی علم کی پھیلاؤں درخشاں ہو کر
زندگی اپنی گذاروں میں اک انساں بن کر

یہ نظم مناجات زندگی کی دوڑ کے ساتھ آگے بڑھتی رہی اور ۱۹۸۳ء میں کویت میں حتی الامکان مکمل ہوگئی اپنے اوپر بھروسہ نہیں، کسی کو دکھانے کی ہمت نہیں، ابا گھر سے دور..... بس ایک رہ گئیں میری دوست خاتون میری والدہ ماجدہ ثریا بیگم بنت میر علی محمد عارف.. بڑی بجاجت سے انھیں بتایا کہ ایک حرکت قبیح سرزد ہوگئی ہے۔ ساز اور میر انیس والی بات کو دل میں ہی رکھا ۔ انھوں نے پڑھا پڑھوا کر سنا۔ ایسا لگا کہ خوش ہوگئیں لیکن کہا کہ آپ کو اپنی تعلیم پر توجہ دینا چاہئے شاعری تو ہوتی رہے گی۔

☆ میر مشتاق کی پیدائش ۲۱/۸/۱۹۳۶ نماز صبح کے وقت

شکل نمبر ۲
میر انیس ہاؤس (بڑا مکان) کی زمینی منزل خریدکردۂ حضرت انیس علی اللہ مقامہٗ

یوسف حسین شائقؔ اور ان کے اہل خاندان کے لیے مختص تھا وسط میں صدر کے درجے مشترکہ استعمال کے تھے جس کمرے پر ☆ بنا ہے اس میں میری اور میری چاروں بہنوں کی ولادت ہوئی تھی۔

شکل نمبر ۳ میر انیس ہاؤس کی بالائی منزل (تعمیر کردہ)

مکان انیس کا اندرونی حصہ اور شیشے کا سائبان

مکان انیس محرابوں اور پچی کاری سے مزین تھا۔ اس کی فصیلیں بلند اور صدر دروازہ بہت مضبوط لکڑی کا شاندار تھا۔ چھتیں بلند تھیں جس کی وجہ سے گھر کے اندر ہمیشہ خنکی رہتی۔ اس کی زمینی منزل کا خاکہ شکل نمبر ۲ میں دیا ہوا ہے۔ صدر میں وسیع ہال، اس کے آگے بڑا دالان، اس کے آگے شیشوں کا سائبان میرے زمانے تک تھا تینوں درجوں کی وسعت کم و بیش مساوی ہے صدر کے ہال اور دالان میں کانس پر گھا گھرے کبوتر، گولے ٹکڑی والے کبوتر رہتے تھے صدر کے درجوں کے جانبین دو دو کمرے ایک صحنچی تھی داہنی طرف سے دونوں کمرے اور ایک صحنچی ہم لوگوں کے خصوصی استعمال میں تھی جبکہ بائیں طرف کا سیٹ
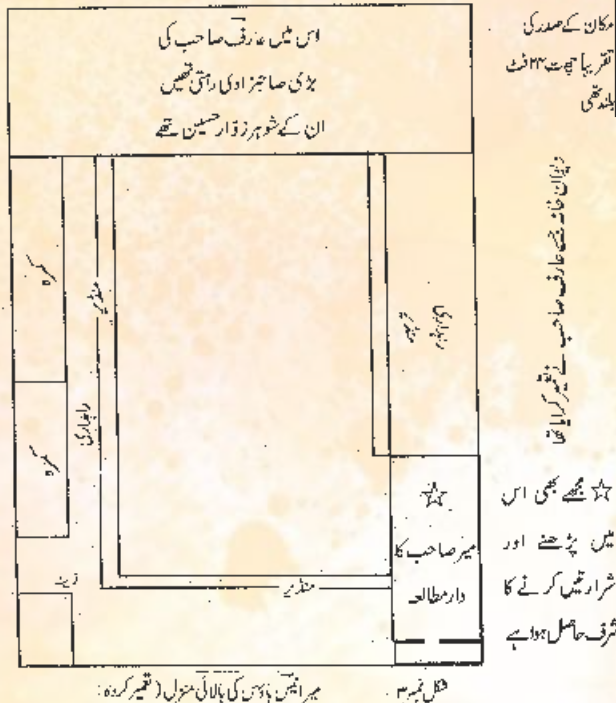
صحن کے دو رویہ درجے بنے ہوئے ہیں۔ دیوان خانہ میر انیسؔ راستہ ہے جہاں انیسؔ اس عہد کے امراء، روساء اور اپنے احباب اور شاگردوں کو بٹھایا کرتے تھے۔ وہ وہیں انھیں طرز زندگی خواندگی کے اصول سے بھی واقف کراتے تھے۔ صحن کے بائیں جانب حمام تھا، اس کے برابر بائیں جانب کپڑے بدلنے کا کمرہ تھا اور جس میں سانپوں کی کالونی تھی یہ گوڑیالے سانپ کہلاتے تھے۔ سانپ اور ہم لوگ بقائے باہمی کے اصول پر عمل کرتے تھے، نہ وہ ہمیں ڈستے تھے اور نہ ہم انھیں مارتے تھے۔ سنا ہے کہ میر انیسؔ کے دوست اُجنّہ میں سے تھے جو ان کی اولاد کی حفاظت کے لیے وہاں رہتے تھے۔ بزرگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ انیسؔ کے انتقال کے بعد ان کی قبر پر تلاوت قرآن مجید فرماتے تھے جو نظر نہیں آتے تھے۔

پڑوس
حکیم ننّے آغا صاحب فاضل

کمرہ | ہال | کمرہ
صحنچی | دالان | صحنچی

پڑوس
بیت الذان صاحب فائز

پڑوس
بڑا مکان

صحن
بیت لائق
حوض
نل
زینہ

دالان
بیت فائق
باورچی خانہ

پڑوس
کیلے والا مکان

ہال
ڈیوڑھی
برآمدہ

(الف) دیوان خانے کی زمینی منزل

کمرہ | کھلی چھت / دالان | کمرہ

(ب) دیوان خانے کی پہلی منزل

شکل نمبر۳
دیوان خانہ اوپری نچلی منزل، تحریر کردہ: میر عارف مرحوم
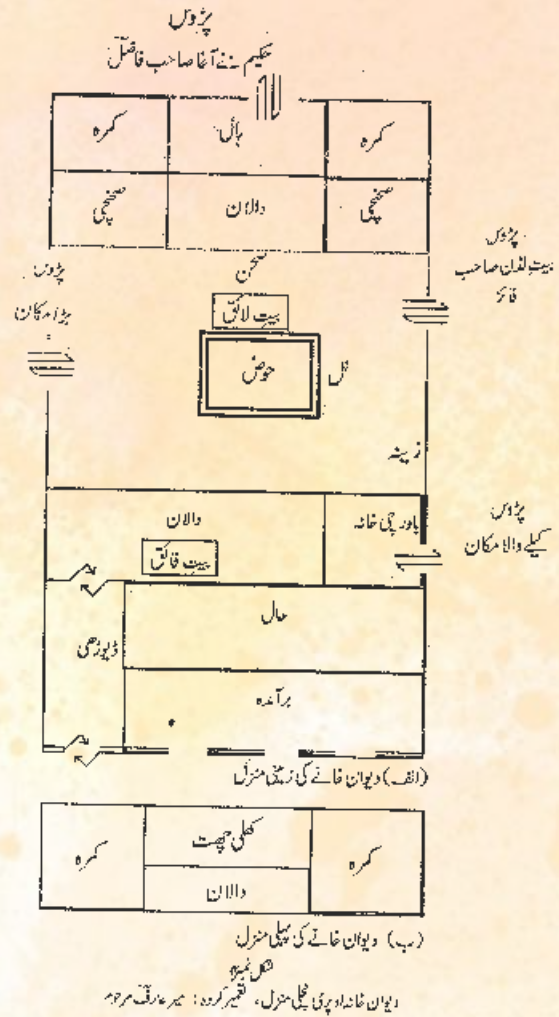
مکان انیسؔ میں ایک وسیع صحن ہے جس میں امرود کا ایک قدیم درخت لگا ہوا تھا۔ زمانۂ قدیم میں صحن کے چاروں طرف پٹریاں تھیں جو کافی چوڑی تھیں۔ یوسف حسین شائقؔ نے اس کے درمیانی نشیب کو مٹی سے بھروا کر پٹریوں کے برابر کر دیا تھا ہشت پہل حوض نمایاں ہے۔ اس حوض میں پلی ہوئی تھیں یہ مچھلیاں اس ماحول سے اس قدر مانوس ہو گئی تھیں ان میں افزائش نسل بالکل قدرتی طور پر ہوتا تھا۔ یہ سالانہ پروگرام گھر کے بچوں کے لیے ایک تعلیمی پراجکٹ ہوتا تھا۔ افزائش نسل کے دورانیہ سے قبل حوض کی صفائی ہوتی تھی جسے گھر کے بچے کرتے تھے۔ یہ ایک ہنگامہ خیز پراجکٹ ہوتا تھا۔ ہمارے زمانے میں اس کی قیادت بھائی ابا حضرت شائقؔ فرماتے تھے۔ حوض میں سے ڈول سے پانی نکالا جاتا تھا کیونکہ سائفن کے ذریعہ بہت تھوڑا پانی نکالا جا سکتا تھا جب پانی کی مقدار کم ہو جاتی تو مچھلیاں پکڑنا آسان ہو جاتا تھا۔ انھیں بڑے پتیلوں میں نکال لیا جاتا انھیں مچھلی پانی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا یہ تمام مچھلیاں سرخ اور سیاہ رنگ کی تھیں۔

مکان انیسؔ کے حوض میں ایک بڑا ایک چھوٹا۔ جب مچھلیاں انڈے دینے کے قابل ہو جاتی تھیں تو چھوٹے والے حصہ میں کیلے کے بڑے بڑے پتے ڈال دئے جاتے تھے۔ ان پتوں پر وہ آتیں اور انڈے دے کر حوض کے اندر چلی جاتی تھیں۔ یہ انڈے مثل حباب دانے کے صبح کو پتوں پر چپکے نظر آتے تھے۔ یہ پتے اٹھا کر حوض کے چھوٹے حصہ میں ڈال دئے جاتے تھے جہاں کچھ روز کے بعد انڈوں سے بچے نکل آتے تھے اگر یہ اور مچھلیوں کے ساتھ ہوں تو مچھلیاں انھیں کھا جائیں جب بچوں کا سائز بڑا ہو جاتا تھا تو انھیں مچھلیوں سے ملا دیا جاتا۔ اس کے لیے حوض میں پانی بھر دیا جاتا لیکن چھلکنے نہ دیا جاتا اس کھیل میں ہم لوگ دو تین ہفتے لگے رہتے۔

گذشتہ صفحہ کی شکل نمبر ۲ میں انیسؔ ہاؤس کی پہلی منزل کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ صدر کے پورے علاقے کے اوپر میر عارف صاحب کی بڑی بیٹی مع اپنے شوہر کے رہتی تھیں جن کا نام سید نذار حسین تھا اور تخلص زائرؔ تھا۔ سنا تھا کہ اس حصہ میں دوست جن رہتے تھے۔

میر انیس کا دار المطالعہ داہنی جانب ہے اور اس میں ایک باکھنا ہے جس میں میر صاحب آنے والوں کا جواب دیتے تھے میں یہاں سے شرارتیں کرتا تھا اور یہیں پڑھتا تھا۔ کبھی کسی کی دو پلّی ٹوپی کالے بھوت کے ذریعہ اٹھائی کبھی طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔

قبرستان میر انیس اس کھجور کے درخت کے ساتھ جسے میر صاحب کے بھائی میر نواب مونس نے کربلا (عراق) سے لاکر لگایا تھا

میر علی محمد عارف نے میر انیس کے مکان کو ۱۸۹۴ء میں پر منشا ئے میر نفیس خریدا اور اپنی اہلیہ مریم بیگم کی فرمائش پر اس میں ایک شاندار حوض بنوایا اس کی تعمیر میں ساڑھے چھ سو دو روپئے صرف ہوئے عارف صاحب چونکہ آمد و صرف کا حساب اپنی بیاض میں لکھ لیتے تھے لہٰذا اپنی اولادوں میں جس کو جو رقم دیتے وہ بھی اس بیاض میں تحریر فرما دیتے۔

عارف صاحب نے مکان کی خریداری کے بعد ایک اہم رقبہ دیوان خانہ کے بطور اضافہ فرمایا جو مردانی بیٹھک کے طریقے سے استعمال ہوتا تھا اس کی دیواروں پر انیس اور خاندان انیس کے مشہور شعراء کی تصویریں آویزاں تھیں دونوں حصوں کے درمیان رابطہ تھا اس میں ایک چھوٹا سا حوض تھا بزرگوں سے سنا ہے کہ اسی حوض میں میر انیس غوطے کے لیے اترتے تھے۔ جس زمانے میں بڑے مکان میں رہتا تھا اس زمانے میں حضرت فائق اور حضرت لائق دو دیوان خانوں میں رہتے تھے لائق صاحب انیس کے دیوان خانے میں اور فائق حضرت عارف کے دیوان خانے میں جو گلی کی طرف تھا کہنے کو تو علاحدہ الگ الگ تھے لیکن رہنے والے لوگ ایک دوسرے کا بیحد خیال رکھتے تھے۔ عارف صاحب کے اس دیوان خانے کے حصہ میں اوپر کی منزل میں آمنے سامنے دو کمرے تھے۔ بڑے مکان کا نام میر انیس ہاؤس ۱۹۶۳ء میں پڑا۔

پورے وثوق سے تو نہیں بلکہ اندازے پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مکان انیس کا رقبہ کم و بیش ۲۰۰۰ مربع گز ہوگا یہ تخمینہ میں نے کراچی کے علاقوں کو دیکھ کر لگایا۔ ان مکانات کی خصوصیات، کشادگی، اونچی چھتیں، موٹے دروازے، طہارت کا انتظام، طویل و عریض ڈیوڑھیاں۔ اس بنا پر مکان ٹھنڈے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ چھت کا بڑا پنکھا جو کپڑے کا بنا ہوا تھا گھر میں موجود تمام افراد کے لیے آرام دہ ماحول پیدا کر دیتا تھا جسے ناصر کی ماں چلاتی تھیں اور چلاتے چلاتے خود بھی نیند کے غلبہ کی وجہ سے وہیں پر سو جاتی تھیں۔

میں نے تربیت کے بارے میں درج ذیل سطور میں جو کچھ لکھا ہے وہ اسی ماحول کی تعلیمات کی بنا پر لکھا ہے۔ ابا حکیم کاظم صاحب کو بھی شاعری کا شوق تھا لیکن وہ اپنی ملازمت کی وجہ سے ہم سے دور رہتے تھے۔ بڑے ماموں فائق صاحب نے بھی مجھے تحت اللفظ خوانی کی تربیت دی حالانکہ مجھے احساس تھا کہ میں خود کو شاعر بنا۔

میں کم و بیش تمام تربیتی اور تعلیمی مراحل سے گزرا جس کا ذکر "خاندان انیس کا غیر رسمی نصاب تعلیم" میں تذکرہ کیا ہے اور جس کو میں نے جدید انداز میں منظم کرنے کی کوشش کی ہے اس زمانے میں مطالب کو ذہن نشین کرنے کے طریقے سلیٹ اور لکڑی کی تختی پر تحریری مشق بار بار زبانی دہرانا یا کسی بزرگ کی مدد سے دہرانا ہوتا

تھا۔ اس زمانے میں جو اہم بات تعلیم کی اساس تھی وہ انفرادی دلچسپی تھی اس زمانے میں شاگرد اور استاد کا رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے میرے اندر شاعری کی روح پھونکنے میں بڑے ماموں کا بڑا ہاتھ تھا اور اس کو پروان چڑھانے میں امی کا بہت ہاتھ تھا۔ البتہ خوشخطی ابا سے سیکھنے کا موقع ملا۔ وہ لکھنؤ کے مشہور کاتب محمد نواب کے بیٹے تھے۔ بڑے ماموں نے ... مجھے اور اپنے بیٹے اصغر حسین شائق کو مرثیہ پڑھنا سکھایا تھا۔ مرثیے کے مطلعے یہ تھے۔ ؎

ع : رن میں افلاک امامت کے قمر آتے ہیں

ع : آئینہ ہے جو ہر مری شمشیر زباں کا

فائق صاحب مرحوم کی پیش خوانی کبھی میں کرتا تھا اور کبھی اصغر میری پہلی پیش خوانی پر انھوں نے ایک رباعی کہہ کے ہمیں دی تھی جسے میں نے پڑھا۔

بستہ لیے منبر پہ میں چڑھ جاتا ہوں
طوطے کی طرح یاد ہے میں پڑھ جاتا ہوں
علم آتا نہیں پڑھ لینے سے ایسے لوگو
نا سمجھی ہی نا سمجھی میں کہہ جاتا ہوں

میں نے خاندان انیسؔ کی غیر رسمی تعلیمات کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے وہ انھیں بزرگ کا فیض ہے۔ انھوں نے میرے اندر جراثیم شاعری ڈالے اور مجھے تحت اللفظ خوانی کی تربیت دی حالانکہ مجھے لگتا ہے کہ میں خود رو شاعر بنا۔

خاندان انیسؔ میں بچّوں کی تعلیم و تربیت کی نہج

جب میں نے میر انیسؔ ہاؤس میں آنکھ کھولی اور پھر ہوش سنبھالا تو لکھنوی تہذیب کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا جو کچھ تقدس باقی رہ گیا تھا وہ بڑے ماموں یعنی فائقؔ صاحب کی وجہ سے تھا وہ ہر لحاظ سے جانشین انیسؔ و عارفؔ تھے اور قدریں بدل رہی تھیں اور مالی مشکلات کے باوجود وقار خاندان برقرار رکھے ہوئے تھے کوچۂ میر انیسؔ اس وقت بھی برائی اور بھلائی کا سنگم تھا۔ لکھنؤ کا بازار حسن پیدل چند منٹ کے فاصلہ پر تھا۔ ہم لوگ اسکول بھی جاتے تو چوک میں ہو کر گزرنا پڑتا تھا اور وہیں کوٹھے اور اس کے مکین نظر آتے اور رستے میں دلّال مصروف عمل رہتے تھے۔ کوٹھوں کے نیچے دو رویہ مختلف دکانیں تھیں۔ اسی چوک میں ایک مسجد تحسین علی خاں تھی جو بلندی پر واقع تھی۔ اس کی پشت پر امام باڑہ جنت مآب سید تقی صاحب تھا۔ چوک فی زمانہ   کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو چار رستوں کا سنگم ہوتا ہے جبکہ لکھنؤ کا چوک ایک طویل سیدھی سڑک تھا جس کے دو رویہ عمارتیں تھیں۔ کوچۂ میر انیسؔ دو جگہ پر ملتا تھا۔ کوچۂ میر انیسؔ کی آبادی مخلوط تھی اور متعدد مساجد اہل سنت کی بھی تھیں مثلاً مسجد سوداگران جسے سوداگر کے خاندان والوں کے کلکتہ چلے جانے کے بعد کیلے والی مسجد کہا جانے لگا۔ اسی سوداگر کی دختر وہ مہ جبین تھی جس کے لیے نواب مرزا شوق لکھنوی نے اپنی مثنوی "زہر عشق" میں نظم فرمایا ہے۔ ؎

جس محلہ میں تھا ہمارا گھر
وہیں رہتا تھا ایک سوداگر
ایک دختر تھی اس کی ماہ جبیں
شادی اس کی نہیں ہوئی تھی کہیں

دونوں مسلک کے ماننے والوں میں باہمی احترام تھا اور دونوں مل جل کر رہتے تھے۔ شرفاء اور با اصول لوگوں کی عزت جو آج کے معاشرہ میں مفقود ہوتی جا رہی ہے وہ موجود تھی۔ اچھائی اور برائی کے سنگم پر بچوں کی تربیت و تعلیم بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ اس تربیتی اور تعلیمی نظام کے کچھ بنیادی ستون تھے.....

(۱) اعزا اور اقارب ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور ایک وسیع و عریض   تربیت دیتے تھے۔ جس پر خاندان کے تمام بچوں کی تربیت کی ذمے داری تھی، مثلاً کوئی بڑا کسی بچے کو غلط بات پر ٹوک سکتا تھا اور والدین اس کا برا نہیں مانتے تھے۔ یہ صورتحال آج سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے سارا تربیتی بار والدین پر ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ذمّہ داری T V کو سونپ دیتے ہیں جو سخت مخرب اخلاق ہو سکتی ہے۔

(۲) اہل محلہ کو بھی یہ حق حاصل تھا کہ وہ بچہ کو ٹوک سکیں۔ اس کی

اصلاح کرسکیں اور ورد الدین کو کسی سنگین غلطی کی اطلاع دے سکیں نتیجتاً بچے اہل محلہ کی تنقید سے زیادہ خائف رہتے تھے۔ یہ طریقہ کار بچوں کی عمومی نگرانی کے لیے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ میر انیس ہاوس علاقے میں اس لیے بھی ممتاز تھا کیونکہ یہاں سے اہل محلہ اور ضرورتمندوں کی مالی، طبی اور تعلیمی اعانت بھی ہوتی تھی یہ سلسلہ حضرت میر عارفؔ کے زمانے تک چلتا رہا۔

(۳) بچوں کی انفرادی نگہداشت بھی اہمیت کی حامل تھی مثلاً بغدادی قاعدہ اور بعد قرآن مجید، کی تدریس، اس کے بعد مدرسہ یا اسکول میں داخلہ سے پیشتر خصوصی اساتذہ یا بزرگ اہل خانہ کی زیر نگرانی ہوتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم گھریلو ہوا کرتی تھی اور انھیں پڑھانے والیاں ہوتی تھیں لیکن ان کی گھریلو تعلیم میں بڑی گہرائی ہوا کرتی تھی۔ خاندان انیسؔ کی خواتین گفتگو کے دوران فارسی اور اردو اساتذہ کے اشعار ضرورت کے وقت پیش کرتی تھیں۔ بچوں کو پڑھانے والی آنے والی مستورات بھی تربیت دینے میں ملکہ رکھتی تھیں۔ بچیاں عملاً سب کام سیکھتی تھیں مثلاً کھانا پکانا، سلائی، کڑھائی، خوشنویسی جس کو سکھانے کے لیے مولوی بڈھن صاحب جیسے ذی علم بزرگ مقرر تھے۔ انھوں نے میرے گھر کی تمام نوعمر لڑکیوں کو اس فن سے بھی آگاہ فرمایا۔

(۴) ولادت کے فوراً بعد گھر کا کوئی بزرگ نوزائیدہ کے کانوں میں اذان واقامت کہتے تھے۔ اس کے بعد بچے کے گلے میں نظر بد کا سیاہ دھاگا اور دعائے ام الصبیان ڈالی جاتی حتی الامکان مائیں اپنا دودھ پلاتیں۔ چھٹی اور ختنے کی رسوم سادگی سے ادا ہوتے۔

(۵) بچپن سے ہی بچوں کو زبانی مشق کے لیے صاف بولی اور سنائی جاتی۔ بچکانی بولی نہیں بولی جاتی تھی ہو سکتا ہے کہ یہی وجہ تھی کہ وہ بچے میر انیسؔ ہاؤس میں پلے بڑھے ہوں وہ تتلاتے نہیں تھے گھر کے بچوں سے ان کے بزرگ افراد 'آپ' اور 'جناب' سے بات کرتے تھے۔

(۶) بچوں کو سلانے کے لیے لوریاں اور داستانِ امیر حمزہ کی کہانیاں سنائی جاتی تھیں۔ یہ کردار سازی کا کام کرتی تھیں۔ یہ کام بڑے بوڑھے یا بڑی بہنیں کرتیں اس میں محمدؐ، آل محمدؐ اور بہادروں، عالموں اور اہل خاندان کے قصے سنائے جاتے تھے۔

(۷) بچوں کو پڑھاتے وقت پنجتنؑ، اماموں، معصوموں، نبیوں کے نام اور ان کی تعداد سکھائی جاتی۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، سورۂ حمد چھوٹے سورے، رباعیات، قطعات، اچھے اشعار زبانی سکھائے جاتے اور انھیں پڑھوا کر بچوں کو داد دی جاتی۔ اسی طرح آداب کرنا سکھایا جاتا، مصافحہ کرنا، خیریت پوچھنا سکھایا جاتا۔ لکھنؤ کی تہذیب میں سلام علیکم کہنا سمجھا جاتا۔ زیادہ تر آداب عرض کرنا یا تسلیم کہا جاتا۔ پہلا فقرہ مردوں سے مختص تھا جبکہ دوسرا عورتوں سے۔ دونوں میں سیدھے ہاتھ سے علیکم اشارہ بھی کیا جاتا تھا۔ اس کی منطق تھی کہ غیر مسلم کو سلام نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں آکر سلام علیکم کی عادت پڑی تو ایک بزرگ جو لکھنؤ سے آئے تھے مجھے سلام علیکم پر ٹوکا اور کہا تمہیں تمیز نہیں۔

(۸) بزرگ جب نماز پڑھنے جاتے (گھر یا مسجد میں) تو بچوں کو اپنی جانمازوں کے پاس بٹھاتے اور نماز پڑھنا سکھاتے پہلے دو رکعت پھر اور زیادہ ...... جب بچے خود پڑھنا شروع کر دیتے تو ان کی نگرانی کی جاتی، میری والدہ نماز نہ پڑھنے پر کھانا نہیں دیتی تھیں۔ اور علی الصبح اٹھنے کا حکم تھا۔

(۹) جسمانی نشو ونما کے لیے پہلو، کرکٹ، فٹ بال، اونچا نیچا، اکڑ بکڑ، سیون ٹائم، کبڈی، بیڈ منٹن، رسہ کشی، پنجہ لڑانا، کلائی لڑانا، لکڑی کا چلانا وغیرہ کھیل تھے۔ لیکن وہ گھروں کی چہار دیواری میں کھیلے جاتے تھے جس میں بزرگوں کی نگرانی رہتی تھی۔ یہ پابندی، بھی تھی کہ مغربین کی نماز تک یا اس کے بعد گھروں میں آجائیں بڑے لڑکے کھیل کود کے بعد نماز مغربین پڑھ کر اپنے اپنے گھر واپس آتے تھے۔ بہت سے نوجوان لڑکے مسجد کے خادم کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔

تربیتی و تعلیمی مراحل

(۱) چھ سال کی عمر تک بالعموم اپنے کلونے خود تخلیق کرتے اس

لیے اس زمانے میں مٹی کے گھروندوں کے سوا کچھ نہیں ملتا تھا وہ پالتو
جانوروں میں دلچسپی لیتے۔ دوڑ بھاگ کرتے نماز پڑھنے کی مشق کرتے
رات کو سوتے وقت بزرگ مردوں اور عورتوں سے کہانیاں لوریاں
اور پہیلیاں سنتے اور سو جاتے تھے۔

چھ سال کی عمر کے بعد رسم بسم اللہ ہوتی جس کی بہت اہمیت ہوتی
بسم اللہ پڑھانے کی سعادت کسی عالم دین یا اہل خاندان میں کسی
بزرگ کو حاصل ہوتی تعلیم **بغدادی قاعدہ** سے شروع ہوتی
جس میں عربی، حروف تہجی کی پہچان، ساحت، ترتیب وغیرہ سکھائی جاتی
ساتھ ہی ساتھ **گلستاں، بوستاں، نامکدنامہ**، فارسی
کی ابتدائی کتب پڑھائی جاتیں جس کے ذریعہ فارسی اور اردو رسم الخط
سے روشناس ہو جاتی۔ تختی یا سلیٹ کے ذریعہ حروف ملا کر الفاظ
بنانے اور اردو زبان کے ہجے کرنے کا طریقہ سکھایا جاتا۔ یہاں سے
خوشخطی کی تربیت دی جاتی اور حروف کے جوڑ ملانے کی تربیت ملتی
اس کے ساتھ ہی قرآن کی تعلیم شروع کی جاتی پہلے پارہ سے شروع
کرنے کے بجائے پارہ عم یعنی تیسویں پارے سے تعلیم شروع کی جاتی
اور نمازمیں پڑھے جانے والے سوروں کو یاد کرایا جاتا۔ اس پارے
سے پڑھائے   زیادہ
ہوتا پھر پہلے پارے سے پڑھایا جاتا اس وقت تک جب تک قرآن
مکمل نہ ہو جائے۔ دعائے ختم قرآن میں کسی حد تک دھوم دھام ہوتی۔

(۳) اسی مرحلہ کے بعد ہی بچہ آئندہ کی تعلیم کی تیاری کرتا تھا انگریزی
تعلیم کے نفاذ سے قبل بچے خاندانی مدرسہ علویہ میں داخل ہوتے جس میں
وہ عربی، فارسی، اردو زبانیں، فلسفہ، منطق، ادب، تاریخ، مذہبیات،
کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اسی دوران لڑکے کو کسی اچھے شاعر کی نگرانی
میں دے دیا جاتا۔ لڑ کا گھر میں بیت بازی، شعر گوئی اور مرثیہ خوانی کی
تربیت حاصل کرتا تھا پورے نظام میں متفوق
بننے اور خود اعتمادی پیدا کرنے میں مدد دی جاتی تھی۔

(۴) انگریزی نظام تعلیم میں جانے والے طلباء یہاں سے اسکول کے
نصابی مضامین میں پرائیویٹ ٹیوشن سنٹر میں مہارت حاصل کرتے
تھے پھر وہ اسکول کا امتحان دے کر براہ راست حسب لیاقت اسکول
کے مناسب درجہ میں داخل ہو جاتے تھے مثلاً میرا داخلہ ایک سال ماسٹر
عابد حسین کے اسکول میں پڑھ کر چھٹے درجہ میں ہو گیا اور جو وقت
کنڈر گارٹن اور مانٹو سری میں ضائع ہوتا ہے بچ گیا اور میں نے
بڑی آسانی سے پانچ سال میں میٹرک کر لیا۔

(۵) لڑکیوں کے لیے بھی مدارس تعلیم تھے لیکن ان کے لیے تعلیم خواتین
دیتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ امور خانہ داری کی تربیت ملتی رہتی تھی لڑکیوں
کی تعلیم کا مقصد یہ ہوتا کہ وہ اچھی بیوی اور اچھی ماں بن سکیں لڑکیوں
کی ملازمت کرنے کا تصور نہیں تھا۔ بعض خواتین شاعرائیں اور
ادیبائیں بھی تھیں لیکن زیادہ تر انگریزی اسکولوں سے دوچار
نہیں تھیں۔ بہت سی خواتین نے پرائیویٹ میٹرک اور منشی فاضل کے
امتحان پاس کئے۔ میرے منجھلے ماموں سید محمد ہادی صاحب لائق کی
بیٹی ڈاکٹر حبیبہ بانو نے شادی کے بعد حکیم آغا جان عیش دہلوی معاصر غالب
پر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ پروفیسر
سید شبیہ الحسن نونہروی کے ماتحت تیار کیا گیا۔ حبیبہ بانو سید نائب حسین
نقوی امروہوی کی بیوی ہیں اور اب نوئیڈا دہلی میں آباد ہیں۔ ڈاکٹر
حبیبہ بیگم عمر میں مجھ سے چھوٹی ہیں۔

(۶) بچوں کا شین، قاف درست کرنے اور ان کی زبان پر صیقل کرنے
کے لیے کچھ طریقے استعمال ہوتے تھے اس میں سے چند نمونے
پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے اوزان اور تقطیع سکھائی جاتی تھی۔

(الف) آدق دُقم دُقم قم قم دُقم دُق
آلق لقم لقم لقم قم لقم لق
عاشق شقم شقم شقم قم شقم شق
آدق دُقم دُقم دُقم قم دُقم دق
اے نرگس بستان چمن نرمی شو

(ب) چھ ماشے شکر۔ چھ ماشے سونف

(ج) اونچی پیٹ اونٹ کی
کچھ اونٹ کی اونچائی سے نہیں
آپ ہی اونچی، پیٹ اونٹ کی

(د) ایک تولا لی لالی کی

دو بچھے لالی رنگ کی
تیجھے لالی میں دیکھوں
رانی نیچے تخت کے
میرا جینے والا ڈولا
یہ بالعموم رات کو رٹوایا جاتا تھا

(۵) بر تنع سیت نایے میں، وہ دُھم سے گر پڑی
(و) آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری
(ز) لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ

سید محمد ہادی لائق فرماتے تھے کہ جس نے متذکرہ گردانیں رٹ لیں وہ پھر اردو پڑھنے میں کہیں پر اٹکے گا نہیں۔

(۷) تختی لکھنے کے لیے صرف حروف کی بنیادی ساخت کی مشق کرائی جاتی مثلاً ب ج اور انھیں مختلف حروف میں بدلنے کے لیے نقطے اور ط وغیرہ ڈالے جاتے تھے۔

(۸) حروف لفظ کے شروع، درمیان یا آخر میں آتے ہیں حرف کی تبدیل شدہ ہیئت کو شوشہ کہتے ہیں۔ ان کے جوڑ ملانا اردو، فارسی اور عربی لکھنے کا ایک اہم مرحلہ ہے اس کو مربوط جدول میں پیش کیا گیا ہے۔

(۹) نئے الفاظ کی تکمیل کے لیے کاپیاں بنوائی جاتی تھیں جس کا نمونہ جدول میں دیا گیا ہے۔

(۱۰) خواندگی کے لیے تین جز و اہم سمجھے جاتے تھے جنھیں (3Rs) کہتے تھے اس کے معنی تھے پڑھنا، لکھنا اور حساب کرنا۔ سننے کی مشق تو بچہ ماں کی گود سے کرتا ہے۔ پڑھنا لکھنا وہ بعد میں سیکھتا ہے بچے اور حساب سکھانے کے لیے لکھنؤ میں تعلیمی تاش استعمال ہوتے تھے اس سے حرام تاشوں (انگریزی) سے وہ بچ جاتے تھے اور وہ الفاظ سے بچے اور ان کی قیمت لگانا سیکھ لیتے تھے تاشوں کی تعداد ۲۸ ہوتی تھی اور ان پر حروف اور ان کی قیمت لکھی ہوتی تھی جو علم اعداد (نظام ابجد) میں ہوتی تھی جفر میں استعمال ہوتی تھی۔ دیکھیے جدول ۲

ان تاشوں کے ذریعہ بچوں کو ایک مشغلہ مل جاتا تھا اس میں بڑے بھی شامل ہو سکتے تھے بچوں کی تصحیح ہوتی تھی۔ جمع، تفریق، ضرب، تقسیم کی مشق ہوتی تھی اور یہ علم اعداد کی ابتدائی ٹریننگ اور "تاریخ" کہنے کی بھی مشق ہوتی تھی تعلیمی تاش تو آج متروک ہو گئے لیکن انگریزی کا ایک کھیل نکل آیا ہے جسے

جدول ۱

گنتی اور اس کی زبانی و تحریری تعلیم

منتر اور زبانی گنتی کی مشق اور اشارے

[illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	۱	(ایک)
اِکّی دُکّا	۲	(دو)
اِکّی دُکّی [illegible]	۳	(تین)
[illegible]	۱	(ایک)
[illegible]	۲	(دو)
[illegible]	۳	(تین)
[illegible]	۵	(پانچ)
[illegible]	۱۲	(بارہ)
[illegible]	۱۴	(چودہ)
[illegible]	۳۰۰۰۰	(ایک لاکھ [illegible])

گنتی کی زبانی اور تحریری تعلیم

گنتی	شماری اعداد	ترتیبی اعداد
۱	ایک	پہلا
۲	دو	دوسرا
۳	تین	تیسرا
۴	چار	چوتھا
۵	پانچ	پانچواں
۶	چھ	چھٹا
۷	سات	ساتواں
۸	آٹھ	آٹھواں
۹	نو	نواں
۱۰	دس	دسواں

کافی لوگ کھیلتے ہیں اس کی نہج تعلیمی تاش سے ملتی جلتی ہوتی ہے۔

(۱۱)

گنتی میں اعداد کے ساتھ اور
زبانی سکھائے جاتے جیسا کہ جدول میں دئے گئے ہیں
مثلاً

اللہ ایک (۱) رسولؐ ایک (۱)

پنجتن پانچ (۵) اِمامؑ بارہ (۱۲)

پہلے امامؑ دوسرے امامؑ بارہویں امامؑ

ایک لڑکا دو لڑکے

جدول ۲

حروف لفظ کی ابتدا، وسط اور آخر میں آ سکتے ہیں وہاں پر شکل تبدیل کرتے ہیں۔ ان شکلوں کو شوشے کہتے ہیں جو جلی دکھائے گئے ہیں۔ ہر شوشے والی [illegible] سے باہم ملائے جاتے ہیں، رموز تکمیل [illegible]۔

حروف تہجی	ابتدا	وسط	آخر
ا	آ ا	ـا ـا	ـا ـا
ب پ ت ٹ ث ن ی سے	بـ	ـبـ	ـب ن ی سے
ج چ ح خ	جـ	ـجـ	ـج ـچ
د ڈ ذ	د	ـد	ـد
ر ڑ ز ژ	ر	ـر	ـر ـڑ
س ش	سـ	ـسـ	ـس ـش
ص ض	صـ	ـصـ	ـص
ط ظ	ط	ـط	ـط
ع غ	عـ	ـعـ	ـع ـغ
ف ق	فـ	ـفـ	ـف ـق
ک گ ل	کـ	ـکـ	ـک ـگ ـل
م	مـ	ـمـ	ـم
ن	نـ	ـنـ	ـن
ہ	ہـ	ـہـ	ـہ
ھ	ھـ	ـھـ	ـھ

علی اسد دانش
9839181230

واجد علی شاہ اور میر انیس

غدر ۱۸۵۷ء

لکھنؤ بقول مصنف 'مرقع خسروی' شیخ محمد عظمت علی صاحب کاکوروی یہ باغوں کا شہر تھا۔ حضور باغ، حضرت باغ، عالم باغ، بنارسی باغ، سکندر باغ، وزیر باغ، موسیٰ باغ، نصرت باغ، نظر باغ، انگوری باغ، بندریا باغ، شالامار باغ، قیصر باغ، عیش باغ جہاں کا عالم یہ تھا کہ وہاں ایک موتی جھیل بنائی گئی تھی جس میں مختلف قسم کی رنگین مچھلیاں پالی گئی تھیں۔ اس کا پانی نہایت صاف شفاف رہتا تھا، اس باغ میں انواع واقسام کے پھل اور پھولوں کے درخت لگائے گئے تھے اس میں نارنجیاں، چیکو، لیچی، ترنج، طرح طرح کے نیبو اور قسم قسم کے آموں کے درخت لگے ہوئے تھے ہر پیڑ پر ایک مالی مقرر تھا جو اس میں پانی دے اور زرد پتیاں اٹھا کر پھینکے۔ وہاں کا ہر درخت تراش کر ایک سا بنایا گیا تھا۔ وہ صرف اس لیے کہ اگر کبھی شہزادے اور شہزادیاں یہاں گھومنے کے لیے تشریف لے آئیں اور وہ کسی درخت کا پھل توڑنا چاہیں تو انھیں اسے توڑنے میں زحمت نہ ہو۔ وہاں قیام کے لیے جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ لب سڑک یہاں آنے کے لیے ایک وسیع دروازہ تھا جس کے اوپری حصے میں دونوں جانب شیر بیٹھے ہوئے تھے جن کے منہ کھلے ہوئے تھے اور ان کے منہ میں طوطے بیٹھے ہوئے یہ صدا دے رہے تھے کہ 'خدا یا بادشاہ سلامت کو شاد و آباد رکھے' سالے

بادشاہ کو کبوتروں اور طرح طرح کی چڑیاں پالنے کا بیحد شوق تھا قیصر باغ میں جہاں ان کا پری خانہ تھا ویسے ہی ان کا چڑیا خانہ بھی تھا وہ روزانہ صبح کو جب ٹہلنے کے لیے باہر آتے تو اس طرف بھی چلے جاتے تھے۔ ایک دن حسب عادت جب وہاں گئے اور انھوں نے اپنی پسندیدہ مینا جس کا انھوں نے مخصوص نام رکھا تھا پکارا۔ اس کا کوئی جواب نہ آیا وہاں کے محافظ سے کہنے لگے شاید کچھ علیل ہو گئی ہے۔ آپ اس کی طرف توجہ دیجیے۔ نوکر کا برا حال ہو گیا جب حضور وہاں سے تشریف لے گئے تو وہ فوراً تحسین گنج گیا جس کے ہاتھ اس نے بیچا تھا اس سے پورا ماجرا بیان کیا اور کہا بھائی میری آبرو بچالو' اس نے فوراً پنجرا سمیت مینا واپس کر دی۔ وہ اسے پوشیدہ کرکے در دولت پر لے آیا اور اسے اسی جگہ پہ چھوڑ دیا جب اسے اپنی جگہ دکھائی دی تو وہ فوراً آوازیں نکالنے لگی۔ اس کی آواز بادشاہ تک پہنچ گئی اور وہ خوش ہو گئے......

حضور پرنور جان عالم محمد واجد علی شاہ نے جہاں مختلف عمارتیں بنوائی تھیں وہیں ۱۸۵۳ء میں ایک خوبصورت بارہ دری بھی بنوائی تھی اس کا نام محرم کا لحاظ رکھتے ہوئے 'قصر العزا' رکھا تھا۔ بقول مصنف 'گذشتہ لکھنؤ' جناب مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی

اس کی تعمیر پر انھوں نے ڈھائی لاکھ روپے خرچ کئے تھے۔ اس میں ضریح، علم ہائے طلا و نقرئی اور بیش بہا جھاڑ و فانوس سے آراستہ تھا۔ اس عہد کے مشہور شاہی خوشنویش میر قربان علی ساقی نے اس عمارت کی روکاری پر جو پتھر نصب کیا گیا تھا اس کی قطعہ تاریخ تعمیر مہدی علی خاں قبول نے بھی جس کی کتابت ساقی نے فرمائی۔ یہ پتھر وہاں موجود تھا جو گردش زمانہ کی نذر ہو گیا۔ قبول کی تاریخ تعمیر کے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

یہ قیصر باغ در قصر العزا، از نیت خالص
شروع اساس کردہ شاہ ہندوستاں عزاداری
بسر در حیدت اسباب ماتم کردہ روز و شب
بہ بین انیست اے دل بادل باجاں عزاداری
بنا مادر نظر مانند ایں سنگیں عزا خانہ
ندیدہ ہیچ کس باچشم خود زنیہاں عزاداری
چوں رونق داد از دل شاہ بہر ایں عزا خانہ
شدہ مقبول شاہنشاہ مظلوماں عزاداری
دعائیہ قبول ایں مصرعہ تاریخ ہاتف گفت
کند تا یک صد و سی سال ایں سلطان عزاداری

۱۸۵۳ء / ۱۲۷۰ھ

موسم بہار میں قیصر باغ میں ایک میلے کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک روایت مشہور ہے کہ بادشاہ کی والدہ معظمہ ملکہ کشور صاحبہ نے ان کی چھٹی کے موقع پر انھیں، جوگیا زیباسن پہنایا تھا جس کی سالگرہ وہ بطور منت مناتی تھیں یہ سلسلہ تین دن تک قائم رہتا تھا اس میں تفریحی مشاغل تماشے اور دلچسپیوں کا سامان بھی شامل تھا۔ ان تمام میلوں میں ہندو سنی اور شیعہ سب شریک ہوتے تھے۔ گرمی کے زمانے میں ملکہ معظمہ وادی کشمیر چلی جاتی تھیں ان کے ساتھ ان کے اہل خانہ بھی ہوتے تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں کشمیر کے ہندو اور مسلمانوں کو لکھنؤ میں لاکر بسایا کشمیر محلہ اسی زمانے کی یادگار ہے جہاں ایک سے ایک ذی علم پنڈت شعراء آباد تھے چکبست اسی خاندان کی اک یادگار تھے۔ اس کے علاوہ بشن نرائن در آبر، تمنا افق اور شرغا اسی رنگا رنگ تہذیب کے پروردہ تھے۔

لکھنؤ کی یہ اتحاد و یگانگت ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں کو پھوٹی آنکھ نہ بھاتی تھی اس لیے انھوں نے مختلف قسم کے مذموم، من گھڑت واقعات ان سے منسوب کئے اور ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے اور حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے تاریخ اودھ مصنفہ سید کمال الدین حیدر ان کے انتقال کے بعد تحریف کرکے شائع کی گئی کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

ولادت ۱۸۰۳ء ..... وفات ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء
مدفن — چوبداری محلہ، چوک لکھنؤ

ریزیڈنٹ کرنل اوٹرم کی فہمائشوں اور دستور المعظم نواب علی خان بہادر کی پر زور تائید کے باوجود انھوں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا اوٹرم نے صلاح مشورہ کے لیے بادشاہ کو پھر بھی تین دن کی مہلت دی یہ تین دن ۷ فروری ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۲ھ کے تھے جب انھیں معزول کر دیا گیا۔ کسی شاعر نے معزولی کا یہ مصرعہ نکالا ع

لکھنؤ شد خراب و اویلا[۱۰]

جان عالم اختر کو کانپور، الہ آباد، گوپی گنج کے درمیان جس جس جگہ چھاؤنی سے گزرے انھیں سلامی دی گئی۔ کانپور سے روانگی کے قبل بنارس کے مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر کی عرضداشت جناب منورالدولہ کی معرفت نظر اقدس سے گزری کہ مُجِب خیر طلب موروثی ہے اور اسی خاندان کا ممنون قدیمی ہے مرحمت خسروانی کا امیدوار ہے کہ حضور بنارس میں املاک خیر اندیش میں رونق افروز ہوں ...[۱۱]

۱۶ر اپریل ۱۸۵۶ء مطابق ۹ر شعبان کو بنارس کی چھاؤنی سکرو رمیں مہاراجہ بنارس کی کوٹھی میں رونق افروز ہوئے مہاراجہ نے بادشاہ کا استقبال اور ان کے قیام کا اہتمام جس خوش اسلوبی سے کیا تھا اس کا بادشاہ نے اپنے منظوم خطوں میں بھی کیا ہے ؎

ایک راجا ملا وہ نیک	لاکھ راجاؤں میں تھا راجا ایک
ایسی خاطر ہماری کی اس نے	آتے ہی ہم کو نذر دی اس نے
کشتیاں پیش کیں جواہر خوب	سب قرینے سے اور با اسلوب
پانچ سو روپئے برائے نثار	بہر دعوت بھی بھیجے سات ہزار
خوب کوٹھی سجی سجائی دوست	چاق ہو ہو گئے وہاں سب سست

پندرہ روز ہم اس جا
ایک میلا تھا، اک تماشا تھا[۱۲]

وہ پندرہ دن وہاں مہمان رہے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ وہ جس کوٹھی میں ٹھہرائے گئے وہاں کے کمرے کی ہر کھڑکی پر خس کی ٹٹیاں لگوائی گئی تھیں۔ راجا صاحب بادشاہ کے پاس آئے اور سلام عرض کرنے کے بعد کہا۔ آپ کو یہاں کیسا لگا، ان کی قوت شامہ کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے جواب میں کہا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کمرے کی مشرقی جانب جو کھڑکی ہے اس میں ایک سال پرانی خس لگا دی گئی ہے۔ راجا نے جب یہ سنا تو حیران رہ گئے اور

واجد علی شاہ کا عزاخانہ قصرُ العزاء جسے اب عام طور پر بارہ دری کہا جاتا ہے

اپنے مصاحب خاص کو بلا کر اس سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ بات پیچ ہے۔ وہ ٹٹی فوراً ہٹا دی گئی اور دوسری نئی ٹٹی لگوا دی گئی ... وہ وہاں کے قیام کے بعد رمضان المبارک ۱۲۷۲ھ / ۱۲ر مئی ۱۸۵۶ء کو کلکتہ پہنچ گئے۔ شدید گرمی، جسمانی تکلیف، روحانی صدمہ برداشت نہ کر سکے سخت بیمار ہو گئے۔ لندن کے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔"[۱۳]

اس سلسلہ میں مشہور ادیب و شاعر شیریں بیان جناب ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی ڈائرکٹر آف تعلیمات اپنی کتاب "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" میں رقم طراز ہیں۔

"لکھنؤ تقریباً ڈیڑھ سو سال تہذیب و ثقافت کے میدان میں ہندوستان کی سربراہی کا فریضہ انجام دیتا رہا۔ سارے ملک میں وہ اپنی نوعیت کا واحد شہر تھا جس میں صبح بنارس کی تازگی، شام اودھ کی ملاحت اور شب مالوہ کی دل کشی کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔"[۱۴]

جب وہ اس ہندوستانی تہذیب و تمدن کے اس گہوارے کو چھوڑ کر

جانے لگے تو اپنا درد دل اس انداز سے بصورت تضمین کہا۔

شب دا ندوہ سے رو رو کے سحر کرتے ہیں
دن کو کس رنج و تردد سے بسر کرتے ہیں
نالہ و آہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

دوستو شاد رہو تم کو خدا کو سونپا
ہم نے اپنے دل نازک کو جفا کو سونپا
قیصری باغ ہے جو اس کو صبا کو سونپا
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

سارے اب شہر سے ہوتا ہے یہ اختر رخصت
آگے بس اب کہنے کی ہمیں ہے فرصت
ہو نہ برباد میرے ملک کی یارب خلقت
در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں [۸]

جان عالم اختر نے جس گلستاں کو سجایا سنوارا تھا وہ اس کی بربادی اپنی آنکھوں سے کیسے دیکھتے اور اپنی اس وفادار رعایا کو کیوں تباہ و برباد کر دیتے ایک شریف النفس انسان سے تو اس بات کی امید رکھنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں لہٰذا انھوں نے عافیت اسی میں سمجھی کر وطن سے دور عالم غربت میں بسر کر لو۔ راتوں کا چین بچ دو۔ یہاں کی گہما گہمیوں کو فراموش کر دو لیکن یہاں کے عوام اور معصوم بھولی صورتوں کے بچوں جس میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان کا خون نہ سہی اپنی آنکھوں کے سامنے بہتے ہوئے نہ دیکھو۔

ان کی ایک بیوی حضرت محل بھی تھیں جن کا نام محمدی بیگم تھا۔ وہ میر غلام حسین صاحب فیض آبادی کی دختر تھیں۔ وہ اس زمانے کے بہترین فن سپہ گری کے ماہرین میں تھے یہی وجہ تھی کہ وہ نہایت بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ فنون حرب سے خوب واقف تھیں اس لیے انھوں نے بوقت جنگ انگریزوں کے چھکے چھڑا دئے تھے اور جنرل ہڈسن جس نے دہلی میں بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو قتل کیا تھا اسے لکھنؤ میں عالم باغ کے محاذ پر بڑی ترکیب سے گرفتار کر لیا اور اسے پھانسی دے دی گئی۔

حضرت محل صاحبہ جن کے جسم سے خوشبو آتی تھی۔ وہ بڑی مدبر، وسیع القلب، شفقت کرنے والی خاتون تھیں۔ تمام مذہبوں سے ان کا لگاؤ یہ سب ثابت کرتے ہیں کہ آج جس ہندوستان میں قومی یکجہتی، بھائی چارے اور اتحاد کی بات کرتے ہیں وہ بیگم حضرت محل کے طرز حیات کا ایک حصہ تھا۔ افسوس کہ پست ذہنیت کے مورخوں نے از راہ بدنیتی ایسی بے مثال کرداروں پر دھول ڈال دی ہے جان عالم نے ان کی صفات اعلیٰ کی بنا پر مہک پری کا خطاب بھی دیا ہے افسوس کہ اس مجاہدۂ آزادی کا ۷ اپریل ۱۸۷۹ء کو نیپال کی سرزمین کاٹھمنڈو میں انتقال ہوا اور ہندوستانی چوک کے پاس ان کی اپنی بنائی ہوئی مسجد اور امام باڑے کے احاطہ میں ان کو سپرد خاک کر دیا گیا [۹] انھوں نے اپنے حسب حال پہلے ہی یہ شعر سپرد قلم کیا گیا۔

لکھا ہوگا حضرت محل کی تحدیر
نصیبوں جلی تھی فلک کی ستائی [۱۰]

واجد علی شاہ اختر کے یہاں سے چلے جانے کے بعد یہاں کے باسیوں پر کیسا وقت پڑا وہ تاریخ اودھ سے متعلق کتابوں اور بعض باتیں علم سینہ کی بدولت ہم تک پہونچیں جو بہت دردناک ہیں۔ پورے اودھ میں ایک ہو کا عالم تھا۔ اب تو وہ چہچہے تھے نہ نغمہ و سرود کی جھنکار اس عہد کے شعراء نے شہر آشوب نظم کیے جو پڑھو تو دل ہل جاتا ہے۔ انیس کے فرزند نفیس نے کہا ہے

مقام ہو کا تھا جس جا نگہ مرتی تھی
حضور کے در دولت پہ خاک اڑتی تھی

یہ در دولت، قیصر باغ کا کچھ علاقہ تھا جسے انگریزی فوج نے نومبر ۱۸۵۶ء میں توپوں سے اڑا دیا۔ بقول سید محمد ہادی صاحب لائق جان آختر کی حکومت کے زمانے میں یہاں کے تمام پھاٹک بند کرا دئے

جاتے تھے اور رات کی تاریکیوں میں محافظوں کی جو آوازیں آتی تھیں وہ یہ تھیں یا علی حیدر… یا علی حیدر، جاگتے رہو جاگتے رہو…… جان عالم واجد علی شاہ کی حکومت کے زمانہ میں قیصر باغ کے تمام پھاٹک بند ہو جاتے تھے صرف ایک پھاٹک کھلا رہتا تھا جس سے وہاں کے منتظمین اور بادشاہ سلامت کے خاص لوگ آجا سکیں۔ جان عالم اختر جب یہاں سے کلکتہ لے جائے گئے تو میر انیس بیحد غمزدہ رہنے لگے اور اپنے کرب کا اظہار یوں فرمایا۔

الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ
انیس ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

میر انیس ہی پر کیا۔ اس زمانے کے وہ تمام شعرائے لکھنؤ جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر بادشاہ سے قریب تھے انھیں سخت صدمہ پہنچا انھوں نے اپنے سلاموں اور مرثیوں میں اس غیر متوقع انقلاب پر غم و اندوہ کا اظہار کیا۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں انیس نے اپنے سلام میں جس کا مطلع ہے

علی سا بھی نہ کوئی عادل زمانہ ہوا
کہ ایک باز و کبوتر کا آشیانہ ہوا

یہ انقلاب غضب کا ہے یا علی فریاد
کہ مسجدیں تھیں جہاں وہاں شراب خانہ ہوا

سیاہ دیدۂ شبیر میں زمانہ ہوا
ہوائے ظلم سے جب گل چراغ خانہ ہوا

امیر جس در دولت سے اک زمانہ ہوا
وہ گھر اجڑ گیا غارت وہ کارخانہ ہوا

مکاں رہے نہ مکیں طرفہ کارخانہ ہوا
زمیں الٹ گئی کیا منقلب زمانہ ہوا

عظیم مجاہدۂ آزادی بیگم حضرت محل صاحبہ

بڑھک کے راہ میں پیچھے کہیں نہ رہ جاؤ
اٹھو انیس اٹھو! کارواں روانہ ہوا[12]

اس سلسلہ میں سید محمد ہادی لائق کا بیان ہے کہ شاہ نجف سے لے کر تحسین گنج اور موسیٰ باغ تک ان تمام کوٹھیوں کو منہدم کر دیا گیا جن کے وارثوں پر انگریزوں کو شک تھا کہ انھوں نے ہماری مخالفت میں حضرت محل کا ساتھ دیا۔ میر انیس بھی اس غیظ و غضب کا شکار ہوئے۔ ان کا امام باڑہ جو موجودہ ہاتھی پارک کے سامنے تھا تاراج کر دیا گیا۔ علامہ اجل مفتی میر عباس صاحب قبلہ نے اس عزا خانہ کی تعمیر کے بعد طویل تاریخ کہی تھی جو ان کی کتاب 'تجلیات' میں موجود ہے۔

یکتائے عصر میر علی آنکہ مثل او
نے چشم چرخ دید نہ گوش جہاں شنید

آں سید انیس لقب عندلیب ہند
کاوصاف او توان ز ریش زمان شنید

آں ذاکرے کہ گفت سر منبر آشکار
رازے کہ جبرئیل بگردوں نہاں شنید

آں نغمۂ کہ سر نزد از طائران قدس
در حیرتم کہ بلبل گلشن جناں شنید

ہر جا کہ خواند مرثیہ از بام و در تمام
گر سنگ خارہ بود ازاں ہم فغاں شنید

غیر از زبان دل نتواند ثنا کشد
آنکس کہ نظم پاک وے از گوش جاں شنید

نازک دلے کہ ہر چہ بگفتند گوش کرد
اماں ز حال زار من ناتواں شنید
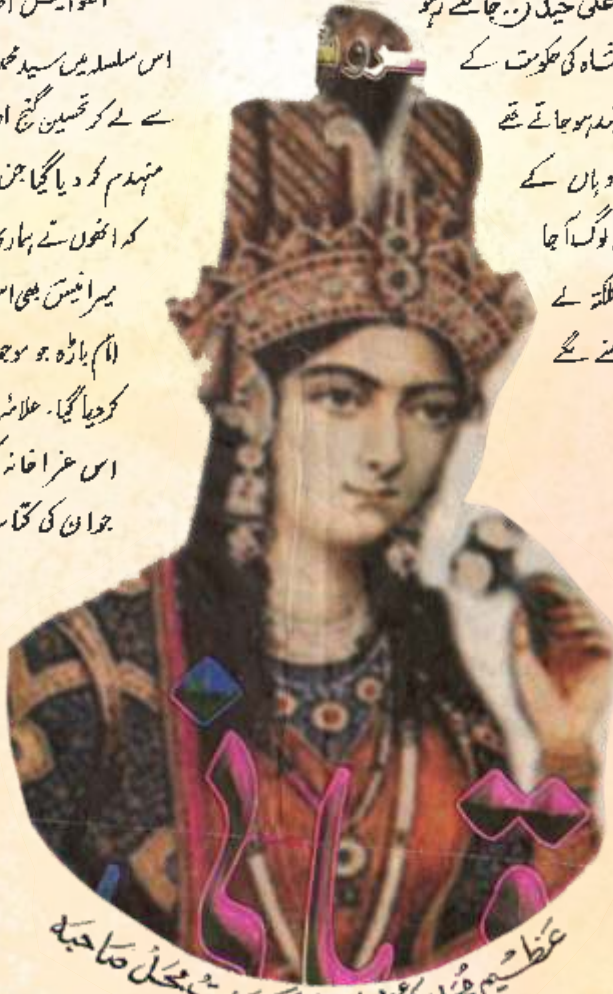
نشنید نیم حرف ہم از سرگذشت من
از دیگراں اگر چہ دو صد داستاں شنید

آوازۂ بنائے عزا خانہ کہ ساخت
در شش جہت فتادہ و ہفت آسماں شنید

معمار وقت صنعت ایں خانۂ عزا
شاید کہ بیتے از لب آں نکتہ داں شنید

ہر کس سر نیاز بر آں آستاں گذاشت
آواز خیر مقدم کرّو بیاں شنید

ہر ذرہ کہ بار دریں بارگاہ یافت
آیات نور خود ز شہہ خاوراں شنید

سید بہ ایں مقام رسید و بچشم دید
کیفیتے کہ از ارم و از جناں شنید

چوں بر ضریح پاک نگاہ من اوفتاد
آہے زدم کہ گوش سر آسماں شنید
سال بناش گشت رقم از سر الم
ایں جا مدام نالۂ زہرا تواں شنید
۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء [13]

انیسؔ کے اس امام باڑے میں بھی لوٹ مچی جس میں شیشہ و آلات آویزاں تھے وہ انگریزی فوج کے سپاہیوں نے سنگینیں مار مار کر توڑ دیئے لکھنؤ کے ہر گھر سے اس فریادی نوحے کی صدا آ رہی تھی

اے کل کے مددگار مدد کرنے کو آؤ۔ فریاد کو پہنچو
تم نے تو بہت معجزے لوگوں کو دکھائے
اک معجزہ بہر خدا ہم کو دکھاؤ۔ فریاد کو پہنچو [14]

لکھنؤ کے اس گلشن نو بہار کو انگریزوں نے خزاں رسیدہ بنا دیا۔ بارہ دری کا نہ جانے کتنا سامان عزاداروں کو چرالیا گیا۔ اس انقلاب نے زندگی کی مختلف قدروں کو متاثر کیا اور لکھنوی تہذیب و تمدن کے اس باغ کو ستمگارانہ سیاست سے تاراج کر دیا گیا۔ میر انیسؔ کی سب سے بڑی پوتی سیدہ کاظمی بیگم صاحبہ بنت میر نفیسؔ کا بیان ہے کہ "قلعہ مچھی بھون کو گولوں اور بارود سے گوروں نے اڑا دیا۔ اس کے پتھر کے ٹکڑے اڑ اڑ کر قریب ہی واقع امام باڑہ آغا باقر پر گرے جس سے وہ امام باڑہ اور سارا سامان عزاداری زمین میں دھنس گیا" یہ امام باڑہ بڑا وسیع تھا دھماکوں کی آوازوں سے اس زمانے کی عورتوں کے حمل اسقاط ہو گئے خود عارفؔ صاحب اپنی والدہ ماجدہ کی گود میں سہمے سے تھے۔

میر انیسؔ کے سب سے چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیسؔ گرفتار کر لیے گئے تھے۔ انیسؔ نے اسی زمانے میں وہ مناجات کہی جو آج تک مشہور ہے ؎

مبتلائے غم دل ناشاد ہے	منحرف چرخ ستم ایجاد ہے
یہ زمانہ بر سر بیداد ہے	آپ پر روشن مری روداد ہے
اب مدد کیجے دم امداد ہے	اے امیر المومنیں فریاد ہے

دیکھتا ہوں پیش و پس کوئی نہیں
آپ بن فریاد رس کوئی نہیں

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ایک پرستار جناب نواب آغا علی خاں عرف آغائی صاحب جو سیتاپور میں ناظم کے عہدے پر فائز تھے اور برٹش گورنمنٹ میں ان کے اثر و رسوخ تھے انھوں نے میر صاحب کے دکھ کو سمجھا اور اپنے اثرات کو بروئے کار لاکر میر سلیسؔ کو رہا کروالیا میر انیسؔ اپنے ایک سلام میں جس کا مطلع ہے ؎

ہے زباں پر مدح باغ علیؑ کے نونہالوں کی

اس میں موجودہ مطبوعہ مقطع کچھ اس طرح ہے

انیسؔ اب تو ہلال و بدر کا ہے مرتبہ یکساں
گھٹادی منصفوں نے منزلت صاحب کمالوں کی

لیکن سلیسؔ کی رہائی کے بعد انھوں نے اپنے متذکرہ سلام کے مقطع میں بطور ممنونیت ناظم صاحب کا ذکر اس طرح کیا۔

خدا آباد رکھے اے انیسؔ آغا علی خاں کو
اگر کچھ قدر ہے تو ان کے یاں صاحب کمالوں کی [15]

بارہ دری ایام عزا میں خوب سجائی جاتی تھی اور وہاں مرثیہ خوانی ہوا کرتی تھی جو اس زمانے کے نامور مرثیہ خواں میر احمد علی اور گوہر علی وغیرہ پڑھتے تھے۔ مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی داخلی و باطنی محاسن کا آئینہ بن گیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اودھ کے تمدن کا نام اس لیے باقی رہے گا کہ اس سے میر انیسؔ کا زندہ و جاوید کارنامہ وابستہ ہے اور انھیں کے عہد میں بیگم حضرت محل صاحبہ نے اپنے فرزند برجیس قدر کو واجد علی شاہ کا وارث قرار دے کر ان کی تاج پوشی کر دی اور وہ چھ مہینے ملک اودھ کے بادشاہ رہے۔ سکہ بھی جاری کیا گیا۔ اس حکومت کو بڑی بدنیتی کے ساتھ بنام غدر برباد کر دیا گیا۔ بارہ دری قیصر باغ کے قیمتی آرائش کے سامان جس میں حلب کے آئینے بھی تھے گورے باہر لاکر انھیں پھینک دیتے تھے وہ چور چور ہو جاتے تھے۔

بقول مولوی عبد الحلیم شررؔ لکھنوی وہ اپنی کتاب "گذشتہ لکھنؤ" میں رقم طراز ہیں کہ "لکھنؤ کی وہ مخدراتِ عصمت جو یہاں کے راستوں سے ناواقف تھیں حیران و پریشان سراپا برہنہ ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں [16] وہ حالات انیسؔ و نفیسؔ کے چشم دید تھے۔ انھوں نے ایک تاریخی مرثیہ نظم کیا جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

برباد وہ کشور ہے کہ سلطاں نہیں جس میں [17]

(غیر مطبوعہ) ۱۶۸ بند

اور میر انیس نے اس لٹے ہوئے لکھنؤ کے رہنے والوں کے دکھے ہوئے دلوں کی تسکین کے لیے ایک مرثیہ کہا جس کا یہ مطلع قرار دیا۔ ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ [18]

اس مرثیے کا اصل نسخہ میر انیس کے پوتے سید خورشید حسن صاحب عرف دولھا صاحب عروج کے پاس تھا جسے میر انیس، میر نفیس، دولھا صاحب عروج اور ان کے ایک شاگرد سید حسن رضا عرف چھمن صاحب نے تحریر کیا تھا۔ راجہ صاحب محمود آباد امیر احمد خاں محبوب جو دولھا صاحب عروج کے ارشد تلامذہ میں تھے فرمائش کی کہ مجھے میر صاحب کے ہاتھ کا تحریر کردہ کوئی مرثیہ مرحمت فرمادیں انھوں نے ان کی یہ دلی خواہش پوری کی اور یہ تاریخی مرثیہ انھیں دے دیا۔ اب یہ مرثیہ جناب مہاراجکمار امیر حیدر خاں حب کے ذخیرۂ مراثی میں موجود ہے۔ عرصہ ہوا یہ مرثیہ ایک دن انھوں نے راقم کو دکھایا تھا۔ مرثیہ ختم ہونے کے بعد میر انیس صاحب نے نواب سید مہدی علی خاں المعروف بہ آغا ابو صاحب کے ذی علم، صاحب زبان، صاحب دیوان بزرگوں کی مدح میں چند بند لکھے ہیں جس کی وجہ سے اس مرثیے کو خصوصی اہمیت حاصل ہو اس طرز خاص سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر صاحب، آغا ابو صاحب کے گھرانے کا حد درجہ احترام کرتے تھے اور ان بندوں سے اس شعر کی نفی بھی ہوتی ہے کہ دخیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہوکر۔

صرف ایک بند پیش قارئین کرتا ہوں ؎

یارب بحق احمدؐ و زہرا و مجتبیٰؑ یارب بحق خون شہیدان کربلا

نواب نامدار جو ہے بانی عزا باجاہ و باحشم پر سلامت ہے صدا

ہر حال میں عنایت مشکل کشا رہے

سر پہ ہمیشہ سایۂ دست خدا رہے

غدر ۱۸۵۷ میں میر انیس کے خاندان پر شدید زوال آگیا۔ لکھنؤ جو ان کے لیے عہد واجدی میں سرمایۂ افتخار تھا جہنم بن گیا۔ احباب نے سمجھا بجھا کر یہاں سے کہیں دور ہٹ جانے کا مشورہ دیا جسے نہ چاہتے ہوئے بھی انھوں نے قبول کرلیا اور یہ کہا ؎

اے خالق ذوالفضل و کرم رحمت کر

اے دافع ہر رنج و الم رحمت کر

سبقت ہے سدا غضب پہ رحمت کو تری

اپنی تجھے رحمت کی قسم رحمت کر [19]

اور ان ناگفتہ بہ حالات میں انھوں نے جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے اپنے دل کی بات بہ شکل رباعیات کہی ؎

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا

کیوں چرخ کہن آہ انیا دور ہوا

اب یاں سے کہیں دور چلو جلد انیسؔ

اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا [20]

کیوں کر نہ دل غمزدہ فریاد کرے

جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے

مانگو یہ دعا کہ پھر خداوند کریم

اجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے [21]

ورق الٹ گیا دنیا کا یک بیک کیوں چرخ

یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا

انھوں نے مجبوراً ملیح آباد کا سفر اختیار کیا جہاں فقیر محمد خاں گویا کے فرزند محمد احمد خاں احمد نے شرفائے لکھنؤ کے رہنے کا بندوبست کیا تھا۔ وہاں کے باغات میں راتوں کو سخت پہرہ رہتا تھا کیا مجال تھی کہ گورے ادھر کا رخ کر سکیں تین مہینے گیارہ دن کے بعد میر صاحب مع اہل و عیال لکھنؤ واپس آگئے اور اپنے ایک عزیز شاگرد مرزا عباس صاحب ساکن محلہ منصور نگر کے یہاں قیام فرمایا۔ [22]

اس زمانے میں ایک پراگندگی کا ماحول تھا ہر شخص ذہنی انتشار میں مبتلا ہی تھا۔ اس کے علاوہ مالی پریشانیاں بھی درپیش تھیں۔ نہ معلوم کتنے شعرا حیدر آباد بھوپال اور نواب کلب علی خاں فائق کے یہاں رام پور چلے گئے۔ ان میں بحر، جلال، اسیر، امیر مینائی، منشی امیر اللہ تسلیم مظفر علی اسیر اور مشہور ریختی گو جان صاحب۔ ان کے بیٹے جفیا جو میر انیس

کے پڑوسی تھے ۔ بقول سید زوار حسین صاحب ذاکر ؎ رزق کی خاطر پھرا تا ہے مقدر دیکھ لو آسیا کرتی ہے گردش دانے دانے کے لیے

جان عالم واجد علی شاہ نے میر انیس کے لیے جو ماہانہ وظیفہ مقرر کیا تھا وہ بند ہو گیا نیز موتی محل صاحبہ کے وقف سے جو سو روپئے تھے وہ بھی موقوف ہو گئے اور وہ مالی مشکلات کا شکار ہو گئے ۔ ان کے ہمعصر شمس العلماء جناب سید حامد حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ (مصنف عبقات الانوار) نے انھیں تہور جنگ کے یہاں عشرہ پڑھنے کے لیے حیدرآباد دکن بھیجا درمیانی خط و کتابت براہ راست انھوں نے خود کی اور جب تمام معاملات طے طے ہو گئے تو میر صاحب عازم حیدرآباد ہوئے ۔ درمیانی خط و کتابت کیا ہوئی تھی وہ اب تک پردۂ خفا میں ہے۔

انیس نے کہا ؎

کہاں کہاں مجھے جانا پڑا وہاں مجھ کو
جہاں جہاں مری قسمت کا آب و دانہ ہوا

میر انیس جب حیدرآباد جانے کی تیاری کرنے لگے تو ان کے ایک مداح نواب فدا علی خاں صاحب ان کے پاس آئے اور ان سے کہا " ارے میر صاحب میں لٹ گیا، برباد ہو گیا ورنہ میں خود آپ کو نہ جانے دیتا اب ہمارے یہاں کے عشرہ کا کیا ہوگا ؟ انھوں نے کہا ... وہ خورشید علی (نفیس) پڑھیں گے "

انھیں نامساعد حالات میں مومنین لکھنؤ کے ذہنی سکون کی خاطر انھوں نے نواب سید مہدی حسین خاں المعروف بہ آغا ابو صاحب کے امام باڑہ واقع ترمنی گنج میں دو دن مندرجہ ذیل مرثیہ پڑھا۔

میر انیس کے معاصرین کی یادگار تصویریں

نواب باقر علی خاں (رئیس شیش محل لکھنؤ)

نواب باقر علی خاں کا شمار لکھنؤ کے نامور رئیسوں میں تھا۔ ان کے والد نواب امجد علی خاں میر انیس کے مخلص قدردانوں میں تھے اور انہیں ان سے قربت بھی حاصل تھی۔ مرثیے میں حضورؔ تخلص کرتے تھے اور میر مونس کے شاگرد تھے۔ نواب باقر علی خاں فن مرثیہ خوانی میں میر انیس کے شاگرد تھے۔ میر انیس نے وفات سے قبل جو آخری مجالس پڑھیں ان میں سب سے بڑی اور یادگار مجلس نواب باقر علی خاں کے یہاں کی تھی جس کا تذکرہ امجد علی اشہری نے "حیات انیس" میں کیا ہے۔

عالی جاہ   والا جاہ

عالی جاہ، والا جاہ اپنے عیال کے ساتھ

دبیر الدولہ مرزا احمد کے ان دونوں فرزندوں کا نام لکھنؤ میں عموماً ایک ساتھ "عالی جاہ، والا جاہ" کر کے لیا جاتا تھا۔ لکھنؤ کے سب سے بڑے رئیسوں میں تھے اور میر انیس کے خاص احباب میں شمار تھا۔ مرزا عالی جاہ عرف منجھلے صاحب شیداؔ تخلص کرتے تھے اور ان سے چھوٹے نواب مرزا محمد والا جاہ عرف چھوٹے صاحب (متوفی ۱۲۸۵ھ) عاشقؔ تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ میں ان کے یہاں کی مجالس کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ میر انیس نے ان کے یہاں جو یادگار مجالس پڑھیں ان کے تذکرے کتابوں میں محفوظ ہیں۔

نواب صاحب کے یہاں کی اس مجلس کا حال نوبت رائے نظر لکھنوی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ :

....'' میر انیس صاحب کے اعتبار شاعری کے متعلق ایک روایت
زبان زد خاص و عام ہے اور یہ اس زمانے کی نقل ہے جبکہ ان کا آفتاب
شہرت نصف النہار تک پہنچ گیا تھا شہر میں مجلسیں قریب قریب روزمرہ
ہوتی تھیں اور عزاداری امامؑ کے چرچے سال بھر قائم رہتے تھے۔ ایک
موقع پر ایک ہندو شاعر کے سلام میں ایک لاجواب شعر نکل آیا ؎

کہتی تھیں بانو الٰہی لیجیو وارث کی خبر
آج کیوں سر سے ڈھلی جاتی ہے چادر بار بار

جس وقت میر انیس نے یہ شعر سنا تو کہنے لگے کہ میں اپنے سب دفتر

دینے کو تیار ہوں۔ خوشامدی لوگوں نے بھی انصاف کا خون کرنا چاہا
اور کہنے لگے .... کہ حضور کے سامنے اس ہندو کی کیا حقیقت ہے
لیکن میر صاحب نے صاف کہہ دیا کہ شاعری کسی کا خاص حصہ نہیں ہے
اور اس میں ہندو مسلمان کی تخصیص فضول ہے ....'' [۲۳]

بسم اللہ خیر الاسماء

مجلس کا انتظام اسی شہر پہ ہے ختم
رونے کا اہتمام اسی شہر پہ ہے ختم
یہ آبرو یہ نام اسی شہر پہ ہے ختم
بس ماتم امام اسی شہر پہ ہے ختم
پوچھو جو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گل ایسا ہزار میں

ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ
گلزار مومنیں ہے زہے شان لکھنؤ
نعرے علیؑ علیؑ کے ہیں قربان لکھنؤ
رضوان بھی ہے ارم میں ثنا خوان لکھنؤ
کیوں سرخرو نہ ہو یہ چمن سبزوار ہے
دیکھو تو اس خزاں پہ بھی ایسی بہار ہے

مانی بھی اس مرقع ماتم سے دنگ ہے
گلشن کو صدقے کیجے یہ مجلس کا رنگ ہے
نوحوں میں ان کے نالۂ بلبل کا ڈھنگ ہے
ماتم کے ولولے ہیں بکا کی امنگ ہے
چہلم کے بعد سوگ کے کپڑے اترتے ہیں
جیتے رہیں یہ لوگ کہ رونے پہ مرتے ہیں

سب عارف حق خلف بوتراب ہیں
شیدائے نام سبط رسالت مآب ہیں
سرگرم کار خیر و شریک ثواب ہیں
بے شک یہ کوثری ہیں کہ آنکھیں پرآب ہیں
روتے ہیں ذکر قتل شہ خوش خصال پر
موتی نثار کرتے ہیں زہراؑ کے لال پر

لکھنؤ اور اس زمانے کے مومنین کی تعریف میں میر انیسؔ کے مرثیہ کے چار بند جو انھیں کے تحریر کردہ ہیں۔
یہ تمام اشعار نواب عالیجاہ والاجاہ کے امام باڑہ واقع ترمنی گنج (عقب کاظمین) میں پڑھے تھے۔ اس مجلس میں مشہور ادیب و مصوّر جناب نوبت رائے نظرؔ لکھنوی موجود تھے۔ تفصیل کے ان کا مضمون "میر انیسؔ مغفور" ملاحظہ کیجیے

—— دانش (آل انیس)

کہتے ہیں ان کو دیکھ کے قدسی بہ احترام
وہ گل ہیں یہ کہ باغ ارم جن کا ہے مقام
ناجی ہیں ان کو نارِ جہنم سے کیا ہے کام
لکھے ہوئے ہیں مصحفِ زہراؑ میں سب کے نام
سب ہیں غلام خاص شہہ مشرقین کے
جنت میں ساتھ ہوں گے یہ غنچے حسینؑ کے

ذی علم، نکتہ فہم، سخن سنج، ذی شعور
ذی قدر، ذی وقار، فروتن، سخی، غیور
نخوت، نہ خود سری، نہ تکبر، نہ مکر و زور
وضعیں درست، قلب صفا اور رخوں پہ نور
کیوں کر نہ فرش و عرش پر یہ نیک نام ہوں
آقا حسینؑ سا ہو تو ایسے غلام ہوں

ہرچند بے اثاث ہیں یہ آسماں اساس
رزاق کا آسرا ہے فقط اور سب سے یاس
نے پیرہن درست، نہ زر ہے کسی کے پاس
زیبا مگر گلوں کی طرح ہیں پھٹے لباس
جوہر شناس ان کے امام جلیل ہیں
کہنہ ہیں گو غلاف پہ تیغیں اصیل ہیں

یارب جہاں کو بھر دے بس اب عدل و داد سے
شیعہ بہت تنگ ہیں اہل عناد سے
یہ دشمنی میں کم نہیں ابن زیاد سے
وہ ان سے کر جو تو نے کیا قوم عاد سے
شیعہ ہر ایک عاشق شیدا علیؑ کا ہے
بے فضل سب کو عشق خدا کے ولی کا ہے

نانا سے دوستی ہے نواسے سے بغض واہ
یہ پوچھے کوئی یہی ہے محبت کی رسم و راہ
خالی ہیں عقل سے یہ خوارج خدا گواہ
چہرے سیاہ، بخت سیہ، قلب بھی سیاہ
حیدرؑ سے منحرف ہیں مطیع یزید ہیں
کیا بے نظیر پیر ہیں اور کیا مرید ہیں

یا منتظم ظہور امام زماں دکھا
اب دم لبوں پہ ہے در امن و اماں دکھا
آنکھیں ہیں منتظر رخ آرام جاں دکھا
پھر برق ذوالفقار کو آتش فشاں دکھا
دشمن رہے نہ ایک شہہ مشرقین کا
اس دم غلام سوگ اتاریں حسینؑ کا

دشمن وہ ہے خدا کا جو ہے دشمنِ امامؑ
جانے نہ پائے ہاتھ سے سررشتۂ کلام
مداحِ علی ہے تمہاری زباں کا کام
بھائی بچھڑ چکا ہے شبیہِ مشرقین سے
اب نوجواں پسر کی ہے رخصت حسینؑ سے

مرنا جوان بھائی کا اور اس پہ یہ ستم
پرسا نہ دلدہی، نہ تسلی نہ دردِ و غم
فوجیں صفیں جمائے ہوئے جنگ پر بہم
ہنستے تھے سوگواروں رونے پہ دمبدم
تو غنے میں ان کے سبطِ رسالت پناہ تھا
مشرب میں جن کے پانی کا دینا گناہ تھا

نے پاس انھیں نبیؐ کا نہ مطلق خدا کا ڈر
قرآں سے بیوقوف، حدیثوں سے بے خبر
باتوں میں زور دل میں بدی طینتوں میں شر
بدکار و بدخصال و بداعمال و بدگہر
پیدا تھا کفر، شرم و حیا ناپدید تھی
سادات ذبح ہوتے تھے اور ان کو عید تھی

کیسے وہ کلمہ گو تھے تعجب کا ہے مقام
کافر بھی لیتے ہیں تو کراہت سے ان کے نام
اسلام گر یہی ہے اس لام کو سلام
کھل جائے گا کھینچے گی جو کل تیغ انتقام
کس جا چھپیں گے روزِ عدالت ضرور ہے
ہم دور ہیں، نہ وہ، نہ قیامت ہی دور ہے

بھائی وہ مر چکا ہے کہ تھا جس کے دم سے گھر
سیدھی ہوئی نہیں ابھی ٹوٹی ہوئی کمر
اب طالبِ رضائے وغا ہے جواں پسر
نوکوں میں برچھیوں کی ہے شبیر کا جگر
پیری میں اس جواں کو بھی کھووں تو کیا کروں
کیوں منصفو کہو! جو نہ روؤں تو کیا کروں

افضل ہے کون سبطِ رسالت مآب سے
دنیا میں ہے تو یہ برکت ہے جناب سے
سرسبز ہے زراعتِ عالم سحاب سے
ذروں کی زندگی ہے فقط آفتاب سے
چھٹ کر پدر سے بانکے پیارے کہاں رہیں
جب آسماں نہ ہو تو ستارے کہاں رہیں

اب کچھ بیاں ہو حالِ شہنشاہِ خوش خصال
بزمِ عزا میں ترکِ ادب ہے یہ قیل و قال
روؤ رلاؤ مرثیے کا ہے یہی مآل
کیا فکر تھی انیس گیا کس طرف خیال
پڑھ لو درود صحبتِ مینو سرشت میں
کرتا ہے کوئی ذکرِ جہنم بہشت میں

میر انیس کے انتقال کے بعد ان کی میت دریائے گومتی لے جائی گئی۔ غسل کے بعد جنازہ سید محمد تقی صاحب قبلہ (جنت مآب) آیا اور وہیں قبلہ و کعبہ مولانا سید حسن صاحب مجتہد نے نماز جنازہ پڑھائی اس کے بعد میت میر انیس کے قائم کردہ قبرستان جس میں بیچ میں انھوں نے اپنے زمانے میں ایک بڑا کمرہ بنوایا تھا اور سب سے پہلے اپنی چھوٹی بہن پیاری بیگم کو وہاں دفن کیا تھا۔ ان کے بیٹے میر محمد رضا رضا لکھنوی تھے۔ انھیں کی دختر نیک اختر عنایت فاطمہ صاحبہ میر علی محمد عارف صاحب کو منسوب تھیں۔

جب جنازہ قبرستان انیس پہنچا تو واجد علی شاہ بادشاہ کے بھائی سلیمان قدر بہادر میر خورشید علی نفیس کی طرف بڑھے اور سیاہ شال عزا ان کے کندھے پر ڈالی۔ وہیں مختصر سی مجلس ہوئی چند بند مرثیے کے جو میر نفیس نے انیس سے متعلق نظم کئے تھے پڑھے اور تدفین عمل میں آئی۔ اس عہد کے تمام شاعروں نے مصرعہ مادۂ تاریخی نکالے جو طوالت کی وجہ سے ترک کئے جاتے ہیں۔

لکھنؤ کے ایک معزز شاعر نوبت رائے نظر لکھنوی تھے جو مشاعروں اور مجلسوں کی زینت بنے رہتے تھے وہ بیک وقت ناقد، ادیب، صحافی، انشا پرداز اور بہترین مصور تھے اور ایک رسالہ خدنگ نظر،

میر انیس کا بذات خود تعمیر کرایا ہوا مقبرہ جسمیں انھوں نے اپنی بہن پیاری بیگم (دختر میر خلیق) کو دفن کیا میر نواب مونس میر انیس کے برابر دفن کئے گئے راجہ امیر حسن خاں امیر الدولہ جو اُن کے شاگرد تھے انھوں نے اس پر پلاسٹر کروایا۔ میر مونس صاحب نے کربلا (عراق) سے لاکر کھجور کا درخت لگایا تھا جو ۱۹۶۰ سے پہلے کے گرنے سے گر گیا۔
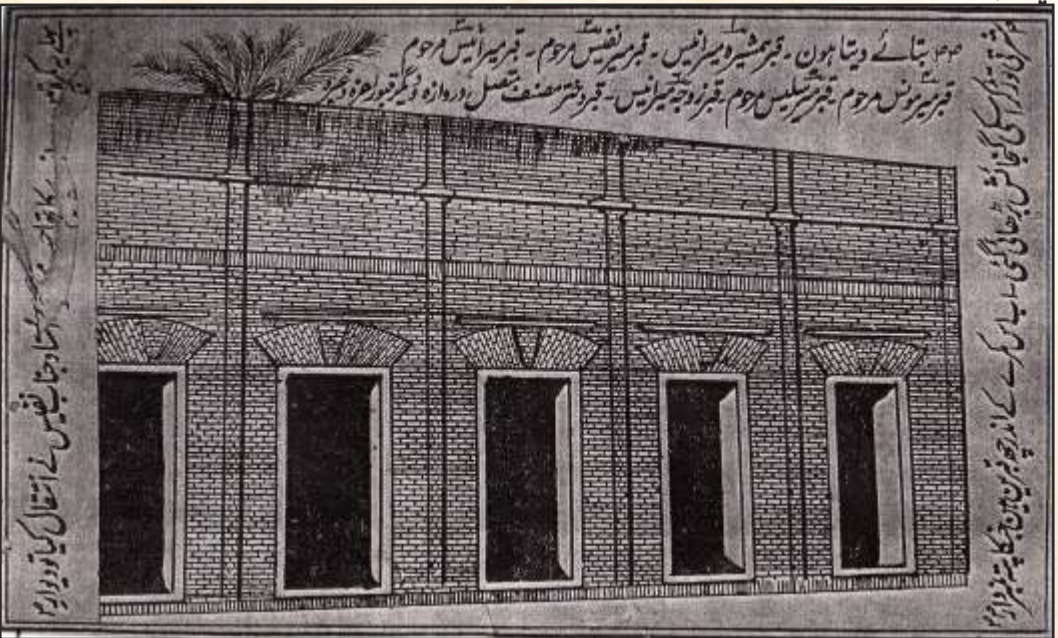
نکالتے تھے وہ میر انیس کی میت میں شریک تھے ان کا بیان ہے کہ :

...... انیسی اور دبیری امتیں بطور خود سخت جھگڑے کیا کرتی تھیں لیکن مرزا دبیر اور میر انیس کے ذاتی تعلقات کو ان فضولیات سے چنداں تعلق نہ تھا۔ مرزا صاحب کو میر صاحب کا ادب اس درجہ ملحوظ رہتا کہ راہ میں ان کی سواری آتی ہوئی دیکھ کر اپنی فنس سے اتر پڑتے اور مودب طریقے سے سلام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے شاگرد رشید میاں منیر نے میر صاحب اور ان کے خاندان کی ہجو لکھی۔ مرزا صاحب کو معلوم ہوا تو سخت ناراض ہوئے اور انھیں بلا کے کہا کہ اپنے ساتھ مجھے بھی روسیاہ بناتے ہو۔ اس سے زیادہ یہ جب میر انیس صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے سیوم کی علانیہ مجلس مرزا دبیر نے ہی پڑھی تھی اور ان کی تاریخ وفات اس مصرعے سے نکالی تھی۔ ع

طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس　　　۱۲۹۱ھ

اسی ایک مصرعہ سے ان کے خیالات کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے گو اب وہ لوگ نہیں رہے اور ان کے شاعرانہ ہنگامے بھی

چیست این ایوان عالی و نفیس
خوابگاہ شاعر اعظم انیس
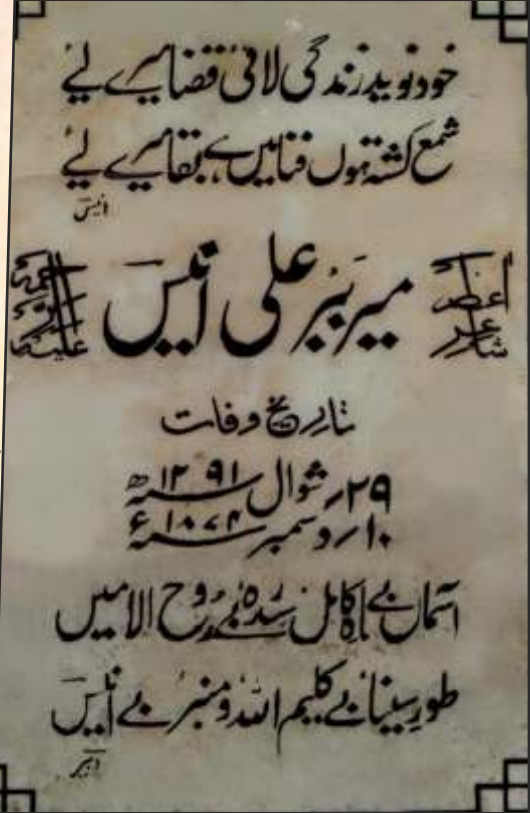
زندگی میں تو نہ رکھا خوش ہمیں ہنس بول کر
آج کیوں روتے ہیں میرے آشنا میرے لیے
(انیس)

انھیں کے ساتھ ختم ہو گئے ان میں سے کسی کو بھی تنگ خیالی کا مجرم قرار دینا ایک سخت جرم کا مرتکب ہونا ہے۔[۴۴]

میر انیس نے بذات خود کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ کربلا کے ظالمین کا انجام کیا ہوگا ؟ اشارے کنائے کئے مثلاً کیسے وہ کلمہ گو تھے یا یہ کہ "کافر بھی لیتے ہیں "، اور "اسلام گر یہی ہے "۔ اور حضرت حجّت امام مہدی آخرالزماں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ معرعہ کھل جائے گی۔ اور ہر طرح کے ظلم کے خلاف بصورت مرثیہ احتجاج کرنے والا یہ عظیم الشان شاعر اس بیت میں تو اس طرح گریز اختیار کر کے بات کو ختم کر دیتا ہے ؎

کس جا چھپیں گے روز عدالت ضرور ہے
ہم دور نہ وہ ، نہ قیامت ہی دور ہے

اپنی نوعیت کا یہ واحد مرثیہ بڑی خصوصیات کا حامل ہے اس میں موجود بندوں سے اس مشہور شعر کی بھی تردید ہوتی ہے جو میر انیس سے منسوب کیا جاتا ہے ، ؎

کوفے سے مل رہے ہیں اسی شہر کے عدو
شاید کہ اے انیس کہیں لکھنؤ نہ ہو

زیر نظر مرثیے کا مقطع یہ ہے

اب روک لے کمیت قلم کی عناں انیس
پیری میں یہ سفر کا رہے دھیان لے انیس
بزم عزا میں سب ہیں ترے قدرداں انیس
کیا جانیے روانہ ہو کب کارواں انیس

جیسے مسافران عدم نے نکالے ہیں
جس قافلے میں تم ہو وہ سب چلنے والے ہیں

تر قیمے کی تاریخ یہ ہے : "روز تاریخ ہفتم رجب ۱۲۸۶ھ بروز چہار شنبہ وقت شب تمام رسید "۔ متذکرہ تاریخ ۱۲۸۶ کے بعد یہ آفتاب سخنوری ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو غروب ہو گیا۔ مرزا دبیر نے مصرعۂ تاریخ نکالا۔

آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس ۱۲۹۱ھ

میر انیس کے منجھلے داماد میر ضامن علی صاحب بادشاہ کے یہاں عہدۂ امانت داری پر فائز تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جان عالم اکثر یہ کہتے تھے کہ میں اس زمانے میں پیدا ہوا ہوں جب لکھنؤ میں انیس ، انس اور مونس جیسے مرثیہ گو موجود ہیں۔ انھوں نے میر انیس کا ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا تھا۔ انیس و دبیر کا انتقال ہوا تو تو انھوں نے لکھا ؎

لو اٹھ گئے دنیا سے انیس اور دبیر
افسوس کہ قدرداں اختر نہ رہے

میر عارف کی بادشاہ سے ملاقات

عارف صاحب کو بادشاہ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا ۱۸۷۵ء میں انھوں نے اپنے سُسر مولوی سید حسن لطافت لکھنوی سے ایک خط لکھوایا اور وہ اسے لیکر عازم کلکتہ ہو گئے وہاں پہنچنے کے تیسرے دن شب میں تین بجے ان کو جان عالم اختر کے حضور باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ بادشاہ نے اپنے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر ان سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ بیٹھ گئے۔ سلام و دعا کے بعد انھوں نے عارف صاحب سے میر انیس کے انتقال پر ملال کے سلسلہ میں کلمات تعزیت ادا کئے اور پوچھا آپ مرثیہ کہتے ہیں ؟ جواب میں عارف صاحب نے کہا ۔۔۔ میں غزل اور سلام کہتا ہوں۔ مرثیہ نہیں کہتا۔ پھر بادشاہ نے اپنے پہلو میں رکھے ہوئے بستے سے اپنا ایک مرثیہ دیا جس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

روئے شہ دیں مصحف ربّ دوسرا
قرآں یہ ناطق ہے وہ خامے سے لکھا ہے

اور مقطع یہ ہے۔

خاموش ہو اختر کہ جگر منہ کے بعل آیا [۴۵]
اندوہ سے تا حلق کلیجہ نکل آیا (۸۵ بند غیر مطبوعہ)

بادشاہ نے جب انھیں اپنا نو تصنیف مرثیہ دیا تھا تو یہ فرمائش کی تھی کہ جمعرات کے دن آپ یہاں کے امام باڑے میں یہ مرثیہ پڑھئے گا۔ میں سنوں گا۔ افسوس کہ بات پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔

ہوا یہ کہ لکھنؤ سے میر نفیسؔ صاحب نے تار بھیجا جس میں یہ لکھا تھا کہ تمہاری بیوی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے فوراً گھر واپس آؤ۔ عارفؔ یہ تار ملتے ہی وہاں سے لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ وہیں قیام کے دوران انھوں نے حکومت اودھ کی بحالی کے لیے ایک دعائیہ نظم کہی تھی جو مرثیہ کے خاتمہ کے بعد درج ہے۔

لازم ہے کہ اب شاہ کو سب مل کے دعا دیں
آمین کی ہر مرتبہ حُفّار صدا دیں
ہاتھوں کو طلب میں سوئے افلاک اٹھا دیں
اور دل سے خیالات علائق کو بھلا دیں
سرسبز ہر اک ان کا ہُوا خواہ ہو یارب
افزونیٔ عمر و حشم و جاہ ہو یارب

یارب دُرِ دندان پیمبرؐ کا تصدّق
زخمِ سر و پیشانی حیدرؑ کا تصدّق
اور فاطمہؑ کے پہلوئے اطہر کا تصدّق
لختِ جگر حضرت شبّرؑ کا تصدّق
حامی ہو پھر اقبال شہِ مرتبہ داں کا
صدقہ سرِ پُر خون امامِ دو جہاں کا

ہو تاج و سریر و علم و فوج عنایت
پھر تخت نشیں ہونے کا ہر جا ہو حکایت
ہو لکھنؤ پھر روکشِ ہر مصر و ولایت
پھر پنجتن پاک کریں آ کے حمایت
ہوں حکم وہ جملہ جہاں قبلۂ عالم
عالم سے ہوں پھر باغ ستاں قبلۂ عالم

افسوس کہ میر عارفؔ کی دعا قبول نہ ہوئی" جناب مسیح الدین کاکوروی جو اس زمانہ کے بہترین انگریزی زبان کے ماہرین میں تھے ان کی معیت میں ملکہ کشور صاحبہ، مرزا سکندر حشمت اور ان کے فرزند عازم لندن ہوئے ملکہ برطانیہ سے ملاقات ہوئی لیکن لکھنؤ میں غدر برپا ہونے کی وجہ سے یہ سفر ناکام ہوگیا۔۔۔۔ وہاں حالات خراب ہونے لگے تو ملکہ معظمہ وہاں سے فرانس روانہ ہوگئیں وہیں ان کا انتقال ہوا۔[۲۶]

قیصر باغ بارہ دری

اس بارہ دری میں واجد علی شاہ کے معتمد خاص دیانت الدولہ نے میر انیسؔ سے مرثیہ پڑھوایا تھا جس کا ذکر سید مہدی حسن احسن نے اپنی کتاب 'واقعات انیس' میں کیا ہے پھر کافی زمانے کے بعد سر محمد علی محمد خاں صاحب والی ریاست محمود آباد اودھ کے چھوٹے بھائی جناب احمد علی خاں صاحب نے اچانک رحلت فرمائی۔ راجہ صاحب نے بارہ دری میں چہلم کا انتظام فرمایا اور اپنے استاد جناب میر علی محمد صاحب عارفؔ سے یہ مجلس پڑھوائی۔ بقول مہذبؔ لکھنوی اس مجلس میں شریک تھا اس میں گورنر بٹلر صاحب مع اسٹاف بہ نفس نفیس موجود تھے۔ تمام روساء و معززین شہر موجود تھے مہاراجہ صاحب کو اپنے اس بھائی سے بحد الفت تھی۔ عارفؔ نے اس مجلس میں جو مرثیہ پڑھا اس کا مطلع درج ذیل ہے۔

گردوں ہے سفینہ مرے دریائے سخن کا

مرثیہ کے آخری چند بند جو شہادت حضرت عباس سے متعلق ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

گردوں ہے سفینہ مرے دریائے سخن کا
سیاح ہوں مدت سے میں صحرائے سخن کا
پروانہ ہے دل شمع تجلّائے سخن کا
مشتاق ہو پھر دید ترا پائے سخن کا
اس بدر سے حسن رخ بیتاب خجل ہے
اس بحر کا موجہ مری بیتابیٔ دل ہے

کیا صبر تھا قربانِ علمدار وفادار
مشکیزے سے پر کر کے پھرے نہر سے ناچار
کہنے لگے پھر دل کی طرف دیکھ کے اک بار
ہے شوق میں پانی کے پھڑکتا ترا بیکار
اس وقت خوشی میں تری ہرگز نہ کروں گا
شبیر کا خادم ہوں تو پیاسا ہی مروں گا

منصف تو ہی اس امر میں ہوائے دل بیتاب
آقا تو نہ پانی پئے اور عبد ہو سیراب
تڑپا کریں معصوم، وہاں صورت سیماب
بے ان کو پلائے ہوئے پی لوں میں یہاں آب

کیا ہوگا اگر اور تعب پیاس سے ہوگا
یہ امر تو نہ زنہار نہ عباسؑ سے ہوگا

گمراہوں نے اس پر بھی جو صفدر کو نہ دی راہ
مجبور ہوا جان و دل سید ذی جاہ
لی تیغ، کیا حملہ، ہٹے خوف سے روباہ
کی جنگ وہ غازی نے کہ العظمت للہ

ہیبت سے تلاطم ہوا، پھر فوج ستم میں
دریا کے قریں لاشوں کے پل بندھ گئے دم میں

جلادوں نے اس حال میں غازی کو جو پایا
ہاں مار لو اب شیر کو، یہ شور مچایا
تیغا کسی ظالم نے جو شانے پہ لگایا
غش ہو گیا صدمے سے ید اللہ کا جایا

بس رہ گیا تھرا کے جری غش نہ زمیں پر
ہیہات گرا، دست یمیں کٹ کے زمیں پر

ہوش آیا تو جھک کر اسے تکنے لگا صفدر
یاں پھر وہ ہی افتاد ہوئی دوش جری پر
یہ ہاتھ بھی شانے سے کٹا وائے مقدر
بے دست ہوا بازوئے فرزند پیمبرؐ

کیوں آب نہ ہو جائے کہ زہرہ ہے بشر کا
پانی کی طرح بہہ گیا خوں قلب و جگر کا

گھوڑے پہ جو تھمنا ہوا پھر شیر کو دشوار
ریتی پہ مع مشک و نشاں گر پڑا جرّار
دینے لگے رو رو کے یہ صدا حیدر کرار
شبیرؑ گرا گھوڑے سے عباس علم دار

شانوں سے قلم ہاتھ ہیں بھائی کی خبر لو
بابا ہو فدا، اپنے فدائی کی خبر لو

میر انیسؔ کے نواسے میر علی محمد عارفؔ

بارہ دری قیصر باغ کی مجلس ختم ہونے کے بعد پیر پور کے راجہ جناب احمد مہدی خاں مرحوم نے بذات خود یہ تصویر کھینچی

اپنے اس وفادار بھائی کی صدا سنتے ہی امام حسینؑ میدان جنگ میں حضرت عباس کے پاس گئے۔ عارفؔ نے اس وقت کی منظر کشی اس طرح کی۔ فرماتے ہیں۔

پہنچے جو تڑپتے ہوئے یوں لاش پہ حضرت
دیکھا کہ علم دار ہوئے راہی جنت
سر پیٹ کے چلائے یہ با صد غم و حسرت
افسوس کہ آئی نہ ملاقات کی نوبت

منجھدار میں کشتی کو مری چھوڑ گئے تم
عباسؑ برادر کی کمر توڑ گئے تم

بقول جناب مہذبؔ لکھنوی اس بند پر بارہ دری میں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ مہاراجہ صاحب بذات خود بھی اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔ عارفؔ صاحب اپنے ہونٹوں سے گریے کو قابو میں

رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے اس مجلس کو اپنے مرثیے کے اس مقطع پر تمام کر دیا۔ ؎

عارف جگر اس غم سے ہوا جاتا ہے پانی
یاد آتی ہے عباس دلاور کی جوانی
کہتے ہیں اسے شاعری و مرثیہ خوانی
دیکھی تری دریائے طبیعت کی روانی
سچ ہے کہ عجب گوہر خوش آب نکالے[27]
اس بحر سے تو نے دُرِ نایاب نکالے[28]

حواشی: اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا۔

1. مرقع خسروی مصنف شیخ محمد حفظت علی کاکوروی۔ مرتبہ ڈاکٹر ذکی کاکوروی، مقیم امریکا، شیخ صاحب بعد وفات مفتی گنج لکھنؤ کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔
2. دیوان قبول لکھنوی ص۶۳
3. اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا، مصنف۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری ص۱۴۳ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ۔ اشاعت 1981 ناشر ڈاکٹر اکبر حیدری۔ قیمت ۱۰۰ روپئے۔
4. تبصرالتواریخ جلد ۲، ص۱۶۹
5. شیوع فیض، ص۴۰۹۔
6. کتاب۔ سلطان عالم واجد علی شاہ۔ مصنف، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ص۲۴۶
7. کتاب، لکھنؤ کی تہذیبی میراث۔ مصنف، ڈاکٹر سید صفدر حسین زیدی ص۱۵
8. یہ اشعار رئیس حسین صاحب نے فراہم کئے جو ادب عالیہ پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔
9. اخبار سہارا، امنگ، سنڈے ایڈیشن۔ مضمون ہم ان کی قربانی کو بھی یاد کریں، مصنف وصی احمد نعمانی ص۱
10. کتاب، اقلیم سخن کے تاجدار، مصنف، ڈاکٹر کوکب قدر سجاد علی مرزا ص۱۰۹
11. مرقع خسروی، شیخ محمد عظمت علی کاکوروی۔ مطبوعہ لکھنؤ۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر ذکی کاکوروی ص۳۳۵
12. یہ سلام میرانیس کے کلام پر مبنی جو ذخیرہ بطور وراثت ہم تک پہنچا اس میں یہ اشعار خصوصاً امیر جس در دولت سے اک زمانہ ہوا، اور اس شعر کو تمام مرتبین مجموعہ سلام انیس کیوں نظر انداز کرتے رہے۔
13. کتاب "تجلیات تاریخ عباس۔ مصنف، ادیب بے بدل، شاعر یکتا مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی۔ اس کتاب کی فراہمی کے لیے ہم مولوی سید ظفر حسین المعروف بہ دُرّن صاحب قبلہ کے بے حد متشکر ہیں جنھوں نے اس کبر سنی کے باوجود زحمت اٹھائی۔ وہ محمد جعفر امید اجتہادی کے فرزند جناب بندہ کاظم جاوید لکھنوی کے شاگرد تھے جب بھی میں ان سے ملاقات کرتا تو وہ جاوید صاحب کے شعر سنایا کرتے تھے جنھیں میں نقل کر لیتا تھا، جو بعد میں میرے کام آئے۔
14. یہ نوحہ میرزا اکبر حسین یاس لکھنوی مرحوم کا ہے یہ میر نواب مونس کے شاگرد تھے۔ ان کے تحریر کردہ بہت سے مرثیے میرے پاس موجود ہیں۔ غزل میں یہ میر ضامن علی جلال لکھنوی کے شاگرد تھے۔
15. کتاب، آغائی صاحب، مصنفہ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی ص۹ آغائی صاحب کا اصل نام نواب آغا علی خاں اور یہ انگریزوں کے زمانہ میں ناظم سلطانپور تھے اور قیام رہتا تھا۔ ان کا بنوایا ہوا امام باڑہ ناظم صاحب برازہ وکٹوریہ اسٹریٹ پر موجود ہے اور وہاں بڑی بڑی شاندار مجلسیں اب بھی ہوتی ہیں۔
16. بحوالہ گذشتہ لکھنؤ، مصنفہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی ص۵۳
17. اس مرثیے کا قلمی نسخہ راقم السطور کے ذخیرہ میں موجود ہے۔
18. میرانیس کا یہ مرثیہ: ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ میر نفیس کے شاگرد سید محمد جعفر، جعفر فرزند آغا میر نجابت فیض آبادی (شاگرد انیس) کا تحریر کردہ میرے پاس موجود ہے۔ اس مرثیہ کے بعض بند ہم نے عمداً ترک کردئے ہیں۔

19، 20 و 21 رباعیات میرانیس منتخبہ سید محمد حسن بلگرامی (ریلوے اکاؤنٹنٹ ریلوے و معدنیات) سرکار آصفیہ نظام۔ باہتمام مولوی رحمت اللہ رعد در مطبع نامی کانپور مطبوع گردید، کتبہ الطاف حسن لکھنوی سنہ ۱۹۰۵ء

جن صفحات سے رباعیاں لی گئیں ان کے صفحہ نمبر ۱۵، ۳۲، ۵۰، ۹۰ وغیرہ

۲۲؎ مرزا عباس صاحب کو ان سے بہت قرب حاصل تھا۔ وہ ان کے بڑے مداحوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ صاحب حیثیت تھے۔ ان کے ہاتھ کا قلم برداشتہ ایک مرثیہ جو بہت طویل ہے جس کا مطلع ہے "دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر" میرے ذخیرۂ مراثی میں محفوظ ہے۔ وہ میر انیسؔ کے اسی مرثیے کی نقل ہے جو انھوں نے بتاریخ پنجم جمادی الآخر ۱۲۷۶ھ کو نظم کر کے تمام کیا تھا۔

۲۳؎ ماخوذ از رسالہ "زمانہ" کانپور فروری ۱۹۰۸ء مصنف نوبت رائے نظرؔ لکھنوی ص ۹۹ و ۱۰۰

۲۴؎ بحوالہ مضمون میر انیسؔ مغفور۔ مصنف نوبت رائے نظرؔ لکھنوی رسالہ "زمانہ" کانپور۔ مطبوعہ ۱۹۰۸ء ص ۱۰۱۔

۲۵؎ یہ مرثیہ میرے ذخیرۂ مراثی میں موجود ہے دعائیہ بند عارفؔ صاحب نے اپنے قلم سے تحریر کئے ہیں۔

۲۶؎ ملاحظہ ہو "سفر نامہ لندن" از مولوی مسیح الدین صاحب کاکوروی مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ۔ ص ۵۱

۲۷؎ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے کتاب "اسلاف و اخلاف میر انیسؔ"، مصنفہ سید محمد عباس آصف نبیرہ میر انیس صاحب لائبریرین راجہ صاحب محمود آباد۔ مرتبہ سید علی احمد صاحب دانشؔ مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۲۰۰۲ء صفحات ۶۵۰۔

۲۸؎ اس مضمون کی تیاری میں برادر عزیز سید خورشید انور رودوی صاحب نے بھی بڑی مدد فرمائی میں ان کا بیحد ممنون ہوں۔

◇◇

میر انیس کا سلسلۂ خاندانی (صفحہ ۸ کا بقیہ)

یہ عالم تھا کہ فروعی اختلافی مسائل کبھی زیر بحث نہیں آتے تھے میر انیسؔ کے ایک استاد حیدر علی صاحب سنی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ لکھنؤ کے صوفی بزرگ مولوی عین القضاۃ صاحب قبلہ علامہ اجل مفتی میر عباس شوستری کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ مولوی حیدر علی صاحب کی مسجد آج بھی چوک میں موجود ہے۔ وہ بڑے بڑے مسائل چٹکی بجاتے حل کر دیتے تھے۔

میر انیسؔ کا کردار

وہ مال دنیا کی طرف سے بالکل بے توجہ تھے اگرچہ کثیر العیال ہونے کی وجہ سے انھیں روپئے کی احتیاج رہتی تھی مگر وہ غیور اور صاحب ہمت تھے اور کسی کے احسان مند ہونے کے متحمل نہیں تھے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ائمہؑ یا اولیا کرام کی طرح فقر میں زندگی بسر کی مگر یہ بھی ہے کہ انھوں نے امراء اور نوابوں کے خزانوں پر حریصانہ نظر نہیں ڈالی چند خاص خاص لوگ تھے جو ان کے ساتھ خفیہ سلوک کرنے کو اپنا فخر دنیوی اور مفاد آخرت سمجھتے تھے وہ بہت ہی قانع انسان تھے۔ ان کی ضروریات محدود اور زندگی سادہ۔ وہ حسن اخلاق کو جوہر انسانی سمجھتے تھے اور اس کی ان کے دل میں قدر تھی اسی وجہ سے ان کی طبیعت میں نزاکت پیدا ہو گئی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ ہر انسان کو اخلاقی میزان میں تولتے تھے۔ ان کی طبیعت خوشامد سے بری تھی۔ مزاج میں حد درجہ انکسار تھا لیکن صاحب ثروت افراد کے ساتھ نہ تھا۔ وہ صرف خدا و مولاؑ پر بھروسہ کرتے تھے جن کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، خود فرمایا ہے۔

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں، یہ نہیں عادت سوال مجھے

کریم دے مجھے وہ فقر اپنی رحمت سے
کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

اس قسم کے اور بہت سے اشعار ان کے کلام میں جا بجا نظر آتے ہیں جو ان کے اوصاف کی بلندی پر گواہ ہیں۔ ◇

• میر انیسؔ صاحب فرماتے تھے کہ

"... وہ شاعر ہی کیا جو تین شمعیں روشن کر کے روزانہ مشق سخن نہ کرے"

دانشؔ عفی عنہ

عبدالرب
اردو ڈپارٹمنٹ خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی لکھنؤ
9452218581

میر انیس کے معاصر مرثیہ گو

مرثیہ اردو شاعری کی قدیم اصناف میں سے ایک اہم صنف ہے اس کے ابتدائی نمونے مثنوی اور غزل ہی کی طرح دکن میں ملتے ہیں لیکن اس صنف کے قدیم نمونے اس تاثر سے خالی ہیں جو بعد میں اس کا امتیاز ثابت ہوئے۔ ابتدائی مرثیوں پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہیئت کے اعتبار سے ان کی اپنی کوئی منفرد شناخت نہیں تھی۔ وہ ظاہری شکل میں زیادہ تر غزل یا قصیدہ سے مشابہ ہوتے تھے۔ شمالی ہند میں ابتداءً زیادہ تر مرثیے دوبیتی (مربع) کی ہیئت میں لکھے گئے اس کے علاوہ مثنوی اور ترکیب بند وغیرہ کی ہیئتوں میں بھی مرثیے لکھے گئے۔ رفتہ رفتہ ہیئت میں بھی تجربے ہوئے اور موضوع کی سطح پر بھی مرثیے کا دامن وسیع ہوتا گیا اور یہ صنف ترقی کرتی گئی بعد میں مرثیے کے لیے مسدس کی ہیئت زیادہ اہم خیال کی جانے لگی عام خیال یہ ہے کہ اس کی ابتدا سوداؔ سے ہوتی ہے لیکن قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے کیونکہ سوداؔ کے بعض معاصرین نے بھی مرثیہ کے لیے مسدس کی ہیئت کو برتا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی لکھتے ہیں ”اس عہد میں چونکہ سب سے زیادہ وقیع نام اور ندرت پسند سوداؔ ہی کی تھی اس لیے گمان غالب ہے کہ اس کے موجد بھی وہی ہوں“ سوداؔ کے عہد میں اس صنف نے نمایاں ترقی کی اور عہد انقلاب دہر نے شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ منتقل کردیا۔ لکھنؤ کے حالات مرثیہ کی ترقی کے لیے زیادہ موزوں اور سازگار تھے چنانچہ یہاں اس صنف نے ارتقاء کے کئی مراحل طے کیے اور اپنا دامن وسیع کیا موضوعات میں بھی وسعت ہوئی اور ہیئت بھی بدلی۔ مربع سے مخمس اور مخمس سے مسدس کی ہیئت کو استحکام حاصل ہوا۔

لکھنؤ کے پہلے دور کے ممتاز مرثیہ گویوں میں احسانؔ افسردہؔ اور گداؔ کے نام آتے ہیں۔ دوسرے دور میں خلیقؔ، فصیحؔ ضمیرؔ اور دلگیرؔ کی رہنمائی میں مرثیہ ترقی کے منازل طے کرتا ہے۔ یہ دراصل لکھنؤ میں اردو مرثیہ کا تعمیراتی دور ہے۔ لیکن مذکورۃ الصدر شعراء نے ہی مرثیہ کو شعری خصوصیات سے معمور کیا اور اسے معراج کمال تک پہنچایا۔ عام طور پر ادبی تاریخ میں اس عہد کو انیسؔ و دبیرؔ کے عہد سے موسوم کیا جاتا ہے اور یہ کچھ غلط بھی نہیں ہے لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انیسؔ و دبیرؔ کے علاوہ بھی کئی اہم شعراء نے مرثیہ کو اپنے خون جگر سے سینچا اور رفعت و بلندی عطا کی البتہ ان کی کاوشیں ان دو ممتاز شعراء کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ دراصل وہ عہد باکمالوں کا عہد تھا۔ علم و فن کے عروج اور اہل علم کی قدردانی کا عہد تھا اس عہد میں شعر و ادب کی تمام اصناف میں ترقی ہوئی۔

یوں دیکھا جائے تو انیسؔ و دبیرؔ کا عہد سیاسی اعتبار سے انتہائی پرآشوب تھا۔ اقتدار اعلیٰ رفتہ رفتہ ہاتھوں سے پھسل رہا تھا بے یقینی کے ساتھ ساتھ توہم پرستی نے بھی اس معاشرہ کو اپنی گرفت میں جکڑ رکھا تھا مگر دوسری جانب علمی نقطۂ نظر

سے یہ لکھنؤ کا عہد زریں کہلانے کا بھی مستحق ٹھہرا بقول مسعود حسن رضوی ادیب ،، لکھنؤ کی عام ادبی سطح اتنی بلند کبھی نہ تھی جتنی انیسؔ دبیرؔ کے عہد میں ہوئی ،، لہٰذا ضروری ہے کہ اس عہد کا جائزہ لینے کے لیے انیس و دبیر کے علاوہ ان کے باکمال معاصرین کی ادبی خدمات پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

میر انیس نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو لکھنؤ کے ادبی افق پر مرثیہ کی توسیع و ترقی کا فریضہ انجام دینے والوں میں فصیحؔ خلیقؔ ضمیرؔ اور دیگر کے نام نمایاں تھے یعنی انھیں انیس کے بزرگ معاصرین اور پیش رو کی حیثیت حاصل ہے ان بزرگ شعراء کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سید مسعود حسن رضوی ادیب رقم طراز ہیں۔

،، ان کی کوششوں سے اردو کا خزانہ مرثیوں کی دولت سے مالا مال ہو گیا۔ ایک ایک کے کلام سے کئی کئی جلدیں بھر گئیں رزم کا عنصر مرثیے میں داخل ہو گیا اور مرثیہ شاعری کی ایک اہم اور بلند پایہ صنف بن گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مرثیے کا خاکہ مطالب اور صورت دونوں اعتبار سے مکمل ہو گیا۔

ذیل میں ان شعراء (انیسؔ کے بزرگ معاصرین اور پیش رو) کی خدمات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے

خلیقؔ

۱۸۴۴ - ۱۷۶۶ میر مستحسن نام خلیقؔ تخلص تھا اردو کے شہرۂ آفاق مثنوی نگار میر حسن کے صاحبزادے اور میر انیس کے والد تھے قادر الکلام شاعر تھے خلیقؔ کی زبان صاف سلیس اور رواں ہے روزمرّہ کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر درج ذیل بند دیکھئے جس میں روزمرّہ محاورہ کے استعمال کے علاوہ لکھنوی معاشرت کی ترجمانی بھی خوب ہے۔

کہتی ہے سر کو پیٹ کے وہ غم کی مبتلا
اے دل تو رانڈ ہونے کا زنہار غم نہ کھا
وارث ابھی بہت ہیں سر پر کسر پہ خوف کیا
دو بھائی ہیں خدا کے دئے میرے مہ لقا
مشکل پڑی تو کیا ہوا مشکل کشا تو ہیں
دولہا اگر نہیں مرے بابا چچا تو ہیں

میر انیسؔ نے ان کی فصاحت اور روزمرّہ کا ذکر مخبریہ انداز میں کیا ہے۔

خلق میں میر خلیق اور تھا خوش گو کوئی کب
نام لے دھو لے زباں کو شیر و تسنیم سے جب

میر خلیقؔ کے زیادہ مرثیے عرصہ تک نایاب رہے بہت بعد میں سید مسعود حسن رضوی اور سید مسیح الزماں جیسے محققین نے تلاش بسیار کے بعد حاصل کیا اور شائقین ادب کے سامنے پیش کیا۔

فصیحؔ

۱۸۵۲ - ۱۷۸۳ میر جعفر علی نام، تخلص فصیحؔ تھا۔ فصیح کا شمار اس عہد کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے پرگو اور بسیار نویس تھے۔ اردو مراثی کے اہم ستونوں میں شمار ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنے ہم عصروں کی طرح مرثیہ کو گوناگوں مضامین سے نوازا۔ فصیح کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے روایتوں کو منظوم کرنے میں تلاش و تفحّص اور چھان بین سے کام لیا ہے اور مرثیے کو اعلیٰ اخلاقی تعلیمات، جذبات کی مصوری اور محاکاۃ نگاری اور ندرت بیان سے ممتاز کیا فصیح کا طرز ادا جدید ہے زبان بھی وہی ہے جو انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں ملتی ہے متروکات کا استعمال بہت کم ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل بند ملاحظہ ہو۔

روایت ہے کہا یوں شہ سے آکر بو تامہ نے
کہ یا حضرت زوال شمس کے اوپر نظر کیجے

تمنّا ظہر کے پڑھنے کی ہے رن میں جماعت سے
نمازِ آخری پڑھ پڑھ کے پھر تلوار کھائیں گے
کہاں پھر یہ جماعت اور کہاں تم سا امام آقا
کہاں پھر یہ سجود اور یہ قعود اور یہ قیام آقا

ضمیر

۱۸۵۵ - ۱۷۸۶ مظفر حسین نام تھا۔ ضمیر تخلص میر ضمیر کے نام سے مشہور ہوئے۔ مصحفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا ان کا کلام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قادر الکلام اور پُرگو شاعر تھے۔ بعض محققین نے میر ضمیر کو مرثیے کی جدید ہیئت کا بانی کہا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ سید مسیح الزماں ڈاکٹر فضل امام اور دوسرے محققین نے اس خیال کی تردید کی ہے لیکن ان کی اہمیت مسلّم ہے۔ مرثیہ کو وسعت اور ترقی عطا کرنے میں ضمیر نے اہم کردار ادا کیا۔ بقول ڈاکٹر مسیح الزماں "دورِ تعمیر کے مرثیہ گویوں میں ضمیر کی شخصیت سب سے قدآور ہے" بعد کے مرثیہ نگاروں نے ضمیر کا اثر سب سے زیادہ قبول کیا۔ مرزا دبیر جیسے باکمال شاعر نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ نمونہ کلام کے طور پر مرثیہ کا ایک بند دیکھئے۔

نقاش تو کرتا ہے قلم سے کہ یہ تدبیر
اک شکل نئی صفحہ قرطاس پہ تحریر
انصاف کرو کلک زباں سے دمِ تحریر
میں صفحہ باطن پہ رقم کرتا ہوں تصویر
سو رنگ سے تصویر مصوّر نے بھری ہے
رنگینیٔ مضموں کی کہاں جلوہ گری ہے

دلگیر

۱۸۴۸ - ۱۷۸۰ لالہ چھنولال نام تھا پہلے طرب تخلص کرتے تھے بعد میں دلگیر ہوئے اور اسی سے شہرت پائی غزل میں ناسخ سے شرف تلمذ تھا جب مرثیہ کی طرف متوجہ ہوئے تو اسی کے ہو کر رہ گئے۔ دلگیر کا شمار اپنے زمانے کے نامور مرثیہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ دلگیر نے حدیث، مجالس اور شہادت کی کتابوں سے روایتیں اور واقعات لے کر مرثیہ کے مختلف موضوعات کو وسعت دی اور اس میں تنوع پیدا کیا۔ نیز مرثیہ کے مروّجہ موضوعات میں شاید ہی کوئی موضوع ایسا رہ گیا ہو جس میں طبع آزمائی نہ کی ہو۔ دلگیر کے مرثیے بہت پُراثر ہوتے ہیں۔ ان کا سارا زور جذباتِ غم کو ابھارنے اور ایسی فضا پیدا کرنے پر ہوتا ہے کہ سننے والوں پر رقّت طاری ہو جائے اور وہ رونے لگیں اور اپنے اس مقصد میں دلگیر کامیاب ہیں۔ بطور مثال مرثیے کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

یہ یقیں ہے مجھے میرے لب کو تر پر
عمّو عباس نے لب اپنے کئے ہوں گے تر
جبکہ کوثر پہ اسے لے گئے ہوں گے حیدر
ڈھونڈتا ہوگا مجھے چاروں طرف کو اصغر
بھولی ہوگی مرے بھائی کو نہ صورت میری
چھوٹے ہی سن میں تھی کیا اس کو محبت میری

اردو مرثیہ کے ارتقائی سفر پر نگاہ ڈالی جائے تو کئی ایسے نام ملتے ہیں جن کے کارنامے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں سے بعض کا تذکرہ گذشتہ سطور میں ہوا لیکن میر انیس کی شخصیت اردو مرثیے کی تاریخ میں سب سے اہم ارفع و اعلیٰ ہے بقول سید احتشام حسین نقوی "میر انیس کی شخصیت اردو مرثیے کی تاریخ میں کسی تصنیف کے اس اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے جسے اس تصنیف کی روح یا خلاصہ سمجھا جاتا ہے" میر انیس کے مراثی پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ صنف اپنی منتہا کو پہنچ چکی ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ انیس کے تمام معاصر مرثیہ نگاروں نے اردو مرثیہ کے فروغ اور ارتقاء میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں انھیں نظر انداز کر کے نہ ہی میر انیس کے مرثیوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے نہ ہی مرثیے کی تاریخ سے بخوبی واقفیت حاصل کی جا سکتی ہے۔

میر انیس کے معاصرین میں سب سے اہم نام مرزا دبیر کا ہے۔ مرزا دبیر (۱۸۷۵ - ۱۸۰۳) ۲۶ اگست کو دہلی میں پیدا ہوئے بچپن میں ہی (تقریباً پانچ سات برس کی عمر میں) لکھنؤ آ گئے یہاں کے جید علماء سے تحصیل علم کیا۔ تحصیل علم کے ساتھ مشق سخن بھی کرتے رہے اور لکھنؤ کی ادبی روایات اور علمی فضا سے فیض اٹھایا۔ مرزا دبیر نے اپنی ذہانت اور طباعی سے بہت جلد وہ مقام حاصل کر لیا کہ لکھنؤ کے ممتاز مرثیہ گویوں میں شمار ہونے لگا۔ لکھنؤ کو اس وقت علمی اعتبار سے مرکزیت حاصل تھی۔ اہل علم اپنے کمالات کے اظہار کے لیے اور اپنی صلاحیتوں کو نمایاں کرنے کے لیے دشوار تر انداز اختیار کرتے تھے تصنع اور تکلف کا انداز اپنا کر اپنی انفرادیت قائم کرتے۔ مرزا دبیر بھی اسی معاشرہ کے پروردہ تھے ان کے مرثیوں کو اسی تہذیب کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں۔

"مشرقی علوم سے گہری واقفیت پرہیزگاری اور خداترسی کتب و سیر و احادیث پر نظر نے دبیر کے مزاج کو ایک عالمانہ رنگ دیا تھا ان کے طرز زندگی نے اسے اور گہرا کر کے ان کے مذاق سخن کی اس طرح پرورش کی کہ علمیت کے اظہار، مشکل پسندی اور خیال آفرینی کو وہ سرمایۂ شاعری سمجھنے لگے اور یہ خصوصیتیں ان کے طرز کلام کا لازمی حصہ بن گئیں۔"

ظاہر ہے مرزا دبیر اس ماحول اور سماج سے الگ نہیں رہ سکتے تھے لیکن مرزا دبیر ہمیشہ ادق زبان ہی نہیں استعمال کرتے بلکہ حسب موقع سادہ و آسان زبان استعمال کرتے ہیں بقول ڈاکٹر مسیح الزماں۔ انھوں نے مرثیہ گوئی میں دو انداز اختیار کئے۔ چہرہ سراپا اور جنگ کو انھوں نے اپنے مذاق کے مطابق قدرت کلام اور زور طبیعت دکھانے کے لیے رکھا اور رخصت شہادت بین میں سادگی بیان سے درد انگیز واقعات ظاہر کئے۔ مرزا دبیر نے اپنے اس انداز کی وضاحت ایک رباعی میں خود کی ہے۔

ہے رزم سراپا تو زباں اور ہی ہے
اور بین کے مابین بیاں اور ہی ہے
کس درجہ ہے بلند تری فکر دبیرؔ
کہتی ہے زمیں یہ آسماں اور ہی ہے

مرزا دبیر جدت پسند طبیعت کے مالک تھے زبان و بیان پر پوری قدرت حاصل تھی قدما کے کارنامے نگاہ میں تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ مرثیے کے معیار کو بلند کیا بلکہ نئے اسالیب اختیار کر کے اور نئے مضامین داخل کر کے اس صنف کو ادبی اعتبار سے ثروت مند کیا مضمون آفرینی خیال آرائی، معنی آفرینی اور تلاش مضامین کے اعلیٰ نمونے پیش کئے اور ایسا قابل قدر سرمایہ اپنے پیچھے چھوڑا جس کی نظیر پیش کرنا مشکل ہے بطور مثال و استشہاد چند بند نقل کیے جاتے ہیں۔

رزمیہ انداز

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے
ہر قصر سلاطین زمن کانپ رہا ہے
سب ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

ہیبت سے ہیں نہ قلعہ افلاک کے در بند
جلاد فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
وا ہے کمر چرخ سے جوزا کا کمر بند
سیارے ہیں غلطاں صفت طائر پر بند
انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے

شہادت اور بین کا انداز

پھر لاش سے لپٹی کہ میں قربان علی اکبر
رخصت نہ ہوئے ہو گئے بے جان علی اکبر
اٹھارہ برس کے مرے مہمان علی اکبر
دنیا سے اٹھے آج پر ارمان علی اکبر
جی کھول کے اب روؤں جو پیارے کی رضا ہو
ڈرتی ہوں کہیں روح تمہاری نہ خفا ہو

ہے ہے مرے جانی مرے دلبر مرے پیارے
تنہا مجھے چھوڑ کے تم دنیا سے سدھارے
تم خواب اجل میں پدر گور کنارے
واری گئی اب کون ہے پردے کو ہمارے
جب قید میں باقی بیداد کریں گے
کیا کیا علی اکبر تمہیں ہم یاد کریں گے

میر انیس کے ممتاز معاصرین میں دوسرا اہم اور قابل ذکر نام حسین مرزا عشق کا ہے۔ عشق (۱۸۸۵ - ۱۸۱۷) میر ضمیر کے داماد تھے والد سے کسی باعث ناراض ہو کر میر ضمیر کے ساتھ رہنے لگے اور انھیں کی شاگردی اختیار کی اور ضمیر کے زیر اثر مرثیہ گوئی کی طرف متوجہ ہوئے۔ عشق کے والد سید محمد مرزا اُنس اور ناسخ کے شاگرد تھے اور غزلیں کہتے تھے عشق نے بھی شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور ناسخ کی شاگردی اختیار کی مگر طبیعت کی جدت پسندی نے صرف مضمون بندی اور خیال آفرینی تک محدود نہیں ہونے دیا۔ عشق نے اصلاح زبان کی طرف توجہ کی اور یہ وقت کا تقاضا تھا۔ اصلاح زبان کی عشق کی کوششوں کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ انھوں نے شاعروں خاص طور پر مرثیہ گویوں کو اس کا احساس دلایا کہ انھیں ان عام ادبی اصولوں کی پابندی کرنا چاہیے جو شعر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں اور اسے ادبی اعتبار بخشتے ہیں۔

میر عشق نے میر ضمیر کے زیر سایہ مرثیہ گوئی کی ابتدا کی میر ضمیر نے اردو مرثیہ کو جو وسعت دی تھی اور مناظر قدرت کے بیان میں مضمون آفرینی اور خیال آفرینی کی طرح ڈالی تھی وہ سب مرزا عشق کے سامنے تھا لیکن عشق نے اپنی انفرادیت کا راستہ نکالا۔ مرثیے کا موضوع خواہ کتنا ہی مہتم بالشان کیوں نہ ہو لیکن محدود ہے اس لیے نئی راہوں کی تلاش آسان کام نہ تھا خصوصاً انیس و دبیر کی موجودگی میں لیکن میر عشق نے اپنی صلاحیتوں سے کامیابی حاصل کی اور اس حد تک نمایاں ہوئے کہ انیس و دبیر کی طرح ایک حلقہ مرزا عشق کے معتقدین کا بھی پیدا ہو گیا۔ میر عشق کے امتیازات کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مسیح الزماں لکھتے ہیں۔

"حدیث و سیر کی کتابوں معجزات و مناقب کے بیان میں انھیں بہت مواد مل گیا جسے انھوں نے خوبی سے مرثیوں میں بیان کیا اور اس طرح یا تو نئی یا کم رائج روایتوں سے تازگی کی فضا پیدا کی۔"

میر عشق نے روایتوں کی تحقیق و تفتیش کی اور حدیث و سیر کی کتابوں سے براہ راست استفادہ کیا اور اگر رائج روایتوں پر مرثیے لکھے تو ندرت اور تازگی بیان پر خصوصی توجہ کی چنانچہ ڈاکٹر مسیح الزماں اور دوسرے محققین نے بھی زعفر جن کی روایت کے مرثیے سے متعلق میر عشق کی ہنر مندی اور فنی چابکدستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مجلس میں جہاں استادان فن انیس و دبیر بھی موجود تھے میر عشق نے جب اپنا مرثیہ "عروج اے مرے پروردگار دے مجھ کو" پڑھا تو انیس نے میر عشق کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ بھئی سید مرزا یہ مرثیہ اپنے ساتھ قبر میں لے جانا تمہاری بخشش کے لیے یہی ایک مرثیہ کافی ہے۔ اسی مرثیے سے متعلق سید مسعود حسن رضوی مرزا دبیر کا قول نقل کرتے ہیں کہ مرزا دبیر مغفور فرماتے تھے کہ اس حال (زعفر جن حال) کا ایسا مرثیہ نہ مجھ سے ہوا نہ میر انیس سے بہر حال عشق نے انیس و دبیر کے سامنے اپنے کمالات فن کا اعتراف کروایا اور مرثیہ کی ترقی و توسیع میں اہم کردار ادا

کیا۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

غزل کا انداز

سب جانتے تھے اس کو کہ دنیا ہے اک سرا
آکر مسافر اس میں رہا اور چل دیا
لوہے کی کوٹھری میں نہیں چھوڑتی قضا
دو دن کا میہماں ہے سلطاں ہو یا گدا
اس میں سدا رہے کوئی امر محال ہے
دنیائے بے ثبات یہ خواب و خیال ہے

تلوار کے بیان میں

پہنچی جو رخ بدل کے جس پر وہ بے محل
رخسار پر لعیں کے عارض ہوئی اجل
مردم ہوئی ہرن جو کئی چشم بد عمل
سیدھی کھنچی وہاں سے مٹا ابروؤں کا بل
ہر خار شکل حرف غلط کاٹتی ہوئی
نکلی عدو کے منہ سے زباں چاٹتی ہوئی

معاصرین انیسؔ میں سید مرزا تعشقؔ (۱۸۲۳-۱۸۹۱) کو بھی ایک اہم مرثیہ گو کی حیثیت حاصل ہے یہ میر عشقؔ کے برادر خورد تھے اور انیسؔ کے دور کے ممتاز مرثیہ گو کے طور پر بھی معروف ہیں تعشق کو کئی تذکرہ نگاروں نے ناسخؔ کا شاگرد لکھا ہے لیکن ناسخ سے ان کی شاگردی مشکوک ہے بعض محققین نے اس کی تردید کی ہے ڈاکٹر مسیح الزماں بھی اسی خیال کے مؤید ہیں اور انھیں اپنے والد انسؔ کا شاگرد بتاتے ہیں۔

لکھنؤ کے ممتاز مرثیہ گویوں میں اکثر نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن ان میں تعشقؔ ہی ایسے مرثیہ گو ہیں جنھیں غزل اور مرثیہ دونوں میں یکساں مقبولیت اور ناموری حاصل ہوئی۔ تعشقؔ مرثیہ گوئی کی طرف آنے کے بعد دوسرے مرثیہ گویوں کے مانند غزل گوئی سے کنارہ کش نہیں ہوئے بلکہ غزل اور مرثیہ دونوں اہم اور مقبول اصناف کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ ڈاکٹر سید مسیح الزماں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تعشقؔ نے مرثیہ میں تغزّل کا رنگ تیز کرکے غزل کی اصطلاحوں، علامتوں اور انداز بیان کو واقعۂ کربلا کے پس منظر میں استعمال کرکے مرثیہ کو ایک نئی سمت دینا چاہی۔ قصیدہ کی تشبیب میں جس طرح بہار کے مناظر علوم و فنون کی باتوں کے علاوہ عاشقانہ مضامین بھی نظم کیے جاتے تھے اسی طرح تعشقؔ نے مرثیہ کے چہرہ میں ہجر و وصال کے مضامین بیان کیے"

تعشقؔ نے مناظر فطرت کے مضامین بھی اپنے مخصوص انداز میں فنکارانہ مہارت کے ساتھ برتے ہیں اور اس طرح جذبات کی مصوّری، واقعات کے بیان اور مناظر فطرت کی عکاسی اور مختلف اجزا کی مناسب ترتیب نے تعشقؔ کے مراثی کو قدر اول کی چیز بنا دیا ہے اور انھیں خصوصیات نے تعشق کو ایک منفرد مقام عطا کر دیا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے۔

پھولوں کے رنگ اڑ گئے فصل بہار میں
کانٹوں نے کی خلش چمن روزگار میں
خوشبو تھی عشق شاہ کی ہر گل عذار میں
ایک ایک پھول فرد تھا سو میں ہزار میں
گو نام کو نہ کام و زباں میں تری رہی
کھیتی وفا کی فضل خدا سے ہری رہی

وہ دھوپ ہے بجا نہیں اہل زمیں کے ہوش
چرخ زبرجدی نظر آتا ہے شعلہ پوش
پانی ہے زیر خاک مگر کھا رہا ہے جوش
کہسار میں ہے گرمیِ ہوا کا عجب خروش
دن بھر تمام روز حرارت بڑی رہی
تا شام دھوپ نہر کے اندر پڑی رہی

پروفیسر محسن نعماں آزردہ
9419007939

مرزا دبیر معترف میر انیس

حالات کبھی کبھی کوتاہ نظری اور وقت کے دھندلکوں کی وجہ سے عجیب صورت اختیار کرتے ہیں۔ غالب کا یہ مصرع ''ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ'' ایسی کیفیتوں پر صادق آتا ہے۔ عموماً جو ہوتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتا اور جو دکھائی دیتا ہے وہ اصلاً ہوتا نہیں ہے۔ اور جتنا زمانی اور زمینی فاصلہ بڑھتا جاتا ہے تو لوگ کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ دنیائے ادب میں ادبی معرکوں کے ساتھ بھی یہی صورتحال رہی ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک جگہ کسی جھیل میں کنکر پھینکا جاتا ہے تو وہ کم لوگوں کو نظر آتا ہے اور اس سے بنے ہوئے لہروں کے دائرے دور دور تک لوگوں کو دکھائی دیتے ہیں اور پھر جیسی جس کی نظر ہو وہ ان لہروں کے ساتھ اپنے حساب سے مختلف وزن اور طاقت کا پتھر جوڑتا ہے۔ میں نے ایک بار اپنے ایک انشائیہ ''حضرت مدیر'' میں لکھا تھا کہ صحافی کو کہیں سے ایک دم ملنی چاہئے۔ وہ اپنے قد کا اور اپنے رنگ کا ہاتھی اس کے آگے خود ہی جوڑتا ہے۔ دم تو اس کے دماغ میں یا اس کے ہاتھ میں رہتی ہے لیکن ہاتھی سب کو دکھائی دیتا ہے۔ یہ تو ایک جملہ معترضہ صحافیوں کی خدمت میں بشمول وضاحت رضوی معذرت کے ساتھ یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ادبی معاملات میں بھی لوگوں نے ایسے ہی مبالغہ سے یا اس کے برعکس کام کیا ہے۔

اودھ کے اساتذہ کاملین کے سلسلہ میں بھی یہ صورت پیش آئی ہے کہیں سیاسی مصلحتوں کے نتیجہ میں اور کہیں محض تفنن طبع تفریح اور مجلس آرائی کی وجہ سے سیاسی اعتبار سے دیکھا ہو تو بادشاہ واجد علی شاہ کے ترجمے میں تحریر کردہ بیانات کو ذہن میں رکھئے جن میں ایسے معتبر مصنف تخلیق کار اور فنکار کے لیے کیا کیا اوٹ پٹانگ باتیں نہیں لکھی گئیں۔ سمجھ میں آتا ہے کہ اس میں بعض لوگوں کو انگریز سے فائدہ تھا اور انگریز تو چاہتا ہی تھا کہ اودھ کے نیک حکمراں کسی نہ کسی طرح بدنام ہوں جہاں تک دوسرے معرکوں کا سوال ہے مرزا دبیر اور میر انیس کے سلسلہ میں جو بیانات سامنے آئے ہیں ان سے لگتا ہے کہ شاید دونوں ایک دوسرے کے دشمن جانی تھے اور ہر بات میں جواب در جواب کا سلسلہ چلتا تھا جیسے آجکل چناؤ کے زمانے میں دو سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیوں کی دکانیں کھول کر بیٹھتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر کے معاملہ میں سب باتیں محض اختراعی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا بہت احترام کرتے تھے اور مرزا سلامت علی دبیر بوجوہ میر ببر علی انیس سے نہ صرف محبت کرتے تھے بلکہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ راستے میں کہیں ملتے تو مرزا

صاحب سواری سے اتر کے میر انیس سے استفسار حال کرتے تھے ۔ وجہ یہ تھی کہ میر صاحب سید تھے اور مرزا دبیر سادات کا نہایت احترام کرتے تھے اس سے اندازہ ہوگا کہ مرزا دبیر میر انیس کے مرتبے کا کس قدر لحاظ رکھتے تھے۔

شبلی نعمانی نے موازنہ انیس و دبیر لکھ کر کچھ غلط فہمیوں کو ایسی راہ دے دی کہ کنکر اور لہروں کے دائروں کی صورت فاصلے بڑھتے گئے اور کہانیاں بنتی گئیں مگران فاصلوں اور ان کہانیوں کا مرزا دبیر کے ذہن میں کوئی مقام نہیں تھا۔ اول تو میر انیس مرزا دبیر سے نہ صرف یہ کہ عمر میں کچھ چھوٹے تھے بلکہ ان کی حیثیت مرزا دبیر کے لیے ایک مہمان شاعر کی تھی جو اپنے ساتھ اپنے خاندان کی خدمات اور خود اپنے فنی سرمایہ کے ساتھ اپنے خاندان کی خدمات اور خود اپنے فنی سرمایہ کے ساتھ لکھنؤ کے افق پر ظاہر ہوئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا دبیر بھی دلی سے لکھنؤ آئے تھے لیکن وہ ان کی کم عمری کا زمانہ تھا جس کی وجہ سے میں نے کہیں لکھا ہے کہ مرزا دبیر نے آنکھ اگرچہ دلی میں کھولی تھی لیکن نگاہ ان کو لکھنؤ میں نصیب ہوئی جب انھوں نے میر ضمیر کی شاگردی میں اپنے فن کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور لکھنؤ میں خاص و عام کی زبان پر ان کا نام چڑھ گیا جب کہیں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ تشریف لائے۔ یہ امجد علی شاہ کا عہد تھا اور اس وقت لکھنؤ میں مرزا دبیر کا طوطی بول رہا تھا۔ نامور اور استاذ فن ہونے کی وجہ سے بھی ان پر میر انیس کا احترام یوں واجب تھا کہ وہ اس وقت وارد لکھنؤ ہوئے تھے جب مرزا دبیر پہلے ہی لکھنؤ کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے میر انیس پر کتاب لکھنا چاہی تو انھیں ان کے قد کی نشاندہی کے لیے کوئی چاہئے تھا جس کے ساتھ وہ موازنہ کر کے منطقی اصول کے تحت اس کی عظمت کو ثابت کرتے۔ تاریخ میں تنقید میں اور محبت میں ایسا ضرور ہوا ہے کہ دن کے مقابلہ میں رات، وصال کے مقابلہ میں ہجر، لیاقت کے مقابلے بے لیاقتی وغیرہ وغیرہ کو ہتھیار اور اوزار کے طور پر موضوع یا مواد کی طرح سے استعمال کیا گیا ہے لیکن علامہ نے دو ایسے قدآور شاعروں کو اس کام کے لیے چنا جنھوں نے اسے اعتراف عجز کے باوجود گمرہی کے عمل پر آمادہ کیا۔ پہلا مفروضہ تو انھوں نے یہ قائم کیا کہ دونوں اپنے فن میں ایک دوسرے کے لیے جواب در جواب کے عمل پر کار فرما تھے جو حقیقت نہیں ہے۔ ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ جب دو باکمال شاعروں کا موضوع ایک ہو اس لیے ان کے کلام میں متحد المضامین اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہوگی اس لیے مضمون کا ٹکرانا کوئی بلا ارادہ فعل نہیں ہوگا بلکہ یہ ایک عام سی بات ہے اس میں انھوں نے جو مفروضہ قائم کیا وہ یہ کہ کسی مضمون کو میر انیس نے پہلے نظم کیا اس کے بعد مرزا دبیر نے اس کا جواب لکھا جو بخیال علامہ کے پست معیار کا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی مضمون مرزا دبیر نے پہلے نظم کیا ہو اس لیے کہ وہ بڑے تھے اور اس لیے بھی کہ وہ زود گو تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے دفتر ماتم کی بیس جلدیں ہیں اور اس کے علاوہ نظم و نثر میں اور بھی کچھ ہے۔ اس کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے جب کوئی مضمون نظم کیا اور ممکن ہے میر انیس کی نظر سے گزرا ہو اور انھوں نے جب اس مضمون پر طبع آزمائی کی ہو تو اس کا بہتر ہونا کسی طرح سے جواب در جواب کا مسئلہ نہیں بنتا بلکہ نقش ثانی ہمیشہ بہتر ہوتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ مرزا دبیر نے میر انیس کے مضمون کے جواب میں شعر کہا اور وہ پھس پھسا ہے قطعاً درست نہ ہوگا۔

مرزا دبیر میر انیس کے کمال اور فن کے معترف تھے جب مرزا دبیر کے بڑے بھائی مرزا آنظر کا انتقال ہوا تو مرزا

دبیر نے کہا کہ "میرے دونوں بازو ٹوٹ گئے"

داد ریغا عینی و دبی دو بازویم شکست
بے نظیر اول شدم اسماں وا آخر بے انیس

سب سے بڑی مثال مرزا دبیر کے میر انیس کے اعتراف کی یہ ہے کہ انھوں نے جو قطعہ تاریخ میر انیس کی وفات پر کہا وہ نہ صرف تاریخ گوئی میں کمال فن کا نمونہ ہے کہ انھوں نے صنعت زبر و بینہ میں کہا تھا اور میں میر انیس کے کمالات کا کھلم کھلا اعتراف بھی ملتا ہے جس سے بہ بستر پر مرزا دبیر کے میر انیس کے تئیں جذبات اور عقیدت کا احوال واضح ہو گا۔ احتیاطاً وہ قطعۂ تاریخ یہاں یہ درج کیا جاتا ہے خیال رہے کہ "حیات دبیر" میں اس قطعہ کے گیارہ شعر چھپے ہیں۔ اکبر حیدری نے اپنی کتاب "شاعر اعظم" میں تیرہ شعر دیے ہیں اور "شمس الضحیٰ" میں چودہ شعر شائع ہوئے ہیں۔

جو درج ذیل ہیں۔

داد خواہم یا غیاث المستغیثین الغیاث
از کہ دل مانوس گردد بے سخنور بے انیس
عبرۃ للناظرین گردید افلاک و زمیں
دیدنی نبود مہ و خورشید و اختر بے انیس
داد ریغا عینی و دبی دو بازویم شکست
بے نظیر اول شدم اسماں وا آخر بے انیس
یادگار رفتگاں ہستیم و مہمان جہاں
چند روزہ چند ہفتہ بے برادر بے انیس
الوداع اے ذوق تصنیف الفراق اے شوق نظم
شد حواس خمسہ و دہ عقل ششدر بے انیس
پوست کندہ موشگافان سخن گویند حیف
ہر سر مو بر رگ جاں نیست نشتر بے انیس
اے ہوس چنداں دل آسودہ در عالم کجاست
دفتر اجزائے معنی گشت ابتر بے انیس
اشک ما را ربطے بدامن بود لیکن اشک ما
رفتہ رفتہ رفت تا داماں محشر بے انیس
بسکہ در ہر غم بسوزد داغ بر بالائے داغ
نیست جز طاؤس دل پروانہ دیگر بے انیس
نیست ایام تماشائے چمن اکنوں کہ ہست
داغ شبنم سینہ و غنچہ مجمر بے انیس
تازہ مضمون نظم می فرمود در ہر بحر شعر
چشمۂ چشمم شود ہم چشم کوثر بے انیس
سال تاریخش بزبر و بینہ شد زیب نظم
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس (۱۲۹۱)
در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
گرچہ طبعم بود محزون و مکدر بے انیس
آسماں بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامیں
طور سینا بے کلیم اللہ منبر بے انیس

(۱۸۷۴ء)

علامہ شبلی نے انیس و دبیر کے سلسلہ میں ایک ایسے سلام کا ذکر کیا ہے جو میر انیس کا نہیں بلکہ میر مونس کا ہے۔ جس کی وجہ سے مشیر اور مونس دونوں ایک دوسرے کا جواب دینے لگے تھے۔ اصل میں میر انیس کے شعر

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

اس شعر کی وجہ سے شبلی نعمانی نے مونس کے شعروں کو انیس و دبیر سے منسوب کر کے ایک ایسا نتیجہ نکالنے کی کوشش کی جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں جبکہ یہ معاملہ میر مونس اور مشیر کا ہے چنانچہ جب لکھنؤ میں اس کے خوب چرچے ہوئے تو مرزا دبیر مشیر سے اور میر انیس مونس سے خفا ہو گئے اور مشیر نے میر انیس سے اور مونس نے مرزا دبیر سے معافی مانگی۔ افضل حسین ثابت نے "حیات دبیر" کے جلد اول میں صفحہ 119 اور

(بقیہ ص ۱۱۳ پر)

علامہ ڈاکٹر سیّد ضمیر اختر نقوی
فلیٹ نمبر ۱۰۲ مصطفےٰ آرکیڈ سندھی مسلم کوآپریٹیو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی
009234306688

لکھنؤ سے میر انیسؔ کی محبّت

دنیا کا ہر انسان اپنے وطن سے محبّت کرتا ہے یہ ایک فطری جذبہ ہے اور جذبے کے تحت ہر انسان اپنے وطن کی تعریف بھی کرتا ہے اور وہ اپنے وطن کی مذمت برداشت نہیں کر سکتا۔ اکثر ایسے مباحثے دیکھنے میں آئے ہیں تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پیغمبروں نے بھی اپنے وطن سے محبّت کا اظہار کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے باشندوں میں یہ جذبہ اس حد تک پایا جاتا ہے کہ دلی والے دلّی پر عاشق تھے اور لکھنؤ والے لکھنؤ کی محبت میں سرشار تھے لکھنؤ کے شاعروں نے لکھنؤ کی تعریف میں ہزاروں شعر کہے ہیں بلکہ طویل مسدس طویل مثنویاں اور غزلیات بھی لکھنؤ کی تعریف میں دستیاب ہیں۔

میر تقی میر ناسخؔ، آتشؔ، امیر مینائی، مرزا دبیرؔ کی طرح میر انیسؔ بھی عاشق لکھنؤ تھے لکھنؤ اور اہلِ لکھنؤ کے لیے دعائیں کی ہیں اور بد دعائیں دی ہیں۔ میر انیسؔ کی دعا تھی لکھنؤ تا قیامت آباد رہے میر انیسؔ اپنے سامعین پر ناز کرتے تھے اور لکھنؤ کے جیسے مجلس کے سامعین میر انیسؔ کو کہیں اور نہ مل سکے وہ لکھنؤ کی مجلسوں کے لیے کہتے تھے۔

"دیکھی نہیں انجم نے کبھی انجمن ایسی"

- - - - - -

کیا اوج ہے کیا رتبہ ہے اس بزم عزا کا
غل عرش سے ہے فرش تلک صلِ علیٰ کا

مشتاق ہے فردوس بریں یاں کی فضا کا
پانی میں بھی یاں کے ہے مزا آب بقا کا

دربار معلّٰی ہے ولی ابن ولی کا
جاری ہے یہ سب فیض حسین ابن علی کا

آسمان پر جس طرح ستارے چمکتے ہیں اس مجلس میں لکھنؤ کے سامعین میر انیسؔ کی نگاہ میں ستاروں کی طرح ہیں اس میں جو مسن ہیں وہ رسول اللہ کے مہمان ہیں۔ متوسط سن کے افراد حضرت علی کے مہمان ہیں نوجوان حضرت علی اکبر کے مہمان ہیں۔ سامعین بچے حضرت علی اصغر کے مہمان ہیں یہ سب پنجتنی ہیں۔ ارشاد رسول خدا ہے کہ یہ عزادار میرے مددگار ہیں۔ حضرت علی کہتے ہیں کہ یہ میرے غم خوار ہیں۔ امام حسین کہتے ہیں یہ میرے مددگار ہیں یہ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔"

امام حسین فرماتے ہیں کہ میں عزاداروں کی قبر میں مدد کرتا ہوں یہ میرے بچوں کے غم میں روتے ہیں اللہ ان کی اولاد کو سلامت رکھے۔ ان کی بستی دنیا میں آباد رہے ان کو اللہ نے دوزخ کی آگ سے آزاد کر دیا ہے۔ ان عزاداروں میں کوئی مر جاتا ہے تو میں ان کے لیے بکا کرتا ہوں اور ان کے لیے دعا کرتا ہوں۔"

مجلس کا ذرہ ہے نور خوشا مجلس عالی
حیدر کے محبوں سے کوئی جا نہیں خالی

عاشق ہیں سب اس کے جو ہے کونین کا والی
اثنا عشری پنج تنی شیعۂ غالی
ششدر ہو نہ کیوں چرخ عجب جلوہ گری ہے
یہ بزم عزا آج ستاروں سے بھری ہے

ان میں جو مسن ہیں وہ پیمبر کے ہیں مہماں
اور جو متوسط ہیں وہ حیدر کے ہیں مہماں
جو تازہ جواں ہیں علی اکبر کے ہیں مہماں
شیعوں کے پسر سب علی اصغر کے ہیں مہماں

سب خورد و کلاں عاشق شاہ مدنی ہیں
پانچ انگلیوں کی طرح یہ سب پنج تنی ہیں

ارشاد نبی ہے کہ مددگار ہیں میرے
فرماتے ہیں حیدر کہ یہ غم خوار ہیں میرے
حضرت کا سخن ہے کہ عزادار ہیں میرے
میں ان کا ہوں طالب یہ طلب گار ہیں میرے

یہ آج اگر رو کے ہمیں یاد کریں گے
ہم قبر میں ان لوگوں کی امداد کریں گے

غم میں مرے بچوں کے یہ سب کرتے ہیں فریاد
اللہ سلامت رکھے ان لوگوں کی اولاد
بستی مرے شیعوں کی رہے خلق میں آباد
یہ حشر کے دن آتش دوزخ سے ہوں آزاد

مرتا ہے کوئی گر تو بکا کرتا ہوں میں بھی
ان کے لیے بخشش کی دعا کرتا ہوں میں بھی

مرد کے لیے واجب عینی ہے یہ زاری
رونا ہی وسیلہ ہے شفاعت کا ہماری
ہے وقت معین پہ ادا طاعت باری
یہ خیر ہے وہ خیر جو ہر وقت ہے جاری

رو لو کہ یہ وقت اور یہ صحبت نہ ملے گی
جب آنکھ ہوئی بند تو مہلت نہ ملے گی

.. ..

مہلت جو اجل دے تو غنیمت اسے جانو
آمادہ ہو رونے پہ سعادت اسے جانو
آنسو نکل آئیں تو عبادت اسے جانو
ایذا ہو جو محفل میں تو راحت اسے جانو

فاقے کئے ہیں دھوپ میں لب تشنہ رہے ہیں
آقا نے تمہارے لیے کیا ظلم سہے ہیں

میر انیسؔ اہل لکھنؤ کو "عاشق سرور" کے لقب سے مخاطب کرتے ہیں ؂

بس اے انیسؔ ختم ہے مجلس میں اب خموش
سر پیٹتے ہیں عاشق سرور بصد خروش

میر انیسؔ کے مرثیے سن کر اہل لکھنؤ بے پناہ گریہ کرتے ہیں میر انیسؔ کہتے ہیں۔

ہے ماتم حسین کا بزم عزا میں جوش

میر انیسؔ خود اپنے لیے کہتے ہیں

"حق یہ ہے کہ تو بلبل بستان عزا ہے"

گویا اہل لکھنؤ میر انیسؔ کو "بلبل بستان عزا" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

لکھنؤ کے عزادار میر انیسؔ کے مرثیے میں مصائب سن کر بے ہوش ہو جاتے تھے۔

"غش ہو گئے مجلس میں کئی شہ کے عزادار"

میر انیسؔ اس بات کی تعریف مجلسوں میں کرتے تھے کہ اہل لکھنؤ میر انیسؔ کی قدردانی کرتے ہیں۔

بزم عزا میں سب ہیں ترے قدرداں انیسؔ

میر انیسؔ اہل لکھنؤ کو دعا دیتے ہیں کہ "اللہ ان سب کو غم حسین کے علاوہ کوئی غم نہ ہو:-

زندہ رہیں دنیا میں شہ دیں کے عزادار
غیر از غم شہ ان کو نہ غم ہو کوئی زنہار

میر انیسؔ اہل لکھنؤ کے لیے دعا کرتے ہیں کہ پروردگار لکھنؤ کے طبقہ کو تو ہمیشہ آباد رکھ۔ دنیا میں یہ سدا شاد رہیں

ان کے سائے میں ان کی اولاد پروان چڑھے۔ محرم کا عشرہ عزاداروں کو آہ و بکا میں گزرے لیکن پورا سال خوشی میں گزرے۔

بس انیسؔ اب یہ دعا مانگ کر لے ربِّ عباد
لکھنؤ کے طبقے کو تو سدا رکھ آباد
رونے والے شہ والا کے رہیں خلق میں شاد
ان کے سائے میں برومند ہو ان کی اولاد
عشرۂ ماہ عزا نالہ کشی میں گذرے
سال بھر شہ کے غلاموں کو خوشی میں گذرے

لکھنؤ کے عزاداروں کے لیے میر انیسؔ نے متعدد مرثیوں میں دعائیں کی ہیں۔

ہے وقت دعا حق سے انیسؔ اب تو دعا کر
جو حاجتیں ان لوگوں کی ہیں ان کو روا کر
ان تعزیہ داروں پہ تو الطاف و عطا کر
مقروض جو مومن ہوں تو قرض ان کا ادا کر
محتاج نہ ہوں تیرے سوا اور کسی کے
اور حشر میں ہوں ساتھ حسین ابن علی کے

واجد علی شاہ کے بھائی سکندر حشمت مرزا جو فوج شاہی کے سپہ سالار تھے ان کے یہاں کی مجلس میں میر انیسؔ نے یہ مرثیہ پڑھا تھا۔

جب آمد سردار دو عالم ہوئی رن میں
مقطع میں ان کے لیے دعا کی ہے۔

یہ وقت دعا کا ہے انیسؔ اب نہ ہو غافل
یا رازق و یا حافظ و یا خالق و عادل
عالم میں برحشمت رہے یہ بانی محفل
سب مطلب دل سے ہوں تری درگاہ سے حاصل
ہر لحظہ فزوں دولت و اقبال و حشم ہو
غم ہو تو فقط فاطمہ کے لال کا غم ہو

میر انیسؔ لکھنؤ کی مجالس کے مجمعوں کو بنظر تحسین دیکھتے تھے اور انھیں نظر بد سے بچانے کی دعائیں کرتے تھے۔

ہے فصل عزا جدا جدا مجلس ہے
گھر گھر ماتم ہے جا بجا مجلس ہے
ماشاء اللہ چشم بد دور انیسؔ
کیا مجمع مومنین ہے؟ کیا مجلس ہے

لکھنؤ کو آباد رہنے کی دعا حشر تک (میر انیسؔ کی زبان سے)

بس اے انیس اب تو ہے شور فغان و آہ
آمین زبان دل سے کہیں عاشقان شاہ
آباد لکھنؤ رہے تا حشر یا اللہ
رکھ میرے دوستوں کو جہاں میں بعز و جاہ
یارب ہرا بھرا چمن آرزو رہے
جب تک چمن میں گل رہے اور گل میں بو رہے

میر انیسؔ اہل لکھنؤ کو ہر مشکل اور مصیبت سے بچانے کی دعائیں کرتے ہیں۔

خاموش انیسؔ اب کہ ہے دل سینے میں بیتاب
جاری عوض اشک ہوا چشم سے خوں ناب
خالق سے دعا مانگ یہ با دیدۂ پرآب
سرسبز رہیں فاطمہ کے لال کے احباب
کچھ غم نہ انھیں جز غم شاہ شہدا ہو
محتاجوں کو راحت ہو مریضوں کو شفا ہو

صفر کا مہینہ اختتام پر ہے۔ چہلم کی مجلسوں کا ذکر کرتے ہوئے میر انیسؔ امام حسین کو الوداع کہہ رہے ہیں یہاں بھی لکھنؤ کی مجلسوں اور سامعین کی تعریف میر انیسؔ کے مدنظر ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اے بے دیار و بے سر و سامان الوداع
اے بنت مصطفیٰ کے دل و جان الوداع
اے دو جہاں کے سید و سلطان الوداع
اے شیعان ہند کے جہان الوداع
آہ و بکا سے ہم کبھی غافل نہ ہوئیں گے
جب تک جئیں گے آپ کی غربت پہ روئیں گے

مولا ضریح پاک پہ بلوائیے شتاب
اب ہجر کی انیسؔ کو بالکل نہیں ہے تاب
رہ جائے گی ہوس جو دیا زیست نے جواب
خاک شفا ملے مجھے یا ابن بوتراب
اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے

میر انیسؔ بادشاہ سلطان عالم واجد علی شاہ اور ان کی زوجہ محترمہ عالم آرا کا ذکر چوتھے مصرع میں کرتے ہیں یعنی اودھ کا حکمراں بھی ان کا مداح ہے۔ میر انیسؔ کی قدردانی میں کسی طرح سے کمی نہیں ہے۔ کیا شاہی خاندان اور کیا عوام سبھی تو انیسؔ کے مداح ہیں پھر لکھنؤ کوفہ کیسے ہو سکتا ہے لکھنؤ کے عدد اور کوفہ کے عدد کیوں ملائے جا رہے ہیں۔

بس اے انیسؔ ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم کو یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند بند ہیں سلطاں پسند بند
یہ فصل اور یہ بزم عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

لکھنؤ کی خلقت کے لیے میر انیسؔ مولا سے مدد مانگ رہے ہیں۔

خلقت کے درد و رنج مصیبت کو رد کرو
آقا مدد کرو مرے مولا مدد کرو

لکھنؤ کے عزادار گریہ کرتے ہیں تو میر انیسؔ انھیں مرحبا کہتے ہیں۔

خاموش اب انیسؔ کہ اک حشر ہے بپا
مجلس میں چار سمت ہے اک شور مرحبا

میر انیسؔ بادشاہ کے لیے دعا کرتے ہیں۔

خالق سے اٹھا کر دعا کر یہ بہ انکسار
قائم رہے جہاں میں یہ شاہ فلک وقار
ہر دم زیادہ حشمت و اقبال و جاہ ہو
حامی جناب فاطمہ زہرا کا ماہ ہو

ملکہ زمانی بھی میر انیسؔ کی مداح ہیں ان کے لیے دعا کرتے ہیں

بس انیسؔ آگے مناسب نہیں تطویل کلام
کر دعا رب سے کہ یا ربّ علیم و علام
ہے جو یہ ملکہ زمانی یہ با تعجیل تمام
دیکھ لے آنکھوں سے یہ روضۂ پرنور امام
آرزو ہے کہ یہ رتبہ تہہ افلاک ملے
اور اسے اب خدمتِ پنجتن پاک ملے

مجالس لکھنؤ کے امام باڑوں کی تعریف عزاداروں کی تعریف

ہے عرش جہاں فرش یہ کاشانہ ہے کس کا
ہر سو ہے تجلی یہ جلوخانہ ہے کس کا
جلتا ہے دل شمع یہ افسانہ ہے کس کا
سرگشتہ ہے مہتاب یہ پروانہ ہے کس کا
روشن ہے جہاں جلوۂ نور ازلی ہے
ہاں بزم معلّائے حسین ابن علی ہے

اللہ رے رتبہ یہ فلک ہے کہ زمیں ہے
ہے عرش مکاں جس کا وہ آج اس میں مکیں ہے
جو دل ہے سو وابستۂ لطف شہ دیں ہے
مجلس ہے کہ گلدستۂ فردوس بریں ہے
یہ اوج یہ رتبہ کسی محفل کو ملا ہے
ان پھولوں کے قربان عجب باغ کھلا ہے

آخری عزا الوداع اور لکھنؤ کے شیعہ عزادار

"زندہ رہیں دنیا میں شہ دیں کے عزادار"

مرثیے کے خاتمہ پر میر انیسؔ امام حسین کو الوداع کہتے ہوئے لکھنؤ والوں کی تعریف کرتے ہیں۔

ہاں اہل عزا مرثیہ اب ہوتا ہے آخر
پرسہ دو کہ ہے فاطمہ اس بزم میں حاضر

ہے ہے شہ آوارہ وطن ہائے مسافر
مذبوح تھا تشنہ دہن صابر و شاکر
زلفیں تری خاک میں سب اَٹ گئیں آقا
ہے ہے تری خنجر سے رگیں کٹ گئیں آقا

ہاں اہل عزا رو دو کہ ماتم ہوا آخر
اے مجلسیو پیٹو کہ یہ غم ہوا آخر
سامان عزائے شہ عالم ہوا آخر
کیا مجمع احباب تھا برہم ہوا آخر

یہ مجلس آخر ہے جگر بند نبی کی
تم لوگوں سے رخصت ہے حسین ابن علی کی

کیا خوب کٹے آٹھ دن اور دو یہ مہینے
نیلے رہے ماتم سے عزاداروں کے سینے
کوتاہ کیا ہاتھ نہ ماتم سے کسی نے
ہر روز دعائیں دیں تمہیں روح نبیؐ نے

دل روتا ہے صدمہ ہے عجب طرح کا جاں پر
دیکھو تو کہ کیا آج اداسی ہے مکاں پر

آقا ترے قربان خدا حافظ و ناصر
اے شیعوں کے مہمان خدا حافظ و ناصر
اے فاطمہ کی جان خدا حافظ و ناصر
اے دین کے سلطان خدا حافظ و ناصر

مجبور ہیں گر قبر میں ہم ہوئیں گے مولا
جیتے ہیں تو پھر اگلے برس روئیں گے مولا

خاموش انیسؔ اب کہ ہے سینے میں جگر چاک
حق ہے ترا اللہ حامی سبطِ شہ لولاک
حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہے کچھ باک
نافہم ہے وہ چاند یہ ڈالے جو کوئی خاک
سب مدح کریں نظم کی یہ نظم و نسق ہے
باطل ہے سو باطل ہے جو حق ہے سو حق ہے

میر انیسؔ کی نظر میں لکھنؤ والے امام حسین کے دوست دار ہیں سے

پُر نور ہے سب بزم وہ تارے یہ ہیں
زہرا و ید اللہ کے پیارے یہ ہیں
روتے ہیں جو بزم غم میں با نالۂ و آہ
شہ کہتے ہیں سب دوست ہمارے یہ ہیں

میر انیسؔ لکھنؤ والوں کو حیدری کہہ رہے ہیں۔

ہاں حیدریو! مرثیہ اب ہوتا ہے آخر
پُرسا دو کہ ہیں فاطمہ اس بزم میں حاضر

- - - - - -

اور لغو شاعر اپنے شعر میں
لکھنؤ والوں کو کوفی کہہ رہا ہے۔ اس لیے یہ لغو شعر میر انیسؔ
کا نہیں ہو سکتا۔

مصروف بکا بزم میں ہیں شاہ کے غم خوار
ہر شخص کے بر لائیں مطالب شہ ابرار

میر انیسؔ لکھنؤ والوں کو
"شاہ کا غم خوار"
کہہ رہے ہیں
لغو شعر میں جو "فلاں" کا ہے
وہ لکھنؤ والوں کو کوفی کہہ رہا ہے
اس لیے یہ لغو شعر میر انیسؔ کا ہو نہیں سکتا۔

کوفہ میر انیسؔ کی نظر میں

کربلا جاتے ہوئے راستہ میں امام حسین کو کوئی مرد مسافر
اگر نظر آجاتا تو گھوڑے کی عناں روک کر پوچھتے تھے۔

غربت کی جفائیں یوں ہی سہتے ہوئے دن رات
طے راہ خدا کرتے تھے شبیر خوش اوقات
ہو جاتی تھی جس مرد مسافر سے ملاقات
گھوڑے کی عناں روک کے فرماتے تھے یہ بات
ٹھہرا نہیں سکتا کہ سر راہ ہے بھائی
کوفے کی خبر سے بھی کچھ آگاہ ہے بھائی

ہر بار یہی خبر ملتی تھی کہ کوفہ میں محبانِ علی کو قتل کیا جا رہا ہے امام حسین جب کوفے کی خبر کسی سے پوچھتے وہ جواب میں یہی کہتا تھا ؎

وہ کہتا تھا کوفے میں عجب غدر ہے مولا
ہر سمت ہیں قصے تو فساد اٹھتے ہیں ہر جا
دوران کا ہے کچھ جن کو مروت نہیں اصلا
ہوتے ہیں ستم کوئی کسی کی نہیں سنتا
ٹوٹا ہے فلک ظلم کا شیعوں کے سروں پر
جب دیکھئے دوڑیں چلی آتی ہیں گھروں پر

اشراف ہیں جتنے وہ نکلتے نہیں گھر سے
دروازے نہیں کھولتے لٹ جانے کے ڈر سے
ہو جاتی ہے جب شام تردد میں سحر سے
سب کرتے ہیں سجدے کہ بلا ٹل گئی سر سے
یہ ظلم یہ بیداد نہیں اور کسی پر
مولا یہ تباہی ہے محبانِ علی پر

حضرت مسلم کے فرزندوں کی حالت کوفے میں

شیعوں کے گھروں میں تو یہ تھی گریہ و زاری
اور ڈھونڈتے پھرتے تھے انھیں کوفہ میں ناری
ناکے پہ لعیں کہہ گئے آکر کئی باری
ہوشیار خبردار اگر جان ہے پیاری
احکام میں حاکم کے خلل آنے نہ پائے
ناکے سے کوئی چھپ کے نکل جانے نہ پائے

کچھ خوف سے مخفی ہیں گرفتار ہیں کچھ لوگ
بگڑے ہوئے آمادۂ پیکار ہیں کچھ لوگ
کوفہ سے نکل جانے پہ تیار ہیں کچھ لوگ
کچھ قتل ہوئے ہیں بسر دار ہیں کچھ لوگ
بے جرم ستاتے ہیں محبانِ علی کو
غل ہے کہ چھپائے نہ کوئی گھر میں کسی کو

کوفے والوں نے حضرت مسلم سے غدّاری کی اور انھیں شہید کر دیا حضرت مسلم کی محبت میں کوفے والوں نے حضرت ہانی کو بھی شہید کر دیا۔ ایسے شہر کو کیا میر انیسؔ لکھنؤ سے ملا سکتے تھے ایک آوارہ شعر کو اس طرح بد دیانتی سے میر انیسؔ کا کہہ کر کسی کتاب میں لکھنا کہاں کا انصاف ہے۔

کوچوں میں منادی یہ صدا دیتا تھا ہر بار
بھاگا ہے کل اک مسجد کوفہ سے گنہ گار
گھر میں کوئی مجرم کو چھپائے نہ خبردار
آفت ہے محلوں میں بپا بند ہیں بازار
بچنے کا نہیں در پئے جاں دشمن دیں ہیں
مسلم کہیں پوشیدہ ہیں فرزند کہیں ہیں

آشوب ہے اس شہر میں اے خلق کے سردار
جو دیں کے ستوں تھے وہ مکاں ہو گئے تاراج
کیا کیا شرفا نانِ شبینہ کو ہیں محتاج
کل قتل ہوا وہ جو گرفتار ہوا آج
وہ خوش ہیں رعیت میں جو حاکم سے ملے تھے
پرسش ہے کیا سوچ کے مسلم لئے ملے تھے

جس روز کہ ہانی کو ستمگار نے مارا
عبرت تھی غضب شہر لرزتا رہا سارا
اک ایک کا صدمے سے کلیجہ تھا دوپارا
نے ضبط کی طاقت تھی نہ فریاد کا یارا
دل پھک رہے تھے آگ لگی تھی جگروں میں
فاقہ رہا دو روز محبوں کے گھروں میں

اس بند میں میر انیسؔ اہل کوفہ کو غدار، بدعہد اور مرتد کہہ رہے ہیں۔

مسلم سے بس اب پاس ہے یا حضرت شبیر
افسوس کہ پردیس میں بیوہ ہوئی ہمشیر
غدار ہیں بدعہد ہیں مرتد ہیں وہ بے پیر
اب کوفے میں چمکے گی ید اللہ کی شمشیر

یہ معرکہ دیکھے گا وہ زندہ جو رہے گا
خوں تا بہ کمر دارا مارہ میں بہے گا

اس بند میں میر انیس بتاتے ہیں کہ کوفے والوں نے حضرت مسلم کا سر کاٹا ہے۔

یہ غل تھا کہ حضرت نے کہا خیمے میں آ کر
اے بیبیو بیٹھو صف ماتم کو بچھا کر
مسلم سوئے فردوس گئے برچھیاں کھا کر
مارا ستم ایجادوں نے تنہا انھیں پا کر
کوفے میں سر پاک اتارا گیا تن سے
روز عرفہ کوچ کیا دار محن سے

کوفے کے حاکم نے حر کو اس لیے بھیجا ہے کہ امام حسین کو گھیر کر کوفہ لے آئے۔

سر شرم سے نہوڑا کے یہ بولا حر ذی جاہ
میں حاکم کوفہ کا فرستادہ ہوں یا شاہ
بہتر ہے کہ اب کوفہ میں چلئے مرے ہمراہ
میں اور طرف جانے نہیں دینے کا واللہ
ہر چند غلام پسر شیر خدا ہوں
مامور ہوں اس پر کہ نہ حضرت سے جدا ہوں

امام حسین فرماتے ہیں کہ یہ کوفی میرے دشمن جانی ہیں۔

سب کوفی و شامی ہیں مرے دشمن جانی

میر انیس کا یہ بند کس کو نہیں یاد۔ جس میں یہ مصرع ہے حضرت عباس کی زبان سے۔

غازی نے دی صدا کہ وہ مارا ذلیل کو
لو کوفیو! گرا دیا حرف ثقیل کو

کوفے والے جو دشمن اہلبیت ہیں وہ میر انیس کی نظر میں ذلیل ہیں پھر بھلا میر انیس لکھنؤ والوں کو کوفی کیسے کہہ سکتے ہیں یہ میر انیس پر کتنا بڑا الزام ہے کہ کوئی صاحب میر انیس کے نام سے منسوب یہ لغو شعر پڑھیں۔

- - - - - - - -

کوفے سے مل رہے ہیں کسی شہر کے عدو
ڈرتا ہوں اے "فلاں"، کہیں لکھنؤ نہ ہو

میر انیس کہتے ہیں کوفے کے لوگ مفسد، بدطریق بداعتقاد ہیں۔ کوفی حضرت فاطمہ زہرا کو رلاکر شاد ہو رہے تھے۔

کوفی تمام مایۂ جور و فساد ہیں
مفسد ہیں بدطریق ہیں بد اعتقاد ہیں
تربت میں فاطمہ کے رلانے پہ شاد ہیں
تیغیں ادھر ہیں دل سوئے ابن زیاد ہیں
بے ہمتوں نے کون سا وعدہ وفا کیا
کیونکر کہوں کہ مسلم بیکس سے کیا کیا

پروفیسر علی احمد فاطمی کا ایک مضمون ڈاکٹر حسن مثنی کی کتاب "انیس اور انیس شناس" میں صفحہ ۱۸۱ پر انیس ترقی پسند شاعری کا پیش رو" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

فاطمی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ۔

انیس جیسا حساس، دراک اور ذمے دار شاعر اس صورت حال کا صرف تماشائی نہیں بن سکتا تھا۔ انھیں صرف تبدیلیوں کا ہی نہیں مجبوریوں کا بھی عرفان تھا۔ ان کے دوربیں اور نکتہ رس ذہن نے ان تمام صورتوں کو واقعہ کربلا میں تلاش کیا اور اپنے دور کو دور یزیدی کے قریب لاکر اس عہد کی فرادیت اور مجرمانہ قاتلی اور خاموشی کو آواز دینے کی کوشش کی للکار اور طنز بھی کیا۔

کوفے سے مل رہے ہیں کسی شہر کے عدو
ڈرتا ہوں اے "فلاں" کہیں لکھنؤ نہ ہو

فاطمی صاحب وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس شعر کو میر انیس سے منسوب کرکے شائع کیا ہے۔ میر انیس کی وفات سے اب تک یہ شعر آج تک کسی کتاب میں چھپا ہوا نہیں ملتا۔

اگر یہ میر انیس کا شعر ہے تو سید مسعود حسن ادیب، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر شارب ردولوی نے یہ شعر اپنی تحریروں میں کیوں نہیں دیا۔ میر انیس کے سوانح نگاروں میں

امجد علی اشہری اور احسن لکھنوی نے اپنی کتابوں میں یہ شعر کیوں نہیں چھاپا۔ خاندان میر انیسؔ کے افراد نے کبھی یہ شعر اپنی تحریروں میں کیوں نہیں پیش کیا۔ فاطمی صاحب کیا بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے کہ یہ شعر انھیں کہاں سے ملا ظاہر ہے وہ نہیں بتا سکتے کہ یہ شعر انھیں کہاں سے ملا کسی کتاب کا حوالہ ان کے پاس نہیں ہے اور وہ شرمندہ ہو جائیں گے میر انیسؔ کے مرثیوں کی چھ جلدوں میں تلاش کریں گے لیکن انھیں یہ شعر کہیں نہیں ملے گا۔ پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

میر انیسؔ کے دور میں فراریت اور مجرمانہ تساہلی کس نے کی لکھنؤ والوں نے یا پورے ہندوستان نے ایسا کیا، کیا دہلی والے ۱۸۵۷ میں دودھ سے دھلے ہوئے تھے اور کیا الٰہ آباد اور کانپور والے جنگ آزادی لڑ رہے تھے خوب نکتہ نکالا ہے فاطمی صاحب نے ۱۸۵۷ میں پورے ہندوستان نے انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے صرف لکھنؤ والے ۱۹ دن مسلسل جنگ لڑتے رہے" جنگ آزادی ہوئی صرف لکھنؤ میں اور کہاں ہوئی۔

اس عظیم محاذ کو فاطمی صاحب "فراریت اور تساہلی" کہہ رہے ہیں اور اس عہد کے کسی شاعر نے اس "فراریت اور تساہلی" کو نہ سمجھا تو میر انیسؔ نے سمجھا جو حیدر آباد دکن، پٹنہ عظیم آباد، الٰہ آباد بنارس سب جگہ ہو کر واپس آئے تو اپنے ایک مشہور مرثیہ۔

جب تک خدا کا علم سرنگوں ہوا

میں چند بندوں کا اضافہ کیا یہ بند اس لیے لکھے گئے کہ لکھنؤ سے دور جاکر انھیں لکھنؤ کی اور زیادہ قدر معلوم ہوئی۔ حیدر آباد کے مجمع میں انھوں نے کہا "ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں"

شہر شہر جانے کے باوجود لکھنوی تہذیب کے عاشق میر انیسؔ کا کہیں دل نہ لگا۔

آخر وطن واپس آئے تو اس بات کا برملا اظہار کر دیا۔

پوچھو تو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گل ایسا ہزار میں
نعرے علی علی کے ہیں قربان لکھنؤ

فاطمی صاحب جس عہد کی بات کر رہے ہیں جس دور کو "فراریت اور تساہلی کا دور" کہہ رہے ہیں اسی دور کے لکھنؤ کی تصویر میر انیسؔ اس طرح کھینچتے ہیں ملاحظہ کیجیے۔

گلشن کو صدقے کیجئے یہ مجلس کا رنگ ہے
مانی بھی اس مرقع ماتم سے دنگ ہے
نوحوں میں ایک نالۂ بلبل کا ڈھنگ ہے
ماتم کے ولولے ہیں بکا کی امنگ ہے
چہلم کے بعد سوگ کے کپڑے اترتے ہیں
جیتے رہیں یہ لوگ کہ رونے پہ مرتے ہیں
مجلس کا انتظام اسی شہر پر ہے ختم
رونے کا اہتمام اسی شہر پر ہے ختم
یہ آبرو یہ نام اسی شہر پر ہے ختم
بس ماتم امام اسی شہر پر ہے ختم
پوچھو تو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گل ایسا ہزار میں
ہر دل ہے عندلیب گلستان لکھنؤ
رضواں بھی ہے ارم میں ثنا خوان لکھنؤ
گلزار مومنیں ہے رہے شان لکھنؤ
نعرے علی علی کے ہیں قربان لکھنؤ
ہر ایک شیعہ عاشق شیدا علی کا ہے
بے فصل سب کو عشق خدا کے ولی کا ہے

ہر چند بے اثاث ہیں یہ آسمان اساس
رازق کا آسرا ہے فقط اور سب سے یاس
نے پیرہن درست نہ زر ہے کسی کے پاس
زیبا مگر گلوں کی طرح ہیں پھٹے لباس

جوہر شناس ان کے امام جلیل ہیں
کہنہ ہیں گو لباس تعین اصیل ہیں
ذی علم نکتہ فہم سخن سنج و ذی شعور
ذی قدر و ذی وقار فروتن سخی غیور
نخوت نہ خودسری نہ تکبر نہ مکر و زور
وضعیں درست قلب صفا اور رخوں پہ نور
کیوں کر نہ فرش و عرش پہ یہ نیک نام ہوں
آقا حسین سا ہو تو ایسے غلام ہوں
(ماخوذ از مرثیہ جب لشکر خدا کا علم سرنگوں ہوا۔ مخطوطہ ۱۲۷۲ھ)

چھڑ جائیں گے پھر لاکھوں قصے یہ بات یہیں تک رہنے دو

سوال یہ ہے کہ یہ شعر کس کا ہے؟ اور میر انیس سے کیوں منسوب کیا گیا۔ لکھنؤ سے رقابت میں چھوٹے بڑے بہت سے شہر مشہور ہیں ایک بہت چھوٹا شہر جس کی شہرت تقسیم ہند کے بعد ہوئی اور پاکستان میں اس شہر کو دہلی اور لکھنؤ کے ادبی دبستانوں کے مقابل لاکر رکھا گیا۔ یہ شہر یوپی میں ہے۔ اسی شہر میں اس شعر کی تخلیق ہوئی شاعر کا نام بھی بہت سے لوگوں کو معلوم ہے۔

"چھڑ جائیں گے پھر لاکھوں قصے یہ بات یہیں تک رہنے دو"

سرے سے یہ شعر ہی غلط ہے شعر میں بہت سی غلطیاں ہیں جو ایک عام شاعر بھی نہیں کر سکتا ہاں کوئی مضافاتی شاعر ایسے پیچھے کھا سکتا ہے اب اس مصرعہ کو لیجئے۔

کوفے سے مل رہے ہیں کسی شہر کے عدد

کوفے کے عدد ہیں	لکھنؤ کے عدد ہیں
ک ۲۰	ل ۳۰
و ۶	ک ۲۰
ف ۸۰	ھ ۵
ے ۱۰	ن ۵۰
	و ۶
۱۱۶	۱۱۱

۱۱۱۔ اور ۱۱۶ میں ۵ کا فرق ہے۔
مضافاتی شاعر نے مصرعہ یوں کہا ہوگا۔
"کوفہ سے مل رہے ہیں کسی شہر کے عدد
لکھنؤ والے اسے کوفہ نہیں 'کوفے' پڑھیں گے۔
'کوفے' ہی لکھیں گے۔

یہ جوش ملیح آبادی کا لطیفہ ہو گیا۔
سجاد ظہیر سے جوش نے پوچھا۔ کہاں سے آرہے ہو انھوں نے کہا 'پونہ' سے۔ جوش نے رضیہ سجاد ظہیر سے کہا تھوڑا سا زہر دے دو تاکہ میں کھا کر مر جاؤں۔ ارے اردو کا ادیب "پونے" کی جگہ "پونہ" بول رہا ہے۔

لکھنؤ والے ثاقب کا شعر اس طرح پڑھتے ہیں۔
گلشن میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹے آواز نہیں آتی
مضافاتی شاعر مصرع ثانی اس طرح پڑھے گا
اللہ رے سناٹا! آواز نہیں آتی
لکھنؤ والے مصرع ثانی اس طرح پڑھتے ہیں
اللہ رے سناٹے! آواز نہیں آتی
کوفے سے مل رہے ہیں کسی شہر کے عدد
کوفے اور لکھنؤ کے عدد الگ الگ ہیں۔ میر انیس ایسی غلطی نہیں کر سکتے تھے۔

مصرع میں دوسری غلطی یہ ہے کہ شاعر یہ کہنا چاہتا تھا کہ کوفے کے عدد سے کسی شہر کے عدد مل رہے ہیں یہ غلطی بھی میر انیس نہیں کر سکتے تھے۔

پہلے مصرع میں شاعر نے تقیہ کیا ہے وہ شہر کا نام نہیں بتانا چاہتا۔ "کسی شہر" کہہ کر صرف اشارہ کر رہا ہے اچانک دوسرے مصرعہ میں ڈرتے ڈرتے شہر کا نام لے لیا۔ سوال یہ ہے کہ ڈر کس بات کا ہے۔

"ڈرتا ہوں اے فلاں کہ وہ لکھنؤ نہ ہو"

یہاں بھی شاعر شک میں پڑا ہوا ہے کہ کہیں وہ شہر

لکھنؤ نہ ہو۔ شاعر کو کس بات کا ڈر ہے یہ شعر سے ظاہر نہیں ہو رہا ہے۔

جب سے کوفہ آباد ہے جب سے اس کے عدد

ک ۲۰
و ۶
ف ۸۰
ہ ۵

۱۱۱

اور جب سے لکھنؤ آباد ہے جب سے اس کے عدد

ل ۳۰
ک ۲۰
ھ ۵
ن ۵۰
و ۶
ء ۱

۱۱۲

ایک سو بارہ (۱۱۲) ہیں۔ یہ ۱۸۵۷ کے بعد کیا خاص بات ہو گئی کہ دونوں شہروں کے عدد اگر برابر ہو جائیں گے تو گویا قیامت آ جائے گی اگر اثر آنا تھا تو اسی وقت آ جاتا جب لکشمن جی نے بنواس سے واپس آکر اس شہر کو آباد کیا تھا۔ عدد کے اثرات ۱۸۵۷ کے بعد کیوں ظاہر ہوئے۔ میر انیسؔ علم اعداد میں ہمزہ ''(ء)'' کی اہمیت جانتے تھے ہندی میں جب (लखनऊ) لکھتے ہیں تو آخر میں او کی آواز آتی ہے اور بغیر ہمزہ (ء) اردو میں لکھنؤ لکھنا غلط ہے یہ ہمزہ او کی آواز بنا رہا ہے ہمزہ کے بغیر ''لکھ نو'' ہو جائے گا۔

میر انیسؔ یہ تمام باریکیاں جانتے تھے کہ علم اعداد عربی سے اردو میں آیا ہے اور ہمزہ بھی عربی سے اردو میں آیا ہے۔ مضافاتی شاعر جس نے یہ شعر کہہ کر میر انیسؔ سے منسوب کر دیا وہ زندگی بھر لکھنؤ میں رہ کر بھی لکھنؤ سے خوش نہیں رہا۔

''چھڑ جائیں گے پھر لاکھوں قصے یہ بات یہیں تک رہنے دو''

اب بھی اگر کسی صاحب کو اصرار ہے کہ یہ شعر میر انیسؔ کا ہے تو لکھنؤ میں ڈاکٹر نیر مسعود صاحب بھی موجود ہیں اور خاندان انیسؔ کے علی احمد دانشؔ صاحب بھی موجود ہیں ان سے دریافت کیا جائے کہ یہ شعر میر انیسؔ کے کس مجموعہ میں ہے مرثیوں میں ہے یا سلاموں میں۔ یا یہ شعر میر انیسؔ نے کس کو سنایا تھا اس راوی کا نام بتایا جائے۔ میر انیسؔ کے کسی قلمی نسخہ میں یہ شعر درج پایا گیا ہے تو اس کا بھی حوالہ دیا جائے۔

میں تو حیران ہوں یہ پروفیسر علی احمد فاطمی صاحب نے کیا کیا؟

◇◇

میر انیس از دیدۂ بزرگاں .... (صفحہ ۲۸ کا بقیہ)

مقتدر اور جہتم بالشان لفظوں کے شاہکار ہیں جن سے اردو شاعری کا اخلاقی و تمدنی جذبہ بہ مراتب بلند اور بہ منازل اہم ہو جاتا ہے۔''

(صحیفہ تاریخ اردو از سید محمد مخمور رضوی اکبر آبادی)

انیسؔ نے جو سب سے اہم کام کیا یہ ہے زبان و تہذیب کا تحفظ۔ جوشؔ اور نظیرؔ کا نام ان کی لفظیات کے حوالے سے بہت لیا جاتا ہے۔ انیسؔ نے ایک مخصوص تہذیب اور زبان، محاورے اور روزمرہ کو اپنے مراثی کے ذریعہ محفوظ کر کے اردو ادب اور زبان کی ایک بہت بڑی خدمت کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام صرف مرثیے جیسی ہی صنف سخن کی بدولت ممکن تھا ہو سکتا ہے کوئی یہ بات کہے کہ غزل نے بھی یہی کام کیا ہے یقیناً کیا ہے مگر غزل میں اجمال ہوتا اور مرثیے میں تفصیل اور تفصیل مرثیے کا ایک اہم عنصر ہے۔

◇◇

رئیس حسین
۲۸ غازی منڈی وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ ۳
8799414666

میر انیسؔ کا لکھنؤ

مشہور ادیب و محقق، مدرس اور بے مثل مزاح نگار جناب رشید احمد صدیقی صاحب مرزا غالب پر تحریر ایک مضمون میں فرماتے ہیں کہ... اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو شاہان مغلیہ نے ہندوستان کو دو نایاب چیزیں عطا کی ہیں ایک آگرے کا تاج محل دوسرے مرزا غالب جیسا منفرد شاعر۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی صاحب نظر ان کے اس فرمان سے اتفاق نہ کرے ایسا نہیں ہوگا اس طرح انھوں نے مرزا غالب کی تعریف کا ایک انوکھا پہلو نکالا تھا جس کی ندرت، تازگی اور نرالے انداز بیان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ اسی نہج پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہی کے ایک مدرس اور محقق ڈاکٹر سجاد علی کوکب قدر صاحب جو شاہ اودھ واجد علی شاہ بہادر کے پرپوتے لگتے ہیں انھوں نے اپنے اور میر انیسؔ کے خاص مرثیے کے ذیل میں لکھے مضمون میں فرمایا تھا کہ شاہان اودھ نے اپنے دور حکومت میں دنیا کو دو بے مثل نوادرات عطا کئے تھے ایک امام باڑہ آصفی اور دوسرے شاعر اعظم مرثیہ نگار میر انیسؔ (میں اس میں مرزا دبیر کو شامل سمجھتا ہوں) بادی النظر میں اس انداز بیان میں مضمر دونوں شاعروں (انیسؔ و غالبؔ) کی تعریف و توصیف مقصود ہے دوسرا ایک اور اہم پہلو جسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا وہ عمارت اور فنکار کی اس شہر سے نسبت ہے۔ یعنی

جب بھی اس شہر کا ذکر ہوگا فنون لطیفہ کا ہر شائق دونوں شاعروں کو نظر انداز نہیں کرسکے گا چنانچہ علم و ادب یا شعر و شاعری سے متعلق جب بھی بات چلے گی لکھنؤ اور آگرے کے ذکر کے ساتھ دونوں شاعروں کو نہ یاد کیا جائے ایسا ممکن نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ انیسؔ کے ذکر کے ساتھ لکھنؤ کے ذکر کو جدا نہیں کیا جاسکتا ہے یہ دونوں لازم ملزوم ہیں چنانچہ آج بھی آغوش مادر کی طرح سرزمین لکھنؤ ان کے جسد خاکی کو سینے سے لگائے ہوئے ہے اور وہ اپنے مقبرے میں آسودۂ خاک ہیں۔ یہ شہر لکھنؤ کو فخر حاصل ہے کہ میر انیسؔ کے فن کو نکھارنے اور جلا بخشنے میں یہاں کے محرم کی عزائی فضا کا بڑا ہاتھ ہے نیز یہاں کے لوگوں کا شعر و شاعری سے دلی لگاؤ، علم و ادب کی صحیح پرکھ اور علماء و فضلا کی ان کے تئیں پذیرائی ورنہ اس سے پہلے جب وہ فیض آباد میں متمکن تھے تو بہت سے بہت تیس ۳۰ یا بتیس ۳۲ بند کے مرثیے ہی کہتے تھے اس وقت ان کے انشا کا انداز بس بیانیہ ہی ہوتا تھا۔ لکھنؤ کی رہائش کے بعد انھوں نے اپنی اس کمی کا احساس ہوتے ہی اس کو منسوخ کردیا۔ اپنی ایک نجی گفتگو میں اس کمی کا اعتراف بھی کیا تھا۔ اس وقت ان کے مرثیے کا انداز کچھ اس طرح تھا کہ جس تاریخ کو مرثیہ پڑھتے تھے اس تاریخ کا ذکر اپنے مرثیے میں کرتے ہوئے

فرماتے تھے مثلاً۔ مومنو آج محرم کی پہلی یا دوسری یا تیسری تاریخ ہے مگر اس ذکر سے یہ احتمال نہ پیدا ہو کہ اس وقت میرانیسؔ کی قدر و منزلت میں کوئی کمی اس وجہ سے واقع تھی نہیں ایسا نہیں تھا مگر اس وقت تک میر صاحب کے کلام میں یہ پختگی جو بعد میں ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز بنی نہیں آئی تھی اس وقت کے کہے ہوئے مرثیے ان کے دیوان میں محفوظ ہیں انھیں پڑھ کر قارئین میری بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ دراصل اس زمانے میں عام دستور ایسا ہی تھا لوگ مرثیہ حصول ثواب کا ذریعہ سمجھ کر کہا کرتے تھے اس میں وہ فن شاعری کے لوازمات کا کوئی لحاظ نہیں کرتے تھے اور اپنے مبلغ علمی کے مطابق شاعرانہ انداز میں شہیدان کربلا کو خراج عقیدت پیش کر دیا کرتے تھے مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی کو صرف رونے رلانے اور ثواب کمانے کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ سامعین بھی ان کی فنّی خامیوں پر حرف زنی نہیں کرتے تھے وہ تو خدا بھلا کرے مرزا رفیع سودا کا انھوں نے مرثیہ کی اس خامی کی طرف شعراء کی توجہ مبذول کرائی چنانچہ بعد میں میر مظفر حسین ضمیرؔ کی اصلاحی کوششوں اور جدّت طرازی سے اس کی الجھی ہوئی زلفیں سلجھیں۔ انھوں نے موجودہ مرثیے کا خاکہ تیار کیا اور اپنے مرثیے اسی نہج پر کہے جسے سامعین نے بہت پسند کیا چنانچہ عوام و خواص سے سند مقبولیت ملنے کے بعد لوگوں نے اسی طرز کو اپنا لیا جب میرانیسؔ رہنے کے خیال سے وارد لکھنؤ ہوئے تو یہاں مرثیہ نگار اسی جدید روش پر گامزن تھے۔ میرانیسؔ یہاں کی رہائش سے پہلے بھی اپنے والد میر خلیقؔ کے ساتھ آتے رہتے تھے۔ مگر اس وقت ان کی ذاکری کا کوئی غلغلہ یہاں نہیں تھا۔ ہاں ان کی ایک مجلس کا ذکر جو انھوں نے اکرام اللہ خاں کے امام باڑے میں پڑھی تھی ملتا ہے۔ ان کی اس کامیاب مجلس کی شہرت اس وقت لکھنؤ میں خوب ہوئی تھی اور ان کے انداز خواندگی کو لوگوں نے بہت پسند کیا تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر آیا ہوں کہ میرانیسؔ کی آمد سے پہلے لکھنؤ میں جدید مرثیہ کا چلن عام ہو چکا تھا چنانچہ مرزا دبیرؔ اور ان کے ہم عصر مرثیہ نگار اسی ہیئت میں مرثیہ کہہ رہے تھے اس زمانے میں مرزا دبیرؔ اور میر بداری کی لکھنؤ میں بہت شہرت تھی جس کا ذکر میرانیسؔ نے اپنے ایک بیان میں کیا تھا۔ لکھنؤ میں شروع شروع میں میرانیسؔ کے کلام سے یہاں کے لوگ متاثر نہیں ہوئے تھے وجہ ان کے قدیم طرز میں کہے ہوئے مرثیوں کا انداز بیان تھا کامیابی نہ ملنے سے میرانیسؔ بہت کبیدہ خاطر ہوئے جس کا ذکر بہت دردبھرے انداز میں اپنی مناجاتوں اور دعاؤں میں کیا ہے۔ مزید کچھ مرثیوں کے درمیانی حصوں میں وہ انبیاء کرام، خداوند کریم ائمہ اطہار سے کلام کی مقبولیت کے لیے مدد کے طالب ہوئے ہیں۔ دراصل اس زمانے میں میر ضمیرؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام سے لوگ اس درجہ متاثر تھے کہ ان کو میرانیسؔ کے سہل ممتنع اور سلیس لہجہ میں سیدھے سادے انداز میں کہے ہوئے مرثیے متوجہ نہیں کر سکے۔ اس وقت لوگ اس طرز سخن کے جو مرزا دبیرؔ اور ان کے استاد میر ضمیرؔ سے مخصوص ہے اس درجہ مانوس اور متاثر تھے کہ ان کو میرانیسؔ کے کلام شعری اور فن سخنوری نیز بہترین طرز خواندگی بھی متاثر نہیں کر سکی۔ اور میرانیسؔ کچھ عرصہ تک ایک صبر آزما کشمکش میں مبتلا رہے اور اپنی جگر کاری کی کوئی داد تحسین نہیں پا سکے مگر دھیرے دھیرے بقول اقبالؔ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" ان کے دل نشین انداز بیان کو ثمرہ تسنیم میں دھلی ہوئی سلیس خاندانی زبان، ان کے پڑھنے کا متاثر کن انداز، لہجہ کی دلکشی، مضامین کا نیاپن، خود اپنے فن پر اعتماد۔ ان سب سحر کارانہ خوبیوں نے یہاں کے قدر دانوں کے دلوں کو اور ذہنوں کو اپنی گرفت میں

لے لیا مگر ان کی یہ کامیابی یہاں کے رنگ سخن اختیار کرنے کے بعد ملی۔ اس کے بعد جو عزت و توقیر قدر دانی کی صورت میں ان کو ملی وہ کسی شاعر کو شاید ہی ملی ہو۔ لکھنؤ میں ہر ایک طبقہ میں ان کا بہت احترام کیا جاتا تھا چنانچہ عبقری حیثیت کے حامل جناب مفتی محمد عباس صاحب جن کی علمی جلالت اس سے عیاں ہے کہ وہ مختلف عنوانات پر مشتمل سیکڑوں کتابوں کے مصنف تھے مرزا غالبؔ کو جب کوئی علمی یا ادبی دقت پیش آتی تھی تو انیس سے وہ مشورہ طلب کرتے تھے خود مفتی صاحب انیسؔ کے کلام کے شیدائی تھی۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے نوابین، روسا، والیان ریاست صاحبان منصب و مراتب، عوام الناس سبھی لوگ ان کی مجلس ذوق شوق سے سنتے تھے۔

حکومت اودھ کے صیغۂ مال کے معتمد عہدہ دار دیانت الدولہ بہادر میر انیسؔ کے کلام سے اس درجہ متاثر تھے کہ ایک امام باڑہ اور اس سے متصل قطعہ مکان جو انھوں نے اپنے لیے بنوایا تھا میر انیسؔ کی احتیاج کو دیکھ کر ان کی نذر کر دیا۔ ان کا یہ مکان اور امام باڑہ انگریزوں نے ۱۸۵۷ میں زمین بوس کر دیا تھا اور ان کو خانہ بربادی پر مجبور کیا۔

شاہ اودھ نواب واجد علی شاہ بہادر کے خسر اور ان کے وزیر اعظم علی نقی خاں میر انیسؔ سے عشرہ پڑھواتے تھے۔ ایک بار دوران عشرۂ مجالس وہ نظر نہیں آئے میر صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ علیل ہیں۔ یہ سن کر میر صاحب نے بھی مجلس پڑھنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ مجبوراً وزیر اعظم کو مجلس میں آنا پڑا مزید معذرت بھی کی۔ شاہ اودھ واجد علی شاہ کی سرکار سے تنخواہ مقرر تھی جو سلطنت اودھ کے قیام تک ان کو ملا کی۔ لکھنؤ میں ان لوگوں کو مجالس سے اتنی یافت ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے تمام خاندان کے ساتھ آرام سے زندگی امیروں کی سی بسر کرتے تھے۔ اس طرح اہل لکھنؤ نے ان کی بہت قدر دانی کی اور وہ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے تھے مگر بقول انیسؔ کے۔

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیسؔ

۱۸۵۷ء کا المیہ رونما ہوا لکھنؤ برباد ہو گیا شاندار عمارتیں کھنڈر میں تبدیل ہو گئیں جن ڈیوڑھیوں پر ہاتھی جھومتے تھے جہاں آٹھ پہر نوبت بجتی تھی وہاں سوائے خاموشی کے کچھ نہیں بچا نہ ان کی شان و شوکت باقی رہی اور نہ طبل و علم جہاں نقارے بجتے تھے وہاں سناٹا چھا گیا۔ یہ بدلی ہوئی مایوس کن صورت حال بہت عبرت خیز تھی اور یہاں والوں کے لیے عظیم مصیبت تھی جس کے نازل ہونے کے بعد لکھنؤ والے پھر سنبھل نہیں سکے۔ لکھنؤ کی خوشحالی بدحالی میں بدلنے کے بعد یہاں کے فنکار اس سے محفوظ رہتے یہ کیسے ہو سکتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ میر انیسؔ جیسے غیور مرثیہ نگار کو عظیم آباد اور حیدر آباد جیسے دور دراز شہروں کے سفر نان و نمک کی فراہمی کے لیے کرنا پڑے مگر یہ سفر انھوں نے بڑی مجبوری کی حالت میں کیے تھے اور یہ بات ان کی انا پر بار تھی جس کا اظہار اشعار کی شکل میں کیا ہے ان لوگوں نے میر انیسؔ کے شایان شان پذیرائی کی اور مہمان نوازی اور قدر دانی میں کوئی کمی نہیں کی۔ ان لوگوں نے توقع سے بہت زیادہ ان کی تواضع کی مگر یہ سفر ان کی ڈھلتی عمر اور گرتی ہوئی صحت کے لیے موت کا پیش خیمہ ثابت ہوئی انھیں اسفار کے بعد وہ علیل رہنے لگے اور آخر کار ۱۸۷۴ء میں وہ مالک حقیقی سے جا ملے۔

حالانکہ ان کے میزبانوں نے ان کو ہر طرح نوازا اور بہت خاطر تواضع کی مگر تمام قدر افزائیوں کے باوجود وہاں انھوں نے اپنے لکھنؤ کے سامعین کو بہت یاد کیا تھا جہاں قدر دانوں نے نہ اظہار پسندیدگی میں کوئی کمی کی اور نہ داد و تحسین میں کوئی بخل سے کام لیا مگر لکھنؤ آنے کے بعد اکثر مرثیوں میں انھوں نے لکھنؤ والوں کی دل کھول کر تعریف اور ان کے مزاج کی یہ تبدیلی پردیس سفر کے بعد ہی ظاہر ہوئی ان

ان کے دو بند یہاں پیش کرنے کے لیے دے رہا ہوں اس
کے علاوہ متعدد بند ایسے ہیں جن میں اہل لکھنؤ کی نیاز مندیوں
ان کی خوبیوں، علم و ادب کی قدر دانیوں کے تذکرے کئے
ہیں مگر میں صرف طوالت کے خیال سے دو ہی بند دے رہا
ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مجلس کا انتظام اسی شہر پہ ہے ختم
رونے کا اہتمام اسی شہر پہ ہے ختم
یہ آبرو یہ نام اسی شہر پہ ہے ختم
بس ماتم امام اسی شہر پہ ہے ختم
پوچھو تو پھر کے آئے ہیں یاں ہر دیار میں
دیکھا نہ ہوگا ایک گل ایسا ہزار میں

ذی علم، نکتہ فہم، سخن سنج، ذی شعور
ذی قدر و ذی وقار فروتن، سخی غیور
نخوت نہ خود سری تکبر نہ مکر و زور
وضعیں درست قلب صفا اور رخوں پہ نور
کیوں کر نہ فرش و عرش پہ یہ نیک نام ہوں
آقا حسین سا ہو تو ایسے غلام ہوں

میر انیس کے اسلاف دہلی سے فیض آباد منتقل ہوئے
تھے میر انیس وہیں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی لکھنؤ
وہ جب آئے جب ان کی کئی اولادیں جوان ہو چکی تھیں مگر ان
کو جو کچھ بھی زندگی میں نیک نامی، عزت و شہرت، قابل رشک
رتبہ ملا وہ لکھنؤ کی سکونت کی شکل میں میسر آیا اس لیے انیس
کی زندگی کے تمام کارنامے بغیر لکھنؤ کا نام لیے مکمل نہیں ہو
سکیں گے۔ اسی طرح ان کی یہ نیک نامی لکھنؤ کی بھی شہرت
کا باعث ہے۔

میر انیس کو جو عزائی (واقعات کربلا سے متعلق) ماحول
لکھنؤ میں ملا اور جیسے علماء، فضلا اور قدر داں میسر آئے مزید براں
جس طرح پڑھے لکھے طبقہ میں ان کی پذیرائی ہوئی اور کہیں
ممکن نہ تھی۔ میری بات کی تصدیق ان کے بعد پیش آئے
سفر کی کیفیات اور تفصیلات ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی
کہی جا سکتی ہے کہ لکھنؤ کے سخن فہم انیس کے کمالات شعری
کا جتنا صحیح ادراک و عرفان رکھتے تھے یہ توقع اور شہروں
سے نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو لکھنؤ
اور میر انیس لازم ملزوم سے تھے یا دوسرے لفظوں میں یہ
بھی کہا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ انیس کا تھا اور انیس لکھنؤ کے
تھے اور آج بھی وہ لکھنؤ کے ہیں۔ آج بھی لکھنؤ کے لوگ
میر انیس کا بہت ادب و احترام سے نام لیتے ہیں۔ ان
کے کلام کے شیدائی آج بھی ایام عزا میں بڑے اہتمام اور
جوش خروش سے مجالس منعقد کرتے ہیں۔ ان میں شریک ہونا
فرض سمجھتے ہیں۔ ذاکر کی حوصلہ افزائی اور داد و تحسین میں کوئی
کمی نہیں کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں انیس کے مرثیوں کی قدر و منزلت
جیسی ان کی حیات میں تھی ویسی ہی آج ان کے انتقال کے
بعد بھی ہے

◇◇

صفحہ ۴۸ کا بقیہ

ردا کا کونہ مرے سر سے اب تو دور ہوا
میں پاؤں پڑتی ہوں بخشو مرا قصور ہوا

۲۲ ردا کے گرنے پہ اللہ یہ عتاب ہوا
کہ مرتے مرتے نہ اس ماں سے کچھ خطاب کیا
اب آنکھ پھیر کے بالو سے تم نے خواب کیا
مرے جوان بڑھاپا مرا خراب کیا
قصور وار تھی میں خبر ساتھ لے نہ گئے
پھوپھی کے ہاتھ میں بھی میرا ہاتھ دے نہ گئے

۲۳ اب آگے ہوش بیاں کا نہیں خموش دبیر
بشکل کعبہ حرم ہیں سیاہ پوش دبیر
ہر ایک دل کو ہے اکبرؑ کے غم کا جوش دبیر
وداع لاش کا خیمہ میں ہے خروش دبیر
خیام شاہ سے اب شور تازہ اٹھتا ہے
رسولؐ پاک کا گویا جنازہ اٹھتا ہے ◇

دیدہائے رنگا رنگ

9415340662

مرثیے کی معنویت

آج کے زمانے میں مرثیے کی معنویت کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں ہم یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ اب سے کوئی سوا سو برس پہلے جب انیس (۱۸۰۲ تا ۱۸۷۴) اور دبیر (۱۸۰۳ تا ۱۸۷۵) موجود تھے تب مرثیے کی معنویت کیا تھی؟ جواب میں کہا جا سکتا تھا کہ اس وقت مرثیے کی معنویتیں کم سے کم دو تھیں۔ ایک تو یہ کہ مرثیہ ایک نسبتاً طویل مذہبی بیانیہ نظم تھا جس کا لکھنا، پڑھنا، سننا اور سنانا سب کار ثواب تھے اور دوسری یہ کہ زبان و بیان، محاورہ اور نمک سک سے درست ہونے کے باعث مرثیے کی ادبی قدر و قیمت بھی تھی اور بعض حالات میں اسے دوسری بیانیہ اصناف کے لیے مثال اور نمونے یعنی Paradigm کے طور پر بھی استعمال کر سکتے تھے۔ اس جواب پر کہا جا سکتا ہے کہ مرثیے کی مذہبی حیثیت سے ہمیں کوئی بحث نہیں کیونکہ اس کی ادبی حیثیت اس کے مذہبی پہلو کی لازماً تابع نہیں ہے رہا سوال مرثیے کی ان خوبیوں کا جن کا تعلق زبان و بیان وغیرہ سے ہے تو اس زمانے میں زبان کے معیار بدل گئے ہیں وہ چیزیں جنھیں انیس و دبیر کے وقت میں زبان کی خوبی کہا جاتا تھا ممکن ہے آج انھیں زبان کا عیب تصور کیا جائے لہٰذا انیس و دبیر کے دنوں میں مرثیے کی معنویت کا جو تعین کیا گیا ہے، وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔

ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے کسی صنف یا کسی ہیئت میں کوئی خاص کارنامہ یا کارنامے ایسے ہوں جن میں اس صنف یا ہیئت کو ایسی ادبی بلندی پر پہنچا دیا گیا ہو کہ آئندہ آنے والوں کے لیے جائے قیام ہی نہ رہے۔ اگر مثلاً میر انیس نے مسدس کی ہیئت میں مرثیے کو اس عروج پر پہنچا دیا جس کے آگے کوئی منظر ہی نہ رہ گیا تو اس بات میں کیا تعجب کہ مسدس کی ہیئت میں مرثیہ اب اپنی معنویت کھو بیٹھا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مسدس کی ہیئت والی نظم ہی اب اپنے امکانات سے خارج ہو چکی ہے۔ اقبال نے طرز انیس کی کم و بیش پیروی کرتے ہوئے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" لکھیں (۱۹۱۱ اور ۱۹۱۳) اقبال کی ان نظموں سے کچھ دہائی پہلے لیکن انیس و دبیر سے کچھ ہی بعد (۱۸۷۹) حالی نے "مسدس" لکھا مگر یہ خیال رکھا کہ میر انیس کے انداز سے محترز رہیں۔ نظمیں تینوں ہی مقبول ہوئیں لیکن ان کی مقبولیت کے اسباب ادبی سے زیادہ مذہبی، سیاسی اور تاریخی تھے "جواب شکوہ" کے تقریباً فوراً بعد صفی لکھنوی نے مسدس کی ہیئت میں "مرثیۂ حالی" لکھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی نظم ایسی نہ ثابت ہوئی کہ مرثیے یا مسدس کے لکھنے والوں کے لیے کسی طرح کی نئی راہ کا اشارہ کر سکے۔

انگریزی ادب میں ایسی مثال ٹی ایس ایلیٹ کی ہے جس نے اپنی نظم The waste land کے اولین مسودے میں ہیروئی ابیات Heroic couplet کی طرز میں ایک طویل ٹکڑا رکھا تھا لیکن ازرا پاؤنڈ Ezra Pound کے سخت اصرار پر اس نے اسے پورا کا پورا حذف کر دیا۔ پاؤنڈ نے ایلیٹ سے کہا کہ یہاں وہ طرز تو الگزنڈر پوپ Alexander Pope (۱۶۸۸-۱۷۴۴) پر ختم ہو گیا۔ اب اس میدان میں ہاتھ پیر مارنے سے تمھیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔

تو کیا اس کا مطلب ہم یہ نکالیں کہ اگر کوئی طرز کسی بنا پر منسوخ یا نامقبول ہو جائے تو پھر اس طرز یا صنف کی روایت میں جو کچھ ہے

وہ سب اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کہنا انصاف اور حقیقت دونوں سے بعید ہوگا لہٰذا سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ ازمنہ گذشتہ کے اصناف اور ہیئتوں کے ساتھ ہم کیا معاملہ کریں؟ اور اس سے بھی اہم تر سوال یہ کہ معاملہ بالآخر جیسا بھی ہو لیکن وہ ہو کس طرح؟ خود پوپ کے ساتھ یہی مشکل آئی تھی کہ ایک زمانے میں اس کی قدر شکنی اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ میتھیو آرنلڈ Matthew Arnold نے برملا دعویٰ کیا کہ ڈرائڈن Dryden اور پوپ اور ان کی طرح کے دیگر شعراء کے ساتھ منصفانہ معاملہ کرنے اور اس کی تعین قدر کے لیے مناسب تنقیدی تصورات وضع کرنے یا دوبارہ دریافت کرنے میں بہت وقت لگا۔

خیر انگریزی تنقید اور ہیروئی ابیات میں طنزیہ شعر کہنے والوں کی ایک خاص مشکل تھی اور وہ یہ کہ رومانی افکار کے وسیع اثر اور نفوذ کی بنا پر انیسویں اور اوائل بیسویں صدی کی انگریزی تنقید میں یہ غلط خیال عام ہو گیا تھا کہ شاعری میں اعلیٰ سنجیدگی Seriousness بہت ضروری ہے (یہ فقرہ آرنلڈ کا ہے) اور طنز و مزاح میں اعلیٰ سنجیدگی کی گنجائش نہیں۔ اردو میں تو یہ معاملہ نہ تھا۔ یہاں کلاسیکی شاعری کی روایت میں طنز، مزاح سب شامل ہیں لیکن یہاں یہ مشکل آپڑی تھی کہ محمد حسین آزاد نے ہمیں سکھایا تھا کہ شاعری اور اس کی اصناف بدلتی رہتی ہیں اور پرانی اصناف اگر اپنا مسلسل جواز نہ پیش کر سکیں تو ان کو باقی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہمارے یہاں اکثر یہ سوال نظر انداز کر دیا گیا کہ اگر کوئی طرز یا صنف آج کسی بنا پر نامقبول ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ اس طرز یا صنف میں جو گذشتہ اقتباسات ہوئے ان پر بھی سوالیہ نشان لگ جائے؟ ابھی حال ہی میں انگلستان کا موجودہ ملک الشعراء ٹیڈ ہیوز Ted Huighes جو ایک اعلیٰ درجے کا جدید شاعر ہے اس نے پہلی صدی کے مشہور لاطینی شاعر اووڈ Ovid کی کتاب Metamorphosis کے منتخب قصوں کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کیا ہے اور اس کا نام Tales from Ovid رکھا ہے اس کے دیباچے میں اس نے لکھا ہے کہ میں نے یہ ترجمے اس لیے کئے ہیں کہ میرے پڑھنے والے اپنی قدیم یورپی روایت سے بے بہرہ نہ رہیں اور ٹھیک اسی زمانے میں سترہویں صدی کے فرانسیسی شاعر Jemdela Fontaine کی منظوم حکایتوں کا (جو چڑیوں، جانوروں درختوں، انسانوں وغیرہ کے بارے میں ہیں اور جن کا ماخذ ایسپ یونانی کی حکایات ہیں) انگریزی میں نیا ترجمہ ہوا ہے اور اس پر خوب گفتگو ہو رہی ہے بنیادی بات یہ ہے کہ اووڈ اور ژاں دالافونتین Jemdela Fontaine دونوں ہی تہذیب اور ادبی اسلوب دونوں کے اعتبار سے جدید مغربی انسان سے بہت دور ہیں لیکن وہاں ان تراجم پر اعتبار نہیں کیا گیا اور ایسی از کار رفتہ اصناف اور ہیئتوں کو دوبارہ دنیا کے سامنے لانے کی کیا ضرورت تھی؟ یعنی اہلِ مغرب جن سے ہم نے اصناف کا نظریہ بڑی حد تک حاصل کیا ہے یہ کہتے نظر نہیں آرہے ہیں کہ قدیم اصناف یا ان اصناف میں لکھے ہوئے ادب کو قبول کرنے سے پہلے ان کی معنویت پر گفتگو ضروری ہے۔

ایک معاملہ یہ بھی ہے کہ اگر میر انیس وغیرہ اہل کمال کی برکت سے مسدس کی ہیئت میں مرثیے کی صنف ایسی بلندیوں پر پہونچ گئی جو دوسروں کے لیے ناقابل تسخیر ہیں تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہم میر انیس وغیرہ کے مرثیے ہی کی مسلسل زندگی کو مشکوک قرار دیں اور کہیں اب چونکہ مسدس کی ہیئت میں قابل ذکر مرثیہ بلکہ کسی بھی ہیئت میں قابل ذکر مرثیہ نہیں لکھا جا رہا ہے لہٰذا ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ مرثیے کی معنویت آج کیا ہے اگر اس سوال کو درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکے گا کہ چونکہ میر و غالب نے غزل کو منتہائے کمال تک پہنچا دیا لہٰذا آج غزل کی معنویت بھی مشتبہ ہو چکی ہے۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ غزل تو آج بھی بہر حال ہماری مقبول ترین صنف ہے لہٰذا اس کی معنویت معرض خطر میں نہیں جبکہ مرثیے کا معاملہ یہ ہے کہ اچھے مرثیے آج بھی نہیں لکھے جا رہے ہیں اور یوں بھی مرثیہ بہت کم لکھا جا رہا ہے۔

یہ صورت حال موجود تو یقیناً ہے لیکن اس سے صنف یا طرز کے مسلسل وجود یا اس کی معنویت پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔ یہ بات

ضروری ہے کہ گذشتہ صدی میں ہمارا معاشرہ بہت کچھ بدلا ہے یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ اس پچھلی صدی میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ کیفیت اور کمیت دونوں لحاظ سے ان تمام تبدیلیوں سے زیادہ ہیں جو اس سے پہلے ہزار برس میں رونما ہوئی تھیں۔ ان گہری، بنیادی اور وسیع تبدیلیوں کی بنا پر ہم اپنی پرانی چیزوں کو تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں۔ ثبات ایک تغیر کو ہے۔ زمانے میں کا مطلب ہم نے یہ نکالا ہے کہ چیزیں جب بدل جائیں تو ان کا پرانا روپ یا ان چیزوں کی پرانی بنیاد بھی حافظہ سے ترک ہو جانا چاہیے ہم نے بزعم خود یہ خیال مغرب سے حاصل کیا ہے لیکن وہاں عالم یہ ہے کہ فلپ لارکن Phillip Larkin جیسے شاعر پر داد کے ڈونگرے اس لیے برس رہے ہیں کہ اس نے قدیم ہیئتوں کو برتنے میں خاص ملکہ حاصل کر لیا تھا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قدیم (بلکہ قدیم ہی کیوں جدید بھی) صنف کی معنویت کے بارے میں گفتگو کرنے میں کئی طرح کے خطرے اور مسائل ہیں اور پھر جو بحث ہوئی اس سے ذرا ہٹ کر بھی دیکھیں تو بعض نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

مثلاً اس معاملے کو نظری اعتبار سے دیکھیں تو پہلا مسئلہ یہ بنتا ہے کہ کسی صنف کی معنویت پر گفتگو ہو ہی کیوں؟ کیا کسی ادبی تہذیب کی طرف سے یہ دلیل کسی صنف کے جواز کے لیے کافی نہیں کہ ہم نے اس صنف کو ایجاد کیا یا کہیں باہر سے لے کر قبول کیا یا اسے باہر سے لا کر اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ یا وہ صنف جو رنگ باہر سے لے کر آئی تھی اس نے ہمارے پہلے سے رائج دیگر اصناف پر اپنا اثر ڈالا اور اس طرح دونوں اصناف یعنی دیسی بدیسی کو نئے انداز اور نئے امکانات سے آشنا کیا۔

ہونا تو یہی چاہیے کہ اصناف کو آپ اپنا جواز قرار دیا جائے اگر کوئی صنف کسی ادب میں مقبول ہے یا تھی تو پھر اسے اپنے وجود اور بقا کے لیے کسی اور جواز یا دلیل کی ضرورت نہیں ہونا چاہیے انسانوں کے تمام کاموں کی طرح ادب کے کاموں میں بھی منطق کا وہ اصول کام کرتا ہے جسے "آکم کا اُسترا" Occam's Razor کہا جاتا ہے

مغربی فلسفیوں میں ولیم آف آکم William of Occam یا بقول بعض Okhan نے چودھویں صدی (۱۲۸۵ تا ۱۳۴۹) میں سب سے پہلے یہ اصول وضع کیا تھا کہ "جو کام کم سے ہو سکتا ہے، اسے زیادہ سے مت کرو"، یعنی کسی قضیہ کو حل کرنے، کسی بات کو ثابت کرنے کسی چیز کو بنانے وغیرہ کے لیے اتنے ہی قدم اٹھاؤ، اتنے ہی مدارج طے کرو جتنے کہ ناگزیر ہوں۔ یعنی ہاتھ گھما کر ناک نہ پکڑو بلکہ سیدھے سیدھے ناک پر ہاتھ ڈالو۔ کسی صورتحال کو غیر ضروری طور پر پیچیدہ نہ بناؤ لہٰذا Entities Should note be multiplied needlessly labour ولیم آف آکم کے اس اصول کی سچائی اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ انسان کو کام چور جانور یا Saving Animal کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اتنا ہی کام کرتا ہے جتنا کرنے کے لیے وہ مجبور ہو۔ کوئی شخص خوشی خوشی فالتو محنت نہیں کرتا۔ اس اصول کو اصناف ادب پر منطبق کریں تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چونکہ اصناف کو ایجاد یا اختیار کرنا محنت طلب کام ہے اور اکثر تو یہ ایک اکیلے آدمی کے بس کا روگ نہیں لہٰذا کسی ادبی معاشرہ میں وہی اصناف وجود میں آتی ہیں یا اختیار کی جاتی ہیں جن کی واقعی ضرورت ہوتی ہے اور جن کے بغیر کام نہ چل سکنے کا خطرہ ہوتا ہے اس طرح ثابت ہوا کہ اگر کسی ادب میں کوئی صنف موجود ہے تو اس کا ہونا ہی اس کا جواز ہے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ ادب ایسی کارگزاری بھی ہے جس کے ساتھ رواج عام، فیشن، شہرت یا عدم شہرت وغیرہ کے بھی معاملات لگے ہوتے ہیں۔ کوئی صنف اگر آج مقبول ہے تو کل وہ معتوب یا گمنام بھی ہو سکتی ہے مثلاً حالی، کلیم الدین احمد، عندلیب شادانی اور ترقی پسند نظریہ سازوں کی کوششوں نے غزل کی مقبولیت میں ایک حد تک کمی پیدا کی اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ حالی وغیرہ کے زیر اثر عشقیہ معاملات کو غزل میں ایک عرصہ تک جگہ بمشکل ہی مل پاتی تھی پھر یہ بھی ہے کہ غلط یا صحیح بعض نسلیں یا بعض ادبی ادوار کسی خاص طرز کو اپنا مخصوص طرز بنا لیتے ہیں اور بعد میں ان کے رد عمل کے طور پر وہ طرز بالکل منسوخ بلکہ مردود ہو جاتا ہے۔ ملٹن کا انتقال

۱۶۷۴ میں ہوا اور ڈرائڈن کا ۱۷۰۰ میں لیکن ملٹن کا آخری زمانہ آتے آتے اس کی محبوب صنف یعنی نظم معریٰ Blank Verse زمانہ کے فیشن کے اس قدر خلاف جا پڑی تھی کہ ڈرائڈن نے ملٹن کے سامنے تجویز بلکہ درخواست رکھی کہ مجھے اجازت ہو تو میں آپ کی نظم Paradis last کو اس زمانے کے فیشن کے مطابق Heroic Opera کی صنف میں ڈھال دوں اور یہ آپیرا لکھا جائے گا Rhyming Couplet یعنی ایک طرح کی مثنوی کی ہیئت میں (جو اس زمانے کی مقبول ترین ہیئت تھی) اور بیچارہ ملٹن راضی بھی ہو گیا۔ ہاں اس نے ڈرائڈن سے یہ ضرور کہا کہ صاحب! میرے کچھ مصرعے تو شائد اس قدر "فرسودہ طرز کے اور بھونڈے" Old fashioned and awkward ہوں کہ اغلباً آپ بھی انھیں سدھارنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ لطف یا ادبی فیشن کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اسی ملٹن نے اسی Paradise lost کی تمہید میں لکھا تھا کہ "مقفّیٰ ہونا کسی اچھی نظم یا منظومے کے لیے قطعاً ضروری نہیں خاص کر طویل تحریروں میں اور مقفّیٰ ہونے کی ریخ تو ایک غیر مہذب عہد کی ایجاد ہے اور اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ پست اور بے جان مضامین اور لنگڑے اوزان کی تلافی کر لی جائے۔"

اب یہ اور بات کہ ملٹن کا رزمیہ اب بھی پڑھا جاتا ہے اور ڈرائڈن کے مقفّیٰ، مثنوی نما آپیرا کے بارے میں ادب کے کچھ طالب علم ہی جانتے ہیں بہر حال تقریباً ۱۹۲۵ سے کوئی ۱۷۹۰ تک انگریزی شاعری میں مثنوی نما مقفّیٰ نظم یعنی Heroic couplet کا بول بالا رہا اور انیسویں صدی میں اس کا بھاؤ اتنا گر گیا کہ اس زمانے کے عظیم ماہر عروض اور نقاد جارج سینٹس بری George Saintbury نے لکھا کہ اٹھارویں صدی Heroic couplet کے جور Tyranny کی صدی تھی اور اگر ہم ملٹن کی معرا نظم کا ایک ٹکڑا اور پوپ Alexander Pope جیسے Heroic couplet کے ماہر کا ایک اقتباس پڑھیں تو ہمیں اول الذکر کے یہاں بے حد تنوع اور موخر الذکر یعنی پوپ کے یہاں زبردست یک رنگی Monotony محسوس ہو گی۔

پھر یہ بھی ہے کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بعض انگریزی شعرا نے ہیروئی ابیات کو بڑے پیمانے پر استعمال کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش اس طرح کی نہیں جیسی آج ہم اردو میں مسدس کی ہیئت میں مرثیے کے بارے میں دیکھتے ہیں کہ محض رسماً بعض مرثیہ گو شعراء نے اسے اپنی رثائی تخلیقات کے لیے استعمال کیا۔ لیکن وہ لوگ اس میں کوئی نئی جان نہ ڈال سکے۔ مرثیے کا معاملہ دوہرا ہے ایک طرف تو اس کے ساتھ مسدس کی ہیئت وابستہ ہے اور دوسری طرف مرثیے کا وہ تصور جو انیسؔ و دبیرؔ کے ہاتھوں مستقل اور قائم ہوا لہٰذا ایسے مراثی جن میں یہ دونوں شرائط نہ پوری ہوتی ہوں۔ مرثیے کے بارے میں ہماری توقعات پوری نہیں کرتے اور مصیبت یہ ہے کہ زمانۂ حال کے بہترین مرثیے بھی انیسؔ، دبیرؔ، مونسؔ، نفیسؔ اور عشقؔ وغیرہ کے مرثیے کو دور سے چھوتے ہوئے بھی نظر نہیں آتے۔ عام قاری یا سامع اس بات کو محسوس کرتا ہے لیکن اس کا منطقی تجزیہ اور محاسبہ نہیں کر سکتا بس وہ یہی فرض کر لیتا ہے کہ چونکہ اعلیٰ درجے کے مرثیوں کے لکھنے والے اب نہیں رہے اس لیے مرثیے کا زمانہ بھی ختم ہو گیا ہے، اب مرثیے کی کوئی مذہبی اہمیت ہو تو ہو لیکن ادب کے میدان میں اس کی معنویت محض تاریخی ہے۔ مرثیے کے بڑے بڑے شعراء کو ہم اس طرح اپنا معاصر فرض کر کے نہیں کر سکتے جس طرح ہم غزل کے اکثر بڑے شعراء کو فرض کر سکتے اور در حقیقت فرض کرتے اور قبول کرتے بھی ہیں۔

اس صورتحال کی وجہیں ادبی بھی ہیں اور تاریخی بھی سب کے سامنے کی تاریخی وجہ تو یہ ہے کہ مرثیے کی مذہبی اہمیت نے اس کی ادبی اہمیت کو اکثر دبا لیا ہے۔ مرثیے کے پہلے جدید نقاد حالی نے مرثیے کے موضوع اور اس میں بیان کئے جانے والے واقعات کا ذکر جس عقیدت اور جذبے کی گہرائی کے ساتھ کیا ہے وہ لائق تعریف تو ہے لیکن لائق تقلید نہیں۔ حالی کی عقیدتمندی نے مرثیے کی ادبی حیثیت کو مشکوک نہیں کمزور یقیناً کر دیا۔ حالی کے برخلاف شبلی نے یہ بات بڑی وضاحت سے کہی کہ مرثیہ اپنی ادبیت کے باعث سنجیدہ تنقیدی مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے اور بالخصوص میر انیسؔ کے کلام میں شاعری کے جس قدر اوصاف پائے

جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے"۔

شبلی کی نظر میں اچھی شاعری کی تمام خوبیاں مرثیے میں یا کم از کم میر انیس کے مرثیے میں موجود تھیں۔ "موازنہ" کے پہلے ہی صفحہ پر انھوں نے لکھا کہ "میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر مجموعہ ہے"۔ اگلے صفحہ پر انھوں نے ان باتوں کا ذکر کیا جن سے ان کے خیال میں اچھی شاعری عبارت ہے پھر انھوں نے لکھا کہ میر انیس کی شاعری کو اسی معیار سے جانچنا چاہئے جس کا مختصراً بیان ہوا جس شخص کو یہ معیار تسلیم نہ ہو اس کے سامنے میر انیس کی نسبت کمال شاعری کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اصولی طور پر تو یہ بات نہایت عمدہ اور درست تھی لیکن شبلی نے اچھی شاعری کی جو تعریف کی اس میں انھوں نے اپنے دور کے تعصبات کو پوری پوری راہ دی اس طرح ان کا نظریۂ شعر بعض ایسی باتوں پر بھی قائم ہوا جو مرثیے کی تنقید کے لیے چنداں اہم نہ تھیں مگر خود مرثیے کے طالب علموں کو شبلی کا یہ انداز پسند نہ آیا کہ مرثیے کی تنقید خالص ادبی بنیاد پر کی جائے اگرچہ شبلی نے مرثیے کے اہم کرداروں (جنھیں انھوں نے "مرثیے کے ہیرو" کہا) کی ایک فہرست اپنی کتاب میں دے دی تھی لیکن اس کی وجہیں انھوں نے دو بیان کیں۔ ایک تو یہ کہ ان ناموں کی تفصیلات کے ذریعہ واقعہ "واقعہ اور روایت کے سمجھنے میں مدد ملے"، اور دوسری وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ "محاسن شعری اور بلاغت کے نکات سمجھ میں آئیں"۔ گویا شبلی نے یہاں بھی مرثیے کی ادبیت کو پیش پیش رکھا لیکن یہ بات شبلی کے معائب میں شمار کی گئی چنانچہ "موازنہ" کے ایک جدید مرتب ڈاکٹر سید رفیق حسین نے اپنے دیباچے میں تحریر فرمایا کہ "مولانا شبلی نے واقعۂ کربلا پر صرف ایک جملہ لکھا ہے اسے اچھی طرح واضح کر دیتے تو تصنیف روشن ہو جاتی"۔

مرثیے کی مذہبی اہمیت آج بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی اس میں تخفیف کا کوئی امکان نہیں اور نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مرثیے کی مذہبی اہمیت اور مقبولیت بڑھتی ہی جائے گی یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر کوئی صنف سخن کسی خاص ضرورت کو بوجہ احسن پورا کر رہی ہے تو پھر اس کی ادبی معنویت اور محاسن شعری کے بارے میں گفتگو غیر ضروری مگر مشکل یہ ہے کہ مرثیے خاص کر انیس و دبیر، مونس، خلیق وغیرہ کے مرثیے کو ادبی بحث سے دور رکھنا خود ادب کے بڑے نقصان کا باعث ہوگا۔ جن معاشروں میں اب مذہب کو ضمنی سی حیثیت حاصل ہے یا جہاں مذہب اور ادب کو کم و بیش الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنے کا رواج ہے وہاں یہ مشکل نہیں۔ مثال کے طور پر خود ملٹن نے اپنا رزمیہ Paradise lost مذہبی نقطۂ نظر سے لکھا تھا اور اپنے خیال میں سراسر مذہبی نظم لکھی تھی جس میں اس نے انسان کے اولیں گناہ Original Sin اور انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی جزا کی توضیح اور جواز پیش کیا تھا لیکن عیسائیت کے جس نظریے (یعنی Calvinism) کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس نے Paradise lost لکھی تھی اس کا چلن بہت کم رہ گیا اور خود انگریزی بولنے والی اقوام میں مذہب کی وہ مرکزی اہمیت نہ رہی جو ملٹن نے اپنے زمانے میں فرض کی تھی اس طرح وہ مذہبی خیالات اپنی جگہ پر رہے جس سے ملٹن کی نظم عبارت ہے اور مطالعہ کرنے والے ان کا مطالعہ اب بھی کرتے ہیں لیکن ادب کے عام پڑھنے والے کے لیے اب Paradise lost ایک اعلیٰ درجے کی نظم ہے جس میں کائناتی مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔

مغرب میں عقیدہ اب چونکہ پہلے کی طرح اہم نہیں رہ گیا ہے اور اب مثال کے طور پر انجیل کے دونوں عہد ناموں قدیم و جدید کا مطالعہ محض بیانیہ کی حیثیت سے بھی کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا وہاں ایسے ادب کو بھی عقیدے سے الگ کرنا مشکل نہیں جو کسی خاص مذہبی عقیدہ کو ظاہر یا قائم کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ ہمارا معاملہ دوسرا ہے۔ ایک تو مذہب ہماری زندگیوں میں ابھی ایک بہت قوت مند وجود رکھتا ہے اور دوسری بات یہ کہ ہماری تہذیب میں زندگی اور مذہب کو اس طرح ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنے کی رسم رہی نہیں ہے "مہابھارت" تلسی داس کی "رامائن" اور "گیتا" جیسی کتابوں کا مقدس وجود ان کے دنیاوی وجود سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مرثیے کو اگرچہ الہامی یا مقدس متن کا درجہ حاصل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ایک طرح کا احترام اور

تکریم ضرور وابستہ ہے لہٰذا مرثیہ کے بارے میں کوئی تنقیدی رائے ظاہر کرنا آسان نہیں۔ شبلی نے اگرچہ مرثیہ کی ادبی حیثیت کو قائم اور مستحکم کرنے کے لیے بنیادی اور ناقابل فراموش اہمیت کا کام انجام دیا لیکن دبیر کے حمایتیوں کی طرف سے ان پر اعتراضات کا طوفان اٹھنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرثیے پر کسی بھی قسم کی نکتہ چینی لوگوں کو گوارا نہ تھی۔ عبدالغفور نساخ ہر حیثیت میں شبلی سے کم تر تھے لیکن انھوں نے بھی جو بعض چھوٹے موٹے مگر درست اعتراضات کئے تھے۔ ان پر لکھنؤ والے اس درجہ چراغ پا شاید اس وجہ سے بھی ہوئے کہ مرثیے کو من حیث الصنف تنقید سے بالاتر رکھنے کا ایک رجحان ہم میں موجود ہے وہ خفیف سا سہی لیکن ہے ضرور اور اس رجحان نے مرثیے کی تنقید کے ارتقا میں رکاوٹیں بہرحال پیدا کی ہیں۔

شبلی کے دکھائے ہوئے راستے پر چل کر ہم لوگوں نے مرثیہ اور بالخصوص میر انیس کے مرثیے کو انگریزی عینک سے دیکھنے کی مزید سعی کی تو نتیجہ یہ نکلا کہ صہبائے عقیدت سے سرشار لوگوں نے میر انیس کو کبھی شیکسپیئر اور کبھی انھیں یونانی طرز کا رزم نگار بنانے کی کوشش کی۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جیسے کسی نابینا شخص سے کہا جائے کہ دریائے گنگا کی گہرائی اتنی ہی ہے جتنی کہ دریائے ڈینیوب کی۔ جس غریب نے کبھی دریا ہی نہ دیکھا ہو اور جو اگر دریا پر جائے بھی تو اس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے یہ سب موازنے مطلب و معنی سے عاری ہیں ہم ہندوستانیوں کو اس خیال سے خوشی ضرور ہو سکتی ہے کہ ہمارا شاعر شیکسپیئر و ہومر سے کم نہیں لیکن یہ خیال ہمیں میر انیس یا مرثیہ، یا خود شیکسپیئر و ہومر کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا اور چونکہ موازنے کی کوئی واقعی بنیاد نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے اس لیے کہ اس رائے (یا فیصلے یا خیال) سے مرثیہ کی بامعنی تنقید کے لیے کوئی امکانات بھی نہیں پیدا ہوئے۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ کو مغربی اصناف یا طرز سخن سے مشابہ کرنے کی کوشش میں ہم نے اپنا نقصان ہی کیا۔ کیوں کہ ہم میر انیس یا کسی بھی مرثیہ گو کو شیکسپیئر یا ہومر تو ثابت نہیں کر پائے اور دوسری طرف بعض لوگوں نے لا محالہ یہ توقع قائم کی کہ مرثیے پر ”واقعہ نگاری“ یا ”واقعیت“ کے اصولوں کا اطلاق ہو سکتا ہے (شبلی نے کہا تھا کہ ”جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصل ہیولا ہے... لیکن شرط یہ ہے کہ جو کچھ کہا جائے اس انداز سے کہا جائے کہ جو اثر شاعر کے دل میں ہے وہی سننے والوں کے دل پر بھی چھا جائے“) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیم الدین احمد جیسے مغرب پرست اور اسلوب احمد انصاری جیسے مشرق شناس دونوں اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ میر انیس کے یہاں ”واقعیت“ کی کمی ہے۔

جہاں تک سوال مرثیے کی خارجی ہیئت کا ہے تو یہ ہم نے معلوم کر لیا کہ مرثیے میں چہرہ، سراپا، رزمیہ وغیرہ اجزا ہوتے ہیں لیکن ان اجزا کو مرثیے میں داخل کرنے یا مرثیے میں ان کے در آنے کی کیا وجہیں تھیں یا ہو سکتی تھیں ان پر ہماری تنقید نے غور نہیں کیا۔ مرثیے کی شعریات پر غزل، مثنوی اور داستان کی شعریات کا کتنا اثر ہے؟ اور کیوں؟ ان سوالات پر بھی ہمارے یہاں توجہ نہ ہوئی درحالیکہ مرثیہ کی معنویت اور ادبی اہمیت تک پہنچنے کے لیے یہ چیزیں زیادہ ضروری تھیں بہ نسبت اس کے کہ میر انیس اور شیکسپیئر وغیرہ میں اشتراکات تلاش کیے جائیں۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے بارے میں مسلسل بحثوں نے مرثیے کی عمومی ادبی معنویت کے تعین میں دو طرح کی رکاوٹیں پیدا کیں۔ ایک تو یہ کہ ان جھگڑوں کا میدان اکثر و بیشتر لفظی اور سطحی رہا۔ فلاں لفظ مرزا صاحب نے غیر فصیح باندھا ہے۔ فلاں لفظ کی تذکیر (یا تانیث) میر انیس نے روا رکھی ہے وہ درست نہیں۔ فلاں فلاں الفاظ میر صاحب مرزا صاحب نے استعمال کئے ہیں حالانکہ وہ متروک ہو چکے ہیں۔ یا ان کے مدافعین کی طرف سے اس قسم کے جواب آئے کہ صاحب آپ کا نسخہ غلط ہے میر انیس/مرزا دبیر نے یوں نہیں یوں لکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی لایعنی بحثوں میں فریقین کی توانائی ضرور صرف ہوئی لیکن ان سے نہ صنف

مرثیہ کا فائدہ ہوا اور نہ انیس اور دبیر کا۔

مرثیہ کے شعریات کے بعض اہم پہلو جو اس خاصہ فضول میں نظر انداز ہو گئے اور جن پر توجہ کی جاتی تو صنف مرثیہ کے علاوہ مرزا دبیر جیسے مرثیہ نگاروں کی بھی وقعت میں بہت اضافہ ہوتا حسب ذیل ہیں۔

(۱) مرثیہ بطور بیانیہ: زبانی بیانیہ اور مرثیہ میں کیا کیا باتیں مشترک ہیں، مرثیہ گویوں نے مرثیہ کے زبانی پن سے کیا فائدہ اٹھایا۔ داستان، مثنوی، قصیدہ اور مرثیے میں کون سے اصول مشترک ہیں؟ غزل کی شعریات نے مرثیے پر کیا اثر ڈالا؟ بعض مرثیہ گویوں کا دعویٰ تھا کہ وہ "کمزور" روایتیں نہیں نظم کرتے۔ یہاں روایت کے کمزور ہونے سے کیا مراد ہے؟ عقیدۂ عوام یا زبانی طور پر مشہور روایتیں؟ منظوم بیانیہ ہونے کی وجہ سے مرثیے میں "افسانہ پن" یعنی Fictiveness کہاں تک ناگزیر ہے۔

(۲) ہماری تہذیب کی ذہنی اور روحانی روداد کی حیثیت سے مرثیہ۔

مرثیے میں کائنات، تقدیر، انسانی تعلقات، جرم و سزا جیسی چیزوں کے بارے میں کیا رویہ ملتا ہے؟ کیا مرثیے کی دنیا اور ہماری روزمرہ کی دنیا میں سب باتیں مشترک ہیں اگر نہیں تو ایسا کیوں نہیں ہے؟

(۳) مرثیہ خوانی کے نکات:

میر انیس اور مرزا دبیر کے علاوہ بھی بعض مرثیہ نگاروں مثلاً دولہا صاحب عروج اور علی محمد عارف کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ مرثیہ پڑھتے خوب تھے۔ نیر مسعود نے "مرثیہ خوانی کا فن" نامی کتاب لکھی ہے۔ مرثیہ خوانی کو سمجھنے کی طرف پہلی کوشش ہے۔ یہاں کچھ باتیں جو مزید توجہ طلب ہیں۔ ان کا ذکر کرتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ غزل مثنوی اور قصیدہ پہلے سے تھے بڑی اصناف میں مرثیہ سب سے تازہ وارد ہے۔ غزل، قصیدہ یا مثنوی خوانی کے طرز نے مرثیے کی خواندگی کو کس طرح متاثر کیا ہوگا۔؟ دوسری بات یہ کہ کیا مرثیے میں رزم کا التزام مثنوی کے اثر ہے۔ مثنوی بھی چونکہ پڑھ کر سنائی جاتی تھی۔ اس لیے اس رزم کا عنصر فطری تھا۔ "عوامی" رزمیوں مثلاً "آلھا اودل" اور "پرتھوی راج راسو" سے لے کر روشن علی اور ان کی طرح کے دیگر "جنگ ناموں" میں رزم کی کثرت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان سب اصناف کا آپس میں کوئی تعلق ہو سکتا ہے اور ان میں قدر مشترک زبانی خواندگی بھی ہوگی۔

(۴) مرثیہ ایسی صنف ہے جو ناخواندہ یا نیم خواندہ، غیر شہری اور "عوامی اسٹیج" کے ماحول میں یکساں مقبول اور کامیاب ہے۔ لہٰذا مرثیے اور جنگ ناموں کا تقابلی مطالعہ دونوں کے بارے میں بہت سی نئی دریافتیں بہم پہنچا سکتا ہے۔

(۵) یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ تحت شہری اور مضافاتی ماحول میں مرثیہ خوانی، مرثیہ گوئی اور مرثیے کو زبانی یاد کرنے فی البدیہہ مرثیہ کہنے کی کیا رسومیات تھی؟ تحت شہری ماحول اور شہری ماحول کے مراثی میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ خوانی کے طور طریقوں میں کس حد تک اشتراک تھا اور کس حد تک افتراق؟

اس طرح کے کئی معاملات جن پر غور نہیں کیا گیا۔ ایک بات جو انھیں باتوں سے نکلتی ہے وہ خود اپنے بارے میں مرثیہ گو کے سامعین اور مرثیہ گو کے تاثر کے بارے میں ہے یعنی سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے بارے میں کس طرح کا خیال رکھتے تھے۔ ان کا Self image کیا تھا؟ مثال کے طور پر شبلی کا فیصلہ مجموعی طور پر میر انیس کے حق میں تھا اور آج ہم میں سے بھی اکثر لوگ میر انیس کو مرزا دبیر سے بہت بہتر قرار دیتے ہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ مرزا دبیر کے بھی طرفدار بہت ہیں اور خود ان کے زمانے میں تو کثرت سے لوگ تھے جو دبیر کی حمایت اور انیس کی مخالفت میں مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ شبلی نے صنف مرثیہ اور انیس و دبیر کی اتنی بڑی خدمت انجام دی لیکن اس وجہ سے کہ انھوں نے انیس کو دبیر پر فوقیت دی تھی شبلی کو دبیریوں کی طرف سے ایسی ایسی باتیں سننے کو ملیں جو متانت اور علمیت دونوں کے منافی تھیں اور احسان فراموشی کا حکم رکھتی تھیں لیکن سوچنے اور پوچھنے کی بات یہ ہے کہ اگر دبیر

واقعی بالکل معمولی شاعر تھے تو ان کے اتنے مداح کیوں تھے کہ کس بنا پر وہ انھیں میر انیس پر فوقیت دیتے تھے؟ اگر صفیر بلگرامی / شیخ ریاض الدین امجد کی روایت صحیح ہے تو غالب نے بھی مرثیہ گوئی کو "مرزا دبیر کا حصہ" قرار دیا تھا

ہم یہ کہہ کر نہیں نکل سکتے کہ اس زمانے کے سب احمق یا کور ذوق تھے۔ انیس و دبیر کے زمانے (انتزاع سلطنت اودھ کے بعد بھی) لکھنؤ مرجع کمال تھا اور یوں بھی کسی زمانے میں سب کے سب لوگ احمق نہیں ہو سکتے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ آج مرثیے کی شعریات بہت حد تک ہم سے کھو گئی ہے جبکہ انیس اور دبیر کے سامعین کے لیے وہ زندہ حقیقت تھی۔ مرثیے کے بارے میں علمی اور تہذیبی طور پر وہ لوگ کیا ہندو کیا مسلمان ہم سے بہت زیادہ جانتے تھے انیس و دبیر کے سامعین کا Self image یہ تھا کہ ہم صاحب ذوق لوگ ہیں۔ بڑے بڑوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں مرثیہ ہماری مذہبی حقیقت بھی ہے اور ادبی و تہذیبی حقیقت بھی اس Self image کو سراسر غلط وہی سمجھ سکتا ہے جو پریم چند اور ستیہ جیت رائے کے شطرنج بازوں کو واقعی اور مبنی بر حقیقت سمجھتا ہو۔

تو پھر ایسے لوگوں کی توقع مرثیہ گویوں سے کیا تھی اور مرزا دبیر اس توقع کو کس طرح اور کس حد تک پورا کرتے تھے۔ اس سوال کا جواب ان لوگوں کے پاس ڈھونا بے کار ہے جو مرثیے کو یونانی رزمیہ یا شیکسپیئر کا ڈراما سمجھتے ہیں۔

دوسری بات جو شاید زیادہ اہم اور زیادہ دیر تک قائم رہنے والی رکاوٹ بنی وہ یہ تھی کہ مرثیے کے طالب علم کو انیس و دبیر کی تحکیم میں اتنا لطف آنے لگا کہ اسے ان کے علاوہ کسی طرف دیکھنے کی فرصت نہ ملی اور اگر کسی نے کوشش بھی کی (مثلاً جعفر رضا نے میر عشق اور ان کے گھرانے کے بارے میں لکھا) تو اس کا بھی زور طبع انھیں یا اسی طرح کی باتوں پر صرف ہوا۔ شبلی نے عمدہ بات لکھی تھی کہ میر ضمیر کا منتخب کلام "میر انیس صاحب کا کلام معلوم ہوگا"۔ شبلی نے یہ بھی کہا کہ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ میر خلیق نے میر ضمیر سے کچھ کم اس فن پر احسان نہیں کیا ہوگا لیکن افسوس ہے کہ ان کا کلام نہیں ملتا۔ اس زمانے میں چند مرثیے جو میر خلیق کے نام سے ایک صاحب نے شائع کئے تھے وہ میر انیس کے نام سے بھی موسوم و مطبع تھے۔ شبلی نے لکھا کہ اگر وہ واقعی میر خلیق کا کلام ہے تو بیٹے کو باپ پر ترجیح کی کوئی وجہ نہیں" مسعود حسن رضوی ادیب کی کاوشوں اور دریافتوں کے نتیجہ میں میر خلیق کا کلام مل بھی گیا۔ اور میر ضمیر کا خاصا کلام پہلے سے موجود بھی تھا لیکن اردو کے کسی اہم نقاد نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کہیں دل کے کسی گوشے میں خیال تھا کہ ایک ہی دو مرثیہ گو ہمارے لیے بہت ہیں اور مزید مرثیہ گو ہوں گے بھی کہاں؟ میر انیس نے تو سب کے تختے الٹ دئے۔

انیس و دبیر سے ہٹ کر دوسرے مرثیہ گویوں پر توجہ نہ کرنے کی وجہ جو بھی رہی ہو لیکن اس کا نقصان دیگر مرثیہ گویوں کے ساتھ انیس و دبیر کا بھی ہوا۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ایس ٹی الیٹ نے جب شیکسپیئر کے بعض نسبتاً کم معروف ڈراما نگار معاصرین کے تفصیلی مطالعے پیش کئے تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ فن ڈراما اور فن شعر کی بہت سی نزاکتیں جنھیں وہ شیکسپیئر سے مخصوص سمجھتے تھے۔ عہد الزبتھ کے تمام اچھے ڈراما نگاروں کے یہاں موجود ہیں اور وہ خوبیاں غالباً اس زمانے کے فن کا خاصہ تھیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی پتہ لگا کہ شیکسپیئر اپنے معاصرین سے واقعی کن صفات کی بنا پر ممتاز ہے۔ تقابلی مطالعے نے بتایا کہ بعض خوبیاں جو اوروں کے یہاں بھی ہیں شیکسپیئر کے کلام میں زیادہ شدت یا مہارت سے برتی گئی ہیں۔

بالکل یہی حال انیس و دبیر کا ہوا کہ ضمیر، خلیق، مونس، نفیس، عشق وغیرہ کے کلام کا تفصیلی اور بالاستیعاب مطالعہ نہ ہونے کی بنا پر ہم ان کی تقابلی خوبیوں، مضبوطیوں اور یکتائیوں سے بے خبر رہے اور اب بھی بے خبر ہیں۔ جب بھی مرثیے کے مطالعہ کی بات آتی ہے بحث گھوم پھر کر انیس و دبیر ہی تک رہتی ہے۔ اس لیے مرثیے کی معنویت کے بارے میں بھی ہم انھیں ایک دو ناموں کے حوالے سے سوچتے ہیں اور ظاہر ہے کہ مایوس ہوتے ہیں جب ہم نے انیس و دبیر کے لکھنوی پیش روؤں اور معاصروں سے صرف نظر

(بقیہ ص ۱۱۳ پر)

پروفیسر مجاور حسین رضوی

7376811599

میر انیسؔ ۔ ماہرِ آئینِ فطرت

فطرت کیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ما سوا انسان جو کچھ اس کے گرد و پیش میں ہے اسی پر فطرت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اب ایک یہ سوال ہوتا ہے کہ انسان اور فطرت میں کیا رشتہ ہے ؟ جب بھی تخلیق آدم کا سوال اٹھتا ہے تو پہلی بات یہی سامنے آتی ہے کہ آدم و حوّا نے اس کرۂ ارض پر آنے کے بعد کیا دیکھا ؟ اقبالؔ نے اپنے شاعرانہ لب و لہجہ میں ایک بند میں بتایا۔

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں
تھی پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

اس طرح اقبالؔ کے یہاں پورا منظر نامہ وقت یعنی سلسلۂ روز و شب کا پابند ہے India in Kalidas نے Wintermitz میں حیاتِ ارضی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہندوستان کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ یہاں کے دریا، پہاڑ، ندیاں، آبشار سب کا متحرک نقشہ نظر آتا ہے۔ دراصل تخلیق کار اپنے گرد و پیش سے متاثر ہو کر تصویر کشی کرتا ہے۔ کالی داس نے بھی اسی طرح ہندوستان کے مناظر کو پیش کیا۔

انگریزی میں فطرت نگاری پر بڑا زور ہے۔ Wordsworth تو گویا فطرت نگاری کا شہنشاہ ہے لیکن یہ حیرت کی بات ہے کہ بیچارے Wordsworth کے گرد و پیش میں گیلے پتھروں، سمندروں اور دو چار ندیوں کے سوا کیا تھا۔ انسان اگر نظر آتا ہے تو یا ساحل پر یا کھیت میں لڑکی کی شکل میں گنگناتے ہوئے مگر انسان اور فطرت کے درمیان کیا رشتہ ہے اس پر روشنی نہیں پڑتی۔

کالی داس کی روایت کی وراثت ہندوستانی ادبیات کے مزاج کے عین مطابق تھی مگر حیرت کی بات ہے کہ صدیاں گذر گئیں مگر کسی دیدہ ور ادیب نے کالی داس کی روایت یعنی فطرت سے وابستگی کو نہیں اپنایا یہ مرثیہ نگاری کی کلاہ افتخار کا طرۂ امتیاز تھا کہ اس نے فطرت کی طرف توجہ کی خصوصاً ہندوستانی شعراء کے لیے ہندوستانی منظر نگاری فطری تھی۔ یہاں کے لالہ زار لہلہاتے ہوئے کھیت، وہ سرزمین جہاں پر دو بجائے خاک کے اڑتا ہو رنگ سبزے کا۔ وہ سرزمین حسن فطرت کا ایک مرقع تھی۔ کالی داس کی تصانیف میں پہاڑ، دریا، میدان، نباتات، چرند پرند نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ کالی داس اپنی شاعری میں شادی بیاہ کے رسوم، مہندی، آئینہ، خاندانی تعلقات بھی پیش

کرتا ہے۔ ہندوستانی مزاج میں مذہبی اثرات کی سراپا نگاری اور جسمانی دلکشی کا بیان ہے۔ انیس کے یہاں یہ سب پہلو بہت نمایاں ہیں مگر جو چیز ہر طبقہ خیال کو متاثر کرتی ہے وہ ان کی منظر نگاری ہے مثلاً ایسے افراد ممکن ہیں جو رشتوں کی اہمیت اور نزاکت یا کسی سماج کے مخصوص آب و رنگ کو پسند نہ کرتے ہوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کی زندگی میں صبح نہ ہو دوپہر نہ ہو۔ شام کا دھندلکا نہ آئے، شب کی سیاہی نہ ہو۔ مرثیہ نگاروں نے خصوصاً انیس نے اس کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ واقعہ کربلا کے افراد مثالی انسان تھے لیکن تھے انسان تو یقیناً فطرت ان کے گرد و پیش جھوم جھوم کے مچلتی تھی۔ یہ وہ افراد تھے کہ ہوائیں اس لیے چلتی تھیں کہ قدموں کو بوسہ دیں اگر سفر در پیش تھا تو پہاڑوں کی سخت راہ کا ذکر اس لیے تھا کہ اعلیٰ ترین انسان عشق الٰہی میں اس سے زیادہ دشوار گزار منزلیں طے کرتا ہے۔ دریا کی لہریں اٹھ اٹھ کر اس کارواں کو حسرت سے دیکھتی تھیں جس نے دریائے فرات پر قبضہ کر کے اس کے کنارے سے خود کو ہٹا لیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ انیس نے بعض ایسے مناظر پیش کئے ہیں جو صحرائے کربلا تو بڑی دور کی بات ہے Switzerland اور کشمیر میں بھی نہ ملیں گے مثلاً یہ بند دیکھئے...

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل، تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

یہاں جو نکتہ قابل غور ہے وہ یہ کہ منظر متحرک تو ہے ہی اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ فطرت انسانی سے بے نیاز نہیں ہے بلکہ اسے یہ احساس ہے کہ بحیثیت محکوم اس کا یہ فرض ہے کہ حاکم کی خدمت میں سرگرم رہے۔ گلشن زہرا کی کلیاں پانی کے لیے بے چین ہیں تو شبنم گلاب کے کٹورے میں سجا کے پانی لائی ہے اور دشت میں نسیم کے جھونکے چل رہے ہیں۔ آسمان پر بہار ہے درخت پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ صحرا ہے سبزہ زار ہے۔ دامان کوہسار پھولوں سے بھرا ہوا ہے اور یہ سب اس لیے ہے کہ دشت کربلا میں تاجدار ہل اتیٰ نے پورے ماحول اور فضا کو پُر بہار بنا دیا ہے۔ اب یہ منظر دیکھئے۔

چلنا وہ باد صبح کے جھونکوں کا دم بہ دم
مرغان باغ کی وہ الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

فطرت کا یہ سارا حسن صرف اس لیے ہے کہ کشتیٔ امت کا ناخدا اس سرزمین پر آیا ہے خود شاعر دشت کربلا کو اسی بنا پر رشک آسمان کہتا ہے۔ یہ بند دیکھئے.....

تھی دشت کربلا کی زمیں رشک آسماں
تھا دور دور تک شب مہتاب کا سماں
چھلکے ہوئے ستاروں کا ذروں پہ تھا گماں
نہر فرات بیچ میں تھی مثل کہکشاں
سر سبز جو درخت تھا وہ نخل طور تھا
صحرا کے ہر نہال کا سایہ بھی نور تھا

یہ وہ منظر ہیں جو کسی بھی شخص کی روح کو بالیدہ کر سکتے ہیں۔ یہاں فطرت کا جمال ہے لیکن فطرت کا جلال

بھی انیسؔ نے پیش کیا ہے اب یہ بند دیکھئے۔

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

یہاں عام زندگی میں انسانوں کا یہ حال ہے جو گرمی سے بے حال ہیں۔ جنگل کا یہ عالم ہے کہ...

شیر اٹھتے نہ تھے دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھُن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

خشکی پر ہی نہیں بلکہ یہ گرمی پانی پر بھی اثر انداز ہوئی تھی۔ پانی جو گرمی کو دور کرتا ہے خود اس کا یہ حال ہے...

گرداب پہ تھا شعلۂ جوالا کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کے زباں
تہہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمی روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

انیسؔ کے یہاں انسان چاہے فطرت سے بے نیاز ہو لیکن فطرت انسان سے بے نیاز نہیں ہے۔ دریا ساحل سے ٹکراتا ہے۔ موجیں گریہ کناں ہو کر لوٹ جاتی ہیں پیاس کی شدت سے انسان تو کیا بے زبان جانور بھی بے حال ہیں...

یہ بند ملاحظہ ہو۔

دو دن سے بے زباں پہ جو تھا آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

اس بند کی تعریف و توصیف اپنی جگہ ہے۔ گھوڑے کا دریا کو دیکھ کر ہنہنانا جانور کی نفسیات کے عین مطابق گھوڑے کا پانی کو دیکھ کر سمٹنا اور کانپنا اور سب اپنی جگہ درست مگر یہ عرض کرنا ہے کہ قافیہ کی پابندی کی وجہ سے میر انیسؔ سے بڑی فاش غلطی ہوئی ہے وہ کہ وہاں آبشار کہاں تھا؟ دریا کا کنارہ تھا لیکن اس طرح کے تسامحات اس عظیم شاعر کے کمال پر کوئی نہیں آتا۔ صرف یہ عرض کرنا ہے کہ انسان بہرحال انسان ہے اور اس سے غلطی ہو سکتی ہے میر انیسؔ کے یہاں بھی تسامحات ممکن ہیں اور ہیں۔ یہ درست ہے کہ انیسؔ کا جوا ہر نگار قلم فطرت کی مصوری میں صبح کے مناظر کا زیادہ ذکر کرتا ہے لیکن اس کا منطقی جواز بھی ہے اس لیے کہ دن کا نقطۂ آغاز ہی صبح ہے جیسے جیسے دن چڑھتا جاتا ہے دوپہر ہوتی ہے تو گرمی اپنے شباب پر پہنچتی ہے۔

یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری ہے پہلی بات یہ کہ صحرا کی مناسبت سے گرمی کے بیان میں شدت کا تذکرہ ضروری ہے۔ دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ واقعہ کربلا جب پیش آیا تھا وہ ستمبر کا زمانہ تھا اس وقت عراق کی جغرافیائی کیفیت کے اعتبار سے اگست ستمبر میں شدید گرمی پڑتی ہے چنانچہ وہ وقت بھی گرمی کے ہی موسم کا تھا یہ گرمی صرف شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے بلکہ اس میں واقعیت ہے۔

پتھریلی چٹانوں سے نکلتے تھے شرارے
ناری تھی ہوا سبز شجر زرد تھے سارے

(بقیہ صفحہ ۱۱۳ پر)

احمد سہیل
امریکہ

میر انیسؔ کے مرثیے کی معنوی کائنات

میر انیسؔ نے اردو کے تہذیبی معاشرہ میں انیسویں صدی میں مرثیے کو وہ عظمت و منزلت دی اور ان بلندیوں تک پہنچایا جہاں سے اس کے زوال کا مفقود ہوگیا اور انیسؔ مرثیوں کے حوالے سے آفتاب و مہتاب بن کر ابھرے اور آج تک ان کے مرثیے اردو شعر و ادب کی نئی معنویت اور مفاہیم کی نئی جہات سے اردو نقد و تحقیق کو مالا مال کر رہے ہیں میر انیسؔ نے اردو مرثیے کو ایک ایسے مقام تک پہنچایا کہ ان کے اسلوب و بیان اظہار کو منفرد انداز میں سامعین و قارئین کے سامنے پیش کر کے رثائی ادب اور مرثیہ کے اظہار کو اس دلفریبی اور دردمندی سے روشناس کروایا جس کی مثال اردو کی تاریخ میں شاید ہی ملے جو آج بھی ایک روایت کا تسلسل قائم کئے ہوئے ہے اور ہمیں آج بھی تازہ لگتی ہے۔

واقعہ کربلا کے کئی سو سال بعد صفوی دور میں فارسی کے شعراء نے مذہبی عقیدت سے مرثیہ لکھنے کی شروعات کی جس میں محتشم کا نام سرفہرست ہے۔ دکنی دور میں کئی بہترین مرثیے لکھے گئے سوداؔ نے مرثیے کو فنی اور جمالیاتی شعری مزاج اور عظمت عطا کی۔ میر انیسؔ کے مرثیے کے بعد مرثیہ کے تجزیہ نگاروں اور نقادوں نے مرثیہ کے اجزائے ترکیبی میں آمد چہرہ سراپا (پیکر تراشی) رخصت، آمد، رجز، جنگ شہادت بین و غمخواری کے اظہار کو عزاداری کو شامل کیا۔

میر انیسؔ نے ۲۴ نایاب اور غیر مطبوعہ مرثیے لکھے انھوں نے بارہ سو کے قریب مرثیے لکھے مگر اس زمانے میں ان مرثیوں سے اغماض برتا گیا۔ انھوں نے مرثیے ہی نہیں لکھے بلکہ سلام، قصائد نوحے رباعیات میں بھی اپنی خوبصورت شاعری کو اردو شاعری اور نقد میں محفوظ کرایا۔ خاص کر ان کی مراثی میں ایک طلسماتی فضا ملتی ہے جس کو 'کرشمہ سازی' کا عنصر بھی کہا جاتا ہے خاندان سیادت کے اس فرد نے مولوی حیدر علی اور مفتی حیدر عباس سے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ میر انیسؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل نگاری سے کیا مگر اپنے والد میر خلیقؔ کے کہنے پہ اس فرمانبردار بیٹے نے غزل لکھنا چھوڑ دی اور غزل سے لاتعلق ہی ہو گئے۔ محمد حسین آزاد کا کہنا ہے۔ والد کی فرمانبرداری میں غزل کو ایسے چھوڑا کہ بس غزل کو سلام کر دیا مگر جب وہ غزل کہا کرتے تھے تو انھیں شیخ امام ناسخ نے انیسؔ تخلص اختیار کرنے کو کہا تھا مگر یہ تخلص غزل کے حوالے سے نہیں بلکہ رثائی ادب کے حوالے سے صدیوں بعد بھی آج جگمگاتا ہے۔ انیسؔ نے زمین سخن کو آسمان کر دیا۔

انھوں نے طرز احساس کو وسیع کیا اور اردو شاعری بالخصوص مرثیے کو مادیت سے باہر نکال کر روحانیت سے بھر دیا میر انیسؔ جس وقت مرثیہ کے آفاق میں داخل ہوئے تو اس وقت لکھنؤ میں لفظی تصنع، مصنوعیت، سطحیت اور نفس پرستی اپنے عروج پر تھی تو انھوں نے دہلی کے دبستان شاعری کی اس کہاوت کو

غلط ثابت کردیا کہ بگڑا شاعر "مرثیہ گو" ہوتا ہے۔

میر انیسؔ کے خاندان میں شاعری نسلوں سے چلی آ رہی تھی۔ ان کے جد امجد میر امامی تھے جو شاہجہاں کے عہد میں ہرات سے ہندوستان آئے۔ میر ضاحکؔ ان کے پردادا تھے اور دادا میر حسن نے اردو کی لازوال مثنوی "سحرالبیان" لکھی میر انیس کے تین بیٹوں میر نفیسؔ، میر رئیسؔ اور میر سلیسؔ بھی شاعر تھے مگر مرثیے کے میدان میں میر نفیس کے مرثیے زیادہ مشہور ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ مرثیے کی نشوونما عزاداری کی گود میں ہوئی اور اودھ کے ماحول میں ان کی شاعری کو عروج حاصل ہوا اودھ کے نوابین اور حکمراں اثنا عشری تھے جنھوں نے مرثیے کو پروان چڑھایا اور یہ صنف ادب وقت کے ساتھ توانا سے توانا ہوتی چلی گئی۔ میر انیسؔ کے نواسے میر عارفؔ نے اپنی یادنگاری میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے آخری ایام میں میر انیسؔ نے ۱۵۷ یعنی ایک ہزار ایک سو بیالیس مصرعوں کا شاہکار مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے" قلم بند کیا جو ایک رات ہی میں لکھا گیا اور اپنے خاندان کی عشرۂ مجالس میں اس کو اپنے مخصوص انداز میں پیش بھی کیا۔ میر انیسؔ کے مرثیے لسانی تجربات سے بھی مزین ہیں۔ ان کی ایک طویل مراثی میں کسی بھی نقطوں میں بغیر نقطوں کے مرثیے لکھے لہٰذا ان کو بے نقط مرثیہ گو بھی کہا جاتا ہے۔ میر انیسؔ کے مرثیوں پر سید مسعود حسن رضوی صاحب نے لکھا ہے کہ اردو مرثیے میں وہ جامعیت ہے کہ اس کے سامنے ساری صنفیں محدود نظر آتی ہیں ابتدا میں مرثیے بہت مختصر ہوتے تھے ان کے مضامین بھی محدود تھے اور ان کا حلقہ اثر بھی محدود تھا وہ شکل میں زیادہ تر غزل قصیدہ سے مشابہ ہوتے تھے۔

میر انیسؔ کے بزرگوں مثلاً ان کے پردادا میر ضاحکؔ دادا میر حسنؔ اور میر خلیق سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا اور میر انیسؔ نے مرثیے کی صنف میں ایک نیا نکھار پیدا کر دیا اور خالص دردناک اور واہماتی جمالیات سے مرثیے کو عقیدہ کے ساتھ پیش کرتے ہوئے ایک فن بنا دیا۔ انیس نے مرثیے کے مختصر کینوس کو وسیع کیا اور انھی لوازمات اور متعلقات کو اپنے مرثیوں میں شامل کیا جو ان کے ذہنی مزاج سے قریب تھے ان کے مرثیوں کی فصاحت اور بلاغت و دیگر لفظیات اور کربلا کے واقعات کے ماخذات معاشرت کو ہندوستانی سیاق میں تشجیر کاری کر کے نئے شاعرانہ لوازمات کے ساتھ مرثیے کے فن کو مقدس اور معتبر صنف ہی نہیں بنایا بلکہ مرثیہ کو ایک ایسا مزاج دیا جو عمرانیاتی اور تشریاتی ہوتے ہوئے احتجاج اور انسانی مزاحمت کے جذبات کو بھی ابھارتا ہے اس میں انسان دوستی اور وجود کی اذیت ناکی اور انسان کے جبر و استبداد کی کیفیات کو ایک مخصوص نظام اشاریت اور رموزیات میں بیان کر کے مرثیے کے فن کو فکری بنا دیا۔ آج ڈیڑھ سو سال گذر جانے کے بعد میر انیسؔ کے مرثیے عصری و معاشرتی اور عقائدی موضوعات اور تشریحات کے سیاق میں بھی نئی معنیات کو دریافت کیا جا رہا ہے مگر بدقسمتی سے اردو میں میر انیسؔ کے مرثیوں کو زیادہ عمیق تنقیدی اور معنوی گہرائی کے ساتھ نہیں لیا گیا ہے۔ اسے مذہبی حوالے سے اور اس کے مجلس عزا تک محدود رکھا اور یہی اس کی ثقافت کی شناخت بنی مگر اسی دور میں جیسے میر تقی میرؔ، غالبؔ ذوقؔ، سوداؔ، مومنؔ، مصحفیؔ آتشؔ وغیرہ کی شاعری کا مطالعہ تفہیمات اور تشریحات زور و شور سے کی گئی وہ میر انیسؔ کے حصہ میں نہیں آئی میر انیسؔ کو دشت کربلا کا سیاح بھی کہا جاتا ہے جنھوں نے ایک سفری رپوتاژ کی صورت میں مرثیے کو پیش کیا۔ انیسؔ دکھاوے کی شاعری کے قائل نہیں تھے وہ شاعری میں بازی گری سے بھی بیزار تھے اور وہ اسے اردو شاعری میں بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ اس قسم کی عدم سنجیدگی اس وقت کی شاعری میں بہت تھی۔ انھوں نے اس رائج لکھنوی شاعری سے الگ رہ کر اپنا راستہ خود بنایا وہ کہتے ہیں۔

ایک قطرہ جو دوں بسط کو تلاطم کر دوں
بحر مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں

لہٰذا انیس کے فنی ہیئتی، لسانی ڈھانچے ساختیاتی اور جدلیاتی شعری مخلطے کا واضح طور پر مطالعہ نہیں کیا اور ان کے محاسن منظر عام پر نہیں آسکے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مرثیے کا صرف اعتراضی شاعری کی حد تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ انیس کے انتقال کے بعد سب سے پہلے شبلی نعمانی نے "موازنہ انیس و دبیر" میں ان دونوں شعراء کے محاسن ستم اور ہنر مندی پر خاصا روشن خیال تقابل کیا ہے جو آج بھی معتبر تصور کیا جاتا ہے اور اس کے اعلا تحقیقی معیار کو واضح کیا۔ میر انیس کو اپنی زندگی میں مرثیے کو ادبی تناظر میں کمتر سمجھنے کا احساس بھی تھا۔ لہٰذا انیس کا کہنا تھا۔

"حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہے کچھ باک
ناقہم ہے وہ چھا ندیہ ڈالے جو کوئی خاک"

شبلی نے میر انیس کے مرثیوں کا نئے انداز میں مطالعہ کیا ہے اس کی قدر و قیمت اور مرتبے کو مطمئن کرنے کی ایک مثبت اور تجزیاتی کوشش کی اور نہایت کھلے ذہن سے انیس اور دبیر کے مرثیوں کا موازنہ کرتے ہوئے انیس کے مرثیے کو دبیر کے مرثیے سے بلند مقام پر رکھا اور "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کے پامال کلمات (   ) کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا اور مرثیے کی بلندیوں کو انیس نے ناظرین اور قارئین کے سامنے ایک الگ صنف کے طور پر روشناس کروایا۔ اس سے قبل مرثیے کو نظم کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ اور عوام و خواص میں ایسا مقبول بنایا یہی نہیں اردو اردو کی شاعری میں خاص طور پر اردو کی گداز غزلوں میں مرثیوں کے الم و یاس کا گہرا اثر ہے۔ انیس کے مرثیے بعض دفعہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے ہزیمت زدہ زوال کا نوحہ بھی لگتا ہے۔ انیس کے کچھ مرثیوں میں علامتی اور عمیق معاشرتی اور مذہبی رموز کو استعمال کرتے ہوئے اس تاریخی اور المناک الخطاط پر نوحہ خوانی کی ہے تو دوسری جانب ان کے نوحے شہر آشوب کی صورت میں بھی ابھرتے ہیں مثلاً لکھنؤ کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے ایک مرثیہ کے سولہ بندوں پر میر انیس اپنے ہاتھ سے جو ایک دو صفحات لکھے ہیں جو ان کے پوتے محمد حسن فائز کے پاس محفوظ تھے۔ انھوں نے نویں دسویں بند میں لکھا ہے۔

جب لشکر خدا کا علم سرنگوں ہوا۔ انیس کے مرثیے رزمیہ شاعری کے زمرے میں بھی آتے ہیں رزمیہ شاعرانہ اظہار میں خیر و شر کی جنگ کو بیان کیا جاتا ہے جس میں معاشرے کے اچھے اور برے کردار ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں اور اچھے کرداروں کو فتح نصیب ہوتی ہے کربلا کی جنگ وہ واحد جنگ ہے جس میں امام حسینؑ شکست کھا کر بھی فاتح کہلائے اور یزیدی فوج کے حصہ میں شرم و ذلت آئی خاص کر کربلا کے حوالے سے ان کا شاعرانہ اظہار رزمیاتی نوعیت کا ہے جس میں انھوں نے مہارت کے ساتھ بلند تخیل اور مضمون آفرینی سے اردو مرثیے میں جدت سے بھرے ہوئے شعری تجربے بھی کئے ہیں جس سے ان کے شعری بیانیے میں زور تشبیہات اور استعاروں میں جدّت تنوع خلق ہوتی ہے۔ انیس نے انسانی خدمات، جبلت اور ڈرامائی و تمثیلی فنکارانہ حوالے سے بھی اردو مرثیے کو عوام الناس کے شاعرانہ مذاق کا نہیں بلکہ مرثیہ کی ڈرامائی تاثر کو زیادہ اثرانگیز بنا کر اسے نئی زندگی دی۔ منظر نگاری، کردار نگاری، واقعہ نگاری، رزم نگاری اور جذبات نگاری کو منفرد حساس جذباتی و فکری سطح پر شاعرانہ اظہار میں ایک نئی جدت کے ساتھ عوام تک پہنچایا اور یوں مرثیے کے ساتھ میر انیس ایسا جڑ گیا کہ مرثیہ انیس مترادف الفاظ بن گئے ہیں۔ میر انیس نے مرثیہ کے لغوی معنی کو وسعت اس طور پر دی کہ اسے جامعیت پر آوازدی" کے معنی کو ایک ثقافتی اور تاریخی تناظر میں پیش کر کے نئے فکری اور اظہار کے نئے بیانوں کو اردو شاعری سے متعارف کرایا۔ یہی نہیں انیس نے

اپنے مرثیوں میں کربلا کی جنگ کے مناظر، واقعات، کیفیات کو باقاعدہ طور پر دیکھنے (امیج) اور محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ جس کو قاری اور سامعین اپنے آپ کو اس جنگ کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے یہی منظر نگاری کا کمال ہے جس کو انیس کا اظہاری جوہر بھی کہا جاسکتا ہے ان کی شاعری میں زبان خود شاعر کے اظہار کو تکلم عطا کرنے لگتی ہے انیس زبان پر حاوی ہیں اور لسانی غلبہ ان کی شاعری پر اپنا رعب قائم نہیں کرتا بلکہ انیسؔ کی فکر اظہار اور جوش و جذبات کی بشری مزاحمت، ثقافتی لہجہ اور فکری رویہ میں ان کے مرثیے کو موج کمال سے سرفراز کرتے ہیں جس میں رزمیہ اظہار کی تپش، دلیری، حق کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے کی خواہش ایک حقیقی کو خلق کرتی ہے۔ ان کے مرثیوں کی فضا اس لیے بھی اجنبی نہیں لگتی کہ مقامی ثقافتی نمونوں اور بود و باش و رسم و رواج کو وہ اپنے مرثیوں میں اس چابک دستی سے شامل کرتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ کربلا کا واقعہ ہندوستان سے دور عربستان کا نہیں ہے بلکہ یہ ہندوستانی مٹی پر رونما ہونے والا سانحہ لگتا ہے۔ شاید اسی سبب کلیم الدین احمد یہ کہنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ میر انیسؔ نے حضرت امام حسینؓ کو لکھنؤ کا دولہا بنا دیا۔ یہی مہارت، ہنرمندی اور فصیح تخیل بندی ان کی مضمون آفرینی کی جان ہے اور اس سبب ان کی شاعری میں سقم اور نقائص پر پردہ پڑ جاتا ہے شاید اسی سبب انھیں اردو شاعری کا ہومر، ایلیڈ، ادیسی، لاڈ کون، ورجل بالمیک اور فردوسی سے بھی منسلک کیا جاتا ہے۔

امداد امام اثرؔ نے کاشف الحقائق (معروف بہ بہارستان سخن مطبوعہ جلد دوم صفحہ ۲۷۴) میں لکھتے ہیں۔ میری دانست میں ہومر ایک بڑا بلندی شاعر تھا لیکن اگر ہومر سیر تھا تو میر انیسؔ صاحب سوا سیر تھے۔ اس افزونی کی وجہ یہ تھی کہ میر صاحب خود نفس شاعری میں ہومر سے زیادہ تھے یا یہ کہ میر صاحب سبجیکٹ ( ) یعنی شاعری کا موضوع ایک ایسا واقعہ بزرگ ہاتھ لگا کہ جس کا جواب دنیا میں نظر نہیں آتا۔ رزمیہ انداز میں جب میر انیسؔ نے میدان کربلا میں تلواروں اور تیروں کی چنگاریاں میدان جنگ جگمگاتا تھا اس کی تصویر کشی کی۔ انھوں نے یہ شعر کہا جس کو پڑھ کر اور سن کر انسان حضرت حسینؓ کی بہادری اور جذبے کو سلام پیش کرتا ہے اور ان کا شعری اظہار ایک فنکار کی تخلیقی صورت میں ابھر کر سامنے آتی ہے ؎

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے
اڑنے لگے شرر و خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشت مصاف سے
صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے

مرثیہ اردو کے تمام اصناف کا احاطہ کرتا ہے۔ مرثیہ سے قبل اردو شاعری میں نظر آتا ہے مگر پہلی بار مرثیہ نے اردو میں رزمیہ کو متعارف کروایا۔ میر انیسؔ نے کئی سو سال پہلے کے سانحہ کربلا کو زمان و مکان کے تناظر سے بھی دیکھا اور ایک دردناک ماضی کے واقعہ کو حال کے سیاق ہی میں نہیں بلکہ مقامی ہندوستانی تناظر میں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا۔ یعنی میر انیسؔ کا شعری کمال ہے کہ انھوں نے مرثیے کو تاریخ سے نکال کر عمرانیاتی بشریاتی مباحث میں شامل کر دیا جس میں جمال بھی تھے اور جلال بھی ہے۔ عقیل رضوی اپنی کتاب "مرثیے کی سماجیات" میں میں لکھتے ہیں ... میر انیس نے ماضی کی کیفیات کو حال میں ضم کر کے المیے کی شدت میں مزید جذباتی گہرائی پیدا کر کے اپنی ایک تکنیک پیدا کر کے سکینہ کی زبان سے ارمان بھرے لمحات کا اعادہ کر کے سامعین کے دلوں میں ان کی تہذیبی تصور دکھا کر اس غم میں مزید کاٹ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔" (ضمیمہ ۲۴ سال ۱۹۹۳ نصرت پبلشرز لکھنؤ)

میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں کا یہ سلیقہ اور امتیاز بھی ہے کہ انھوں نے کربلا کے واقعہ کو ایک ثقافت سے اٹھا کر دوسری ثقافت میں ڈھال لیا اور یہ مرثیہ خاص ہندوستانی بود و باش کا بن گیا مثلاً شمالی ہندوستان کے ہندوؤں میں "رسم سمکشتا" ہے جس میں دولہا دلہن کو ایک دوسرے کے سامنے بٹھا کر ایک دوسرے

سے رونمائی کروائی جاتی ہے جس کو مسلمانوں میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کے بعد آرسی مصحف کے نام سے جانا جاتا ہے اس کو انیس نے بڑے فنکارانہ انداز سے یوپی کے ہندوستانی ماحول میں سمو کر اپنے مرثیے "وہ جھولا شفق سے چڑے پر،،

جب لالہ زار صبح میں گری اور حضرت قاسم سے رخصت ہونے پر "آرسی مصحف" کی رسم کو یوں بیان کیا ہے ؎

صاحب بھلا عدم کے مسافر سے کیا حجاب
ہم یوں ہیں جس طرح کہ سر آب ہو حباب
گھونگھٹ اٹھا کے ہم کو دکھاؤ تو رخ کا نور
پاس اب نہ آسکیں گے کہ ہوتے ہیں تم سے دور

انیس کے مرثیے اردو شاعری کا زیور ہیں یہ وہ ہونہار شاعر ہیں جس نے اپنے والد کے کہنے پر غزلوں کو خیرباد کہہ کر اپنے شاعرانہ جوہر کو مرثیہ کے لیے وقف کردیا۔ انھوں نے سلام اور رباعیاں لکھیں مگر ان کی قدر و منزلت "مرثیے،، میں ملی۔ ان کے دور میں کئی نامور غزلیہ شعراء موجود تھے۔ انیس اس لحاظ سے روایتی ماحول اور شاعرانہ بندشوں سے باہر نکل کر مرثیے میں وہ کارنامے دکھائے جو آج ڈیڑھ سو سال گذرنے کے بعد کسی مرثیہ کو نصیب نہیں ہوا ان کا مرثیہ کہنے کا فیصلہ بغیر خوف اختیار کیا۔ اس میں ان کی انکساری، بزرگوں اور والدین کی دعائیں شامل تھیں میر انیس نے اس بات کا احساس دلایا کہ امام حسین اور ان کے رفقاء ملکوتی صفات سے آراستہ تھے کہ ان کی قوت مشاہدہ اتنی قوی تھی کہ وہ واقعات کی گہرائیوں میں اتر کر ایسے شعری سراپے میں بیان کر سکتے ہیں جو اس عالم میں ممکن تھے یہی انیس کی قوت متخیلہ کی جانچ تھی اور میر انیس اس میں سرخرو ہوئے۔ راقم الحروف نے کراچی کے اخبار "مساوات،، دسمبر ۱۹۷۴ میں میر انیس کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں میرا موقف یہ تھا۔

لکھنؤ کے معاشرے اور انداز فکر میں اور سماج کی اخلاقی حالات میں افسوسناک حد تک تبدیلی آ گئی تھی۔ زندگی کے ہر شعبہ پر ظاہرداری اور بناوٹ کی چھاپ تھی لہٰذا شاعری ان تمام عوامل سے الگ کیسے رہ سکتی تھی۔ انشا جیسا طباع انسان درباداری کے امراض میں گرفتار ہو کر ایسا تباہ ہوا کہ اس کا جتنا ماتم کیا جائے کم ہے... ان برائیوں کو کم کرنے کے لیے مجدّد کی موجودگی ضروری تھی یہ مجدد انیس کی صورت میں ظاہر ہوا۔ بالکل نہیں کہا جاتا ہے کہ اگر انیس درمیان میں نہ آجاتے تو لکھنؤ کی شاعری کی آج کیا حالت ہوتی۔ غالباً مرثیہ کو بھی وہ دلکشی حاصل نہ ہوتی جو انیس کی وجہ سے نصیب ہوئی۔

ماخذات

احمد سہیل (سہیل احمد خان) میر انیس مساوات کراچی دسمبر ۱۹۷۶ ۔ اثر لکھنوی۔ انیس کی مرثیہ نگاری لکھنؤ۔ دانش محل مارچ ۱۹۵۱ ۔ امجد علی اشہری لکھنوی۔ حیات انیس سہ ماہی اردو شمارہ ۔۱۹۲۱ ۔ امداد امام اثر۔ کاشف الحقائق۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ ۔ انور سدید۔ میر انیس کا قلمرو۔ مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۰۔ علی جواد زیدی۔ ہندوستانی ادب کے معمار ساہتیہ اکادمی دہلی۔ فضل امام۔ انیس شناسی علی گڑھ مکتبہ الفاظ ۱۹۸۱ ۔ نیر مسعود۔ میر انیس۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد عقیل رضوی۔ مرثیے کی سماجیات۔ نصرت پبلشرز لکھنؤ ۱۹۹۳ محمد رضا کاظمی (ترتیب تعارف) میر انیس اردو ورلڈ کراچی ۲۰۰۹ ۔ مشکور حسین یاد۔ مطالعہ انیس کے نازک مراحل کلاسیک لاہور ۲۰۰۲ ۔ غلام حیدر مرتب۔ میر ببر علی انیس کتاب نما۔ خصوصی شمارہ مکتبہ جامعہ دہلی ۲۰۰۱ ۔ صالحہ عابد حسین (مرتبہ) انیس کے مرثیے۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو نئی دہلی ۱۹۸۰ ۔

○○

انکساری نے عطا کی رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

صفحہ ۷۷ کا بقیہ

میر انیس کے عہد پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے بھی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انیس کے معاصر مرثیہ گویوں نے صنف مرثیہ کی توسیع و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا پھر ان کے شاگردوں کی کثیر تعداد ہے خود انیس و دبیر کے خاندان کے کئی مرثیہ گویوں نے ناموری حاصل کی یہ درست ہے کہ انیس و دبیر اردو مرثیہ کی تاریخ میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں لیکن ان کے معاصرین کی خدمات بھی اہم ہیں۔ انیس و دبیر کے بعد مرثیہ کی تاریخ میں جو نئے موڑ آئے۔ سماجی حالات و کوائف اور سیاسی جبرہ دستیوں کے متعلق جو مرثیے لکھے گئے ان میں انیس کے علاوہ ان کے معاصرین اور ان کے خوردوں کے اثرات صاف دیکھے جا سکتے ہیں۔

◇◇

صفحہ ۸۰ کا بقیہ

۱۲۰ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور میر مونس کا یہ سلام کئی مجموعوں میں شائع بھی ہو چکا ہے تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی تصنیف "مرزا سلامت علی دبیر" صفحہ ۹۶۔ ۹۷

مرزا سلامت علی دبیر نے میر انیس کی وفات کے بعد مرثیہ کہنا ترک کر دیا اور ہر وقت اپنے برادر عینی مرزا انطیسر اور برادر دینی میر انیس کے سوگ میں مغموم اور اداس رہتے تھے۔ یہ موقع نہیں کہ میں اس مضمون میں ہر بات کو شواہد اور ثبوتوں کے ساتھ حوالے دے دے کے وضاحت پیش کروں بلکہ یہ محض ایک غلط فہمی کو ذہنوں سے دور کرنے کے لیے کچھ اشارے کیے گئے ہیں تاکہ ان اساتذہ کے تئیں اگر ہم اپنا خراج پیش نہ کر پائیں تو کم سے کم اپنی طرف سے غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کو روک کر مقدور بھر کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔

◇◇

صفحہ ۱۰۴ کا بقیہ

کہ رکھا ہے تو پھر دہلی اور دکن کی مرثیہ گوئی کو پوچھنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟

مرثیے کی شعریات میں ایک اہم اضافہ میر انیس کے زمانے میں اور شاید ان کے ہی ہاتھوں یہ ہوا تھا کہ مرثیہ میں استعارہ، رعایت اور مناسبت الفاظ کا بول بالا ہوا۔ انیس کے زمانے سے پہلے یہ خصائص مرثیے میں بہت کم تھے۔ مرثیہ کو بین کی سطح سے اٹھا کر شاعری کی سطح پر قائم کرنے میں ان چیزوں کا بڑا ہاتھ ہے شبلی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ "خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی مبالغہ، صنائع و بدائع، شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں اگرچہ بعض جگہ یہ چیزیں نقش و نگار اور زیب و زینت کا کام دیتی ہیں" یہ بیان صحیح ہو یا غلط لیکن ظاہر ہے کہ یہ میر انیس یا لکھنؤ کے کسی بھی اہم مرثیہ گو کے کلام کے بارے میں دور رس غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے ان غلط فہمیوں کا تدارک صرف اس بات سے نہ ہوگا کہ میر انیس یا دیگر مرثیہ نگاروں کے یہاں بکار لائی ہوئی صنعتوں کی فہرست بنائی جائے۔ اس سے بہت زیادہ ضروری یہ ہے کہ مرثیہ کی شعریات کو از سر نو اس طرح مرتب کیا جائے کہ مرثیہ، غزل، قصیدہ، مثنوی اور داستان سب ایک باپ کی اولاد معلوم ہوں۔

◇◇

صفحہ ۱۰۷ کا بقیہ

یہ حال تھا کہ پھولوں کی شادابی بھی مرجھا گئی تھی اور گرمانے والی دھوپ اپنی سفیدی کھو کر کجلا گئی تھی۔

وہ لو وہ آفتاب کی حدّت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے جن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

◇◇

ڈاکٹر مظفر سلطان حسن تُرابی
ریٹائرڈ ٹیچر ادجی آئی سی ٹیچرس کالونی
نزد کوتوالی مغل پورہ۔ مراد آباد
7905279087

میر انیس کے مراثی میں تاریخ اسلام

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ واقعہ کربلا کا مذہب اسلام اور دین و آئین اسلام سے براہ راست بہت گہرا ربط و تعلق ہے کیونکہ یہ المناک واقعہ رونما اور وقوع پذیر ہی اس لیے ہوا کہ یزید پلید اصول و احکام اسلام میں تحریف و تنسیخ کر رہا تھا اور اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے انسانی و اخلاقی اقدار پر مبنی پیغامات کو مسخ و منسوخ کر رہا تھا جس کی بنا پر یزید کے اس سوء عمل کے فطری اور ضروری ردعمل کے طور پر اس کے خلاف امام حسینؑ کے قیام و اقدام کے نتیجے میں یہ عظیم سانحہ و المیہ پیش آیا چونکہ یزید پلید انسانی اقدار اور اسلامی شعار و کردار کو پامال کر رہا تھا اس لیے تاریخ اسلام میں تبلیغ اسلام کے اپنے نانا رسولؐ خدا حضرت محمدؐ مصطفےٰ اور اپنے بابا ولی خدا حضرت علیؑ مرتضیٰ کے ایثار و قربانی پر نظر رکھنے اور اسی تحفظ دین کے فداکارانہ ماحول اور اس کی جاں نثارانہ فضا میں تربیت و پرورش پانے والے حضرت امام حسینؑ نے محسن انسانیت اور محافظ شریعت کی حیثیت سے اسلام کی حفاظت کے لیے تاریخ ساز شہادت قبول کر کے اور تاریخ انسانیت کی عظیم الشان اور عدیم المثال قربانی پیش کر کے عظمت انسانیت اور وقار انسانیت کو بچا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ کربلائی ادب چاہے سوز و سلام کی صنف سے ہو یا نوحہ و مرثیہ کی صنف سے ہو سب میں مختلف تلمیحات کے ذریعے جگہ جگہ اسلامی واقعات کے حوالے نظر آتے ہیں خصوصاً مرثیے میں تو اس طرح کے نمونے کثرت سے ملتے ہیں۔

اردو مرثیہ نگاروں نے عزت بشریت کی حفاظت اور ناموس شریعت کے تحفظ کے لیے معرکہ کربلا کے جاں باز نیک ناموں کے فداکارانہ کارناموں اور سپاہ اسلام کے جاں نثاروں اور وفا شعاروں سرفروش کرداروں کا تذکرہ کرتے ہوئے حسینی جماعت میں شامل مجاہدوں کے صفات و کمالات نیز خاندان رسالت کے دوران نبوت سے وابستہ افراد و اشخاص کی ذاتی و خاندانی شرافت و نجابت اور عظمت و فضیلت کے لحاظ سے خصوصاً میدان جنگ میں معرکہ آرائی اور نبرد آزمائی کے موقع پر غازیوں اور مجاہدوں کی رجز خوانی و مبارز طلبی کے ذریعے اپنے اعلیٰ و ارفع حسب و نسب اور آبا و اجداد کی جلالت و سعادت کے اظہار و اعلان کا بیان کرتے ہوئے متعدد مقامات پر تاریخ اسلام کے مختلف اہم واقعات کا ذکر کیا ہے اور خاص طور پر میر انیس نے اپنے مراثی میں بہت ہی موثر و معتبر تلمیحات کے ذریعہ نہایت بلیغ و عمیق اشارات و کنایات کے وسیلے سے تاریخ اسلام کے بہت سے واقعات و سانحات کو بڑے اہتمام و احترام کے ساتھ نہایت مناسب مقامات پر بہت برمحل جگہ دے کر ان سے وسیع پیمانہ پر خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ ان واقعات سے واقعہ کربلا کا دین اسلام سے ربط و تعلق کا بھی پتہ چلتا ہے اور بڑی حد تک معرکۂ کربلا کے اسباب و عوامل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مراثی انیس میں تاریخ اسلام کے نمونے اور اشارے اتنی کثیر

تعداد میں ملتے ہیں کہ ان کا احاطہ کسی مضمون یا مختصر مقالے میں ممکن
نہیں ہے بلکہ اس کے لیے کئی ضخیم کتابیں درکار ہوں گی کیونکہ واقعہ کربلا
کا اصل ہدف اور مرکزی موضوع ہی دین اسلام ہے۔ اور ظاہر ہے
کہ دین اسلام خود بہت سے ضمنی، انسانی و اخلاقی موضوعات پر
محیط و مشتمل ہے۔ اس لیے زیرِ نظر مقالے میں اختصار کے پیشِ نظر
حتی الامکان صرف ایسے چند مشہور و معروف تاریخ ساز و کردار ساز واقعات
کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے جس سے معرکہ کربلا کی اہمیت اور
اس کے کرداروں کی عظمت اجاگر ہوتی ہے اور شہدائے کربلا و شہیدان
راہ حق و صداقت کا مقصد شہادت بھی واضح ہوتا ہے۔ یہ کیونکہ میر
انیس نے اپنے مراثی میں تاریخ اسلام کے واقعات کا استعمال
واقعہ کربلا کے کرداروں کی شخصیتوں کی مناسبت سے نہایت سلیقہ
مندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ حالات و سانحات کے مطابق
نظم کیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ تاریخ اسلام پر میر انیس کے
عبور و تسلط کا پتہ چلتا ہے بلکہ اپنی وسیع تاریخی معلومات کے برمحل
اور مناسب استعمال میں ان کی قدرت کلام اور مہارت فن بھی ثابت
ہوتی ہے۔ میر انیس نے تاریخ اسلام کے مختلف واقعات کو معرکہ
کربلا میں شامل شخصیات اور ان سے منسوب و متعلق حالات کے
تناسبات و تلازمات کے مطابق علم معانی و بیان کی روشنی میں صنائع
و بدائع کی خوبیوں اور لفظی و معنوی صنعتوں کے ساتھ نہایت فنی
مہارت اور چابکدستی سے استعمال کیا ہے جس سے مرثیہ نگاری
کے فکر و فن اور شعر و سخن پر ان کی مضبوط گرفت اور استادانہ و فنکارانہ
عبور و تسلط کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس مقالے میں میر انیس کے مراثی میں مذکور تاریخ اسلام
کے ان مشہور و معروف واقعات و حادثات کا اجمالی تذکرہ کرتے
ہوئے ان کا مختصر جائزہ پیش کیا جا رہا ہے جو تاریخ اسلام کی مقدس
ترین ہستیوں اور خاندان شریعت کی پاکیزہ ترین شخصیتوں سے
منسوب و متعلق ہیں اور تحفظ دین و شریعت کے سلسلے میں اہلبیتؑ
رسالت سے مخصوص طور پر وابستہ ہیں اور جن کو دین اسلام کی
تبلیغ و تحفظ اور تعمیل و تکمیل میں بنیادی حیثیت اور کلیدی اہمیت حاصل
ہے خصوصاً میر انیس کی مرثیہ نگاری میں ان کی مخصوص و منفرد اور
ممتاز و مایہ ناز خصوصیت یعنی "رزمیہ شاعری" کے حوالے سے اسلامی
شریعت کی اشاعت و حفاظت کے لیے ان ذوات مقدسہ
کی مسلسل عزیمت و استقامت، عزم و استقلال اور شجاعت و
شہامت نیز ایثار و قربانی اور جاں نثاری و فداکاری پر مشتمل
واقعات کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

کربلا کی جنگ اصل میں حق و باطل اور ایمان و نفاق بلکہ ایک
طرح سے دین و بے دینی اسلام اور کفر کی جنگ تھی جس میں امام
حسین حق کے نمائندے تھے اور یزید باطل کا نمائندہ تھا اور اس
جنگ میں حسین اسلام کی محافظ روشن ہستیوں کے وارث کا کردار
ادا کر رہے تھے اور یزید اسلام مخالف تاریک شخصیتوں کا کردار
ادا کر رہا تھا۔ اس اعتبار سے کربلا کے حالات و واقعات
بیان کرتے وقت دلیل و تمثیل کے طور پر تاریخ اسلام کے
بعض گزشتہ حالات و واقعات اور کردار و شخصیات کا ذکر بھی ناگزیر
تھا۔ اسی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میر انیس نے بھی اپنے
مراثی میں حسب موقع و محل کسی بھی واقعے کی مناسبت سے تاریخ
اسلام کے کسی نہ کسی گزرے ہوئے واقعے کی یاد دہانی کرتے ہوئے
نہ صرف تاریخ اسلام سے اپنی وسیع معلومات کا ثبوت دیا ہے
بلکہ واقعات کے تقاضے اور مطالبے کے مطابق مناسب تلمیحات
کا استعمال کر کے مرثیہ نگاری کے فکر و فن پر اپنے عبور اور اسے
سلیقے سے برتنے کے شعور کا بھی مظاہرہ کیا ہے۔

اہلبیتؑ اور پنجتن پاک سے متعلق واقعات

اہلبیت اطہارؑ اور پنجتنؑ پاک کا پاکیزہ کردار اور دین اسلام
کی تبلیغ و تحفظ میں آغاز دعوت و ہدایت ہی سب سے زیادہ
نمایاں اور عظیم الشان و عدیم المثال رہا ہے۔ اس سلسلے میں
ان کی صداقت و ہدایت، شجاعت و سخاوت اور دین اسلام کی
نصرت و حمایت اور رسول اسلامؐ کی نبوت و رسالت
کی گواہی و شہادت نے شروع ہی سے بڑی اہم خدمات

انجام دی ہیں وہ دین اسلام کی ہمہ جہت اشاعت و حفاظت کے لیے ہمہ وقت و ہمہ تن ہمیشہ ہر موقع پر اس طرح آمادہ و تیار رہتے تھے کہ اگر وہ قرآنی احکامات اور الٰہی پیغامات اور اسلامی تعلیمات کو اپنی سیرت و شخصیت میں ڈھال کر دنیا میں بہترین نمونۂ عمل پیش کرتے تھے تو خدا نے بھی ان کے قول و عمل کو اپنے کلام کی تعبیر اور اپنی کتاب کی تفسیر سے عبارت کر کے اپنی سنت اور قرآن کی سورت و آیت کا پیکر عطا کر دیا تھا۔ دین اسلام اور رسول اسلام کے تحفظ کے لیے اہلبیتؑ اطہار کا یہ کردار اور جذبۂ ایثار دعوت ذوالعشیرہ میں تبلیغ دین اور آغاز ہدایت سے لیکر میدان غدیر میں اعلان ولایت کے ذریعے تکمیل دین اور اتمام نعمت تک اور پھر میدان کربلا میں اسلامی شریعت اور الٰہی سنت کی حفاظت کے لیے حسینؑ اور اصحاب حسینؑ کی شہادت تک کا ہر واقعہ تاریخی اہمیت بلکہ تاریخ ساز حیثیت رکھتا ہے۔

چنانچہ اس سلسلے میں جب ہم مراثی انیس کا مطالعہ کرتے ہیں تو جگہ جگہ تاریخی واقعات پر مبنی ایسی تلمیحات کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کے ذریعہ انھوں نے اہلبیتؑ اطہار اور پنجتن پاک کی عظمت و فضیلت سے منسوب و متعلق الگ الگ واقعات کو اپنے مختلف مرثیوں کے متعدد بندوں میں بار بار تکرار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ میر انیس کے انھیں مرثیوں کے ایسے ہی کچھ تلمیحاتی بندوں کے حوالے سے تاریخ اسلام کے ان چند مشہور و معروف اور اہم واقعات کا ذکر اس مقالے میں کیا جا رہا ہے جن میں اہلبیتؑ اطہار اور پنجتن پاک کے فضائل و مناقب کا بیان اور اعلان کیا گیا ہے۔

دعوتِ ذوالعشیرہ

دین اسلام کا پہلا جلسۂ تبلیغ جہاں سے اس کی اشاعت اور ہدایت کا آغاز ہوا وہ تاریخ اسلام میں دعوت ذوالعشیرہ کے نام سے مشہور ہے کیونکہ بعثت کے بعد رسول اللہ برابر تین سال تک بہت ہی رازداری کے ساتھ پوشیدہ طور پر اسلام کی خفیہ دعوت دیتے رہے اور جب یہ آیت نازل ہوئی کہ "اے رسول تمہارے کنبہ والوں میں جو تمہارے قریبی رشتہ دار ہیں انھیں اللہ سے ڈراؤ"[1] تو آنحضرت نے حضرت علیؑ کے ذریعہ ضیافت کا مختصر سا انتظام کر کے اولاد عبدالمطلب کے چالیس آدمیوں کو بلوایا اور کھانا کھلانے کے بعد اپنی نبوت و رسالت کا اعلان کر کے انھیں اسلام کی طرف دعوت دی مگر رسولؐ اللہ کا کلام سنے بغیر ہی مجمع منتشر ہو گیا۔ دوسرے دن پھر ضیافت کا انتظام کر کے انھیں جمع کیا اور دعوت طعام کے بعد دعوت اسلام دی اور کار تبلیغ و ہدایت میں نصرت و مدد چاہی مگر سوائے حضرت علیؑ کے کسی نے بھی حامی نہیں بھری اور سب نے نصرت و اعانت کے ساتھ ہی آپ کی نبوت و رسالت کی گواہی اور شہادت دینے سے بھی انکار کر دیا جب سب لوگ رسولؐ اللہ کو جھٹلا رہے تھے اس وقت حضرت علی کے ذریعہ آپ کی نبوت و رسالت کی گواہی و شہادت اور نصرتؐ و حمایت کے اعلان کا ذکر خدا نے اپنے حبیب کی تسلی اور دلاسے کے لیے قرآن مجید کے سورہ رعد میں کر کے انھیں اس طرح اطمینان دلایا ہے کہ "جو لوگ کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ تم اللہ کے بھیجے ہوئے رسول نہیں ہو۔ تو اے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ میرے اور تمہارے درمیان میری نبوت اور رسالت کی صداقت کی شہادت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے اور اس کی جس کے پاس پوری کتاب کا علم ہے"[2]

واقعہ نزول سورۂ دہر

اہلبیتؑ اطہار نے مختلف مواقع پر بارہا اپنی ضرورتوں پر دوسروں کی ضرورتوں کو ترجیح دے کر اپنی بے مثال جود و سخا اور ایثار و کرم کا بے مثل و نظیر مظاہرہ کیا ہے ایسا ہی ایک موقع وہ بھی ہے جب حضرات حسنین کریمین بیمار ہوئے تو رسولؐ اللہ کے مشورہ سے حضرت علیؑ و جناب فاطمہؑ زہرا اور امام حسنؑ و حسینؑ کے ساتھ ہی کنیز فضہ نے بھی حسنین کریمین کی صحت و شفا کے لیے تین روزوں کی منت مان لی جب حسنین کریمین شفایاب ہوئے اور ان لوگوں نے منت پوری کرنے کے لیے پہلا روزہ رکھا اور جب افطار کے لیے بیٹھے تو دروازے پر ایک سائل نے

آواز دی کہ میں ایک مسکین ہوں اور بھوکا ہوں مجھے کھانا کھلا دو یہ آواز سن کر سب نے اپنے اپنے حصے کی روٹیاں سائل کو دے دیں اور پانی سے افطار کر لیا۔ دوسرے دن پھر روزہ رکھا افطار کے وقت دروازے پر سائل نے آواز دی کہ میں ایک یتیم ہوں اور بھوکا ہوں مجھے کھانا کھلا دو اس دن بھی سب نے اپنے حصے کی روٹیاں سائل کو دے دیں اور پانی سے افطار کر لیا تیسرے دن پھر روزہ رکھا اور جیسے ہی افطار کے لیے بیٹھے دروازے پر سائل نے آواز دی کہ میں ایک قیدی ہوں اور بھوکا ہوں مجھے مجھے کھانا کھلا دو چنانچہ اس دن بھی سب نے اپنے حصے کی روٹیاں سائل کو دے دیں اور پانی ہی سے افطار کر لیا اس وقت اہلبیتؑ کے اس جود و سخا اور ایثار و کرم کی تعریف میں خدا نے پورا سورۂ دہر نازل کیا جس کی ابتدا ''ھل اتیٰ'' سے ہوتی ہے اور اسی سورہ مبارکہ میں ارشاد فرمایا ''اور یہ لوگ کھانا کھلا دیتے ہیں اللہ کی محبت میں مسکین و یتیم و اسیر کو''[3]

میرانیس نے اسی سورۂ دہر کی پہلی آیت ھل اتیٰ... آیت قل کفیٰ کے ذریعے واقعہ دعوت ذوالعشیرہ اور واقعہ نزول سورۂ دہر کی طرف اپنے تین مرثیوں کے مندرجہ ذیل تین بندوں میں اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ۔

بھیجا ہماری شان میں خالق نے ہل اتیٰ
کافی سند کے واسطے ہے لفظ قل کفیٰ
زیبا ہمارے تن پہ ہے تشریف انّما
ہم کو کیا خدا نے سرافراز لافتیٰ
ہم سے زیادہ کس کا ہے رتبہ جہان میں
قرآں ہے تین حصہ ہماری ہی شان میں[4]

حق نے کیا عطا یہ عطا ہل اتیٰ کسے؟
حاصل ہوا ہے مرتبۂ لافتیٰ کسے؟
کونین میں ملا شرف انّما کسے؟
کہتی ہے خلق بادشہ قل کفیٰ کسے؟
دنیا میں کون منتظم کائنات ہے؟
کس کو کہا خدا نے کہ یہ میرا ہاتھ ہے؟[5]

روحی فداک اے قمر برج ہل اتیٰ
قلبی فداک اے گہر تاج لافتیٰ
ابر عطا محیط کرم، منبع سخا
شمع حریم حق گل گلزار قل کفیٰ
اے نوح خلق تو ہے سفینہ نجات کا
طوفاں میں آسرا ہے فقط تیری ذات کا

واقعہ حدیث کساء

اہلبیت اطہار اور پنجتن پاک کی عظمت و بزرگی اور طہارت و پاکیزگی کے متعلق کساء یمانی (یمنی چادر) میں رسول اللہؐ کے ساتھ حضرات حسنین کریمین اور حضرت علیؑ مرتضیٰ و فاطمہ زہراؑ اور جناب جبریل امین کے جمع ہونے کا واقعہ بہت معتبر و مستند ہے واقعہ اس طرح ہے کہ ایک مرتبہ رسولؐ مقبول حضرت فاطمہ زہراؑ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں اپنے بدن میں کچھ ضعف و نقاہت محسوس کر رہا ہوں مجھے یمنی چادر لاکر اڑھا دو۔ آپ چادر اوڑھ کر لیٹ گئے کچھ دیر بعد آپ کے بڑے نواسے حضرت حسنؑ آئے اور سلام کر کے نانا سے اجازت لے کر چادر کے اندر داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چھوٹے نواسے حضرت حسینؑ آئے اور نانا کے پاس جا کر سلام کیا اور اجازت لیکر چادر کے اندر داخل ہو گئے پھر حضرت علیؑ آئے اور سلام کر کے اجازت لی اور چادر کے اندر داخل ہو گئے اس کے بعد حضرت فاطمہ زہرا بھی قریب گئیں اور سلام کر کے اجازت لی اور چادر کے اندر داخل ہو گئیں۔ اس طرح جب پنجتن پاک چادر کے اندر ایک ساتھ جمع ہو گئے تو رسولؐ اللہ نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ یہی میرے اہلبیت ہیں تو انھیں ہر رجس و نجاست سے پاک و بری رکھ چنانچہ خدا نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر فرشتوں سے اہلبیتؑ کی عظمت و فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے آسمانوں کو خلق نہیں کیا اور زمین کو نہیں بچھایا

پرنور سورج اور ضیا بار چاند کو روشن نہیں کیا۔ گردش کرنے والے فلک کو نہیں بنایا اور جاری و ساری دریا اور اس میں چلتی ہوئی کشتی کو نہیں پیدا کیا مگر ان پانچ مقدس ہستیوں کی محبت میں جو اس چادر کے اندر جلوہ فرما ہیں۔ خداوند عالم سے ان پنجتن پاک کی یہ فضیلت وعظمت سن کر جبریل امین بھی خدا سے اجازت لیکر چادر کے قریب آئے اور بعد سلام رسولؐ اللہ سے اجازت لے کر چادر کے اندر داخل ہو گئے اور کہا یا رسول اللہ بیشک اللہ تعالیٰ نے درود و سلام کے ساتھ وحی کے ذریعہ آپ پر آیۂ تطہیر نازل کر کے آپ کے اہلبیتؑ کی طہارت و پاکیزگی کی ضمانت لے لی ہے ؎ اس واقعہ میں حضرت فاطمہ زہرا کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جن کے وسیلے اور حوالے سے پنجتن پاک کا تعارف فرمایا ہے

اس واقعہ کا بھی میر انیسؔ نے اپنے دو مرثیوں کے درج ذیل دو بندوں میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

شبیر نے فرمایا کہ وہ کس کی ہے مادر۔
قرآں میں جسے حق نے کیا طاہر و اطہر
دنیا کا شرف زینت دیں عرش کا زیور
خاتون جناں نور خدا بنت پیمبرؐ
بھیجی ہے انھیں چادر تطہیر خدا نے
امت کے گنہ ڈھانپ دیئے جنکی ردا نے

ہاں بتا آیۂ تطہیر کسے آیا ہے؟
دست اپنا کسے اللہ نے فرمایا ہے؟
ہل اتیٰ کس کے لیے روح امیں لایا ہے؟
کس نے معراج کا دنیا میں شرف پایا ہے؟
قرب ایسا کسے اللہ کی درگاہ میں ہے
فرق قوسین بتا کس میں اور اللہ میں ہے

محبتِ اہلبیتؑ اجرِ رسالتؐ ہے

اسلام کے لیے اہلبیتؑ اطہار اور پنجتن پاک کی خدمات و زحمات کے اعزاز و اکرام کے لیے خدا نے ان کی محبت و مودت کو اجر رسالت قرار دیا ہے چنانچہ جب مسلمانوں نے رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تبلیغ اسلام اور ان کی ہدایت کے سلسلے میں آپ کی زحمتوں اور مشقتوں کے لیے مال و دولت اور زر و جواہر وغیرہ کی شکل میں اجر اور صلہ کی پیش کش کی تو اللہ نے آپ سے فرمایا کہ (ترجمہ) اے رسول ان سے کہہ دو کہ میں اپنی رسالت کا کوئی اجر نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ تم میرے قرابت داروں (اہلبیتؑ) سے مودت اور محبت کرو۔ ؎ اور جب آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں نے آپ سے پوچھا یا رسولؐ اللہ آپ کے قرابت دار کون ہیں تو آپ نے فرمایا یہ علیؑ، فاطمہؑ حسنؑ اور حسینؑ ہیں اور پھر آنحضرت نے ان کی مودت و محبت کی اہمیت وعظمت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ آگاہ ہو جاؤ کہ جو آل محمدؐ کی محبت پر مرے وہ شہید مرتا ہے۔ سنو! جو آل محمدؐ کی محبت پر مر جائے وہ مغفرت کیا ہوا مرتا ہے۔ سنو جو آل محمدؐ کی محبت پر مرے وہ توبہ کیا ہوا مرتا ہے۔ سنو جو آل محمدؐ کی محبت پر مرے وہ ایمان کامل کے ساتھ مرتا ہے۔ سنو جو آل محمدؐ کی محبت پر مرے اس کو ملک الموت اور منکر نکیر جنت کی بشارت دیتے ہیں۔ سنو جو آل محمدؐ کی محبت پر مرے خدا اس کی قبر کو فرشتوں کی زیارت گاہ بنا دیتا ہے.... الخ

میر انیسؔ نے اسی مودت اہلبیتؑ کی اہمیت و برکت کے حوالے سے ان کی عظمت و فضیلت کو اپنے دو مرثیوں کے مندرجہ ذیل بندوں میں بیان کیا ہے۔

تم لوگوں میں احمد نے امانت ہمیں چھوڑا
سو تم نے سر رشتۂ الفت ہی کو توڑا
قرآں سے بھی تم پھر گئے منہ ہم سے بھی موڑا!
یہ بھی ہے بہت پانی اگر دو ہمیں تھوڑا
اولاد نبی قابل بیداد نہیں ہے
کیا آیۂ قُل لا اَسئلکُم یاد نہیں ہے ؎

....

طاعت سے جو افضل ہے اطاعت ہے وہ کس کی؟
پوچھے گا خدا جس کو محبت ہے وہ کس کی؟

پہنچادے جو کوثر پہ رفاقت ہے وہ کس کی ؟
جو اجر رسالت ہے مودّت ہے وہ کس کی ؟
انصاف کا اس وقت طلب گار ہوں تم سے
ہے کون مراد آیۂ لَا اَسْئَلُکُمْ سے

تسبیح فاطمہ زہرا (س)

سیرت حضرت فاطمہ زہرا دنیا کی تمام عورتوں کے لیے اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ تمام عالم نسواں کے لیے اپنی سیرت وکردار کی تشکل میں بہترین نمونۂ عمل پیش کرتے ہوئے گھر کے تمام کام کاج، بچوں کی پرورش و تربیت سے لیکر چکی پیسنے کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور جھاڑو برتن تک سب کچھ بڑی محنت اور لگن کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں اگرچہ اس کے لیے آپ کو سخت اذیت و تکلیف بھی اٹھانی پڑتی تھی ایسے ہی ایک مرتبہ چکی پیستے پیستے آپ کے ہاتھ زخمی ہو گئے اور ان سے خون بہنے لگا تو آپ نے حضرت علیؑ کے مشورے سے اپنے بابا رسولؐ خدا سے خدمت گار کی درخواست کی تو آنحضرت نے فرمایا کہ بیٹی میں تمہاری محنت و مشقت اور تکلیف واذیت سے بخوبی واقف ہوں مگر میں تمہاری تسلی کے لیے تمہیں ایک ایسی بابرکت اور گرانقدر چیز عطا کرتا ہوں جو تمہارے لیے دنیا و آخرت دونوں جگہ بہترین ہدیہ و تحفہ ثابت ہوگی اور وہ یہ ہے کہ تم رات میں سوتے وقت ہمیشہ ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ پڑھ لیا کرو تو تمہیں اس سے بہت اطمینان وسکون بھی حاصل ہوگا اور بڑا اجر وثواب بھی ملے گا۔ چنانچہ حضرت فاطمہؑ نے اسے اپنا مستقل وظیفہ بنا لیا جو آپ سے منسوب ہوکر تسبیح فاطمہ کے نام سے ماثور و مشہور ہے اور ہر نماز کے بعد تعقیبات نماز میں برابر پڑھی جاتی ہے۔

میر انیس نے اپنے دو بندوں میں درج ذیل تسبیح کا ذکر کیا ہے۔

بند ملاحظہ فرمائیں۔

یہ ذکر تھا کہ شاہ نے پھیرا ادھر سلام
وہ آخری نماز جماعت ہوئی تمام
تسبیح فاطمہ کو ابھی پڑھتے تھے امام
بڑھ بڑھ کے جو لگانے لگے تیر اہل شام
اٹھے نہ شہ پہ محو تھے یاد اللہ میں
یاں تک کہ آئے تیر کئی خیمہ گاہ میں ۳۱

کرتے تھے مناجات ادھر یاور و انصار
پڑھتے تھے نماز شب ادھر سید ابرار
تھی نیت تسبیح بتول جگر افگار
آواز بکا خیمے سے آنے لگی یکبار
اکبر سے اشارہ کیا مڑ کر کہ یہ کیا ہے
کی عرض پھوپھی جان کے رونے کی صدا ہے

معجزہ شق القمر

خالق کائنات نے دین اسلام کو اپنے پسندیدہ دین کے طور پر منتخب کرکے اس کی تبلیغ کے لیے اپنے حبیب خاص صاحب خلق عظیم آخری نبی کریم کو انسانی اخلاق وکردار اور بشری وقار و اقدار کی ارفع و اعلیٰ منزلوں پر فائز کرکے بھیجا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی بعثت سے قبل چالیس سال تک مسلسل صرف عملی طور پر اپنے اخلاق وکردار کے حق وحقانیت اور صدق وصداقت کی خاموش تبلیغ کرکے لوگوں سے پہلے اپنی صداقت و امانت کا کلمہ پڑھوایا صادق وامین کا لقب حاصل کیا اور قرآن حکیم کے حکم وارشاد کے مطابق کبھی حکمت وموعظے سے کام لیا تو کبھی وقت کے تقاضے اور سماج کے مطالبے پر کرامات ومعجزے کے بھی مظاہرے کیئے چنانچہ ایسے ہی ایک موقع پر لوگوں کے مطالبہ پر اپنی نبوت ورسالت کی صداقت کی دلیل وحجت کے طور پر اپنی ایک انگلی کے اشارہ سے چودھویں کے چاند کے دو ٹکڑے کرکے اپنی نبوت ورسالت کا اعجاز دکھایا۔

یہ واقعہ تاریخ اسلام میں معجزہ شق القمر کے نام سے مشہور ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ سنہ ۹ بعثت میں ایک بار حج کے موقع پر چودہویں رات کو ابوجہل کچھ یہودیوں کے ساتھ کوہ ابوقبیس پر رسول اللہ کے پاس آیا اور آپ سے یہ مطالبہ کیا کہ ہم اس شرط پر آپ کی نبوت و رسالت پر ایمان لائیں گے کہ آپ معجزہ دکھا کر اس چاند کے دو ٹکڑے کر دیں۔ آنحضرت نے خدا سے دعا کر کے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو چاند دو ٹکڑے ہو گیا اور دونوں ٹکڑوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہو گیا کہ دونوں کے بیچ میں کوہ حرا نظر آنے لگا اس معجزے کو وہاں موجود لوگوں نے تو دیکھا ہی تھا جو لوگ وہاں موجود نہیں تھے انھوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ قرآن مجید نے بھی سورۂ قمر میں اس معجزے کا ذکر کیا ہے۔

گواہیٔ درخت

اسی طرح کفار و مشرکین نے اس سلسلے میں اپنی ہٹ دھرمی کو برابر جاری رکھتے ہوئے ایک مرتبہ آپ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ اس درخت سے کہیئے کہ وہ آپ کے دعوائے نبوت و رسالت کی صداقت کی گواہی دیتے ہوئے آپ کے پاس آ جائے آپ نے اس کو حکم دیا تو وہ آپ کی صداقت کی گواہی دیتا ہوا آپ کے پاس آ گیا۔ پھر ان لوگوں نے کہا کہ اس سے کہیئے اپنی جگہ واپس چلا جائے چنانچہ آپ نے حکم دیا تو وہ واپس چلا گیا۔ پھر لوگوں نے کہا آپ اس سے کہیئے آدھا اپنی جگہ رکا رہے اور آدھا آپ کے پاس آ جائے اس وقت آپ نے ایسا ہی حکم دیا تو اس نے آپ کے اس حکم کی بھی تعمیل کی اور آدھا اپنی جگہ رکا رہا اور آدھا آپ کے پاس آ گیا۔ یہ دونوں واقعے اس بات کی دلیل ہیں کہ خدائے قادر و قدیر نے اپنے رسولؐ کو کائنات کا مالک و مختار بنا کر نظام کائنات پر مکمل حق تصرف عطا کر کے پوری کائنات کا مالک و مختار بنایا تھا۔

میر انیسؔ نے اپنے دو مرثیوں کے مندرجہ ذیل دو بندوں میں ان دونوں واقعوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

برپا عَلَمِ نظم و نسق کر دیا کس نے
عالم کو سوئے کعبۂ حق کر دیا کس نے
رنگِ رخِ کفار کو فق کر دیا کس نے
ہاں بدر کو انگشت سے شق کر دیا کس نے
لب ہل گئے جب نخلِ دعا میں ثمر آیا
انگشتِ شہادت کو اٹھا کر شجر آیا [۱۰]

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
آئے غضب خدا کا ادھر رخ جدھر کروں
بے جبرئیل کارِ قضا و قدر کروں
انگلی کے اشارے میں شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی [۱۱]

معراج رسولؐ مقبول

ربِ جلیل نے یوں تو اپنے تمام برگزیدہ بندوں خصوصاً انبیاء و مرسلین کو دوسرے عام انسانوں کے مقابلے میں بلند مقام عطا کیا ہے مگر تمام بندوں اور انبیا و مرسلین کے مقابلے میں اپنے حبیبِ خاص احمد مجتبیٰ حضرت محمد مصطفیٰ کو سب سے زیادہ قدر و منزلت اور عظمت و جلالت سے نواز کر خصوصی اعزاز و امتیاز سے سرفراز فرمایا چنانچہ آپ کی اس خصوصی جلالت قدر اور عظمت شان کا شاہد واقعہ معراج ہے جس کے مطابق خالق زمین و آسمان اور مالک کون و مکاں خدائے فرش و عرش نے ۲۷ رجب المرجب سنہ ۱۲ بعثت کو رات میں حضرت جبرئیل امین کو خصوصی دعوت کے ساتھ کے ساتھ بھیج کر ایک مخصوص برق رفتار سواری "براق" کے ذریعہ عرش معلّٰی کے انتہائی قریب مقام "قاب قوسین" کی بلند ترین منزل معراج پر اپنی عظیم نشانیاں دکھانے کے لیے بلایا۔ آپ ام ہانی کے گھر سے روانہ ہوئے اور مسجد حرام (خانہ کعبہ) اور مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) ہوتے ہوئے اور آسمانی منزلوں کو طے کرتے ہوئے بیت معمور اور سدرۃ المنتہیٰ اور دریائے نور کی حدوں سے گزر کر

تنہا آگے بڑھے اور عرش اعظم کے اس ارفع و اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے جہاں اس عبد خاص اور معبود حقیقی کی عظمت ذات و صفات اور کمال عزت و شان کے درمیان بس صرف دو کمان یا اس سے بھی کچھ کم فاصلہ باقی رہ گیا تھا۔ تاریخ اسلام کے اس عظیم الشان واقعہ کو خدا نے اپنی مقدس کتاب قرآن کریم کی دو سورتوں میں بہت وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کے شروع ہی میں ارشاد فرمایا ہے کہ (ترجمہ) پاک پاکیزہ ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے کو راتوں رات سیر کرائی مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس یا آسمانی مسجد بیت معمور) تک جس کے چاروں طرف ہم نے برکتیں مہیا کر رکھی ہیں تاکہ ہم اس کو اپنی قدرت کی نشانیاں دکھائیں"[18]

سورۂ والنجم کی ابتدائی آیتوں میں ارشاد فرمایا ہے کہ (ترجمہ)

۔۔ وہ آسمان کے اعلیٰ و ارفع کنارے پر تھا پھر وہ اور قریب ہوا پھر وہ اور قریب ہوا اور آگے بڑھا پھر دو کمان کا فاصلہ باقی رہ گیا بلکہ اس سے قریب تر تھا۔ پس خدا نے اپنے بندے کو جو وحی کرنی تھی کر دی۔۔ الخ۔۔۔[19]

معراج کے اس اہم واقعے جہاں خالق کائنات و مالک موجودات ایک طرف اپنے حبیب خاص سے اپنی انتہائی قربت و محبت کا اظہار فرما رہا ہے تو دوسری طرف سرور کائنات و فخر موجودات کے کائنات ارضی و سماوی پر اقتدار اعلیٰ کا بھی اعلان فرما رہا ہے کیونکہ سرکار دو عالم نے اس سفر معراج میں براق پر فرش سے عرش تک کے طویل ترین فاصلہ کو اس سرعت رفتار کے ساتھ طے کیا کہ وہاں سے واپس آئے تو زنجیر در ہل رہی تھی آب وضو بہہ رہا تھا اور بستر گرم تھا۔ میر انیس نے اپنے چار مرثیوں کے درج ذیل پانچ بندوں میں اس واقعہ معراج کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ۔

ابرو کو کماں کہتے ہیں اس فہم کے قرباں
ابرو بھی جگر گوشۂ احمد کے زہے شان
ممدوح کے رتبے کا بھی لازم ہے ذرا دھیان
یہ اس کے نواسے کے تن پاک کی ہیں جاں
جو شاہ ہے قوسین مکاں ارض و سما میں
فرق دو کماں جس کے رہا اور خدا میں[20]

بخشا کسے اللہ نے معراج کا پایا
سو مرتبے کو عیسیٰ کی طرح کس نے جلایا
پڑتا نہ تھا اس خاک پہ کس شخص کا سایا
حد کس کا ہے وہ سورۂ کوثر جسے آیا
کس رخ کو تجلّی صفت بدر عطا کی
دنیا میں کسے حق نے شب قدر عطا کی[21]

سب بولے کہ اس بات سے واقف ہے زمانہ
لاریب ہیں محبوب خدا آپ کے نانا
روشن ہے شب ماہ سے معراج کا جانا
کافر ہے وہ اس بات کو جس نے نہیں مانا
وہ قبلۂ دیں باعث ایجاد فلک ہے
آپ ان کے نواسے ہیں کچھ اس میں نہیں شک ہے

پھیرا جو فرس کو اسد اللہ کے پسر نے
مجرا کیا اقبال نے تسلیم ظفر نے
پہنچا دیا سر عرش پہ شمشیر دو سر نے
دکھلایا عروج معراج سپر نے
تھا ہوش نہ پریوں کو نہ انسان نہ جن کو
غل تھا کہ جہاں میں شب قدر آئی ہے دن کو[22]

ہاں بتا آیۂ تطہیر کسے آیا ہے
دست اپنا کسے اللہ نے فرمایا ہے
ہل آتیٰ کس کے لیے روح امیں لایا ہے؟
کس نے معراج کا دنیا میں شرف پایا ہے
قرب ایسا کسے اللہ کی درگاہ میں ہے
فرق قوسین بتا کس میں اور اللہ میں ہے[23]

چالیس سال تک مسلسل محمد عربیؐ کے ذاتی و صفاتی حسن اخلاق اور عظمت کردار کا اقرار و اعتراف کرتے ہوئے ان کی صداقت و امانت کا کلمہ پڑھنے والے کفار قریش اور مشرکین مکہ ان کی بعثت اور اعلان

رسالت کے بعد سخت عداوت و بغاوت اور شدید مخالفت کا اعلان کر کے آمادۂ عناد و فساد ہو کر جنگ اور جدال و قتال کے لیے تیار ہو گئے یہاں تک کہ آپ کو ترک وطن کر کے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ مگر مدینے میں بھی آپ کو چین سے نہیں رہنے دیا اور اسلام کی مقبولیت و موفقیت اور توسیع و ترقی کو دیکھ کر آپ پر تحمیلی جنگیں مسلّط کرنا شروع کر دیں۔ ان میں سے جنگ بدر، جنگ احد جنگ خندق، جنگ خیبر اور جنگ حنین عہد رسالت مآبؐ میں اور جنگ جمل و صفین اور جنگ نہروان محافظ اسلام حضرت علیؑ کے دور خلافت میں اپنی نوعیت و کیفیت اور بعض ممتاز خصوصیت کے اعتبار سے تاریخ اسلام میں بہت مشہور ہیں۔ میر انیسؔ نے اپنے مراثی میں معرکۂ کربلا کے غازیوں اور مجاہدوں کی رجز خوانی کی ترجمانی کرتے ہوئے ان کی زبانی اپنی اور اپنے بزرگوں اور پیشروؤں کی شجاعت و شہامت، عزم و استقلال و عزیمت و استقامت کے تعلق سے خصوصاً بنی ہاشم کے جوانمردوں اور جانبازوں کے عزم و ہمت اور جرأت و ہیبت کے سلسلے میں یاد دہانی کراتے ہوئے جگہ جگہ اور بار بار ان جنگوں کے حوالے دیے ہیں۔

جنگِ بدر

یہ تاریخ اسلام کی پہلی جنگ ہے جو مدینۂ منورہ سے تقریباً اسی میل کے فاصلہ پر بدر نامی ایک گاؤں کے پاس ۱۷ رمضان سنہ ۲ھ میں کفار قریش اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئی اور اسلامی جماعت باوجود اپنی قلت افراد و وسائل کے ظفریاب و فتح مند ہوئی۔ اس جنگ کا مختصر واقعہ یہ ہے کہ مدینہ میں مسلمانوں کو خبر ملی کہ کفار قریش ابو سفیان کے بہکاوے اور بھڑکاوے میں آ کر بڑی تیاری اور پوری آمادگی کے ساتھ مدینہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ کفار قریش کی فوج کشی کی اطلاع پا کر پیغمبر اسلام بھی کفار کی ایک ہزار فوج کے مقابلے کے لیے صرف تین سو تیرہ افراد پر مشتمل مختصر سی جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے۔ حضرت علی کی سرداری اور سپہ سالاری میں جنگ ہوئی اور خدا کی نصرت و مدد سے مسلمانوں کو فتح و ظفر حاصل ہوئی۔ اس جنگ میں ستّر کفار قتل ہوئے اور ستّر ہی قید کیے گئے اس جنگ کا ذکر خدا نے قرآن مجید کے سورۂ آل عمران اور سورۂ انفال وغیرہ میں کئی مقامات پر کیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے کہ (ترجمہ) "بیشک تمہارے لیے ان دو جماعتوں (رسول کی صداقت کی) بڑی واضح نشانی ہے جو بدر کی جنگ میں ایک دوسرے سے گتھ گئے تھے ان میں سے ایک جماعت اللہ کی راہ میں جہاد کر رہی تھی اور ایک کافروں کی جماعت تھی جس کو مسلمان اپنی آنکھوں سے اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے مگر خدا نے ان کی قلیل جماعت ہی کو فتح و ظفر عطا کی اللہ جس کی چاہتا ہے اپنی نصرت و مدد سے تائید کرتا ہے بیشک اس واقعہ میں آنکھ والوں بڑی عبرت و نصیحت ہے۔" [۲۵]

اسی سورہ میں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ (ترجمہ) "یقیناً جنگ بدر میں تمہاری نصرت و مدد کے باوجود اس کے کہ تم دشمن کے مقابلے میں بے وقعت تھے پھر بھی خدا نے تمہیں فتح و ظفر سے سرفراز فرمایا پس تم خدا سے ڈرتے رہو تا کہ اس کے شکر گذار رہو۔" [۲۶]

میر انیسؔ نے حضرت علیؑ کی شجاعت اور ان کی تلوار کی تعریف و توصیف کے سلسلے اپنے تین مرثیوں کے مندرجہ ذیل بندوں میں بڑے ولولہ انگیز اور پرجوش انداز میں جنگ خندق و خیبر و حنین کے ساتھ ہی جنگ بدر کا حوالہ اس طرح دیا ہے۔

فخر عرب و روم و عجم کی ہے یہ تلوار
کاٹے ہیں نشاں جس نے علم کی ہے یہ تلوار
کاٹ اس میں غضب کا ہے ستم کی ہے یہ تلوار
قتل مہ نو بدر میں چمکی ہے یہ تلوار

ہلتی تھی زمیں ہاتھ جو قبضہ پہ دھرا تھا
خندق کو اسی تیغ سے لاشوں سے بھرا تھا [۲۷]

- - - - - - -

سب کافروں کو بدر سے دم میں بدر کیا
پیش رسولؐ عمرو کو زیر و زبر کیا

جنگ حنین خیبر و خندق کو سر کیا
عنتر کو سر سے تا بہ قدم خوں میں تر کیا
مارا جو ایک ضرب میں مرحب کو جان سے
آئی تھی مرحبا کی صدا آسمان سے [۲۸]

کس حسن سے لب پہ ہے ستائش اب وجد کی
اعدا کو دکھاتے ہیں وغا بدر و احد کی
نعرہ ہے کہ حیدر نے رسولوں کی مدد کی
توڑا ہے در قلعہ شدت میں رمد کی
گردش کبھی دی اور کبھی اونچا کیا سر سے
ہلکا تھا وہ در دست مبارک میں سپر سے [۲۹]

جنگِ احد

جنگ احد تاریخ اسلام کی دوسری بڑی اور اپنے نشیب و فراز سے بھرے بعض تشویشناک و ہولناک حالات و واقعات اور کچھ دردناک والمناک حادثات وسانحات کی وجہ سے بہت مشہور جنگ ہے۔ اس جنگ کا واقعہ یہ ہے کہ جنگ بدر کی شکستِ فاش اور ذلت آمیز ہزیمت سے تلملا کر انتقامی جذبے کے زیر اثر بدلہ لینے کی غرض سے ابوسفیان نے پانچ ہزار کی مسلح فوج کے ساتھ مدینہ پر چڑھائی کردی جب رسول اللہؐ کو اس کی خبر ملی تو آپ بھی ایک ہزار سے کم افراد کی جماعت کے ساتھ دفاع کے لیے نکل پڑے اور مدینہ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر احد نامی پہاڑ کے دامن میں صف آرائی اور معرکہ آرائی ہوئی آنحضرت نے اس مورچہ میں جنگی حکمت عملی کے طور پر پشت پر تیراندازوں کا دستہ تعینات کردیا تھا اور سخت تاکید کردی تھی کہ جنگ میں فتحیابی کے بعد بھی کسی حالت میں یہ دستہ اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہٹے۔ جب جنگ ہوئی تو فوج مخالف کے پیر اکھڑ گئے اور فتح بالکل قریب تھی کہ دوسرے مسلمانوں کے ساتھ یہ دستہ بھی مال غنیمت پر ٹوٹ پڑا اور اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یہ جگہ خالی دیکھ کر موقع کو غنیمت جانتے ہوئے دشمن کی بھاگی ہوئی فوج نے پلٹ کر اسی طرف سے مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف مسلمانوں پر اچانک حملہ کردیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح و کامرانی شکست و نامرادی میں بدل گئی۔ سید الشہدا حضرت حمزہ شہید ہوگئے جس سے میدان میں افراتفری اور مسلمانوں کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی اسی دوران کسی نے سازش کے تحت یہ آواز بلند کردی کہ محمد قتل کردئے گئے جس سے مسلمانوں کے حوصلے اور بھی پست ہوگئے اور وہ میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ حالانکہ رسول اللہؐ آواز دیتے رہے کہ میں زندہ ہوں مگر کسی نے بھی آپ کی ذات اور بات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ ایک شخص نے حضور کو پتھر مارا جس سے آپ کے دو دانت شہید ہوگئے اور پیشانی مبارک بھی زخمی ہوگئی۔ آپ زخموں سے نڈھال ہوکر ایک گڑھے میں گر گئے حضرت علیؑ نے آپ کو سنبھالا اور کفار کو بھگا کر آپ کی حفاظت کی اور ایک پہاڑی پہ لے جاکر اپنی ڈھال میں پانی لاکر آپ کے زخموں کو دھو کر صاف کیا۔

یہ جنگ روز سہ شنبہ ۱۵ شوال سنہ ۳ھ کو ہوئی۔ اس جنگ کا ایک دردناک اور المناک پہلو ابوسفیان کی زوجہ ہندہ کا حضرت حمزہ کی لاش کے ساتھ درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا سینہ چاک کرکے ان کے کلیجہ کو نکال کر چبانا اور لاش کی بے حرمتی کرنا ہے اس جنگ کا منظر خدا نے اپنی مقدس کتاب قرآن مجید کے سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۴۴ سے ۱۶۰ تک بہت تفصیل کے ساتھ ہے ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے کہ (ترجمہ) اے مسلمانوں تم اس وقت کو یاد کرو جب تم میدان جنگ سے بدحواس ہوکر بھاگتے ہوئے پہاڑ پر چڑھے جارہے تھے اور باوجود اس کے کہ رسولؐ تمہارے پیچھے کھڑے ہوئے تم کو بلا رہے تھے مگر تم جان کے خوف سے مڑ کر دیکھتے بھی نہیں تھے پس چونکہ تم نے رسولؐ کو آزردہ و رنجیدہ کیا اس لیے خدا نے بھی تم کو اس کی سزا میں شکست کا رنج دیا... الخ...!![۳۰]

دوسری جگہ اس جنگ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ (ترجمہ) بے شک جس دن جنگ احد میں دو جماعتیں آپس میں گتھ گئی تھیں اس دن جو لوگ تم مسلمانوں میں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے بعض گناہوں (رسول کی نافرمانی)

کی وجہ سے شیطان نے انھیں بہکا کے ان کے پیر اکھاڑ دئے تھے۔[31]

میر انیس نے اپنے دو مرثیوں کے درج ذیل دو بندوں میں حضرت علیؑ شیر خدا کی مشہور زمانہ شجاعت اور مجاہدانہ کارناموں کا بیان کرتے ہوئے جنگ احد کا ذکر کیا ہے۔

کس حسن سے لب پہ ہے ستائش اب وجد کی
اعدا کو دکھاتے ہیں وغا بدر و احد کی
نعرہ ہے کہ حیدر نے رسولوں کی مدد کی
توڑا ہے در قلعہ کو شدت میں رمد کی
گردش کبھی دی اور کبھی اونچا کیا سر سے
ہلکا تھا وہ در دست مبارک میں سپر سے[32]

شیر اس کے ہو تم نبیرے ہو جو بیت اسد کا
سر جس نے کیا معرکہ صفین و احد کا
دنیا میں بڑا نام ہے تم دونوں کے جد کا
ماں صدقے گئی وقت ہے ناموں کی مدد کا
ایک ایک جری دشت ستم لاشوں سے بھر دے
اللہ تمہیں لشکر اعدا پہ ظفر دے[33]

نزول ذوالفقار

جنگ احد میں اسد اللہ صاحب ذوالفقار حضرت حیدرؑ کرار نے مافوق العادت بلکہ مافوق الفطرت دلیری و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمام لوگوں کے میدان جنگ چھوڑ دینے کے باوجود تنہا لشکر کفار کا مقابلہ کیا اور رسول اللہ کی حفاظت کی جنگ کے دوران آپ کی تلوار ٹوٹ گئی اور ایک ہاتھ بھی شکستہ ہو گیا تھا لیکن پھر بھی آپ زخموں کی تکلیف کی پروا نہ کرتے ہوئے زخمی بدن شکستہ ہاتھ اور ٹوٹی ہوئی تلوار کے ساتھ برابر مردانہ وار جنگ کرتے رہے اور حملے کر کے دشمنوں کی صفوں کو الٹتے رہے۔ حضرت علیؑ کی اس ہمت مردانہ کو دیکھ کر خدا نے آپ کے لیے ذوالفقار بھیجی اور لافتیٰ کا خطاب عطا کیا اور جبریل امین نے آپ کی شان میں لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار کا قصیدہ پڑھا۔

میر انیس نے اس واقعہ کو حضرت علیؑ کے مشہور القاب شیر خدا اور حیدرؑ کرار اور نزول ذوالفقار کے حوالے سے اپنے دو مرثیوں کے مندرجہ ذیل دو بندوں میں بیان کیا ہے۔

اس شیر کے فرزند ہیں یہ شیر
اللہ نے بھیجی ہے جسے عرش سے شمشیر
تلوار کھینچی ان کی تو لاشوں کے ہوئے ڈھیر
یہ سب سے زبردست ہیں اور ان سے ہیں سب زیر
ہم لوگوں کی ہے موت جو زندہ ہیں یہ غازی
گر تیغ نہ ہو شیر درندہ ہیں یہ غازی[33]

اس حجت باری نے یہ فرمایا پھر اک بار
من بعد نبی کون ہے کونین کا سردار
کس کا ہے لقب شیر خدا حیدر کرار
اللہ نے بھیجی ہے کسے عرش سے تلوار
ہر جنگ میں کفار پہ در کون رہا ہے
محبوب الٰہی کی سپر کون رہا ہے[34]

جنگ خندق

جنگ خندق جس کو جنگ احزاب بھی کہتے ہیں دین اسلام کی عزت و عظمت کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ مشہور جنگ ماہ ذیقعدہ ۵ھ میں مدینہ منورہ کے مضافات میں سات پہاڑیوں کے سلسلے پر مشتمل کوہ سلع کے دامن میں لڑی گئی۔ اس جنگ کو جنگ خندق اس لیے کہتے ہیں کہ آنحضرت نے جناب سلمان فارسی کے مشورے سے دشمنوں سے حفاظت کے لیے سامنے کی طرف خندق کھدوا دی تھی اور جنگ احزاب اس لیے کہتے ہیں کہ مدینہ میں رہنے والے بنی نضیر کے یہودی رسول اسلام کے قتل کی ناپاک و نامراد سازشوں کی پاداش میں جوار مدینہ سے نکالے جانے کے بعد خیبر میں جا کر مقیم ہو گئے تھے اور انتقام کی آگ میں دن رات ہر وقت جلتے رہتے تھے۔ انھوں نے اسی انتقامی جذبے کے زیر اثر یہودیوں کے دو قبیلوں کے

ساتھ مل کر کافروں اور مشرکوں کی تمام جماعتوں کو بھی مسلمانوں
کے خلاف بھڑکا کر اپنے ساتھ لیا اور ایک فیصلہ کن جنگ کے ارادہ
سے مدینہ پر دس ہزار کی فوج کے ساتھ چڑھائی کر دی چونکہ اس
جنگ میں تمام دشمن قبیلوں و جماعتوں نے ایک ساتھ مل کر مسلمانوں
کے خلاف لشکر کشی کی تھی اسی لیے اس جنگ کو جنگ احزاب بھی
کہتے ہیں۔

اس جنگ کے تنہا ہیرو اپنی ہمت مردانہ اور جرأت مجاہدانہ
کی وجہ سے صرف تنہا شیر خدا حضرت علی مرتضیٰ قرار پائے کیونکہ اس
جنگ میں بھی حضرت علیؑ اور عرب کے ایک ہزار جوانوں کے برابر طاقتور
مشہور پہلوان عمر بن عبدود کے درمیان براہ راست دو بدو مقابلہ
آرائی اور نبرد آزمائی ہوئی تھی اور حضرت علیؑ نے عمرو بن عبدود کو
قتل کر کے دین اسلام و رسول اسلام اور تمام اہل اسلام کی عزت و
آبرو اور جان و جہان کی حفاظت کی تھی کیونکہ رسول اللہ نے بھی مدینہ
پر فوج مخالف کی چڑھائی کی اطلاع پا کر مدینہ سے باہر نکل کر
مورچہ بندی کر لی۔ فوج مخالف نے خندق کے اس پار سے مسلمانوں
کا محاصرہ کر لیا یہ سلسلہ تقریباً ستائیس دن تک مسلسل جاری رہا
ایک دن عمر بن عبدود اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر خندق پھاند کر لشکر
اسلام تک پہنچ گیا اور مقابلہ آرائی کے لیے مبارز طلبی کرنے لگا اور
جب اس نے اسلام کی صداقت و حقانیت اور حقیقت جنت پر
طنز کیا تو پیغمبر اسلام نے ۔۔۔۔۔ مسلمانوں کی غیرت کو
للکارتے ہوئے تین بار انھیں مقابلہ کے لیے جوش دلایا مگر کوئی تیار
نہیں ہوا ہر بار صرف حضرت علیؑ آگے بڑھتے آخر کار جب کوئی
مقابلہ کے لیے نہیں کھڑا ہوا تو آنحضرت نے حضرت علی کو جنگ کی
اجازت دی اور آپ کو اپنی زرہ پہنائی۔ کمر میں اپنی تلوار حمائل کی۔ سر
پر اپنے ہاتھوں سے عمامہ رکھا اور خود اپنے ہاتھوں سے حضرت علیؑ
کو جنگ کے لیے تیار کر کے دعاؤں کے ساتھ میدان میں بھیجا
اور علیؑ کے ایمان کا قصیدہ پڑھتے ہوئے کہ ''آج کل ایمان کل کفر
کے مقابلہ کے لیے جا رہا ہے'' عمرو بن عبدود کے مقابلے کے لیے روانہ
کیا۔ حضرت علیؑ رسول اللہ سے رخصت ہو کر ان کی دعاؤں کے حرز و
حصار میں شان اسداللّٰہی کے ساتھ عمرو کے سامنے پہونچے اور
پہلے اس کو اسلام کی دعوت دی جسے اس نے قبول نہیں کیا پھر اس
کی جاں بخشی کرتے ہوئے میدان جنگ سے چلے جانے کی مہلت دے کر
واپس جانے کو کہا۔ اس نے اسے بھی منظور نہیں کیا اس کے بعد
جنگ کی دعوت دی اور جنگ شروع ہو گئی اور شہ واروں کا تبادلہ
ہوا آخر اس نے ایک ایسا وار کیا کہ اس کی تلوار حضرت علیؑ کے
خود کو کاٹتی ہوئی سر تک پہنچ گئی۔ اس کے اس وار سے سنبھل کر
حضرت علیؑ نے پلٹ کر جو ایک وار کیا تو ید اللّٰہی قوت سے اس کا
پاؤں کٹ گیا اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا حضرت علیؑ نے اس کا
سر کاٹ لیا اور نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اسے لے کر رسول اللہ کی
خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے فرط مسرت اور شدت
محبت سے آپ کی شجاعت اور ذوالفقار کی ضربت کا قصیدہ پڑھتے
ہوئے فرمایا کہ ''روز خندق کے دن علیؑ کی ایک ضربت ثقلین یعنی
دو جہان کی تمام خلقت کی عبادت سے بہتر ہے۔''

اس جنگ کے حوالے سے قرآن مجید کے اکیسویں پارہ میں سورۂ
احزاب کے نام ایک پورا سورہ ہے جس کی آیت نمبر ۹ سے ۲۷ تک
پوری تفصیل کے ساتھ جنگ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔
خصوصاً آیت نمبر ۱۰ اور ۱۳ میں بعض لوگوں کی دہشت و وحشت
اور خوف و بدحواسی کی کیفیت کی بہت عبرت ناک منظر کشی
کی گئی ہے''۔ [۳۵]

میر انیس نے یوں تو اپنے کئی مرثیوں میں جنگ خندق کی طرف
اشارہ کیا ہے مگر خاص طور سے اپنے دو مرثیوں کے درج ذیل تین بندوں
میں بہت موثر انداز میں اس جنگ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

خندق وغا عمرو سیہ کار کی وہ دھوم
تھراتا تھا تلوار سے جس کی عرب و روم
رو کے جو حربوں کو بڑھا خاصۂ قیوم
جھپٹا اسد آہو پہ یہ سب کو ہوا معلوم
اک ضرب میں نہ گرز تھا نہ مغفر تھا نہ سر تھا
خندق کے ادھر لاش سر نحس ادھر تھا [۳۶]

جس وقت ظفر یاب ہوئے حیدرِ کرار
اک ہاتھ میں سرِ عمرو کا اک ہاتھ میں تلوار
فرمایا نبی نے یہ بہ اعلان و بہ تکرار
افضل ہے دو عالم کی عبادت سے یہ اک وار

سرِ فتح کا تھا پاؤں پہ خالق کے ولی کے
جبریلِ امیں چومتے تھے پاؤں علیؑ کے [۳۷]

ہم سے ہیں سب جہاں کے زبردست زیردست
جو سر بلند تھے انھیں ہم نے کیا ہے پست
عمرو بن عبدود سے دلاور کو دی شکست
ہے دیکھنے کا یہ تن و توش اے شکم پرست

بالا کو پست، پست کو بالا نہ جانیو
تلواریں کھانا منہ کا نوالا نہ جانیو [۳۸]

جنگِ خیبر

خیبر مدینہ منورہ سے تقریباً پچاسی میل کے فاصلہ پر واقع یہودیوں کی ایک بستی تھی۔ یہاں کے باشندے اسلام کی روز افزوں توسیع و ترقی اور اس کے روز بروز بڑھتے ہوئے عروج و اقبال کو دیکھ کر پہلے ہی سے بغض و حسد کی آگ میں جل بھن رہے تھے کہ جوارِ مدینہ سے شہر بدر اور جلاوطن کیئے گئے یہودیوں نے ان کے ساتھ کینہ اور حسد اور اضافہ کر دیا چنانچہ انھوں نے قبیلۂ بنی اسد اور قبیلۂ بنی غطفان کی مدد کے یقین پر بھروسہ کر کے ان کے ساتھ مل کر مدینہ کو تباہ و برباد اور مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کا پورا منصوبہ بنا کر مکمل تیاریاں کر لیں۔ جب رسولؐ اللہ کو ان کے اس ناپاک منصوبہ کی خبر ملی تو آپ ۱۲ صفر ۷ھ کو چودہ سو پیدل اور دو سو سواروں کی جماعت کے ساتھ اس منصوبے کو ناکام کرنے اور اس فتنہ کو فرو کرنے کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے اور خیبر میں پہنچ کر مورچہ بندی کر لی اور یہودیوں کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ یہودیوں نے خود کو قلعہ قموص میں بند کر لیا۔ مسلمان برابر قلعہ پر حملہ کرتے رہے مگر قلعہ فتح نہیں ہوا۔ اس صورتحال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے آنحضرت نے یہ اعلان فرمایا کہ میں کل علم اس کو دوں گا جو جوانمرد بہادر ہوگا۔ بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والا ہوگا میدان جنگ سے بھاگنے والا نہ ہوگا۔ وہ خدا اور رسولؐ کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا اور رسولؐ اس کو دوست رکھتے ہوں گے اور خدا اس کے دونوں ہاتھوں پر قلعۂ خیبر کو فتح کرے گا چنانچہ دوسرے دن صبح ہوئی تو ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں خود کو حضور کے سامنے علم حاصل کرنے کے لیے پیش کیا مگر حضور نے آواز دی کہ علیؑ کہاں ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ وہ تو بیمار ہیں اور بخار و آشوبِ چشم میں مبتلا ہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ جا کر ان سے کہو کہ رسولؐ خدا بلاتے ہیں آنحضرت کا پیغام سن کر آپ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اصحاب کے کاندھوں کا سہارا لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ آنحضرت نے حضرت علیؑ کا سر اپنے زانوئے مبارک پر رکھا، چہرے پر دستِ مبارک پھیرا تو بخار اتر گیا اور آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا تو آشوبِ چشم جاتا رہا اور مکمل دائمی شفا مل گئی پھر علمِ اسلام حضرت علیؑ کو دے کر فرمایا کہ جاؤ اور قلعہ قموص کو فتح کرو۔ رسولؐ اللہ کا حکم پا کر حضرت علیؑ میدان جنگ میں پہنچے اور علم کو پتھر پر گاڑ کر قلعہ پر حملہ کر دیا۔ قلعہ کے اندر سے حارث، مرحب، عنتر اور ربیع و یاسر جیسے نامی گرامی جنگجو پہلوان مقابلہ کے لیے آتے رہے اور شیرِ خدا حضرت علیؑ کے حملے کا نشانہ اور ذوالفقار کا نوالہ بن کر موت کے گھاٹ اترتے رہے اس سے خیبر والوں میں افراتفری اور بھگدڑ مچ گئی۔ اس دوران بھاگتے ہوئے ایک شخص نے موقع پا کر آپ کے ہاتھ پر ایسا وار کیا کہ آپ کے ہاتھ سے سپر چھوٹ گئی اور ایک دوسرا یہودی اسے لے کر بھاگ گیا۔ اس پُر فریب حرکت پر حضرت علیؑ کو جلال آ گیا اور آپ نے غیظ میں آگے بڑھ کر قلعہ خیبر کے آہنی اور وزنی دروازے پر اپنا بایاں ہاتھ رکھ کر زور سے دبایا تو آپ کی انگلیاں اس میں اس طرح پیوست ہو گئیں جیسے موم میں لوہا در آتا ہے اور جو آپ نے ایک جھٹکا دیا تو وہ دروازہ جسے چالیس آدمی مل کر بند کرتے اور کھولتے تھے اکھڑ کر آپ کے ہاتھ میں آ گیا اور یداللہ نے قوتِ ربانی سے اس دروازے کو سپر بنا کر آگے کی جنگ کی۔ اور اسے اپنے ہاتھوں پر لے کر

خندق کے اوپر پل بنا کر لشکر اسلام کو خندق کے اس پار اتار کر قلعہ کے اندر داخل کرایا۔ اور اس وقت حضرت علیؑ کے پیر ہوا میں معلق رہے میر انیسؔ نے یوں تو اس جنگ کا حوالہ مختلف انداز میں اپنے کئی مرثیوں میں دیا ہے مگر ان چار مرثیوں کے پانچ بندوں حضرت علیؑ کی جوانمردی کا ذکر بطور خاص کیا ہے۔

نانا نے تمہارے در خیبر کو جو توڑا
مانند سپر ہاتھ سے اس در کو نہ چھوڑا
ہر وار میں بچتا تھا نہ اسوار نہ گھوڑا
خالی ہوا جب قلعہ تو منہ جنگ سے موڑا
تھراتے تھے کفار تزلزل میں زمیں تھی
تھا زور تو یہ اور غذا نان جویں تھی [40]

کاٹا کیا روم و عرب اس تیغ دو سر سے
گزری سر مرحب سے تو عنتر کی کمر سے
دیں داروں کو امن اس نے دیا فتنہ و شر سے
ضرب اس کی نہ روکی گئی جبریل کے پر سے
کیا کیا نہ بدل جائے گا کیا کیا نہ رکے گا
پر حشر تک اس ضرب کا سکہ نہ مٹے گا [41]

یاں نور چشم فاتح خیبر قریب ہے
لو وارث کشندۂ عنتر قریب ہے
لخت دل درندۂ اژدر قریب ہے
جو تیغ کا دھنی ہے وہ صفدر قریب ہے
جوہر کبھی چھپے نہیں تیغ اصیل کے
کاٹے انھیں کی تیغ نے پر جبرئیل کے [42]

بے جسر تھا خندق سے اترنے میں تامل
خندق کو اسی در کو بہادر نے کیا پل
جب تک نہ گئی فوج نبی قلعہ میں بالکل
تھامے رہے اک ہاتھ سے در صاحب دلدل
وہ پائے مبارک تھے ہوا پر نہ زمیں پر
مولا کے قدم تھے پر جبریل امیں پر [43]

پائی نہ اماں لشکر صفین و جمل نے
عنتر کو جلا ہے اسی تیغ اجل نے
نے لات نے مرحب کو بچایا نہ ہبل نے
کاٹا ہے شجر کفر اس تیغ کے پھل نے
گر پاس نہ ہوتا پر جبریل امیں کا
ملتا نہ پتا زیر زمیں گاو زمیں کا [44]

واقعہ رجعت شمس

واقعہ رجعت شمس تاریخ اسلام کا ایک نہایت اہم واقعہ ہے جو حضرت علیؑ کے معجزہ کی حیثیت سے مشہور ہے اور حضرت علیؑ کی عظمت شان اور جلالت ایمان کی روشن دلیل ہے یہ معجزہ سکہ ھ میں اس وقت رونما ہوا جب رسول اللہؐ جنگ خیبر سے لشکر اسلام کے ساتھ واپسی پر وادی القریٰ کی طرف جاتے ہوئے مقام صہبا پر پہونچے اور وہاں پر قیام فرمایا۔ ایک روز حضورؐ پرنور حضرت علیؑ کی آغوش مبارک میں سر رکھے ہوئے آرام فرما رہے تھے کہ وحی کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اتنا طویل ہو گیا کہ غروب آفتاب سے پہلے تمام نہیں ہوا۔ اس دوران نماز عصر کا وقت گزرنے لگا تو حضرت علیؑ نے اشاروں سے نماز عصر ادا کی تاکہ نزول وحی کے سلسلہ میں کوئی خلل نہ پڑے۔ جب نزول وحی کا سلسلہ تمام ہوا تو آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ اے علی کیا تم نے نماز عصر ادا کر لی؟ تو آپ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ چونکہ نزول وحی کا سلسلہ جاری تھا اور آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا اس لیے میں نے اشاروں ہی میں نماز پڑھ لی یہ سن کر رسول اللہ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ چونکہ علیؑ تیری اور تیرے رسولؐ کی اطاعت میں تھا اس لیے اس کے لیے سورج کو پلٹا دے تاکہ یہ پھر سے پورے ارکان کے ساتھ باقاعدہ طور پر نماز عصر ادا کرے اور علیؑ سے فرمایا کہ سورج کو حکم دو کہ وہ پلٹ آئے چنانچہ حضرت علیؑ نے سورج کو پلٹنے کا حکم دیا تو وہ پلٹ آیا اور حضرت علیؑ نے تمام ارکان کے ساتھ دوبارہ مکمل طور پر نماز عصر ادا کی۔

میر انیسؔ نے اس معجزہ کے حوالے سے حضرت علیؑ کی جلالتِ شان کو بیان کرتے ہوئے اپنے تین مرثیوں کے مندرجہ ذیل تین بندوں میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

وہ رعب کہ شیروں کو بھی عبرت ہوئی جس سے
وہ حلم کہ خورشید کو رجعت ہوئی جس سے
وہ زور کہ ایمان کو قوت ہوئی جس سے
وہ ضربِ بنا کفر کی غارت ہوئی جس سے
دیکھے اسے آگاہ جو حیدر سے نہیں ہے
بہتر کوئی شاہدِ درِ خیبر سے نہیں ہے[۴۵]

محبوبِ حق نے سائق الاحسان کسے کہا؟
فرمایا اپنا جسم کسے جاں کسے کہا؟
دانندۂ دقائق قرآں کسے کہا؟
نور دلیل و حجت و برہاں کسے کہا؟
کہتے ہیں سب ولی خدا کس جناب کو
رجعت ہوئی ہے کس کے لیے آفتاب کو[۴۶]

رجعت ہوئی خورشید فلک کو پئے حیدر
یعنی نہ قضا ہوئے نمازِ شہِ صفدر
روزہ جو رکھا میں نے تو لے خالق اکبر
دن تھا یہ ہوئی رات چھپا مہر منور
منظور تھی خود ہی میں بزرگی مرے سبطین کی
دن ہو گیا واں شب کا تو یاں شب ہوئی دن کی[۴۷]

فتح مکّہ و بُت شکنی

۶ ھ میں صلح حدیبیہ کی جنگ بندی کے شرائط کی رو سے دس سال تک باہمی جنگ و جدال ممنوع ہونے کے باوجود قریش کے حریف قبیلہ بنی بکر نے آنحضرت اور مسلمانوں کے حلیف قبیلہ بنی خزاعہ پر فوج کشی کر کے چڑھائی شروع کر دی اور قریش کی مدد سے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ آخر کار ان حالات سے مجبور ہو کر بنی خزاعہ نے حضورؐ سے مدد مانگی تو آپ نے دس ہزار پر مشتمل ایک بڑا لشکر تیار کر کے مکہ کا قصد کیا۔ ابوسفیان نے جب تیاری کی یہ حالت دیکھی تو گھبرا کر حدیبیہ کے صلح نامے کے معاہدہ کی تجدید کی درخواست پیش کرنے کے لیے مدینہ آیا اور پہلے اپنی بیٹی زوجۂ رسول مقبول ام حبیبہ کے پاس گیا تو آپ نے بہت سخت ردِّ عمل کا مظاہرہ کیا پھر وہ رسولؐ مقبول کے پاس گیا تو آپ نے سکوت اختیار کر لیا۔ وہاں سے ناکام و نامراد ہو کر حضرت علیؑ کے پاس گیا تو آپ نے بھی کوئی توجہ نہ دی اور وہاں سے بے نیلِ مرام حضرت فاطمہؑ کی خدمت میں پہنچا مگر آپ نے بھی کوئی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ آخر میں مسجد میں جا کر خود ہی یک طرفہ طور پر صلح کی تجدید کا اعلان کر کے واپس چلا گیا۔

رسولؐ اللہ نے توجہ اور مناسب حکمتِ عملی کے ساتھ جنگ کی مکمل تیاریاں خفیہ طور پر کر لیں مگر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ کس طرف جانے کا ارادہ ہے چنانچہ ۱۰ر رمضان المبارک ۸ ھ کو آپ غیر معروف راستوں سے ہوتے ہوئے اچانک مکہ جا پہنچے اور مکہ سے چار فرسخ کے فاصلہ پر ”مرالظہران“ نامی مقام پر خیمہ زن ہو کر پڑاؤ ڈالا جب اس لشکر کی کثرت کی شہرت ہوئی تو ابوسفیان گھبرا کر حضرت عباسؓ کے پاس آیا اور ان کے مشورہ سے جان بچانے کے لیے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا تو آنحضرت نے اس کی جان بخشی کر کے اس کو پناہ دے کر یہ رعایت دے دی کہ فتح مکہ کے موقع پر جو اس کے گھر میں پناہ لے گا اس کی جان بخش دی جائے گی۔ غرض کہ اس کے بعد جنگ شروع ہو گئی اور تھوڑی بہت مزاحمت کے بعد مکہ پر آسانی سے قبضہ ہو گیا اس جنگ میں بھی اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت علیؑ تھے حضرت رسول اللہ اپنے ناقہ قصویٰ پر سوار ہو کر فاتحانہ شان سے باوقار انداز میں مکہ کے اندر داخل ہوئے اور عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے سات مرتبہ خانۂ کعبہ کا طواف کر کے حرم کعبہ کے اندر داخل ہو گئے اور ان تمام بتوں کو خود توڑ ڈالا جو نیچے تھے اور اونچائی پر نصب بتوں کو توڑنے کے لیے حضرت علیؑ کو اپنے کاندھے پر چڑھایا اور آپ نے ان سب بتوں کو توڑ کر زمین پر پھینک دیا۔

فتح مکہ کا معرکہ اور اس موقع پر بت شکنی کا واقعہ تاریخ اسلام میں دین اسلام کی شوکت و سطوت کے لحاظ سے اور اس کے پیغام توحید پرستی اور عقیدہ وحدانیت پرستی کے اعتبار سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسلام کی بنیادی تعلیم اللہ کے بندوں کو بے شمار مخلوقات اور لاتعداد بتوں کی شکل میں خود اپنی ہی بنائی ہوئی مصنوعات کی پرستش کی ذلت ولعنت اور ضلالت سے نکال کر مختلف مصنوعی خداؤں کی بت پرستی کے انتشار سے بچا کر خدا پرستی کے ذریعہ کلمۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے ایک مرکز اتحاد پر سایۂ توحید میں جمع کر دینا تھا اس لیے بت شکنی کا یہ واقعہ اس سلسلہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس وقت خانۂ کعبہ کے اندر اور باہر الگ الگ قبیلوں کے تین سو ساٹھ بت نصب کئے ہوئے تھے جن میں سے چار بڑے بڑے بت بڑے قبیلوں سے مخصوص و متعلق تھے عزّیٰ بنی غطفان، کا بت تھا۔ منات قبیلہ اوس و خزرج کا بت تھا۔ لات قبیلہ بنی ثقیف کا بت تھا اور ہبل، سب سے بڑا سرخ پتھر کا بنا ہوا بت تھا جس کے سامنے تمام قبیلوں کے لوگ بلا تفریق و اختلاف سر جھکاتے تھے اور وہ خانۂ کعبہ کے اندر بہت بلندی پر نصب کیا گیا تھا۔ ان بتوں کا ذکر قرآن مجید کے سورۂ والنّجم میں بھی موجود ہے۔

میر انیس نے بھی فتح مکہ کے موقع پر ان بتوں کے حوالے سے حضرت علیؑ کی بت شکنی کے اس کارنامے کو اپنے مرثیوں میں بڑے فخریہ انداز میں بیان کیا ہے۔ بطور نمونہ تین بند درج ذیل ہیں۔

بازوئے نبیؐ دست خدا نفس پیمبر
طیب و زکی طاہر و پاکیزہ و اطہر
لشکر شکن و بت شکن فاتح خیبر
سرتاج عجم میر عرب حیدر و صفدر
اصنام سے کیا خانۂ حق پاک کیا ہے
گہوارہ میں اژدر کا دہن چاک کیا ہے [۳۹]

کس کے پدر کا نام جناب امیرؑ ہے
کس کا پدر رسولؐ خدا کا وزیر ہے
وہ کون ہے جو صاحب تاج و سریر ہے
کون و مکاں میں کون بشیر و نذیر ہے
بنیاد کفر کس نے جہاں سے مٹائی ہے
کس نے نبیؐ کے دوش پہ معراج پائی ہے [۴۰]

خالی کیا علیؑ نے بتوں سے خدا کا گھر
عزّیٰ کہاں ہے لات و ہبل آج ہیں کدھر
غل تھا علیؑ ہیں دوش محمدؐ پہ جلوہ گر
مصحف پہ مصحف آج ہے اور نور نور پر
سب سے علیؑ کا مرتبہ اعلیٰ ہے دیکھ لو
شیر خدا کی شان دو بالا ہے دیکھ لو [۴۱]

جنگ حنین

مقام حنین مکہ معظمہ سے تقریباً تین میل کے فاصلہ پر واقع طائف کی سمت میں ایک وادی کا نام ہے۔ فتح مکہ کی خبر سن کر بنی ہوازن، بنی ثقیف، بنی خشم اور بنی سعد نے آپس میں اجماع کر کے اجتماعی طور پر یہ طے کر لیا کہ ایک ساتھ مل کر مسلمانوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کریں چنانچہ پانچ ہزار افراد پر مشتمل ایک بڑے لشکر کے ساتھ حنین اور طائف کے درمیان مقام اوطاس پر جمع ہو گئے جب آنحضرتؐ کو اس کی خبر ملی تو آپ بھی مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو لے کر ۸ شوال ۸ھ کو مکہ سے نکل پڑے اور حضرت علیؑ کو سردار لشکر بنا کر میدان میں پہنچے فوج مخالف کے جو لوگ پہاڑوں میں چھپے ہوئے تھے وہ یکایک نکل آئے اور تیروں نیزوں پتھروں سے حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملے سے مسلمان گھبرا گئے اور بد حواس ہو کر جنگ احد کی طرح رسول اللہ کو دشمنوں میں چھوڑ کر میدان سے نکل گئے اور رسول اللہ انھیں پکارتے ہی رہ گئے مگر باقاعدہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی حضرت علیؑ حضرت عباسؓ ابن حارث اور ابن مسعود کے علاوہ سب لوگ وہاں سے چلے گئے حالات کی نزاکت کو دیکھ کر رسولؐ اللہ جنگ کرنے کے لیے آگے بڑھے

کیونکہ دشمنوں نے رسول اللہ کو تنہا دیکھ کر موقع پاکر آپ پر بھی حملہ کر دیا تھا مگر حضرت عباس نے آپ کو روک دیا اور چند جانثاروں نے دشمنوں کے حملے کو ناکام بنا کر آپ کو بچا لیا اور پھر مسلمانوں کی غیرت کو للکارتے ہوئے انھیں آواز دی تو سو مسلمان واپس پلٹ آئے اور پھر زبردست جنگ شروع ہو گئی۔ دشمنوں کی فوج کے علمبردار ابوجرول نے مقابلہ کے لیے پکارا تو لشکر اسلام کے علمبردار حضرت علی نے جواب دیا اور ایک ہی وار میں اس کا شکار کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ جنگ کر کے فتحیاب ہو گئے۔ اس کے بعد مقام اوطاس میں بھی جنگ ہوئی اور مسلمان وہاں بھی فتح مند ہوئے قرآن مجید نے بھی اس جنگ کے نشیب و فراز کو سورہ توبہ میں بہت واضح طور پر بیان کیا ہے۔ [52]

میر انیس نے اس جنگ میں حضرت علیؑ کی بے مثال شجاعت کے حوالے سے دوسری مشہور جنگوں کے ساتھ اپنے مرثیے میں جنگ حنین کا بھی ذکر اس طرح کیا ہے۔

سب کافروں کو بدر سے دم میں بدر کیا
پیش رسول عمرو کو زیر و زبر کیا
جنگ حنین و خیبر و خندق کو سر کیا
عنتر کو سر سے تا بہ قدم خوں میں تر کیا
مارا جو ایک ضرب میں مرحب کو جان سے
آئی تھی مرحبا کی صدا آسمان سے [53]

واقعہ غدیر خم

۸ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو غدیر خم کے میدان میں حضرت علیؑ کی ولایت و مولائیت کا اعلان تاریخ اسلام کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ جہاں خدا نے حضرت علیؑ کی ولایت و مولائیت اور اپنے پسندیدہ اور منتخب دین اسلام کی تکمیل اور نعمتوں کے تمام ہونے کا اعلان کیا۔ سنہ ۱۰ھ میں جب رسول اللہ اپنے آخری حج "حجۃ الوداع" سے فارغ ہو کر سوا لاکھ اصحاب کے ہمراہ واپس ہو رہے تھے تو غدیر خم کے مقام پر پہنچے کے بعد جبریل امین خدا کا یہ حکم لے کر نازل ہوئے کہ "اے ہمارے رسول آپ پر آپکے پروردگار کی طرف سے جو حکم نازل کیا جا چکا ہے اس کی تبلیغ کر کے لوگوں تک پہونچا دیجئے۔ اگر آپنے اس حکم کی تبلیغ نہ کی تو گویا آپ نے اس کی رسالت ہی کی تبلیغ نہیں کی۔۔ الخ۔۔۔" [54]

اس حکم کو پاتے ہی آنحضرت نے اصحاب کے مجمع کو روکا اور اونٹوں کے پالانوں کا منبر بنوا کر اس پر جلوہ افروز ہوئے اور ایک طویل خطبہ ارشاد فرمایا جس میں حمد و ثنا کے بعد اپنی خدمات کا اعتراف کرایا اور ولایت و مولائیت کا اقرار لیا اس کے بعد حضرت علی کو بھی منبر پر بلایا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو بلند کر کے ان کی ولایت و مولائیت کا بھی اعلان کیا اور ارشاد فرمایا کہ جس کا جس کا میں مولا ہوں اس کے اس کے یہ علی بھی مولا ہیں۔۔الخ۔

اس اعلان کے بعد خدا نے بھی تاریخ اسلام کا یہ اہم ترین اعلان کیا۔ کہ "آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمتوں کو تمام کر دیا اور تمہارے لیے دین اسلام سے راضی ہو گیا۔" [55]

میر انیس نے قرآن مجید میں بیان کی گئی حضرت علیؑ کی عظمت و فضیلت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے اپنے دو مرثیوں کے مندرجہ ذیل دو بندوں میں اس اہم اور مشہور واقعہ کی طرف قرآن مجید کی آیتوں کی روشنی میں بہت واضح اشارہ کیا ہے۔

آباد ہوئی کس کی رعایت سے رعایا
کس شاہ نے دیں داروں کی بستی کو دکھایا
کس کے لیے اَکمَلتُ لَکُم دِینَکُم آیا
اَتمَمتُ عَلَیکُم کا صلا ہے کسے پایا
یکتائے جہاں کون ہے جرأت میں سخا میں
دو حصّے ہے قرآن خدا کس کی ثنا میں

نورِ اللہ نے اپنا کسے امداد کیا
خانۂ کفر کو کس شیر نے برباد کیا

حق نے قرآن کے سورہ میں کسے یاد کیا
کس کو اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ارشاد کیا
کس سے ہر جنگ میں عاجز صف کفار آئی
بدر میں کس کے لیے عرش سے تلوار آئی [57]

واقعۂ مباہلہ

واقعہ مباہلہ بھی تاریخ اسلام کا ایک ایسا یادگار معرکہ ہے جو بغیر کسی جنگ و خون ریزی کے صرف اہلبیتؑ اطہار (پنجتن پاک) کے نورانی چہروں کے رعب و جلال کے ذریعے فتح ہوا! اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ یمن میں نجران نامی ایک مقام ہے جو کہ عیسائیوں کا مسکن و مرکز ہے وہاں پر ایک بڑا گرجا گھر تھا آنحضرت نے انھیں بھی اسلام کی دعوت بھیجی انھوں نے حالات معلوم کرنے کے لیے عبدالمسیح عاقب کے زیر قیادت ایک وفد رسولؐ اللہ کی خدمت میں مدینہ بھیجا۔ مسجد نبوی میں ان سے حضرت عیسیٰؑ کے خدا کا بیٹا ہونے کے سلسلے میں مباحثہ و مناظرہ ہوا۔ رسولؐ اللہ نے فرمایا۔ اگر تمہارے قول و عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ اس لیے خدا کے بیٹے ہیں کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو حضرت آدم ان سے بدرجۂ اولیٰ خدا کے بیٹے قرار پائیں گے کیونکہ وہ تو باپ اور ماں دونوں کے بغیر پیدا ہوئے تھے جب عیسائی نہیں مانے اور اپنی بات پر اڑے رہے تو خدا نے فرمایا کہ ”اے رسولؐ تمہارے علم کتاب آجانے کے بعد بھی جو تم سے حجت و تکرار اور کٹھ حجتی کرتے ہیں ان سے کہہ دو کہ ہم اپنے بیٹوں کو لائیں اور تم اپنے بیٹوں کو لاؤ ہم اپنی عورتوں کو لائیں اور تم اپنی عورتوں کو لاؤ اور ہم اپنی جانوں کو لائیں اور تم اپنی جانوں کو لاؤ پھر آپس میں مباہلہ کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔“ [58]

اللہ کے حکم اور آخری قول و قرار کے مطابق ۲۴ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ کو رسولؐ اللہ پنجتن پاک (علی و فاطمہ اور حسن و حسین) کے ساتھ مباہلہ (جھوٹوں پر لعنت) کرنے کے لیے مقررہ مقام اور معینہ وقت پر پہنچے۔ عیسائیوں کے سردار اور مذہبی رہنما نے جیسے ہی ان نورانی چہروں کو دیکھا رعب و جلال سے کانپنے لگا اور مباہلہ سے باز آیا اور جزیہ دے کر رعایا بننا قبول کر لیا۔

میر انیسؔ نے اپنے دو مرثیوں کے درج ذیل دو بندوں میں اس واقعہ کا ذکر قرآنی القاب کے ساتھ اس انداز میں کیا ہے۔

غیر از علی ملا شرف صادقین کسے
ہاتھ آیا زور دست جہاں آفریں کسے
یسین میں کہا ہے امام مبیں کسے
حق نے کیا ہے راز کا اپنے امیں کسے
کس کو کہا ہے منذر و ہادی جہان میں
نص مباہلہ ہے کہو کس کی شان میں [59]

وہ کون ہے اللہ و نبی کو ہے جو پیارا
جو عرش کی زینت ہے وہ ہے کون سا تارا
ہے اَنْفُسَنَا اَنْفُسَکُمْ کس سے اشارا
اللہ نے کس گھر میں ستارے کو اتارا
اعلیٰ کسے فرمایا علیؑ کس کو کہا ہے
اللہ نے قرآں میں ولی کس کو کہا ہے [60]

جنگ بیرُالاَلَم بیرُالعَلم

یہ تاریخ اسلام کی ایک ایسی ہولناک اور وحشت ناک جنگ ہے جو خوفناک جنوں کی جماعت کے ساتھ تنہا حضرت علیؑ نے لڑی اور شاندار فتح حاصل کی۔ جنگ سکارسک سے واپسی پر جب رسولؐ اللہ کا گزر ”وادی کثیف ازرق“ نامی ایک ویران و سنسان مقام سے ہوا تو اس کے بارے میں دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ اس جگہ ایک ایسا کنواں ہے جس میں وہ جن رہتے ہیں جن پر حضرت سلیمان پیغمبر کو بھی قابو حاصل نہیں ہو سکا تھا اور جب ادھر سے تبع یمانی کا گزر ہوا تھا تو اس کے دس ہزار سپاہیوں کو انھیں جنوں نے قتل کر دیا تھا یہ سن کر آنحضرت نے قافلہ کو وہیں قیام کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ دس آدمی جا کر جنوں کے اس کنویں سے پانی بھر لائیں جب وہ لوگ

کنوئیں کے پاس پہنچے تو ایک عفریت برآمد ہوا اور اس نے ایک ایسی غضبناک اور شعلہ بار آواز نکالی جس سے سارا جنگل آگ کا بن گیا اور پوری وادی کی زمین کانپنے لگی۔ یہ منظر دیکھ کر خوف و دہشت کی وجہ سے سب لوگ واپس آگئے مگر ایک صحابی ابو العاص ہمت کر کے آگے بڑھے تو جل کر راکھ ہو گئے۔ اس وقت آنحضرت نے حضرت علیؑ کو بھیجا جب آپ وہاں پہنچے تو اس عفریت نے رجز پڑھتے ہوئے آپ پر زبردست اور زوردار حملہ کر دیا۔ آپ نے اس کا وار خالی دے کر ذوالفقار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیے اس کے بعد کنویں سے آگ کے شعلے اور دھوئیں کے طوفان بلند ہونے لگے اور بہت دہشت ناک شور کے ساتھ بے شمار خوفناک شکلیں سامنے آگئیں۔ حضرت علیؑ نے قرآن کی چند آیتیں پڑھیں جس سے آگ بجھ گئی اور دھواں ہوا میں تحلیل ہو گیا پھر آپ نے کنویں کی جگت پر اس کے اندر ڈول ڈال دیا مگر ڈول کنویں سے باہر پھینک دیا گیا اور پھر ایک عفریت برآمد ہوا آپ نے اسے بھی قتل کر دیا اور دوبارہ کنویں میں ڈول ڈالا مگر وہ دوبارہ پھر باہر پھینک دیا گیا تو پھر آپ کمر میں رسّی باندھ کر کنویں میں اتر گئے اور جنوں کی جماعت کے ساتھ جنگ شروع کر دی۔ آپ کے اس شدید حملے سے ان میں چیخ و پکار مچ گئی اور الامان کا شور بلند ہونے لگا چنانچہ آپ نے کلمہ پڑھنے کی شرط پر سب کی جان بخش دی اور بیس ہزار جنوں کو قتل کر کے ان کے چوبیس ہزار قبیلوں کو مسلمان بنا کر کنویں سے باہر نکلے۔ میر انیسؔ نے اپنے چار مرثیوں کے مندرجہ ذیل چار بندوں میں اس جنگ کا حوالہ دیا ہے۔

تم یہ نہ سمجھنا کہ وہ ہیں جنگ سے عاری
باعث ہے فقط یہ کہ ہے امت انھیں پیاری
ہے غیظ ہمارا غضب ایزد باری
جبریل سے رکتی نہیں تلوار ہماری
جن روزوں میں دادا سے مرے جنگ ٹھنی تھی
دہشت سے پری جان کی جانوں پہ بنی تھی [۶۱]

ہر سن اس کا ہے زیادہ مرے سن سے
پانی بھی لبوں تک نہیں پہنچا کئی دن سے
بیزاری ہے جن و ملک انس کو ان سے
ہم وہ ہیں کہ جانبر نہ ہوئے دیو بھی جن سے
اس چاہ کے اندر بھی چرائے ہیں دم اب تک
مشہور ہے افسانۂ بیر الالم اب تک [۶۲]

مشہور ہے جہاں میں بیر الالم کا حال
آتش میں جا کے کود پڑے شیر ذوالجلال
ڈر سے جنوں کا جان بچانا ہوا محال
سائے کی طرح ہو گئی سب فوج پائمال
نے دیو ان کے سامنے ٹھہرے نہ جن لڑے
شیر خدا زمیں کے تلے تین دن لڑے [۶۳]

جس وقت سر چاہ علی کے قدم آئے
جنات ہزاروں تہ تیغ دو دم آئے
فریاد کناں ساکن بیر الالم آئے
یا شیر خدا دین محمد میں ہم آئے
دیجے گا سزا پھر اگر اس راہ سے نکلیں
یوسف کی قسم لو جو کبھی چاہ سے نکلیں [۶۴]

علیؑ مولودِ کعبہ

دین اسلام کی تبلیغ و توسیع کے سلسلے میں اسلام اور رسولؐ اسلام کی نصرت و حفاظت اور امداد و اعانت کے لیے حضرت علیؑ کی ذات والا صفات کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور آپ کا شعار و کردار سب سے زیادہ نمایاں رہا ہے اس لیے اللہ نے آپ کو اپنے گھر خانہ کعبہ میں خاص اہتمام سے اور خصوصی انتظام کر کے پیدا فرمایا اور اس طرح اپنے رسولؐ کو اپنے گھر سے ناصر و مددگار عطا فرمایا۔ چنانچہ یہ بھی تاریخ اسلام کا ایک بہت ہی خاص اور منفرد و ممتاز واقعہ ہے کہ جب آپ کی ولادت کا وقت قریب آیا تو آپ کی والدہ گرامی حضرت فاطمہ بنت اسد خانۂ کعبہ کے قریب

آئیں اور آپ نے خانۂ کعبہ کا طواف کر کے دعا کی کہ اے میرے پروردگار میری مشکل کو میرے لیے آسان کر دے اسی وقت خانۂ کعبہ کی دیوار شق ہوئی اور آپ کے لیے ایک نیا در بنا اسی سے آپ خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہوئیں اور وہیں پر ۱۳ رجب المرجب ۳۰ عام الفیل مطابق ۶۰۰ء کو بروز جمعہ مبارک آپ کی ولادت باسعادت ہوئی تین دن وہاں قیام رہا مگر حضرت علیؑ نے نہ آنکھیں کھولیں نہ دودھ پیا چوتھے دن جب رسولؐ اللہ اپنے ناصر و مددگار کے استقبال کے لیے تشریف لائے تو آپکی والدہ معظمہ آپ کو لے کر خانہ کعبہ سے باہر نکلیں اور آپ کو رسولؐ اللہ کی آغوش میں دے دیا۔ آپ نے جیسے ہی رسالت کی خوشبو سونگھی فوراً ہی آنکھیں کھول دیں اور جمال رسالت کی زیارت کی اور حضور پر نور نے اپنی زبان مبارک آپکے دہن اقدس میں دے دی اور آپ نے ان کے لعاب دہن سے اپنی غذا حاصل کی۔

میر انیسؔ نے اپنے ایک مرثیے کے ایک بند میں خانۂ کعبہ میں حضرت علیؑ کی ولادت کے اس واقعہ کو بھی اس طرح بیان کیا ہے کہ۔

پیدا ہوا جو کعبے کے اندر وہ کون ہے
چیرا ہے جس نے مہد میں اژدر وہ کون ہے
اتری جسے پر تیغ دو پیکر وہ کون ہے
توڑا ہے جس میں قلعہ خیبر وہ کون ہے
سب کافروں کو کس نے مطیع خدا کیا
باطل کو کس کی تیغ نے حق سے جدا کیا [۹۵]

علیؑ قاتل اژدر

حضرت علیؑ کے بچپن کا بہت مشہور واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ کے جوار و اطراف ایک عظیم الجثہ دیو ہیکل اژدہا تھا جس کا قد چار سو گز لمبا تھا۔ سر پر دو بڑے بڑے سینگ تھے دو انگاروں جیسی شعلہ بار سرخ آنکھیں تھیں پہاڑ جیسا بھاری بھرکم سرخ اور غار جیسا چوڑا اور گہرا منہ تھا جس کی چوڑائی بیس گز تھی اور اس میں چار چار بالشت لمبے دانت تھے لوگ اس سے بہت تنگ تھے۔ اس کے جسم پر کوئی بھی اسلحہ کام نہیں کرتا تھا اس لیے اس نے بہت تباہی مچا رکھی تھی

ایک دن وہ مکہ شہر میں گھس آیا تو اس کے خوف سے دہشت کے مارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اتفاق سے وہ اژدہا محسن اسلام و محافظ رسولؐ حضرت ابو طالب کے گھر میں داخل ہو گیا اس وقت حضرت علیؑ کی عمر صرف چار ماہ کی تھی اور آپ گہوارے میں تھے اژدہا گہوارے کی طرف بڑھا اور جیسے ہی قریب پہنچا فوراً ہی شیر خدا نے گہوارے سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کو سر سے دم تک چیر کر دو ٹکڑے کر کے زمین پر ڈال دیا۔ یہ حیرت انگیز ماجرا جب لوگوں نے دیکھا تو سب کے سب حضرت علیؑ کی جرأت و شجاعت کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔

میر انیسؔ نے حضرت کی شجاعت و بہادری کے اس معجزہ کو مذکورہ بالا کعبے میں ولادت علیؑ کے سلسلے میں مذکور بند کے علاوہ اور دوسرے دو مرثیوں کے درج ذیل دو بندوں میں بھی حضرت علیؑ کی عظمت و جلالت اور طہارت و شجاعت کے ضمن میں نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بڑی عقیدت سے اس طرح بیان کیا ہے۔

بازوئے نبیؐ دست خدا نفس پیمبر
طیب و زکی طاہر و پاکیزہ و اطہر
لشکر شکن و بت شکن و فاتح خیبر
سرتاج عجم میر عرب حیدر صفدر
اصنام سے کیا خانۂ حق پاک کیا ہے
گہوارے میں اژدر کا دہن چاک کیا ہے [۹۶]

. . . .

گو طفل ہیں پر تیغ زنی ارث ہے ان کا
یہ بطن سے مادر کے جری ہوتے ہیں پیدا
جانباز ہیں ایسے کہ نہیں جان کی پروا
بڑھ بڑھ کے ہزاروں سے وغا کرتے ہیں تنہا
طفلی میں جوانوں کے کئے کام علی نے
گہوارے میں اژدر کو بھی چیرا ہے کسی نے [۹۷]

سورج سے حضرت علیؑ کی گفتگو

روایت میں منقول ہے کہ مولائے کائنات ابوتراب حضرت علیؑ کی کائناتِ عالم پر حکومت و حکمرانی تھی۔ آپ کا اقتدار و اختیار ثابت کرنے کے لیے سورج نے آپ سے سات بار گفتگو کی۔

پہلی بار کہا کہ یا امیرالمومنین آپ خدا سے میری شفاعت فرمائیں کہ وہ کبھی مجھ پر عذاب و عتاب نہ کرے۔

دوسری بار کہا مجھے حکم فرمائیں تاکہ آپ کے دشمنوں کو جلاکر راکھ کردوں۔

تیسری بار اس وقت جب آپ نے شہر بابل میں ڈوبتے ہوئے فرمایا کہ پلٹ آ تو وہ لبیک کہتا ہوا فوراً پلٹ آیا۔

چوتھی بار جس وقت آپ نے سورج سے پوچھا کہ کیا تم میری کوئی خطا بتا سکتے ہو۔ تو اس نے جواب دیا میرے پروردگار کی عزت و جلال کی قسم اگر خدا لوگوں کو آپ کی طرح بے خطا پیدا کرتا تو پھر جہنم کو پیدا ہی نہ کرتا۔

پانچویں بار اس وقت جب حضرت ابوبکر کے زمانے میں لوگوں نے نماز کے بارے میں اختلاف کیا اور حضرت علیؑ کی مخالفت کی تو سورج نے آپ کے حق میں گواہی دیتے ہوئے جواب دیا کہ حق علیؑ کی طرف آپ کے ہاتھ میں اور آپ کے ساتھ ہے۔ سورج کی یہ گفتگو تمام حاضرین نے اور قریش نے بھی سنی۔

چھٹی بار جب سورج حضرت کے واسطے وضو کرنے کے لیے پانی کی بالٹی لایا اور حضرت علیؑ نے وضو کرنے کے بعد اس سے سوال کیا کہ تم کون ہو تو اس نے جواب دیا کہ اے امیرالمومنینؑ میں خورشید تاباں اور آفتاب درخشاں ہوں۔

ساتویں بار جب آپ کا وقت شہادت قریب آیا تو سورج نے آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر سلام کیا اور آپ سے عہد و سفارش کی۔

سورج کی حضرت علیؑ سے اس گفتگو اور ہم کلامی کو میر انیس نے ایک مرثیہ کے مندرجہ بند میں یوں بیان کیا ہے۔

خورشید سات بار ہوا کس سے ہم کلام
کس سے زمین کہتی تھی شب کو خبر تمام
ناطق ہے کس کی شان میں اللہ کا کلام
انجیل اور زبور میں لکھا ہے کس کا نام
حامی ہے سب کا کون حیات و ممات میں
کس کی ثنا ہے سورۂ والعٰدیات میں

حضرت علیؑ کا سائل کو حالت رکوع میں انگوٹھی دینا

دین اسلام میں مسئلہ ولایت اہم ترین مسائل میں سے ہے۔ قرآن مجید کے سورۂ مائدہ میں خدا و رسول خدا اور حضرت علی مرتضیٰ کی ولایت و مولائیت کا اعلان کرتے ہوئے اس طرح ارشاد ہوا ہے کہ تمہارا ولی و مولا اللہ ہے اور اس کا رسولؐ ہے اور وہ جو ایمان لائے ہیں اور جو نماز کو قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔" ۵۹؎

اس آیت کریمہ کو آیۂ ولایت کا نام دے کر اسے حضرت علیؑ کی ولایت و مولائیت کی دلیل قرار دیتے ہوئے اس کے شان نزول میں حالت نماز میں حضرت علیؑ کی اس منفرد سخاوت کا وہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ مسجد نبوی میں حضور پُرنور نماز پڑھ رہے تھے کہ مسجد کے دروازے پر ایک سائل نے آواز دی اور سوال کیا۔ چونکہ لوگ نماز جماعت میں مصروف تھے اس لیے کسی نے جواب نہیں دیا۔ سائل نے محروم و مایوس ہوکر خدا کی بارگاہ میں عرض کیا کہ اے پروردگار۔ گواہ رہنا کہ میں تیرے گھر اور تیرے در پہ سوال کیا مگر محروم رہا اور مایوس ہوا۔ سائل کی یہ آواز سن کر حضرت علیؑ نے حالت رکوع ہی میں وہ انگلی بڑھا دی جس میں انگوٹھی تھی۔ سائل نے آپ کا اشارہ سمجھ کر انگلی سے انگوٹھی نکال لی۔ اسی وقت حضرت علیؑ کی اس منفرد سخاوت کی تعریف میں آپ کی ولایت کی دلیل کے طور پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میرانیسؔ نے حضرت علیؑ کی شجاعت و سخاوت اپنے ایک مرثیہ کے درج ذیل بند میں یوں بیان کیا ہے کہ۔

زورِ آورانِ خلق کو کس نے کیا ہے زیر
دونوں جہاں میں کون علی سا ہوا دلیر
کہتی ہے کس کو خلق دو عالم خدا کا شیر
بھوکے کو کس ولی نے کیا تین روز سیر
کس کی سخا کا غل ہے عراق و حجاز میں
سائل کو کس نے دی ہے انگوٹھی نماز میں[۳]

حضرت علیؑ کی بے مثال سخاوت

حضرت علیؑ کی بے مثال سخاوت کا یہ واقعہ تاریخ اسلام کا مشہور و معروف واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی جنگ سے واپس آرہے تھے اور مال غنیمت میں سے آپ کو حصے میں بہت کثیر مقدار میں مال و دولت اور ساز و سامان ملا تھا جو کئی اونٹوں پر لدا ہوا تھا۔ راستے میں ایک سائل نے آپ سے ایک روٹی کا سوال کیا آپ نے اپنے عزیز وفادار غلام حضرت قنبر سے فرمایا کہ سائل کو روٹی دے دو۔ جناب قنبر نے کہا کہ مولا روٹی تو تھیلے میں ہے آپ نے فرمایا تھیلا سمیت دے دو قنبر نے کہا کہ تھیلا اونٹ کے ہودج میں ہے تو فرمایا ہودج سمیت دے دو قنبر نے کہا کہ ہودج تو اونٹ کی پشت پر ہے تو فرمایا کہ اونٹ سمیت دیدو۔ قنبر نے کہا کہ اونٹ قطار میں ہے تو فرمایا کہ قطار سمیت دیدو یہ سن کر قنبر نے فوراً ہاتھ سے اونٹوں کی مہار چھوڑ دی اور دور ہٹ کر الگ کھڑے ہو گئے۔ حضرت علیؑ نے مسکرا کر پوچھا کہ قنبر تم مہار چھوڑ کر دور کیوں ہٹ گئے تو قنبر نے جواب دیا کہ اے مولا۔ میں نے دیکھا اس وقت آپ کا دریائے سخاوت جوش پر ہے اس لیے مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اونٹوں کے ساتھ مجھے بھی سائل کے حوالے کر دیں کیونکہ آپ جیسے شفیق، مہربان آقا کو میں ہرگز چھوڑ نہیں سکتا۔

میرانیسؔ نے حضرت علی کی بے مثال سخاوت کے اس واقعہ کا ذکر اپنے ایک مرثیہ کے مندرجہ ذیل بند میں حضرت علی کے روضہ کے ایک زائر سے زیارت کو جاتے ہوئے کربلا میں حضرت امام حسینؑ کی ملاقات کے موقع پر اس کو مال و اسباب اور ساز و سامان کی پیش کش کرتے ہوئے اور مہمانی کی دعوت دیتے ہوئے امام عالی مقام کی زبانی اس طرح کیا ہے

درکار جو تجھے ہو وہ لے بہر کردگار
پیدل اگر ہے تو یہ حاضر ہے راہوار
ناقہ بھی لے ترا تو ہے آقا و نامدار
سائل کو جس نے روٹی کے اونٹوں کی دی قطار
حاضر ہے جان و مال کہ ہے میہمان تو
بھائی ہمارے گھر کو بھی گھر اپنا جان تو[۴]

میرانیسؔ نے حضرت علیؑ کے حوالے سے تاریخ اسلام سے متعلق کئی اہم واقعات خصوصاً جنگ جمل و جنگ صفین اور جنگ نہروان جیسے مشہور اور خون ریز معرکوں کا بھی ذکر ہے جن میں حضرت علیؑ اور ان کی مخالف دوسری مسلمان جماعتوں کے درمیان مقابلہ آرائی اور زبردآزمائی ہوئی اور حضرت علیؑ کو حق و صداقت کی سربلندی کے لیے ان سے جنگ کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

حسنینؑ کے لیے جنت سے لباس آنا

حضرت رسولؐ خدا اور علیؑ مرتضیٰ کی سعیٔ مشکور اور کوشش محمود و مبرور کے ذریعہ دین اسلام کی تبلیغ و تکمیل کے بعد چونکہ آئندہ اس کی حفاظت و پاسداری کی ذمہ داری حضرت امام حسنؑ و امام حسینؑ کے سپرد ہونے والی تھی اس لیے ان دونوں امام زادوں کی تربیت و پرورش بڑے ناز و نعم اور اہتمام و احترام سے ہوئی خاص طور سے رسولؐ اللہ نے بڑی ناز برداری سے نہایت شفقت و محبت کے ساتھ ان کی ہر خواہش پوری کی چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ ایک مرتبہ عید کے موقع پر حضرات حسنین کریمین نے رسولؐ اللہ کی خدمت میں ملول ہو کر عرض کیا

کہ نانا جان! مدینے کے ہمارے ہم عمر بچوں کے پاس تو عید کے نئے نئے کپڑے ہیں مگر ہمارے پاس تو نئے کپڑے نہیں ہیں۔ ہم نماز عید کے لیے کیسے چلیں گے؟ تو آنحضرت نے دعا فرمائی اور جناب جبریل امین جنت سے لباس لے کر آ گئے۔ اسی طرح ایک بار دونوں شہزادوں نے مادر گرامی جناب فاطمہ زہرا سے عید کے لیے لباس کا تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا تمہارے کپڑے درزی کے پاس ہیں چنانچہ رضوان جنت درزی بن کر ان کے لیے جنت کے حلے لیکر آ گیا۔

حسینؑ کے لیے رسولؐ مقبول کا ناقہ بننا

دین اسلام کی حفاظت و پاسداری کے لیے رسول اللہؐ نے ان دونوں شہزادوں کی ذہن سازی اور حوصلہ افزائی کتنی ناز برداری کے ساتھ کی تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ایک بار عید کے دن جب مدینے کے بچے عید کی نماز کے لیے اپنے اپنے اونٹوں پر جا رہے تھے تو انھیں سواروں پر بیٹھے دیکھ کر حسنین کریمین بھی مچل گئے کہ نانا جان ہمارے ہم عمر بچوں کی طرح ہمارے لیے بھی سواری ہونی چاہئے یہ سن کر رسول اللہؐ نے انھیں پیار کر کے اپنے کاندھوں پر بیٹھا لیا اور خوش ہو کر فرمایا کہ لو تمہاری سواری میں بن گیا اور پھر جب انھوں نے کہا کہ نانا جان سب بچوں کے ہاتھوں میں تو ان کی سواریوں کی مہاریں ہیں ہمارے ناقے کی مہار کہاں ہے تو آپ نے اپنی دونوں زلفیں ان کے ہاتھوں میں تھما کر فرمایا کہ لو یہ تمہارے پیارے ناقے کی مہاریں ہیں۔ پھر شہزادوں نے کہا کہ نانا جان سب کے اونٹ تو بولتے ہوئے چل رہے ہیں مگر آپ تو بالکل خاموش چپ چاپ چل رہے ہیں۔ تو آنحضرت نے بھی ان کی دلداری اور دلنوازی کے لیے اپنے منہ سے عفو عفو کی آوازیں اونٹ جیسی نکالنے لگے۔ یہ منظر دیکھ کر جب کسی نے کہا کہ کتنی اچھی سواری ہے تو آپ نے فرمایا کہ یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ کتنے اچھے سوار ہیں۔

میر انیس نے اپنے کئی مرثیوں کے درج ذیل چار بندوں میں ان دونوں واقعوں کا ذکر نہایت پاکیزہ و شائستہ اور موثر الفاظ و انداز میں کیا ہے۔

حلّے بہشت کے جسے بھیجے خدائے پاک\
ہو بعد مرگ اس کا کفن کربلا کی خاک\
ہیکل کے خط سے فاطمہ کا دل ہو دردناک\
تیغوں سے اہل ظلم کریں اس کے تن کو چاک\
دوش رسولؐ پاک پہ جو سیمبر چڑھے\
خنجر سے کٹ کے نیزے پہ اس شہ کا سر چڑھے [۱]

تھا عید کو عریاں کہ عنایت ہوئی پوشاک\
عمامہ و پیراہن و پاجامہ و ردو پاک\
مرکب جو نہ تھا اونٹ بنے سید لولاک\
بالا رہا سب سے مرا رتبہ تہہ افلاک\
یہ تخت سلیماں کو نہ یہ تاج ملا ہے\
بچپن میں مجھے رتبۂ معراج ملا ہے [۳]

اللہ رے اوج واہ ری حشمت نبی وقار\
اک آن بے حسینؑ نبیؐ کو نہ تھا قرار\
اکثر بنے تھے عید کو محبوب کردگار\
مثل نگیں یہ مہر نبوت پہ تھے سوار\
مرکب حسینؑ کے شہ گردوں مقام تھے\
جیبیں جو تھیں رکاب تو گیسو لگام تھے [۴]

. . . .

آپ ان کے ناز اٹھاتے تھے بادشاہ بحر و بر\
پھر کس سے روٹھیں آپ سے روٹھیں نہ یہ اگر\
اکثر انھیں چڑھایا ہے حضرت نے دوش پر\
گیسو دئے ہیں ننھے سے ہاتھوں میں بیشتر\
روٹھے تھے یہ سو قدموں پہ سر دھر کے آئے ہیں\
منہ کے نہ چومنے کا گلا کرنے آئے ہیں [۵]

حضرت رسولؐ مقبول سجدہ میں اور حسینؑ پشتِ رسولؐ پر

حضرت امام حسینؑ نے میدانِ کربلا میں دین کی عزت، اسلام کی عظمت، قرآن کی صداقت، نماز کی حفاظت اور سجدے کی آبرو کے لیے سجدے میں سر کٹا کر اور نیزے پر قرآن کی تلاوت کر کے جو اپنی عظیم الشان قربانی پیش کی ہے اس کے پس منظر میں تاریخ اسلام کا یہ واقعہ بھی بہت خاص اہمیت کا حامل ہے کہ جب لوگوں نے مسجد نبوی میں یہ پُر نور منظر دیکھا کہ رسولؐ اللہ نماز میں مصروف ہیں اور سجدے کی حالت میں کھیلتے ہوئے آکر حسینؑ پشت مبارک پہ آکر بیٹھ گئے۔ رسولؐ مقبول نے جیسے ہی سجدہ سے سر اٹھانا چاہا کہ اللہ نے حسینؑ کی دلجوئی و عزت افزائی کے لیے فوراً ہی جبریل امین کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ ہمارے حبیب سے جا کر کہہ دو کہ جب تک حسینؑ خود ہی آپ کی پشت سے نہ اتر جائیں آپ سجدے سے سر نہ اٹھائیں چنانچہ آپ نے ستر بار سبحان ربی الاعلیٰ و بحمدہ کہا اور جب حسینؑ خود ہی آپ کی پشت مبارک سے اتر گئے تب آپ نے سجدہ سے سر اٹھایا۔ لوگ سمجھے کہ وحی نازل ہو رہی ہے۔

میر انیسؔ نے اس واقعہ کو بھی اپنے ایک مرثیہ کے ایک بند میں یوں بیان کیا ہے کہ:

لکھا ہے یہ کہ سجدے میں تھے ایک دن رسولؐ
پشت نبی پہ آکے چڑھا دلبرِ بتولؐ
خیر الوریٰ نے سجدۂ حق کو دیا یہ طول
سمجھا ہر اک کہ وحی خدا کا ہوا نزول
سر پیٹنے کی جا ہے یہ جس کا وقار ہو
سینے پہ اس حسینؑ کے قاتل سوار ہو
۲۶ء

حوالے

۱۔ قرآن مجید سورۂ شعراء آیت ۲۱۴ پارہ ۱۹
۲۔ 〃 سورۂ رعد آیت ۴۳ پارہ ۱۳
۲۔ قرآن مجید سورۂ دہر آیت ۸ پارہ ۲۹
۴۔ انیس کے مرثیے جلد اول، صالحہ عابد حسین مرثیہ ۲ بند ۱۹ جس دن یزید شام میں مسند نشیں ہوا۔ ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی
۵۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۹ بند ۵۳ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۶۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۹ بند ۲۰ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔
۷۔ قرآن مجید سورہ احزاب آیت ۳۳۔ پارہ ۲۲
۸۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۵ بند ۶۴ اے شمع قلم روشنی طور عطا کر ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۹۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۲۱ بند ۲۸ آمد آمد حرم شاہ کی دربار میں ہے ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۱۰۔ قرآن مجید سورہ شوریٰ آیت ۲۳ پارہ ۲۵
۱۱۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۶ بند ۱۵ جب رن میں حسین اصغر بے شیر کو لائے ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۱۲۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۵ بند ۵۹ اے شمع قلم روشنی طور عطا کر ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۱۳۔ انیس کے مرثیے جلد اول صالحہ عابد حسین مرثیہ ۷ بند ۲۲ طے کر چکا جو منزل شب کاروان صبح ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۱۴۔ انیس کے مرثیے جلد اول صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۰ بند ۲۲ جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۱۵۔ قرآن مجید سورۂ قمر آیت ۱ پارہ ۲۷
۱۶۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۵ بند ۶۱ اے شمع قلم روشنی طور عطا کر ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۱۷۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۲ بند ۶۲ نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۱۸۔ قرآن مجید سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱ پارہ ۱۵
۱۹۔ 〃 〃 والنجم آیت ۷ تا ۱۸ پارہ ۲۷

۲۰۔ انیس کے مرثیے جلد اول صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۵ بند ۶۳ جب آب رواں بند ہوا فوج خدا پر ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۲۱۔ 〃 〃 جلد دوم 〃 〃 〃 ۱۵ 〃 ۶۲ اے شمع قلم روشنی طور عطا کر ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۲۲۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۶۳ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃
۲۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۸ 〃 ۷۷ جب دولت سرور پہ زوال آگیا رن میں 〃 〃
۲۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۱ 〃 ۲۸ آمد آمد حرم شاہ کی دربار میں ہے 〃 〃 〃
۲۵۔ قرآن مجید سورۂ آل عمران آیت ۱۳ پارہ ۳
۲۶۔ 〃 〃 〃 آیت ۱۲۳ تا ۱۲۷ 〃 ۴
۲۷۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۳ بند ۳۶ جب تیغ ید اللہ کھنچی دشت وغا میں ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۲۸۔ 〃 〃 جلد اول 〃 〃 ۹ 〃 ۵۸ شمشاد بوستان رسالت حسینؑ ہے 〃 〃 〃
۲۹۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۷ 〃 ۷۴ دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر 〃 〃 〃
۳۰۔ قرآن مجید سورۂ آل عمران آیت ۱۵۲ پارہ ۴
۳۱۔ 〃 〃 〃 〃 ۱۵۵ پارہ ۴
۳۲۔ انیس کے مرثیے جلد اول صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۷ بند ۷۴ دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۳۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۷۳ جب حر کو ملا خلعت پر خون شہادت 〃 〃 〃
۳۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۱ 〃 ۹۱ جب حضرت زینبؑ کے پسر مر گئے دونوں 〃 〃 〃
۳۵۔ 〃 〃 〃 دوم 〃 〃 〃 ۵ 〃 ۶۶ اے شمع قلم روشنی طور عطا کر 〃 〃 〃
۳۶۔ قرآن مجید سورۂ احزاب آیت ۱۰ و ۱۳ پارہ ۲۱
۳۷۔ انیس کے مرثیے جلد اول صالحہ عابد حسین مرثیہ ۹ بند ۵۷ جب حر کو ملا خلعت پر خون شہادت ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۳۸۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۵۸ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃
۳۹۔ 〃 〃 جلد دوم 〃 〃 〃 ۴ 〃 ۷۸ حضرت سے جب برادر خوشخو جدا ہوا 〃 〃 〃
۴۰۔ 〃 〃 جلد اول 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۵۵ جب حر کو ملا خلعت پر خون شہادت 〃 〃 〃
۴۱۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۰۰ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃
۴۲۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۳ 〃 ۴ آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی 〃 〃 〃
۴۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۷ 〃 ۷۵ دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر 〃 〃 〃
۴۴۔ 〃 〃 جلد دوم 〃 〃 〃 ۱۳ 〃 ۲۷ جب تیغ ید اللہ کھنچی دشت وغا میں 〃 〃 〃
۴۵۔ 〃 〃 جلد اول 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۹۹ جب حر کو ملا خلعت پر خون شہادت 〃 〃 〃
۴۶۔ 〃 〃 جلد دوم 〃 〃 〃 〃 〃 ۵۵ شمشاد بوستان رسالت حسینؑ ہے 〃 〃 〃
۴۷۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۵ 〃 ۴۲ اے شمع قلم روشنی طور دکھا دے 〃 〃 〃
۴۸۔ قرآن مجید سورۂ والنجم آیت ۱۹ و ۲۰ پارہ ۲۷

۴۹۔ میر انیس کے مرثیے جلد اول صالحہ عابد حسین مرثیہ ۹ بند ۹۸ جب حر کو ملا خلعت پرخون شہادت ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۵۰۔ 〃 〃 〃 دوم 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۵۰ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے 〃 〃 〃
۵۱۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۰ 〃 ۷۶ جب نوجوان پسر شہ دیں سے جدا ہوا 〃 〃 〃
۵۲۔ قرآن مجید سورہ توبہ آیت ۲۵ تا ۲۷ پارہ ۱۰
۵۳۔ انیس کے مرثیے جلد اول صالحہ عابد حسین مرثیہ ۹ 〃 ۵۸ جب حر کو ملا خلعت پرخون شہادت 〃 〃 〃
۵۴۔ قرآن مجید سورہ مائدہ آیت ۶۷ پارہ ۶
۵۵۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۳ 〃 〃
۵۶۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۱۵ بند ۶۷ اے شمع قلم روشنی طور دکھا دے ترقی اردو بیورو نئی دہلی
۵۷۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۲۱ 〃 ۲۹ آمد آمد حرم شاہ کی دربار میں 〃 〃 〃
۵۸۔ قرآن مجید سورہ آل عمران آیت ۶۱ پارہ ۳
۵۹۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۹ بند ۵۴ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے 〃 〃 〃
۶۰۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۵ 〃 ۶۸ اے شمع قلم روشنی طور عطا کر 〃 〃 〃
۶۱۔ 〃 〃 〃 اول 〃 〃 〃 ۱۵ 〃 ۶۶ جب حضرت زینب کے پسر مر گئے دونوں 〃 〃 〃
۶۲۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۷ 〃 ۱۳۵ دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر 〃 〃 〃
۶۳۔ 〃 〃 〃 دوم 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۵۷ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے 〃 〃 〃
۶۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۳ 〃 ۳۸ جب تیغ یداللہ کھنچی دشت وغا میں 〃 〃 〃
۶۵۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۵۱ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے 〃 〃 〃
۶۶۔ 〃 〃 〃 اول 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۹۸ جب حر کو ملا خلعت پرخون شہادت 〃 〃 〃
۶۷۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۱ 〃 ۹۴ جب حضرت زینب کے پسر مر گئے دونوں 〃 〃 〃
۶۸۔ 〃 〃 〃 دوم 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۹۳ شمشاد بوستاں رسالت حسین ہے 〃 〃 〃
۶۹۔ قرآن مجید سورہ مائدہ آیت ۵۵ پارہ ۶
۷۰۔ انیس کے مرثیے جلد دوم صالحہ عابد حسین مرثیہ ۹ بند ۵۲ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے 〃 〃 〃
۷۱۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۰ 〃 ۵۴ جب نوجوان پسر شہ دیں سے جدا ہوا 〃 〃 〃
۷۲۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۲۵ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے 〃 〃 〃
۷۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱۵ 〃 ۴۱ اے شمع قلم روشنی طور عطا کر 〃 〃 〃
۷۴۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۲۲ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے 〃 〃 〃
۷۵۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۱ 〃 ۴۴ دشت وغا میں نور خدا کا ظہور ہے 〃 〃 〃
۷۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ۹ 〃 ۲۳ شمشاد بوستان رسالت حسین ہے 〃 〃 〃

حسن عباس فطرت

میفیر II این، آئی، بی، این روڈ پونہ ۴۸

9890393149

فردوسی وانیس ایک جائزہ

آئیے آج آپ کی ضیافت طبع ایک ممتاز عالم و دانشور و ادیب ڈاکٹر صفدر آہ سیتاپوری کی یاد سے کروں وہ بہت سی زبانوں کے ماہر تھے۔ انھوں نے تلسی داس کی رامائن (رام چرتر مانس) کا بہترین و سلیس اردو ترجمہ کیا تھا جو بہت مقبول و معروف ہوا تھا وہ قدیم علمی و قلمی اہل قلم تھے میر و میریات میں انھوں نے کئی نئے نکتے اٹھائے تھے میر کی خود لکھی کتاب میں بعض غلط فہمیوں کی تردید بھی کی تھی وہ عموماً خاموش طبع تھے P.W.A کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اگرچہ وہ ممبئی سے ساٹھ ستر کلو میٹر دور اپنے دو چار قدر دانوں کے پڑوس میں رہتے تھے غذا سادی پہنا وا معمولی مگر سبھی ان کا احترام و عزت کرتے تھے خواہ وہ مجروح ہوں کہ خواجہ احمد عباس یا سردار جعفری۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایک بار ہم اور غلام حسین گردش ان کے تکیہ تک جا پہنچے اور ان کے قیمتی وقت کو بانٹ کھایا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں آپ نے دعوت دی مطالعہ فردوسی وانیس کی اور ڈاکٹر صفدر آہ کی رام کہانی سنانے لگے مگر میں نے ان کی کچھ باتیں تو بتائی نہیں خصوصاً اختلاف رائے کی صورت میں ان کا طیش و غصہ اور پھر جلدی مسکرا دینا۔ ہاں تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے بات اس لیے شروع کی تھی کہ ان کی تصنیفات میں ایک 'فردوسی ہند' بھی تھی۔ وہ کون سے بزرگ تھے فارغ سیتاپوری جن کا نام و نشان مجھے معلوم نہ تھا نہ جاننے کی کوشش کی۔ کتاب کہاں رکھی وہ گئی کہاں۔ کسی ترغیب کے بغیر اسے پڑھنا آسان بھی تو نہ تھا اور مجھ میں تو یہ ہمت و جسارت نہیں نہ قابلیت و تجربہ کہ میں کسی کو فردوسی ہند کہہ سکوں فردوسی تو پھر فردوسی ہے اور پھر شاہنامہ والا فردوسی۔

میرے مقالہ کا عنوان صرف مطالعہ فردوسی وانیس ایک سرسری مطالعہ ہی ہو سکتا ہے وہ بھی کسی حد تک بمصداق "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

زبان فارسی کی وسطانی نے تعلیم کے دوران یہ قطعہ پڑھا تھا جو از بر ہے۔

درشعر سہ پیمبران آنند۔ شعر کے تین پیغمبر ہیں۔
ہر چند کہ لا نبی بعدی۔ ہر چند کہ حضور نے کہا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔

ابیات قصیدہ و غزل را۔ فردوسی و انوری و سعدی
ابیات (اشعار) قصیدہ و غزل کے پیغمبر فردوسی و انوری و سعدی ہیں۔ بعد میں انوری کا شعر ملا

آفریں بر روان فردوسی — آں ہمایوں نژاد و فرخندہ
او استاد بود و ما شاگرد — او خداوند بود و ما بندہ

پھر سعدی نے کیا کہا وہ بھی سنئے۔

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد
کہ رحمت بر آں پاک زاد

نظامی کا شمار فارسی کے عظیم شعراء میں ہے وہ بھی کہتا ہے ؎

سخن گوئی پیشۂ دانائے طوس
کہ آراست زلف سخن چوں عروس

ان تمام اشعار کا خلاصہ یہ ہے کہ فردوسی بحیثیت شاعر سب پر فائق ہے علامہ اثر مشہور عربی مورخ خاتمۃ السائر میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ زبان عرب کثرت لغت و معنی وسیع رکھتی ہے مگر شاہنامے کا جواب نہیں ہے وہ کہتے رہے ہیں کہ درحقیقت اس صورت میں لوگ شاہنامہ کو فارسی کا قرآن کہہ چکے ہیں ویسے تو مثنوی مولانا روم کے بارے میں جامی کا یہ مصرعہ مشہور ہے۔

ہست قرآں در زبان پہلوی

یہ تو رہی اپنوں کی بات۔ یورپ کے علماء و مستشرقین بھی فردوسی کے کمال شاعری کے معترف ہیں۔ سرگور اوسلی نے تذکرہ شعرا میں فردوسی کو ہومر کا مشابہ کہا ہو اگرچہ ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فردوسی ہم پایہ ہومر نہیں پھر بھی اگر ایشیا میں کوئی ہومر کا ہم رتبہ ہے تو وہی ہے۔

اب آگے پروفیسر براؤن کو سنئے جن کی تاریخ ادبیات ایران کا شہرہ ہے ان کا خیال بہت پر لطف ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ شعراء جو فردوسی کے بعد آئے مثلاً منوچہری اسدی طوسی، نظامی گنجوی، قاآنی۔ انھوں نے شاعرانہ خیالات و شوکت الفاظ میں فردوسی سے بلند درجہ پایا ہے شاہنامہ کو ہم (شعبۂ معلقہ) اور جاہلیت کا عمدہ کام کا درجہ نہیں دے سکتے مگر یہ ان فضلا کا اپنا خیال ہے محققین اس کے حق میں نہیں ہیں اس کے بعد لطف در لطف کی بات یہ ہے کہ براؤن صاحب حیران ہیں کہ کس وجہ سے "شاہنامہ" اتنی زیادہ شہرت پا گیا پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ چونکہ شاہنامہ درحقیقت مسلمانوں کے اسلاف کا افتخار نامہ تھا۔ اس لیے بلحاظ محبت ملی و مذہبی سب پر فائق ہو گیا علامہ شبلی نے شعر العجم (حصہ اول) صفحہ ۱۳۳ پر اسے نقل کرتے ہوئے جواباً ایک پر معنی شعر فارسی لکھ کر بات ختم کر دی ہے

حریف کاوش مژگاں خونریزش نہ اے زاہد
بدست آور رگ جانی و نشتر را تماشا کن

ان صاحب سے آگے قدم سر جان میلکم نے بڑھایا ہے ان کی تاریخ ہم نے پڑھی تھی جس میں کئی صفحات میں ایک حرف بھی صحیح نہیں بلکہ بڑے ادب و احترام سے کہا جائے تو یہ کہ موصوف نے آزاد خیالی سے اول قول بکا ہے مثلاً یہ کہ مسلمانوں نے ایران کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہاں کے قدیم و عظیم کتب خانوں کو جلا دیا اور فردوسی نے اس لٹے پھنکے کتاب خانوں سے شاہنامہ کا مواد حاصل کیا۔ یہ جھوٹ ہے کیونکہ ایران پر مسلمان لشکر جب سعد ابن وقاص کی قیادت میں ایران پہنچا تو حضرت عمر کی خلافت کا زمانہ تھا۔ فردوسی اس وقت تک شاہنامہ تقریباً مکمل کر چکا تھا اور اسلام سے مشرف بھی ہو چکا تھا۔

تعجب یہ ہے کہ اہل قلم و مورخین کا ایک گروہ مدتوں تک شاہنامہ کو افسانہ در افسانہ اور داستان در داستان کے طور پر دیکھتا رہا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کا ماخذ قدیم پہلوی معتبر اور ضخیم کتابیں ہیں۔ اطراف و اکناف میں کچھ اور موثق معتبر سفرناموں اور سرگذشت حیات سے بھی مواد جمع کیا ہے اور یہ مسلم ہو چکا ہے کہ اس سے بہتر فارسی (پہلوی) زبان میں اتنی معتبر و ملی تاریخ کوئی نہیں ہے جس میں تاریخ کے جزئیات ہی نہیں بلکہ وہ ڈھائی ہزار سال قبل کا سماجی، اجتماعی، تہذیبی آئینہ ہے جیسے رسم شادی عزا اور رثا، خطوط و نامہ نویسی کے آداب و سلیقے، دربار سرکار سرداروں کے جنگ میں انتخاب و شرائط، ان کی تقرری و معزولی وغیرہ سب اس میں ہے۔ البتہ شاہنامہ میں کچھ مطالب، موضوع و مضامین ایسے بھی آ گئے ہیں جو افسانوی حدود و عقل سلیم کے بعید نظر آتے ہیں مگر آخر میں یاد فردوسی کہ وہ ان مشکلات کو حل کرتے ہوئے خود کہتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

تو ایں را دروغ و فسانہ نداں
بیکساں روشن درزمانہ بداں
تم اسے جھوٹ و افسانہ نہ سمجھو اسے زمانے کے تغیر و روش
جان لو۔

ہر آں چیز اندر خورد با خرد
دگر برہ رہ نز فسر و معنی برد
جو چیز عقل میں کھلباتی ہے اسے رمز و معنی میں
شمار کرو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک جگہ بہت عمدہ بات لکھی ہے کہ بڑی شخصیتوں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ ان کی شخصیت افسانہ بن جائے۔ اس لحاظ سے بھی فردوسی عظیم ہے کہ چھٹی صدی (بعد اسلام) کے بعد سے اب تک یعنی جب سے فردوسی کے حالات کا لکھنا شروع ہوا سب میں اختلافات واشتباہات کی بھرمار ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے چہار مقالہ میں اس کے بعد محمد عوفی نے لباب الالباب میں پھر تیمور لنگ کے پوتے بای سنغر نے جو فردوسی کے زمانے سے قریب تھے وہ بھی اس الزام سے بری نہیں ہیں اور بے اعتبار ہیں۔ دولت شاہ سمرقندی کے بیانات جو ذرا تفصیل سے لکھے گئے ہیں وہ اور عربی مصنفین میں قزوینی نے "آثار البلاد" میں جو درج کیا ہے اس کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ مشہور ہے کہ اس نے محمود غزنوی کے شکایت نامہ میں بھی لکھا تھا۔

ستم کردہ ام رستم پہلواں
وگرنہ یلے بود در سیستاں
میں تھا جس نے رستم کو رستم بنایا ورنہ وہ سیستان (صوبہ) کا ایک جوانمرد ہی تھا۔

اردو میں بھی شاہنامہ ہی رہا شعرا نے اس سے بہت کچھ سیکھا اور لیا جس سے میرانیس کو بھی خارج نہیں کیا جاسکتا (مثالیں بعد میں آئیں گی) بعض نے صرف ٹائٹل ہی کو لیا اور خامہ فرسا ہوگئے چنانچہ ایک مشہور و خوش گو شاعر نے ہمت کرکے وہ شاہنامہ اسلام لکھ ڈالا جس کی وقتی طور پر ملک میں واہ واہی ہوئی۔ اس خاکسار کو کہیں کہیں سے اس کے مطالعہ کی توفیق بھی ہوئی مگر جوش کے اس شعر نے ٹھنڈا کردیا۔ جوش نے کہا۔

اسلام کا شاہنامہ لکھنے والے
اسلام کو شاہی سے تعلق کیا ہے

شاہنامہ فردوسی ایک لازوال عظیم صحیفہ ہے یہ روایت ہی ہے کہ فردوسی نے اسے بیسوں کی لالچ میں محمود غزنوی کی فرمائش پر تیار کیا تھا۔ ہاں اس کی ہجائی تو اس نے محمود کی ہجو کرکے ضرور ثابت کردی ہے جس کا ایک ہی شعر لکھوں گا۔

پرستار زادہ نیاید بکار
دگر چند دارد پدر شہریار
غلام زادہ بالک کسی کے کام کا نہیں ہوتا اگر اس شہریار کے دو چار باپ کیوں نہ ہوں۔

اس ہجو نامہ نے بھی شاہنامہ جیسی شہرت حاصل کی اگرچہ محمود غزنوی کے خوف سے ایک مدت تک لوگ اسے پڑھتے و سنتے نہ تھے۔ ہاں اس ہجو نامہ کے ابتدائی دو اشعار بھی ملاحظہ کریجئے فردوسی کہتا ہے۔

اگر شاہ را شاہ بودے پدر
پسر بر نہادے سر تاج مہر
اگر شاہ کا باپ شاہ ہوتا تو میرے سر پر (اس کے انعام میں) تاج زریں رکھ دیتا۔

اگر مادر شاہ بانو بدے
مرا سیم و زر زیر زانو بدے
اگر شاہ کی ماں ملکہ ہوتی تو میرے زانوؤں تلے سونا چاندی بکھر دیتی۔

محمود غزنوی ایک تو شہنشاہ نہیں تھا اس کے ہم عصروں میں دور و قریب کئی بادشاہ تھے سبکتگین نے اسکی

بہادری و ذہانت دیکھ کر اپنے ساتھ رکھ لیا تھا بعد میں اس کی
موت کے بعد اسے غزنی کی راج گدی مل گئی تھی جو ایک چھوٹا سا
ملک تھا۔ محمود غزنوی نے یہاں وہاں حتیٰ کہ دور دور
ملکوں پر حملہ کرکے اپنا دبدبہ و ملک و مال بڑھا لیا تھا۔ ایاز نامی
اپنے غلام کے عشق میں بدنام بھی ہوا تھا۔ بہت جلد حکومت
اور اس کا نام جھام چلا گیا۔ فردوسی کا کلام شہروں شہروں
پھیلتا گیا اور دیہاتوں و قریوں میں اس کے نام کا ڈنکا
بجنے لگا۔ تہران کے سب سے بڑے محلہ میدان طوسی میں اس
کا صدہا برس کا مجسمہ جھجھا رہا ہے ایسا کہ اس کی داڑھی کے
بال بھی گنے جا سکتے ہیں۔

شادی و دیگر رسوم دنیا میں شاہنامہ ہی پڑھا جاتا ہے۔
ہماری نوجوانی میں شاہنامہ کی خصوصیت کا یہ عالم تھا
کہ کالج میں داستان عجم جلد اول و دوم اردو میں داخل
نصاب تھی۔ قصہ رستم و اسفندیار، رستم و سہراب کی جنگ اور
منیژہ و بیژن کی داستان عشق زال اور سیمرغ پہاڑ پر اس
کی بے پدر و مادر پرورش، ہفت خوان رستم و اسفندیار
اور یاد نہیں کیا کچھ تھا۔ اس تحریر کا اشارہ یہ ہے کہ
شاہنامہ یہاں بھی قصہ و کہانیوں کا مجموعہ تھا مگر صرف کچھ ہی
حصہ پورے کا پورا نہیں جبکہ ہمارے فاضل و لائق مستشرقین
نے اسے عجائب القصائص کہا ہے اور شاید اب بھی
کہتے ہیں ہمیں عہد طالب علمی میں فردوسی کے کئی اشعار
یاد تھے۔ مثلاً

منیژہ منم دخت افراسیاب
برہنہ ندیدم تنم آفتاب

میں منیژہ ہوں افراسیاب کی بیٹی۔ آفتاب نے
بھی میرے بدن کو برہنہ نہیں دیکھا۔

سوال اٹھتا ہے کہ افراسیاب کون تھا اس کے لیے
آپ کو پورا شاہنامہ دیکھنا پڑے گا جہاں افراسیاب
ہی نہیں کئی کردار اس کے علاوہ بھی ہیں جن سے واقفیت ضروری
ہے مثلاً۔

کیقباد: منوچہر کیقباد کے بعد پہلا بادشاہ جس
نے توران سے جنگ شروع کی۔ رستم و اسفندیار و سہراب
وغیرہ کو لڑایا با جاہ و جلال و عظمت و جوانمرد در عین حال
با حماقت و زود رنج۔

کیخسرو: بڑے باپ کا بیٹا، علو ہمت و شجاعت رحم
عدل و انصاف والا افراسیاب شاہ توران (وسط ایشیا)
کا شجاع، مکار با ظلم و جور فریب۔

رستم۔ نامی پہلوان، جوانمرد، وفادار نسبت بہ تخت و
تاج ایران۔ کسی سے بھی ہارا نہیں اپنی موت مرا۔

سہراب: مستی، شجاعت مگر بے تجربگی و ناقصی کا پتلا
رستم کا بیٹا جو اسی کے ہاتھوں اپنی بے وقوفی سے ایران ہی
میں مارا گیا۔

اسفندیار: بے مثال شجاعت مگر حریص سلطنت جس
نے اسے موت کے منہ میں ڈال دیا۔ اس وقت کے بادشاہ
گستاسپ سے اس نے تاج و تخت ایران مانگا تو اس نے
شرط لگائی کہ اگر تو رستم کو گرفتار کرکے میرے پاس دست
بستہ لے آئے تو میں تجھے سلطنت سونپ دوں گا۔ رستم
بوڑھا ہو چلا تھا وہ تیار ہو گیا۔ رستم سے لڑا اور مارا گیا۔

بیژن: دلیر و وفادار مگر افراسیاب کی بیٹی کا عاشق تھا
رستم کا بھانجا گیو کا بیٹا۔

منیژہ: افراسیاب (تورانی) کی بیٹی حسین و جمیل بیژن
کی عاشق و معشوقہ (دونوں) اس کے علاوہ بھی تہمتن، بہرام
گودرز (باپ) گیو (بیٹا) اور بہت سے کردار

برسوں پہلے لکھنؤ میں ایک بار احتشام حسین صاحب
سے یہ خاکسار کہہ بیٹھا کہ احتشام صاحب کچھ لکھئے موصوف نے
کسمساتے ہوئے جواب دیا کہ کیا لکھوں؟

اردو پر زوال کا سایہ بڑھ چکا تھا آج مجھ سے زیادہ ور
کے مدیر شہیر نے باصرار شدید یہ کہا ہے کہ انیس و فردوسی

پر لکھو میرے لیے کئی دشواریاں ہیں۔

اول تو یہ کہ آج عام طور سے اردو پڑھنے لکھنے والے اردو ہی سے نابلد ہو رہے ہیں تو فارسی کا ذکر ہی کیا؟

دوسرے نقاہت و ضعیفی سے قلم بھی رک رک کے چلتا ہے۔ تیسرے یہ کہ فردوسی اور شاہ نامے میں ایسے ہزارہا الفاظ ہیں جو پہلوی زبان کے ہیں اور متروک ہو چکے ہیں اگرچہ فردوسی کا کلام سادہ و تازہ ہے اس نے عربی الفاظ لانے سے گریز کیا ہے مگر مجھے اردو والوں کے لیے کہیں کہیں فردوسی کے اشعار کا بھی ترجمہ کرنا پڑ رہا ہے اس لیے میں بہت کم ترجمہ طلب اشعار پیش کرنے کی کوشش کروں گا گو کہ ترجمہ سے روح شعر تو اپنی جگہ ہی رہ جاتی ہے اس کے علاوہ ایک دشواری یہ بھی ہے کہ شاہنامہ میں ان اسلحوں اور ہتھیاروں کا مفصل ذکر ہے جو اب کمیاب و نایاب ہی ہیں۔ مثلاً نیزہ۔ گاودم۔ خرمہرہ۔ کوس، طبل، نقارہ، جوشن، خود، مغفر، چہار آئینہ، خفتان، ترک، برگستوان گوپال، گرز، تیغ، سپر درقہ، خنجر، ژوبین، تیر تبر، ناوک خشت، خدنگ، کمان، کمند، سنان، نیزہ، پرتاب، ترزین دبوس، قارورہ، شراع، عرادہ، رایت، علم، درخش، سراپردہ وغیرہ۔

اقسام فوج:۔ قلب، جناح، میمنہ، میسرہ، طلایہ، ساقہ مدار، کمینگاہ، دود وغیرہ۔

خدا رحمت کرے انیس و دبیر پر کہ انھوں نے اپنے مراثی میں ان کا کچھ استعمال کر کے اس کا زنگ جھاڑ دیا۔

اسی طرح فردوسی نے جو اقسام جنگ بیان کئے ہیں وہ بھی بہت کچھ ان مرحومین کے مراثی میں جگہ پائے ہوئے ہیں جیسے کشتی، پکڑ، شمشیر بازی، تیر اندازی، کمند اندازی نیزہ بازی وغیرہ سب کا فردوسی نے کاملاً ذکر کیا ہے اور اسے ایسا بیان کیا ہے کہ اس کی تصویر کھینچ دی ہے:

ہمیں زال الوسی شد دردمند ز فتراک بگشاد پیچاں کمند

الوسی نے دردمندی کے باعث فتراک سے کمند پیچاں نکالی

برانگیخت کاموس جنگی نبرد
هم آورد را دیده و بازو برد

کاموس اٹھا جنگ میں مقابلہ کو اور آنکھ و بازو سب لے گیا۔

بمان پیچید اورا ز زین
نگوں اندر آورد و زد بر زمین

لگام کو کھینچا اور اسے زین سے گھسیٹا نیچے لا کر زمین پر ٹپک دیا۔

چلئے منہ کا مزہ بدلتے اور دماغ کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے فردوسی کی ولادت واصلی وطن کی بھی کچھ مختصر بات ہو جائے۔

میرے محدود مطالعہ اپنے کتاب خانے کی بربادی اور کتب کی کمیابی کے باوجود میری نظر میں فردوسی کا صحیح تر بیان علامہ شبلی نعمانی نے کیا ہے اگرچہ صرف اسّی صفحات لکھے ہیں مگر ایسے معتبر و مستند مان کر فارسی زبان کے مصنفین نے بھی اس کے حوالے دئے ہیں اگرچہ شبلی نے بھی ان سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ حاجی فتح اللہ مفتون یزدی جو حیدرآباد دکن میں فارسی کے استاد کی شہرت رکھتے تھے اور نہایت منکسر المزاج و محتاط عالم تھے ان سے بھی استفادہ کیا ہے کیونکہ انھوں نے اپنی دو سو صفحات کی کتاب کا نام ہی "حقیقت فردوسی و شاہنامہ" رکھا ہے جو سچائیوں سے بھرا ہوا حوض ہے) میں چند سطریں فردوسی و شاہنامہ کے تعلق سے آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔

فردوسی نام وولدیت و وطن

مسلم ہے کہ فردوسی کا وطن طوس تھا۔ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں بعض مورخین کی سند سے فردوسی کے والد کا نام منصور بن فخر الدین احمد مگر محقق و مسلم یہ ہے کہ اس کا نام حسن ابن اسحٰق ابن شرف اور کنیت ابوالقاسم (مشہور بہ حکیم ابوالقاسم) اور تخلص فردوسی تھا۔

ولادت و وفات

بطور یقین فردوسی کا سال ولادت تو معلوم نہیں لیکن شاہنامہ کے آخر میں اس نے خود کہا ہے۔

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد
ایدم بریکبارہ برباد شد

اس وقت میری عمر اسی (۸۰) کے قریب ہے امید ہے کہ وہ ایک ہی بار (موت کے بعد) برباد ہو جائے گی۔ اس کے بعد اس نے جو کہا ہے اسے دیکھ کر مان لینا چاہئے کہ وہ ۳۲۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار
کہ گفتم من ایں نامۂ شاہوار

سن ہجری کے ۸۰ کو پانچ سے ضرب دو

اسی وجہ سے شبلی اور تاریخ حبیب السیر نے ۴۱۰ ہجری و ۴۱۱ ہجری لکھا ہے

حضرت جلال الدین عمر جعفری زینبی نے ۴۱۶ھ لکھا ہے فردوسی شاہنامے کی تشکیل کے بعد بارہ سال تک زندہ رہا یزدی صاحب لکھتے ہیں کہ جب فردوسی دنیا میں آیا تو اس کے باپ نے خواب دیکھا کہ اس نومولود نے کوٹھے پر پہنچ کر آواز لگائی تو ہر طرف سے لبیک کی صدا آئی صبح ہوتے ہی وہ اپنے پیر شیخ نجیب الدین کے پاس پہنچا جو تعبیر خواب بتانے میں مشہور تھے۔ فردوسی کے باپ نے ان سے اپنا یہ خواب بیان کیا انھوں نے کہا کہ ”تیرا بیٹا شاعر ہوگا اس کے اشعار دنیا بھر میں مشہور ہوں گے۔

فردوسی شاعری کی ابتدا ہی سے ملکوں ملکوں گھومتا رہا ہر جگہ شاہی مہمان ہوتا۔ طوس سے ہرات، خراسان، غزنی سیستان، دریا، باغ، بازار، دربار، شہر و دیہات، گلی کوچہ، مازندران، توران، زابل اور اس زمانے کے ممالک مگر غزنی میں چار سال گزارے ۶۵ سال کی عمر میں اس کے کڑیل، جوان و صالح بیٹے کی اچانک موت ہوگئی وہ اس سے بہت متاثر ہوا ۳۷ سال کے بیٹے کی وفات کا مرثیہ بھی اس نے اپنے اشعار میں بیان کیا ہے۔

متعصبین فردوسی یہ کہہ کر لوگوں کو بہکانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاہنامے میں ہے ہی کیا بس دور دراز کے افسانے ہی تو بھرے ہیں۔ دیو سفید ظالم کا جام جہاں کا اس کی ناک سے نکلنے والے سانپ زال پدر رستم کی پرورش کرنے والا سیمرغ و اکوان دیو وغیرہ جیسے اعتبار و عقل میں نہ آنے والے کیریکٹر و قصے بھی موجود ہیں جو اس کی واقعیت و وقعت دونوں کو گرا دیتے ہیں مگر علامہ ثعلبی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ چونکہ یہ چیزیں ابتدائی تواریخ میں تواتر سے بیان ہوئی ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ماخذ کے طور پر ایمانداری سے اسے بھی بیان کریں کیونکہ وہ زمانہ تو بہت سے عجائب سے بھرا ہے جیسے اس وقت لوگوں کی عمروں کا ہزار سال یا زیادہ ہونا اسی طرح شاہنامہ کے دلچسپ قصوں میں ہفت خوان رستم و ہفت خوان اسفندیار وغیرہ (رستم و اسفندیار کے سات کٹھن و مہلک سفر) کو بھی لغویات قرار دیا گیا ہے مگر ابوریحان البیرونی آثار باقیہ (عربی) میں لکھتا ہے چونکہ تاریخ کے یہ پرانے قصے قدیم ترین تواریخ سے لیے گئے ہیں۔ ابن مقفع پہلوی نے اسے عربی میں ترجمہ کیا تھا ژندی و پہلوی ادب دونوں اس کا ماخذ ہیں عرض خاکسار یہ ہے کہ وہ زمانہ ہی اساطیر و داستانوں کا تھا سنسکرت سے بھی فردوسی واقف تھا۔ اردو میں طلسم ہوشربا آج بھی پڑھی جاتی ہے اور بعض علماء نے اسے پڑھنے کی ہدایت بھی کرتے ہیں اردو سنوارنے کے لیے۔

فردوسی جب سن رشد کو پہنچا تو تحصیل علم میں مشغول ہوگیا اور بہت سے علوم و زبان کا ماہر ہو کے نکلا چنانچہ دروستا ژندی زبان سیکھی۔ وہ صاحب جائداد تھا روپیہ پیسہ کی نہ اسے حاجت تھی نہ لالچ اس نے شاہنامہ کے

دیباچہ میں ابتدا ہی میں اپنی زبان پر اعتراض کرنے والوں کو سمجھا دیا (اس کا ذکر ہم شروع میں ہی کر چکے ہیں۔)

میر انیسؔ

انیسؔ کا نامۂ حیات طولانی ہے نہ ان کی سوانح عجائبات رکھتی ہے البتہ ان کی شاعری کی عمر اور اس کے اندر ہی ایسے کارنامے ضرور لائق تحریر ہیں۔ میرؔ و سوداؔ، غالبؔ و ذوقؔ، آتشؔ و مصحفیؔ کے عہد میں اپنا لوہا سب سے منوا لینا انیسؔ کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہی ہے۔ دیگر یہ کہ انیسؔ کا نام میر ببر علی انیسؔ سب کے نوک زبان ۱۲۱۶/ یا ۱۲۱۷ء میں فیض آباد گلاب باڑی میں ولادت ہوئی۔ تعلیم و تربیت ان کے عظیم والد جناب مستحسن خلیقؔ نے کی بہت بڑے شاعر و مرثیہ گو تھے۔ لکھنؤ ان کا آنا دیر میں ہوا جبکہ مرزا سلامت علی دبیرؔ وہاں قدم جما چکے تھے مگر میر انیسؔ نے لکھنؤ آکر بہت جلد اپنی بنالی وہ مختلف علوم متداولہ و فن سپہ گری سے خوب واقف تھے عزت خاندانی و وضعداری ان پر ختم تھی وہ کسی رئیس و امیر سے جھک کے نہیں ملتے تھے ان کی شاعری کسبی نہیں خلقی تھی۔ اردو کو انھوں نے اپنے کلام سے دوسری زبانوں کا ہمسر بنا دیا بلکہ اسے بین الاقوامی زبانوں میں شامل کرا لیا۔ انھوں نے ہزارہا مراثی، سلام و رباعیات کہی ہیں جو سب کی سب جاندار ہیں اور بہت سی زبانوں پر ہیں مشہور ہے کہ انھوں نے ڈھائی لاکھ شعر لکھے تھے (اس میں بلا مبالغہ کا استعمال نہیں کیا جا سکتا) اگرچہ یہ بھی کمال ہے کہ غزل (کمترین) مثنوی، قصیدہ کہنا انھوں نے ترک کر کے اپنی شاعری کو صرف مرثیہ امام و کربلا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ بقول سید احتشام حسین مرحوم "انھوں نے مرثیہ کی محدود چوکھٹ میں جو تصویریں سجائی ہیں جو رنگ آمیزی کی ہے اور رضاعی کا جو کمال دکھایا ہے وہ براہ راست محض رونے رلانے کے لیے نہیں ہو سکتا یقیناً ان کے اندر وہ شاعرانہ و خلاقانہ بصیرت ہے جو کسی صنف کی پابند نہیں ہوتی بلکہ اپنے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے دائرے کو وسیع کرتی ہے۔ مگر خاکسار اس میں (مسدس) کی پابندیٔ داماں کا اضافہ بھی چاہتا ہے مولانا عبد السلام ندوی شعر الہند جلد ۱ میں میر انیسؔ کے لیے رقم طراز ہیں۔

"انسانی کردار و افعال ساکن ہوں یا متحرک۔ میدان جنگ کا نقشہ ہو یا بزم کی گرما گرمی وہ اسے اس قدر صحیح اتار دیتے ہیں کہ بڑے سے بڑا مصور بھی اس پر حرف گیری نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر کربلا سے دمشق کے راستے میں میر انیسؔ امام زین العابدینؑ کے حال زار کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

تلواریں لیے چاروں طرف ظلم کے بانی۔\
حلقہ میں دل افگاروں کے وہ یوسف ثانی\
وہ طوق کا لنگر وہ سلاسل کی روانی\
غربت کا الم بے پدری تشنہ دہانی

- - - - - - -

مڑ کر کبھی زینب کے رخ پاک کو دیکھا\
بیڑی کبھی دیکھی کبھی افلاک کو دیکھا

انیسؔ کی زبان

انیسؔ کی زبان کل کی طرح آج بھی مصفّا و منجھی ہوئی ہے وہ صحت محاورہ و لغت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ابتدائی کلام میں کچھ قدیم مگر بہت کم محاورات ضرور مل جاتے ہیں سب ان ہی کی زبان سے سنیے۔ فرماتے ہیں اور صحیح فرماتے ہیں

کس نے تیری طرح سے اے انیسؔ\
عروس سخن کو سنوارا نہیں

مرقع نگاری پیکر تراشی، محاکات، مرقع نگاری ان کا خاص کمال تھا اسکی نقل ہوتی ہے مگر جواب نہیں ہے۔

اظہار جذبات واحساسات

بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ پورا ذخیرہ مرثیہ نازک سے نازک اور بڑے بڑے جذبات واحساسات سے پر ہے اور مرثیہ دراصل ہے ہی احساسات غم وجذبات الم کے اظہار کے لیے مدح ومبارکباد یا خوشی ضمناً ضرورتاً کہیں کہیں آجاتی ہے اور اس کا لانا بھی ضروری ہے۔

انیس کا طرز بیان

اس کا بیان سورج کو چراغ دکھاتا ہے تمثیلوں و استعاروں، صنائع و بدائع کا برمحل استعمال تشبیہیں آسان، بیان میں غضب کی روانی۔ فصاحت کا تو کہنا ہی کیا وہ خود بھی اللہ سے دعاگو ہیں۔

آگاہ کر آغاز تکلم سے زباں کا
عاشق ہوں فصاحت بھی وہ دے حسن بیاں کا

ہم تو غالب کے شیدائیوں میں ہیں جس نے جو بھی کہا وہ پتھر کی لکیر ہے۔

لکھتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

انیس نے غالب کے مرنے پر ۱۹۲۹ھ میں کئی اشعار پر مشتمل سوگواری قطعہ لکھا تھا اور اس میں غالب کی طرز نوا کو سراہا بھی تھا۔ ان کی طرز ادا کا۔

اس کے علاوہ ان کی شاعری، طرز ادا میں خوبیاں ہی خوبیاں تھیں جس کا احاطہ یا احصا آسان نہیں۔ انیس کا موازنہ شیکسپیئر و کالی داس ویاس سے کرنے والے بھی اپنی جگہ پر درست ہیں۔

تناسب و ہمواری

انیس کے مراثی میں ہر لحاظ سے تناسب و ہمواری تسلسل ہے البتہ وہ کوئی مستند مورخ نہیں تھے لہٰذا ان سے واقعات کو من وعن بیان کرنے کی امید کرنا صحیح ہے نہ مطالبہ جائز اس کا انھوں نے دعویٰ بھی نہیں کیا ہے۔ یہ ضرور کہا ہے

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس کی وفات

۱۸۷۴ء میں بعارضہ تپ آپ کا انتقال ہوا پر لنے لکھنؤ میں ایک کھنڈر جو کبھی ان کا اپنا باغ تھا دفن ہوئے۔ انیس صدی مناتے ہوئے بزم انیس نے اسے عمارت کی شکل دے دی جو دیدنی ہے شاید زوار وہاں جاتے ہوں مگر مجھے تو کوچہ میر انیس ہی سنسان دکھائی دیا جبکہ ہزاروں سال پہلے شاہ غزنی اور اس کے کئی حلیف شاہوں کا معتوب و ڈری سہمی رعایا جو فردوسی و شاہنامہ کا نام لیتے ہوئے خوف کھاتی تھی چار پانچ سال سے زیادہ نہ گذرا ہوگا کہ مزار فردوسی آباد و زیارت گاہ عوام و خواص بن گیا۔ نظامی سمرقندی لکھتا ہے کہ میں نے ۵۱۰ھ میں اس کے مقبرہ کی زیارت کی۔ دولت شاہ نے اس کے مزار کو مرجع عام بتایا ہے اور قاضی نوراللہ شوستری لکھتے ہیں کہ عبداللہ خاں ازبک کی توجہ سے مقبرہ فردوسی زائرین سے معمور و بارونق ہے عوام عموماً وشیعہ خصوصاً اس کی زیارت کرنے جاتے ہیں اور یہ شرف میرے حصہ میں بھی آیا۔ بقول حافظ۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

پچھلی صدی میں رضا شاہ پہلوی کے حکم اور انجمن ملی ایران اور چند باہمت وطن پرستوں کے باہمی تعاون و کوشش سے طوس میں مقبرہ فردوسی بنام "آرام گاہ فردوسی،، بہت ہی دلکش وخوبصورت تعمیر ہوا جو ایک

دل کشا باغ میں ہے جشن ہزار سالہ فردوسی وہیں منایا گیا تھا جس میں شرق و غرب کے ادباء و فضلا و علماء نے شرکت کی تھی۔

انیس اور لکھنؤ

انیس اور لکھنؤ کو جدا نہیں کیا جا سکتا وہ بہت درد مند دل رکھتے تھے وطن پر اس کے نام پر جان دینے والوں میں سے تھے ۱۸۵۷ء کا داغ ان کے سینے سے مرتے دم تک نہیں گیا۔ اپنی آنکھوں سے شہر کو تباہ کرنے کا منظر دیکھا میر انیس لکھنؤ سے باہر خود نہیں نکلے خاندان اور اپنے کو بچانے کے لیے تیس چالیس میٹر لکھنؤ کے قریب کے قریب قصبہ کاکوری میں کئی ماہ رہے۔ سقوط اودھ اور انتزاع سلطنت کے بعد بہت جگہ سے بلاوے آئے مگر وہ یہی کہتے رہے کہ اس کلام کو اسی شہر کے لوگ سمجھتے ہیں اور کوئی اس کی قدر کیا کرے گا پہلی مرتبہ ۱۸۵۹ میں اور پھر بڑے اصرار کے بعد ۱۸۶۰ میں عظیم آباد تشریف لے گئے۔ شاد عظیم آبادی حیات تھے انھوں نے اس سفر کا حال بھی لکھا ہے بنارس (دہلی پور) کے ایک حکیم صاحب انیس کے فدائی تھے۔ درمیان سفر وہ انیس کو بنارس میں ضرور روک لیتے۔ مونس ہمیشہ سفر میں انیس کے ساتھ ساتھ رہتے ۱۸۷۱ میں حیدرآباد نواب تہور جنگ کے بعد اصرار پر گئے اور واپسی میں الہ آباد میں قیام کیا۔ مجلس انیس کی جہاں بھی ہوتی لکھنؤ تو چھوڑیے ہر جگہ لوگوں کا اژدہام و مجمع کثیر ہوتا خان بہادر ذکاء اللہ نامور اہل قلم الہ آباد کی ایک مجلس میں تھے سخت گرمی کے باوجود مجمع گوش بر آواز تھا اور داد دے رہا تھا۔ اتفاق سے ان کی محفل میں ایک انگریز بھی بیٹھا تھا اور بظاہر لگتا تھا کہ وہ محظوظ بھی ہو رہا ہے خان بہادر ڈاکٹر ذکاء اللہ بعد مجلس اس انگریز سے پوچھ بیٹھے تمہیں کیسا لگا مسٹر؟ اس نے جواب دیا کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اونچی کرسی پر ایک دو بڑھیا بیٹھی" ہے اس کے ایک اشارے پر لوگ مسکرا دیتے ہیں اور دوسرے اشارے پر ملول و گریاں ہو جاتے ہیں۔

بہرحال انیس کا انتقال ہجری ۱۲۹۱ مطابق ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ اپنے ہی باغ میں دفن ہوئے ۶۴ یا ۶۵ کا سن رہا ہوگا سخت مصائب و آلام میں اتنی عمر کاٹ لینا بھی ان کی ایک صفت ہے کیونکہ زندگی میں اعتدال و احتیاط ورزش، فن سپہ گری کی مشق بھی جاری رہتی تھی غذا بھی قلیل تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

مطالعہ انیس اور مقالہ نگاری کی کمزوریاں

علی سردار جعفری کی طرح ہمارے خاندان میں بھی انیس مقبول و محبوب تھے کچھ نہ ہو مگر گھر میں ان کے دو چار مرثیے ضرور رہتے۔ مرزا دبیر کے بھی والد مرحوم قصبہ بلود سدھار تھ نگر کے اپنی ایمانداری، عبادت و تقویٰ و عشق اہلبیت میں منفرد تھے۔ سرکار انگریز کے ملازم تھے اور دادا مرحوم بھی الحمد مال ہو کر روزانہ نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید با آواز بلند فرماتے اڑوس پڑوس کے لوگ اسے کان لگا کر سنتے۔ خیر اس زمانے میں بچوں کو بھی منبر پر بیٹھ کر سلام و رباعی پڑھانے کا رواج تھا چنانچہ میری بھی باری آئی تو اردو میں لکھ کر ایک پرچہ دیا گیا جو میں نے دیکھا پڑھا بھی صحیح سگر کیا تھا وہ اس کے معنی مطلب سے غافل و بے بہرہ۔ شاید آج بھی کہیں یہ چلن باقی ہو رباعی سنئے مشہور ہے شاید یاد بھی ہو۔

بالیدہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا
ظل علم صاحب معراج ملا
منبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علم
اب چاہئے کیا؟ تخت ملا تاج ملا

یہ تو انیسؔ کی مشہور اور ابتدائی زمانے کی رباعی ہے ان کی بہت سی رباعیات میں نے اپنی بیاض میں خوشخط لکھا تھا یہ نعمت بھی ہماری موروثی ہے باپ دادا، چچا، برادر سب خوشخط۔ بہرحال قصہ کوتاہ اس سب کے باوجود مطالعہ انیسؔ کا مجھے موقع نہیں ملا تھا تیج کمار وارث نولکشور نے جیسے ہی اس کی پانچ جلدیں چھاپ دینے کا اعلان کیا۔ کم قیمت کے ساتھ کمیشن بھی ملا۔ میں نے تین سیٹ لے لیے مگر برسوں سے میرے پاس پہلی و چوتھی جلد ہی رہ گئی۔ کچھ بانٹ دی بقیہ آنے جانے والے دوستوں کے ہاتھ لگ گئی۔

برادر عزیز محترم نیر مسعود، صالحہ آپا و پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیبؔ سر صفدر حسین کی چند کتابیں ہی میرا سرمایہ مطالعہ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حریری، بدیعی، حماسہ جاحظ، سید رضی ابو نواس وغیر ذالک نے مجھے اس کا موقع کم دیا ہو کیونکہ مجھے میٹرک کے بعد عربی مدرسہ میں داخلہ لینا پڑا جس کی والد مرحوم نے حد سے زیادہ تاکید کی تھی۔ اب میں اس مقالے کا رخ پھر فردوسی کی طرف موڑتا ہوں کہ انیسؔ کو رستم و سہراب و اسفندیار، جمشید، بہرام، کیقباد وغیرہ سے متعارف کرنے والا فردوسی اور اس کا شاہنامہ ہی ہے سنئے انیسؔ کے تین اشعار

گیتی کے چار دانگ میں برپا ہے میرا شور
پنجوں سے میں نے توڑ دیا سرکشوں کے زور
بہرام ڈر سے کانپ رہا ہے میان گور
سیمرغ و فیل وہ ہر بشر مثل مور

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے
اس سے بہتر حضرت عباس علمدار ممدوح کے

رعب و جلال کا شت عرانہ اظہار شاید ہی ممکن ہو مگر انیسؔ نے تمام بڑے بڑے بہادروں میں رستم پر تان کیوں توڑی اس لیے کہ فردوسی نے شاہنامہ کے وسیلہ سے رستم کو ہیرو بنا دیا تھا۔ اور اس نے سہراب و اسفندیار جیسے پہلوانوں کو نیچا دکھایا تھا۔ کلام انیسؔ میں جمشید و ضحاک و فریدوں و بہمن وغیرہ کے نام بھی آتے ہیں وہ بھی بلاشبہ فردوسی کی دین ہے۔

ایران ایک قدرتی چمن زار ہے ملک کا کونا کونا رنگ برنگے پھولوں سے لبالب بھرا ہے۔ قدم قدم پر آب رواں، آبجو، نہریں، آبشار شمشاد و چنار کے گھنی چھاؤں، جھرنے، قنات، برف کے جھالے دھوپ ہلکی و خنکی کی شال اوڑھے ہوئے پھر بہار کیا آئی تمام فرش و زمین تختۂ زمرد بن گیا۔ باد سحر، باد صبا، باد نسیم کے جھونکے، خوشبوؤں کی لپٹ، سبزہ کی لہک، بلبل کی چہک، طاؤس کا رقص، نادی نا نون پہ آئی ہوئی جوانی، مشرق میں ایران جیسا کہیں نظر نہ آئے گا قاآنی کہتا ہے۔

نسیم خلد می وزد مگر ز جوئبار ہا
کہ بوئے مشک می دہد ہوائے مرغزار ہا

ان ہی نعمتوں کی برکت و زیر اثر ایران کی تمام انشا پردازی ادب و شعر گوئی پر رنگینی چھا گئی۔ ایرانی شاعر جب کسی خوبی و کمال کو بیان کرے گا تو رنگ و بو سے پیچھا نہیں چھڑا پائے گا چنانچہ فردوسی جب فوج کی تعریف کرتا ہے تب بھی وہی حال ہے۔

سوئے شہر نہاد ند رائے
سپاہی بد و گو نہ بازنگ و بوئے

میری نظر میں انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شمالی ہند اور ہندوستان جیسے گرم و سخت موسموں والے ملک میں زندگی بسر کر کے جہاں لوگ اکثر پسینے میں ڈوبے رہتے ہیں وہاں پہ رہ کے کاغذ پر گل و نسترن دریا و

کہسار۔ ایک طرف سرخئ شفق دوسری جانب پربہار درخت صحرا گل بوٹے سبزہ زار شبنم کے گلوں پر گہر ہائے آبدار خوش رنگ پھولوں سے بھرا ہوا کوہسار دریا کی روانی نسیم صبح کی مروجہ جنبانی، شب و روز کے رنگ بدلتے مناظر کی تصویر اپنے زور تخیل سے ایسی ایسی کھینچی ہے کہ اصل سے زیادہ اس کی تصویر بھلی لگتی ہے

وہ سرخئ شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ باردر درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پر گہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

قوت تخیل کی خوبی یہ ہے کہ محال بات اس انداز سے کہی جائے کہ وہ بظاہر ممکن بن جائے۔ انیس کا زور بیان وتخیل دیکھئے فرماتے ہیں۔

ابھریں دروہ پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم
لوئے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم
دریا میں روشنی ہوئی جسم حضور سے
لے لیں بلائیں پنجہ مرجاں نے دور سے

حضرت عباس دریا پر

زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

کلام میں واقعیت ضروری نہیں بلکہ ہونا یہ چاہیئے کہ وہ اصلیت سے اثر سے خالی نہ ہو سه

حملہ غضب ہے بازوئے شاہ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

کسی مثنوی کا وکلام کی خوبی میں درج موضوعات کو دیکھا جاتا ہے

حسن ترتیب۔ یعنی جو واقعہ نظم کیا جارہا ہے اس میں حسن ترتیب لازمی ہے کیونکہ واقعات جو بکھرے ہوئے منتشر ہوتے ہیں اس میں ترتیب نہ ہو تو بات نہیں بنتی فردوسی کے یہاں واقعات کا انبار ہے مگر ہر جگہ اس نے ترتیب کا خاص خیال رکھا ہے۔

کیریکٹر

مثنوی میں سیکڑوں اشخاص کا ذکر ہے جو الگ الگ صنف اور پیشوں سے وابستہ ہیں۔ مرد وعورت، شاہ و گدا، جوان، ضعیف، بچہ، امیر غریب، تاجر وکاری گر ان سب کے حالات واخلاق وعادات کے مطابق ان کا کیریکٹر قائم کیا جائے اور آگے جہاں جہاں اس کا ذکر آئے وہ کیریکٹر بدلنے نہ پائے بقول مولانا عبدالسلام ندوی۔

" انسانی کردار وافعال چاہے ساکن ہوں میدان جنگ کا نقشہ اور بزم کی گرما گرمی کی اس قدر صحیح تصویر اتاری جائے کہ بڑے سے بڑا مصور بھی اس پر حرف گیری نہ کرسکے میر انیس کربلا سے دمشق کے اذیت ناک سفر میں امام زین العابدین کی حالت کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں سه

تلواریں لیے چاروں طرف ظلم کے بانی
حلقہ میں دل افگاروں کے وہ یوسف ثانی
وہ طوق کا لنگر وسلاسل کی روانی
غربت کا الم، بے پدری، تشنہ دہانی
مڑ کر کبھی زینب کے رخ پاک کو دیکھا
بیڑی کبھی دیکھی کبھی افلاک کو دیکھا

فردوسی کے شاہنامہ میں بھی نہیں کہ ہزاروں متروک الفاظ ہیں بلکہ بہت سے الفاظ کے معانی اس نے اپنی پسند وخیال سے رکھ دیئے۔ مطالعہ فردوسی میں پہلے ہی ان دونوں باتوں کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے

یہ بھی فردوسی کا کمال ہے کہ عربوں سے خلقی نفرت کے باعث اس نے شاہنامہ کے ساٹھ ہزار اشعار میں بہت گنے چنے عربی الفاظ استعمال کئے اور وہ بھی معنی بدل کے جیسے تغیر عربی ہے اس کو فرسودہ کا معنی پہنایا۔ عنصر کو گوہر وجود کو توانائی وغیرہ

انیسؔ کی زبان بیگمات کی اور فصیح ہے جو آج بھی قابل تقلید ہے اور خود ان کے اپنے زمانے میں مستند مانی جاتی رہی ہے انھوں نے خود ہی کہا ہے ؎

یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال
معجزہ گر نہ اسے کہئے تو ہے سحر حلال
کسی نے بھی تیری طرح اے انیسؔ
عروس سخن کو سنوارا نہیں

اور بھی اس طرح کے بہت سے اشعار انھوں نے کہے ہیں جسے بیجا تعلی کا نام نہیں دیا جاسکتا۔

انیسؔ کو ہر لحظہ شاعری میں زبان و فصاحت کا خیال رہتا تھا۔ لکھنؤ میں افاضل علماء و شعرا کی کمی نہ تھی اور سب انیسؔ کا مرثیہ سننے آجاتے تھے ان میں عالم اسلام و ہند کی اعلا شخصیت مفتی میر محمد عباس بھی ہوتے جو انیسؔ کے استاد بھی تھے۔ مصلح زبان حضرت ناسخؔ لکھنوی جن کی شاگردی نے انھیں حزیںؔ سے انیسؔ بنایا اور وہ غزل کے میدان سے نکل کر مرثیہ کو معراج بخشنے کے لئے منبر پر آگئے۔

تو انیسؔ کی ایک دشواری یہ بھی تھی کہ کوئی کلمہ ایسا نہ آئے جس پر مجمع انگلی اٹھا سکے۔ انیسیوں و دبیریوں کی سرد جنگ جاری تھی بہت سے لوگ تو اعتراض کو ڈھونڈنے ہی کی غرض سے مجلسے بڑھاتے تھے ان ہی کو خطاب کر کے انیسؔ نے کہا تھا۔ پورا سلام ہے چند شعر جو مشہور بھی نہیں سنئے۔

سلام کے اشعار

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
بھلا تردد بیجا سے اس میں حاصل کیا
اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو
غلط یہ لفظ یہ بندش نئی یہ مضموں سست
ہنر عجیب ملا ہے یہ نکتہ چینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

فردوسیؔ نے بعض اشعار میں لفظ کو دوسرے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جیسے آذین کو زیب و زینت کے معنی پہنائے ہیں۔

ز دیبائے چین بر گل آذیں بہ بست

اندرخور کو لائق مناسب کے معنی دئے ہیں

ہر آں چہ اندر خور د با خرد

انوشہ یعنی خوش رہو۔ آفرین

انوشہ کر گرد ید گو ہر پدید

ایسی لمبی فہرست ہے بہرحال فردوسیؔ آزاد تھا انیسؔ پابند در پابند۔ انیسؔ کا محاکات و تخیل میں کوئی ثانی نہیں مگر محاکات کے بھی دقیق خصوصیات ہیں۔ بقول شبلی نعمانی اس میں فرق مراتب ہے۔ اسی بنا پر شاعری کے مدارج میں نہایت تفاوت ہے یہی بات مصوری کی ہے مشہور ہے کہ ایک یونانی مصوّر نے ایک آدمی کی تصویر بنائی جس کے ہاتھ میں انگور کا خوشہ تھا۔ جب یہ تصویر عام جگہ پر لگائی گئی تو وہ اس قدر اصل کے مطابق تھی کہ پرندے اسے انگور سمجھ کر چونچ مارنے لگے لوگ بھی جمع ہوگئے ہر طرف واہ واہ ہونے لگی لیکن مصوّر رو رہا تھا کہ تصویر میں نقص رہ گیا لوگ حیران ہو کر پوچھنے لگے۔ اس سے بہتر اور کیا کمال ہوسکتا تھا۔ مصوّر نے کہا کہ بلاشبہ تصویر اچھی بنی ہے لیکن جس کے ہاتھ میں انگور ہے

اس کی تصویر اچھی نہیں ورنہ پرندے انگور پر ٹوٹ پڑنے کی ہمت نہ کرتے۔

محاکات میں اس طرح کی باریکیاں پائی جاتی ہیں اور یہی وہ نکتہ ہے جس سے فرق مراتب ہوتا ہے کائنات کی ہر شے میں محاکات پائے جاتے ہیں خواہ وہ کسی واقعہ کا بیان ہو یا منظر کا یا جذبات انسانی کا یا کسی حالت و کیفیت کا انیس کا کلام اس سے مالا مال ہے۔ یہاں دیکھئے حضرت عباس کے بھوکے پیاسے گھوڑے کا حال نمونہ کے طور پر۔

دو دن سے بے زباں پہ تھا جو آب و دانہ بند
دریا کو ہنہنانے لگا دیکھ کر سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند
چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

فردوسی کے شاہنامہ میں دس بارہ مختلف کیریکٹر ہیں جس کو بتایا جا چکا ہے اور وہ ہر موقع پر ہر کیریکٹر کا استعمال کرتا ہے اس طرح وہ ان کے افعال و کردار بول چال رفتار و گفتار میں کہیں پر کوئی فرق نہیں آنے دیتا اور یہ کوئی آسان کام نہیں مثنوی میں اس کا خیال ضروری ہے کہ ہر شخص کا کیریکٹر ہر جگہ رہتے بدلے نہیں کم از کم ایسی بات نظر نہ آئے جو اس قائم کردہ کردار کے خلاف ہو ہمارے یہاں اکثر شعرا اس نکتہ کو پیش نظر نہیں رکھتے وہ جس موقع کا بیان کرتے ہیں وہاں کے خاص لوازم کا اثر غالب آجاتا ہے اور انھیں پچھلے کیریکٹر کا خیال نہیں رہتا اس لیے بعض اوقات تناقض بلکہ تضاد بیانی بھی ہو جاتی ہے۔

اردو میں میر انیس اس صنف میں ممتاز ہیں مثلاً انھوں نے حضرت امام حسین کا جو خاص کردار قرار دیا ہے وہ صبر و تحمل، برداشت، تمکین و وقار، فروتنی، حیا و عجز ہے۔ مراثی میں امام علیہ السلام کا ذکر سو سو طرح سے آیا ہے اور ہر قسم کے حالات اس بلا کے بن میں پیش آئے ہیں لیکن کسی بھی موقع و حالات میں یہ اوصاف قاصد صغریٰ کے سوال و تحسین پر امام کا کردار دیکھئے ؎

یہ تو نہیں کہا کہ شہ مشرقین ہوں
مولا نے سر جھکا کہا میں حسین ہوں

۔۔۔۔۔۔

برچھیاں تول کے ہر غول سے خونخوار بڑھے
نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماندار بڑھے
بولے شہ یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے
اسد حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

میں نے لکھا ہے کہ فردوسی آزاد ہے اور انیس پابند صرف مرثیہ و مسدس کے دائرے میں نہیں بلکہ وہ اپنے ممدوحین امام حسین، حضرت عباس، امام سجاد اور اہل حرم کے تاثرات کو بھی حد میں رہ کر بیان کر سکتے ہیں سہراب کی ماں اپنے بیٹے کے قتل کی خبر سنتی ہے تو فردوسی اس کی حالت یوں بیان کرتا ہے

بیفتاد بر خاک و چوں مردہ گشت
تو گفتی ہم خونش افسردہ گشت

زمین پر گری اور مردوں جیسی ہو گئی تم دیکھتے تو کہتے کہ اس کے جسم میں لہو نہ رہا۔

خروشید و جوشید و جامہ درید
بزاری بر آں کودک رسید

چلائی اور غم سے دیوانی ہوئی پیرہن چاک کیا اس نا کتخدا بیٹے پر غم کی وجہ سے
مگر انیس اہل حرم کی عصمت و عظمت کو دیکھتے

ہوئے بی بی زینب کی سوگواری کا بیان امام حسین کے بعد داغ
قتل پر بڑی احتیاط کے ساتھ کرتے ہیں کہتے ہیں اگرچہ
زینب کا دل پاش پاش تھا جس کا صحیح بیان و انداز
انسانی طاقت کے بس کا نہیں مگر انیس کی ہنرمندی
کا اس موقع پر اندازہ کیجئے۔

ڈھانپ کر ہاتھوں سے پر بنت علی چلائی
ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی
ضرب اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی
گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی
آنکھ کھولی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا
سر اٹھایا تو سر شہ کو سناں پر دیکھا

سر دیکھ کے بھائی کا وہ بیکس یہ پکاری
دکھ پائی بہن آپ کی مظلومی پہ واری
خنجر سے یہ گردن کی رگیں کٹ گئیں ساری
تم مر گئے پوچھے گا خبر کون ہماری
آفت میں پھنسی آل رسول عربی کی
اب جائیں کہاں بیٹیاں زہرا و علی کی

ایسے بہت سے اشعار بیبیوں کے تڑپنے کے ہیں
جیسے شہادت عباس علمدار و شہزادہ قاسم و علی اکبر و عون
و محمد کے جنھیں مراثی کی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔
اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے نمونتاً دو بند لکھے گئے ہیں۔
فردوسی ہر کسی کے جذبات کو اس کے حالات کے لحاظ
سے بے دریغ بیان کر دیتا ہے جو انیس سے نہیں ہو
سکتا۔ کیخسرو نہایت حلیم و باوقار بادشاہ تھا لیکن جب
اس کے بھائی کا خون طوس کی غلطی سے ہوتا ہے تو وہ
بے اختیار ہو کر اسے گالی دے بیٹھتا ہے

بر دشنام بکشاد لب شہریار

گالی دینا سلاطین کا شیوہ نہیں لیکن فردوسی جانتا
ہے کہ کیخسرو اس وقت کیخسرو نہیں فخر و غرور غیظ و غضب
سے کوئی اور ہو گیا تھا۔ انیس حضرت علی اکبر کی دردناک
شہادت کے بعد کا منظر یوں دکھاتے ہیں۔

شبیر یہ سر پیٹ کے اس وقت پکارے
بانو علی اکبر گئے ہاتھوں سے تمہارے
جلادوں نے نیزے مرے فرزند کے مارے
فردوس میں داخل ہوئے دنیا سے سدھارے

فردوسی کی ایک اور خصوصیت

شاہنامہ کی گہرائی، چوڑائی، لمبائی کی پیمائش بہت
دشوار بلکہ ناممکن ہے مگر فردوسی نے کئی مقامات پر ایجاز
و اختصار کا معجزانہ کمال بھی دکھایا۔ خاتمۂ کلام میں اس
کی مثالیں بھی سن لیجئے۔
رستم سہراب کو خط لکھتا ہے تہدید کے وسیع مضمون
کو ایک شعر میں ادا کرتا ہے۔

دگر نہ بکام من آمد جواب
من و گرز و میدان افراسیاب

نظامی نے اپنے فخریہ میں زمین آسمان کے قلابے
ملائے مگر فردوسی ایک شعر میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ
جاتا ہے۔

سہراب کا زور: خم آورد پشت سناں شیخ
بزد تند و برکند ہفتاد میخ

ایک جھٹکے میں خیمہ کی کاڑس ستر میخ اکھاڑ پھینکیں۔

لب سال بردم دریں سال سی
عجم زندہ کردم دریں پارسی

......

کنوں جنگ سہراب و رستم شنو
دگرہا شنیدستی ایں ہم شنو

بقول علامہ شبلی۔ فردوسی نے ایں ہم سے جو بات کہی
ہے وہ ہزاروں تمہید سے بھی پیدا نہیں ہو سکتی

رستم کی بہادری

بروز نبرد آں یل ارجمند
بہ شمشیر و خنجر بہ گرز و کمند
درید و برید و شکست و ببست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست

مبالغہ کا شعر انیسؔ کا بھی نقل کیا جا چکا ہے۔

زبس گرد میداں کہ برشد بدست
زمیں شش شد آسماں گشت ہشت

بقول عبدالسلام ندوی۔ انیسؔ کا یہ شعر بھی بےمثال بلکہ صرف پہلے مصرع کا جواب مشکل ہے۔

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے
ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے

معذرت

یہ آدھا ادھورا مقالہ لکھنے والے کے لیے بلائے جان ہو گیا تو پڑھنے والے (جو بھی دو چار ہوں) وہ بھی عاجز آگئے ہوں گے۔ فردوسیؔ کے دربار و باغات شاہوں کے محل و حرم کی چاندنی اور سب سے زیادہ فردوسی کی نظر میں عورت کی عزت اور اس کی عفت و عصمت کا تحفظ منیژہ دختر افراسیاب و بیژن گیو کا بیٹا اور رستم کے بھانجے کے عشق و محبت و ایثار کا قصہ رودابہ و زال کا والہانہ پیار تہمینہ و رستم کی چاہت ایک فارسی سے آشنا فرد کے لیے بیحد دلچسپ موضوع ہیں کہیں کہیں اس میں مثنوی سحرالبیان کی بھی جھلک مل جاتی ہے۔ ان سب عیش و لذت کی باتوں اور شب و روز کے بوس و کنار میں وہ عورت کو ہمیشہ پاکدامن رکھتا ہے اور اسے صاف و تحریر بیان بھی کرتا ہے۔

شعر ملاحظہ کیجئے۔

ہمہ بود بوس و کنار و نبید
مگر شیر کو گور را نشکرید

یہ شراب و شباب کا قصہ چلتا رہا مگر دیکھو کہ شیر نے گورخر کا شکار نہیں کیا۔ یہی حال فردوسی کا ہر رزمائی داستان میں ہے۔

انیسؔ کے سامنے مخدرات عصمت و طہارت اور اس کی پاک و مقدس کنیزیں اور ان کی بہادر اولاد تھی اس لیے انھوں نے اپنی عظیم شاعری کے وسیلہ سے پہلے تو ان سب کی دلاوری و بےخوفی دکھائی جو رزمیہ شاعری کے لوازم میں ہے۔ دوسری طرف بھائی بہن، چچا، بھتیجی باپ بیٹی، میاں بیوی، ماں بیٹے، بھائی بھتیجے، بھانجے اور دیگر قریبی اعزا میں خواتین کربلا کے کردار کو ایسا سنوار سجا کے اپنی شاعری میں پیش کیا کہ وہ کوئی اور (مرزا دبیر کے سوا) نہ پیش کر سکا۔ انھوں نے حسینؑ و زینب کے کردار کو عرف عام کا محاورہ بنا دیا۔

زینب سی بہن ہوگی نہ شبیر سا بھائی

تفصیلات کلام انیسؔ میں ملیں گی۔ یہاں عورتوں کے احترام میں فردوسیؔ کا ایک شعر اور سن لیجئے۔

از صاحب کرم چہ توقع کنند باز
از ناکساں کہ دست بر اہل حرم زنند

مصور تصویر کا ہر رخ نمایاں کر کے نہیں دکھاتا تاہم اس سے وہی تاثر پیدا کر سکتا ہے جو اصل چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ انیسؔ کا فن اس سے بھی آگے ہے۔ سبزہ و شبنم دیکھ کر وہ اثر کہاں پیدا ہوتا ہے جو انیسؔ کے اس شعر سے

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

بقول محمد حسین آزاد انیسؔ نے ثابت کر دیا کہ حقیقت و تخیلاتی شاعر ہم ہیں کہ ہر رنگ بےخیالی اور ہر حال میں ہم

اپنے الفاظ کے جوڑ بند سے ایسا طلسم باندھ دیتے ہیں کہ چاہے رلا دیں چاہے ہنسا دیں اور چاہیں تو حسرت کی مورت بنا دیں۔ محاکات میں یہ ضروری ہے کہ جب کسی ملک و قوم یا کسی مرد یا بچہ کی حالت بیان کرنی ہو تو اس کی تمام خصوصیات، حرکات و سکنات لہجہ و زبان کا لحاظ رکھنا بلکہ اسے بعینہ ادا کرنا چاہئے ۔

چلاتی سکینہ کہ اچھے میرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہہ دو اب کہیں خیمہ کریں بپا
ٹھنڈی ہوائیں لے چلو ہوں تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ نہ چشمہ نہ آب ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت خراب ہے

بیٹی فاطمہ صغریٰ بیمار ہیں۔ امام حسین مجبور ہیں مشیت الٰہی ہوگی اس لیے وہ سفر از مدینہ تا کربلا میں ان کو نہ لانے کا اعلان کر چکے ہیں۔ فاطمہ صغریٰ پر بجلی گر پڑتی منتیں سماجتیں کرتی ہیں دیکھئے۔ انیس کی محاکات کا جمال بیٹی امام سے کہتی ہے۔

وہ بات نہ ہوگی جو پریشان ہو مادر
ہر صبح دوا اپنی لوں گی خود آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

مماثلت

فردوسی و انیس میں اگر مماثلت کی بات کی جائے تو سب سے بڑی مماثلت یہ ہے کہ فردوسی کے بعد سب کو علانیہ نظر آیا کہ اب مثنوی کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے اس لیے مثنوی تو کسی نہ کسی حال میں رہی مگر رزمیہ مثنویاں بند ہو گئیں البتہ نظامی اپنے زور طبع پر قابو نہ پا سکے اور ہمت نہیں ہاری سکندر نامہ لکھا جو بلاشبہ اپنے طرز میں لاجواب ہے لیکن رزمیہ یا واقعہ نگاری شاہنامہ پر ختم ہو گئی۔ ہفت پیکر ہشت بہشت اخلاقیات میں بوستاں حدیقہ سنائی پھر تصوف و فلسفہ میں مثنوی مولانا روم بہت نامور ہوئے مگر رزمیہ مثنوی تقریباً ختم ہو گئی۔ بڑے شاعر فردوسی کے زمانے میں بھی تھے بعد میں بھی ہوتے رہے اور بقول ظ انصاری۔ فارسی زبان میں ہر ڈھائی سو برس بعد ایک نہ ایک شاعر پیدا ہوتا رہا بالکل یہی انیس کے بعد اردو مرثیے کا حال ہوا۔ اس نے علالت کی چادر اوڑھ لی۔ اس کے بعد نفیس، عارف، اوج، مونس، عشق و تعشق اور دیگر کئی استاد نامور شاعر بیسویں صدی تک اس کی چارہ گری و تیمارداری کرتے رہے یہ سلسلہ آج بھی بند نہیں ہوا ہے۔

مبالغہ فردوسی کے یہاں مبالغہ ہے مگر اصلیت کے اثر سے خالی نہیں۔ انیس کا کلام بھی اس کا بہتر نمونہ پیش کرتا ہے۔

حملہ غضب ہے بازوئے شاہ حجاز کا
لنگر نہ ٹوٹ جائے زمیں کے جہاز کا
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

:- فردوسی :-

ز لشکر برآمد سراسر خروش
زمیں پر خروش ہوا پر خروش
جہاں لرز لرزاں شد و دشت و کوہ
زمیں شد نہ نعل سواران ستوہ
درفش از درفش و گروہ از گروہ
گستہ لشہ شب بر آمد ز کوہ

عشقیہ شاعری کا زوال۔ فردوسی کے بعد عشقیہ

شاعری کا ایران میں زوال شروع ہوا اور بڑھتا ہی رہا انیسؔ نے مرثیہ نگاری کے جاہ و جلال سے اردو ادب کو معراج کی منزل تک لائے اور مرثیہ نے غزل کو مات دے دی۔ اور غزل سے بہتر نظم نگاری مانی جانے لگی۔

مماثلت و مفارقت

دونوں عظیم شعراء نے مشترکہ طور پر

۱۔ درس توحید و پابندیٔ دین و مذہب دیا ہے

۲۔ دونوں نے درس حکمت و موعظت دیا ہے

۳۔ ہر دو نے محبت اخلاق کا پیغام دیا ہے۔

۴۔ دونوں نے عاجزی خاکساری، فروتنی کو بلند درجہ دیا ہے۔

۵۔ فردوسی و انیسؔ کسی نے طمع دنیا نہیں کی نہ اسے مستحسن کہا۔

۶۔ تہذیب، تمدن، رسوم شادی و مرگ کا سلسل ذکر دونوں کے یہاں ملتا ہے۔

۷۔ جنگ و حرب و ضرب۔ تلوار، گھوڑے کی تعریف کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فردوسی کے دو اشعار دیکھئے۔

بروز نبرد آں یل ارجمند
بہ شمشیر و خنجر بگرز و کمند
درید و برید و شکست و بہ بست
یلاں را سر و سینہ و پا و دست

انیسؔ کے یہاں اس کی مثال بہت ہے مگر گنجائش بیان نہیں (کلام انیسؔ دیکھئے)

۱۰۔ عشقیہ داستانوں سے کلام انیسؔ خالی ہے لیکن اعزہ و اقرباء کی مودت کی ہر موقع پہ بہترین کشتی کی گئی ہے۔

۱۱۔ نظام حکومت۔ دربار کے آداب وغیرہ سے مراثی انیسؔ سے تعلق میں اور فردوسی نے انہی موضوعات پہ اپنے فن و ہنر کو انڈیل دیا ہے۔

۱۲۔ ایرانی بہادروں کے فردوسی نے بہت سے نام گنائے ہیں۔ اس میں کچھ مراثی انیسؔ میں بھی ہیں بقیہ مماثلت و نامطابقت پڑھنے والوں کی کوششوں و طاقت پہ چھوڑتا ہوں کیونکہ مقالہ بیحد طویل ہو گیا ہے اگرچہ اپنے حدود تعریف سے باہر نہیں۔ شکریہ۔

◇◇

صفحہ ۱۶۲ کا بقیہ

میں آنا یا آخری بند میں صفیں، صاف، صفائی، کج ادائی لڑائی، کاٹ، چھانٹ، لگاوٹ، دکھائی، خون کرنا، آنا جانا جان لینا، برق، جلوہ گری کی معنویت یا ان بند کی رعایتوں صنعتوں کی تفصیل کا موقع نہیں ہے لیکن اس سے یہ سمجھنا

کہ میر انیسؔ کی زبان بہت سادہ ہے درست نہیں ہوگا وہ فارسی و عربی الفاظ کا بلا تکلف استعمال کرتے ہیں اور ان کی صنعتیں، فہم کامل کا مطالبہ بھی کرتی ہیں لیکن ان کی ایک صفت ایسی ہے جو ان کو اردو کے تمام شعراء میں

کرتی ہے یعنی وہ لفظ کی نبض پہچانتے ہیں مشکل الفاظ ہوں یا نامانوس الفاظ، فارسی و عربی کے لفظ ہوں یا اودھی و ہندی کے الفاظ۔ وہ موقع محل اور معنوی و لفظی رعایتوں کے ساتھ اس طرح ان کا استعمال کرتے ہیں کہ نہ وہ اجنبی

محسوس ہوتے ہیں اور نہ ادراک معنی میں رکاوٹ بنتے ہیں اسی لیے انیسؔ کے مرثیے جمالیاتی اعتبار سے فنکاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

◇◇

ڈاکٹر شارب ردولوی
سی ۹۵ سیکٹر سی۔ علی گنج لکھنؤ
8840038282

مراثیٔ انیسؔ کی جمالیات

جمالیات فلسفۂ حسن ہے یہ ایک چھوٹا سا لفظ فلسفہ کی دنیا میں اپنی ابتدا سے آج تک بحث کا موضوع رہا ہے اور ابتک اس کی کوئی ایسی تعریف نہیں کی جا سکی جو سب کے لیے قابل قبول ہو چند حروف کا یہ مرکب اپنی وسعت میں پوری کائنات کا احاطہ کرلیتا ہے اور شاید یہی ایک لفظ ہے جس کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے خواہ وہ خالق قدرت کی تخلیق ہو یا ذہن انسانی کی۔ ایک بے جان لفظ کب رنگ و نکہت کی علامت بن جائے اور ایک بدرنگ و بدنما پتھر کب دلکش و دلفریب پیکر میں بدل کر جمالیاتی مطالعہ کا موضوع بن جائے۔

جمالیات ان احساسات میں ہے جو انسان کو جبلی طور پر ملے ہیں یہ بحث کہ حسن کیا ہے یا جمالیات کسے کہتے ہیں بہت قدیم ہے اور ہر زمانے میں بحث مباحثہ کا موضوع رہی ہے ہر فلسفی اور ماہر جمالیات نے اپنے نقطۂ نظر سے اس کی تعبیر و تشریح کی۔ عقلی دلائل نے اسے کچھ بتایا تو محسوسات اور وجدان نے اس کی کوئی اور تشریح پیش کی۔ شعرا اور صوفیوں نے اسے کسی اور رنگ میں دیکھا۔ تصوّر پرستوں کے لیے حسن صرف ایک تصوّر ہے تو مادہ پرست تناسب و توازن سے اس کی تعریف کرتے ہیں اور اخلاق پرست خیر محض نام دیتے ہیں۔ ان فلسفیانہ مباحث میں الجھے بغیر اگر زبان و ادب کی حد تک اس کے معنی اور مفہوم کے تعیّن کی کوشش کی جائے تو جمالیات فن میں حسن اور خوبصورتی کا مطالعہ ہے لیکن جمالیاتی مطالعہ کا احاطہ بہت وسیع ہے جہاں تک زبان و ادب کا تعلق ہے اس میں فن کے تمام محاسن، آرائش زبان، بیان کی خوبی، تشبیہ و استعارے کی آراستگی، دلکش اور حسین پیرایۂ اظہار، تخیل کی بلندی مسرّت و حظ کی بازآفرینی سب آجاتے ہیں۔

میر انیسؔ کا شمار اردو کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے لیکن وہ اس لیے بڑے شاعر نہیں ہیں کہ انھوں نے لاکھوں اشعار کا ذخیرہ چھوڑا بلکہ اس لیے سب سے بڑے مرثیہ گو ہیں کہ انھوں نے مرثیہ کو زبان و اظہار کا اعلیٰ نمونہ بنادیا۔

میر انیسؔ نے ہمیشہ اپنی زبان پر فخر کیا کبھی اسے خلیق کی زبان کہہ کر کبھی یہ کہہ کر کہ اس احاطہ سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے۔ ان کا یہ دعویٰ اس عہد میں بڑی جرأت کی بات تھی۔ وہ ناسخ اور آتش کا عہد تھا اور

بات پر واں زبان کٹتی تھی

انیسؔ کو خلیق نے ناسخ کی شاگردی کے لیے بھیجا تھا ان کا تخلص بھی ناسخ کا عنایت کردہ تھا۔ اس کے باوجود انیس نے ناسخ یا اس عہد کی زبان کا اثر قبول نہیں کیا اور اشرافیہ میں مقبول زبان کے بجائے اپنے گھر کی زبان کو شعری اظہار کا ذریعہ بنایا۔ میر انیسؔ کی پیدائش و پرورش

فیض آباد میں ہوئی جہاں کی زبان اودھی تھی یہی اودھی ان کے گھر کی زبان رہی ہوگی۔ ان کے ادبی اظہار کی زبان میر حسن کی زبان تھی جو خلیق سے ہوتی ہوئی میر انیس تک پہونچی تھی۔ انیس خلیق کی جس زبان پر ناز کرتے ہیں وہ دراصل کئی پشتوں کے لسانی کلچر کی دین ہے۔ انیس کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے بات چیت کی زبان کو اعلیٰ جمالیاتی اظہار کی زبان بنا دیا۔ اس عہد کے دو شاعروں کے لسانی کارنامے یا اجتہاد کو تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ ایک غالب جس نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا اور دوسرے انیس جس نے مرثیہ کے ذریعہ مکالمہ کو جمالیاتی اظہار کا اعلیٰ نمونہ بنا دیا۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ انیس کے مرثیوں کے بیشتر حصے مکالمے پر منحصر ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے مرثیوں میں یہی فرق ہے کہ دبیر اپنی مضمون آفرینی پر مرثیے کی بنیاد رکھتے ہیں اور انیس فارسی و عربی کے بے تکلف استعمال کے باوجود زبان و اظہار کے جمالیاتی عناصر سے مرثیے کو ایک خوبصورت ادبی فن پارے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

مرثیے کا میدان واقعہ کے لحاظ سے محدود ہے جس میں شاعر نہ کوئی تبدیلی کر سکتا ہے اور نہ اضافہ جبکہ اس کے مقابلہ میں دوسری اصناف سخن میں جولانیٔ طبع کے جوہر دکھانے کے بے شمار مواقع ہیں۔ انیس اس محدود فضا میں وسعت پیدا کرنے کے لیے زبان کو اسلحہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ شاعروں میں انتخاب الفاظ اور ان کے محل استعمال پر شعری جمالیات کی بنیاد ہے۔ اگر شاعر موقع و محل کی مناسبت اور موضوع کے تقاضے کے مطابق الفاظ کا انتخاب نہیں کرتا تو وہ الفاظ خواہ کتنے ہی علمی، پُر مغز اور بھاری بھرکم کیوں نہ ہوں جمالیاتی کیف و تاثر پیدا نہیں کر سکتے۔ میر انیس کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسے برمحل الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں کہ واقعہ نگاہوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

میر انیس زبان کے ان نکات سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے مرثیے کی فنی جمالیات کے اپنے کچھ اصول تھے جس میں فن، زبان، اظہار، حسن ادا سب شامل ہیں اور آج تک ان اصولوں کو کلاسیکی مرثیہ کے مطالعہ میں بوطیقا کی حیثیت حاصل ہے ؎

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

ان چند مصرعوں میں میر انیس نے مرثیے کی تمام جمالیاتی خصوصیات کی نشان دہی کر دی ہے۔ زبان میں سلاست اور روزمرہ زبان کے حسن اور ترسیل کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح صنعتوں کو شاعری کا زیور قرار دیا گیا ہے۔ اشعار میں صنعت دلکشی پیدا کرتی ہے لیکن اگر صنعت مغلق اور سمجھ میں آنے والی نہ ہو تو حسن کے بجائے ابہام کا سبب بن جائے گی۔ لکھنؤ میں اس زمانے میں رعایت لفظی اور صنعتوں کے استعمال کا بڑا زور تھا۔ میر انیس نے بھی صنعتوں اور رعایت لفظی سے کام لیا ہے لیکن صرف اس حد تک کہ جہاں وہ فطری اور بے ساختہ ہوں۔ الفاظ کا چست ہونا اور موقع کے مطابق عبارت کا استعمال مرثیے کے جمالیاتی عناصر میں ہے۔

میر انیس کے یہاں انتخاب الفاظ اور اس کے محل استعمال کی بڑی اہمیت ہے اور یہ مرثیے کا ایک بڑا نازک پہلو ہے اس لیے کہ مرثیے میں طرح طرح کے کردار

ہیں اور میر انیسؔ نے ان کرداروں کی عمروں، ان کے رشتوں عہدوں اور تعلق کو نگاہ میں رکھ کر ہر ایک کے لیے مختلف زبان وضع کی ہے۔ ایک ایسی زبان جو تہذیبی اقدار کی بھی نمائندگی کرتی ہے مثلاً یہ بند دیکھئے۔ جس میں ایک بڑے واقعہ کو نظم کیا گیا ہے یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب امام حسینؑ کا قافلہ فرات کے کنارے خیمے نصب کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ یزیدی فوج کے سپاہی دریا کے کنارے خیمے نصب کرنے سے روکتے ہیں جس پر بلوے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔

آغوش میں پھوپھی کے سکینہ دہل گئی
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی
محمل سے منہ نکال کے فضہ نے یہ کہا
بلوہ کنار نہر ہے اے بنت مرتضیٰ
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا
قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباس باوفا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو
سب دشت کو بچتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

یہاں پر واقعہ کا بیان ایک کنیز کی زبان سے کیا گیا ہے اس لیے جناب زینب کا نام لینے کے بجائے بنت مرتضیٰ کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔ جو اس عہد کی تہذیب کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بند گو کہ صرف ایک اطلاع کے لیے تھا لیکن میر انیسؔ نے درجہ بدرجہ ماجرے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے بند سے پہلے کی بیت میں اس ہنگامے سے پیدا ہونے والی دہشت کا بیان ہے کہ آغوش میں پھوپھی کے سکینہ دہل گئی / غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی۔ اور پھر فضہ کا محمل سے منہ نکال کر دیکھنا اور واقعات کی تفصیل کو بیان کرنا کہ اے بنت مرتضیٰ نہر کے کنارے بلوہ ہو گیا ہے اور پھر اس کے ایک ایک پہلو کو الگ بیان کرنا کہ اشقیا نیزے بڑھا بڑھا کر جوانوں کو ہٹا رہے ہیں اس کے بعد ایک تیسری تصویر ہے جو دل میں نہ جانے کتنے وسوسے پیدا کرنے والی ہے کہ عباس کا ہاتھ تلوار کے قبضہ پر ہے یعنی بس غضب ہونے والا ہے اور پھر پورے ماحول کی تصویر کشی ہے۔

سب دشت کو بچتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

جو دوسرے مصرعہ بلوہ کنار نہر ہے اے بنت مرتضیٰ سے مختلف ہے اس میں صرف بیان واقعہ تھا اور اس تصویر میں تاثر، ہیبت، خوف، جرأت و دبدبہ اور توصیف سب ہے۔

میر انیسؔ کے مرثیوں میں جمالیاتی عناصر کے جائزے میں جو بات شدت سے اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ منظر یا واقعہ کی تصویریں اور تشبیہات اور استعارات کا التزام ہے۔ جن سے ان تصویروں میں وہ رنگ آمیزی کا کام لیتے ہیں مثلاً یہ بند دیکھئے جس کا ہر مصرع ایک تصویری اکائی ہے اور جس کے چھ مصرعے مل کر تصویروں کی ایک خوبصورت سمفنی بناتے ہیں۔

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہر ہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

میر انیسؔ نے اس بند میں بڑی خوبصورتی سے صبح کی مختلف کیفیتوں کی تصویروں سے ایک بڑی تصویر تخلیق کی ہے۔

جمالیات کی تعریف کرتے ہوئے ہیگل نے لکھا ہے کہ حسیاتی صورتوں یا وسائل کے ذریعہ تصور کے اظہار کا نام حسن ہے اور کروچے اسے خطا انگیز اور ذات کا

کامیاب اظہار قرار دیتا ہے۔ اس روشنی میں اگر مراثی انیس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ دونوں پہلو کے مرثیوں میں نمایاں طور پر نظر آئیں گے۔ بظاہر مرثیے اور خط انگیزی میں تضاد محسوس ہوتا ہے اس لیے کہ مرثیہ تعزیت اور غم کا اظہار ہے اور خط مسرّت کی نشاندہی کرتا ہے لیکن انیس نے مرثیہ میں ایسے بے شمار مواقع پیدا کئے ہیں جنھیں پڑھ کر لطف و مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ صبح کے مناظر کا جہاں انھوں نے ذکر کیا یا تلوار کی تعریف، جنگ اور سراپا کے بند کی رنگین بیانی احترام و مسرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ کربلا میں رخصت کا منظر بہت اندوہناک ہے۔ ایک ایسی رخصت جس کے بعد زندہ واپسی کا کوئی انتظام نہیں۔ خود انیس نے رخصت کے مناظر بڑے رقّت آمیز رنگ میں نظم کئے ہیں لیکن جہاں انھوں نے چاہا ہے اسے مسّرت و انبساط میں تبدیل کر دیا ہے۔ امام حسینؑ کی میدان جنگ کو روانگی کے منظر میں کس طرح دلکشی پیدا کی ہے اس بند میں ملاحظہ کیجیے ؎

بیٹھے جو آپ تن کے فرس برق ہو گیا

بوئے بہشت لے کے نسیم سحر چلی
آگے فرس کے فتح تو پیچھے ظفر چلی
خود سر پہ چتر بن کے ضیائے قمر چلی
گھوڑا چلا کہ فتح کی گویا خبر چلی
غرفوں سے حوریں دیکھتی تھیں شہ سوار کو
پریاں طبق لیے تھیں سروں پر نثار کو

درجِ دہن پہ لعل و عقیق و یمن نثار
غنچے نثار پھول تصدق چمن نثار
حسنِ بیاں پہ طوطیِ شکر شکن نثار
شور نمک پہ شاعرِ شیریں سخن نثار
فقروں میں لطف باتوں میں لذت بھری ہوئی
قرآں کی طرح سے فصاحت بھری ہوئی

ان بند کو حسن بیان اور صنائع لفظی و معنوی نے اعلیٰ شعری اظہار کا نمونہ بنا دیا ہے۔ اسی طرح تلوار کے بیان میں میر انیس نے جو حسن اور تغزل پیدا کیا ہے اور جس طرح کی تشبیہات اور استعارات وضع کئے ہیں وہ خط انگیز ہی نہیں بے مثال ہیں ؎

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ جو جدا
جیسے کنارِ شوق سے ہو خوب رو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا رگ جاں سے گلو جدا
گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

تلوار کی تعریف میں ایک بند اور ملاحظہ کیجئے

دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہے دھارا جیسے
گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارہ جیسے
روشنی تھی کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کوندنا برق کا شمشیر کی ضو نے دیکھا
مگر ایسا تو نہ دم خم مہِ نو نے دیکھا

ان بندوں میں خوبصورت تشبیہات، تغزل حسن الفاظ اور رعایت لفظی کے بیساختہ استعمال نے مل کر خط انگیز فضا تعمیر کی ہے۔ دراصل یہ سارا معاملہ قدرت زبان اور قدرت اظہار کا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عہد انیس میں دوسرے شعرا زبان پر قدرت نہیں رکھتے تھے لیکن میر انیس کے یہاں زبان کا جو تخلیقی ادب اور بے تکلف استعمال ہے رعایتوں اور صنعتوں میں جو بیساختگی ہے وہ ان کی انفرادیت ہے۔ وہ کسی لفظ، محاورے یا صنعت کے لیے کوئی اہتمام نہیں کرتے یہاں تک کہ بعض ایسے الفاظ جنھیں غیر فصیح سمجھا جاتا ہے انھیں بھی نظم کرنے سے نہیں جھجکتے جبکہ وہ اس عہد زبان میں سے کسی رعایت کو روا نہیں رکھتا۔

ایم ایم شریف نے فن اور فنکار کے بارے میں ارسطو کے حوالے سے لکھا ہے کہ۔

"فنکار موجودہ حسن کو محض فروغ ہی نہیں دیتا بلکہ اکثر معمولی مواد سے اور جیسا کہ خود ارسطو کو علم ہے کہ بھدے مواد سے بھی حسن تخلیق کرتا ہے چنانچہ پوری پڈیز کی میڈیا تخلیق حسن کی ایک اعلیٰ مثال ہے"
(جمالیات کے تین نظریے)

میر انیس اکثر ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو غیر فصیح ہیں یا جنھیں سوقیانہ الفاظ سمجھ کر شاعری میں استعمال نہیں کیا جاتا اور یہ زبان اور اس کی تخلیقی اظہار پر ان کی قدرت کی مثال ہے مثلاً۔

کرتا تھا سائیں سائیں وہ صحرائے لق و دق
تھے بسیوں کے صورت مہتاب رنگ فق
دم گھٹتے تھے اندھیروں سے بچوں کو تھا قلق
آواز سے درندوں کے ہوتے تھے سینے شق
مائیں انھیں سلاتی تھیں منہ ڈھانپ ڈھانپ کے
سینوں میں پٹتے جاتے تھے وہ کانپ کانپ کے

یا دوسرا بند ہے ؎

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر
کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر
دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اجاڑ تھا
ایک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا

ان بند میں اجاڑ پہاڑ، دق، فق، قلق اور شق کے قافیے صوتی اعتبار سے ناگوار کیوں نہ محسوس ہوں لیکن میر انیس نے ان آوازوں سے ہیبت اور وسعت کا تاثر پیدا کیا ہے اور روزمرہ محاورے سے سائیں سائیں کرنا اندھیرے سے دم گھٹنا، منہ ڈھانپ ڈھانپ کر سلانا، بچوں کا ڈر سے سینوں سے لپٹ جانا ایسی چیزیں ہیں جو ہر انسان کے تجربے کا حصہ ہیں اس سے انھیں سن کر وہ اسے زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے اور میر انیس عام بولیوں اور روزمرہ کے الفاظ استعمال کر کے اسی احساس قربت کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ میر انیس نے اس سلسلہ میں ایسے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں جو اردو شاعری میں ان سے پہلے استعمال ہی نہیں ہوئے لیکن ان کی خوبی یہ ہے یہ ہے کہ جہاں پر وہ استعمال ہوئے ہیں وہاں کسی طرح کی غرابت یا نامونوسیت کا احساس نہیں ہوتا۔ میر انیس اس طرح کے نامانوسی الفاظ سے بھی لسانی و معنوی حسن پیدا کرتے ہیں۔ ذیل کے بند میں بعض ایسے الفاظ انیس نے استعمال کئے ہیں جو اودھی یا عام بول چال کے ہیں۔ لیکن انھیں پڑھتے وقت یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ اردو کے شعری ذخیرۂ الفاظ سے باہر کے ہیں۔

معجز نما تھی شاہ کی شمشیر آبدار
دکھلائی ماہ صیف میں برسات کی بہار
یاں برق واں ہوا تو ادھر ابر رود بار
بہیا کہیں لہو کی کہیں خوں کی آبشار
یوں سر برس گئے یہ رواتی تھی باڑھ میں
پڑتا ہے ڈونگرا کبھی جیسے اساڑھ میں

اس بند میں اساڑھ ہندی مہینے کا نام ہے اور عوام کی بولی کا لفظ ہے بہیا، باڑھ۔ ڈونگرا یہ تمام الفاظ اودھی اور ہندی کے ہیں۔ میر انیس نے باڑھ بمعنی تلوار کی دھار اور بمعنی سیلاب دونوں طرح نظم کیا ہے۔ یہاں پر تیزی اور دھار کے معنوں میں ہے لیکن اس کے ساتھ رواتی اور سر برسنے کی رعائت سے سیلاب کا تاثر بھی پیدا کیا ہے۔ ایک اور مصرعہ میں اسی لفظ سے سیلاب کی کیفیت کو اس طرح پیش کیا ہے۔

شہ کہتے تھے ہے باڑھ پہ دریا نہ رکے گا

ایک اور بند میں روزمرہ رعائت لفظی اور صنعتوں کی بے ساختگی دیکھئے۔ زبان کا یہ استعمال کوئی غیر معمولی فنکار ہی کر سکتا ہے ؎

پہنچی جو سروں تک تو کلائی کو نہ چھوڑا
ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شرارت کو لڑائی کو نہ چھوڑا
تیزی کو رکھائی کو صفائی کو نہ چھوڑا
اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

پہلے گھائی اور رکھائی کے الفاظ دیکھئے جو عوامی زبان کے الفاظ ہیں اور شاید اس وقت لکھنؤ کی عام زبان میں بھی مستعمل نہیں رہے ہوں گے اس لیے کہ اودھی اور دیہاتی بولیوں میں ہی ایسے الفاظ بولے جاتے تھے پہلے مصرعہ میں پہنچی اور کلائی کی رعایت۔ پہنچی ایک زیور ہے جو دیہاتی عورتیں بازوؤں پر پہنتی ہیں۔ اسی طرح رکھائی رو کھا پن بھی ہے اور بخاری کا ایک اوزار بھی ہے اور چوتھے مصرعے میں دو محاوروں کا استعمال قینچی کی طرح زبان کا چلنا اور فقرے کسنا ایک عجیب لطف پیدا کرتے ہیں۔

میر انیسؔ کے مرثیوں میں رعایتوں، محاوروں اور روز مرہ کا استعمال بڑی خوبصورتی سے ہوا ہے۔ بعض ناقدین رعایت لفظی کے استعمال کو اچھا نہیں سمجھتے لیکن میر انیسؔ کی رعایت کے لیے محاورہ استعمال نہیں کرتے۔ وہ رعایت لفظی سے لفظی و معنوی صنائع پیدا کر کے شعر کی معنویت اور دلکشی میں اضافہ کرتے ہیں اس لیے ان کے یہاں مناسبت لفظی ایک جمالیاتی حسن ہے۔ مثلاً ان بند میں رعایتوں اور محاوروں سے معنوی تہہ داری اور صوتی آہنگ ملاحظہ کیجئے۔
اشعار دیکھئے۔

نہ وہ آنکھیں نہ وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج
سیدھی باتوں میں بگڑتا یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج
جن کو سمجھا ہے غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

اس کے علاوہ ایک دوسرے مرثیہ کے یہ بند دیکھئے ؎

سر ٹپکے تو موج اس کی روانی کو نہ پہنچے
قلزم کا بھی دھارا ہو تو پانی کو نہ پہنچے
بجلی کی تڑپ شعلہ فشانی کو نہ پہنچے
خنجر کی زباں تیغ زبانی کو نہ پہنچے
دوزخ کی زبانوں سے بھی آنچ اس کی بری تھی
برچھی تھی، کٹاری تھی، سروہی تھی چھری تھی

جلوہ کیا بدلی سے نکل کر پر نو نے
دکھلائے ہوا میں دو سرا اک شمع کی لو نے
تڑپا دیا بجلی کو فرس کی تگ و دو نے
تا کا سپر مہر کو شمشیر کی ضو نے
اعدا تو چھپانے لگے ڈھالوں پہ سروں کو
جبریل نے اونچا کیا گھبرا کے پروں کو

رعایت زبان روزمرہ اور محاورے کا لطف اس بند میں دیکھئے ؎

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی
کج ادائی کو نہ چھوڑا وہ لڑائی نہ گئی
کاٹ چھانٹ اور وہ لگاوٹ وہ رکھائی نہ گئی
سیکڑوں خون کئے اور کہیں آئی نہ گئی
شور تھا برق پئے جلوہ گری نکلی ہے
جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

یہاں پر آنکھیں، چتون، تیور، مزاج، سیدھی باتوں میں بگڑنا تخت، تاج، غنی، محتاج، باغ دکھلانا، چھینٹوں

(بقیہ صفحہ ۱۵۶ پر)

علی اصغر الحیدری
۲۰۶ جہلم ہاسٹل۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی
9968616032

موازنۂ رباعیات انیس و خیامی

(بے ثباتی دنیا کے حوالے سے)

تاثیر و تاثر اور اخذ و استفادہ ہر زندہ ادب میں ایک تاریخی نوعیت کا حامل باب رہا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ادبی سرمایہ اس سے بے فیض اور نا آشنا نظر نہیں آتا فارسی اور اردو ادب میں بھی تاثیر و تاثر کا یہ خاص باب ابتدا سے ہی چلا آ رہا ہے اردو کا ساختیاتی ماخذ اس کے محاورے اصطلاحیں، کلمے اور شعری اسلوبیات و قوالب فارسی ہی سے اخذ کرتا ہے بلکہ بعض مقامات پر فارسی ادب کے نقوش لیتے گہرے اور عمیق نظر آتے ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے ترجمہ کے قالب میں ہم نے اس کے مضامین و قوالب کو اپنا لیا ہے یہ الگ بات ہے کہ آج اردو کا ادبی سرمایہ بڑے افتخار کے ساتھ عالمی ادب کے مقابلہ میں کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے شاید یہ اخذ و استفادہ ہی وہ مرکزی شاہراہ ہے جہاں پر کسی بھی زبان کا ادب بہت ہی سرعت رفتار کے ساتھ ترقیاتی منازل اور ارتقا انداز پیش رفت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اردو ادب کے بے شمار ایسے اشعار ہیں جن پر ترجمہ کا گمان ہوتا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ اشعار ان فارسی اشعار سے ہی اخذ کرتا ہے علاوہ بریں متقدم اردو شعراء شعر و سخن کے ارتقا اور مزید توسیعی اضافے کی غرض سے فارسی دواوین کا مطالعہ کرتے اور ان کے مضامین میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ نئی آب تاب اور لب و لہجہ میں پیش کرتے تھے یہی سبب ہے کہ مضامین اور محتویات میں باہمی اشتراکی نقاط کی سطح بہت زیادہ ہے لیکن اسے صرف "اخذ و استفادہ" ہی کی نگاہ سے دیکھنا چاہئے مثلاً غنی کشمیری (م-۱۶۶۸) کا یہ شعر ہے۔

گشت چوں رشتہ عمر کوتاہ
معنی سال گرہ فہمیدم
(۱)

اس فارسی بیت کا یہ رباعی ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔

دل سے طاقت بدن سے کس جاتا ہے
آتا نہیں پھر کر جو نفس جاتا ہے
جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا
یاں اور گرہ سے اک برس جاتا ہے
(۲)

غنی کا شعر اختصار و سادگی کی عمدہ مثال ہے لیکن انیس نے اپنی رباعی میں عمر اور زندگی کے فنا کی جو تعبیر کی ہے وہ لسانی، فنی اور فکری لحاظ سے غنی کے شعر پر فوقیت رکھتی ہے۔ میر انیس نے لفظ 'سالگرہ'، سے 'گرہ'، اور 'گرہ سے عقدہ کھلنا'، کے تلازمات کا جو بر محل استعمال کر کے معنوی صورت پیدا کر دی ہے وہ غنی کشمیری "رشتۂ عمر" اور "سالگرہ" کے لفظ سے پیدا نہ کر سکے۔ اس طرح اگر زمانی اعتبار سے غنی کے شعر کو تقدم حاصل ہو سکتا ہے

لیکن معنی اور مطالب کی وسعت کے لحاظ سے میر انیس کا شعر "و بلاغت" کی بہترین مثال ہے۔

بہرحال میر انیس اردو کے وہ رکن رکین ہیں جن سے اردو ادب لسانی اور موضوعی اعتبار سے پُر مایہ ہوتا رہا ہے انیس ایک طرف جہاں مراثی کے حوالے سے یکتائے روزگار سخن سرا ہیں وہیں دوسری طرف رباعی گوئی میں بھی فلسفیانہ مسائل اور اعتقادی نکتہ آفرینی کے حوالے سے ایک نئی طرز کے موجد ہیں۔ اس سلسلہ میں امداد اثر امام کی یہ بات قابل غور ہے۔

انیس اور دبیر نے اردو رباعیوں کی شرم رکھ لی " (۳)

ڈاکٹر محمد حسن کا یہ قول بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ۔

" انیس کی رباعیوں نے اردو ادب میں ایک بلند مرتبہ پایا ہے ان میں سیدھی سادی باتیں بڑے تیکھے پن سے کہی گئی ہیں۔ جو دل سے نکلتی ہیں اور دل میں اتر جاتی ہیں۔ رباعی کی صنف خاصی مشکل ہے کہ مخصوص بحروں کے چار مصرعوں میں ایک جہان معنی کو سموتی ہے نہ اس میں غزل کا سا اختصار ہے کہ محض کیفیت کے اظہار پر قناعت کرے اور صرف تاثر ہی کو ادا کرنے پر قناعت کرے نہ نظم کی سی وسعت ہے کہ کسی مقدمہ کو منطقی ربط کے ساتھ بیان کرے اس میں تو غزل کا اختصار بھی ہے اور نظم کا سا ربط بھی ہے پھر بحر متعین اور مصرعے فقط چار۔ علاوہ بریں اس صنف میں ایسے ایسے اکابر طبع آزمائی کر کے نام کما چکے ہیں کہ ان سے آگے قدم بڑھانا سخت دشوار تھا مگر انیس نے یہاں بھی اپنی عظمت کا سکہ منوایا اور رباعی میں اپنا نام ہی نہیں اپنی چھاپ بھی چھوڑ گئے انیس کے نام سے رباعی کا جو مخصوص رنگ آہنگ پہچانا جاتا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔" (۴)

اگر منصفانہ نظر سے دیکھا جائے تو اردو رباعی کو میر انیس نے بعض نقاط پر خیامی کے رباعیات کے روبرو کھڑا کر دیا ہے۔ اس مقالے میں اسی تناظر سے ہم ان دو بزرگ شاعروں کا موازناتی مطالعہ پیش کر رہے ہیں۔

عمر خیام (د۔ ۴ر دسمبر ۱۱۳۱ء۔ م ۱۸ر مئی ۱۰۴۸ء) فارسی ادب کا وہ نامور شاعر ہے جس کی اثر گذاری سے شاید بہت کم ادبی سرمایہ محفوظ ہے رباعیات خیام کا تقریباً دنیا کی ہر زندہ زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ سرزمین ہند چونکہ فارسی زبان و ادب کا خود مرکز رہی ہے اس لیے رباعیات خیام کا اصل متن بدون ترجمہ ہی ہندوستان میں رائج رہا۔ اس بنا پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں عمر خیام کی شہرت ایڈورڈ فٹز جیرالڈ (۱۸۸۳۔ ۱۸۰۹) (۵) کی مرہون منت نہیں ہے عمر خیام کی اصل رباعیات کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن بعد کے شعراء نے خوب الحاق و اضافے کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں صادق ہدایت (۱۹۵۱۔ ۱۹۰۲) کا یہ قول معنی خیز ہے۔

اکثر رباعیات خیام کے غیر معتبر ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بے خوار شعراء تکفیر کے خوف سے اپنی رباعیات خیام کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔" (۶)

عمر خیام موجودہ دور میں حکیم، فلسفی اور ریاضی داں سے زیادہ لذت پرست (۷) اور عدمیت پسند (۸) شاعر کی حیثیت سے مشہور و معروف ہے اس حیثیت سے تعارف کا سہرا ان لوگوں کے سر بندھتا ہے جنھوں نے اپنی لذت پرستانہ اور عدمیت پسندانہ رباعیات کو عمر خیام کی طرف منسوب کیا۔

انھیں آوارہ رباعیات کی تحقیق و تفتیش میں مولانا عبدالباری آسی (۱۸۹۳۔ ۱۹۴۶) نے اپنی کتاب "رباعیات عمر خیام پر ایک تحقیقی نظر" (۹) میں عمر خیام سے منسوب رباعیات کے مآخذ و منابع تلاش کئے ہیں۔ اسی طرح علامہ محمد تقی جعفری (۱۹۲۳۔ ۱۹۹۸) نے "تحلیل شخصیت عمر خیام" (۱۰) میں خیام کی رباعیات کو چار قسموں میں تقسیم کیا ہے اور ان رباعیات کے علاوہ جو فلسفیانہ معیار پر اترتی ہیں مثلاً بے ثباتی دنیا اور گذران وقت ان تمام بقیہ رباعیوں کو معتبر اور مستند حوالوں سے رد کر دیا ہے۔

رباعیات خیام کے منجملہ موضوعات میں "بے ثباتی دنیا" خاص موضوع ہے جس پر اکثر محققین اور ناقدوں نے بھر

ہر اعتبار و سند ثبت کیے ہیں۔ دنیا کی بے وفائی اور گذران وقت
کے حوالے سے ادبی سرمایہ بہت ہی غنی واقع ہوا ہے لیکن عمر خیام
کی فلسفیانہ دقیقہ رس نگاہ اور ادراک نے اس موضوع پر خاطر خواہ
اضافہ کیا ہے یہی وہ خاص موضوع ہے جو میر انیس کے یہاں بہ
مختلف کیفیتوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس وقت باہمی موازنہ
سے یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کی رباعی مقابل رباعی
سے بلیغ انداز میں مطالب و معانی پیش کر رہی ہے۔

اردو ادب میں میر انیس جہاں اپنی مراثی کے حوالے سے
ممتاز اور اردو کے صف اول کے شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں
وہیں رباعیات کے حوالے سے بھی ادبی دنیا میں اپنا لوہا منوا
چکے ہیں۔ میر انیس کی رباعیات محتویات و مضامین اور ہیئت
و اسلوب کے لحاظ سے رباعیات عمر خیام سے مقابلہ کرتی نظر آتی ہیں۔
لیکن اس مقالہ میں ان رباعیات کے حوالے سے تطبیقی مطالعہ کیا گیا
ہے جن میں دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی کے مضامین پائے
جاتے ہیں اس لیے کہ دیگر مضامین میں کوئی وجہ اشتراک
بہر صورت نظر نہیں آتی ہے۔

اس تقابلی مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر انیس کے
مطالعہ میں خیام کی رباعیات رہی ہوں گی اور یہی وجہ ہے کہ ان
کے رباعیاتی سرمایہ پر کافی حد تک یہ رباعیاں اثر انداز بھی ہیں۔

علاوہ ازیں میر انیس کے دور میں خیام کی رباعیات کا اثر
دیگر مشہور شعراء پر نظر آتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ برتنے والے
شاعروں نے اس طرح کی رباعیات کے جواب بھی لکھے ہیں خود
میر انیس کے معاصر علامہ مفتی محمد عباس شوستری متخلص بہ سید
(۱۸۸۹ - ۱۸۰۹) نے بھی خیام کی ان رباعیات کا جواب رباعیوں
میں دیا ہے جو عدمیت پسندی، لذت گرائی، خوش گذرانی اور
تخصیص شراب خواری کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اس تقابلی
مطالعہ سے یہ بھی باور ہوتا ہے کہ میر انیس کی فکری مشرقیت
اور نبوغت ہنری نے اردو رباعیاتی دنیا میں وہ بیش قیمت
مضامین بھر دیے ہیں جن کے دم پہ اردو رباعیاں خیام کے رباعیات
پر ایک گوناگوں فوقیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

تقابلی مطالعہ

زندگی چاہے جتنی طویل ہو لیکن اس آغاز کا انجام بہر حال
متعین و مقدر کیا جا چکا ہے۔ دوسری دنیا میں داخل ہونے سے
پہلے زاد راہ اور توشہ کی ذخیرہ اندوزی ہر صاحب عقل کے
لیے نہایت معنی رکھتی ہے ورنہ اس دنیا کی علمی تہی دستی کل
کے حسابی دن کسی کو شرمساری اور افسوس کے سوا کچھ نہیں دے
سکتی۔ اس موضوع کو بہت سارے شعراء نے باندھا ہے
لیکن میر انیس اور خیامی کی مندرجہ ذیل رباعی ایک الگ دنیائے
معانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

زان پیش کہ از جام اجل مست شوی
زیر لگد حادثہ ها پست شوی
سرمایہ بدست آر، دریں رہ کاینجا
سودی نکنی، اگر تہی دست شوی
(۱۱)

گر لاکھ برس جیئے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے
(۱۲)

ان دونوں رباعیوں کے بارے میں یہ کہنا بے معنی ہے
کہ لفظی اعتبار سے مشابہت زیادہ ہے یا نہیں لیکن مضمون
کے اعتبار سے ترجمہ کا احساس ہوتا ہے اگر غور سے ان دونوں
رباعیات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس
نے خیام کی رباعیوں میں نئی سمتوں کو راہ دی ہے۔ لسانی نقطۂ
نظر سے انیس کی رباعی خیام کی رباعی سے زیادہ سادگی اور روانی
کے پہلو رکھتی ہے۔ یہاں میر انیس نے خیامی کی رباعیات
کی جو توضیح کی ہے اس سے بہتر انداز میں کسی شارح سے بھی
ممکن نہیں ہو (دلولہ خیز شعوری طور پر ہی سہی)

مثلاً درج ذیل رباعی ملاحظہ ہو۔

شادی بطلب کہ حاصل عمر، دمی است
ہر ذرہ ز خاک کیقبادی و جمی است
احوال جہان و اصل این عمر کہ ہست
خوابی و خیالی و فریبی و دمی است

(۱۴)

اس رباعی کا مرکزی اور اساسی مفہوم یہ ہے کہ احوال جہان خواب و خیال اور عمر و زندگانی فریب سے زیادہ کچھ نہیں ہے خیامی نے اس رباعی میں تلمیحات اور لف و نشر کے استعمال سے بڑی وسعت پیدا کر دی ہے۔ انیس کی یہ رباعی خیام کی رباعی سے اگرچہ اخذ کردہ معلوم ہوتی ہے لیکن مفہوم کا نیا پن اور منفرد انداز قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے
ہستی کو حباب آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کھلا
جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

انیس بھی خیامی کی طرح طفلی، شباب اور ہستی کو خواب سے تعبیر کرتے ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ خیامی حیات و موت کے درمیانی لحظہ کو ہی حاصل عمر کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس لمحہ گزران، چار الگ الگ الفاظ "خواب"، "خیال"، "فریب"، اور "دمی" سے تعبیر کرتے ہیں۔

دونوں بزرگ شعراء نے مذکورہ رباعیات میں موت و حیات کے فلسفہ کو پیش کیا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میر انیس کی رباعی میں فقط اور فقط فلسفیانہ وضاحت ہے اور خیامی کی رباعی میں جہاں فلسفۂ زندگی کا ذکر ہے اسی کے ساتھ اغتنام عمر کا اختصاص بھی نظر آتا ہے۔ خیام وقت کے گزر جانے اور غیر متوقف ہونے پر نالاں ہے اسی لیے لوگوں کو اس بات کی تلقین بھی کرتے ہیں کہ اس لحظہ سے حتی الامکان فائدہ اٹھا لینا چاہئے کیونکہ یہاں آنے والا دنیاوی اموال و اسباب ذخیرہ کر کے بھی موت سے دور نہیں بھاگ سکتا۔ یہ دنیا کس کے لیے رکی ہے یہاں نہ جانے کیسے کیسے لوگ آئے اور گذر گئے

آنہا کہ کہن شدند و اینہا کہ نوند
ہر کس مراد خویش یک یک بدوند
این کہنہ جہان بکس نماند باقی
رفتند و رویم و دیگر آیند و روند

(۱۵)

ماحصل یہ ہے کہ لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں ہم بھی آئے ہیں اور جائیں گے ہمارے علاوہ اور لوگ آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ اس رباعی کا چوتھا مصرع اس کی جان ہے۔

"رفتند و رویم و دیگر آیند و روند

اس چھوٹے سے مصرع میں خیام نے جملہ گذشتگان و آیندگان افراد کی زندگی کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ خیام کے اسی فلسفیانہ نقطہ نظر کی مثال میر انیس کے یہاں بھی ملتی ہے۔

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں
وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

(۱۶)

میر انیس نے اس رباعی میں استعاراتی حساب سے گل رعنا سے "جوان"، نخل سے "پیر" اور گل سے "نوجوان" مراد لیے ہیں دنیا کا استعارہ باغ ہے۔ یہ لفظیاتی نظام خیام کی ذکر کردہ رباعی میں بھی نظر آتا ہے۔ وہ بھی کہن سے "پیری" اور نو سے "نوجوانی اور جوانی" مراد لیتے ہیں۔ ہلکا سا ساختیاتی فرق یہ ضرور ہے کہ میر انیس نے اس پوری رباعی کی بنیاد "فطرت پسندی" پر استوار کی ہے۔ مفہومی نوعیت دونوں کی یکساں نظر آتی ہے یہ وہ مفہوم ہے جس کی قرآن و احادیث میں بھی تکرار ہوئی ہے دنیا کی بے ثباتی اور گذر جانے کے حوالے سے اردو فارسی اور عربی ادب میں معتدبہ حصہ موجود ہے۔ اس مضمون پر مشتمل اشعار

حضرت علیؑ سے منسوب دیوان میں بھی موجود ہیں جن کا ذکر لطف سے خالی نہیں ہے۔

تحرز عن الدنیا فان فناءہا
محل فناء لا محل بناء
فصفو تھا ممزوجہ بکدورۃ
وراحتہا مقرونہ بعناء

دنیا سے بچو اس کی ابتدا ہی فنا ہے یہ ایسی جگہ نہیں جہاں آبادی ہو سکے۔ اس کے شفاف پانی کدورت سے ملے ہوئے اور اس کی راحت رنج و غم سے ملی ہوئی ہے۔

یا عاشق الدنیا لغیرک وجہہا
ولتندمن اذا رتک کفاھا

(۱۸)

خیامی اور میر انیس کی رباعیات فنائے جہاں اور بے ثباتی عالم پر مکمل طور سے اس بات پر اصرار کرتی ہے کہ لحظۂ گزراں کو غنیمت سمجھ کر حتی الامکان کچھ کر لیا جائے۔ گذشتہ اور آئندہ کل کی فکر سے بے پروا ہو کر ناعمل اور حرکت پر تکیہ کرنا ہی دانشمندی کے مترادف ہے کیوں کہ دنیا میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

غفلت میں کھو عمر جہاں فانی ہے
کچھ خیر تو کر لے وہی کام آتی ہے
کار امروز را فردا نہ گذار
جو رہ گیا آج کل پشیمانی ہے

(۱۹)

فکر امروز و فردا انسانی عمل کو معرض تعویق میں ڈال دیتی ہے اور آئندہ کل میں پشیمانی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا تعمیری زندگی کے لیے ہر لحظہ زندگی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اگر اس لمحۂ چشم زدن کو بھی بے استعمال کھو دیا گیا تو "ولتندمن" کا جملہ قسمت بن جاتا ہے۔ یہی موضوع خیام نیشاپوری کے یہاں بھی نظر آتا ہے۔

امروز ترا دسترس فردا نیست
و اندیشۂ فردات بجز سودا نیست
ضائع مکن این دم از دلت شیدا نیست
کاین باقی عمر را بہا پیدا نیست

(۲۰)

یہ انسانی زندگی اگر حرکت میں ہے تو موت کے بعد حیاتیاتی عمل کا دائرہ مزید وسعت اختیار کر لیتی ہے اس کے علاوہ دیگر مضامین میں بھی یکسانیت نظر آتی ہے لیکن یہ نظریاتی ہم آہنگی اس مقام پر جا کر اپنے دائرہ کار سے الگ ہو جاتی ہے جہاں عمر خیام کے شعری دنیا میں لذت پرستی اور مادہ پرستی کے عناصر کا آغاز ہوتا ہے۔ میر انیس اور خیامی کے درمیان بنیادی اور اساسی فرق یہی ہے کہ خیامی ایک ایسا فلسفی شاعر ہے جو دنیا کی بے ثباتی پر یقین تو رکھتا ہے لیکن اس غم کو غلط کرنے کے لیے جو حیلہ تلاش کرتا ہے وہ اسلامی دائرہ عمل سے باہر کا ہے ہر وہ گزرتی ساعت کی ہر لمحہ سے فائدہ نچوڑتا تو ہے لیکن بے فائدہ ہدف کے لیے سپرد کرتا ہے۔ وہ ساقی سے یہ تو کہتا ہے کہ فکر فردا صرف الجھنوں کو جنم دیتی ہے لیکن فکر فردا سے نجات کا راستہ گمراہی اور مستی و رندی میں ڈھونڈتا ہے۔

این قافلۂ عمر عجب می گزرد
دریاب دمی کہ با طرب می گزرد
ساقی غم فردائے حریفان چہ خوری
پیش آر پیالہ را کہ شب می گزرد

(۲۱)

میر انیس اس کے برعکس اس فنا پذیر دنیا میں عرصۂ حیات کو اس لیے غنیمت سمجھتے ہیں تاکہ اس میں عمل خیر انجام دیا جا سکے۔ وہ بھی فکر فردا کے قائل نہیں لیکن آخرت کے لیے ذخیرہ اندوزی اور عمل نیک کے خواستگار ہیں۔ درج ذیل رباعی دراصل خیام کی رباعی کا جواب ہے۔

جس دم نزدیک وقت رحلت ہوگا
یارو! کیا ہی مقام حسرت ہوگا
کوئی عمل نیک نہ ہوگا جز یاس
آخر کو وہی رفیق تربت ہوگا

(۲۲)

میر انیس عمل صالح کو زندگی کا ماحصل سمجھتے ہیں وہ دنیا میں آنے کا مقصد صرف عمل صالح تصور کرتے ہیں اگر اس مزرع آخرت میں کچھ کام نہ کرسکے اور دنیاداری میں زندگی گزر گئی تو اس زندگی کا مقصد صرف یہی ہے کہ ہم کہیں پر کسی اور مقصد سے جائیں اور کچھ دوسرا کرکے آئیں۔

اندیشۂ باطل صبح و شام کیا
عقبیٰ کا نہ کچھ ہائے سرانجام کیا
ناکام چلے جہاں سے افسوس انیس
کس کام کو یاں آئے تھے کیا کام کیا

(۲۳)

میر انیس کے معاصر علامہ مفتی محمد عباس لکھنوی نے جن سے میر انیس کے دوستانہ تعلقات تھے خیامی کی ان رباعیات کا جواب دیا ہے جن میں خیام لذت پرستی اور شراب خوری اور اس کی مدہوشی تخصیص کرتا ہے۔ خیامی۔

من می خورم و ہر کہ چو من اہل بود
می خوردن او بپیش خدا سہل بود
می خوردن من حق ز ازل می دانست
گر می نہ خورم علم خدا جہل بود

مفتی محمد عباس سید

می خوردن تو پیشۂ نا اہل بود
سخت ست عذاب و خوردنش سہل بود
در فعل تو علم حق ندارد تاثیر
پس نسبت فعل خود بہ حق جہل بود

خیامی:۔

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
آنکس کہ گناہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میان من و تو چیست بگو

جواب از مفتی محمد عباس سید

عفو و کرم از خدا مگو نیست بگو
در ہست پس اعتراض تو چیست بگو
گر در عوض ستم نکوئی بکند
پس عدل چہ چیز و صاحبش کیست بگو (۲۴)

ظاہر ہے یہ جوابات میر انیس کی نظر سے ضرور گذرے ہوں گے اس کے علاوہ میر انیس خود علمی اور مذہبی شخصیت کے حامل شاعر ہیں۔ وہ اپنی شعری دنیا میں انھیں مطالب کو راہ دیتے ہیں جو قرآن و حدیث سے مطابقت رکھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ بے ثباتی دنیا کے موضوعات پر بھی کلی طور پر خیامی کے ساتھ نظریاتی اشتراک کی ہم آہنگی نظر نہیں آتی بلکہ انیس کا دوسرا نظریہ سامنے آتا ہے جو ان کا خاصہ ہے دنیا کے اسرار و رموز کی بے کرانی اور ناپیدا کناری کے مضامین فلسفی شعراء کے یہاں بہ کثرت پائے جاتے ہیں۔ ہر فلسفی نے اپنے تئیں یہ اقرار کیا ہے کہ میں نے بس یہی جانا کہ میں نے کچھ نہیں جانا۔ خیام بھی اسی فکر کے حامل نظر آتے ہیں اور ان کی یہ رباعی ضرب المثل کی حیثیت سے دائرہ سائر ہے۔

ہرگز دل من ز علم محروم نہ شد
کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
ہفتاد و دو سال فکر کردم شب و روز
معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد (۲۵)

اس نکتہ پر آکے میر انیس خیامی کے ہم خیال نظر آتے ہیں وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ دنیا کی اصالت و بے کرانی کا ادراک محال ہے میر انیس کی مندرجہ ذیل رباعی کے ابتدائی تین مصرعے خیام کی رباعی کی تفسیر کے تناظر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

آنکھیں کھولیں مگر یہ پردا نہ کھلا
ہم سب پہ کھلا پہ حال دنیا نہ کھلا
دریائے تفکر میں رہے برسوں غرق
مانند حباب یہ معمّہ نہ کھلا

(۲۶)

درحقیقت اس دنیا کے بعض مسائل اتنے مرموز اور پراسرار ہیں کہ اس کی گرہ کشائی انسانی حیطہ ادراک سے باہر ہے دنیا کے تلازمات میں ایک موضوع موت بھی ہے لیکن کون ہے جو موت کی حقیقت اور ماہیت سے پردہ اٹھا سکے خیامی کی رباعی اسی پس منظر میں کہی گئی ہے۔

آں بے خبران کہ در معنی سفتند
در چرخ بہ انواع سخن ہا گفتند
آگہ چو نگشتند بر اسرار جہاں
اول زنخی زدند و آخر خفتند

(۲۷)

حکیم جس کا دائرہ کار اسرار دنیا کی حقیقت و ماہیت کی نقاب کشائی پر محیط ہے وہ طبعیات اور مابعد الطبیعات الٰہیات اور دیگر موضوعات پر خود داد تحقیق دیتا ہے۔ دراصل موت ایسی شے ہے ہی نہیں جسے میزان عقل پر تولا جا سکے۔ میر انیس جو اردو رباعیات ادب کے نامُندہ فلسفی شاعر ہیں اسی موضوع کو ذرا اور وسعت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

کچھ عقل کی میزان پہ تولا نہ گیا
چپ ہو گئے اس طرح کہ بولا نہ گیا
عقدے سب حل ہوئے مگر آہ انیس
یہ بند اجل کسی سے کھولا نہ گیا

(۲۸)

اس تقابلی مطالعہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا کی بے ثباتی، اور اس کے متعلقات پر خیامی اور انیس کی تقریباً ایک جیسی ہی نگاہ ہے۔ ممکن ہے یہ مشابہت خیامی کی رباعیات کے مطالعہ سے پیدا ہوئی ہو۔ بہر نوع اس سے اس بات کا تو خاص طور سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر انیس نے اردو جہاں رباعیات میں نئے اور فلسفیانہ رجحانات کے مطالب پیش کئے اس طرح اردو رباعیات کو عاشقانہ مضامین سے نکال کر نئی جہت پر لگا دیا یہ میر انیس ہی کا حصہ ہے کہ اردو رباعیات فارسی کے رباعی گو شعراء کے مائہ شعری کے مقابلہ میں بے رنگ آہنگ نظر نہیں آتی ورنہ انیس سے قبل اردو شاعری کی دنیا میں کوئی بھی ایسا شاعر نہیں گزرا جس نے اس صنف میں اختصاص حاصل کیا ہو۔ متقدم شعراء نے رباعی کہیں ضرور لیکن ان کی رباعیات کی حیثیت ضمنی رہ گئی۔

اس موقع پر ڈاکٹر سلام سندیلوی کی درج ذیل رائے پر بات مکمل ہو جاتی ہے کہ۔

اگر میر انیس مرثیہ نہ کہتے تو ان کی رباعیات ہی اس قدر بلند مرتبت تھیں جو ان کی حیات ابدی کی ضامن بن جاتیں در اصل میر انیس دور متوسط کے سب سے بڑے رباعی گو شاعر ہیں ان کی شیریں، پردرد، بلند آواز صدیوں تک اردو رباعی کی فضا میں گونجتی رہے گی۔" (۲۹)

اشارے و توضیحات

۱۔ دیوان غنی کشمیری ص ۱۴۴ مصحح احمد کرمی۔ چاپ اول ۱۳۶۲ ایران

۲۔ رباعی نمبر ۱۹۵ ص ۳۱۲ دیوان رباعیات انیس، تحقیق و تدوین و تشریح ڈاکٹر سید تقی عابدی۔ مطبع ایچ ایس آفسٹ پرنٹس نئی دہلی

۳۔ رباعیات انیس۔ علی جواد زیدی ص ۵۱ ترقی اردو بیورو نئی دہلی۔

۴۔ رباعیات انیس ص ۳، ۴ مرتبہ سید محمد حسن بلگرامی جے کے آفسٹ پریس دہلی ۱۹۷۹ طبع دوم بحوالہ رباعیات انیس مرتبہ سید علی جواد زیدی ص ۵۱

۵۔ ایڈورڈ براؤن یہ انگریز قلم کار و شاعر و مترجم ۳۱ مارچ

۱۸۰۹ میں پیدا ہوا۔ رباعیات خیام کے ترجمہ کی وجہ سے مشہور ہوا ۱۸۵۹ میں فٹس جیرالڈ نے رباعیات خیام کا آزاد اور منظوم انگلش ترجمہ کیا ۱۴ جولائی ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔

۶۔ ترانہ ہائے خیام ص ۲۲، چاپ اول انتشارات امیر کبیر تہران، ایران

۷۔ اس فلسفہ کو فلسفہ عیاشی اور فلسفہ ایپیکور بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کا بنیادی ماخذ ایپیکور کی تعلیمات پر استوار ہے جو ۳۰۷ سال قبل مسیح قدیم یونان میں تھا۔

۸۔ انکار کل یا عدمیت پسندی یہ لفظ لاطینی سے ماخوذ ہے یعنی عدم۔ گورگیاس (۳۸۰) وہ پہلا یونانی فلسفی ہے جس کے یہاں پر عدمیت پسندی اور انکار کل کے عناصر پائے جاتے ہیں نے ۱۹ویں صدی میں اس کے قوانین و اصول مرتب کئے۔

۹۔ رباعیات عمر خیام پر ایک تحقیقی نظر۔ عبدالباری آسی۔ مطبوعہ شاہی برقی پریس لکھنؤ جون ۱۹۴۴

۱۰۔ تحلیل شخصیت خیام۔ محمد تقی جعفری چاپ اول مطبع موسسہ کیہان۔ تہران ۱۳۶۵

۱۱ مجموعہ رباعیات عمر خیام، رباعی ۷۵۹ ص ۱۰۱ مطبع منشی تیج کمار لکھنؤ، بتیا

۱۲۔ رباعی نمبر ۳۲۸ ص ۲۲۷

۱۳۔ رباعی نمبر ۲۰۲ ص ۸۲ منشی تیج کمار

۱۴۔ رباعی نمبر ۴۰۳ ص ۴۰۲ علی جواد زیدی

۱۵۔ ص ۸۵ مجموعہ رباعیات خیام

۱۶۔ رباعی نمبر ۲۰۹ ص ۳۱۹ ڈاکٹر تقی عابدی

۱۷۔ دیوان علی، تصحیح۔ مقدمہ و تعلیق۔ دکتر سیدہ مریم روضاتیان سلسلہ انتشارات انجمن آثار و مفاخر فرہنگی، تہران ۱۳۸۳ ش ص ۵۸۔

۱۸۔ رباعی نمبر ۱۸۰ ص ۳۰۴ ڈاکٹر تقی عابدی۔

۱۹۔ رباعیات حکیم۔ خیام نیشاپوری مقدمہ و حواشی باہتمام جناب محمد علی فروغی و دکتر غنی تہران ۱۳۲۱ نشر کتابہائی چاپ رنگین ص ۷۳

۲۰۔ ص نمبر ۸۷

۲۱۔ رباعی نمبر ۲۲۳ ص ۳۲۶ ڈاکٹر تقی عابدی

۲۲۔ ص ۸۹ علی جواد زیدی

۲۳۔ تجلیات عباس، تاریخ عباس تالیف مرزا محمد ہادی لکھنوی نظامی پریس لکھنؤ ص ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۳۴

۲۴۔ رباعیات خیام ص ۹۴

۲۵۔ رباعی نمبر ۱۴ ص ۹۰ علی جواد زیدی

۲۶۔ مجموعہ رباعیات عمر خیام۔

۲۷۔ رباعی نمبر ۲۱۴ ص ۳۲۱ ڈاکٹر تقی عابدی۔

◇◇

میر انیس کے لیے مولانا حالی کی کہی ہوئی رباعیات خود انھیں کے قلم سے

دو رباعیاں میر انیس کی شان میں

اردو! گو رواج جا بجا تیرا ہے
شہروں میں رواج لکھنؤ تیرا ہے
پر جب تک انیس کا سخن ہے باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیس
اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیس
دلی جو مٹی تو لکھنؤ تھی اس کی بہار
دونوں کو ہے دعوے کہ ہمارا تھا انیس

عنبر بہرائچی
9451089339

سنسکرت شعریات کے رس نظریہ کی روشنی میں

میر انیس کے تخلیقی کارنامے

واضح رہے کہ لفظ رس سنسکرت ادب میں بہت قدیم ہے اس کا اولین استعمال ویدوں میں ملتا ہے وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہی ساتھ اس کے معانی میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ اس کا استعمال چار معنی میں ہوا ہے پہلا۔ ذائقہ کے سلسلے میں۔ دوسرا ادویات کے سلسلہ میں۔ تیسرا شاعری کے فن سے متعلق چوتھا عقیدت کے اظہار کی شکل میں ہیں۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مستحکم ہے کہ لفظ رس کو بہت اہمیت دی گئی ہے ویدوں میں بھی لفظ رس کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ شرنگار رس शृंगार रस کا بیان کئی منتروں मंत्रों یا رچاؤں میں کیا گیا ہے۔ شرنگار اور دوسرے رس مثلاً ویر वीर کرون करुण ہاسیہ हास्य بھیانک भयानक یعنی خوفناک ادبھت अद्भुत وغیرہ کا بیان پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی واتسلیہ वात्सल्य یعنی مامتا اور شانت शान्त یعنی پرسکون وغیرہ رسوں سے متعلق بیان ویدوں کی مختلف رچاؤں ऋचाओं میں دستیاب ہے۔

رگ وید ऋग्वेद میں رس رس کو پانی، شہد کی شکل میں ہوا ہے۔ رگ وید تسمے اسیہ اپورن सवाد سواد स्वाद رستے सम्मे آکرتو भाक्तो سواد स्वाद آتھر وید अथर्ववेद میں رس کے معانی ـــــ تر ہوتے گئے اور اس طرح رسوں کی اہمیت کو قبول کیا گیا۔ ویدوں کے بعد اپنشدوں उपनिषदों میں رسوں کی اہمیت کو قبول کیا گیا ہے جو بعد میں آچاریہ بھرت आचार्य भरत نے رسوں کے رنگوں کا بیان بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً شرنگار کو سفید ہاسیہ हास्य کا سفید۔ کرون करुण کا سرمئی رودر रौद्र کا سرخ بتایا ہے۔

اس طرح ویدوں سے لے کر اپنشدوں اور بعد میں اچاریہ آنند وردھن आचार्य आनन्दवर्धन ابھنو گپت अभिनवगुप्त اور پنڈت راج جگن ناتھ पंडित राज जगन्नाथ تک رس کی اہمیت کو قبول کیا گیا۔ بعد کے زمانے میں مراٹھی تنقید نگار بار لنگے बार लिंगे نے رسوں کی اہمیت کو کالرج Coterige کی ancient mariner کا ایک مصرعہ

"paintedspip on a painted occean"

کو پڑھنے کے بعد تصویر آمیز آبی جہاز کا ہی پیکر ہمارے سامنے ابھرتا ہے جس سے اس نظم کی شاعرانہ عظمت کو سمجھنے میں یہ باہری آزاد عنصر حرف آفرینی کے لیے ہے مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی بیکار چیز ہے۔ نظم کی شاعرانہ عظمت بھلے ہی اس سے آشکار نہ ہوتی ہو مگر نظم کی فضا کو ترتیب دینے میں

اس کی اہمیت ضرور ہے کسی شعری فن پارے کا تجزیہ کرنے پر عام طور پر تاثرات دکھائی پڑتے ہیں۔

۱۔ الفاظ کے محسوسات
۲۔ الفاظ سے جڑے ہوئے پیکر
۳۔ الفاظ سے جڑے آزادی پیکر کی تخلیق۔
۴۔ موضوع کا تجزیہ
۵۔ جزیہ
۶۔ جزیہ کا علمی تاثر

ڈاکٹر بارلنگے Dr.Barlinge ان چھ حالات کا الگ الگ تجزیہ یوں کرتے ہیں کہ کسی نظم میں الفاظ کے تانے بانے کو دیکھنے کے بعد محسوسات اسی اسٹیج stage طرح آتی ہے۔ حروف کی ہیئت اور ان کی خوبصورتی یا بدصورتی یا بدصوتی کا اثر ہمارے اوپر ضرور پڑتا ہے مگر اس کی مقدار بہت کم ہوتی ہے بدخط میں لکھی جانے والی نظم یا تخلیق کو پڑھنے میں دشواری ہوگی زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ کوئی قاری جھنجھلاہٹ میں اسے نہ پڑھے لیکن بدخط یا خوشخط کبھی اچھی نظم یا شعر کا حصہ نہیں ہو سکتے۔

بہرکیف رسوں کی تعداد کے بارے میں آچاریہ بھرت نے ناٹیہ شاستر नाट्यशास्त्र میں رسوں کی تعداد آٹھ بتائی ہے۔ سنسکرت شعریات میں پہلا شرنگار رس (روحانیت آمیز) کیفیت دوسرا رودر रौद्र یعنی غضب ویر رس वीर रस یعنی شجاعت वीभत्स یعنی کراہت، ہاسیہ हास्य یعنی مسرت، بھیانک भयानक یعنی رحم آمیز کیفیت۔ کرن करुण ادبھت अद्भुत یعنی حیرت، بھیانک भयानक یعنی دہشت۔

آچاریہ بھرت نے ان آٹھ رسوں کا تعین کرنے کے بعد شانت رس शान्त रस کو بھی بہت اہمیت دی ہے جو بہت اہمیت کی حامل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان رسوں میں تمام رسوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

اس فن میں اردو شاعری وصل संयोग اور ہجر वियोग سے متعلق مضامین سے بھری ہوئی ہے۔ وصل سے متعلق یہ اشعار خوب ہیں۔

کب یہ آنکھیں تری دہلیز سے چپکا سکتا
میں جو چاہتا تو تماشہ نہیں بکھرا سکتا
میرے ہونٹوں پہ کوئی آگ سی کھل سکتی کہیں
تیری آنکھوں میں کوئی ابر سا لہرا سکتا
شاید آتا کسی پہلو سے تجھے بھی پسند
میں جو ملبوس محبت تجھے پہنا سکتا
تجھ کو کھو دینے کو تیار بھی ہو ہر لمحہ
اور یہ حسرت بھی نہیں ہے کہ تجھے پا سکتا
یوں بھی ہر روز تری دید کی عادت تھی لیے
آنکھ اب دل تو نہیں ہے جسے بہلا سکتا
ایسی ویسی کوئی امید نہ رکھتا مجھ سے
میں ترے ساتھ بہت دور نہیں جا سکتا

(ظفر اقبال۔ عیب و ہنر ص ۲۷)

اب ہجر کی بھی مثال ملاحظہ ہو ؎

کشتیٔ جاں سے گزرنے کو جی چاہتا ہے
ان دنوں یوں ہے کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے
گھر میں یاد آئی بھی کل دشت کی وسعت تم ہو
دشت میں آئے ہو گھر جانے کو جی چاہتا ہے
کوئی صورت ہو کہ پھر آگ رگ و پے میں بہے
راکھ بننے کو بکھر جانے کو جی چاہتا ہے
کیسی مجبوری و لاچاری ہے اس کوچے میں
جا نہیں سکتا مگر جانے کو جی چاہتا ہے

....

ہاسیہ हास्य رس کے بارے میں آچاریہ ابھینو گپتا فرماتے ہیں کہ شرنگار اور کرُن رس کے مستقل جذبات کے ذریعہ ہم رنگ احساس پیدا نہیں ہوتا جبکہ ہاسیہ رس کا مستقل جذبہ ہم رنگ احساس کو پیدا کرنے میں پوری طرح کامیاب رہتا ہے شرنگار رس کے مستقل جذبہ جنسی میلان रति کے ذریعہ پیدا ہونے والے رس کا احساس خوشی آمیز ہوتا ہے اسی طرح کرُن करुण کا مستقل جذبہ افسوس سے پیدا ہونے والا احساس افسوس آمیز نہ ہوکر غم آمیز ہوتا ہے۔

ہاسیہ رس میں مضحکہ آمیز جسمانی حالت پوشاک کلام اور حرکت وغیرہ کے بیان سے ہاسیہ رس نمو پذیر ہوتا ہے اس کا مستقل جذبہ ہنسی ہے اس کا محرک اساسی بگڑی ہوئی پوشاک اور کلام وغیرہ ہیں۔ اس رس کا محرک ہیجان ہے اردو شاعری میں اکبر الہ آبادی کے علاوہ بہت سی مثالیں ہیں پس چند اشعار پر اکتفا کرتا ہوں ؎

سکون شاید ہے پیدا ہونے والا
حکومت کی توجہ حاملہ ہے
عدالت کا دل بھی لبھانے لگی ہے
مساۃ رشوت کی اٹھتی جوانی
بجلی کی روشنی میں چلے آئیے کلیم
کھمبے سڑک پہ ہیں ید بیضا لیے ہوئے
اللہ کی اس دنیا میں سرمایہ پرستی کا عالم
بے زر کا کوئی بھوئی نہیں زردار کے لاکھوں سالے ہیں
(شوق بہرائچی)

آچاریہ بھرت نے ہاسیہ رس کی دو قسمیں بتائی ہیں اول آتمستھ आत्मस्थ اور دوم پرستھ परस्थ

خود ہنسنا آتمستھ اور دوسروں کو ہنسانا پرستھ परस्थ ہے پنڈت راج جگناتھ نے ان دونوں قسموں کی تعریف زیادہ عملی کی ہے۔ ان کے مطابق آتمستھ आत्मस्थ اسے کہتے ہیں جس کی نمو پذیری ہنسی کے موضوع کو دیکھنے سے ہوتی ہے اور پرستھ परस्थ ہاسیہ (مزاح) دوسروں کو ہنستے ہوئے دیکھ کر نمو پذیر ہوتا ہے۔

کرن رس करुणरस رحم آمیز کیفیت بھوبھوت भवभूति کے مطابق کرون رس करुणरस اکیلا رس ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا رس نہیں ہوتا۔ ان کے مطابق کرون करुण رس کی دو قسمیں ہیں اول سونشٹھ स्वनिष्ठ (ذ) دوم پرنشٹھ प्रनिष्ठ ذاتی نقصان یا بد دعا وغیرہ سے ہونے والی تکلیف سے پیدا ہونے والا کرون رس سونشٹھ کہلاتا ہے اور کسی غیر کے نقصان یا غم سے پیدا ہونے والا کرن رس پرنشٹھ प्रनिष्ठ کہلاتا ہے

کرن رس کی نمو پذیری کے بارے میں اچاریوں نے کسی عزیز شخص کے ختم ہوجانے اور آفت یا بدقسمتی سے دوچار ہونے کو کرن رس کا سبب مانا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی عزیز شخص یا شے کے ختم ہو جانے اور آفت یا بدقسمتی سے دوچار ہو جانے پر ہی کرن رس پیدا ہو اس شخص یا شے کو اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو بھی کرن رس پیدا ہو سکتا ہے۔ اردو کی ایک مثال اس ضمن پیش کی جاتی ہے ؎

سینے سے جبکہ ہو گئی ستم کے پار
گھوڑے پہ ڈگمگانے لگا حُرِّ نامدار
رکھ کر جگر پہ ہاتھ پکارا وہ دل فگار
اے فاطمہ کے لال یہ خادم ہوا نثار
اب شفقت امام حجازی کا وقت ہے
آقا یہی غلام نوازی کا وقت ہے
جس دم سنی امام امم نے صدائے حر
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولے کہ ہائے حر
رو کر کہا رفیقوں سے دیکھی وفائے حر
خیمے میں پیٹنے لگی زینب برائے حر
کھینچی جو شہ نے آہ دل بیقرار سے نکلی تڑپ کے فاطمہ زہرا مزار سے

ان اشعار میں جناب حر محرک اساسی ہیں ان کی نعش پاک محرک ہیج ہے۔ حضرت حر کا جناب حسین سے گفتگو کرنا اثرات اور ترسیلی جذبات ہیں۔

ویر رس वीर रस یعنی شجاعت آمیز کیفیت

اچاریوں نے ویر رس کی چار اقسام بتائی ہیں۔

۱۔ دیا ویر رس दया वीर रस

اس رس کی نمو پذیری وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی بہادر شخص کسی مغموم اور پریشان حال کو دیکھ کر اس کی مدد کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس کے اجزا حسب ذیل ہیں۔

۱۔ محرک اساسی۔ پریشان حال شخص

محرک ہیج۔ غم سے کراہنا، بین کرنا وغیرہ

اثرات۔ پریشان حال شخص سے ہم دردی کا اظہار، اس کے غم دور کرنے کے لیے کوشش کرنا اور اس کی خدمت کرنا۔

۲۔ دان ویر رس दान वीर रस

اس کے اجزا حسب ذیل ہیں۔

محرک اساسی، کشکول گڑگڑاتا سوالی یا فقیر وغیرہ

محرک ہیج۔ مقدس مقام، مقدس دن یا تاریخ خیرات کی اہمیت پر وعظ کو سننا وغیرہ۔

اثرات۔ کشکول کی عزت دل کھول کر خیرات بانٹنا۔ ترسیلی جذبات۔ خوشی، استقلال، تحمل اور یاد وغیرہ

۳۔ دھرم ویر رس धर्म वीर रस

محرک اساسی۔ آسمانی کتابوں اور مذہبی کتابوں میں بتائے گئے راستے پر چلنے والا، پاکباز، صوفی، سنت اور پادری وغیرہ۔

محرک ہیج۔ مذہبی کتب کا مطالعہ، وعظ و نصیحت مندر، مسجد، گرجا گھر گرودوارہ وغیرہ، مذہبی کتب کا مطالعہ۔

اثرات۔ مذہبی کتب کا مطالعہ اور ان کو سننا۔ اچھا پیسوں کے حفاظت کے لیے پورا انہماک۔

ترسیلی جذبات۔ استقلال، تحمل اور رحم۔

۴۔ یدھ ویر رس युद्ध वीर रस

شاعری میں دراصل اسی رس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔ دنیا بھر کی رزمیہ شاعری میں اس کی بہترین مثالیں دستیاب ہیں۔ عوام میں بھی ویر رس سے مراد یدھ ویر رس युद्ध वीर रस ہے۔

محرک اساسی۔ دشمن

محرک ہیج۔ دشمن کی رجز خوانی، اس کی للکار، جنگی موسیقی، میدان جنگ دشمن کا فن جنگ وغیرہ

اثرات۔ دست و پا کا پھڑکنا، اپنی بہادری کا بیان حملہ، فن حرب و ضرب رسالہ بندی وغیرہ۔

ترسیلی۔ جذبات، فخر، یاد، خوشی اور تجسس وغیرہ۔

اردو شاعری کی مثال

کہتا تھا کر زتوں کے اک ایک پہلوان
رکھ دو یہ مشک اے اسداللہ کے نشان
بڑھ کر جواب دیتے تھے عباس نوجوان
چہرہ بگاڑدوں کا سنبھالے رہو زبان
کیا منہ جو مشک لے کوئی جب تک ہاتھ ہے
لے بے حیتو مری جاں اس کے ساتھ ہے
زخمی تھے پر فرس کو ڈپٹتے تھے بار بار
بڑھ بڑھ کے غول فوج کے ہٹتے تھے بار بار
دکھلا رہے تھے رنگ علی کی لڑائی کا
اعدا کے خوں سے لال تھا سبزہ ترائی کا

(میر انیس)

۵۔ رودر رس रौद्र रस غضب آمیز کیفیت

اس رس کا مستقل جذبہ غصہ ہے۔ کردار یا منظر اور ترسیلی جذبات نیز منقلبات کے اتصال سے

فطری میلان کی شکل میں صاحب دل قاری یا سامع میں موجود غصہ مستقل جذبہ کی شکل میں ذائقہ دیتا ہوا رودر रौद्र رس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

محرک اساسی مجرم، دھوکا، غداری اور بے ایمانی کرنے والے افراد محرک مہیج۔ جرم کرنا، تلخ کلامی، اکڑنا آنکھیں دکھانا وغیرہ۔

اثرات۔ آنکھیں لال ہو جانا، ہونٹوں کا پھڑکنا دانت پیسنا، تیوری چڑھانا، بدن میں کپکپی، آلات جنگ اٹھا لینا اور چیخنا وغیرہ۔

ترسیلی جذبات۔ فخر، تیزی، تندی، شوخی اور یاد وغیرہ۔

اردو کی مثال حسب ذیل ہے ؎

یہ سن کے پکارا عمر سعد جفاکار
آتا ہے بڑا سبط پیمبر کا مددگار
اس پیر کو مہلت نہ دیا چاہیئے زنہار
بڑھ کر کہا غازی نے کہ اے ظالم و غدار
میں تیری طرح دشمن شبیر نہیں ہوں
ہوں پیر تو واللہ پہ بے پیر نہیں ہوں
گو ہاتھوں میں رعشہ ہے او ظالم و گمراہ
گر کوہ کو چاہوں تو اکھاڑوں صفت کاہ
ان ہاتھوں کی قوت سے ابھی تو نہیں آگاہ
ہے قدر شناس ان کا جگر بند ید اللہ
پیری سے جو ہے پشت خمیدہ تو بجا ہے
جس خاک میں جانا ہے ادھر سر بھی جھکا ہے

(میر انیس)

۶۔ بھیانک رس भयानक रस

کردار یا مناظر اور اثرات نیز ترسیلی جذبات کے سے جب صاحب دل قاری یا سامع کے قلب میں فطری میلان کی شکل میں موجود مستقل جذبۂ خوف طلوع ہو کر رس کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو بھیانک رس نمو پذیر ہوتا ہے۔

محرک اساسی۔ خوفناک شے یا شخص مثلاً شیر، ناگ آگ، سیلاب، کوئی آواز، سونا، گھر، بھوت، جن یا چڑیل کا خیال وغیرہ۔

محرک مہیج۔ خوفناک شخص یا شے کی حرکات مثلاً شیر کی دہاڑ، تنہائی، سانپ کا رینگنا اور زبان نکالنا دریا کا تیز بہاؤ، آگ کی اونچی اونچی لپٹیں وغیرہ۔

اثرات۔ کانپنا، روئیں کھڑے ہونا، منہ کا رنگ اڑ جانا، آنکھیں پھٹنا۔ پسینہ آجانا اور بیہوش ہونا وغیرہ

اثرات۔ کانپنا، روئیں کھڑے ہونا، منہ کا رنگ اڑ جانا، آنکھیں پھٹنا۔ پسینہ آجانا اور بیہوش ہونا وغیرہ۔

ترسیلی جذبات فکر، بیہوشی تکلیف اور موت وغیرہ۔

اردو کی مثال ؎

رنگ زرد پھیکا ہے چہرے پہ ذرا نور نہیں
داغ چیچک کے ہیں پر خال نہ زنبور نہیں
ہے دہانہ جو دریدہ زبان سخت دراز
کچھ بناوٹ ہے نہ انداز نہ عشوہ ہے نہ ناز
چھوٹی گردن ہے، گلا شہر بہکا بہت بد آواز
طبع اقدس ہو نہ کیوں گندہ بغل سے ناساز
ناتراشیدہ ہے وہ کندہ تو دو ہاتھ ہیں چوب
پنجہ انگشت نما جیسے پریشاں جاروب
ران پر گوشت نہیں اور نہ اس پر مچھلی
ساق پر بال ہے اور سخت ہے جیسے لکڑی
پنجہ کشژدم کی طرح کج ہے کڑی ہے ایڑی
انگلیاں پاؤں کی بدوضع ہیں ٹیڑھی ٹیڑھی
پا میں چکر ہے تو مانند فلک کج رفتار
نام پر مارے ہرجائی کے بیزار ہزار

(طلسم ہوش ربا۔ جلد ششم ۲۶۲)

۷۔ ویبھتس رس वीभत्स रस کراہیت آمیز کیفیت

کریہہ چیزوں کو دیکھ کر یا سن کر مستقل جذبہ نفرت آمیز طلوع ہوتا ہے جو متعلق منظر اثرات اور ترسیلی جذبات کے اتصال سے ویبھتس رس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

محرک اساسی۔ کریہہ شے، میلی کچیلی بدبودار پوشاک سڑا ہوا گوشت اور خون۔ مچھلی بازار، قصائی اور شمشان گھاٹ وغیرہ۔

کریہہ مہیج۔ تیز، بدبودار، سڑا ہوا گوشت، کیڑوں کا رینگنا، مکھیوں کا بھنبھنانا۔ گدھ، کوّے اور کتّوں کا سڑے ہوئے گوشت کو بھنبھوڑنا وغیرہ۔

اثرات۔ منہ پھیرنا اور تھوکنا وغیرہ۔

ترسیلی جذبات۔ والہانہ لگاؤ، بے نیازی اور اضطراب وغیرہ۔ بہر حال جن اشیا کو دیکھنے اور سننے سے کراہیت یا نفرت کا جذبہ پیدا ہو اسے ویبھتس تسلیم کر لینا چاہئے۔

اردو کی مثال۔۔۔۔ حقیقت میں دیونی قالب انسان میں سمائی ہوئی سر شکل گنبد حمام، سیاہ چہرہ، نیلی کرتی، کچی تھان کا لہنگا، از سر تا ناخن یا بصورت دل کافر سیاہ مثل پردۂ ظلمات کے سراسر خطا ہے، حقیقت میں الٹا توا ہے۔ زبان منہ سے نکلی ہوئی رال ٹپک رہی ہے دونوں ہاتھ زمین پر ٹیکے ہوئے بیٹھی جھوم رہی ہے دس جوان ایک جانب سر جھکائے ہوئے مثل برگ بید کانپ رہے ہیں چہرے ان بیچاروں کے اداس عالم یاس۔ ایک پہلو میں مٹکا شراب کا اٹھا منہ سے لگایا غٹ غٹ پی گئی۔ ایک جوان کی ٹانگ پکڑ کر مع استخوان چبانا شروع کیا۔"

(طلسم ہوش ربا جلد ششم صفحہ ۱۶۴)

۸۔ ادبھت رس अद्भुत रस یعنی حسرت آمیز کیفیت

حیرت ناک چیزوں کو دیکھنے سے ادبھت رس نمو پذیر ہوتا ہے۔ ماورائی شے یا واقعہ کے ذریعہ بھی ادبھت رس پیدا ہوتا ہے۔ اچاریہ بھرت کے مطابق۔ ادبھت رس کی نمو پذیری ماورائی اشخاص سے ملاقات، باغ اور مقدس مقامات پر جانے، ماورائی اشخاص سے ملاقات وغیرہ۔

مستقل جذبۂ حیرت۔

محرک اساسی۔ ماورائی یا حیرت ناک شے

محرک مہیج۔ حیرت ناک شے کا تجزیہ

اثرات۔ رونگٹیں کھڑے ہونا

ترسیلی جذبات۔ یاد، خوشی اور جوش وغیرہ۔

اردو کی مثال۔

کیوں نہ سو جان سے ہو گلزار بہار معنی
محو رنگینیٔ تصویر سراپائے نبی
یہ وہ صورت ہے کہ دیکھی نہ سنی ایسی کبھی
تھی یہی شکل مقدس کہ ازل میں جو کھنچی
نازسے خامۂ قدرت نے کہا واہ رے میں
یوں اٹھا عارض پر نور کہ اللہ رے میں
کیسی تصویر کہ ہے صبح بہار امکاں
کیسی تصویر کہ ہے آئینہ پرداز جہاں
کیسی تصویر کہ ہے لوح و قلم نور افشاں
کیسی تصویر کہ ہے کلک مصور نازاں

سراپائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

(از محسن کاکوروی)

یہاں تک آچاریہ بھرت کے آٹھ رسوں کا بیان پیش کیا گیا۔ بعد کے دو رسوں پر بھی اظہار کرنا ضروری ہے۔

۹۔ شانت رس शान्त रस سکون آمیز کیفیت

اچاریہ وشوناتھ अचार्य विश्वनाथ شانت رس کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس کا مستقل جذبہ بے نیازی اس کا محرک اساسی آفاقی دنیا کا ادراک اور عرفان عقیدت

ہیں کہ اس کے محرکات تہیج ہیں زہاد اور فقرا کے آستانے
مقدس مقامات ، خوبصورت جنگل اور اللہ والوں کی قربت
اس کے اثرات ہیں۔ خوشی، یاد، رحم اور بے نیازی
وغیرہ شانت رس کی قبولیت کے بارے میں تنازعات
بھی رہے ہیں۔ آچاریہ بھرت نے رسوں کی تعداد آٹھ
مانی تھی۔ ان کے بعد اچاریہ ریڈھی نے اپنی تصنیف کاویا
درش میں آٹھ رسوں کو پیش کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے
کہ آچاریہ بھامہ بھی رسوں کی تعداد آٹھ ہی مانتے ہیں اب
سے پہلے اچاریہ اُدبھٹ نے نو رسوں کو قبول کیا ہے۔
اور انھوں نے شانت رس کو پہلی بار پیش کیا۔ شانت رس
کی مخالفت میں حسب ذیل دلیلیں پیش کیں۔

۱۔ آچاریہ بھرت نے اسے نہیں پیش کیا ہے
۲۔ اسٹیج stage پر اسے نہیں پیش کیا جا سکتا
اس کی نمو پذیری عوام الناس میں نہیں ہو سکتی
۳۔ شانت رس میں محبت اور نفرت دونوں رکاوٹ
ڈالتی ہیں جبکہ دنیا محبت اور نفرت سے خالی
نہیں ہے اس لیے یہ قبل کی فطرت کے مطابق
نہیں ہے لیکن یہ ان دلیلوں کے خلاف اظہار خیال
کیا گیا ہے۔ ان آچاریوں کا کہنا ہے کہ یہ ضروری
نہیں ہے کہ آچاریہ بھرت نے اگر اسے اہمیت حق ہے،
تشہیر دی ہے تو اسے قبول نہیں کیا جائے چونکہ یہ
ذائقہ لاتی ہے۔

شانت رس حوالہ کے لیے نہیں ہو سکتا یہ صحیح ہے
لیکن اگر آپ غور کریں تو شرنگار رس بھی تو سبھی کے لیے
نہیں ہے۔ ایک وہ شخص جو عبادت گزار ہے اور خالق
حقیقی سے لو لگائے ہے اسے شرنگار رس سے کیا لینا دینا۔
اس ضمن میں اردو کی مثال حسب ذیل ہے ۔

پائندہ ہوں وہ اوج مجھے آج ملا
ظلّ علم صاحب معراج ملا

منبر پہ نشست سر پہ حضرت کا علم
اب چاہئے کیسا تخت ملا تاج ملا
(میرانیس)

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے
مانند حباب ہستی انساں ہے
لنگر اگر ہے دل تو ہر نفس باد مراد
سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے
(میرانیس)

واتسلیہ رس (کیفیت آمیز رس)
واتسلیہ رس کی دو اقسام ہیں
سینیوگ واتسلیہ संयोग वात्सल्य
اردو کی مثال یوں ہے ۔

وہ گورے گورے چہرے پہ زلفیں ادھر ادھر
کرتے گلوں میں نور بدن جن سے جلوہ گر
اختر سے وہ چمکتے ہوئے کان کے گہر
رشک طوق گلے، غیرت قمر
بسکیں پہ نقش نام خدائے جلیل کے
تعویذ گردنوں میں پر جبرئیل کے
مسجد میں آئے ہنستے ہوئے جب وہ گل بدن
خوشبو سے صحن مسجد جامع بنا چمن
تسلیم کو حسین سے پہلے جھکے حسن
فطرس ہوئے مسکرانے لگے سرور زمن
(میرانیس)

یوگ واتسلیہ योगवात्सल्य شفقت آمیز کیفیت

مثال نمبر ۲ ۔
کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھائی نہ تھی کبھی
روئیں پسر بے خبر لیٹے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی
ان کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی
روئیں پسر پہ ان کو رلاتی نہ تھی کبھی

(بقیہ ص ۱۸۵ پر)

عادل فراز
۲۵۰/۶۸۱ مفتی گنج ۔ لکھنؤ
9936066598

میر انیس کی بیانیہ شاعری

مرثیہ ایک طویل بیانیہ نظم کا نام ہے جس میں مرثیہ نگار ایک طویل واقعہ کو منظوم پیرائے میں ڈھالتا ہے اور سامعین گھنٹوں ایک واقعہ کو دلچسپی کے ساتھ سنتے ہیں۔ طویل واقعہ کو سامعین کی دلچسپی کے لحاظ سے اس طرح تہہ در تہہ ڈھالنا ضروری ہوتا ہے کہ مختلف واقعات ایک سلسلہ وار واقعہ کی کڑی معلوم ہوں۔ بیانیہ گو کہ نثری اصناف میں زیادہ ابھرتا ہے مگر اصناف نظم میں بیانیہ پر خاص توجہ کی گئی اور بیانیاتی نظام میں کئی خوشگوار تبدیلیاں سامنے آتی رہیں۔ میر انیس میں بیانیہ کی کیفیت کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ بیانیہ کی تعریف اور لوازمات کا جائزہ لیا جائے۔

بیانیہ کا اطلاق نثری اصناف پر ہوتا ہے بیانیہ یعنی Narrative افسانہ ناول اور قصہ کہانیوں میں موجود ہوتا ہے۔ فکشن کا پورا تانا بانا بیانیہ سے ہی تیار ہوتا ہے۔ بیانیہ ہی کسی بھی خیال یا کہانی کو زندگی عطا کرتا ہے زوتان تادا روف کے بقول "بیانیہ برابر ہے حیات کے" بیانیہ کی اہمیت پر لیوتار لکھتا ہے "بیانیہ ہی سے معاشرہ کوائف و روابط، نیک و بد، غلط و صحیح کی پہچان اور ثقافتی رویوں کے معیار طے ہوتے ہیں بیانیہ نہ صرف کسی بھی معاشرہ میں انسانی رشتوں کے نظم و ضبط کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ فطرت اور ماحول سے انسان کے روابط کا بھی مظہر ہوتا ہے کسی بھی معاشرہ میں حسن، حق اور خیر کے معیار اس سے طے ہوتے ہیں اور عوامی دانش و حکمت بھی اسی سرچشمہ کی دین ہیں۔ مختصر یہ کہ کسی بھی صحافت میں معاشرتی کوائف و ضوابط اور معاشرتی رشتوں کی تشکیل و تہذیب جس سرچشمۂ فیضان سے ہوتی ہے وہ بیانیہ ہے (ساختیات پس ساختیات و مشرقی شعریات۔ از گوپی چند نارنگ ص ۵۳۱)

لیوتار کے اس بیان کے بعد بیانیہ کی اہمیت کا اندازہ بخوبی ہوتا ہے۔ بیانیہ مردہ خیال کو زندگی عطا کرتا ہے اور معاشرتی و ثقافتی رویوں کے معیار طے کرنے میں اہم کردار عطا کرتا ہے۔ جدید نظم میں بیانیہ روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر بیانیہ کمزور ہوگا تو شاعر اچھوتے خیال اور نادر موضوع کے باوجود تاثر پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ شاعری میں بیانیہ کا رواج مرثیہ مثنوی اور قصیدے تک محدود رہا ہے لیکن نئی نظم میں نت نئے تجربوں کی کوشش اور لہجہ و ہیئت کی دریافت میں نئی نظم کی ہیئت میں بیانیہ کو خاص اہمیت دی۔

ادب میں بیانیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے مہابھارت اور رامائن کا طویل بیانیہ ان کی زندگی کی علامت بن کر ابھرتا ہے۔ اسی طرح شاہنامہ فردوسی، مثنوی مولانا روم زہر عشق، خواب و خیال، قطب مشتری اور دیگر اردو

کی تمام مثنویوں کو ان کے بیانیہ کی جدت نے امتیاز بخشا ہے ورنہ تقریباً تمام مثنویوں کے موضوعات میں یکسانیت محسوس ہوتی ہے۔ اردو مرثیہ کی عظمت کا معیار اس کے بیانیہ کی گوناگوں کیفیت ہی طے کرتی ہے میرے نزدیک عالمی ادب میں بیانیہ کے جو تجرباتی نمونے مرثیوں میں ملتے ہیں کسی دوسری صنف میں اس کے ہم پایہ نمونے دستیاب نہیں ہوتے۔

بیانیہ کی تعریف میں ممتاز نیر یوں رقم طراز ہیں:

”بیانیہ کئی معنوں میں کئی واقعات کی ایک داستان ہوتی ہے جو یکے بعد دیگرے علی الترتیب بیان ہوتے ہیں۔ تکنیک تنوع ناول اور افسانہ میں بشمولہ شب خون جنوری ۲۰۰۲) یہ تعریف ناول، افسانہ، مثنوی اور داستانوں کے لیے موزوں ہے مگر جدید نظم اس تعریف کے دائرے میں نہیں آتی کیونکہ جدید نظم ایک خیال اور ایک موضوع کا احاطہ کرتی ہے لہٰذا اس کا بیانیہ بھی ایک واقعہ یا ایک خیال کا پابند ہوگا۔ نیا افسانہ بھی کئی واقعات کو سمیٹنے سے کتراتا ہے یہی وجہ ہے کہ مائکرو فکشن جیسی اصطلاح نے جنم لیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بیانیہ کی تعریف میں واقعات کے ساتھ واحد کا صیغہ بھی استعمال کیا ہے۔ ”بیانیہ سے مراد ہر وہ تحریر ہے جس میں کوئی واقعہ یا واقعات بیان کیے جائیں“ (شب خون ۲۰۰۲ جنوری ص ۶۵) فاروقی کی نگاہ میں جدید نظم کا ارتقائی عمل تھا لہٰذا وہ واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کو ہی بیانیہ کا خاصہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کے مطابق ایک واقعہ بھی بیانیہ کا حصہ بن سکتا ہے۔

بیانیہ شاعری کا بنیادی ذریعۂ اظہار قصہ گوئی میں ہوتا ہے تمثیلی قصوں اور داستان گوئی میں بیانیہ شاعری کا فن ہی کمال عطا کرتا ہے۔ ایک مختصر یا طویل کہانی کو مکالموں اور لفظوں کے صوتی آہنگ سے امتیاز عطا کرتا ہے داستان اور تمثیلی قصوں میں بنیادی طور پر ”ہیرو“ کو اہمیت دی جاتی ہے کہانی کا پورا پلاٹ ”ہیرو“ کے ارد گرد ہی بنا جاتا ہے ”ہیرو“ کے علاوہ دیگر کرداروں کی اہمیت ذیلی ہوتی ہے مگر یہ ذیلی کردار ایسا اوقات ”ہیرو“ کے کردار پر غالب ہو جاتے ہیں۔ اس کہانی میں ہیرو کے کردار کے ساتھ ہیرو کا تہذیبی ماحول، معاشرتی ثقافت ادب اور فنون لطیفہ کو خاص توجہ دی جاتی ہے علاقائی طرز معاشرت و ثقافت کو ہیرو کے کردار کے ساتھ مطابقت دی جاتی ہے تاکہ قاری اجنبیت کا شکار نہ ہو۔ مرثیہ طویل قصے، کہانیوں اور تمثیلی داستانوں کے پیرائے میں ہی لکھا جاتا ہے مرثیہ بھی ”ہیرو“ کے کردار کو مکالماتی ڈرامائیت، صوتیاتی آہنگ اور معاشرتی تمدن کے اظہار کا ذریعہ قرار دیتا ہے مگر مراثی کا امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ ”ولن“ کے کردار کو بھی اسی طاقت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے جس طاقت کے ساتھ ہیرو کے کردار کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ خیر و شر کے معرکہ کی صحیح منظر کشی ہو سکے۔

بیانیہ شاعری کی چار اقسام

بیانیہ شاعری کی چار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ نظم نگاری / گیت Ballad اس کا بیانیہ روایتی قصے کہانیوں سے گوندھا جاتا ہے۔ اساطیری واقعات اور مافوق العادت کہانیوں کو نغموں یا گیتوں کی ہیئت میں پیش کیا جاتا ہے یہ گیت طویل اور مختصر دونوں ہیئتوں میں لکھا جاتا ہے یعنی ایک رباعی اور قطعہ کی شکل میں بھی۔

۲۔ لے (Lay) انگریزی میں اسے لائی کہا جاتا ہے اس کے ڈانڈے فرانسیسی بیانیہ شاعری سے ملتے ہیں اس بیانیہ میں ماورائی تصورات کو جگہ دی جاتی ہے۔

۳۔ رزمیہ (Epic) یہ ایک شاعرانہ بیانیہ ہے جس میں شاعر ہیرو کی بہادری اور اس کے کارناموں کو پرجوش

انداز میں نظم کرتا ہے جیسے مہابھارت کے کردار، رانی جھانسی
بھگت سنگھ، مہاتما گاندھی اور امام حسین کے کردار اور کارناموں
کو رزم نگاروں نے رزمیہ کے تمام اصولوں کو بروئے کار لاتے
ہوئے تحریر کیا ہے۔ انیس و دبیر کے مرثیہ رزمیہ کے اصولوں
پر کھرے اترتے ہیں۔

۴۔ دیہقانی گیت یا قصیدہ (Dayll) ایسی نظموں میں
ہیرو کو استعاراتی شکل میں پیش کیا جاتا ہے جس کی
نوعیت عینی بھی ہو اور مشاہداتی بھی۔ جیسے مارٹن لوتھر
گاندھی جی، ٹیپو سلطان، جھانسی کی رانی پر لکھی گئی بیانیہ نظمیں۔

انیس کا مرثیہ بیک وقت ان چاروں اقسام کا احاطہ
کرتا ہے۔ اس امتیاز کے ساتھ کہ انیس کا مرثیہ ماورائی
تصورات اور اساطیری قصے کہانیوں سے مبرا ہے۔ مگر
انیس کا بیانیہ اکثر واقعات میں اساطیریت اور ماورائی
تصورات کی جھلکیاں پیش کرتا ہے یعنی جس وقت وہ میدان
جنگ کا نقشہ کھینچتے ہیں اور ہیرو جنگ پر آمادہ نظر آتا ہے
یا جس وقت میر صاحب گھوڑے اور تلوار کی تعریف کرتے
ہیں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم مافوق العادۃ کہانیوں
کو پڑھ رہے ہوں اور ماورائی تصورات کوئی شے ہماری
آنکھوں کے سامنے متحرک ہو۔

انیس کا ڈرامائی بیانیہ

ڈرامہ کا فن شاعری کے فن کو کمال عطا کرتا ہے کیونکہ
ڈرامہ کی تشکیل میں بیک وقت کئی فنون لطیفہ کی کارفرمائی
ہوتی ہے۔ ڈرامہ جس طرح اسٹیج پر مختلف فنی مہارتوں
کی بنیاد پر کھیلا جاتا ہے اور ناظرین کو مسحور کر دیتا ہے اسی
طرح مرثیہ میں ڈرامے کے فن کا استعمال سامع کو تصور میں
ناظر کی صف میں شامل کر دیتا ہے۔ گویا مرثیہ نگار ایک
واقعہ میں ڈرامے کے فن کے استعمال کی بنیاد پر وہ تمام
کیفیات شامل کرتا ہے جو ایک اسٹیج ڈرامہ کے لیے ضروری
ہوتی ہیں فن ڈرامہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر
وزیر آغا لکھتے ہیں "ڈرامہ کے لیے کہانی کا انتخاب
کرتے وقت اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے کہ
کہانی میں کرداروں کا تصادم اور پلاٹ کا مدوجزر ضروری
ہے" مزید لکھتے ہیں "ڈرامہ نگار کا کام یہ ہے کہ وہ
وقت کی طنابیں کھینچ کر ان واقعات کو ایک محدود وقت
میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان میں از خود ایک ڈرامائی
کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ مبالغہ سے
کام لے کر ان واقعات کے نقوش کو زیادہ شوخ کر دیتا
ہے تاکہ ناظرین پر ان کے گہرے اثرات مرتسم ہو سکیں
(نئی قدریں ڈرامہ نمبر ص ۳۴ شمارہ ۵ سال ۱۹۶۸ مضمون
اردو ڈرامہ از وزیر آغا) ڈاکٹر وزیر آغا کے اس بیان کے
ضمن میں انیس کے مرثیے کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہوگا
کہ انیس کس طرح چودہ سو سال پہلے کے تاریخی واقعات
کی طنابیں کھینچ کر ایک محدود وقت میں اس طرح پیش
کرتے ہیں کہ ڈرامہ نگار کا فن از خود ہر مصرع میں محسوس
ہوتا ہے یعنی میر انیس عمداً فن ڈرامہ نگاری کو برتنے
کی کوشش نہیں کرتے بلکہ واقعات کا تسلسل، کرداروں
کا تصادم اور پلاٹ کا مدوجزر ڈرامائیت کو جنم دیتا ہے۔

ڈرامائی بیانیہ کے لیے دوسری بڑی ضرورت مکالمہ
نویسی کی ہوتی ہے۔ شاعری میں یوں بھی مکالمات کو منظوم
پیرائے میں اس طرح ڈھالنا کہ ہر مصرع روزمرہ معلوم ہو
اور ضرب المثل بن جائے مشکل ہوتا ہے مگر انیس کے
مراثی کے اکثر مصرع روزمرہ کی بہترین مثال اور زباں زد
خاص و عام ہیں فن ڈرامہ کی ایک خوبی کرداروں کی پیش
کش ہے۔ کرداروں کی پیش کش کا انداز ہی ڈرامائیت
میں اضافہ کا سبب بنتا ہے۔ کرداروں کی تعمیر کے پس
پردہ محرک سماجی، تہذیبی یا حولیاتی عوامل کارفرما ہوتے
ہیں جن کے بغیر کرداروں کی فنی تکمیل ممکن نہیں۔ ہر کردار

اپنے ماحولیاتی نظام اور سماجی و ثقافتی تمدن کا آئینہ دار ہوتا ہے جیساکہ انیس کے مرثیے کے کردار اودھی تہذیب کے پروردہ معلوم ہوتے ہیں۔ میر انیس کے مرثیوں کا وصف خاص یہی ہے کہ ان کے کردار عربی تہذیب و ثقافت کے آئینہ دار ہوکر اودھی و ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انیس کے مرثیوں میں لکھنوی تہذیب و ثقافت کا زوال اور ۱۸۵۷ء کا انتزاعی دور پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

چونکہ مرثیہ حزنیہ کیفیت کا حامل ہوتا ہے اور ڈرامہ کے لیے حزنیت زیادہ پر اثر ہوتی ہے اس لیے انیس کے تمام کرداروں پر حزنیہ کیفیت حاوی رہتی ہے۔

مرثیہ نگار کی فنی آزمائش یہی ہے کہ مرثیہ کے تمام کردار حقیقی اور عظمت کے حامل ہیں کوئی بھی واقعہ مافوق العادۃ اور خلاف فطرت نہیں ہے یہ الگ بات کہ مرثیہ نگار مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے کسی کردار یا کسی واقعہ کو مافوق العادۃ بنانے کی کوشش کرے۔ انیس ان معائب سے بھی بری ہیں۔ ان کے کرداروں میں ڈرامائیت اور مبالغہ آرائی موجود ہے مگر کہیں کہیں یہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ کردار مافوق العادۃ افعال انجام دے رہے ہیں بلکہ کرداروں کی عظمت مبالغہ آرائی اور ڈرامائیت کے فن کو بھی اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے۔

میر انیس جس طرح مرثیہ کا آغاز کرتے ہیں اور پھر مناظر قدرت کے بیانیہ کے ساتھ تمام عناصر کی ترتیب کا خیال کرتے ہوئے شہادت کے بیانیہ تک آتے ہیں وہ کمال فن ہے گویا مرثیہ ایک نظم نہ ہوکر ایک مکمل ڈرامائی تشکل اختیار کرلیتا ہے جس کے کردار بہت واضح اور تمام ڈرامائی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔ ڈرامائی عناصر کی تکمیل نے مرثیہ کو کمال عطا کیا ہے۔ اس طرح ہم صرف مرثیہ کے کینوس پر تمام کرداروں کو اسی طرح متحرک دیکھتے ہیں جس طرح ڈرامہ کے اسٹیج پر دکھائی دیتے ہیں بعض کرداروں کی ہمارے تصور میں مختلف تشکلیں بن جاتی ہیں اور اسی تصوراتی تصویر کی بنیاد پر ہم مرثیہ کے کرداروں کی عظمت کی افہام و تفہیم کے مسئلے سر کرتے ہیں مثلاً حضرت عباس کے لیے ایک زبردست بہادر دلیر مرد اور سقائے حرم کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے امام حسین ایک سرپرست اور صابر کی اعلا مثال نظر آتے ہیں حضرت زینب مثالی خاتون بھائی سے بے انتہا محبت کرنے والی بہن تیر دل عورت اور ایک صابر دکھائی دیتی ہیں اسی طرح دیگر کردار بھی اپنے سیاق و سباق کی بنیاد پر مختلف خوبیوں کی بنا پر اپنی ایک امیجری بناتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح منفی کردار کی بھی ایک الگ تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جیسے حرملہ، شمر، ابن سعد اور خولی وغیرہ یہ تصویریں مرثیوں کی ڈرامائی عناصر کی تشکیل کی بنیاد پر ابھرتی ہیں جبکہ بعض کردار اس تصویر سے بالکل الگ یا مختلف خوبیوں کی حامل ہیں جیسے تاریخی لحاظ سے حضرت عباس علمدار ایک فقیہہ وقت، بہترین مدبر اطاعت گزار، صابر اور جنگی بصیرت کے متحمل شخص ہیں مگر مرثیوں میں ان خوبیوں کا احاطہ بہت کم کیا گیا ہے یعنی جو تصویر مرثیہ نگار نے پیش کی ہے ہم اسی تصویر کے رنگوں کے آج بھی عادی ہیں اگر آج بھی کوئی اس تصویر سے الگ دوسری تصویر پیش کرتا ہے تو سامعین کی سماعتوں اور عقیدتوں پر گراں گزرتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ ڈرامائی بیانیہ ملاحظہ ہو۔

گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا
لو اب اٹھا لو تیغ و سپر تم پہ ہیں فدا
دریا کو تم تو لے چلے اے میرے مہ لقا

وہ تیسر ہو کہ دھاک ہے ساری خدائی میں
دیکھو کوئی تمہارے سوا ہے ترائی میں

جب کربلا میں داخلۂ شاہ دیں ہوا

اس مرثیہ میں موجود واقعاتی نظام کا تاریخی صفحات میں ذکر نہیں ہے یعنی جس طرح کربلا میں امام حسین کے داخلہ کے واقعہ کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ واقعی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے مگر بیان کئے گئے اکثر واقعات تاریخی حقائق پر مشتمل نہیں ہیں مگر واقعاتی نظام کا تصوراتی بیانیہ حقیقت سے بعید بھی نہیں لگتا یعنی مکمل واقعہ جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ تاریخی نہیں ہے مگر شعری تقاضوں کی بنیاد پر اور ڈرامائی عناصر کی تمیز نے اس مرثیہ کو اصل تاریخ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے جبکہ تاریخ میں کہیں ایسا واقعہ موجود نہیں ہے کہ حضرت عباس نے کبھی اپنے آقا حضرت حسین کے حکم سے سرتابی کی ہو یا اطاعت حکم میں تامل سے کام لیا ہو جبکہ مرثیہ نگار یہ دکھاتا ہے کہ جوش شجاعت میں کس طرح حضرت عباس کا چہرہ سرخ اور غصہ عقل و فہم پر غالب ہے شجاعت کا ایسا بیانیہ سامعین خوب سنتے ہیں اور محو ہو جاتے ہیں اور اس وقت اس حقیقت سے بھی باخبر نہیں ہوتے کہ حضرت عباس کی حقیقی شخصیت کیا ہے۔

مثلاً حضرت حر بن یزید ریاحی کا ابن سعد سے یہ مکالمہ ملاحظہ کریں جبکہ اس مکالمہ کا تاریخ سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر جس طرح بیانیہ میں اس مکالمہ کو لکھا گیا ہے اور واقعہ نگاری کی گئی ہے وہ اس مکالمہ کو اصل تاریخ کا حصہ بناتی ہے۔ وہیں مصرعوں میں للکار کی کیفیت جو ڈرامہ کا اہم حصہ ہے ایک نیا بیانیہ وضع کر رہی ہے۔
ملاحظہ فرمائیں۔

عمل خیر سے بہکا نہ مجھے او ابلیس
وہی کونین کا مالک ہے وہی ارض و رئیس

کیا مجھے دے گا ترا حاکم ملعون و خسیس
کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھیں پرچہ نویس
ہاں سوئے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں
پہلے جاتا نہ تھا ظالم تو لے اب جاتا ہوں

انیس کے کلام میں مختلف واقعات جس طرح زنجیر کی ایک کڑی معلوم ہوتے ہیں وہ خوبی دوسرے مرثیہ نگاروں کے یہاں کم نظر آتی ہے۔ ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف گریز کا انداز دوسروں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ گریز کا بند دوسرے واقعہ کا پہلے واقعہ سے رشتہ منقطع نہیں ہونے دیتا بلکہ اسی واقعہ کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔

جملہ اصناف سخن کا مجموعہ مرثیہ

مرثیہ اپنے جامع، محیط اور وسیع بیانیہ کی بنیاد پر جملہ اصناف سخن کا مجموعہ نظر آتا ہے۔ مرثیہ بیک وقت مثنوی، قصیدہ، غزل اور شہر آشوب جیسی اصناف سخن کا مجموعہ ہے جس طرح مختلف واقعات مثنوی میں تسلسل کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں اسی طرح مرثیہ میں بیان ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مرثیہ اپنے آغاز میں مثنوی کی ہیئت میں زیادہ لکھا گیا۔ ڈاکٹر رشید حسن خاں بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اردو ادب کے پچھلے سرمایہ میں بیانیہ شاعری کے سب سے اچھے نمونے یا تو مثنویوں میں ملیں گے یا مرثیہ میں (تعارف: انتخاب مراثی انیس دو بیر ص ۷)، چونکہ اپنے عہد کے تمام تر مرثیہ گو مثنوی نگار بھی ہوتے تھے لہذا مثنوی کے فن کو مرثیہ کے فن کے ساتھ برتنے میں مشکل درپیش نہیں آئی اسی طرح سودا اور میر تقی جیسے تمام شاعروں نے مرثیہ لکھا۔ وہ تمام مرثیہ نگار قصائد کے فن پر بھی دسترس رکھتے تھے لہذا مرثیہ میں قصیدہ کا فن بھی نظر آتا ہے

مگر میرانیس اور مرزا دبیر کے عہد سے پہلے تک قصیدہ، غزل اور مثنوی کے فن سے مرثیوں میں کم استفادہ کیا گیا۔ اگر مراثی دبیر و انیس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح ایک مرثیہ اپنے الگ الگ حصوں میں مثنوی، قصیدہ، غزل اور شہر آشوب کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔

مرثیہ میں قصیدہ کے تمام اجزائے ترکیبی سے مدد لی گئی اس فرق کے ساتھ کہ قصیدہ فقط زندوں کے اوصاف کا بیانیہ ہے جبکہ مرثیہ میں مردوں کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے یا یوں کہا جائے کہ شہید کو مردہ کہنا قرآنی حکم کے خلاف ہے کیونکہ قرآن شہدائے راہ حق کو زندہ کہہ کر خطاب کرتا ہے اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ میں بھی شہید کی تعریف زندوں کی تعریف کے زمرے میں آتی ہے۔ قصیدہ کا اہم حصہ ہجو ہوتا ہے۔ مرثیہ میں یزیدی لشکر کی ہجو کے پہلو جا بجا ملتے ہیں اور قصیدہ سے بہتر انداز میں ملتے ہیں۔ رہی غزل کی بات تو مرثیوں کے اکثر اشعار کو غزل کے اشعار کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

مزید جملہ اصناف سخن کی خوبیوں اور اجزائے خاص کو ہیئتی انفرادیت اور بیانیاتی وسعت کی بنیاد پر سمیٹتا ہے مرثیہ کے علاوہ کوئی دوسری صنف سخن دیگر اصناف کا مجموعہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی کیونکہ اس کی ہیئت اور بیانیاتی نظام میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مرثیہ کی کامیابی کا اصل راز یہی ہیئتی و بیانیاتی نظام ہے۔ جس پہ مرثیہ کے متعصب ناقد کی نگاہ نہیں گئی اگر کلیم الدین احمد جیسے ناقدین مرثیہ کو ہیئت و بیانیہ کے لحاظ سے پرکھتے تو شاید مرثیہ کی مخالفت کے جواز نہ تلاشنے پڑتے

عہد انیس کا جائزہ لینا ضروری

میر انیس کے بیانیہ کا جائزہ لینے سے قبل یہ جائزہ لینا بھی ضروری ہے کہ انیس جس عہد میں مرثیہ لکھ رہے تھے وہ میر تقی میر اور ناسخ کا عہد تھا یعنی میر تقی میر اپنے انداز بیان اور قدرت لسانی کی بنیاد پر خدائے سخن کا درجہ پا چکے تھے۔ میر تقی میر کے بعد لکھنؤ میں ناسخ کا دور آتا ہے یہ دور صناعی اور بے روح قافیہ پیمائی کا دور تھا یعنی جس روایت کو میر تقی میر دہلی ہونے کی بنیاد پر لکھنؤ میں پروان چڑھا گئے تھے ناسخ اس کے برخلاف معنی سے زیادہ لفظی صناعیت پر زور دینے لگے قصیدہ اور مثنوی میر نے بھی لکھے اور ناسخ کے عہد میں قصیدہ و مثنوی کی ترویج کے لیے کوششیں ہوئیں کیونکہ جس انداز بیان کو ناسخ پروان چڑھانا چاہتے تھے وہ قصیدہ اور مثنوی کے مزاج سے قریب تھا۔ ناسخ اور ان کے شاگردوں نے شاعری کی بنیادی قدروں کو بدلا اور شعری روایت میں نئے دور کا آغاز کیا۔ ناسخ کے بعد ایک زمانہ تک ان کے رائج کردہ اصولوں اور شعری نظریہ کی اتباع کی جاتی رہی۔ میر انیس کا عہد ناسخ کے عہد سے ملتا ہے یعنی انیس، میر تقی میر اور ناسخ جیسے اساتذۂ سخن سے مشاق، ہنرمندی اور فنی چابکدستی پہ گہری نظر رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ انیس کا مرثیہ دونوں کی روایت کا حریف معلوم ہوتا ہے۔ میر انیس کا بیانیہ میر کے قصیدوں مرثیوں مثنویوں سے ممتاز اور ناسخ کی ادبی جدت طرازیوں سے برأت کا اعلان ہے۔

گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں "انھوں نے (انیس) مرثیہ کی فضا میں قصیدہ کی روایت (غیر شعوری طور پر ہی سہی) استفادہ کرکے فصاحت کے مروجہ مفہوم میں نئی جہات کا اضافہ کیا اس طرح گویا ناسخیت کے بعض اجزا کی تقلیب کرکے انھوں نے ناسخیت سے ٹکر لی۔ مرثیہ کو نیا جمالیاتی ذائقہ دیا اور بالواسطہ طور پر ناسخیت کی شکست میں اہم کردار ادا کیا۔ (اسلوبیات انیس مشمولہ انیس شناسی ص ۱۶۱، ۱۶۲)"

واضح ہوتا ہے کہ میر انیس مرثیہ کی روایت میں تقلیب کے ساتھ مرثیہ کی فضا کو عام فصاحت و بلاغت کے اسلوب سے یگانہ بنا رہے تھے۔ اس تبدیلی کے لیے انیس نے جہاں اسلوب بیان میں کئی اہم تبدیلیاں کیں وہیں مرثیہ کا بیانیہ بھی قصیدوں اور مثنوی کی زبان سے الگ رکھا۔

آخر مرثیہ میں اچانک ایسی کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کی بنیاد پر مرثیہ ادبی حیثیت اختیار کر گیا جس عہد میں شعری صلاحیتوں کے اظہار کے لیے غزل، قصیدہ اور مثنوی جیسی اصناف سخن موجود تھیں اور ہر شاعر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے کے لیے انھیں اصناف سخن کا سہارا لے رہا تھا۔ میر انیس ان تمام اصناف سے ہٹ کر مرثیہ کی طرف مائل ہوتے ہیں اور مرثیہ کی ادبی حیثیت بدل جاتی ہے جبکہ مرثیہ انیس سے قبل بھی مسدس کی ہیئت میں لکھا جا رہا ہے یعنی ہیئت کی تبدیلی مرثیہ کی حیثیت منوانے کا ذریعہ نہیں بنی۔ ہاں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جن ادبی قدروں کو مرثیہ میں شامل کیا گیا مسدس کی ہیئت اس کے اظہار کے لیے موزوں ہیئت تھی ورنہ اسلوب بیان، فصاحت و بلاغت کے اصول اور دوسرے ادبی قواعد مثنوی اور قصیدوں میں برتے جا رہے تھے انیس نے مرثیہ میں بیک وقت تمام اصناف سخن کے اجزاء کو اس طرح شامل کیا کہ مرثیہ اپنی ساخت میں مرثیہ رہا مگر اس کے بعض قصیدہ، مثنوی اور غزل سے قریب ہونے لگے۔ اس تبدیلی میں انیس نے بیانیہ کی قدرت کا سہارا لیا اور اہم تبدیلیاں کیں۔

مرثیہ کے بعض اجزائے ترکیبی قصیدہ سے مستعار لیے گئے ہیں لہٰذا مرثیہ پر قصیدہ کے اثرات کا مرتب ہونا لازمی تھا ساتھ ہی جن اساتذہ نے قصیدہ کو بام عروج پر پہنچایا ان کا اسلوب اور مزاج بھی مرثیہ کے مزاج اور اسلوب کی توضیح و ترقی میں معاون ثابت ہوا۔

ضروری ہے کہ انیس کے عہد میں لکھے جانے والے قصائد کے بیانیہ اور موضوع کو مرثیہ کے موضوع اور بیانیہ کے ساتھ تقابلی جائزہ لیا جائے۔ اس لیے کہ انیس کا مرثیہ بیک وقت سودا، میر ناسخ کے قصائد کے اسلوب اور مروجہ روایت سے انحراف کی کہانی دہراتا ہے کیونکہ انیس خود بھی یہ توضیح دے چکے تھے کہ ان کا مزاج درباری نہیں ہے لہٰذا ان کی طبیعت کبھی قصیدہ کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود مرثیہ میں ہیرو کی تعریف کے وقت ان کا مزاج قصیدہ کے مزاج کے کافی قریب معلوم ہوتا ہے یہ الگ مسئلہ کہ اس تعریف میں قصائد سے الگ کیفیت دخیل رہی کیونکہ انیس کے مرثیہ کا ہیرو معصوم اور اللہ کے منتخب بندے ہیں لہٰذا تعریف کا دائرہ بھی احتیاط کے ساتھ بنایا گیا ہے۔

انیس کو یہ بھی علم تھا کہ ان کے عہد تک فن شاعری کا بہترین اظہار کا ذریعہ قصیدہ تھا لہٰذا ان کے زیادہ تر مرثیوں میں قصیدہ کا فن حاوی نظر آتا ہے۔ قصیدہ کی طرح مرثیہ میں بھی تعریف کا اسلوب اور ہجو کا انداز فطرت نگاری مبالغہ آمیزی اور مختلف واقعات کو مضبوط بیانیہ کی لڑی میں پرونا انیس کا ہی خاصہ ہے۔ انیس کے مرثیہ پر کس قدر قصیدہ کا فن حاوی ہے۔ گھوڑے اور تلوار کی تعریف کے چند بند ملاحظہ ہوں۔

رستم تھا درع پوش کہ پاکھر میں راہوار
جرار بردبار، سبک رو، وفا شعار
کیا خوشنما تھا زین طلاکار و لفقرہ کار
اکسیر تھا قدم کا جسے مل گیا غبار
خوش خو تھا خانہ زاد تھا دلدل نژاد تھا
شبیر بھی سخی تھے فرس بھی جواد تھا
(جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے)

ابرڈھالوں کا اٹھا تیغ دو پیکر چمکی
برق چھپتی ہے یہ چمکی تو برابر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی کبھی سر پر چمکی
کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن اسے ڈستے دیکھا
مینہ سروں کا صف دشمن پہ برستے دیکھا

دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہے دھارا جیسے
گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے
روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کوندنا برق کا شمشیر کی ضو میں دیکھا
کبھی ایسا نہیں دم خم مہ نو میں دیکھا
(نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری)

گھوڑے کی اور تلوار کی تعریف میں سودا ذوق اور مصحفی نے بھی قصیدے لکھے ہیں یا کسی قصیدے میں ضمنی تعریف کی ہے مگر تعریف کا یہ انداز اور لفظیاتی تیور ان کے قصائد میں مفقود ہے خاص طور پر جس طرح میر انیس کلائیوں، بھنووں، آنکھ، ناک، کان، زلفوں، شانوں گردن، ہاتھ، ہونٹ، رخساروں اور پیروں کی چال ڈھال کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ انداز فقط میر صاحب ہی کا خاصہ ہے۔ قصائد اور مثنویوں میں بھی تعریف میں ایسا تنوع نظر نہیں آتا جو میر صاحب کے یہاں موجود ہے۔

مراثی انیس میں بیانیاتی نظام کی انفرادیت وجدت پر تنقیدی نگاہ کی ضرورت ہے۔ اب تک مراثی انیس کی وہ خصوصیات واضح نہیں ہو سکی ہیں جو دیگر اصناف نظم میں مفقود ہیں اور دیگر مرثیہ نگاروں کے یہاں بھی اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ ہمارے ناقدین نے مرثیہ کو ایک مذہبی صنف سخن کے طور پر دیکھا ہے بہتر ہوگا کہ عقیدت کی عینک اتار کر خالص فنی نقطہ نگاہ سے مرثیہ کی خوبیوں و خامیوں کا جائزہ لیا جائے۔ ◇

صفحہ ۱۷۷ کا بقیہ

میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی وہ میں تھی ماں کو کبھی جانتے نہ تھے
ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خورد سال
پر ان کے آگے مجھے کچھ نہ تھا خیال
راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال
میں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہے میرا لال
وہ دونوں مرنے والے پہلو میں ہوتے تھے
پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے
(میر انیس)

مثال نمبر ۳۔
ایک بچہ پھول جیسا سب کو اکیلا کر گیا
اب بھلا یہ باغ میں کیوں تتلیاں کم ہو گئیں
گرا دیا اسے اس قدر جلدی
ہوا ابھی تو مرا گل مہکنے والا تھا
(ظفر گورکھپوری)

اردو شاعری رسوں سے بھری ہوئی ہے جو بات شاعری اور رس نظریہ کے تعلق سے میری نظر میں میر انیس اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

حواشی

۱۔ ناٹیہ شاستر नाट्यशास्त्र
۲۔ ابھینو رس بیمان
۳۔ آچاریہ دنڈی
آچاریہ جامہ
آچاریہ ابھینو گپتا۔

◇◇

سید حمید الحسن
عمید جامعہ ناظمیہ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ
9415028645

میر انیسؔ اور عالم انسانیت

ارباب جریدہ نیا دور کا شکر گذار ہوں کہ ان کی طرف سے مندرجہ بالا موضوع پر کچھ لکھنے کی فرمائش ہوئی۔ ظاہر ہے جب تک ہم میر انیسؔ کی عظمتوں اور رفعتوں تک نظر بلند کرنے کی ہمت و جرأت نہ کر لیں جب تک ہم ان کے ایک ہی مرثیہ کو پوری طرح پڑھ لینے اور سمجھ لینے کی صلاحیت حاصل نہ کر لیں اس موضوع پر قلم اٹھانا قارئین کا وقت ضائع کرنا ہی سمجھا جائے گا مگر اس لیے کچھ نہ کچھ لکھنا ہے کہ ''نیا دور'' کا تقاضا ہے کہ نئے دور میں جینا ہے تو یہ سب کرنا ہوگا ورنہ بس اس دور سے دور ہی چلے جاؤ۔

میر انیس کو تو ہم بہت ہی کمسنی سے پڑھتے چلے آئے ہیں۔ گھر کی زنان خانے کی مجالس میں ہماری امی مرحومہ جب مرثیہ پڑھتی تھیں اور ہر طرف سے رونے کا شور بلند ہوتا تھا جسے لکھنؤ کی زبان میں چٹّس پڑ جانا کہتے ہیں۔ تو ہم اپنی مرحومہ امی کے چہرے کو دیکھتے رہتے تھے کہ یہ کیا ہو رہا ہے سب تو رو رہے ہیں اور یہ زار و قطار روتی بھی جا رہی ہیں مرثیہ بھی پڑھتی جاتی ہیں۔ ہم بعد میں پوچھ لیتے امی یہ آپ اتنا رو رہی تھیں؟ جواب ملتا۔ ہاں بیٹا تم نہیں سمجھتے پڑھ کر سمجھ لوگے کہ میر انیسؔ کے یہ مرثیے کیا کیا سمجھا دیتے ہیں اور واقعی جب کچھ ہوش سنبھالا تو الماری سے ان کتابوں کو نکال نکال کر پڑھنا اور سمجھنا چاہا۔ صرف میر انیسؔ مرزا دبیر ہی نہیں اور بھی اساتذہ کے کلام ملے پڑھے اور تنہائیوں میں پڑھ کر اکیلے خود کو روتے پایا۔ آنسو ہی آنسو یہ کہتے تھے اب آیا سمجھ میں کہ تمہاری امی اور تمام بیٹیاں کیوں روتی ہیں۔ یہ دکھاوے کے آنسو نہیں ہوتے یہ ہر اس انسان کے دل کی چبھن ہوتی ہے جو اسے ایک مرثیہ نگار کا قلم عطا کرتا۔ مرثیہ نگاری کی نوک قلم تو بس کاغذ پر رنگ بھرتی ہے مگر اس کے افکار کی طغیانی ہر قلب میں گداز، ہر آنکھ میں سیلاب اشک اس لیے بھر دیتی ہے کہ اس کا مخاطب انسان ہوتا ہے اور اس کا محبوب انسان کی انسانیت کا محافظ ہوتا ہے اگر صرف غزل کی زبان ہے تو غالب سے سن لیجئے کہ پریشانی تو ہے مگر فرد کو ہے۔ فرد کے لیے ہے عام مجمع کو کیا؟

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

لیکن اگر مدح حقیقی مطلوب ہے اور مطلوب حقیقی کی مدح ہے تو پریشانی کیسی۔ میر انیسؔ ہر قاری کو نیا احساس عطا کر سکتے ہیں۔

نقش کفِ بو تراب ہو جاتا ہے
ہر آنکھ میں باریاب ہو جاتا ہے

چھو کر جو نکل جائے ذرا کلکِ انیسؔ
نقطہ بھی وہ آفتاب ہو جاتا ہے

وحشی ہیں وہ جو مظلوم پر ظلم کر کے اسے آنسو بہانے اور گریہ وزاری پر مجبور کرتے ہیں اچھے اور سچے انسان ہیں وہ جو کسی مظلوم کے آنکھوں سے بہتے اشک پونچھتے ہیں یا اس کی ہمدردی میں دوسروں کو آمادہ کرتے ہیں ان کی آنکھوں کو بھی نم کر دیتے ہیں۔ یہ عہد جاہلیت سے آج تک ایسا ہی دیکھا گیا ہے لیکن سرزمین ہند کے شاعروں نے اپنا مراثی کلام اس زمین سے وابستہ کر دیا جسے کربلا کہتے ہیں اور اپنے مرثیے ان شہیدوں سے مخصوص کر دیتے ہیں جنھیں کربلا والے کہتے ہیں اور اس طرح ہندوستان کے مرثیہ نگار با عظمت شعراء نے ایک دنیا کو اس جذبے سے آشنا کیا جو درد انسانیت اور عظمت انسانی کہلاتے اسے ہم حسینی۔ ہم مسلمان اگر کہتے ہیں تو صحیح ہے لیکن دیکھئے اسی بات کو ایک کرسچین ایک مسیحی محقق کس طرح کہتے ہیں ڈیوڈ میتھوز (لندن) لکھتے ہیں۔ ۱۹۶۹ میں لکھنؤ گیا۔ میرا لکھنؤ پہنچنا اتفاقاً نہیں بلکہ عمداً محرم الحرام کے پہلے دس دنوں میں ہوا جن دنوں کربلا میں رونما ہونے والے واقعات معرکہ کربلا اور حضرت امام حسین عالی مقام کی المناک شہادت عظمیٰ کو نہایت دردمندانہ احساسات وجذبات کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے اور تعزیہ داری کی نمائش کے ذریعہ حقیقی رنج والم کا اظہار کیا جاتا ہے۔" آگے وہ لکھتے ہیں "میں ہر صبح بلا ناغہ لکھنؤ کی اس چلچلاتی دھوپ میں نواب صاحب کے ہمراہ پاپیادہ اس جگہ جاتا تھا جہاں مجلس مرثیہ خوانی منعقد کی جاتی ہے۔ سفر کا کچھ حصہ میں ننگے پیر طے کرتا تھا بجائے اس کے کہ انیسؔ کے مندرجہ ذیل اشعار کو بلا وجہ کی بڑی مبالغہ آمیزی کہیں۔ ہمیں ایمانداراانہ طور پر کہنا ہوگا کہ یہ اشعار اس راستے کی صحیح کیفیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ جس راستے سے چل کر ہم اس مجلس میں پہنچتے تھے۔

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لوکہ الحذر، وہ حرارت کہ الاماں
رَن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

مسیحی محقق ہیں، مجمع ہے کوئی صاحب میر انیسؔ کا کلام سامعین کو سنا رہے ہیں اور انسانیت کا سبق یہ مرثیہ کیا دے رہا ہے کہ وہ آگے چل کر کہتے ہیں۔

"یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ہم لکھنؤ میں نہیں ہیں بلکہ ہمیں درحقیقت جسمانی طور پر عراق کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں لے جایا گیا ہے جہاں پر حضرت امام حسین عالی مقام ایک ناہنجار اور بے رحم دشمن کے ہاتھوں جام شہادت نوش کرتے ہوئے اپنے خالق حقیقی سے ملاقات کا شرف حاصل کرتا تھا۔ مضمون نگار کے وقیع تجزیہ میں ڈانٹے، شیکسپیئر یا نظامی جیسے شعراء کے یہاں کبھی ایسا پریشانی کا منظر نہیں ملے گا جہاں میر انیسؔ ہر اس جگہ فن کو کمال پر لے جاتے ہیں جہاں کہیں ریگستان کی گرمی اور تڑپا دینے والی پیاس کے باوجود شجاعت میں کوئی کمی ہو۔ وہ شجاعت جو انسانیت کے تحفظ کے لیے ہو۔ اقتدار پسندی کے لیے نہیں۔ بات صرف اتنی ہی نہیں کہ کربلا سے دنیا کتنا متاثر ہے اور بات صرف یہ بھی نہیں کہ دنیا کی ہر زبان میں کربلا کو کس طرح پیش یا قبول کیا گیا بات یہ ہے کہ کربلا سے عالم انسانیت کو کیا ملا اور اس سے کیا سیکھا اور جب ہم اس موضوع کو سامنے رکھ کر اس نثر یا نظم کے بارے میں لکھیں جو ہندوستان اور ہندوستان میں اردو اور اردو میں مختلف عظیم المرتبت خطباء و شعراء مرثیہ نگاران کے ذریعہ ہمارا سرمایہ ہے تو ہم بڑے ہی احساس فخر کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں میر انیسؔ کے رباعیات، قطعات اپنی جگہ ہیں اور خود مرثیہ کے ذریعہ

اس جذبۂ انسانیت کو ابھارنا، سجانا، بلندیوں تک لے جاتا ایک ایسی شاہراہ بنی کہ جس پر چلنے کی تمنا نہ جانے کتنے ادبا، شعراء کو ہونے لگی اور پھر یہ ایک ایسی تعلیم گاہ بن گئی جس میں کتنے ہی اور کتنے بھی اصناف سخن کیوں نہ ہوں ان سب میں ممتاز یہی تعلیم رہی سب کچھ نظر انداز کر سکتے ہیں انسانیت نہیں۔ شرف انسانیت۔ لیکن جسے میر انیس نے یا ان کے معاصرین نے کہیں بھی کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا عدالت اور انصاف انسانیت کے لیے سبب شرف و فضل ہیں اور اگر یہ نہ رہ جائے تو سوسائٹی اور سماج بے معنی میر انیس کیا درد محسوس فرماتے ہیں ؎

نا قدرئ عالم کی شکایت نہیں مولا
کچھ دختر باطل کی حقیقت نہیں مولا
باہم گل و بلبل میں محبت نہیں مولا
میں کیا ہوں کسی روح کو راحت نہیں مولا

عالم ہے مکدّر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

اس مرثیہ میں وہ آگے اس انسانیت کی تنزلی پر کس طرح افسردہ ہیں (مطلع سوم میں فرماتے ہیں)

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں اس میں
وہ گل ہے یہ گل بوئے محبت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست مروت نہیں جس میں
وہ شہد ہے یہ شہد حلاوت نہیں جس میں

بے درد و الم شام غریباں نہیں گذری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گذری

آئیے۔ عالم انسانیت کے لیے کلام انیس میں تین اصناف سخن سے ایک ایک مثال اور ایک ہی پیغام کہ اچھا انسان وہی ہے۔ جو دوسروں کا درد سمجھے اور یہ جب ہی ممکن ہے جب وہ وحشی انسانوں سے نفرت کرے اور مظلوموں سے محبت رکھے: ایک رباعی

دنیا دریا ہے اور ہوس طوفاں ہے
مانند حباب ہستئ انساں ہے
تنگ ہے جو دل تو ہر نفس باد مراد
سینہ کشتی ہے ناخدا ایماں ہے

ہر انسان جس دنیا کی حرص میں لالچ میں انسانیت کو بھلا دیتا ہے اس دنیا کے ہر ایسے لالچی کے لیے میر انیس کس طرح عبرت پیش کرتے ہیں۔

آغوش لحد میں جب کہ سونا ہوگا
جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیس
ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہوگا

یہاں ایک ادبی شاہکار کلام کی یاد آ گئی قارئین کے لیے اسی جگہ تحریر کر دیں۔

علامہ علی الاطلاق حضرت مفتی سید محمد عباس شوستری رح اور حضرت میر انیس میں بڑی دوستی تھی۔ ان کے انتقال پر مفتی صاحب نے کئی قطعات تاریخ نظم کئے اور ایک جگہ ان کی رباعی کے مصرع سے تاریخ وفات نکالی۔ مفتی صاحب کے اس جگہ پانچ اشعار ہیں ان میں کے آخری دو جو میر صاحب کی شان میں اس طرح ہیں ؎

مدح میں اس کی کسے طاقت گویائی ہے
کون ایسا ہے جو اس طرح کا گویا ہوگا
سال تاریخ بھی گویا کہ کلام ان کا ہے
ہائے جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا (۱۲۹۱ھ)

مفتی صاحب کی تاریخ گوئی کے کمال کے سب ہی معترف تھے اور ہیں۔

میر صاحب کے کلام "جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا" میں سے صرف لفظ جز کی جگہ ہائے لکھا اور تاریخ وفات پیش کر دی گئی۔

میر انیس کے لیے ہمارا شرف کہ ہم بزم مدّاحان میر انیس میں شامل ہونے کی سعادت حاصل کر لیں جن کے لیے ہمارے

جدعلامہ مفتی سید محمد عباس شوستری فرمائیں۔
"شاعر یکتا رئیس ذاکرین، تارک دنیا انیسؔ اہل
دیں جدمرحوم سرکار نجم الملتؒ نے ان تفصیلات کو
کبھی اپنے معاصرین علما کے ذریعہ پیش کیا ہے"
رباعی اور قطعات تاریخ سے آگے بڑھ کر دیکھیں کہ
انسان کے دل دردمند کے لیے میرانیسؔ بذریعہ صنف سخن سلام
کیا رہبری فرماتے ہیں۔ کربلا ہے شب عاشور تاریک رات
ختم ہو رہی ہے۔ انسانیت کی نئی زندگی کی صبح صبح عاشور بنکر
سامنے آرہی ہے۔ انسانی تاریخ نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے
جن کی داستان کبھی برسوں پر کبھی مہینوں پر کبھی متعدد دنوں پر
نقش نظر آئے گی لیکن ایک دن بھی نہیں صرف صبح سے عصر تک
چند گھنٹوں میں ایک ایسی تاریخ سامنے آئے جو قیامت تک
قانون عظمت بشر بن جائے۔ جب بیکس بیبیاں، اجنبی جگہ
چاروں طرف خون کے پیاسے، تلواروں کی جھنکار کی آوازیں
جانوروں کا شور، بہتی نہر سے سیراب ہونے والوں کی
خوشیاں۔ ان کے درمیان یہ بیکس، مجبور، مسافرت کے عالم
میں تین دن سے پیاسی بیبیاں، ان کے پیاس سے بلکتے
بچے اور ان کے درمیان ان کے سرپرست بزرگوں، بھائیوں،
جوانوں بیٹوں کی زندگی کی آخری رات، اس میں ابھرتی ہوئی
وہ صبح جو اس طرح آرہی ہے کہ پھر کبھی انسانیت کے لیے کوئی کالی
رات آنے نہ پائے اور آنا چاہے تو اسے کربلا کے شہیدوں
کی یہ صبح اس لیے روک دے گی کہ اس دن کی صبح نے نہ صرف
ایک سورج نہیں ۷۲ سورج ایسے دیکھے جن کی روشنی قیامت
تک کبھی نہ بجھ سکے گی۔ میرانیسؔ نے سلام کے اپنے اس
پانچویں شعر کے دونوں مصرعے اس طرح نظم کر دئے کہ ایک
مصرع انسانیت کی تاریکی کی کیفیت سمجھائے تو دوسرا مصرع
اللہ کی کبریائی اور نئی روشنی کا پیغام دے رہا ہے پہلا مصرع
اپنے سرپرست کی روحانی عظمتوں کا اعلان ہے تو دوسرا
مصرع اسی سرپرست روحانی کی تمام انسانیت کے لیے
بشارت ہے، نوید ہے، مژدہ ہے۔ دیکھو یہ آخری دن۔ یہ
آخری صبح، یہ ایک اٹھارہ برس کے جوان کی آخری اذان ایک
باپ اور ان کے جوان بیٹے کی ہم آہنگی، ہم نوائی۔ یہاں
نہ حضرت ابراہیم کی طرح آنکھوں پر پٹی ہے نہ ان کے جوان
کے لیے فدیہ آجانے کی توقع ہے یہاں یقین شہادت ہے
دونوں کو۔ ایک کی قربانی ایک کے بچ جانے کی بات
نہیں دونوں کے لیے دونوں کی شہادت کا یقین مگر حکم
باپ کا کیا۔ اطاعت بیٹے کی کس طرح، قلب کا اطمینان
دونوں طرف۔ میرانیسؔ آپ کی پاک روح پر سلام۔ آپ
کے سلام کے اس شعر کو پڑھ کر۔

حرم روئے کہا جب آسماں کو دیکھ کر شہ نے
علی اکبر اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے

یہ اذان انیسؔ کی نظروں میں اس زمانہ کے لیے ہے
جس کے لیے آگے چل کر کبھی اسی راستے پر چلنے کی تمنا
کرنے والے جوشؔ ملیح آبادی کہیں گے

کیا نماز شاہ تھی ارکان ایمانی کے ساتھ
دل بھی ہر سجدے میں جھک جاتا تھا پیشانی کے ساتھ

انسانیت کے لیے میرانیسؔ کا سلام یہ پیغام دے رہا ہے
دیکھو تو۔ زمین کربلا پر فاطمہ کے پھول بکھرے ہیں۔

شہیدوں کی یہ خوشبو ہے کہ سب جنگل مہکتا ہے

انسان کے دونوں رخ کس طرح ہیں؟ انسان انسانیت
والے اور انسان نفرت اور ذلت والے۔ ایک طرف
یزیدی دوسری طرف حسینی۔

وہاں بٹتا ہے غلہ قحط ہے یاں آب و دانے کا
ادھر فاقہ ہے اور کھانا ادھر لشکر میں پکتا ہے

اور اب میرانیسؒ کی روح پر فتوح سے یہی درخواست ہے
کہ آپکے مرثیوں میں اگر صرف یہی چند بند اس موضوع اور
مضمون کے لیے کیوں منتخب کر لیے گئے تو ناراحت
نہ ہوں تمام مرثیے ان کا مقصود ایک ہی ہے ہماری کیا

مجال جو ہم اس میں سے کہیں سے منتخب کرتے نظام روحانیت
الگ ہے وہیں سے ہدایت ملتی ہے۔ ورق گردانی کرتے
کرتے جہاں نظر ٹھہر گئی اسی کو لے لیا اور تتمہ مضمون قرار
دے لیا ہے۔ وہ سلام سے جوان بیٹے کی شہادت کی بات
تھی اس میں مرثیے کے ۷۹ بندوں سے چند بند مگر یہاں
انسانیت کی بقا کے لیے اب چھ ماہ کے بیٹے کی بات ہو
تین پھل کے تیر نے باپ کا بازو اور بچے کے گلے کو نشانہ
بنا لیا ہے۔

مچھلی سا جو ہاتھوں پہ تڑپتا تھا وہ بے شیر
بیتاب تھے بچے کے لیے حضرت شبیر
جب خوں نہ ہوا بند گلے سے کسی تدبیر
چلّو سے لگے پھینکنے سوئے فلک پیر
اس خوں کو ملک لے گئے افلاک کے اوپر
لکھا ہے کہ قطرہ نہ گرا خاک کے اوپر

......

قطرہ اگر اس خون کا گرتا بہ سر خاک
دانہ کبھی اگتا نہ زمیں پر نہ افلاک
ہو جاتی گرفتار بلا امت سفّاک
اللہ رے صبر پسر سیّد لولاک
فرماتے تھے راضی ہوں میں جو مجھ پہ تعب ہو
نازل نہ امت پہ نہ خالق کا غضب ہو

ایک بند چھوڑتے ہوئے دنیا دیکھے انسانیت کے لیے
تحفہ امام حسین۔

نعش کو ہاتھوں پہ اٹھا کر یہ پکارے
اے بار خدا خلق سے اصغر بھی سدھارے
صد شکر کہ تو نے مرے سب کام سنوارے
کچھ اور پئے نذر نہ تھا پاس ہمارے
یہ ہے پسر صاحب معراج کا ہدیہ
مقبول ہو اس بندۂ محتاج کا ہدیہ

اور ایک ہزار تین سو ستتر (۱۳۷۷) سال گزر چکے مگر
صدیوں کا یہ غبار اس قربانی کے مقصد کو دھندلا نہ کر سکا
اور اس خون کی چمک کو ہلکا نہ کر سکا جو صرف اور صرف
اسلام کی بقا کے لیے۔ انسان اور انسانیت کے لیے تھا
اور ہے اور رہے گا۔ حضرت انیس کی یہ رباعی اس کی
یاد دلاتی ہے ؎

جب ذبح حسین ذوی الاکرام ہوا
ماتم کا حرم سرا میں کہرام ہوا
آتی تھی یہ نعش کے تن بے سر سے صدا
اب بخشش امت کا سرانجام ہوا

بخشش اس میں کہ ویسے ہو جیسا امام حسینؑ اور ان کے
ساتھیوں نے چاہا۔ ویسے نہ ہو جیسا یزید اور یزیدیوں نے
سمجھانا چاہا۔ یہی ہے نام مراثی میر انیسؔ ہے اور بس۔

◇◇

رباعیات

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

●

دنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں
کس راز سے خالق کے یہ آگاہ نہیں
باریک ہے ذکر قرب معراج رسولؐ
خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

●

7006534950

منزل عشق: امام حسین اور اردو کا رثائی ادب

مرثیے کے تعلق سے مولانا حالی کہتے ہیں۔

"بہرحال ہم انیس کے مرثیہ کی اور نئی طرز کی مرثیہ گوئی کی دلی داد دیتے ہیں لیکن نئی دھن کے شاعروں کو ہرگز یہ صلاح نہیں دیتے کہ مرثیہ گوئی میں ان کا یا اور مرثیہ گویوں کا اتباع کریں۔ اول تو یہ امید نہیں کہ اس خاص طرز میں رزم بزم اور فخر خودستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا لمبی لمبی تمہیدیں اور رطوطلبے باندھنے، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانے مرثیہ کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں اور بعینہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ یا بھائی کے مرنے پر اظہار حزن وملال کے لیے سوچ سوچ کر رنگین اور مسجع فقرے انشا کرے اور بجائے حزن وملال کے اپنی فصاحت وبلاغت کا اظہار کرے۔"

(مقدمہ شعروشاعری۔ مرتبہ وحید قریشی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۲۰۱۰ ص ۲۳۶)

یہ سچ ہے کہ اردو میں ادبی تنقید کی بنیاد حالی نے رکھی اور علمی سطح پر اتنی ترقی کے باوجود آج بھی ہم حالی کے ارد گرد ہی خامہ فرسائی کرتے ہیں لیکن حالی کی تمام باتوں کو عقیدے کے طور پر اپنانا اور ایمان لانا دانشوری کا تقاضا نہیں بلکہ یہ عمل ہمیں لکیر کا فقیر بنا دینے کے مترادف ہوگا۔ اول تو یہ کہ کسی فن پارے کو مذہبی عقائد میں قید کردیا گیا تو اس کی افادیت اور آفاقیت پر حرف آئے گا علاوہ ازیں پھر تو وہ ایک فرقے تک محدود ہو کر اپنی اہمیت برقرار نہیں رکھ پائے گا پھر یہ کیونکر امید کی جائے کہ ایک غیر مسلم بھی واقعۂ کربلا کے سانحہ پر ویسے ہی آنسو بہائے جو ایک عقیدت مند محب اہلبیت کرتا ہے یعنی پھر تو شاعری مذہبی عقائد کی ترجمان بن کر رہ جائے گی اور مرثیے کی بھی وہی حیثیت رہ جائے گی جو نوحوں کی صنف کے ساتھ ہوا کہ یہ تبھی بامعنی ہوگا جب نوحہ خوانی کے ساتھ سینہ زنی بھی اس کا جزو لازم بن جائے۔

ظاہر ہے آفاقی ادب تو وہی کہلائے گا جو زمان ومکان کی تمام بندشوں کو توڑ کر آگے بڑھ جائے۔ تبھی تو ہم مولانا روم، رومن کلاسیکی ادب اور سنسکرت میں کالی داس اور بالمیکی سے لے کر شیکسپیئر، میر، غالب، سوز، کبیر اور حافظ وغیرہ کی تخلیقات پر سر دھنتے ہیں۔

اگر ہم عقائد تک محدود ہو گئے تب تو مولانا روم کی مثنوی ہمیں بے معنی لگنے لگے گی جس میں وہ حضرت موسیٰ کو ایک گڈریے سے معافی مانگنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ تبھی ہم ان کا یہ شعر دہراتے ہیں کہ۔

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

یعنی انسانی بقا کے ضامن رواداری اور محبت کے

جذبات ہی ہو سکتے ہیں ورنہ ہم ہننگٹن کی تہذیبوں کے ٹکراؤ
کے نظریے کا شکار ہونے سے بچ نہیں پائیں گے یعنی مولانا
روم کے یہ خیالات ہمیں انسانی اعلا اقدار کی پاسداری کی
طرف مائل کرتے ہیں۔

ظاہر ہے ہم نے ہزاروں سال کی انسانی زندگی کی
ارتقائی منزلیں طے کرکے خلاؤں کو سر کیا ہے یہ اس لیے
ممکن ہو سکا۔ ہم نے عہد بعہد ترقی کی راہ میں حائل اپنی ذہنی
تربیت بھی کی ہے اور حیوانی صفات کو ترک کرتے ہوئے
اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل کیا ہے یعنی اپنے نفس پر
قابو پانے کے لیے ہم نے اپنے اندر بیٹھے درندے کی ذہن
سازی اس طرح کی ہے کہ اسے اپنی سماجی ذمے داری کا
احساس دلایا اور اسے انسانی صفات سے معمور کیا ہے
ایک دوسرے کو مار کر کھا جانے کے بجائے ہم نے اپنے
ذہن کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ باہمی احترام اور سماجی
تنظیم سازی ہی ہم کو تمنا کا دوسرا قدم اور عالم امکان پر قدرت
رکھنے کی راہ میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں نتیجے کے طور
پر ہم نے جہاں بھی اندھیرا دیکھا وہاں روشنی پیدا کرنے کی
کوشش کرکے اپنی زندگی کو اور بھی تابناک بنایا ہے بقول
علامہ اقبالؒ

تو شب آفریدی چراغ آفریدم

یا

آندھیاں توڑ لیا کرتی تھیں شمعوں کی لویں
جڑ دیے اس لیے بجلی کے ستارے ہم نے (کیفی)

یہاں بالکل یہ مقصود نہیں کہ حالی کے خیالات کو
سرے سے رد کر دیا جائے لیکن یہ عرض کر دینا ضروری ہے
کہ انسان کی زندگی کا چاہے جتنا بڑا سانحہ یا غم ہو وقت
گزرنے کے ساتھ اس میں وہ شدت باقی نہیں رہتی، بھائی
باپ، بیٹا، بیٹی یا بہت ہی قریبی رشتہ دار یا دوست زندگی بھر
یاد رہتے ہیں اور ان کا غم یاد آنے پر تازہ ہو جاتا ہے لیکن
رویے میں تبدیلیاں آتی ہیں اور جب یہ تبدیلیاں شاعر یا ادیب
کے تخیلی پرواز کا حصہ بنتی ہیں تبھی بڑی شاعری جنم لیتی ہے
اور یہی تبدیلی واقعہ کربلا کو عرب کے چٹیل میدان سے نکال کر
ہر مذہب و ملت کے احساس و جذبات کا حصہ بنا دیتی ہے
جذبات کی صداقت اس میں نہیں کہ کوئی ذاکر اہل بیت کے
مصائب بیان کرتے ہوئے سامع پر وہ اثر ڈالے کہ وہ زار
و قطار گریہ کرنے لگے لیکن اس گریہ کا اثر کتنا دیرپا ہوتا ہے
وہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں لیکن اسی غم کا اظہار جب بسم اللہ
خاں اپنی شہنائی کے ذریعہ کرتے ہیں تو ہم پر غنائیت طاری
نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیں اس قدر مسحور کر دیتی ہے کہ
وہ غم کا جذبہ ہماری روح میں سرایت کر جاتا ہے اور اس
واقعہ کو جب میر انیس بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

آج شبیر پر کیا عالم تنہائی ہے

شیفتہ کے قول سے اتفاق کرتے ہوئے محمد حسن نے
بھی یہ بات دہرائی ہے کہ اگر میر انیس یہی ایک مصرع کہہ
دیتے تو وہ کربلا کے پورے کرب کو ہماری رگ و پے میں اتار
دینے کے لیے کافی تھا۔ عہد حاضر کا المیہ یہ ہے کہ ہم بڑی
شدت سے جھوٹے تشخص Falsa identily کا شکار
ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے صرف مذہبی بنیادوں پر ہی
نہیں بلکہ نسل اور رنگ کی بنیادوں پر بھی جس قدر gheto
isation کا ایک بہت بڑا خطرہ درپیش کر دیا ہے اس
پر ہم نے سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش نہیں کی ہے محمد
ہی نہیں بلکہ اللہ بھی صرف مسلمانوں کا ہو گیا ہے رام صرف
ہندوؤں کے اور اس بھگدڑ اور بھیڑ چال میں انسان کہیں کھو
گیا ہے۔ جوش ملیح آبادی کا یہ خواب ہے

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

ظلمت کدے میں غرق ہوتا نظر آتا ہے انیس و دبیر
اور دیگر مرثیہ نگاروں نے امام حسین کی جو تصویر پیش کی ہے

وہ ایک ایسے عاشق کی ہے جو انسانی زندگی کے اعلا مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے صرف خود کو نہیں بلکہ اپنے چھ ماہ کے بچے سے لیکر اٹھارہ سال کے جگرپارہ اور پورے خاندان کی قربانی دینے کو تیار ہیں۔ مجید امجد کے لفظوں میں۔

سلام ان پہ تہہ تیغ بھی جنھوں نے کہا
جو تیرا حکم جو تیری رضا جو تو چاہے

یہ صرف رضائے خداوندی نہیں بلکہ زندگی کے راز کو حاصل کرنے کی جستجو ہے۔ انسانیت کی بقا کا جنون ہے جو ہر قسم کی تنگ نظری سے بالاتر ہے اور جو آتش نمرود سے گھبراتا نہیں بلکہ اس کو گلزار بنا دینے کا جذبہ رکھتا ہے۔

امام حسین کی حیثیت بھی ایک عاشق کی ہے اپنے مقصد کو حاصل کر لینے کا عشق، نانا کے دین یعنی انسان اور انسانیت کی بقا کا عشق جس کی طرف میرؔ نے اشارہ کیا تھا۔

زیر شمشیر ستم میرؔ تڑپنا کیسا

وہ اعلا انسانی قدریں جن کی بنیادیں روز بروز کمزور پڑتی جارہی ہیں ان کو بھر سے تقویت بخشنے کی مگن مرثیوں کی سماجی معنویت کیا ہو سکتی ہے اس کی جستجو مذہبی عینک لگانے کے بجائے تعصب اور تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر اور امام حسین کو ایک خاص فرقے کا نمائندہ قرار دے کر مرثیے کی ادبی اور تہذیبی اہمیت کو رد کر دینے سے نہیں بلکہ ان آفاقی اقدار کی معنویت اور پاسداری کے تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے جن کی بنیادیں ہماری ہزاروں سال کے تمدن کی تاریخ میں پنہاں ہیں۔

ماضی میں مرثیوں نے سماجی طور پر کوئی رول ادا کیا ہے کہ نہیں اس بحث سے بالکل الگ مرثیوں کی معنویت کو عصر حاضر کے تقاضوں کی روشنی میں پرکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے اس صارفی تہذیب Consumerist culture نے تمام انسانی رشتوں کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ماں، باپ، بھائی، بہن دوست احباب یہ سارے رشتے آج کس طرح بکھر رہے ہیں آئے دن عصمت دری کے واقعات جنون کی شکل میں آپ سنتے اور پڑھتے ہیں۔ انسان اور کتنا گر سکتا ہے آج یہ خبر سن کر آپ چونکتے نہیں کہ ایک باپ اپنی بیٹی کی آبرو لوٹ لیتا ہے اور سماج اسے برداشت کرتا ہے دولت حاصل کرنے کے لیے باپ بیٹے کا یا بیٹا باپ کا قتل کر سکتا ہے۔

انسان کے سامنے زندگی کی قوت پنہاں آشکار ہو جائے وہ اس کے اصل مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہو یہی تو رازِ دوام زندگی ہے۔ علامہ اقبال نے نے مزید جس بات پر زور دیا تھا وہ یہی تھا کہ؎

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

یہی وجہ ہے کہ اپنے زمانے کے بڑے بڑے چنگیز و نادر تاریخ کی ردی کی ٹوکری میں گم ہو گئے تو زندگی کی آسائشوں اور تخت و تاج کو ٹھکرا کر زندگی کے مقصد اور اس کی بقا کے لیے اپنے خون سے اس کی آبیاری کرنے والے جب دنیا کے خداؤں سے ٹکرائے تو کبھی ابراہیم بنے تو کبھی موسیٰ اور اس مقصد کو اس کی انتہا تک پہنچا کر جس نے زندگی کو تابناک اور با مقصد بنایا۔ وہ حسین بنا جس کے لیے شاعر پکار اٹھا اور جو خواجہ معین الدین چشتی کی عوامی درگاہ کی زینت بنا۔

سر داد نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

انسانیت کی بقا کی یہی تڑپ جب شاعری کا حصہ بنتی ہے تو اس کے خالق کی ذات اس مقصد میں ضم ہو جاتی

ہے اور شاعر کے ذاتی تجربے پورے معاشرہ کی حیثیت Sensiblty کا حصہ بن جاتی ہے اس مقصد کے حصول کے لیے عنا آب شعروں کے انتخاب میں رسوا ہوتے ہیں اور جب شاعری کے راز کو پا لیتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے جانا یہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یعنی شاعری ہو یا دیگر فنون لطیفہ اسی زندگی کے راز کے تلاش کی جستجو ہے جس کے لیے شاعر یا فنکار اپنے آئیڈیل کبھی اپنے تخیل کی بنیاد پر تراشتا ہے تو کبھی تاریخ کے حقائق اس کی رہنمائی کرتے ہیں اس لیے شاعر یا فنکار کی یہ ناآسودگی ہی ہے جو اسے اس ظلمت کدہ سے روشنی کی طرف مائل کرتی ہے۔

جب ہم اردو شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے بنیادی خمیر میں جو سب سے نمایاں بات نظر آتی ہے وہ اس کا مزاحمتی پہلو یعنی sence of defiance ہے یہی مزاحمت defiance کا پہلو اسے عربی اور فارسی کی روایتی چہار دیواریوں سے باہر لاتا ہے اور عشق کے نئے معنی و مفہوم تلاش کرتا ہے اور جب ایک قطرے کو وسعت دیتا ہے تو اسے قلزم میں تبدیل کر دیتا ہے اور ہمارا شاعر میر جب عشق کے اس بلیغ راز کو پا لیتا ہے تو واقعہ کربلا کے ہیرو امام حسین کی حیثیت اسے ایک عاشق کی نظر آتی ہے جو اپنے مقصد عشق کے حصول کے لیے اور انسان و انسانیت کی بقا کے لیے سر تسلیم خم کر کے سرخرو ہو جاتا ہے۔

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

آج جب اردو مرثیے کی معنویت اور افادیت پر بحث کرنے بیٹھتے ہیں تو بنیادی طور پر اس کے سماجی پہلو پر غور کرنا ہوگا۔ اردو مرثیہ اور واقعہ کربلا اگر حصول زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کرنے کا ایک استعارہ بن گیا تو اسکا بھی ایک تاریخی اور سماجی پس منظر ہے جس پر غور کئے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ راقم الحروف کی نظر میں اس کا ایک پہلو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہماری مشترکہ تہذیبی روایات کو جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ معاشی ہی نہیں بلکہ تہذیبی سطح پر بھی مجروح کرنے کی کوشش کی گئی تو واقعہ کربلا اور امام حسین ایک استعارہ بن کر ہمارے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بن گئے۔

غور کیجئے اردو مرثیہ جب اپنی ترقی کی بلندیوں کو پہنچ رہا ہے وہ ایک عبوری دور ہے یعنی وہ جاگیر داری نظام جس میں سماجی اور تہذیبی رشتے پورے معاشرہ کو ایک اکائی unit کی شکل میں باندھتے ہیں۔ انسانی جذبات اور قدریں ایسی ہیں جہاں بھائی بہن ماں باپ، بیوی، بیٹی اور خاندان کے جوان اور دوست احباب کے رشتوں کی بنیادی سطح جذباتی ہے صرف خون کا رشتہ نہیں بلکہ ایک دوست اپنے دوست کے لیے جان قربان کر دینے کا جذبہ رکھتا ہے۔ صنعتی تبدیلیاں ان رشتوں کو مجروح کرتی ہیں اور اچانک یہ رشتے منتشر ہوتے نظر آتے ہیں۔ لوگ گاؤں سے نکل کر تلاش معاش میں شہروں کا رخ کرتے ہیں شہر پہنچ کر ایک فرد جو ابھی چند روز پہلے ایک اجتماعی اکائی کا حصہ تھا۔ وہ شہر کی جگمگاتی سڑکوں پر خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ داری نظام کی بنیاد نفع و نقصان پر ہوتی ہے اور جب مقصد حیات زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی سعی ہو جائے تو جذبات مجروح ہوں گے۔ انسانی رشتے کمزور پڑیں گے جس کی طرف علامہ اقبال نے اشارہ کیا تھا

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

اسی تضاد پر غور کرتے ہوئے کارل مارکس surplus value کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ سرمایہ داری نظام کے ان مثبت پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن کے تحت سائنسی اور صنعتی ایجادات وجود میں آئیں ہیں انسان دنیا پر اپنی

گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتا جاتا ہے اور دنیا بازیچۂ اطفال نظر آنے لگتی ہے لیکن مشینوں کی ایجاد اور سائنسی ترقیاں انسانیت کے لیے ایک بہتر زندگی کا پیغام لانے کے بجائے اس کے لیے استحصال کا ذریعہ اور مشین کا ایک پرزہ بنا دیتی ہیں۔ کیفی اس حقیقت کی بہترین عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

یہ زمیں تب بھی نگل لینے کو آمادہ تھی
پاؤں جب ٹوٹتی شاخوں سے اتارے ہم نے
ان مکانوں کو خبر ہے نہ مکینوں کو خبر
ان دنوں کی جو گپھاؤں میں گزارے ہم نے
کئی یہ دیوار بلند، اور بلند، اور بلند
بام و در اور ذرا اور سنوارے ہم نے

بام و در سنوارنے کے لیے اپنی تعمیر کردہ عمارت سے بے دخل ہونے کا کرب اور اس سے پیدا بیگانگی alienation کے تحت نا آسودگی کا جذبہ اس میں جو احساس محرومیت frustration پیدا کرتا ہے وہ اسے اپنے ماضی کی طرف واپس لے جاتا ہے جن میں کھو کر کبھی تو وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے تو کبھی زندگی کے مقصد کی پہچان کر کے شمشیر بے زنہار بن کر صفحۂ ہستی پر ابھرتا ہے اس طریق عمل process میں ماضی کے یہ سارے آئیڈیل اس کی رہنمائی کرتے ہیں اور ان آئیڈیلوں میں اردو شاعری کا سب سے بڑا ہیرو امام حسین کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو ہر طرح کے ظلم و جبر اور استحصال سے ٹکراتا ہے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی جد و جہد میں کوئی سمجھوتہ نہیں کرتا۔ شہادت حسین جب مقصد حسین سے آگے بڑھ کر مقصد انسانیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو وہ ایک قوم، ایک مذہب، ایک خطہ تک محدود نہیں رہ جاتا بلکہ دنیا کے تمام دبے کچلے ظلم کے شکار لوگوں کی بقا اور آزادی کا مرکز بن جاتا ہے۔ یہی وہ آئیڈیل ہے جو شاعر انقلاب جوشؔ سے کہلاتا ہے۔ شعر دیکھئے ...

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین

مرثیوں کی معنویت کے تعلق سے یہاں عرض کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ بیگانگی alienation کے تحت یہ صنف سماج سے لاتعلقی کی مظہر ہے بلکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شاعری خصوصاً مرثیہ کی صنف کا تعلق براہ راست مزاحمت اور عصری انسانی مسائل کی غمازی بھی ہے اسی لیے مذہب کی تجارت اور اس کو ذریعۂ معاش بنانے کے رویے کو جوشؔ نے جس طرح آڑے ہاتھوں لیا آپ اس سے بخوبی واقف ہیں۔

عالم اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خون اہلبیت میں لقمے کو تر کرتا ہے تو

یا

ذاکروں نے موت کے سانچے میں دل ڈھالے نہیں
یہ شہید کربلا کے چاہنے والے نہیں

یہاں جن دو رویوں کا ذکر ہو رہا تھا ان میں ایک یہ کہ ماضی کی ان باتوں کے علاوہ مرثیوں کے تہذیبی اور ثقافتی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ ہمیں اپنی زندگی جینے کی تربیت بھی کرتا ہے جو آج کے ماحول میں ناپید ہوتی چلی جا رہی ہے یعنی مرثیے کی مجلسوں میں شرکت کر کے ہماری نئی نسل کو اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ، بات چیت کا انداز، اپنے بزرگوں اور سماج میں لوگوں کے ساتھ پیش آنے کے آداب بھی ہم نے انہی مجلسوں سے سیکھے ہیں۔

آج الفاظ کے معنی، ان کا استعمال اور موقع و محل وغیرہ کا مسئلہ بھی لمحۂ فکریہ ہے۔ یہی نہیں مرثیوں کے تعلق سے فنون لطیفہ کی مختلف اصناف سے متعارف ہونے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے جیسے سوز خوانی کی روایت اور موسیقی وغیرہ۔

◇◇

عباس رضا نیرّ
شعبۂ اردو۔ لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ
9919785172

انیسؔ کی منظر نگاری

انیسؔ کی منظر نگاری پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں انیسؔ کے اس مقصد کو پیش رکھنا ہوگا کہ خود میر انیسؔ اپنے مرثیوں کے ذریعہ ہندوستانی عوام سے کیا کام لینا چاہتے تھے اس اعتبار سے اگر ۱۸۵۷ کے اودھ کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس وقت کے اودھ کی خود مختاری اصلاً خود مختاری نہیں تھی اور اس وقت کی عوام کے پاس برٹش گورنمنٹ سے لڑنے کے لیے کوئی خاص وسیلہ بھی نہیں تھا ایسے میں میر انیس اپنے مرثیوں میں واقعات کربلا کو پیش کر کے ہندوستانی عوام کے دلوں میں جذبۂ انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے چونکہ بلا تفریق مذہب وملت اس وقت کے ہندو مسلم سب ان کی مجلسوں میں کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے ایسے میں میر انیس کو ہندوستان کی فضا میں عرب کی تاریخ کا ایک واقعہ پیش کرنا تھا اور اس انداز میں پیش کرنا تھا کہ اس پیش کش میں یہاں زندگی، یہاں کی سوچ فکر، یہاں کی چہل پہل اور یہاں کے رسم ورواج شامل ہوں تاکہ لکھنؤ میں بیٹھا ہوا انسان چودہ سو سال کا سفر لمحوں میں طے کر کے سرزمین عراق پر رونما ہونے والے اس تاریخی واقعہ کا ذکر بن جائے اور انیس اپنے قاری اور سامع کو اپنے مرثیوں کے ذریعہ ایک بڑا پیغام دے سکیں۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی پیغام کی اثر انگیزی کے لیے اس میں تاثیر کا ہونا ضروری ہے اور تاثیر دینے کے لیے ضروری ہے کہ عیش وعشرت کی فراوانی اور تن آسانی میں زندگی گزارنے والے لوگوں کو ان واقعات کی سخت جانی سے روشناس کرایا جائے جو انھیں قربانیوں کے جذبے کی طرف گامزن کر سکیں چنانچہ میر انیس اپنے مرثیوں میں صبح، دوپہر، شام، شب، گرمی، بہار، شجر، صحرا گرد، غبار، آندھی، طوفان، زلزلہ اور محشر جیسے مناظر پیش کرتے ہیں اور ان مناظر کے ذریعہ اپنے مسئلہ پیغام کی حدت کو بہت بلند کر دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ ان سارے مناظر کے سہارے میر انیس ایک علامتی ڈھانچہ بھی قائم کرتے ہیں اور اپنی قوت متخیلہ کے ذریعہ بیان واقعہ کو واقعہ سے زیادہ فطری بنا دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ میر انیس نے فیض آباد میں آنکھیں کھولی ہیں اور لکھنؤ میں زندگی گزاری ہے اودھ کے علاقہ میں کہیں ریگستان یا پہاڑ نہیں ہے پھر بھی وہ دشت، صحرا، دریا، جنگل دھوپ کی سختی، گرمی کی شدت اور رات کی تاریکی کے منظر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سارا واقعہ اپنی کیفیات کے ساتھ قاری کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ انیسؔ بہار یہ منظر سے ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامان کوہسار

تاخے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

دیکھئے موسم بہار کا کتنا خوبصورت بیان ہے خاص طور سے دوآبے اور اودھ کے چمن اور باغات میں صبح صبح جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں انھیں انیس نے کس کمال شاعری کے ساتھ اپنے مشاہدے کا حصہ بنا دیا۔

حالی نے مطالبہ کیا تھا کہ اب تک ہماری شاعری میں قومی عناصر کی شمولیت نہیں ہوسکی ہے بلکہ سارے مناظر خارجی ہیں۔ انیس کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے مرثیوں میں عرب کی تاریخ ضرور بیان کرتے ہیں لیکن اس انداز میں جیسے یہ واقعہ بالکل ہندوستان کا ہے اور ہندوستان میں پیش کیا جا رہا ہے۔ انیس کا قلم لفظوں سے وہی کام لیتا ہے جو ایک ماہر مصوّر کا برش رنگوں سے لیتا ہے وہ مختلف موقعوں پر ایسے مناظر پیش کرتے ہیں کہ لفظوں سے تصویریں بننے لگتی ہیں اور ان کے مرثیے سننے ہی نہیں دیکھنے کی چیز بن جاتے ہیں اور بیان واقعہ کی تاثیر اصل مناظر سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اس حوالے سے انیس کے دو تین بند اور ملاحظہ کیجئے۔

ٹھنڈی ہوائیں سبزہ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

....

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جابجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

یہاں پہلے بند پر غور کیجئے۔ منظر صبح کا ہے سورج کی پہلی پہلی کرنیں نکلنے کا وقت ہے۔ درختوں اور پودوں کے پتوں پر شبنم کی بوندیں پڑی ہوئی ہیں ان پر سورج کی ترچھی ترچھی کرنیں گر رہی ہیں۔ شبنم کی یہ بوندیں اکٹھا نہیں ہیں بلکہ بکھری بکھری ہیں۔ الگ الگ بوندیں ہیں سورج کی کرنیں الگ الگ چمک رہی ہیں ہر بوند پر الگ الگ رنگوں کا عکس پڑ رہا ہے جس کی وجہ سے درخت کا ہر پتہ جواہر نگار نظر آ رہا ہے اور اس قدر حسین معلوم ہو رہا ہے کہ اس پر ہیرے موتی قربان ہو جائیں۔ انیس کی جزئیات نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف پھول پتّوں اور درختوں کا بیان نہیں کرتے بلکہ شبنم کی بوندوں کی منظر کشی بھی اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی چلتی پھرتی تصویریں نظر آنے لگتی ہیں۔

دوسرا بند منظر نگاری کے ساتھ انیس کے عقیدے اور عقیدت کی بھی مرقع کشی کر رہا ہے۔ گلشن زہرا کے پھول اگر پیاسے ہیں تو شبنم نے گلاب کے کٹورے بھر دیے ہیں زہرا کے ساتھ گلشن، گلاب اور شبنم کی رعایتیں بھی خوب ہیں جن سے انیس نے تازگی، پاکیزگی کی ایک تقدیسی فضا قائم کی ہے۔

تیسرے بند میں سحر سے بالکل ذرا پہلے کے وقت کو پیش کیا گیا ہے جس میں ابھی سورج نہیں آیا ہے۔ صرف تارے جھلملا رہے ہیں یہ تو منظر نامے کا زمانی حصہ ہے۔ جو سویرے

اور اندھیرے کی ملی جلی کیفیت پیش کر رہا ہے دوسری طرف منظر نامے کا مکانی پہلو بھی بہت خوب ہے جو جنگل اور گلشن کی ملی جلی فضا پیش کر رہا ہے۔ واضح رہے کہ صبح صادق سے پہلے کا یہ فطری منظر بہت طولانی نہیں ہوتا بلکہ لمحاتی ہوتا ہے اندھیرے اور اجالے کے درمیان کا یہ مختصر سا وقفہ جتنی جلدی آتا ہے اتنی ہی جلدی چلا بھی جاتا ہے لیکن منظر نگاری میں یہ بھی انیسؔ کے مشاہدے کا کمال ہے کہ وہ ایک ایک پہر بلکہ پہر کے مختصر مختصر حصوں کو بھی پورے التزامات کے ساتھ اپنے مرثیے میں بیان کرتے ہیں مثلاً درختوں کی شاخوں پر بیٹھ کر پرندے سورج کی روشنی میں نہیں بلکہ تاروں کی چھاؤں میں چہچہاتے ہیں تو میر انیس اپنی منظر نگاری میں پرندوں کی چہچہاہٹ کو بھی غیر فطری نہیں ہونے دیتے۔

ویسے تو اردو شاعری میں منظر نگاری کا وجود انیسؔ سے قبل بھی تھا لیکن بہت محدود تھا جس طرح جزئیات کے ساتھ انیسؔ کا قلم ایک ایک تصویر کو مکمل کرتا ہے ایسی فن کاری انیسؔ سے پہلے اردو شاعری میں موجود نہیں تھی۔ آپ نے دیکھا صبح کی منظر کشی میں تاروں کے بجھنے، چاند کے ڈوبنے، سورج کے نکلنے کرنوں کے چمکنے، پھولوں کے کھلنے، پرندوں کا تسبیح خدا کرنے اور درختوں کے پتوں پر شبنم کی بوندوں کے الگ الگ بکھرنے سے گلابوں کے کٹوروں کے بھرنے تک کا بیان میر انیسؔ نے اتنے فطری انداز میں کیا ہے کہ نور صبح، ظہور صبح اور نور ظہور صبح کی تمام تر کیفیات قاری کی نظروں میں پھرنے لگتی ہیں ذرہ ذرہ جھومتا ہوا، پتہ پتہ لہلہاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان منظر ناموں کے ذریعہ انیسؔ اپنے اصل واقعہ کو پیش کرنے کے لیے فضا سازی میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں یعنی انیسؔ کا سامع مناظر فطرت کے ذریعہ سے ہی اندازہ کرنے لگتا ہے کہ انیسؔ اپنے مرثیے میں آج واقعہ کربلا کا کوئی وقوعہ پیش کرنے والے ہیں یعنی کربلا کا واقعہ اور انیسؔ کے منظر دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ صبح کی بہار سے متعلق انیسؔ کے دو بند اور ملاحظہ کیجئے۔

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کا رخ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے
مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام
یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام
لکھے خدا نماز گزاروں میں اپنا نام
سب ہیں وحید عصر یہ غل چار سو اٹھے
دنیا سے جو شہید اٹھے سرخ رو اٹھے

یہاں نماز فجر سے بالکل پہلے کی وقت کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ بس ابھی ابھی نماز صبح کا وقت ہونے والا ہے چاند ڈوبنے والا ہے۔ سورج اگنے والا ہے امام حسین ایک نظر آسمان کی طرف دیکھتے ہیں اور مڑ کر اپنے رفیقوں کو نماز کے لیے آواز دیتے ہیں۔ یہ رفیق شب عاشور کے جاگے ہوئے ہیں ان میں کوئی سویا نہیں ہے چنانچہ امام حسین ان کو جگاتے نہیں بلکہ فریضۂ سحری ادا کرنے کے لیے مڑ کر آواز دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ وقت کی کیفیات کے حوالے سے بھی انیسؔ کا مشاہدہ کس قدر باریک اور تیز ہے۔

دوسرا بند بھی صبح کی ہی منظر نگاری پر مشتمل ہے لیکن اس صبح کے انجام کے طور پر آنے والی شام کا کس قدر حسین بیان ہے۔ صبح اور شام انسانی زندگی کی علامت ہیں شام تک انسان اپنے مقاصد کی تکمیل کر لیتا ہے۔ امام حسین کہتے ہیں کہ آج شام تک ہم بھی اپنا نصب العین حاصل کر لیں گے ہم پیاسے ضرور ہیں مگر عزت و آبرو کے ساتھ کوثر پر پہنچیں گے۔ نماز گزاروں میں ہمارا نام لکھا جائے گا

یعنی اسلام کا پیغام باقی رکھنے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح کامیاب ہوں گے کہ ہمارا ہر فرد وحید عصر اور یکتائے روزگار کہلائے گا۔

انیسؔ نے صبح کی منظر کشی میں صرف فوج حسین کی عبادت گزاریوں کا بیان ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس صبح میں فوج یزید کا بھی حال بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ایک بند دیکھئے۔

وہ سرد ہوا صبح کی وہ نور کا عالم
اور زمزمے مرغان خوش الحان کے وہ باہم
وہ سبزۂ صحرا پہ پڑے گوہر شبنم
اور صبح کی نوبت کی صدا آتی وہ ہر دم
نالے کی جو شہنا میں صدا تھی تو بجا تھی
وہ نوبت قتل پسر شیر خدا تھی

آپ نے دیکھا کہ انیسؔ نے ایک ہی صبح کے دونوں طرفوں کو کس طرح سے پیش کیا ہے۔ ایک طرف تسبیح و تہلیل کی آوازیں ہیں اور دوسری طرف جنگ کی نوبت۔ ایک طرف شہادت کا مکمل نصب العین ہے اور دوسری طرف صرف قتل امام حسین کی تیاریاں۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہاں قتل امام صرف قتل امام نہیں ہے بلکہ مکمل انسانیت کا قتل ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ انیسؔ نے صبح کو صرف اور صرف بطور منظر پیش نہیں کیا ہے بلکہ صبح کو بھی خیر و شر کا تصادم کی علامت بنا دیا ہے۔ انیسؔ کے منظر ناموں میں صبح عاشور کا سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ اندھیروں کو کھانے کی علامت بن جاتا ہے جو یزیدیت کے ذریعہ پھیلائے گئے ہیں یعنی انیسؔ کے مرثیوں کی صبح ایک حیات نو کا آغاز کرتی ہے۔ اس صبح سے ایسی روشنی پھوٹتی ہے جو جبر و ستم کے چہرے سے نقاب چھین لیتی ہے اور ایثار و قربانی کے جلوؤں کے ساتھ حسینیت کا پیغام بن جاتی ہے۔

انیسؔ نے جس طرح صبح کے مناظر کو ان کی تمام تر کیفیات کے ساتھ پیش کیا ہے اسی طرح شام اور رات کی تاریکی کو بھی پیش کرنے میں انیسؔ کا مشاہدہ اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ دو بند ملاحظہ کیجئے۔

خورشید چھپا، گرد اڑی، زلزلہ آیا
اک ابر سیہ دشت پر آشوب میں چھایا
پھیلی تھی جہاں دھوپ وہاں ہو گیا سایہ
بجلی کو سیاہی میں چمکتا ہوا پایا
جو حشر کے آثار ہیں سارے نظر آئے
گرتے ہوئے مقتل میں ستارے نظر آئے

جنگل کی اداسی وہ تو وہ شام کا ہونا
بچوں کا وہ کھانے کے لیے بھوک میں رونا
پانی کی تمنا میں وہ منہ اشکوں سے دھونا
فاقوں میں کہاں نیند کہاں چین سے سونا
لو چلتی تھی جب خاک میں اٹ جاتے تھے بچے
ماؤں سے اندھیرے میں لپٹ جاتے تھے بچے

یہاں پہلے بند پر غور کیجئے۔ زلزلہ آتا ہے تو زمینیں اندر دھنستی ہیں اور زمینوں کے دھنسنے سے گرد و غبار اوپر کو اٹھتے ہیں۔ قمقمے، کنگرے، جھاڑ فانوس، گنبد و مینار ساری چیزیں زمین پر گر پڑتی ہیں۔ طوفان کا ماحول ہو تو بجلی چمکتی ہے لیکن سیاہی میں ڈوب جاتی ہے۔ پورے بند کا منظر زلزلے کے پس منظر میں بیان کیا گیا ہے لیکن پورا بند ایک علامتی فضا قائم کرتا ہے۔ زلزلہ امام حسین کی شہادت ہے۔ سورج امام حسین کی ذات ہے۔ گرد و غبار اور آندھی طوفان سب کے سب لشکر شام ہے۔ مقتل میں ایک کے بعد ستاروں کا گرنا انصار حسینی کی شہادت ہے۔

دوسرے بند میں ایک لٹے ہوئے قافلے کی مظلومانہ تائید کو بڑھانے کے لیے منظر کو تھوڑا بدلا گیا ہے۔ یہاں گرمی اور کیفیتوں کو بیان کرتی ہے۔ ایک تو موسم کی گرمی دوسرے جنگ و جدال کی گرمی۔ شام کا وقت ہے۔ کہیں لو چل رہی ہے

کہیں ریت اڑ رہی ہے۔ کھلا میدان ہے ایسے میں ایک
قافلہ ہے جس میں کچھ بھوکے پیاسے بچے ہیں آندھی چلتی
ہے تو بچوں کے چہرے گرد و غبار سے اٹ جاتے ہیں اور
بچے "عالم خوف میں ماؤں سے لپٹ جاتے ہیں۔ یہاں قدرت
کے مناظر اور انسانی مناظر دونوں کی کیفیات کو انیس
نے ایک ساتھ مربوط کر دیا ہے۔ اس ارتباط سے منظر کی
اثر پذیری کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ رات کی تاریکی کو
پیش کرتے ہوئے انیس کی منظر نگاری کے دو بند اور ملاحظہ
کیجئے۔

صدمے سے ہوا رنگ رخ ماہ کا کافور
اختر بھی بنے مردمک دیدۂ بے نور
غم چھا گیا راحت دل عالم سے ہوئی دور
تصویر الم بن گئی جنت میں ہر اک حور
کہتے تھے ملک رات نہ ہووے گی اب ایسی
تاروں نے بھی دیکھی نہ تھی تاریک شب ایسی

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اس شب کی سیاہی
ہے چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغان ہوا بر میں تپاں بحر میں ماہی
تربت سے نکل آئے تھے محبوب الٰہی
فریاد کا تھا شور رسولان سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اداسی تھی نجف میں

ان دونوں بندوں میں رات تاریکی کے ساتھ واقعہ کی خبر
حزنیہ تھا دونوں عالم کو محیط کر لیتی ہے۔ انیس کے قلم کی سیاہی
اور شب غم کی سیاہی دونوں مل کر المیہ فضا کے بہترین مظہر
ہو جاتے ہیں۔ پرندوں کو ہوا میں سکون ملتا ہے اور مچھلیوں
کو پانی میں یعنی ہوا اور پانی دونوں کی تاثیریں ٹھنڈی ہیں
لیکن واقعہ شہادت نے دونوں کی تاثیروں کو گرمی کی
شدت میں بدل دیا ہے۔ گرمی کی اس شدت سے رنج
الم کی شدت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ یعنی رنج و الم
کی شدت کا وہ عالم ہے کہ رسولان سلف فریاد کر رہے ہیں
یثرب لرز رہا ہے اور نجف محو ماتم ہے انھیں کیفیات پر مشتمل
انیس کا ایک بند اور ملاحظہ کیجئے۔

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد
ہلتے تھے کوہ کانپتی تھی وادئ نبرد
تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی زرد، زمیں بھی زرد
خورشید چھپ گیا جو اٹھی کربلا کی گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں

یہ بند امام حسین کی شہادت کا کس قدر نفسیاتی بیان ہے
جس کی منظر نگاری میں انیس رنگوں کی زبان کا استعمال
کرتے ہیں۔ زرد رنگ، مایوسی، اداسی، اور پژمردگی کی علامت
ہے تیرگی رنج والم کی علامت ہے۔ پورا بند امام حسین کی
شہادت کے بعد ہونے والے افسردگی اور اداسی کی
کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ دن، دھوپ اور زمین سب کی
زردی سے ایک طرح کے خوف کی تصویر ابھرتی ہے۔ خورشید
امام حسین کی ذات ہے اور کربلا کی گرد فوج یزید خورشید
کے چھپ جانے سے سارا عالم تیرگی میں ڈوب گیا ہے۔
مرثیہ کا یہ بند اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ میر انیس نہ تو
شاعرانہ قدرت کے مظاہرے کے طور پر منظر نگاری کرتے
ہیں اور نہ مرثیے کو طول دینے کے لیے بلکہ وہ اپنی منظر نگاری
کے ذریعہ واقعہ کی تاثیر کو تیز کرنے کا کام لیتے ہیں۔

کلیم الدین احمد نے انیس کے مرثیوں پر اعتراض کرتے ہوئے
کہا تھا کہ انیس کے مرثیوں سے اگر منظر نگاری کے بند نکال
دئے جائیں تو بھی مرثیے کے تسلسل پر کوئی فرق نہیں
پڑے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیس کی منظر نگاری ہی
واقعہ اور واقعہ کے کرداروں کی اثر انگیزی میں اضافہ کرتی ہے
اور اگر انیس کی منظر نگاری کو اس شخص کی نگاہوں سے دیکھا
جائے جس کے اوپر اس واقعے کا شدید اثر ہوا ہو تو انیس کے
مناظر بیان واقعہ سے دور نہ ہو کر حقیقت حال نظر آتے ہیں۔

انیسؔ کے مرثیوں میں اکثر مقامات پر گرمی کی شدت کا بھی بیان نظم ہوا ہے یہ بیان بھی واقعات کربلا کی تاثیر میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ تخیل اور محاکات کی دھوپ چھاؤں میں انیسؔ گرمی کی شدت کا نہایت اثر انگیز بیان کرتے ہیں وہ صرف مناظر کو دکھاتے نہیں بلکہ اپنے قاری اور سامع کو اس گرمی کی شدت کا احساس بھی کرواتے ہیں۔

یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

وہ گرمی کے ایام وہ صحرائے خطرناک
پتے کا نہ سایہ تھا بجز سایۂ افلاک
اٹھتے تھے بگولے کہیں اڑتی تھی کہیں خاک
ریتی پہ پڑا تھا پسر سیدِ لولاک
بھن جاتا تھا دانہ بھی جو گرتا تھا زمیں پر
اس دھوپ میں سایہ نہ تھا لاشِ شہِ دیں پر

زمین پر گرتے ہی دانے کا بھن جانا انیسؔ کا تخیل ہے لیکن سفر کرنے والے آج بھی ایسے صحراؤں کی نشاندہی کرتے ہیں جن میں وہ دھوپ سے جلتے ہوئے پتھروں پر اپنے کھانے کی چیزیں رکھ کر بھون لیتے ہیں جن پتھروں پر دانے بھن جاتے ہوں ان پتھروں پر انسان کے جسم کا کیا حال ہوگا۔ حسینؑ صاحبِ لولاک حضرت محمد مصطفیؐ کے فرزند ہیں جن کے دین میں لاشوں کو جلانا حرام ہے بلکہ میت کو نہایت آرام سے سرد جگہ پر رکھنے کی تاکید کی گئی ہے اس بھون دینے والی زمین پر سبطِ رسول کا لاشہ بے گور و کفن پڑا ہوا ہے بتایئے انیسؔ کا یہ منظر شدت احساس میں اضافہ کرتا ہے یا نہیں۔ گرمی کی شدت کے حوالے سے انیسؔ کے دو بند اور ملاحظہ فرمایئے۔

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت
پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت
سونلا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
توسنے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

اہلِ حرم ہیں محمل و ہودج میں بے قرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ یا شاہِ نامدار
گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفلِ شیرخوار
کیوں کر یہ دکھ اٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

یہاں پہلے بند کا صوتی آہنگ ملاحظہ کیجئے۔ مسلسل سخت اور درخت کی کرخت آوازیں ہمارے کانوں سے گزر کر ہمارے دماغوں پر گرمی کی سختی کی تصویریں ابھارتی ہیں یہ صوتی تاثیر ہمارے جذبوں کو احساس سے قریب کرتی ہیں زمین پتھریلی ہے اور ہوا رتیلی آدمی تو آدمی جانور بھی گرمی سے جھلس رہے ہیں سب کے چہرے کملا رہے ہیں پورا منظر نامہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت پر مشتمل ہے دوسرا بند سفر کے راستے میں بچوں کی کیفیت اور بچوں کے ماؤں کو ماتا کے بیان پر مشتمل ہے مکالمہ کے ساتھ منظر نگاری کی بہترین مثال ہے۔ اب یہ بند دیکھئے۔

وہ لو وہ تپش اور وہ گرمی کا مہینہ
سردی میں ہو ذکر اس کا تو آجائے پسینہ
دشوار ہے اس دھوپ میں معصوموں کا جینا
ویرانہ ہے بستی میں اجڑتا ہے مدینہ
حضرت بھی گھلے جاتے ہیں تشویش سفر سے
ہیں ساتھ وہ بچے کہ جو نکلے نہیں گھر سے

یہاں اس گھرانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے جو عام طور سے سفر کا عادی نہیں ہے اس پر گرمی کا زیادہ اثر ہونا فطری ہے اس کی کیفیات سے اپنے قاری کو روشناس کرانے کے لیے میر انیسؔ نے یہ منظر تراشے ہیں اور اب خاص طور سے یہ دو بند ملاحظہ کیجئے جن میں

گرمی کی شدت اپنے کمال پر ہے۔

آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارہ تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیِ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

یہاں پہلے بند پر غور کیجئے مبالغہ کہیں سے نہیں ہے ہاں کمال شعریت ضرور ہے سخت گرمی میں جو لوگ اندر رہتے ہیں جب وہ باہر نکلتے ہیں تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ آفتاب کی تمازت آنکھوں کو بند کئے دیتی ہے نظریں خس خانۂ مژہ سے باہر نہیں نکل پاتیں اور اگر باہر نکلتی ہیں تو نگاہوں کے پیروں میں بھی چھالے پڑ جاتے ہیں۔

دوسرا بند کچھ اور قیامت کا ہے۔ گرمی کی شدت کا مختلف موجودات پر مختلف اثر ہوتا ہے۔ بڑوں، بچوں، جانوروں پرندوں مچھلیوں انتہا یہ کہ دریا کی موجوں پر گرمی کی شدت کا کیا اثر ہو رہا ہے انیسؔ کی جزئیات نگاری ان سب کا بیان کرتی ہے کہ گرداب شعلۂ جوالہ بنا ہوا ہے۔ حباب انگارہ نظر آ رہے ہیں۔ پانی سے چنگاریاں اٹھ رہی ہیں گرمی کا وہ عالم ہے کہ پانی کی تہوں پر رہنے والے نہنگ بھی جاں بلب ہیں اور پانی کی تہوں کے اندر رہنے والی مچھلیاں بھی نہنگ تو سرخون کے ہوتے ہیں انھیں گرمی کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے وہ پانی کی تہوں پر آجاتے ہیں لیکن وہ بھی گرمی کی شدت سے بے حال ہیں۔ ان کی بھی زبانیں منہ سے باہر نکلی آ رہی ہیں اور وہ مچھلیاں جو موجوں کی مخالف سمت میں چلتی ہیں جب وہ اچھل کر اوپر آتی ہیں تو موجیں سیخ ہو جاتی ہیں اور مچھلیاں کباب۔

انیسؔ کی منظر نگاری کے اس مختصر تجزیے میں ہم نے دیکھا کہ انیسؔ مناظر قدرت کو اتنی فطری اور منظم صورت میں پیش کرتے ہیں کہ ان منظروں سے ہم صرف روشناس نہیں ہوتے بلکہ وہ ہمارے حواس سے آگے بڑھ کر احساس کے تاروں کو جھنجھنا دیتے ہیں اور تب انیسؔ کے مرثیے ہمیں ایک طرح کی احساسی شاعری کا لطف دینے لگتے ہیں۔ انیس کی منظر نگاری صرف مناظر قدرت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مکالمہ، گفتگو، رویہ، رسم و رواج، رجز، مبارز طلبی، جنگ جیسے تمام واقعات و بیانات کو انیس منظر نامہ ہی بنا کر پیش کرتے ہیں مثلاً جناب زینب کا عون و محمد سے کہنا ''سر کو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس'' امام حسین کا قاصد صغریٰ سے مخاطب ہونا ''مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں'' یا دعائیہ انداز ''صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے'' جیسے بے شمار مصرعے انیس کی منظر نگاری کا ہی منہ بولتا آئینہ ہیں۔ بزم اور رزم دونوں طرح کی منظر نگاری میں انیس کی مثال نہ انیسؔ سے پہلے کے شعراء میں نظر آتی ہے نہ انیس کے بعد۔ ہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ انیسؔ کی منظر نگاری کے اثر سے ہی اردو شاعری کو برج نرائن چکبست، دیا شنکر نسیم اور اور شبیر حسن خاں جوش جیسے شعراء نصیب ہوئے جن کے مناظر میں انیس کی منظر نگاری کے اثرات آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ○○

اپنے تاثرات سے ضرور مطلع فرمائیں

nayadaurmonthly@gmail.com

9920529631

موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ کا تاریخی پس منظر

اردو مرثیہ کی تنقید میں "موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ" کو وہی مقام حاصل ہے جو عمومی طور پر اردو شاعری کی تنقید میں حالیؔ کے مقدمہ کو حاصل ہے حالانکہ انداز نقد دونوں کا جدا ہے۔ حالیؔ کا مقدمہ شعر و شاعری نقد شعر کے ان نظری مباحث کا احاطہ کرتا ہے جن کا مقصد تخلیق شعر سے حظ و انبساط کے ساتھ ساتھ سوسائٹی سے وابستہ ان تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھنا ہے جن سے شاعری کے سماجی سروکار کے امکانات قوی ہوتے ہیں۔ حالیؔ نے شعر میں سادگی، جوش اور اصلیت کو معیاری شاعری کی اساس قرار دیتے ہوئے زبان و بیان کے استعمال کا جو قرینہ سجھایا ہے ان میں شعر کے صوری حسن سے زیادہ معنوی ابعاد پر توجہ دی گئی ہے اس کے برعکس شبلی کی موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ اردو میں عملی تنقید کا نقش اول تسلیم کی جاتی ہے۔ شبلی نے اس کتاب میں اردو شاعری کی ایک صنف کو منتخب کیا اور اس کا تاریخی پس منظر اور دیگر اصناف شعری کے درمیان اس کی فنی حیثیت کا تعین کرتے ہوئے دو شاعروں کا موازنہ ان کے فنی خصائص کی بنیاد پر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں لفظ کوشش شعوری طور پر استعمال کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اس تالیف کو دو باکمال مرثیہ نگار شاعروں کے فن کا محاکمہ یا محاسبہ کرنے میں کوئی حتمی درجہ حاصل نہیں ہے

موازنے کی اشاعت کے بعد اس کے جواب یا تردید میں جو بھی کتابیں شائع ہوئیں ان کے مصنفین و مولفین بھی اس کے داعی رہے کہ شبلی کی اس کتاب کی بنیاد پر انیسؔ و دبیرؔ کے فنی خصائص و نقائص پر کوئی ایسی رائے قائم نہیں کی جا سکتی جو مبنی برانصاف ہو۔ اس ضمن میں خود شبلی کا اعتراف بھی قابل غور ہے جس کا ذکر انھوں نے موازنے کی تمہید میں کیا ہے اور اس سے متعلق بعض نکات پر گفتگو آگے ہوگی۔ ابھی تو یہ دیکھنا ہے کہ اس تالیف کا تاریخی پس منظر کیا تھا جب اس نہج پر اس تالیف پر غور کیا جائے گا تو تاریخی پس منظر کے تعین میں کم از کم تین زاویے بنیں گے ان میں سے دو انتہائی اہم ہیں اور اگرچہ تیسرا بھی اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے عدم واقفیت مرثیہ کے فکری جہات کو سمجھنے میں مخل ہو سکتی ہے جہاں تک پہلے دو کا سوال ہے تو ان میں پہلے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ اس تالیف کا شمار ادب کے جس زمرے میں ہوتا ہے اس میں اس سے قبل کیا روایت کارفرما رہی ہے دوسرا یہ کہ جن مرثیہ نگاروں کے درمیان مبینہ طور پر موازنے کا دعویٰ شبلی نے کیا ہے ان کے عہد میں اردو مرثیہ کی روایت اور اس روایت میں ان مرثیہ نگاروں کا مقام و مرتبہ کیا تھا۔ ان کا معاشرتی و تہذیبی

ماحول کیسا تھا اور چونکہ ان باکمال مرثیہ نگاروں کا تعلق اس مرکز سے تھا جسے اردو شاعری میں بعض خصوصیات کی بنا پر انفرادی شناخت حاصل تھی تو یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس تخلیقی ماحول کا اثر ان مرثیہ نگاروں کے یہاں کس حد تک ہے یا ان کا تخلیقی رویہ کس حد تک اس شعری ماحول کو متاثر کرسکا ہوا زمانے کے تاریخی پس منظر کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان پہلوؤں پر غور کرنے کی ضرورت ہے تا کہ صرف یہ کہ اردو میں تنقید کے آثار اور روایت کے سیاق میں شبلی کی اس کتاب کے تاریخی پس منظر کا تعین کردیا جائے اگرچہ اس طور سے بھی اس کتاب کی تاریخی انفرادیت اور صنفی امتیاز سے بڑی حد تک واقفیت ہو جائے گی لیکن جب تک دیگر پہلوؤں پر نظر نہ ہوگی یہ مقابلہ یکطرفہ رہے گا۔

شبلی کی اس تالیف کو اس اعتبار سے بہرحال فضیلت حاصل ہے کہ اردو میں علمی تنقید پر یہ پہلی باقاعدہ کتاب ہے اس سے قبل برائے نام تنقید اردو میں ان تذکروں کا چلن عام تھا جن میں کسی شاعر کے محاسن یا معائب کی نشاندہی کچھ تو تذکرہ نگار کی شاعر سے ذاتی واقفیت اور اس واقفیت میں دوستانہ یا معاندانہ رویہ کی مداخلت کی بنا پر ہوتا تھا اور کچھ ان نکات کے تحت شعراء کی تخلیقات کا جائزہ لینے کی روش عام تھی جن کی بنا پر مشرقی شعریات کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔ اردو تذکرہ نگاری کی تاریخ میں یہ انداز کم و بیش ہر کسی کے یہاں جزوی رد و بدل کے ساتھ نظر آتا ہے شاعری کا محاکمہ اس محدود دائرہ میں کرنے کے باوصف ان تذکروں کی تاریخی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان تذکروں میں فنی نکات سے واقفیت کا بندھا ٹکا انداز اور شعر کے معنی و مطالب کو دریافت کرنے میں فکری سطحی پن کے باوصف اردو تنقید کی روایت میں انھیں مکمل طور پر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

ان تذکروں میں جن عناصر کی غیر شعوری کارفرمائی ان کی فنی، ادبی یا تنقیدی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے ان کو باضابطہ اور شعوری طور پر میزانِ نقد قرار دے کر حالی نے مقدمہ لکھا جس میں اردو شاعری کی مختلف اصناف میں زبان و بیان اور موضوع کے لحاظ سے زبان ادب اور سوسائٹی کے مثلث کو بہ ہر نوع اس طور سے ربط دیا ہے کہ شعر و ادب میں صرف صناعی و صنعت گری تخلیق کو جذبہ و احساس کی سطح پر پر اثر نہیں بنا سکتی اور اگر شعر پڑھنے کے بعد جہانِ قلب و ذہن میں کوئی تغیر و تحرک نہ ہو سکے تو ایسی شاعری ناقص ٹھہرے گی۔ اس زاویے سے اردو شاعری کے تجزیہ میں غزل اور قصیدہ خاص طور سے ان کا ہدف بنے تاہم مثنوی اور مرثیہ کو موضوع کی نوعیت اور طرزِ اظہار کی بنیاد پر بہ کار آمد قرار دیا۔ مرثیہ کی توصیف کرتے ہوئے حالی نے لکھا کہ مگر حق یہ ہے کہ اس نئی طرز تعلیم کی نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہوگئی ہے ۲۔ حالی نے مرثیہ کو نہ صرف فنی نقطۂ نظر سے اردو شاعری میں ممتاز قرار دیا۔ بلکہ اس کے موضوع میں حیات انسانی کی تربیت کے روشن امکانات کی بنیاد پر اردو مرثیہ نگاروں کی تخلیقات کو فارسی اور عربی شاعری سے بھی ممیز ٹھہراتے ہوئے کہا کہ:

"اس خاص طرز کے مرثیہ کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اردو شاعری میں اخلاقی نظم کا مستحق صرف انھیں لوگوں کا کلام ٹھہر سکتا ہے بلکہ جس اعلا درجہ کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیہ میں بیان کئے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔" ۳

حالی نے مقدمہ میں مرثیہ کے فنی نکات کی نشاندہی اور موضوعی اعتبار سے اس کی رفعت اور بلندی کا اعتراف

کرتے ہوئے میر انیس کا ذکر خصوصی طور سے کیا ہے اور اس
سلسلہ میں ان کے یہاں تفحص الفاظ کے برتنے اور نیچرل
شاعری کے معیاری اور قابل قدر شعری اثاثہ کا ذکر کیا ہے
دیکھا جائے تو شبلی نے بھی موازنے میں انیس کی شاعرانہ
فضیلت کے جو نشان قائم کئے ہیں ان میں جزوی ہی
سہی حالی کی صدائے بازگشت سنی جاسکتی ہے مقدمہ
شعر و شاعری کی اشاعت ۱۸۹۳ میں ہوئی اور اس کے
بعد نقد شعر میں علم معانی و بیان، عروض، علم بدیع و قوافی
کے علاوہ ان عوامل پر بھی غور و فکر ہونے لگا جن کا تعلق
شعر کے مضمون کی معاشرتی و اخلاقی افادیت سے ہے
اردو تنقید کی روایت میں تذکروں کے بعد حالی کے اس
مقدمے سے انتقادی عمل میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان
سے اردو تنقید کو بہرحال ایک نئی جہت حاصل ہوئی
مقدمے کے بعد جس کتاب نے اس جہت کو مزید مستحکم
اور معتبر بنایا وہ شبلی کی موازنہ انیس و دبیر ہے یہ کتاب
۱۹۰۷ میں منظر عام پر آئی حالانکہ شبلی اسے تین برس قبل ہی
مکمل کر چکے تھے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے
لکھا ہے ۔

"۱۹۰۳-۱۹۰۴ میں شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر
لکھا مگر بقول رشید حسن خاں ۱۹۰۷ میں مطبع ہندی
آگرہ میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا اور اس
کتاب کا بنیادی عنصر تقابل ہے اور اس طرح
یہ کتاب اردو میں تقابلی تنقید کی پہلی کتاب
کہی جاسکتی ہے جس میں انھوں نے تقابل کا
راستہ اپنا کر انیس و دبیر پر سیر حاصل
گفتگو کی ہے ۔"

اس میں کلام نہیں کہ موازنہ اردو میں تقابلی تنقید کا
نقش اول ہے اس میں دو شاعروں کے فن پر اظہار
خیال ان فنی نکات سے کیا گیا ہے جنھیں تخلیق شعر
میں مبادی حیثیت حاصل ہے۔ حالانکہ اردو شاعری کی
تخلیق میں انیس و دبیر سے قبل بھی ہمعصر شعراء کے
درمیان تقابل کا رجحان ملتا ہے لیکن اس میں ادبی و فنی
محک پر شعر کو پرکھنے کے بجائے اضطراری اور جذباتی
انداز میں ان کی فضیلت اور برتری ثابت کرنے کی کوشش
ان کے مداحوں کے ذریعہ کی جاتی تھی اور کبھی تو بات
حد ادب سے تجاوز کر کے شخصی سطح پر آجاتی تھی اور پھر ایک
دوسرے کو زیر کرنے کے لیے غیر مہذب و غیر شائستہ انداز
میں فریقین ایک دوسرے کے مدمقابل آجاتے۔ شعرائی
معاصرانہ چشمکوں کا انتہائی دلچسپ اور بعض مقامات پر
مبالغہ آمیز بیان آزاد نے آب حیات میں کیا ہے اور اس
ضمن میں انھوں نے انیس و دبیر کے مداحوں کو انیسیئے اور
دبیریئے کے عنوان سے جن دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے
اس نے ان دو باکمال مرثیہ نگاروں کے کلام پر تنقید میں
مستقل اصطلاح کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ آزاد نے
اس حوالے سے آب حیات میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب
حقائق پر مبنی نہیں ہے اور اب تو یہ بات پایۂ ثبوت کو
پہنچ چکی ہے کہ شعراء کے احوال رقم کرتے وقت انھوں
نے بہت کچھ اپنے تخیل سے بھی ایجاد کر لیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف زئی کے درج بالا اقتباس کا آخری
جزو کسی حد تک صداقت سے عاری ہے اور اس کی تائید
خود شبلی نے موازنے کی تمہید میں کر دی ہے شبلی کے اس
بیان پر نظر ڈالنے سے پیشتر ڈاکٹر عبدالمغنی کی یہ رائے
ملاحظہ ہو جو اردو کی تنقیدی روایت میں موازنے کی اہمیت
پر معروضی انداز میں روشنی ڈالتی ہے ۔

نظم نگاری کے کمالات کا تجزیہ اس طرح کیا گیا ہے کہ
رزمیے، المیے اور فطرت نگاری کے عناصر نمایاں ہوگئے ہیں
یہ علمی تنقید کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے جو اس مشرقی
تنقید نگاری کا نقطۂ عروج ہے جس کی ابتدائی مثالیں تذکروں

میں ملتی ہیں۔" ؎ ۵

یہ اقتباس اردو تنقید میں موازنے کی اہمیت کی توثیق کرنے کے ساتھ ہی اس تصور کی نفی بھی کرتا ہے جس کی بنا پر اسے دو مرثیہ نگار شاعروں کے درمیان فنی تقابل پر مبنی قرار دیا گیا۔ اردو تنقید میں تمام تر سنجیدگی اور غیر جانبداری کے باوصف اکثر اعتدال و احتیاط کا فقدان کسی فن پارہ یا فن کار کے جائزہ ادبی مقام و مرتبہ کا تعین کرنے میں مزاحم ہوتا ہے اور خصوصاً رثائی شعر و ادب کی تنقید میں افراط و تفریط کا انداز نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے شبلی کی تالیف کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ رہا جبکہ خود شبلی کا یہ بیان اگر ارباب نقد و نظر کے سامنے ہو تو اس کتاب کے متعلق ایک بنیادی اور بڑی غلط فہمی کا ازالہ از خود ہو جاتا ہے۔

"فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کر لیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اردو شاعری میں زلف و خال و خط یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میر تقی کی غزلیت اور درد کا تصوّف غالب کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں۔ لیکن ان بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے۔ میر انیس کا کلام شاعری شاعری کے اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن ان کی طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ "کلام فصیح ہوتا ہے اور بین اچھا کہتے ہیں" بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اور مرزا دبیر حریف مقابل قرار دئے گئے اور مدت ہائے دراز کی غور و فکر، کد و کاوش، بحث و تکرار کے بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ ترجیح کا مسند نشین کس کو کیا جائے۔" ؎ ۶

اس اقتباس کا پہلا جز اردو شاعری کے معیار و منہاج سے متعلق انھیں خیالات کی تائید کرتا ہے جو شبلی سے قبل حالی اپنے مقدمہ میں پیش کر چکے تھے۔ خصوصاً غزل اور قصیدہ کی فرسودگی اور مصنوعی پن کے بارے میں حالی نے جس تفصیلی انداز میں لکھا ہے اس کو شبلی نے زلف و خال و خط یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے ذریعہ ظاہر کیا ہے موازنہ انیس و دبیر کی تالیف کا اصل سبب دادین میں لکھی وہ عبارت ہے جس کی بنا پر سخن شناسوں نے یہ رائے قائم کر لی تھی کہ میر انیس کی شاعری کی خصوصیت کا انحصار صرف فصاحت اور بینیہ انداز پر ہے۔ دراصل شبلی نے موازنہ میں اس رائے کی تردید بڑی ساداز ور صرف کیا ہے اور اس مقصد کی تکمیل میں وہ اس توازن کو برقرار نہ رکھ سکے جو ہم پلہ شاعروں کے درمیان تقابل کی بنیادی شرط ہے۔ درج بالا اقتباس کا اختتامی جز خود اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ شبلی نے دونوں مرثیہ نگاروں کے درمیان تقابل کا جو ڈول ڈالا تھا اس میں انیس و دبیر کے شاعرانہ اوصاف کو نمایاں کرنے میں ان کا یہ تصور شعوری طور پر کارفرما تھا کہ انیس کو دبیر سے بہتر ثابت کیا جائے حالانکہ انھوں نے بظاہر غیر جانبدارانہ طرز نقد کی پیروی کا دعویٰ کیا ہے۔ لیکن اس کتاب کے مندرجات اس دعویٰ کی واضح تردید کرتے ہیں۔ شبلی نے مرثیہ نگاری کی تاریخ پر قدرے تفصیل سے گفتگو کے بعد کلام انیس کے اوصاف کی نشاندہی جن عنوانات کے تحت کی ہے ان کی توضیح مفصل انداز میں کی ہے جبکہ دبیر کے متعلق بیان میں اختصار نمایاں ہے۔ انیس کے مرثیوں میں فصاحت، روزمرہ، الفاظ کا انتخاب، بحر و ردیف و قافیہ کی موزونی، بلاغت بلحاظ مضمون، تسلسل بیان، صنائع و بدائع، انسانی جذبات کی ترجمانی، مناظر قدرت کی تفصیل اور اسی طرح واقعہ نگاری کے متنوع پہلوؤں کو دریافت کرنے میں متعدد حوالوں اور مثالوں سے مدد لی ہے اور کتاب کا یہ حصہ دو سو سے زیادہ صفحات کو محیط ہے جبکہ دبیر کے بابت جو کچھ لکھا گیا ہے اسے محض ۳۰ صفحات

میں سمیٹ دیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ انیسؔ کے مرثیوں میں فنی محاسن و اوصاف انتہائی ارفع و اعلیٰ مدارج کے حامل ہیں تاہم اس بنیاد پر دبیر کے مرثیوں کو صرف فنی لغزشوں کا مجموعہ نہیں قرار دیا جا سکتا جیسا کہ موازنے کے باب کا آغاز ہی شبلی نے اس عنوان سے کیا ہے۔ مرزا دبیر کے کلام کے عیوب، شبلی نے کتاب کے آغاز میں جو یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کتاب میں میر انیسؔ کا موازنہ بھی مرزا دبیر سے کیا گیا اور اس مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہے۔ ہے اسے یہ عنوان خود ہی باطل کر دیتا ہے۔

موازنہ انیسؔ و دبیر کے تاریخی پس منظر پر غور کرتے وقت اس ماحول اور معاشرت کو بھی پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جس میں ان مرثیہ نگاروں کی شاعری پروان چڑھی اس ماحول اور معاشرت کے بعض اختصاصی پہلو ایسے ہیں جو صرف اودھ کی سرزمین سے ہی مخصوص ہیں خصوصاً اگر شعر و ادب کے حوالے سے بات کی جائے تو جس زمانے میں انیسؔ و دبیرؔ کی مشق سخن کا آغاز ہوا لکھنؤ کو امتیازی ادبی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ امتداد زمانہ کے سبب شاعری میں دہلی کی مرکزی حیثیت کمزور پڑ چکی تھی۔ اور شاہان اودھ کی شعر و ادب سے والہانہ دلچسپی کے سبب اس شہر میں باکمال سخنداںوں کا جماوڑا لگ گیا تھا جس کے سبب شاعری یہاں کی ثقافتی زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی تھی۔ اودھ کے مہاجر شعراء کے برعکس اس خاک سے اٹھنے والے شاعروں نے اپنی راہ الگ بنائی اور اس راہ پر چلتے ہوئے فن کے وہ منازل طے کیے جن کے ذریعہ رکھی گئی بنیاد پر اودھ کی حکومت کا جو عظیم الشان قصر تعمیر ہوا اس میں سماجی و تہذیبی زندگی کے کئی ایسے روشن چراغ ضیا بار نظر آتے ہیں جن سے اس ملک کی تاریخ میں درخشندگی کا اضافہ ہوا ۱۷۲۴ تا ۱۸۵۷ کا زمانہ اودھ کی سماجی زندگی کا ایسا زریں دور رہا ہے جس میں انسانیت نواز اقدار انتہائی توانا اور مستحکم انداز میں عوام الناس کے درمیان محبت اور یگانگت کے مثالی نمونے پیش کر رہی تھیں۔ شاہان اودھ نے اپنے ہم عقیدہ افراد کے علاوہ دیگر مکتب فکر کے لوگوں کے تہذیبی و ثقافتی معاملات میں مساویانہ سلوک سے معاشرتی سطح پر اس تہذیبی روایت کو پروان چڑھایا جسے گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔ اس ماحول میں عزاداری کا فروغ اودھ کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ عزاداری کے فروغ نے مرثیہ اور دیگر رثائی اصناف کی ترقی و ترویج میں اہم کردار ادا کیا۔ انیسؔ و دبیرؔ کے ذریعہ اردو مرثیہ نگاری کو شرف و فضیلت حاصل ہونے سے قبل حیدریؔ، سکندرؔ، گداؔ، احسانؔ، افسردہؔ، اور خلیقؔ، فصیحؔ، ضمیرؔ، دلگیرؔ جیسے کئی بلند قامت مرثیہ نگار اس صنف کو فنی وقار عطا کر چکے تھے۔ ان میں آخر الذکر چار مرثیہ نگاروں نے اس صنف کو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا جس کا اتّباع ان کے بعد کے بیشتر مرثیہ نگاروں نے کیا اور پھر اسی طرز کی بنیاد پر مرثیہ کی صنفی شناخت قائم ہوئی۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر مسیح الزماں کا یہ خیال قابل غور ہے۔

> "اس دور میں مرثیہ کی ہیئت ہی متعین نہیں ہوئی بلکہ اندرونی ساخت کی بھی تنظیم ہوئی جو ایک تخلیق کو فنی بلندی دیتی ہے۔ اس ساخت کے اہم جز ابتدا، واقعات، منتہا اور خاتمہ ہیں۔ اگرچہ بیشتر مرثیے واقعات کربلا میں سے کسی ایک جزو کو موضوع بناتے ہیں لیکن اس جزو کو ایک سالم اکائی کی حیثیت سے نظم کیا جاتا ہے۔"[۵]

مرثیہ نگاری کے ایسے تابناک پس منظر میں انیسؔ و دبیرؔ کا ورود اس صنف کے لیے مزید ترقی کا باعث ہوا۔ ان باکمال مرثیہ نگاروں نے اپنے اسلاف سے ایک حد تک

استفادہ کیا ورنہ بیشتر اپنے زورِ طبع سے اپنی انفرادی شناخت قائم کی اور پھر ایک کے حصہ میں سلاست، روانی اور برجستگی پر ماہرانہ قدرت اور دوسرے کے یہاں خیال آفرینی، مضمون بندی اور بلاغت کے دریا رواں نظر آتے ہیں۔ ان اکابرین کے فن کے فروغ میں اودھ میں عزاداری کی اس روایت کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا جو اس خطّہ کی عوامی زندگی کا اہم جزو تھی۔ انیسؔ و دبیرؔ کے مدّاحوں نے اپنے ممدوحین کی تعریف و توصیف کا جو انداز اختیار کیا اس میں والہانہ پن بعض اوقات ایسی جذباتی شدت پسندی اختیار کرتا نظر آتا ہے جو مرثیہ کے سامعین کو ایسے دو گروہ میں تقسیم کر دیتا ہے کہ ہر گروہ اپنے ممدوح کو افضل و برتر ثابت کرنے پر ہمہ وقت آمادہ نظر آتا ہے موازنہ انیسؔ و دبیرؔ کی تالیف میں ارباب ذوق کا یہ رویہ اس محرک کی حیثیت رکھتا ہے جس نے شبلی کو ان مرثیہ نگاروں کے درمیان تقابل کے اس طور پر آمادہ کیا۔ اگرچہ شبلی براہ راست اس تہذیب و معاشرت سے اس قدر وابستہ نہیں رہے جس سے ان کی شخصیت اور افکار و خیالات پر گہرے اثرات مرتسم ہوتے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موازنہ انیسؔ و دبیر کی تالیف میں غیر شعوری طور پر اس ماحول اور معاشرہ کی کارفرمائی بہرحال رہی جس میں انیسیئے اور دبیریئے کی اصطلاح مقبولِ عام ہو چکی تھی۔

جہاں تک لکھنؤ کے مخصوص رنگ شاعری (خصوصاً غزل کے حوالے سے) کے اثرات کی بات ہے تو اس ضمن میں ان مرثیہ نگاروں کی نگارشات میں ان مقامات کی نشاندہی بارہا ارباب نقد و نظر نے کی ہے لہٰذا اس کی تکرار مناسب نہیں۔ اس سلسلہ میں بس اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ انیس اور دبیر کے مرثیوں میں وہ مقامات جہاں تلوار اور گھوڑے کی تعریف نیز مرثیہ کے ہیرو کا سراپا بیان ہوا ہے وہاں لکھنؤ کی غزلیہ شاعری کے اسی رنگ کا پرتو نظر آتا ہے جو رعایت لفظی اور صنعت گری سے عبارت ہے۔ ان مرثیہ نگاروں نے ایسے مقامات پر اپنے زورِ تخیل سے کچھ ایسے مضامین بھی نظم کئے ہیں کہ جہاں تک غزل گو شعراء کی رسائی بھی کم ہوئی ہے اپنے گرد و اطراف کے شعری ماحول سے اثر قبول کرنا ایک فطری عمل کی حیثیت رکھتا ہے یہ ضرور ہے کہ ان مرثیہ نگاروں نے اس اثر کی قبولیت میں بھی اپنے فنی معیار سے مفاہمت نہیں کی اور مرثیہ کے نفس موضوع کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس رنگ کو برتنے کی فنکارانہ سعی کی جس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی بھی حاصل ہوئی۔ ان اکابرین فن کا محاکمہ کرتے وقت اس معاصر شعری روایت کو بھی مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے اور دراصل یہی وہ انفرادی پہلو ہے جو ان شاعروں کی خلاقیت کا پتہ دیتا ہے۔ شبلی نے بھی موازنے میں ان کی جانب اشارہ کیا ہے۔

اس حقیقت کو بہرحال تسلیم کرنا چاہیے کہ شبلی نے ہرچند کہ اپنی تالیف میں انیسؔ کی شاعرانہ فضیلت کو ثابت کرنے میں دبیر کے ساتھ مکمل انصاف نہیں کیا اور اگرچہ ان کا یہ انتقادی عمل اصول نقد پہ پورا اترنے سے قاصر رہا لیکن اس تالیف نے مرثیہ کی تنقید کے لیے وہ ماحول تعمیر کیا جس نے شبلی کے بعد کئی ارباب ادب کو اس کا مقصد شبلی کے معروضات کی تردید کرنا یا ان کے نقائص کی نشاندہی کرنا تھا اس لیے ان میں بھی تنقیدی معروضیت کے بجائے جذباتیت کا غلبہ رہا۔ اس سلسلہ میں کتابوں میں المیزان، رد الموازنہ، تردید موازنہ اور حیات دبیرؔ کا ذکر خصوصی طور سے کیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ انیسؔ و دبیرؔ کے فن پر جو دیگر کتابیں لکھی گئیں ان کے مصنفین یا مؤلفین نے شبلی کی موازنہ انیسؔ و دبیرؔ سے کسی نہ کسی طور اکتساب فیض کیا ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ رثائی تنقید کو باضابطہ ایک رجحان کے طور پر ادب سے رائج کرنے میں

(بقیہ صفحہ ۲۴۸ پر)

ڈاکٹر شبیہہ صغریٰ
موضع و ڈاکخانہ مچھلی گاؤں ضلع امبیڈکر نگر

معترضین مرثیہ اور میر انیس

یہ عجیب دلچسپ مسئلہ ہے کہ جہاں ایک طرف مرثیہ اور میر انیس کے پرستاروں کی تعداد ہے وہیں اس کے معترضین کی تعداد بھی کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتی ہے معترضین زیادہ تر اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ صنف سخن میں زیادہ تر شخص متوفی کے محامد وفضائل بیان ہوتے ہیں مدح کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی اردو مرثیہ پر اعتراض کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"جو اثر ایسی اخلاقی نظموں سے انسان کے دل پر ہونا چاہئے وہ نہ مرثیوں کے سامعین پر ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ حالی کے نزدیک اس کے دو اسباب ہیں:"

(۱) اول تو یہ خیال کہ مرثیہ کا اصل مقصد رونا رلانا ہے سامعین کو دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا ہے۔

(۲) دوسرے یہ اعتقاد کہ جو کچھ صبر و استقلال و شجاعت و ہمدردی، وفاداری و غیرت و حمیت عزم بالجزم اور دیگر اخلاق فاضلہ خود امام ہمام اور ان کے عزیزوں اور دوستوں سے معرکہ کربلا میں ظاہر ہوئے مافوق طاقت بشری اور خوارق عادات سے تھے) کبھی ان کی پیروی اور اقتدا کرنے کا تصور بھی دل میں نہیں آنے دیتا"

(۳) مرثیہ کو واقعہ کربلا کے ساتھ مخصوص کرنا تمام عمر اسی ایک مضمون کو دوہراتے رہنا اگر محض بہ نیت حصول ثواب ہو تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن شاعری کے فرائض اس سے وسیع ہونے چاہئے۔ [۳]

شبلی نعمانی صنف مرثیہ اور انیس کے قدردانوں میں ہیں لیکن اعتراضات کرنے میں نہیں چوکتے۔ فرماتے ہیں۔

"کربلا کے واقعات جو میر انیس اور تمام مرثیہ گویوں کا موضوع شاعری ہے جہاں تک تاریخ و روایت سے ثابت ہے نہایت مختصر ہیں لیکن مرثیہ گویوں نے ان میں نہایت وسعت پیدا کی ہے بعض جگہ محض ایک اجمالی واقعہ مذکور تھا اس کو اس قدر وسعت دی کہ واقعہ کے تمام جزئیات بیان کر دئے بعض جگہ روایات میں اس واقعہ کا نام نشان بھی نہ تھا لیکن اس لحاظ سے کہ وقت و حالات کے اقتضا سے اس واقعہ کا پیش آنا ضرور تھا۔ واقعے کو فرض کر لیا اور پھر اس کو اس طرح پھیلا کر لکھا کہ گویا پورا واقعہ من و عن روایتوں میں مذکور تھا" [۴]

اب کلیم الدین احمد کے اعتراضات بھی ملاحظہ ہوں موصوف حالی اور شبلی کے اٹھائے گئے اعتراضات سے دو قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔ یہی حال احسن فاروقی اور اظہر علی فاروقی کا بھی ہے حالانکہ بنیادی طور پر جو سوالات

حالی اور شبلی کی ذہنی پیچیدگی کا نتیجہ ہیں ان کا تصرف ان حضرات نے انگریزی ادبیات کے ناقص مطالعہ کے پس پشت کیا ہے۔ بہر کیف ان کے اعتراضات بھی اجمالاً ملاحظہ ہوں۔

"مرثیہ کا میدان ایک طرف تمام اصناف شاعری سے وسیع تر ہے تو دوسری جانب نہایت تنگ۔ مرثیہ رزمی شاعری کا مترادف ہو سکتا ہے رزمی شاعری کی وسعت آشنکارہ ہے لیکن مرثیہ میں مضمون ایک پر زور بلکہ مذہبی جذبہ سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اس کے بیان میں وہ شاعرانہ صداقت ممکن نہیں جو رستم و سہراب کی داستان میں ہے۔ شاعر و سامعین ایک زبردست مذہبی جذبہ سے متاثر ہوتے ہیں"

رزمیہ شاعری میں لطف اس وقت ممکن ہے جب ہم دو پلہ مخالف ہوں۔ اگر ایک جری، بہادر، جملہ کمالات کا مجموعہ اور دوسرا محض کم ہمت کمینہ ہو تو پھر مصرع میں کوئی لطف باقی نہیں رہتا۔

واقعہ کربلا کو ایک مسلسل و مربوط نظم میں بیان کرنا ممکن تھا لیکن اس کی بھی اردو شاعری میں ہمت نہ تھی اور نہ طاقت وغیرہ وغیرہ،، ۵۵

ڈاکٹر احسن فاروقی معترض ہیں کہ

مرثیہ صرف ایک ذات اور صرف ایک واقعہ سے متعلق ہے اس سے اس کا میدان بہ لحاظ بیان و فلسفہ دونوں طرح بہت محدود ہو گیا ہے یعنی صرف ایک ہی واقعہ کو ہمیشہ پیش کیا گیا ہے اور ایک ہی قوم کے طبقہ عوام کے جذبات کو اٹھایا گیا ہے۔ مرثیہ کا مقصد صرف رونا رلانا ہے غم کے علاوہ دوسرے جذبات اس کے دائرہ سے باہر ہو گئے ہیں۔

مرثیہ میں زندگی اس طرح پیش ہو ہی نہیں سکتی جیسی ناول، ڈرامہ ایپک وغیرہ میں پیش کی جاتی ہے اور اس میں زندگی کی وسیع النظری نہیں مل سکتی جو غیر مذہبی ادب میں پائی جاتی ہے۔ ۵۶

اعتراضات اظہر علی فاروقی

(۱) بین میں مردوں کے منہ سے ایسی باتیں نکلوانا جن سے ان کے صبر و تحمل مردانگی و شجاعت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ عورتوں کی زبان سے ایسے الفاظ کہلانا جن سے ان کی متانت و وقار، محبت وغیرت کو ضرب لگتی ہو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔

(۲) مرثیہ گو سراپا میں افراد مرثیہ کا حلیہ بیان کرتا ہے۔ قصیدے کے مانند یہاں بھی ممدوح کے چہرے، خدو خال، لب و دندان، چشم ابرو وغیرہ کے حسن و جمال کا نقشہ کھینچا جاتا ہے اگرچہ ابن قدامہ قصیدے میں اسے نظم کرنا معیوب سمجھتا ہے۔ ۵۷

معترضین کے اعتراضات کا اجمالی خاکہ درج بالا عبارتوں میں ملتا ہے۔

افسوس ہے کہ معترضین تنقید و احتساب کے بنیادی فرائض جوش اعتراض میں یکسر فراموش کر دیتے ہیں اور حدود نقد و نظر سے ہٹ کر صرف عیب جوئی اور فتنہ جیتی کو ہی مطمح نظر بنا لیتے ہیں۔ گریہ وزاری دہائی کہہ کر طنز کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ تنقید کا اصل مقصد مواد، زبان اور اسلوب ہوتا ہے نہ کہ ایقاعات عقود اور عبادات کو زیر بحث لانا۔ یہ خارج از بحث ہے رامائن ہو یا مہابھارت پدماوت ہو یا سور ساگر اوڈی سی یا ایلیڈ یا پیراڈائز لاسٹ ان کے مصنفین کے عقائد و ایقاعات سے کوئی واسطہ تنقید اور تنقید نگار

کو نہیں رہتا ہے۔ ادبی اور فنی محاسن پر پرکھا جانا اور کسا جانا ہی نقد اور معیار انتقادیات ہے اس لیے اردو مرثیہ اور میر انیس کے ذیل میں یہ بحث خارج از موضوع ہے کہ گریہ وزاری، آہ و بکا، فریاد و ماتم و نالہ کس طرح کا عمل ہے چونکہ اردو مرثیہ سے مراد خاص طور سے واقعہ کربلا کے غمناک اور روح فرسا مقامات ہی مقصود ہیں یہی دراصل مرثیہ اور میر انیس پر اعتراضات کے اصلی اسباب ہیں اور اسی سے اور بہت سے اعتراضات آنکھ بند کر کے وارد کر دیئے جاتے رہے ہیں۔ اسی طرح کے اعتراضات کا جواب دینا غیر ضروری ہے لیکن ایک مقتدر، صائب الرائے حضرت حالی کا یہ اعتراض کہ سامعین اس کی شعری خوبیوں کی طرف دھیان نہیں دیتے قطعی بے بنیاد ہے اور ناواقفیت کی روشن دلیل ہے مجالس سید الشہداء میں جن لوگوں نے شرکت کی ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اہل مجلس آج کے اس ادبی اور علمی انحطاط کے دور میں بھی مراثی اور خاص طور سے مراثی انیس بڑے ذوق اور شوق اور انہماک سے سنتے ہیں ہر ہر مصرع کے حسن و قبح کو پرکھتے ہیں لفظوں کی مناسبت اور صنعتوں کی داد دیتے ہیں اور بھری مجلسوں میں بر سر منبر مرثیہ گویوں کو برمحل ٹوک دیتے ہیں اور مصرعوں کی اصلاح اور ایضاح بھی فرماتے رہتے ہیں۔

کلیم الدین احمد مرثیہ اور میر انیس پر اس لیے اعتراض وارد کرتے ہیں اس میں زاد   بہت ہے گویا فلسفہ گریہ کے سب سے بڑے مخالف اور منکر ہی ہیں۔ میر انیس پر کلیم الدین احمد کی ایک غیر ادبی کتاب بھی آگئی ہے جسے پڑھ کر یقین ہی نہیں ہوتا کہ کلیم الدین احمد جیسا شخص میر انیس کے بارے میں اس طرح کا خیال رکھتا ہے یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ مرثیہ دو طرح کے ہیں ایک سوز خوانی کے دوسرے تحت اللفظ کے لیے سوز خوانی کے مراثی نیکی ہوتے ہیں ان کا آغاز ہی رنج و مصائب سے ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مراثی انیس کا مقصد صرف رونا رلانا نہیں بلکہ بزم کا رنگ جدا رزم کا میدان جدا اور مختصر پڑھ کے رلا دینے کا عنوان جدا جدا ہوتا ہے میر انیس کا ایک بند اس بات کی توضیح کے لیے ملاحظہ ہو۔

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہو توصیف بھی ہو
دل میں محظوظ رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

مندرجہ بالا بند کے ہر مصرعے کو غور سے پڑھا اور سمجھا جائے تو بے سر پیر کے اعتراضات کا سد باب از خود ہو جاتا ہے یعنی مرثیہ وہ صنف سخن ہے جس میں بزم، رزم، دبدبہ، شوکت وحشم نالہ و زاری سب کچھ مل جاتا ہے لیکن شاعر کے لیے فہم کامل کا ہونا لازمی ہے نافہم فنکاران نزاکتوں کو نہیں برت سکتا ہے۔

اعتراضات کی دنیا بہت وسیع ہوا کرتی ہے طرح طرح کے پہلو تلاش کر لیے جاتے ہیں۔ ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ مراثی میں کردار تو بہت ہوتے ہیں لیکن کسی کردار کی تکمیل نہیں یعنی کسی کی شخصیت واضح نہیں ہے یہ اعتراض سراسر بے بنیاد اور غلط ہے۔ مرثیہ نگاروں نے اور خود میر انیس نے خاص اور اہم کرداروں کی شان میں مکمل، مدلل اور مبسوط مرثیے لکھے ہیں جو مراثی کی جلدوں میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ مرثیے ہیں کو فہ کا سفر حضرت حر کی عقیدت مندی حضرت جون کی پامردی حضرت عباس کی وفاداری حضرت عون و محمد کے حوصلے

اور ولولے، حضرت علی اکبر ہمشکل پیغمبر کی سیرت نگاری حضرت قاسم ابن حسن کی تمنائے موت اور رد الفقر موت حضرت حبیب ابن مظاہر کا حق رفاقت جناب سکینہ بنت الحسین، پیاس کی شدت اور ان کی طفلی، حسین کے ششماہے علی اصغر کی طفولیت اور پامردی شریکۃ الحسین ثانی زہرا کا کردار حضرت علی ابن الحسین یعنی حضرت سید سجاد کی سیرت کے نورانی نقوش اور کردار کی عظمتوں کو تفصیل سے ملاحظہ کیا جاتا ہے جس میں باقاعدہ تاریخی ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے۔

ہاں! ڈاکٹر احسن فاروقی کا اعتراض دیکھنے میں بڑا منفرد، ادبی و علمی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ذرا بھی غور سے غیر جانبدار ہو کر دیکھا جائے اصل حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں کہ مرثیہ میں زندگی، ناول، ڈرامہ اور اپیک جیسی نہیں ملتی ہے حالانکہ اس میں صنف مرثیہ اور میر انیس کا کیا قصور ہے۔ مرثیہ مرثیہ ہے ڈرامہ نہیں ہے ڈرامے کا فن اسٹیج کا ہے مرثیہ کا اسٹیج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ اعتراض بھی قابل اعتنا ہیں کہ مرثیہ نگاری صرف مداحی ہے یا یکسر قصیدہ نگاری ہے اور یہ بھی صحیح نہیں کہ مرثیہ میں مدح اور بین میں کوئی ربط نہیں پیش کیا جاتا ہے حالانکہ یہ سب چیزیں تو صرف مرثیہ کے سرسری مطالع سے واضح ہو جاتی ہیں۔ فاضل معترضین نے معلوم نہیں کون سے دل و دماغ سے مرثیے کا مطالعہ کیا ہے اور معلوم نہیں کس عینک سے دیکھا ہے۔

اردو کے مغرب زدہ نقاد اپنے تنقیدی اصول و ضوابط کو مستند بنانے کے لیے انگریزی، فرانسیسی، جرمنی یونانی اور لاطینی وغیرہ وغیرہ سے ضرور حوالہ دیتے ہیں۔ لہٰذا مرثیہ اور میر انیس کے مقبولیت اور شہرت سے چڑھ کر جب یہ لوگ قلم اٹھاتے ہیں تو نقاد کے منصب کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور تنقید کو نکتہ چینی، ہرزہ سرائی اور عیب جوئی کے خلاف میں لپیٹ کر سامنے آتے ہیں تو بہت طرہ اور غرہ سے کہتے ہیں کہ یورپ میں حزینہ ادب کا مقصد رلانا نہیں ہے اس سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر احسن فاروقی یہ کہنے پر اتر آتے ہیں کہ۔

"اس لحاظ سے مرثیہ اصناف سخن ادب کے دائرہ سے بالکل باہر ہو جاتا ہے جو شعریات میں شامل کی جاتی ہیں اس کا شمار پست عوامی ادب میں ہی ہو سکتا ہے"

مغربی ادب کے معماروں میں سب سے گرانقدر نام ارسطو کا ہے۔ آئیے اس کی "بوطیقا" میں وہ کیا ارشاد ہے۔ فرماتے ہیں۔

"ٹریجڈی (المیہ) نقل ہے کسی ایسے عمل کی جو اہم اور مکمل ہو اور ایک مناسب عظمت (طوالت) رکھتا ہو جو مزین زبان میں لکھی گئی ہو جس سے حظ حاصل ہوتا ہو لیکن مختلف ذریعوں سے جو درد مندی اور دہشت کے ذریعہ اثر کرکے ایسے ہیجانات کی صحت اور اصلاح کرے حظ بخشنے والی زبان سے میری مراد ایسی زبان ہے جو موزونیت، نغمے اور تقطیع سے مزین ہو اور میں نے مزید یہ بھی کہا کہ مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے کیونکہ بعض حصوں میں صرف تقطیع کو استعمال کیا جاتا ہے اور بعض میں نغمے کو"[۵]

ارسطو کے درج بالا بیان سے احسن فاروقی کے اعتراض کی مدلل تردید ہو جاتی ہے۔ ہاں یورپ میں حزینہ ادب کا مفہوم صرف رونا رلانا نہیں ہوتا۔ ارسطو کہتا ہے کہ مختلف حصوں میں مختلف ذریعوں سے جو درد مندی اور دہشت کے ذریعہ اثر کرکے ایسے ہیجانات کی صحت اور اصلاح کرے۔

دراصل مرثیہ اور مراثی انیس درد مندی انسان دوستی

کا جیتا جاگتا مرقع پیش کرتے ہیں۔ ٹریجڈی (المیہ) کو
مزین زبان میں لکھنے کی بات بھی ارسطو نے کہی ہے
اس لیے المیہ یا حزنیہ کے تمام تر عناصر اور اجزا اردو مرثیہ
اور مراثی انیس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

میر انیس کے سلسلے میں یہ بات محل نظر ہے کہ یہ دونوں
دبستانوں سے بھی معرکہ آرا رہے حالانکہ اب یہ کیفیت
تقریباً ختم ہو چکی ہے لیکن تہذیبی سطحوں پر عصبیت زدہ
تصورات آج بھی کسی نہ کسی طور پر مل ہی جاتے ہیں یہ امر
مسلم ہے کہ علاقائی تعصب

سیاست کی دنیا میں ہو یا شعری و ادبی حضرات میں ہمیشہ
غیر معتدل اور غیر منصفانہ ہوتے ہیں۔ میر انیس کو تعصبات
اور ذہنی تحفظات یہاں تک لے گئے کہ یہ کہا جاتا رہا
کہ انیس صرف شیعوں کے رونے رلانے کا وسیلہ ہے اور
پھر ذرا سطح عصبیت نے انگڑائی لی تو کہا جانے لگا کہ
انیس نے عرب کے جغرافیائی اور تاریخی فضا کو لکھنؤ کے رنگ
بو میں ڈھال کر معرکہ کربلا کی روح کو فنا کر دیا ہے اور
پھر مزید کہا جانے لگا کہ انیس نے واقعات اور کردار کو
لکھنوی تہذیب اور لکھنوی نواب زادوں کے انداز سے
پیش کر کے اصل روح کو فوت کر دیا ہے اور اس طرح کے
بہت سے بے بنیاد اور غیر سنجیدہ اعتراض ہیں۔

اعتراضات اور معترضین کی طویل فہرست پر نظر ڈالنے
کے بعد جب ہم ذرا کچھ دیر کے لیے غور و فکر کی دنیا میں
آ جاتے ہیں تو پھر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر بڑا نقاد، نباض شعر و
ادب مفکر اور دانشور میر انیس کو بڑا شاعر اور عظیم شاعر تسلیم
کرتا ہے۔

واقعہ کربلا کو میر انیس نے اپنے شعری افکار کے سانچے
میں ڈھالا ہے جس میں ان کا تخیل جذبۂ سرشاری اور فن
کاری کے اعلا نمونے دل و دماغ کو متاثر کرتے ہیں جس
نے بھی مراثی انیس کا مطالعہ یا استیعاب کیا ہے صرف وہی

سمجھ سکتا ہے کہ حضرت علی اکبر کے بیان میں میر انیس ۲۲۸ مرثیے
حضرت عباس کے بیان میں تقریباً ۱۵۰ مرثیے لکھے ہیں۔
سید الشہدا حضرت قاسم ابن حسن حضرت عون و محمد اور حضرت
حر کی شان اقدس میں سو سے زیادہ لکھے ہیں۔

یہ میر انیس کے فن کی انفرادیت ہے جس میں کوئی شاعر
شریک نہیں وہ یہ کہ انیس نے واقعہ کربلا کو ادبی اور شعری
پیکر عطا کر کے اسے کسی ایک فرقہ کے لیے نہیں بلکہ تمام نسل
انسانی کے لیے ایک روشن مشعل عطا کر دی ہے جو باطل کی
قوتوں سے ٹکرانے اور نبرد آزما ہونے کا حوصلہ بخشتی ہے اور
ہر سچے اور پاکیزہ دل کو استعماریت کے خلاف علم بغاوت بلند
کرنے کا عزم پیدا کرتی ہے۔ میر انیس نے واقعہ کربلا کے عربی
کرداروں کو ہندوستان کی ارضیت اور حقانیت کے پیکر میں پیش
کیا ہے تاکہ وہ کردار موثر ثابت ہو سکیں بقول ڈاکٹر محی الدین زور:

"میر انیس اگر ہندوستانیوں کی نظروں کے آگے
ایک عرب عورت کا مکمل نقشہ کھینچ دیتے تو ان کے
کلام کو اس قدر مقبولیت حاصل نہ ہوتی کیوں کہ
ہندوستانی ان کی پیش کردہ ہستیوں کو اپنی چیز
نہ سمجھ کر ان سے غیرت برتتے اور یہ مغائرت
انھیں ان ہمدردیوں اور اس پر خلوص محبت سے
روکے رہتی جو آج میر انیس کے پڑھنے کے بعد
حضرت زہراؑ اور حضرت زینبؑ وغیرہ کے متعلق
دلوں میں خود بخود پیدا ہوتی ہے۔"[9]

◇◇

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ
عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

[9] تنقیدی مقالات۔ ڈاکٹر محی الدین

علی احمد فاطمی
9415306239

ترقی پسند تنقید کی انیس شناسی

ہمارے دوست اور ممتاز ادیب و محقق ہلال نقوی جو نہ صرف رسالہ "رثائی ادب" کے باصلاحیت مدیر ہیں بلکہ رثائی ادب کے ماہرین میں سے ہیں۔ اس وقت برصغیر میں مرثیہ انیس، دبیر، جوش اور جدید مرثیہ پر جتنی اچھی نظر اور سرمایہ ان کے پاس ہے شاید ہی کسی کے پاس ہو ۲۰۰۲ میں جب میر انیس کی پیدائش کا دو صد سالہ جشن منایا جا رہا تھا۔ انھوں نے رثائی ادب کا تقریباً بارہ سو صفحات پر مشتمل جہازی سائز کا انیس نمبر شائع کیا جس کی اپنی تاریخی حیثیت ہے۔ اس کے اداریہ کے پہلے ہی صفحہ پر انھوں نے جو ایک غور طلب بات رقم کی اسے آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔

"میر، غالب، انیس، اقبال اردو کے کم و بیش تمام ہی نقادوں نے انھیں چار شعراء کو اردو کے عظیم تخلیق کاروں کا منصب عطا کیا ہے لیکن کیا انیس پر اردو تنقید نے وہی حق ادا کیا ہے جو میر غالب اور اقبال کے متعلق دیکھنے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اردو تنقید کا جواب نہیں میں ہوگا اور اس کی بظاہر صرف ایک وجہ ہے اور وہ ہے کہ اس صنف کا ایک مذہبی تصور اور اس کے ہیرو سے تعلق۔ لیکن یہ بھی ہماری خوش فہمی ہی ہے ورنہ آپ آگے بڑھئے تو اکثریت انیس کو ایک فرقے کا شاعر تسلیم کرتی ہے۔"

کیا خدا لگتی بات کہی ہے استاذی پروفیسر سید محمد عقیل نے جب اپنی بیحد اہم کتاب "مرثیے کی سماجیات" ۱۹۹۳ لکھی تو خاصی مخالفت ہوئی۔ عقیل صاحب بظاہر مسلکی اعتبار سے شیعہ ہیں اور مرثیہ اور مرثیہ نگاروں پر غیر معمولی نظر رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان سے اختلاف کیا گیا۔ شاید وجہ یہ تھی کہ وہ ترقی پسند نقاد ہیں اور اس سے زیادہ یہ کہ مرثیہ کے تعلق سے اعتقادات ہو سکتے ہیں۔ ایک مخصوص شعریات ہو سکتی ہے لیکن سماجیات کیسے اور کس طرح؟ خیر یہ الگ بحث ہے میں نے اس کتاب پر ایک مکمل تبصرہ نما مضمون لکھا جو ایوان غالب کے عالمی انیس سیمینار میں پڑھا گیا۔ میں بھی مضمون کی ابتدا میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ "اردو تنقید یا ہمارے نقادوں نے جتنی توجہ میر، غالب اقبال یا بعض دوسرے شاعروں پر دی انیس پر کیوں نہیں دی۔ مقدار معیار کے اعتبار سے تنقید کی جتنی کتابیں متذکرہ بالا شعراء پر ملتی ہیں انیس پر نسبتاً کم اور جو ہیں ان میں سے چند کو چھوڑ کر زیادہ تر تحقیق سے متعلق ہیں اور جو تنقید بھی ہے ان میں حقیقت، بصیرت اور معروضیت کم دیکھنے کو ملتی ہے جو صف اول کی تنقید کا معیار و شعار رہی ہے۔ کیا اس کی وجہ مرثیہ کا یا انیس کا مذہبی مزاج ہونا مجلس و منبر سے متعلق ہونا تنقید نگاری کا پابند ہونا یا کچھ اور۔ اس مبہم گفتگو کا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ جب عمومی طور پر مرثیہ شناسی یا انیس شناسی میں راست اور آزاد تنقید کی مشکلات ہیں تو پھر ترقی پسند نقادوں کے سامنے تو اور بھی مشکلیں تھیں۔ وہاں مسئلہ تھا اشتراکیت کا، خارجیت کا سماجیت کا جن کی ایک طبقۂ فکر کی طرف سے مخالفت رہی ہے۔ یہی مسئلہ عقیل صاحب

کی کتاب کی تفہیم میں بھی آڑے آیا۔ اسی لیے میں نے خاص طور پر اس مضمون کا عنوان کچھ اس قسم کا قائم کیا جس میں تین چار ترقی پسند نقادوں کی انیس شناسی کا مختصر جائزہ پیش کروں جس سے کچھ اندازہ ہو سکے کہ اعتقاد انیس اور افہام انیس کے مابین کیا فرق ہے بھی یا نہیں

اپنی گفتگو کا آغاز سب سے اہم اور سب سے بڑے ترقی پسند نقاد احتشام حسین کے ایک نایاب لیکن بیحد اہم مضمون / مقدمہ مطالعہ انیس " سے کرتا ہوں مضمون کی ابتدا میں جو بات کہی گئی ہے اس سے میری تمہید کو تقویت پہنچی ہے۔

" عالمی ادب پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض ادیب و شاعر محض اس وجہ سے اپنا صحیح مقام حاصل نہ کر سکے کہ ان کے موضوع پر تنگ خیالی سے نگاہ ڈالی گئی ہے "

یہ تو ایک عمومی گفتگو ہو سکتی ہے لیکن اس کے فوراً بعد کے جملے پچھلے جملوں کی پوری وضاحت کر دیتے ہیں ملاحظہ ہوں۔

" اس کے صرف ایک رخ کو پیش نظر رکھ کر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کی اپیل محض ایک خاص گروہ کے لیے مخصوص ہے نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی فنی صلاحیت شاعرانہ بصیرت، تخلیقی قوت اور قدرت بیان کا اعتراف دبی زبان سے کیا گیا "

لیجئے اس کے بعد کے جملوں میں بات پورے طور پر سامنے آجاتی ہے۔

" اس حیثیت سے میر انیس کا شمار ان فنکاروں میں ہوتا ہے جس کا سارا سرمایہ شاعری مسلمانوں کے ایک خاص فرقہ کے لیے وقف ہے۔ ایک اعلیٰ پائے کا فنکار اور شاعر پر اس سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ اس کے پر خلوص انتخاب موضوع کو اس کی مذہبیت یا تنگ نظری پر محمول کر کے اس کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ انصاف نہ کیا جائے اسے اس توجہ کا مستحق نہ سمجھا جائے جس کا وہ واقعی مستحق ہے "

ان جرأت مندانہ تمہیدی کلمات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ احتشام حسین اپنے مخصوص، ترقی پسند فکر و نظر سے انصاف کریں گے لیکن یہ بھی سمجھتے چلنا چاہئے کہ انیس کے عظیم و کثیر سرمایہ شاعری کو محض ایک مقالہ میں سمو پانا مشکل کام ہے لیکن احتشام حسین اپنے اس طویل مضمون کی ابتدا میں وہ بات کہہ جاتے ہیں جو بڑے بڑے نقاد کہتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اسباب کی گرہیں کھولتے ہوئے وہ سب سے پہلے صنف مرثیہ کی اہمیت کی کمی کا ذکر کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو والا تصور بھی مضحکہ خیز رہا۔ شاعروں نے اس مضحک سے بچنے کے لیے مرثیہ کو عمومی مجلس سے نکال کر مذہبی جلسوں تک پہنچا دیا حالانکہ انھیں مجلسوں نے مرثیہ اور انیس کو زندہ بھی رکھا ورنہ احتیاط پسند تنقید اور احترام پسند تہذیب نے انیس و دبیر کو ختم کرنے کی انجان کوشش کر دی تھی۔ ایک وجہ غزلیہ شاعری یا عشقیہ شاعری کا غلبہ بھی تھا جس میں حسن و عشق کے لطیف موضوعات تھے۔ حسن و جمال کے تذکرے تھے۔ دبستان لکھنؤ کی غزلوں میں بطور خاص صنف مرثیہ کی نزاکتوں کو لے کر کچھ باتیں اور بھی ہیں جنھیں احتشام حسین نے تہذیبی سیاق میں پیش کیا ہے لیکن یہاں میں ان کی انیس شناسی پر باتیں کرنا چاہوں گا جو میرے مضمون کا اصل مقصد ہے لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ان نزاکتوں کو سمجھے بغیر آپ انیس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو نہیں سمجھ سکیں گے اس لیے کہ مرثیہ یا انیس کی شاعری پر جب بھی گفتگو ہوئی تو عالمانہ گفتگو میں بھی عقیدہ اور جذبہ زیادہ کام کرتا رہا۔ فکر و فن کم۔ انیس کی شاعری کے فکری و فنی تجربے، مقابلے کی کمی میں یہ نازک جذباتی امور آڑے آتے رہے۔ احتشام حسین ایک بنیادی و حقیقی سوال کرتے ہیں۔ حقیقت نگاری کا کیا مفہوم ہے اور میر انیس نے کس حد تک اس کی پابندی کی ہے اور اس سے زیادہ یہ سوال۔ مرثیے میں جو اخلاقی تصور زندگی پیش کیا گیا ہے وہ کس قسم کے سماج اور کس قسم کے لوگوں کے لیے مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ انیس کے مرثیوں کا مطالعہ کرنے والوں کو

ان کے حالات زندگی عقائد اور خیالات سے بھی واقف ہونا چاہئے احتشام حسین کا سماجی اور سائنسی ذہن ان مبادیات کو اس لیے لازمی قرار دیتا ہے کہ اس سے مرثیہ اور انیسؔ دونوں کا دائرہ فکر اور تخلیقی عمل ایک مخصوص طبقہ سے نکل کر وسیع سے وسیع تر ہوتا ہے اور انیسؔ کی شاعری کا انسانی، سماجی اور تہذیبی حلقہ از خود بڑا ہونے لگتا ہے ایسا اس لیے بھی کہ مرثیہ بطور رزمیہ شاعری اور کربلا بطور انسانی و اخلاقی حادثہ اپنے آپ میں اتنے بڑے موضوعات ہیں جو کسی حلقہ و عقیدہ میں قید ہو ہی نہیں سکتے۔ دیکھئے یہیں سے مرثیہ کی صنف بڑی ہونے لگتی ہے اور انیسؔ کے مرثیے تو اس سے بھی زیادہ بڑے، اس لیے کہ ان میں محض مرثیت یا رزمیت نہیں بلکہ غیر معمولی شعریت اور مقصدیت ہے۔ مشکل یہی ہوا کہ ہم نے مرثیہ کو مرثیت، عقیدت اور جذباتیت کے طور پر زیادہ لیا۔ اس کی فنی بصیرتوں، زندگی کی حقیقتوں اور غم کی معرفتوں کے ذریعہ کم۔ اس لیے دائرہ تفہیم اور اور تعبیر سمٹتا ہی رہا۔ اور تنقید کا دامن تنگ ہوتا گیا۔ احتشام حسین کا خیال ہے کہ انیسؔ کی شاعری ایک وسیع عمیق اور بلند مرتبہ رکھتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ ان کی مرثیہ نگاری محض تاثرات غم نہیں ہے جو لوگ اسے صرف اسی تاثر سے لیتے ہیں تو احتشام حسین سوال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی وہ یہ بات کہتے ہیں۔

> "اگر مرثیہ محض تاثرات غم کے اظہار کا نام ہے جو کسی شخص کی موت پر انفرادی یا اجتماعی طور پر پیدا ہوتے ہیں تو پھر انیس کے مرثیوں کو مرثیہ کہنا کہاں تک درست ہے؟"

اسی لیے احتشام حسین مرثیہ کو صرف رزم یا ایپک نہیں مانتے اور انیسؔ کی شاعری کو صرف رزم نامہ بھی نہیں مانتے۔ ان کا یہ جرأت مندانہ اظہار ہے کہ انیسؔ ایپک اور ٹریجڈی کی مغربی تعریف سے ناواقف تھے۔ اگر اس صورت میں ان کے سامنے کوئی مثال تھی تو وہ فردوسی کی شاہنامہ تھی یا کچھ اور۔ وہ اوڈیسی دوانتے کا میڈی اور پیراڈائز لاسٹ سے بھی ناواقف تھے لیکن ان سب کے باوجود احتشام حسین نے تعریف کی۔ یہ بھی کہتے ہیں۔

> "انھوں نے مرثیہ کی محدود دنیا میں ان اعلیٰ نظموں کی شان پیدا کی جو دوسرے ملکوں کے سرمایہ شاعری میں ایک بیش بہا مقام رکھتی تھیں۔"

ایپک کی ناواقفیت یا محدودیت کے باوجود اس صنف میں انسانی و اخلاقی اقدار کی کشاکش لازمی ہو چکی تھی یا ہو رہی تھی انیسؔ نے ان امور پر توجہ دے کر وسعت کے ساتھ اپنے تخلیقی تجربہ کا حصہ بنا کر اپنے مرثیوں کو ایپک، ٹریجڈی، زندگی غرضیکہ سب کچھ سمیٹ لیا۔

احتشام حسین یہ بھی کہتے ہیں کہ انیسؔ ڈرامہ کی صنف سے بھی واقف نہ تھے۔ لیکن انسانی فکر و عمل، جذبۂ محبت کے ڈرامائی اظہار پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ اس لیے کہ ان کی نظر انسان کے فطری جذبۂ ایثار سے تھی ڈرامہ کے اظہار سے کم۔ مرثیہ خوانی کے دور میں محققین و ناقدین نے اس میں مغربی طرز کی ڈرامائیت تلاش ضرور کی لیکن وہ انسان کی فطری ڈرامائیت کو ٹھیک سے نہ سمجھ سکے جو انیسؔ نے برتی اور کامیاب ہوئے اس لیے کہ وہ نقل کے بجائے انسان کی اصل حقیقت سے زیادہ قریب تھی۔ تبھی تو احتشام حسین یہ کہتے ہیں۔

> "انیسؔ ایک مخصوص نقطۂ نظر سے حقیقت نگاری کی طرف مائل تھے۔ انھوں نے واقعات اور مناظر، کردار اور جذبات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اکثر و بیشتر حقائق سے قریب ہی رہتے ہیں..... جس شخص کو اس بات کا احساس ہو کہ جو بات جیسے کہے جانے کی ہے اور جس جگہ کہے جانے کی ہے اسی طرح وہ کہی جائے۔ اس کے حقیقت پسند ہونے میں کسی قسم کا شک نہیں ہو سکتا۔"

حالانکہ احتشام حسین یہ بھی کہتے ہیں کہ انیسؔ کی حقیقت نگاری پر بحث ہو سکتی ہے تاہم ظلم، ظالم۔ جبر و قہر۔ قتل و خون وہ انسانی و سماجی قدریں ہیں جن پر بحث یا اختلاف کی گنجائش کم سے کم ہے کیونکہ یہ عالمی قدریں ہیں باقی مقامی اور فروعی۔ مشکل یہی ہے کہ

انیسؔ کے تعلق سے ہم ضروری بحثوں میں زیادہ الجھے رہے ان کی عالمی و انسانی اقدار اکثر نظروں سے اوجھل رہی ایسے خیالات ایک ترقی پسند سماجی اور مارکسی ذہن کے نقاد کے ہی ہوسکتے ہیں جس نے حقیقت کی معرفت حاصل کرلی ہو اور حقیقتوں کی سنجیدہ و پیچیدہ پہلوؤں کو بھی سمجھ رکھا ہو اور ان پہلوؤں کو رثائی شاعری، انیسؔ کی شاعری میں تلاش بھی کیا ہو۔ یہ تلاش غالب اقبال کی تلاش سے قدرے مشکل ہے اور مختلف بھی۔ یہ ایک ترقی پسند نقاد ہی کرسکتا ہے کہ انیسؔ کی رثائی شاعری، جو پابند ہے لیکن اس میں مزاحمت کی دنیا آباد ہے۔ آزادی کی تڑپ ہے، ظلم کے خلاف نعرۂ احتجاج ہے۔

احتشام حسین کہتے ہیں۔

”اگر ہم مراثیٔ انیس کو غائر نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے ان پابندیوں کے اندر آزادی کی جو راہیں نکالی ہیں وہ ان کی شاعرانہ عظمت اور تخلیقی صلاحیت کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔“

یہ جملے بھی دیکھئے۔

”انھوں نے اپنی تخلیقی قوتوں سے کرداروں کے نقوش عمل کو زندگی میں نفسیاتی اور جذباتی پیچیدہ راستوں سے گزار کر ان کی انسانی اور حقیقی خصوصیتوں کا احساس دلایا۔“

عام مرثیہ گو واقعہ کربلا کے سبھی کرداروں کو ایک سی صورت / شجاعت پیش کردیتا ہے لیکن احتشام حسین کا کہنا ہے کہ انیسؔ کے سارے کردار ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی خصوصیات میں مرتبہ میں الگ الگ ہیں۔ کہتے ہیں۔ ”کوئی شخص مراثیٔ انیس میں امام حسین اور حضرت عباس کے کردار میں دھوکا نہیں کھا سکتا“۔ کرداروں کی اس تفریق میں ہی ان کی تعریف ہے یہ ایک گہری نگاہ والا ہی کرسکتا ہے۔ خاندان، معاشرہ اور سماج میں ان رشتوں کی معنویت اور اہمیت سمجھتا ہے انیسؔ نے ثابت کیا ہے کہ کردار نگاری صرف ایک تخلیقی مرحلہ نہیں ہوتا ہے بلکہ خاندانی اور سماجی معاملہ بھی ہوتا ہے اور اس سے زیادہ یہ ہے کہ ان سب کی فنکارانہ پیش کش ان کو عقیدتمند بناتی ہے اس سے زیادہ شاعر بناتی ہے اور یہی شاعری ابتداً اسے مقامی بناتی ہے بعد میں عالمی بناتی ہے۔ عالمی اس لیے بھی بناتی ہے کہ رزمیہ ہو المیہ یا مرثیہ ان سب میں اعلیٰ انسانی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ بلند مقصد نظریہ اور فلسفہ کے بلند سے بلند تر ہونے کی ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں جذباتی کئے بغیر نصیحت و ہدایت کئے بغیر بھی شاعری کے اعلیٰ جوہر سامنے آجاتے ہیں جو انیس کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ایک نازک بات احتشام حسین نے اور اٹھائی ہے وہ یہ کہ رزمیہ میں جہاں جتنے پیچ و خم پیدا ہوتے ہیں تصادم اور شور ہوتا ہے وہاں انیس کو زیادہ کامیابی ملی ہے۔ احتشام حسین کچھ مثالیں بھی پیش کرتے ہیں اس کے بعد یہ بلیغ بات بھی قلم سے نکلتی ہے۔

> میرانیس نے مرثیہ کو وہ شکل دی جہاں اس میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی اور اردو شاعری کے بہت سے وہ پہلو جو تشنہ تھے یا زوال آمودہ تمدنی حالت میں پسندیدہ نہیں ہے تھے نمایاں حیثیت اختیار کر گئے۔

”واقعہ کی عظمت اور موضوع کی اہمیت کا احساس نہ ہوتا تو میر انیسؔ کے احساس فن کو چار چاند نہ لگتے اچھی شاعری سے ایک نظم اچھی بن سکتی ہے لیکن اسے اعلیٰ بنانے کے لیے ایک عظیم واقعہ ہونا چاہئے جو انسانی احساس کو جھنجھوڑ سکے اور جس کی مدد سے جذبات کے رشتوں میں بہتر تنظیم پیدا کی جاسکے۔“

زوال پذیر سماج، مذہب میں پناہ لیتا معاشرہ، ملک سے معاشرہ کا سیاست سے فرار۔ احتشام حسین ان عناصر کو بھی مرثیہ نگاری کے عوامل و محرکات کا سبب مانتے ہیں۔ انیس کے مرثیوں کی کامیابی کہ اس نے صرف عقیدت ہی کو تقویت نہیں پہنچ رہی تھی بلکہ

آمادہ روزگار سے نجات مل رہی تھی۔ اس بات سے کم و بیش انیس بھی واقف تھے۔ ان سماجی عناصر کی جھلک بھی بہر حال انیس کے مرثیوں میں نظر آجاتی ہے۔ مضمون کے آخری حصہ میں تحسین کے یہ کلمات دیکھئے۔

"میر انیس کی شاعری کے بعد مرثیہ شاعری میں ایک مثالی حیثیت اختیار کر گیا۔ اسے صرف ادب کی ایک مستند صنف کا درجہ حاصل نہیں ہوا بلکہ بہت سے شعراء کے لیے وہ منارۂ ہدایت بن گیا۔ دورِ جدید کے نہ جانے کتنے شعراء نے انیس سے شعوری یا غیر شعوری طور پر کسبِ فیض کیا ہے۔"

آخر میں لکھتے ہیں۔

"میر انیس نے مرثیہ کو وہ شکل دے دی جہاں اس میں غیر معمولی وسعت پیدا ہو گئی اور اردو شاعری کے بہت سے وہ پہلو جو تشنہ تھے یا زوال آمودہ تمدنی حالت میں پسندیدہ نہیں رہے تھے نمایاں حیثیت اختیار کر گئے۔"

احتشام حسین کا یہ طویل ناقدانہ و عالمانہ مضمون پہلے صنف مرثیہ کو، اس کے بعد انیس کی مرثیہ نگاری کو فکر و فن کے وسیع تر سیاق و سباق میں جانچتا پرکھتا ہے اگر ایک طرف وہ ایپک ٹریجڈی وغیرہ کی روایت کی چھان بین کرتا ہے تو دوسری طرف زوال آمادہ سماج کے اخلاق و کردار کی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس پورے تناظر میں انیس کی شاعری کا حقیقی اور اخلاقی عنصر اس مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ یوں تو احتشام حسین نے ایک مختصر سا مضمون شبلی کی کتاب "موازنہ انیس و دبیر" پر بھی لکھا ہے لیکن وہ انیس شناسی پہ کم شبلی شناسی پر زیادہ ہے اور اس سوال کا جواب تلاش کرتا ہے کہ شبلی بنیادی طور پر مورخ تھے لیکن جب کسی ایک شاعر پر کتاب لکھنے کا خیال آیا تو انیس ہی کا انتخاب کیوں کیا۔ بہر حال یہ پہلی کتاب ہے جس میں مرثیہ شناسی اور انیس شناسی کے عناصر ملتے ہیں۔ احتشام حسین یہاں بھی کہتے ہیں کہ اس زوال آمادہ دور میں انیس کا کلام شاعری کے تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے شبلی جن شاعرانہ خصوصیات کو اہمیت دیتے تھے ان کے مناسب ترین نمونے انیس کے کلام میں نظر آتے ہیں۔

ان دونوں مضامین میں احتشام حسین نے جس طرح کے ذہن اور وژن کا مظاہرہ کیا ہے وہ ایک ترقی پسند ذہن ہی کر سکتا ہے وہ انیس اور عہد انیس کے بارے میں متعدد سوال اٹھاتے ہیں لیکن خود ان کے متعلق بھی ایک سوال ہے کہ تقریباً دو دہائی سے زیادہ لکھنؤ کی شبلی تہذیب اور رثائی ماحول میں رہتے ہوئے بھی انھوں نے کلام انیس پر باقاعدہ صرف ایک ہی مضمون لکھا جبکہ غالب، اقبال وغیرہ پر کئی مضامین لکھے ہیں کیا وہ بھی احتیاط و احترام کا شکار رہے جس کا شکوہ وہ اپنے مضمون کی ابتدا میں دوسروں سے کرتے ہیں۔

ممتاز ترقی پسند ناقد سید محمد عقیل دبستان احتشام حسین کے ہی پیرو کار ہیں۔ ادب کا تہذیبی و سماجی مطالعہ ہی ان کا اصل تنقیدی موقف ہوا کرتا ہے انیس شناسی کے ضمن میں بھی ان کا طریقہ نقد کم و بیش یہی رہا ہے۔ انیس پر انھوں نے سات مضامین لکھے ہیں۔ اس میں ایک مرثیہ کا علمی تجزیہ کیا ہے جو مرثیہ جیسی طویل رزمیہ صنف کے تعلق سے ایک نئی شروعات ہے۔ میں اپنی گفتگو ان کے ایک بیحد اہم مضمون "میر انیس کی اقلیم سخن" سے شروع کرتا ہوں۔ اقلیم سخن کی اصطلاح انھوں نے انیس سے ہی لی ہے جہاں انیس دعا کرتے ہیں کہ ان کا اقلیم سخن پر قبضہ ہے (اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے) عقیل صاحب کی اصل تنقید وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں وہ کہتے ہیں کہ معاملہ صرف دعا کا نہیں ہے بلکہ جس نوع کی وہ شاعری کر رہے تھے "وہ ایک عمرانی مسئلہ بھی ہے"، اور پھر وہ عمرانیات کے حوالے سے فیض آباد اور اس کی گلاب باڑی تک پہنچتے ہیں۔ اور اس عمرانی مسئلہ کو میر حسن، میر خلیق سے جوڑتے ہیں کہ منظر نگاری، فطرت نگاری اور انسانی فطرت یہ سب کچھ مرثیہ کے درد و غم کو ابھارنے میں مدد کرتی ہے تبھی تو عقیل صاحب پورے اعتماد سے کہتے ہیں۔ یہ تمام وراثت میر انیس کے ساتھ ہمیشہ چلتی رہی، عقیل

صاحب یہ بھی اعتماد سے کہتے ہیں:

"ان کے فن کا مقصد اگر کوئی صرف آرائش وزیبائش اور صنائع لفظی ومعنوی کو سمجھتا ہے تو وہ میر انیس کے اقلیم سخن کا مسافر نہیں ہو سکتا کہ اصل مقصد تو درد وغم کا اظہار ہے۔"

تو سوال یہ ہے کہ انیس کے مرثیوں کا اصل مقصد صرف درد وغم کا اظہار ہے اور یہ اظہار اس لیے بھی کہ یہ صنف مرثیہ کا ناگزیر عنصر ہے تو پھر اس میں عمرانی مسئلہ کیا ہے فوری طور پر مضمون میں فنی مسائل پر زیادہ گفتگو کی گئی ہے لیکن اسی گفتگو کے بطن سے عقیل صاحب بڑی نزاکت کے ساتھ انسان کے حواس خمسۂ انسان کے مختلف رشتے، جذبات واحساسات، اجتماعی تجربات معاشرہ اور تاریخ سے پیدا ہونے والی رثائی کیفیتوں کو جذب کرنے کے لیے بیرونی کائنات تک رسائی کو خارجیت اور سماجیت سے جوڑ دیتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ خارجی کائنات کی یہ اظہاریت غزل میں ممکن نہ تھی یہ رثائی شاعری میں ہی ممکن تھا۔ یوں تو عقیل کی گفتگو کا زیادہ تر انحصار فن وہنر پہ ہوتا ہے لیکن وہ ان امور کو علیحدہ طریقے سے نہیں سوچتے۔ وہ اس کے پس پردہ تہذیب کی کارکردگی، روایت پرستی اور معاشرہ کی تبدیلی سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ یہ جملے دیکھئے۔

"مرثیے میں رقت کی شرط ایک اہم شرط اس لیے بھی ہے کہ مرثیہ گویوں نے اسی صورت کے لیے مرثیہ کہے بھی تھے اس وقت کے لکھنوی سماج اور علی الخصوص مجلسی سماج میں رقت ایک ٹیکنیکل لفظ بن گیا تھا۔ کیوں کہ گریہ بر مصائب حسین مرثیے کی بنیادی شرط تھی، مرثیہ نگار مرثیوں میں خواہ کتنی ہی پینترے کیوں نہ دکھائے لیکن اس کے بیان سے اگر سننے والوں پر رقت طاری نہ ہوئی تو ایسا بیان اور ایسی مجلس معیار سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہے۔"

اور اب یہ بلیغ جملہ بھی ملاحظہ کیجئے۔

"میر انیس ان انسانی اقدار، اخلاقی کمٹ منٹ جو اسلام کی جزئیات میں سے تھا۔ شعور اور زندگی کی طہارت اور خیر البشر والی میراث کی شکست وریخت سے پیدا ہوئی آشفتگی کو بھی مرثیوں میں پیش کر کے غم وافسوس کی وہ صورت پیدا کرتے ہیں، جن سے رقت کا ٹیکنیکل لفظ روایت سے اوپر اٹھ کر غم کا ایک ایسا ہالہ بنا لیتا ہے، جس میں شعری بلندی عالمی صورتیں لے کر پیش ہوتی ہے۔"

عقیل صاحب رقت یا رثائیت کو صرف جذبات یا مجلس کی ضروریات کے تحت نہیں دیکھتے بلکہ اس میں اس عہد کی تہذیبی تصویر بھی پیش کرتے ہیں جسے آپ رثائی تعبیر بھی تصور کر سکتے ہیں وہ پوری لکھنوی رنگ شاعری کو تہذیب معاشرت ثقافت اور سیاست کے رو سے دیکھتے ہیں جس میں مرثیہ نگاری ایک معنی خیز و فکر انگیز استاریہ ہے غرضکہ فن وفکر، رقت ورثائیت اور لکھنوی ثقافت اور شعری نزاکت پر عمدہ گفتگو سامنے آتی ہے اور مضمون انیس کے اقلیم سخن یعنی ان کی سخنوری اور شاعری کے تہذیبی تلازمے پیش کرتا ہوا ایک نئی تصویر وتعبیر پیش کرتا ہے۔

سماجیات کے تعلق سے ان کا غیر معمولی طویل مضمون انیس کے مرثیوں کا سماجی تجزیہ ہے جو ان کی کتاب "سماجی تنقید اور تنقیدی عمل" میں شامل ہے۔ مضمون کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے۔

"انیس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ انھوں نے ایسے مقام اور ایسے وقت میں آنکھ کھولی جہاں اور جب سماجی زندگی اپنی بہت سی تعمیری قدروں کو کھو رہی تھی اور محض ظاہری نمائش زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی شکل میں رونما ہو رہی تھی جس میں ان کے تمام ہم عصر شعرا بھی ڈوبے ہوئے تھے۔"

اس کے بعد عقیل صاحب تاریخی حالات، تہذیبی زوال، عیش وعشرت کو پیش کرتے ہیں اور ایسے میں انیس کے مرثیوں کی رثائیت کا کیا تال میل، کیا مذاق امواج۔ لیکن انیس نے خاندانی راستہ اپنایا ضرور لیکن عقیل صاحب کا خیال ہے کہ انھیں

راستوں میں نہ صرف خاندان بلکہ اس عہد کے تحفظ اور بقا کی مدھم صورت تھی۔ عقیل صاحب سوال بھی کرتے ہیں" انیس نے کہاں تک اس کی کوشش کی اور کہاں تک وہ اپنے دور کے ہمنوا ہو گئے۔ ان تمام باتوں کی تلاش کے لیے ان کے مرثیوں کا تجزیہ ضروری ہو جاتا ہے۔" یہ تجزیہ و تلاش ہی اس مضمون کا مرکزی خیال ہے جو اس سے قبل انیس کے مرثیوں میں نہیں برتا گیا یعنی ان حوالوں سے نہیں دیکھا گیا اس لیے کہ ایک خاص شیعی ماحول میں رثائیت نے ایک خاص معنی و مقصد کا لبادہ اوڑھ لیا تھا عقیل صاحب یہ لبادہ اتارتے ہیں اور اسے سماجی اور انسانی حقیقتوں سے جوڑتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انیس کے مرثیے اساسی طور پر کربلا کے ضرور ہوتے ہیں لیکن ثقافتی طور پر ان کا تعلق لکھنوی سماج سے ہے جو بڑے سلیقہ سے اور خاموشی سے مراثی انیس میں داخل ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے نسلی امتیاز پر گفتگو کرتے ہیں جو ہندستانی سماج کا ناگزیر حصہ ہے اس کو بھی وہ تاریخ کے سیاق و سباق میں دیکھتے ہیں۔ انیس بھی اس سے الگ نہیں ہیں۔ وہ اپنے خاندان کی نجابت اور شرافت کو اسی تناظر میں پیش کرتے ہیں لیکن جب اصل مرثیہ پیش کرتے ہیں تو وہی انیس انسانیت کا ایک صحیح نظریہ پیش کرتے ہیں اور بقول مصنف۔ جس میں حرکت اور سماجی اثرات کا اظہار صاف طریقے پر ہوتا ہے۔ حر جو اچھی نسل سے نہیں تھا اس کی تعریف کر جاتے ہیں اور کس طرح یہ مصرع خلق ہوتا ہے وہ کیا اصل تھی اس نخل کی اور کیا ثمر آیا۔" اس کے علاوہ عقیل صاحب ایک اور پتے کی بات کہتے ہیں کہ انیس نے رثائی شاعری کا انتخاب کیا تھا یہ ان کی خاندانی مجبوری تھی۔ اس لیے اس وقت کے تعیش پسندانہ لکھنؤ کو وہ اس شکل میں پیش نہیں کر سکتے تھے لیکن خود مرثیہ گوئی بھی اس زوال آمادہ ماحول کی دین تھی۔ یہ خیال ملاحظہ کیجئے۔

"کنج عزلت میں مثال آسیا گوشہ گیری کا مقصد بھی اپنے کو اس آب و ہوا سے بچانا تھا جو انیس کے لیے ناموافق تھی مگر انسان کی زندگی میں خلا بھی پھیل اور بڑھ نہیں سکتی تھی باوجود ان تمام کوششوں کے وہ زوال آمادہ سماجی قوتیں جو لکھنؤ پر اپنا اثر ڈال رہی تھی خود مرثیہ گوئی جس کا ایک رخ تھی انیس ان سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے ہیں۔"

عقیل صاحب انیس کی وضع قطع کو بھی لکھنؤ کی معاشرتی تہذیب کی تصویر کہتے ہیں۔

"ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کی نفاست، ان کی وضع قطع، چھڑی رومال، چوگوشیہ ٹوپی اور نستعلیق چال سب اسی ماحول کا نتیجہ تھے جسے انیس تھوڑی بہت کوشش کے ساتھ منفرد رکھنا چاہتے تھے۔"

اس انفرادیت میں اس لکھنوی تغزل کو بھی دخل ہے جو ان دنوں رائج تھی۔ ان مصرعوں میں عقیل صاحب لکھنوی غزلیہ شاعری کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔

پھلک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

اس مزاج کے کئی اشعار پیش کر کے عقیل صاحب اس کی سماجی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ لکھنؤ کا تعیش پسند سماج اور اس کی سطحی عشقیہ شاعری جہاں انگیا چولی کا ذکر چل رہا ہو۔ بقول مصنف ؎

"ایسا سماج جس میں ایسی ہی تمام باتوں سے دلچسپی لی جا رہی ہو جو شعر و ادب کو بھی اسی عینک سے دیکھتا ہو وہاں صرف ہائے حسین وائے حسین کہہ کر خاموش ہو جایا جائے جبکہ وہ لوگ جو اسی وقت اس صنف کے مرد میداں تھے رعایات لفظی اور جنسیات کے تذکرے مرثیوں میں کر کے برابر خراج تحسین وصول کر رہے تھے چنانچہ میر انیس نے اپنے ایسے مقدس موضوع میں تغزل اور جنسیات کو شامل کرنا شروع کیا۔"

مرثیہ میں تلوار کا ذکر اس طرح جس طرح تذکرۂ عشق اور جلوۂ حسن میں معشوق کے عشوے، غمزے دیکھئے۔

کس کرشمے سے وہ لیلیٰ ظفر راہ چلی
گہہ تھمی گاہ بڑھی گاہ رکی گاہ چلی

برچھیاں پھسل گئیں اس پر جسے دیکھا بھالا
آ گیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا

کاٹ چھانٹ اور وہ لگاوٹ وہ دکھائی نہ گئی
سینکڑوں خون کئے اور کہیں آئی نہ گئی

تجزیے کی نزاکت اور متضاد صورتوں میں سماجی بصیرت کا ادراک عقیل صاحب کی دوربیں نظر کی غمازی کرتا ہے اور انیس کے مرثیوں کو سماجی و تہذیبی سیاق و سباق کی ایک انوکھی تصویر پیش کرتا ہے نیز یہ گہرا اشارہ بھی ایسا انیس لاشعوری طور پر کر رہے تھے۔ ورنہ ان کی نیت رشد و ہدایت کی نہ تھی۔ عقیل صاحب پورے مضمون میں غزل کی تمام خصوصیات کو سماجی ضروریات کے حوالے سے رثائی شاعری میں تلاش کر کے ایک نئی تعبیر پیش کرتے ہیں مضمون کے اگلے حصہ میں وہ انشاء مصحفی، آتش، ناسخ وغیرہ کا ذکر کر کے اس عہد کی شعری نزاکت کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے رشتے مرثیے سے جوڑتے ہیں اور صاف طور پر کہتے ہیں۔

"بہت ساری چیزیں جنھوں نے مرثیوں میں ایک خاص آب و تاب پیدا کی وہ لکھنؤ کے سماجی پس منظر کے باعث ظہور میں آئیں۔"

اور آگے لکھتے ہیں۔

"انیس کے گرد و پیش جو زندگی اور جس قسم کا سماج تھا اس میں مردانگی، معیاری زندگی اور اس کے مقدس حقائق اور ان تمام اقدار سے فرار تھا جو انسان کو دنیا کا مقابلہ کر کے اس میں صحیح زندگی بسر کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں یا کم از کم اس وقت کے سیاسی بھنور سے نکالنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔"

"مرثیے کا ایسا سماجی اور تہذیبی تجزیہ جس میں تاریخ کی جبریت سماج کی انفعالیت، خارج کی پیچیدہ حقیقت ہو اور ساتھ ساتھ شاعری کی نزاکت بھی ترقی پسند تنقید سے قبل کہاں تھا صرف عقیدتیں، تعریفیں اور محفلیں تھیں۔ فن تھا لیکن ایسی فکر نہ تھی جس میں سماجیات کا بھی برابر سے دخل ہو۔ عمدہ رثائی شاعری یوں بھی ایک خاص معاشرتی و تہذیبی ماحول کی پیداوار ہوتی ہے جس میں رزمیہ اور المیہ کا بہر حال دخل ہوتا ہے اس لیے ضروری نہیں کہ المیہ محض باطنی ہو خارجی المیہ بھی باطنی رنج و غم کا سبب بنتا ہے بس اس کے تجزیے کی ضرورت ہوا کرتی ہے جو ترقی پسند نقادوں سے قبل نہ تھا عقیل صاحب نے نہ صرف سماج کو پیش کیا ہے بلکہ سماج کے ان تضادات و تصادمات کو بھی پیش کیا ہے۔ جو غزل میں مرثیہ اور مرثیہ میں غزل کی سی کیفیات پیدا کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عقیل صاحب نے انیس پر کئی مضامین لکھے ہیں یہاں تمام مضامین کا تجزیہ ممکن نہیں۔ ان مضامین کے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جس سے عقیل صاحب کے گہرے سماجی شعور اور ترقی پسند فکر و آگہی کا اندازہ ہوتا ہے دیکھئے۔

"یہ تمام صورتیں تجربات اور مقامی دسترس لکھنؤ و نواح لکھنؤ کی میر انیس کے زمانے اور تہذیب سے متاثر ایسی صورتیں ہیں جن کا بیان اور محاورات نہیں محاوریات کا اندازہ دوسری سرزمین والے نہیں کر سکتے شاید وہ مرثیوں کی ایسی فضاؤں سے متاثر اور خفیف بھی مشکل سے ہو سکتے ہیں اور یہ مجبوری دنیا کی ہر زبان کی مجبوری ہے۔"

اس کے بعد جو گفتگو عقیل صاحب نے کی ہے کہ شاعری میں جو مقامی اشارے ہوتے ہیں وہ باہر کے لوگ خواہ کتنے ہی ایکسپرٹ ہوں نہیں سمجھ سکتے۔ ان کی اشاریت اور نزاکت کو بس شاعر سمجھتا ہے یا مقامی قارئین و شائقین۔ ایک اور نازک بات جو صرف مرثیوں میں دکھائی دیتی ہے اور وہ ہے خارجیت کے ساتھ رنج و غم کی باطنی کیفیت جو خارجیت کو مزید با اثر اور بامعنی بنا دیتی ہے تبھی عقیل صاحب یہ نازک بات کہہ گئے۔

"اس کا سبب اور توجیہہ محض سیاسی اور سماجی تجزیے نہیں کر سکیں گے کہ اس کی غم انگیز تاریخیت میں ایک عالم غم و الم بھی گردش کرتا رہتا ہے اور رہے گا جسے شبلی صاحب نہیں سمجھ سکیں۔ مرثیوں کی جذباتی کیفیت اور محافل مرثیہ کی غم انگیز فضا اور یہ کیفیات ہی ان باتوں کا صحیح جواب دے سکیں گے۔"

اسی رنج والم کو عقیل صاحب نے اپنے ایک مضمون انیس کی المیہ پیکر تراشی میں پیش کیا ہے۔ المیہ پیکر تراشی اپنے آپ میں سوالیہ نشان ہے اور یہ کس نوع کی ہوسکتی ہے اس میں الم کتنا ہوگا پیکر کتنا اور اس کی تراش خراش کتنی۔ مضمون کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے۔

"اس میں محسوسات، تجربے اور الفاظ میں جذبات کو متشکل کر دینے کی طاقت اور صلاحیت اگر شاعر میں نہ ہو تو یہ شاعرانہ مصوروں جسے انگریزی میں کہا جاتا ہے صحیح طور پر پیش نہیں کی جاسکتی۔"

کچھ دیر اس کی تعریف ہوتی ہے اس کے بعد یہ اعتراف کہ انیس نے اگرچہ اپنے مرثیوں میں چلن کا حصہ کم رکھا ہے مگر غم انگیزی کے لیے جو تصویریں انھوں نے بنائی ہیں ان کا پورا مطالعہ کئے بغیر ان کی نادرہ کاری کو سمجھنا مشکل ہے۔ پورے مطالعہ میں تہذیب اودھ تہذیب غم اور تہذیب فن آجاتے ہیں اور تینوں ایک دوسرے سے مربوط ہیں اسی ارتباط اور انجذاب کو عقیل صاحب نے عالمانہ انداز میں پیش کیا ہے جس سے مضمون میں ایک غیر معمولی جدت و ندرت آگئی ہے۔ فنی گفتگو کرتے ہوئے بھی وہ کہیں بھی تہذیب و معاشرت کا دامن نہیں چھوڑتے یہی ان کا ترقی پسندانہ نقطۂ نظر ہے اور یہی ان کی انیس شناسی اور دو قدم آگے بڑھ کر کائنات شناسی بھی۔ یہ عالمانہ جملے دیکھئے۔

"یہ ایک عجیب بات رہی کہ دنیا کے تمام المیوں میں شدت کو بڑھانے کے لیے شعرا نے کائنات کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیا ہے۔ موسم، رات، دن، صبح شام چاند ستارے سب المیہ کے ایسے یونٹ بن جاتے ہیں جیسے ان کے بغیر ٹریجڈی کی یہ تصویر مکمل ہو ہی نہیں سکتی یہی نہیں بلکہ اکثر تو کائنات کے یہ اجزا کرداروں کا رول بھی ادا کرنے لگتے ہیں اور آمد و رفت اور تغیرات سے کاہنوں اور نجومیوں کا پارٹ پیش کرتے نظر آتے ہیں ہومر کی ایلڈ اور ورجل کی اینڈ سے لے کر فردوسی کے شاہنامے تلسی داس کی رامائن اور بیاس کی مہابھارت سے انیس اور تمام مرثیہ نگاروں کی تخلیقات تک اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔"

اور یہ جملہ بھی۔

"انیس کے ساتھ یہ سماجی ماحول بھی ہے اور اعتقاد کی دنیا بھی اور ساتھ ہی المیہ کی روایتیں بھی۔"

ملاحظہ کیجئے عقیل صاحب نے المیہ پیکر تراشی کو بھی محض لغت یا صنعت کے حوالے سے کم دیکھا بلکہ آفاقی کائناتی غم کے توسط سے پیکر تراشی کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ مثالیں دے کر اپنی گفتگو پختہ کرتے ہوئے مضمون کو ان جملوں پر ختم کرتے ہیں:

"ایسی مکمل تصویریں اردو کی المیہ شاعری میں میر انیس کے علاوہ کسی اور کے یہاں مشکل سے ملیں گی جو مرثیے کے المیہ میں ایک ڈائمنشن پیدا کرتی ہیں۔"

عقیل صاحب کو عملی تنقید یا عملی تجزیہ سے بھی گہری دلچسپی ہے عام طور پر ایسے تنقیدی و تجزیاتی عمل کا تعلق غزل نظم سے زیادہ ہوتا ہے لیکن عقیل صاحب پورے ایک مرثیہ کا تجزیہ کر جاتے ہیں جو ایک مشکل کام تھا۔ اس نوع کی تنقید میں تجزیاتی و تشریحی عمل ہوتا ہے لیکن عقیل صاحب یہاں بھی توجہ کرتے ہیں اور مرثیہ کے تئیں ان کے سماجی مطالعہ کی وکالت کرتے ہیں۔ یہ خیال ملاحظہ کیجئے۔

"آگے کے چند بند لکھنؤ اور خاص طور پر مسلمان متوسط گھرانوں کے توہمات کو واضح کرتے ہیں۔ بلائیں لینا، عین الکمال سے بچوں کو بچانے کی تمنا کرنا، خاص توہم پرست گھرانوں کا شعار ہے۔ اگرچہ یہ الفاظ انیس نے حضرت زینب کی زبان سے ادا کرائے ہیں لیکن اس میں میر انیس کی مقامی، سماجی نفسیات بول رہی ہے جس میں بزرگوں کی دعا خوروں کے حق میں بھی شامل ہے۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

"کچھ ان کا ذوق، ان کی سماجی روایات، گرد و پیش

کا مطالعہ ان کی مدد کرتا ہے۔ اس کا سہارا لے کر
اس پس منظر کو سجاتے ہیں۔ لباس کشتی میں سجا کر لانا
وہ روایت تھی جو انھوں نے لکھنؤ کے شاہی گھرانوں
میں دیکھی یا سنی ہوگی۔ شرفا کی محفلوں میں بھی جب کسی
لباس کو پیش کیا جاتا مہذب اور معقول طریقے سے
آج بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر یہ رسم رائج ہے۔"

یوں تو یہ تجزیہ بھی پیکر تراشی کے مباحث پر مشتمل ہے لیکن اس تراش خراش میں کس طرح مقامی تہذیب معاشرت دبے پاؤں داخل ہو جاتی ہے عقیل صاحب کی اس پر گہری نظر ہے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ عقیل صاحب ایک بڑے ترقی پسند تنقید نگار ہیں ان کا بڑکپن ان کے علم و فکر میں تو ہے ہی لیکن اس سے زیادہ تخلیقی فن پاروں پر اس کا اطلاق اور اس کی تلاش۔ عقیل صاحب کا تنقیدی ذہن اور وژن تاریخ و تہذیب سے ہوتا ہوا تخلیق تک پہنچتا ہے اور تجزیہ و تشریح کرتا ہے۔ مرثیہ میں تاریخ تہذیب اور تقدیس کے معاملات کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ ان کا فکری و فنی نزاکتوں کے ساتھ نئی صورتوں کو تلاش کرنا اور سماج، انسان اور انسانیت سے رشتے استوار کرنا ترقی پسند تنقید کا ناقدانہ و مفکرانہ عمل رہا ہے اور عقیل صاحب کی انیس شناسی اس پر صد فی صد کھری اترتی ہے۔ انیس کے حوالے سے احتشام حسین کے بعد سید محمد عقیل کا نام دوسرا بڑا نام ہے جو اس مکتبہ فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔

تیسرا نام پروفیسر شارب ردولوی کا ہے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے انیس پر خاصا کام کیا ہے ۱۹۵۹ء میں ان کی ایک مکمل کتاب "مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر" شائع ہوئی اس کے بعد ۱۹۸۴ میں ان کی کتاب "تنقیدی مطالعے" شائع ہوئی جس میں انیسیات سے متعلق ان کے تین مضامین شائع ہوئے۔ اس کے بعد ۲۰۰۶ء میں "مرثیہ اور مرثیہ نگار" کے عنوان سے کتاب شائع ہوئی جس میں انیس پر چار مضامین شامل ہیں یہاں ان کی مکمل انیس شناسی کا جائزہ لینا مقصد نہیں بس ان مضامین کا احاطہ و تجزیہ کرنا ہے جس میں ان کے اندر کا ترقی پسند ناقد زیادہ کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ انیس کے سلسلہ میں جو تہذیبی اور سماجی مطالعہ احتشام حسین اور سید محمد عقیل کا ہے اسی ضمن میں ان کا سب سے اہم مضمون انیس کے مرثیوں کا سماجیاتی مطالعہ ہے۔ مضمون کی ابتدا میں لکھتے ہیں۔

"ادبی سماجیات کے مفسرین اس کی بالکل مختلف
توجیہ کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ادبی تخلیق اپنے گرد و
پیش اور سماجی حالات کی پروردہ ہوتی ہے بلکہ اس
کے اظہار کے سانچے بھی مخصوص عہد اور سماجی حالات کے
متعین کردہ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی مخصوص زمانے
اور حالات میں کوئی صنف وجود میں آتی ہے اور ان
حالات کے ختم ہونے کے بعد یا سماجی حالات کے بدل
جانے سے رفتہ رفتہ وہ صنف بھی ختم ہو جاتی ہے...
بہر حال ادب پر سماجی اثرات کی حقیقت سے انکار
کرنا مشکل ہے۔"

اپنے اس خیال کی تائید کے لیے وہ مغربی مفکرین کی مثالیں بھی پیش کرتے ہوئے عہد انیس تک پہنچ کر اس کے سماجی حالات کا سرسری ذکر کرتے ہیں۔ انیسویں صدی کے حادثات، تغیرات، زندگی کا کھوکھلا پن، تشنگی اور غم اور پھر یہ مدلل گفتگو تاریخ اودھ کی روشنی میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس پورے عہد میں مرثیے کے عروج اور مقبولیت کا سبب صرف شیعی حکومت نہیں تھی بلکہ بڑی حد تک وہ سماجی اور سیاسی حالات تھے جن سے اس عہد کا انسان دوچار تھا" اور یہ کارآمد نفسیاتی جملہ بھی۔ چونکہ واقعۂ کربلا زیادہ بڑا اور غم انگیز واقعہ تھا اس لیے اس میں انھیں سکون تھا اور خراب حالات میں جینے اور مصائب برداشت کرنے کی سکت ملتی تھی۔ شارب صاحب نے یہ نکتہ بھی ظاہر کیا کہ چونکہ واقعۂ کربلا بھی ایک مخصوص سیاسی و سماجی پس منظر میں منعقد ہوا تھا اس لیے ان کے انسانی اور سماجی رشتے بھی بنتے تھے اس کے بعد وہ انیس پر آتے ہیں۔ اولاً زبان و بیان پر گفتگو کرتے ہیں جو اس عہد میں رائج تھی۔ یہ گفتگو بھی لسانی کم سماجی زیادہ ہے اور یہ بھی ترقی پسند فکر ہی کی دلالت کرتی ہے اس کے بعد وہ تفصیل میں جاتے ہیں اور اس عہد میں رائج زیلی،

سماجی تہذیبی نظام کے وہ اثرات جو کلام انیس میں جانے انجانے انداز میں مرتسم ہوئے اس کو نزاکت، بلاغت کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور استناد سے کہتے ہیں۔

"واقعہ کربلا کا اصل تہذیبی پس منظر کچھ بھی رہا ہو لیکن میر انیس نے اس سارے واقعہ کو اپنے تہذیبی منظر نامے میں پیش کیا ہے۔ اس کا اصل سبب قوت عصر کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے جس سے کسی عہد کی ادبی تخلیقات الگ نہیں ہو سکتیں۔"

اور یہ حقیقت بھی ہے۔ اس حقیقت کا اطلاق انیس کے مرثیوں میں کس انداز سے ہوتا ہے وہ مثالیں پیش کر کے اپنی گفتگو کو موثر و معتبر بناتے ہیں۔ انداز گفتگو اور نظریہ تنقید و تشریح ترقی پسندانہ ہی ہوتا ہے جس میں عمرانیات کا دخل زیادہ ہے۔ معاملہ تہذیب کا ہو، زبان کا ہو، مسرت و غم کا۔ شارب صاحب ہر قدم پر یہ کہتے نظر آتے ہیں: انیس اپنے مرثیوں میں جس طرح کی گفتگو، محاورے زبان اور تراکیب و الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ ان کے عہد کی اور تہذیب کی شناخت ہے۔ اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مرکزی خیال سے بھٹکتا نہیں ہے اور مضمون میں بار بار کہا جاتا ہے۔ کوئی صنف اپنے عہد کے سماجیاتی اثرات سے قطعی طور پر باہر نہیں رہ سکتی۔ انیس کے مرثیوں میں شادی بیاہ، رخصت، محبت، رنج و غم سبھی شاعری میں آتے ہیں لیکن ان کی خصوصیت و انفرادیت نہیں ہے۔ اس عہد کے سماجی و تہذیبی اثرات سے ان کا غیر شعوری خلاقانہ انعکاس ہی ان کی مرثیہ نگاری کو اعلی شاعری کے مقام پر لا کھڑا کرتا ہے۔ ورنہ صرف رثائیت اور بیانیت سے مرثیہ بڑا نہیں ہوتا۔ دو معنی خیز جملے دیکھئے۔

"جاگیر دارانہ عہد کی ایک خصوصیت مدنیت ہے یعنی شہر زندگی، شرافت اور شائستگی کا محور بن جاتا ہے۔"

"اس لیے ان کی (انیس) شاعری، مدنی زندگی کے آثار و تہذیب سے اپنی غذا حاصل کرتی ہے۔"

اور مضمون ختم ہوتا ہے ان حتمی جملوں پر۔

"انیس کے مرثیوں کا پورا جمالیاتی نظام اس عہد کی ایسی قدروں سے جڑا ہوا ہے جس کی تمام معنوی تہوں سے سماجیاتی مطالعہ کے بغیر لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا اس کے علاوہ اودھ کی سماجی تاجیر اور جاگیر دارانہ تہذیب کی قدریں ان کے متن مضمون میں اس طرح شیر و شکر ہو گئی ہیں کہ وہ واقعہ کا ایک حصہ بن گئی ہیں۔"

سماجیاتی نظام کس طرح جمالیاتی نظام بن جاتا ہے یہ بات ایک سنجیدہ صاحب نظر ترقی پسند نقاد ہی سمجھ سکتا ہے اور سمجھا سکتا ہے اس لیے کہ اسے پتہ ہے کہ جمالیات کی نمود خلاء میں جنم نہیں لیتی وہ انسانی فکر و عمل میں ہی پوشیدہ رہتی ہے کہ انسان کی ہر تعمیری فکر اور معاشرے کو خوبصورت بنانے کا عمل فلسفہ جمال کی اساس ہوتا ہے خواہ وہ الیہ کی رزم ہو یا مرثیہ کی بزم۔ انیس نے رثائیت میں جمال پیدا کیا اور جمال میں غم زندگی کی جمالیات پیدا کی یہ ان کے بڑے تہذیبی تصور اور شاعرانہ تخیل کی دین ہے شارب ردولوی کا ترقی پسند ذہن انیس کی اسی عظمت کو تلاش کر کے اسے پورے جواز اور اعزاز کے ساتھ پیش کیا ہے شارب صاحب کا یہ گراں قدر مضمون انیس شناسی کے اہم در کھول دیتا ہے اور شارب صاحب کی تنقیدی بصیرت کی تصویر پیش کرتا ہے۔

بات جمالیات یا جمالیاتی نظام کی نکل آئی ہے تو ملاحظہ کیجئے شارب صاحب کا ایک اور مضمون جس کا عنوان ہی ہے "مراثی انیس میں جمالیاتی عناصر"، حالانکہ جمالیات کا فلسفہ آسان نہیں اس لیے کہ اس کا تعلق رومان اور وجدان سے زیادہ ہوا کرتا ہے اور عقلی رویے کچھ اور کہتے ہیں اس میں مادیت اور سماجیت بھی آجاتی ہے اس لیے شارب صاحب بھی کہتے ہیں "جمالیاتی مطالعہ کا احاطہ بیحد وسیع ہے" اس قدر وسیع کہ اس میں مرثیہ کی بھی صنف آجاتی ہے۔ اس لیے کہ اس میں روحانی کرب بھی ہے اور تزکیہ نفس بھی۔ جس کی اپنی ایک جمالیات ہوتی ہے جو بظاہر ناقابل یقین ہے اس لیے کہ تسکین قلب کے معاملات بڑے عجیب ہوا کرتے ہیں۔ اس لیے مرثیہ میں جمال کے عناصر عجیب لگ سکتے ہیں

لیکن شارب صاحب کی عمیق نگاہی اور قدر شناسی پہلے تو یہ جملے نکلواتی ہے۔ "کسی بھی خوبصورت اظہار کے پیچھے صرف تصور اور حسیت ہی نہیں ہوتی بلکہ منطقی فکر کی کارفرمائی بھی ہوتی ہے وہ یہ بھی کہتے ہیں۔ شاعری کا میں تشبیہات و استعارات کی تخلیق اور اس کے عمل سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے" اور وہ اس عمل اور اندازے میں مصروف ہو جاتے ہیں پہلی سطح پر زبان کا تجزیہ کرتے ہیں اور عمدہ بات یہ نکلتی ہے کہ "انیس زبان کو صرف ذریعہ اظہار کے طور پر نہیں استعمال کرتے۔ ان کے یہاں زبان ایک جمالیاتی قدر ہے" زبان کی خوبصورتی اور اس کا استعمال اس کی چلن سے تہذیب کا انعکاس یہ سب اپنے آپ میں فنکارانہ عمل تو ہے لیکن یہ عمل جمالیاتی قدر سے کیسے اور کب وابستہ ہوتا ہے یہ اپنے آپ میں ایک نازک امر اور عمل ہے جس پر شارب کم گفتگو کر سکے۔ صرف تہذیب کے اظہار اور وہ بھی زوال پذیر تہذیب احساس و اضطراب کی منزل پر ضرور لے جاتی ہے اور فکر و فن کے اعلیٰ قدر سے جوڑتی ہے تاہم متذکرہ سوال ہنوز قائم رہتا ہے البتہ جہاں وہ انیس کی منظر نگاری اور فطرت نگاری کی گفتگو کرتے ہیں وہاں وہ انیس کی قدرت اظہار اور مرقع کشی کی تعریف کرتے ہوئے مثالوں کے ساتھ وہ جمالیاتی احساس پیدا کرتے ہیں لیکن یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ ان میں سرخی، شفق، نسیم کے جھونکے، گلاب کے کٹورے وغیرہ میں فطرت اور احساس فطرت کے تئیں احساس جمال کا پیدا ہونا فطری تو ہے لیکن وہ انسانی فطرت سے زیادہ بڑے نہیں ہوتے۔ فطرت انسانی اور فطرت آسمانی کے امتزاج سے ہی ایک بڑی جمالیاتی قدر کا تعلق ہوتا ہے جو انیس کے مرثیوں میں جا بجا نظر آتی ہے اور یہیں سے انیس کے مرثیے بڑے ہوئے ہیں ورنہ محض رونے رلانے کے لیے تو مرثیے نہیں کہے گئے پورے مضمون میں زبان و بیان کی آرائش و زیبائش پر زیادہ گفتگو کی گئی ہے۔ ذکر خواہ صحرا کا ہو یا بستی کا۔ شام کا ہو یا صبح کا، لو کے تھپیڑوں کا یا باد نسیم کا۔ بس وہ نازک بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور شارب صاحب نے مضمون کے درمیان آگے کہی۔ بات بظاہر معمولی ہے لیکن بہت اہم اور نازک ایک مثال کے بعد وہ کہتے ہیں۔

"اس بند میں اجاڑ، پہاڑ، دق، فق، قلق اور شق کے قافیے صوتی اعتبار سے ناگوار کیوں نہ محسوس ہوں لیکن میر انیس نے ان آوازوں سے ہیبت اور وسعت کا جو تاثر پیدا کیا ہے اور روزمرہ محاورے سائیں سائیں کرنا، اندھیرے سے دم گھٹنا منہ ڈھانپ کر سلانا، بچوں کا ڈر سینوں سے لپٹ جانا ایسی باتیں ہیں جو ہر انسان کے تجربے کا حصہ ہیں۔ اس لیے انھیں سن کر وہ اسے زیادہ شدت سے محسوس کرتا ہے۔"

انسان کا فطرت سے متاثر ہونا عین فطرت ہے لیکن فطرت کا انسان سے متاثر ہونا جمالیات کے رو سے بڑی بات ہوا کرتی ہے۔ ان صنعتوں سے شعر میں ابعاد پیدا کرنا عمدہ تخلیقی عمل گردانا جاتا ہے لیکن ان صنعتوں میں انسانی جذبات و محسوسات کا جذب پیوست ہوتا اور لسان و لغت سے انسان اور انسانیت کے تخلیق، تجربات و وجدان کا حصہ بنتا ایک بڑے جمالیاتی تصور کا پیمانہ مانا جاتا ہے۔ اس کی طرف بھی مضمون میں اشارے ملتے ہیں

شارب ردولوی کا ایک اور دلچسپ مضمون ہے "انیس کے مرثیوں میں ڈرامائیت"۔ مرثیہ اور ڈراما دو الگ الگ صنفیں ہیں۔ لیکن بڑا شاعر ایک صنف کی متعین حد توڑتا ہے اور دوسری اصناف کو جوڑتا بھی ہے۔ شارب صاحب کہتے ہیں کہ یوں تو فردوسی کا شاہنامہ مثنوی ہے لیکن اسے دنیا کا بڑا ایپک بھی کہا جاتا ہے اسی طرح انیس کے مرثیوں میں ایک المیہ اور ڈراما سبھی کچھ آگئے ہیں۔ چونکہ مرثیہ میں مرثیہ خوانی کا فن بھی شامل تھا اس لیے اس میں پیش کش کی ڈرامائی کیفیت کا شامل ہونا ضروری تھا۔ شارب صاحب نے تو اور آگے بڑھ بڑھ کر حرکت، عمل، کشمکش، تکلیف اور خوشی سبھی کو شامل کرلیا۔ بار بار اس طرح کے جملے نکلتے ہیں۔ "کرداروں کو انیس نے ایک ڈرامے کے زندہ کرداروں کی طرح پیش کیا" سب سے اچھا پہلو مرثیے میں تصادم کا ہوا کرتا ہے۔ اس تصادم کی بنیاد میں نظریات تو ہوتے ہی ہیں لیکن عملی تصادم

اقداری تصادم اور جنگی تصادم میں جو نقل و حرکت ہے اس میں شامل ڈرامائی کیفیت، نظریات کو تو تقویت پہنچاتی ہے۔ نیز تخلیق میں بھی ایک تجسس، تلطف پیدا کرتی ہیں جس سے مرثیہ میں پھیلاؤ تو آتا ہے گھاؤ اور پھنساؤ بھی آتا ہے اور مرثیہ کی محدودیت و مشروطیت ٹوٹتی ہے پھیلتی ہے اور اپنے دامن میں نہ صرف دیگر اصناف بلکہ حیات و کائنات کے رزم اور بزم دونوں کو سمیٹ لیتی ہے جس میں حق صداقت اور انسانیت ہے۔ مرثیہ میں ڈرامائی انداز میں جب ان عناصر کا تصادم ہوتا ہے تو بقول شارب ردولوی۔

"مرثیے میں تصادم کی مثالیں دو طرح کی ملتی ہیں ایک نظریاتی تصادم جو نظریات اور مقاصد کے فرق سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا حق اور انصاف، صداقت اور نیکی اور دینداری کے لیے جان نثار کر رہا ہے۔"

مرثیہ میں ڈرامائیت کی تلاش بھی ترقی پسند نقاد کو زندگی کے تضادات و تصادمات سے جوڑتی ہے اور یہی ذہن اور وژن کا فرق ہوا کرتا ہے جو مختلف مکاتب فکر میں دکھائی دیتا ہے ترقی پسند نقاد ادب کی تمام صنعتوں، رویوں اور شکلوں کو زندگی کے رویوں اور شکلوں سے جوڑ کر دیکھتا ہے۔ اس موضوع پر شارب ردولوی نے ایک مکمل کتاب "انیس کے مرثیوں میں ڈرامائی عناصر" لکھی ہے جو اس دلچسپ موضوع کو بڑے کینوس میں دیکھتی ہے جس کے مطالعے اور تجزیے کی الگ سے ضرورت ہے۔

انیس سے متعلق شارب صاحب کا ایک اور مضمون ہے جس کا عنوان ہی غور طلب ہے۔

"میر انیس اور اصول نقد" کیا معنی خیز جملوں سے مضمون کی ابتدا ہوتی ہے۔

"دنیا کی تقریباً ہر زبان میں شعراء نے ایسے اشعار اور نظمیں لکھی ہیں جو نہ صرف یہ کہ ان کے تنقیدی شعور کی نشاندہی کرتی ہیں بلکہ آنے والے زمانے میں اسی شعور پر شعر و ادب کی تنقید کی بنیاد رکھی گئی ہے۔"

اس کا زاویہ یہ ہے بقول مہر رشیق۔ جب نظم پوری کر چکو تو اپنے اشعار کی خود تنقید و تصحیح کرو۔ سنجیدہ شعرا کے یہ سلسلے بطور خاص نظر آتے ہیں انیس کے تعلق سے شارب صاحب کہتے ہیں

"انیس اور دوسرے شعراء کے یہاں بھی اشعار میں بعض ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو اس عہد کے تنقیدی شعور اور رجحان کی نشاندہی کرتی ہیں کچھ عملی باتیں ہوتی ہیں۔ کچھ معروضی اور کچھ اہم جملے مثلاً ایک اچھا شاعر اچھا تنقیدی شعور بھی رکھتا ہے۔ کسی شاعر کا تنقیدی شعور جتنا بلند ہوگا اس کی شاعری اتنی ہی اچھی ہوگی۔ اس طرح ایک اچھے شاعر کی تنقیدی بصیرتوں اور ضرورتوں کے ذکر کے بعد وہ انیس کی طرف آتے ہیں اور ابتدا میں ہی کہتے ہیں۔

"میر انیس اردو کے عظیم شاعروں میں ہے۔ انھوں نے اردو کی ایک صنف شاعری مرثیے کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ انیس کے خون جگر سے ادب کی ایسی جامع صنف بن گیا جس نے اردو کو نہ صرف یہ کہ مقامی زبانوں میں ممتاز جگہ دی گئی بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے آنکھیں ملانے کے قابل بنا دیا۔ اگر ایک طرف وہ صف اول کے شاعر ہیں تو دوسری طرف ان کے تنقیدی شعور اور محاسن شاعری کے بارے میں ان کے نظریات نے اردو شاعری عام معیار کو بلند کیا۔"

اگلی سطروں میں ان خیالات کی توسیع ہے اور بیحد عالمانہ و ناقدانہ گفتگو کی گئی ہے۔ انیس کے تعلق سے ایسی گفتگو کم پڑھنے کو ملتی ہے۔ درمیان میں ایک جملہ یہ ملتا ہے۔

"اردو کے کسی شاعر کے کلام نے تنقید میں اتنے اہم اضافے نہیں کئے تھے جتنے کہ انیس کے کلام نے کئے ہیں۔"

اور یہ جملہ کس قدر معنی خیز ہے۔ تنقید کے پیمانے فنکار کی تخلیق ہی سے بنتے ہیں۔ پھر اس کی توجیہہ تفصیل اور تفسیر اور معیار

یہ تنقید۔ انیس نے زبان اور شاعری کو اتنی وسعت دی اور اظہار بیان کے ایسے نئے گوشے تلاش کئے جو دوسری جگہ نہیں ملتے۔ اب ایک ترقی پسند نقاد کے یہ جملے بھی دیکھئے۔

جس طرح اس میں انسانی نفسیات، رزم اور بزم، ڈرامائی عناصر، جذبات نگاری کی جزئیات، کردار نگاری، مناظر قدرت، اخلاقی تعلیم، تہذیبی و سماجی اقدار سمٹ آئی تھیں ان سے پہلے اردو شاعری میں یہ چیزیں یکجا نہیں ہوئی تھیں۔"

اور مضمون ختم ہوتا ہے ان جملوں پر۔

"انیس نے اپنے کلام کے ذریعہ تنقید کو نئے پیمانے اور اصول دیے۔ آج اردو کے شعری ادب کے مطالعہ کے سلسلے میں جو اصول ناقدین کے سامنے رہتے ہیں ان میں سے بہت سے صرف انیس کے کلام کی دین ہیں۔"

شارب ردولوی نے انیس سے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا ہے جو تفصیلی مطالعہ کا متقاضی ہے۔ یہاں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ شارب صاحب کی تنقید میں ایک توازن ہے۔ ترقی پسند رویہ اور زاویہ بھی لیکن اس میں شدت، جارحیت نہیں۔ شارب صاحب کی یہ بات بیحد اہم ہے کہ انیس سے قبل مرثیہ مذہبی شاعری زیادہ تھی، ثواب کا درجہ رکھتی تھی انیس نے اسے پھیلایا، بلند کیا جس سے مرثیہ کی تنقید میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ان کا یہ جملہ کس قدر معنی خیز ہے تنقید کے پیمانے فنکار کی تخلیق سے ہی بنتے ہیں۔ ترقی پسند نقادوں نے فنی و ہیئتی خوبیوں پر تو گفتگو کی نیز سماجی، اخلاقی اور انسانی اقدار پر گفتگو کر کے مرثیوں کی تنقید کو بلند و بالا کیا۔ مرثیہ کے تعلق سے جہاں ایک طرف ترقی پسند تنقید کے یہ پیمانے ترقی پسند فکر و نظر کی دین ہیں اس سے زیادہ مرثیہ صنف کی وسعت اور انیس کے مرثیوں کی عظمت کی بھی دین ہے۔

اب میں دو تین اور ترقی پسند ناقدین کے دو تین اقتباسات پیش کر کے اپنی گفتگو تمام کروں گا۔

ممتاز ترقی پسند ناقد محمد حسن تو مرثیہ اور مرثیہ خوانی کو ایک عوامی آرٹ مانتے ہیں اور اپنے ایک مضمون "مراثی انیس میں آویزش کی نوعیت" کی ابتدا اسی خیال سے کرتے ہیں اور درمیان میں لکھتے ہیں "انیس نے واقعہ کربلا کو اپنے ملک اور اپنی تہذیب کا رنگ و آہنگ دے دیا" اس کے بعد وہ المیہ کی طرف آتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کہ المیہ ٹکراؤ سے پیدا ہوتا ہے پھر سوال کرتے ہیں کہ۔ انیس کے مرثیوں میں المیہ کرداروں کی کشمکش کی نوعیت کیا ہے پھر ایک جملہ یہ بھی نکلتا ہے۔ ان میں کوئی اندرونی خلش موجود نہیں ہے محمد حسن اسے ایک خارجی اور سماجی ٹکراؤ کہتے ہیں۔ اسی لیے وہ حضرت امام حسین کے کردار کے بارے میں کہتے ہیں "ان کا راستہ صاف اور سیدھا، ان کا عزم ہمالہ کی طرح مضبوط اور ان کی شخصیت مرتب اور مربوط ہے" اس کے بعد وہ انیس اور عہد انیس کے بارے میں کہتے ہیں۔

"یہ استفہامیہ صرف انیس کا ہی نہیں پورے تمدن کا استفہامیہ بن کر ابھرتا ہے۔ انیس پورے واقعہ کو اپنا تہذیبی پیکر بخش دیتے ہیں اور اپنے دور کے استفہامیہ کو مذہبی سانچے میں ڈھال دیتے ہیں"

محمد حسن ایک کھلے اور بڑے ذہن کے نقاد ہیں۔ انھوں نے بڑے فکری و فلسفیانہ انداز میں تخیل کو مادہ سے جوڑا اور عقیدہ کو منشور حیات بنا کر پیش کیا اور پھر اس کی دائمی قدر کے حوالے سے کہا۔ کشمکش ازل سے ہے اور جو بھی شاعر فنکارانہ اور مفکرانہ طور پر ان انسانی اقدار کی کشمکش سے ٹکراتا رہا ہے۔ وہ کل بھی زندہ تھا۔ آج بھی زندہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں انیس بھی ہیں۔ ممتاز ترقی پسند دانشور راج بہادر گوڑ نے اپنے مضمون "انیس کی شاعری کا سماجی مقصد" میں باقاعدہ انیس اور ان کے کلام کو ایک بڑے انسانی اور سماجی مقصد سے جوڑ کر دیکھا ایک اقتباس ایک اور ترقی پسند نقاد صدیق الرحمٰن قدوائی کا پیش کرتا ہوں۔

"انیس کے مرثیوں سے پہلے اردو شاعری میں عورت کی اس زندگی کی حقیقی تصویریں نہیں ملتیں جو ایک خاندان

اور سماج میں اس کی اصل حیثیت کا پتہ دیں انیسؔ
کے ہاں عورت عام خاندانی اور سماجی رشتوں اور
ان کی بنا پر وہ جن خوشیوں اور غموں اور آزمائشوں
سے گزرتی ہے اپنی جنس کی بنا پر خاندان اور سماج
میں اس کا جو رول رہا ہے اسے انیسؔ اور صرف انیسؔ
نے اردو شاعری میں ایسی تفصیل اور ہنرمندی کے
ساتھ افشا کیا۔"

مثالیں اور بھی ہیں لیکن میں نے یہاں ترقی پسند نقادوں کے چند منتخب مضامین کے ذریعہ کچھ معروضات رکھی ہیں ہر چند کہ کئی اعتبار سے یہ مطالعہ نامکمل اور سرسری ہے تاہم جو دو ایک بنیادی باتیں میں کہنا چاہتا ہوں اور جو ان تمام مضامین میں مشترک طور پر ابھر کر آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ ان تمام ترقی پسند نقادوں نے کلام انیسؔ کو مذہب یا مذہبی عقیدت سے آگے جا کر شاعری اور فن شاعری کے حوالے سے تو دیکھا ہی اس میں انسانیت سماجیت مزاحمت اور کہیں کہیں بغاوت کے عناصر تلاش کئے۔ انھیں امام حسین کے کردار میں ایک حق پرست، شجیع اور باطل شکن انسان بھی نظر آتے ہیں جس نے دشمن کے آگے سر نہیں جھکایا تبھی تو ترقی پسند شاعر جوشؔ ملیح آبادی کے قلم سے ایسے مصرعے نکلتے ہیں۔
شبیر نے حیات کا عنوان بنا دیا ، جس سورما کا اسم گرامی حسین ہے۔
جو تولتا تھا نوک مژہ پر حیات کو۔ اور یہ ٹیپ کے مصرعے۔

جس کی نظر پہ شیوہ حق کا مدار تھا
.جو روح انقلاب کا پروردگار تھا

ترقی پسند شاعروں، نقادوں، دانشوروں نے معرکۂ کربلا، امام حسین کے حوالے سے انیسؔ کی مرثیہ نگاری بلکہ پوری مرثیہ نگاری کو محض رثائیت، جنیت وغیرہ سے نکال کر انسانیت، انقلابیت سے جوڑ دیا۔ ان نقادوں نے انیسؔ کی کردار نگاری، منظر نگاری فطرت نگاری وغیرہ کو انسانی فطرت، سماج کی کیفیت انسانی جذبات کے کیف و کم اور معاشرہ کے پیچھے سے جوڑ کر دیکھا، اس پر منطقی استدلال کے ساتھ عالمانہ گفتگو کر کے اس کے کینوس کو بڑا کیا۔ شاعری کو رومان و وجدان سے نکال کر انسان اور انسانی اعمال و اقدار سے جوڑ کر دیکھا جہاں تاریخ فلسفہ، مذہب، فطرت، انسانیت سب شیر و شکر ہو گئے جس کی وجہ سے انیسؔ کی شاعری لازوال اور بے مثال ہو گئی۔ اور ایک عظیم رزمیہ و المیہ شاعری میں ڈھل گئی۔ اقبال جیسے عظیم شاعر کو یہ کہنا پڑا: "خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔"
حالی کی یہ رباعی بھی ملاحظہ کیجئے۔

اردو! گو راج چار سو تیرا ہے
شہروں میں رواج کو بہ کو تیرا ہے
پر جب تک انیسؔ کا سحر ہے باقی
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

غالباً یہ احساس و اعتبار خود انیسؔ کو بھی تھا۔ تبھی تو پورے اعتبار سے کہا ؎

مری قدر کر اے زمینِ سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

◇◇

رباعیاں

دریا تری رحمت کا اگر سر کھینچے
جنت کبھی مجھ کو کبھی کوثر کھینچے
دھو ڈالیں لکھے کو کاتبانِ اعمال
گر تو قلم عفو خطا پر کھینچے

●

دولت کی ہوس ہے نہ طمع مال کی ہے
خواہش منصب کی ہے نہ اقبال کی ہے
ہے ذات تری جوّاد و غفّار و غنی
امید تجھی سے ترے افضال کی ہے

ڈاکٹر عابد حسین حیدری
پرنسپل ایم جی ایم کالج سنبھل یوپی
9411007150

بالمیکی کی رامائن، تلسی داس اور انیس

اردو ادب کے رنگارنگ اصناف سخن میں مرثیہ کو وہ مرتبہ حاصل ہے جس کے مقابلہ میں سارا ذخیرۂ شعر ہیچ ہے سخت سے سخت اشعار کڑی سے کڑی تنقید کے باوجود فنی کسوٹی پر مرثیہ رزم و بزم، جذبات، واقعات، فطرت نگاری بلند نگاہی، تمثال کاری، جرأت آفرینی دردانگیزی میں مجموعی طور پہ بے عیب ہے۔ قطب شاہ کے مراثی بین مرثیت اور محاکات کے اعلا مرثیہ پر ہوں یا نہ ہوں۔ ولی دکنی، میر تقی میر، سودا، ضمیر، فصیح، دلگیر، خلیق کے بعد انیس اور دبیر تک جو فن ہمارے سامنے آتا ہے اس میں رزمیہ شاعری کے تمام عناصر جمع ہو گئے۔ اگر کوئی شخص اردو کی رزمیہ شاعری اور ادب اردو کی فنی چھان بین کرے تو اسے مشرق میں ایک ایسی روایت ملے گی جس کی نظیر عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی میں ملنا مشکل ہے۔

اسلام ایک زندہ حقیقت ہے اور حسین اس حقیقت کی ابدی حقیقت۔ حسین صرف مسلمانوں کے ہی نہیں ساری کائنات کے انسانیت شناسوں کے پیارے ہیں۔ اس پیار نے واقعہ کربلا کی تبلیغ کی اور اب عالم یہ ہے۔

اک فخر سا محسوس ہمیں ہوتا ہے
جب کوئی یہ کہتا ہے ہمارے ہیں حسین

انیس کی خلاقانہ صفات اور ان کی شعری عظمت کا یوں قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان کی حیات کے مطالعہ سے کہیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ دنیا بھر کے معروف رزمیے سے کسی حد تک واقف تھے مگر اس کے باوجود عالمی ادب کے عظیم رزمیہ نظموں کے خواص ان کی رثائی شاعری میں اجاگر ہوئے ہیں اور جو ادب عالیہ کا حصہ سمجھے جاتے ہیں وہ ان کی شعری بصیرت کی حیرت انگیز مثالیں ہیں۔

دنیا کے ادب میں انتہائی متاثر کن رزمیے نظم کئے گئے ہیں۔ ان رزمیوں کو دوسری اصناف سے اس اعتبار سے بھی جداگانہ حیثیت حاصل ہے کہ یہ کسی ایسی داستان یا تاریخی واقعہ سے اخذ شدہ ہیں جن کی قومی، علاقائی یا آفاقی اہمیت مسلّم ہو۔ اس اعتبار سے یہ تفریحی کہانیوں کے بجائے ایسے فن پاروں کی شکل اختیار کر گئی ہیں جن میں کسی قوم کی فطرت اس کی آئیڈیل میں اور اس کے فلسفۂ حیات کو بیان کرنا مقصود تھا۔ قومی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر مہابھارت اور رامائن کے کرداروں کی تمام تر خصوصیات وہی تھیں جو ہندوستان کی قومی خصوصیات ہیں اور انھیں کرداروں کے ذریعہ ہندوستانیوں کے قومی تفاخر کو اجاگر کیا گیا۔

ہندوستان میں قومی رزمیہ شاعری کی پہلی مثال مہابھارت کی شکل میں ملتی ہے جسے ہندوستانی رزمیوں میں سب سے بڑی رزمیہ نظم قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں مذہبی تحریک

کے ایک نقطۂ نظر کے تناظر کے طور پر اس لیے برتا گیا ہے کہ وہ اس رزمیہ میں ایک اہم موضوع کے طور پر سامنے آتی ہیں۔

مہابھارت کے علاوہ ہندوستان میں بالمیکی کی رامائن کو بھی مقبول شاعری کا درجہ حاصل رہا ہے جسے بعد میں تلسی داس نے اپنے فنکارانہ خوبیوں سے اودھی کے قالب میں ڈھال کر زندۂ جاوید بنادیا تلسی داس کی رامائن کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ عوام میں اس کی جو قدر ہوئی وہ بالمیک کی رامائن کی نہ ہو سکی۔ تلسی داس نے اپنی مانس میں بیرونی خطوط تو والمیکی کے تاریخی واقعات ہی سے بنائے ہیں لیکن انھوں نے نہ توان کے اجزا کو نظر انداز کیا ہے جن پر اضافے کا گمان ہے اور نہ ادھیت رامائن وغیرہ سے اخذ مطالب میں پس و پیش کیا ہے اصل سرچشمہ والمیکی ہی کی تصنیف ہے یہاں یہ بات ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ تلسی داس نے ایک پر خلوص عقیدت شعار، سچے بھگت اور فنکار کی حیثیت سے جس سرچشمہ سے مناسب مواد پایا اسے اپنی تخلیق میں صرف کیا جگہ جگہ عصری مذہبی معتقدات، رسوم دیو مالائی عناصر کو اپنے پیغام کو زیادہ موثر بنانے کے لیے استعمال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تلسی داس کا مانس فن ہی نہیں بھگتی اور پیغام رسانی کا ایک عدیم المثال نمونہ ہے۔ رام چرت مانس کی تخلیق اس عہد میں ہوئی جب عوام و خواص کی زبان پر بھگتی اور پریم کے گیت تھے۔ صوفیائے کرام کے ملفوظات ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول تھے یہ اکبر کا دور تھا اسی کی ایما پر رامائن اور مہابھارت کے فارسی ترجمے بھی ہوئے اسی کے ساتھ ادھیاتم رامائن خطوط پر رام چرت مانس کی تصنیف ہوئی۔ بالمیکی کا مرکزی کردار رام ہیں جو سرتاپا محبت ہیں، رام اونچ نیچ اور ذات پات میں یقین نہیں رکھتے۔ ان کے چرن چھو کے اور ان کے شرن میں آکے سب ہی پاک پوتر ہو جاتے ہیں۔ رام چرت مانس کا مقصد بالاعلان تبلیغ ہے والمیکی کے یہاں بھی تبلیغ ہے لیکن بالواسطہ رامائن میں سات کانڈیا ابواب ہیں یہ رام اور سیتا کی زندگی کے مختلف ادوار پر مبنی ہیں رامائن کے تین مرکزی کردار رام، لکشمن اور سیتا (ستیم شوم سندرم) صداقت، خیر اور حسن کی تجسیم ہے سیتا صداقت کی علامت ہیں، رام شیو کی حیثیت رکھتے ہیں اور لکشمن حسن کا مجسمہ ہیں۔ رام چرت مانس میں تلسی داس کے بالمیکی کے عقیدے کی وضاحت اپنے الفاظ میں درج ذیل انداز میں کی ہے۔

"بھگوان جو واحد ہے، خواہشوں سے آزاد ہے
جس کی کوئی شکل نہیں جس کا کوئی نام نہیں جو
کبھی پیدا نہیں ہوا جو سراسر صداقت ہے
جو بلند و برتر ہے۔ ہر جگہ موجود ہے وہ بھگوان
کبھی کوئی شکل اختیار کر کے زمین پر اترتا ہے
اور زبردست کارنامے انجام دیتا ہے یہ کام
وہ اپنے عقیدت مندوں کی بھلائی کے لیے
کرتا ہے کیونکہ وہ رحم و کرم والا ہے"

(رام چرت مانس۔ تلسی داس۔ ترجمہ نورالحسن نقوی ص ۲۱)

انیسؔ کے رزمیوں کا موضوع واقعات کربلا ہیں جن میں خیر و شر کی تفریق ایک گہری بصیرت کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ یہ ایسے مرقع ہیں جن میں انیسؔ نے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق کربلا کے تاریخی معرکے کے طے شدہ واقعات سے کام لیا ہے۔ ان رزمیوں کے سارے کردار متعین ہیں۔ ان کے عقائد آشکارہ ہیں۔ ان کرداروں کے تصوّرات زندگی بھی سب پر منکشف ہیں یہاں تک کہ ان کرداروں کی جد و جہد کا آغاز اور انجام بھی سب پر کھلا ہوا ہے۔ انیسؔ کے مسلک اور عقیدے نے ان کرداروں کو ان خواص کا مرقع دکھایا ہے جن میں تبدیلی کی گنجائش

نہیں تھی نہ خیر کے بطن سے کوئی شر پیدا کیا جا سکتا تھا۔ نہ شر کے بطن سے خیر۔ اسی لیے یہ رثائی رزمیے کسی مخصوص عہد یا طبقہ کی نمایندگی تک محدود نظر نہیں آتے بلکہ ان کے ذریعہ جن اخلاقی اقدار کی صورت گری کی گئی ہے اس نے ان میں ایک ہمہ گیریت اور آفاقیت پیدا کر دی ہے اور یہ رزمیے عدم تشدد کی بنیاد پر قائم انسانی معاشروں کی برتری کا پیغام بن گئے ہیں۔

راماین کے کردار یقیناً حق و صداقت کے علمبردار اور منکرین خدا دنیاداروں اور ہوس پرستوں کی کھلم کھلا مخالفت کرتے ہیں اور شر اور بدی کی قوتوں پر غالب آجاتے ہیں۔ لیکن واقعہ کربلا میں امام حسینؑ کا قتل ہو جانا شر اور بدی کی قوتوں کا غالب آجانا نہیں تھا بلکہ امام حسینؑ کی شہادت کے بیان میں انیسؔ نے ان کے اس ازلی مقدر کی طرف اشارہ کیا ہے جو ان کے لیے مقصد حیات کے مترادف تھا۔ حسینؑ بچپن ہی سے اس مقصد حیات کے حصول پر گامزن تھے اگر وہ اس مقصد حیات کو نہ پہچان پاتے تو یہی ان کی شکست ہوتی، حسینؑ جس طرح اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوئے اور جس طرح اپنے مقصد کی شاندار تکمیل میں کامیاب ہوئے یہی انسانیت کی جیت تھی جس کے ساتھ کربلا میں ایسے کردار تھے جن کی موجودگی کے بغیر انسان معاشرے کی بقا کا تصور ہی ممکن نہیں ہو سکتا۔ درج میں انیسؔ کے مرثیہ ؏

بخدا فارس میدان تہور تھا حر

کا وہ تاریخی مکالمہ بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے جو جناب حر اور ابن سعد کے حوالے سے انیسؔ نے پیش کیا ہے جس میں انسانیت کی عظمت مضمر ہے۔ یعنی انسانیت کی اعلا صفات جیسے خودداری، پاس و لحاظ صداقت، طرفداری حق، عظمت کردار، احساس ظلم وغیرہ جناب حر کی شکل میں اور ادنیٰ صفات ضمیر فروشی، خود غرضی، خوشامد، چاپلوسی، مکّاری، عیّاری اور ابن الوقتی کا پیکر عمر سعد کی شکل میں سامنے آتا ہے مثلاً۔

حر سے گھبرا کے یہ بولا عمر سعد شریر
یہ تو ہے صاف طرفداری شہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریف امیر
اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدح شبیر
سن چکا ہوں کہ ہے مضطر تو کئی راتوں سے
الفت شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

نہ وہ آنکھیں نہ وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج
سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج
جن کو سمجھا ہے غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

عمر سعد کے جواب میں انیسؔ نے جو حر کی تقریر نظم کی ہے اس میں انسانیت کی اعلا اقدار کی برتری کو اس طرح ثابت کیا ہے جس سے ظلم کی شکست خوردگی اور مظلومیت کی فتح ثابت ہوتے ہوئے انسانیت کے گھنونے کردار سے خود بخود نفرت اور اعلا اقدار سے فطرتاً رغبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

حر پکارا کہ زباں بند کر او ناہنجار
قابل لعن ہے تو اور وہ تیرا سردار
ابن زہرا ہے جگر بند رسول مختار
میرا کیا منہ جو کروں مدح امام ابرار
اک زمانہ صفت آل عبا کرتا ہے
آپ قرآں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے

حر کی اس جوابی تقریر میں انیسؔ نے حر کا جولب و لہجہ اور تیور متعین کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حر انسانیت کی تمام اعلا اقدار پر پوری طرح قائم ہیں۔ آپ بھی وہ تیور

ملاحظہ فرمائیں۔

ہاں سوئے ابن شہنشاہ عرب جاتا ہوں
بے ستمگر جو نہ جاتا تھا تو اب جاتا ہوں

رامائن اور رانیس کے کرداروں کی کئی مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ امام حسین کی طرف سے باوجود اس کے کہ بیعت اٹھا لی گئی تھی بھوک، پیاس کی شدت ہے لیکن حسین کا کوئی جاں نثار حسین کو چھوڑ کر نہیں گیا۔ بالمیکی کے رامائن کا ایک کردار حق و صداقت کا ساتھ دینے کے لیے اپنے بھائی کو چھوڑ کر جاتا ہے لیکن رام چندر جی کی طرف بھوک پیاس نہیں ہے۔ ادھیاتم رامائن میں وبھیشن اور رام چندر جی کی گفتگو کو بہت خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا ہے جس میں بالمیکی نے رام چندر کے کردار کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ہے پر بھو۔ میں آپ کے چرن۔ کمل کی وشدھ بھکتی روپ سیڑھی پا کر گیان یوگ نامک راج بھون کے سکھر پر چڑھنا چاہتا ہوں"

لیکن انیس کا کردار حر اپنی غلطی پر نادم ہے اور سب سے پہلے اپنی جان کو نچھاور کر کے حسین کی کربلا کا حصہ بننا چاہتا ہے۔ مجرم حر حسین کی طرف آتا ہے اور حسین کا کردار انیس کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔

حر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر
دوڑ کر چوم لیے پائے شہ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے با توقیر
میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر
میں رضامند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباس دلاور کے برابر ہے تو

....

لائے اس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امام
بولے عباس کمر کھول اب اے نیک انجام
شہ نے فرمایا مناسب ہے کوئی دم آرام
عرض کی حر نے کمر خلد میں کھولے گا غلام
فاتحہ پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہے
آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہے

بالمیکی کا کردار وبھیشن سیر و سیراب ہے لیکن انیس کا کردار بھوک پیاس سے جاں بلب ہے لیکن قربانی کا جذبہ موسم کی تمازت پر غالب تھا انیس کا وہ منظر نامہ بھی قابل دید ہے۔

وہ لو، وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزہ گیاہ سے
سایہ کنوئیں میں اترا تھا پانی کی چاہ سے

آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خسخانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

انیس نے اپنے رثائی رزمیوں میں رزمیہ کے دیگر عناصر مثلاً جنگ، معرکوں، حریفوں کے مقابلوں، ہتھیاروں کی تفصیلات، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، بہار صبح کے مناظر، موسم کی شدتوں جواں مردوں کے جوش اور ولولے بی بی زینب، بی بی شہر بانو، بی بی سکینہ، بی بی صغریٰ و کبریٰ، علی اکبر و عباس، امام عالی مقام کے جذبات و احساسات کی عکاسی جن کمالات اور قابل رشک شعری خصوصیات کے ساتھ کی ہے۔ اس کا بیان ہمارے ناقدین نے جگہ جگہ پیش کر کے میر انیس کی صناعی کا اعتراف کیا ہے اور

محمد حسین آزاد نے تو ان رتنائی رزمیوں کو عالمی ادب کے
کے لیے اردو شاعری کی دین قرار دیا ہے۔ راقم الحروف
کو اپنی کم علمی کا اعتراف ہے کہ اس موضوع کے ساتھ
انصاف نہیں کرسکا اس لیے حقیقت یہ ہے کہ بالمیکی کی رامائن
کی فضا الگ ہے اور انیس کے مرثیوں کی فضا الگ ہے
لیکن ایک چیز مشترک ہے وہ ہے انسانی اقدار کی پیشکش
میں ہندوستانیت۔ انیس نے واقعہ کربلا کے منظر نامہ
کو ہندوستانی رنگ و آہنگ دے کر اسے آفاقیت
عطا کی اور سچ تو یہ ہے کہ رامائن کے کرداروں کو آئیڈیل
بنانے والا شاعر چکبست بھی انیس کی جادو بیانی کے حصار
سے آگے نہیں نکل سکا جس کا اعتراف رام بابو سکسینہ
نے بھی کیا ہے کہ وہ دو انیس کے کلام کے شیدا تھے چکبست
نے بالمیکی کے اس منظر نامہ کو اردو کا روپ دیا ہے
جب رام چندر جی اپنے والدین سے رخصت ہوتے ہیں

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن سے اشک پوچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال
خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال
سکتہ سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

چکبست کے درج بالا بندوں پر غور کرنے کے بعد
جب انیس کے مشہور مرثیہ۔
جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا
کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انیس کس
پائے کے رزم نگار ہیں۔ رخصت کے منظر نامہ میں انیس
نے جس طرح جذبات کی عکاسی کی ہے وہ انیس ہی کا
حصہ ہے۔

جب نوجواں پسر شہ دیں سے جدا ہوا
روشن قمر سپہر بریں سے جدا ہوا
نور نظر امام مبیں سے جدا ہوا
لخت جگر حسین حزیں سے جدا ہوا
دل داغ ہو گیا دل و جان بتول کا
گھر بے چراغ ہو گیا سبط رسول کا

پیری میں آفت غم اولاد الاماں
دل اور زخم خنجر بیداد الاماں
وہ اضطراب خاطر ناشاد الاماں
وہ اشک و شور اور وہ فریاد الاماں
بیٹا نہ ہو تو زیست کا پھر کیا مزا رہا
جب گھر اجڑ گیا تو زمانے میں کیا رہا

درج بالا مرثیہ کا تجزیہ استاد محترم پروفیسر انیس اشفاق
نے اپنے مضمون "میر انیس اور قصہ گوئی کے فن" میں
تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے
ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ بالمیکی کی رامائن سنسکرت
میں تھی جس کی ادبی حیثیت مسلّم تھی اور یہ زبان پایۂ امتیاز
رکھتی ہے اور ان بولنے اور استعمال کرنے والے بھی
قومی اعتبار سے اہل ثروت سے شمار کئے جانے کا استحقاق
رکھتے ہیں۔

انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری
کے لیے ایسے کردار منتخب کئے کہ اردو زبان پر زوال
آسکتا ہے لیکن انیس کی شاعری پر زوال نہیں آسکتا۔

سیّد اطہر رضا بلگرامی
بی ۳ جوہری فارم، نورنگر ایکسٹینشن، اوکھلا جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
9891425691

مراثیِ انیسؔ میں جنبش، حرکت و سُرعت کے فنّی مظاہرے

جنبش، حرکت و سرعت سے زندگی کا ثبوت ملتا ہے ان میں زندگی کی سطحوں کا عکس جھلکتا ہے۔ زندگی کا پہلا احساس جنبش سے ہوتا ہے جس کا دائرۂ عمل انتہائی لطیف، مختصر اور محدود ہوتا ہے سانس کی محض آمد و شد جسم میں جو ہلکا سا ارتعاش پیدا کرتی ہے جنبش کے دائرے میں زندگی کا احساس کراتی ہے لبوں پر آیا ہلکا سا تبسم نظروں کا جھک جانا یا کسی مرکز پر ٹھہر جانا غیر معمولی طور پہ گہری سانس لینا یہ سب جنبش کے دائرے میں زندگی کا ثبوت ہیں۔ یہاں زندگی اپنا احساس خاموشی سے کراتی ہے جب اس جنبش میں کسی اندرونی یا بیرونی اسباب کے تحت تیز روی آجاتی ہے تو وہ حرکت میں بدل جاتی ہے یہاں اعضاء و جوارح کے عمل زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ قدموں سے چلنا، ہاتھوں کو ہلانا، گردن موڑنا یا جھکانا غصہ میں آنکھوں کا سرخ ہو جانا سب حرکت کے حصار میں زندگی کا ثبوت ہیں اور پھر کہیں اسباب کے تحت اگر اس حرکت میں مزید تیزی آجائے تو وہ سرعت کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے بھاگنا دوڑنا، چلانا، جھپٹنا یا چیخ کر رونا یہ سب سرعت کے حدود میں زندگی کا احساس کراتی ہیں۔

زندگی کے احساس کی یہ تینوں سطحیں انسان کی ذہنی فکر و اس کے جذبات سے جڑی ہیں جن کو اس کی طبیعت و مزاج اور اس کے تہذیبی و معاشرتی اقدار، اعتقادات و معتقدات، رسم و رواج کی پاسداری، اپنی نگہداشت میں کنٹرول کرتی رہتی ہے۔ شخصیتوں کو بنانے اور ان کی شناختوں کو قائم رکھنے میں زندگی کی یہی تینوں سطحیں کلیدی رول ادا کرتی ہیں۔ ایک عظیم شاعر ان کو بطور قوت استعمال کر کے گرد و پیش کا ماحول، فضا اور کرداروں کے حرکات و سکنات کو جیتا جاگتا سانس لیتا سا بنا دیتا ہے۔ انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں ان قوتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے ان کے مرثیوں میں منظر نگاری، مکالمہ نگاری، جذبات نگاری، پیکر تراشی، رزمیہ نگاری، ڈرامائیت اور بین سبھی اجزا جنبش، حرکت اور سرعت کے موزوں ترین استعمال سے زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں۔ زندگی کے اتنے قریب کہ مرثیہ سننے والا اپنے آپ کو اسی ماحول میں پاتا ہے۔ وہ انیسؔ کے پیش کردہ واقعات کا چشم دید گواہ بن جاتا ہے۔

انیسؔ کے مرثیوں کی یہ قوتیں ان کے موزوں ترین الفاظ و تشبیہات کے انتخاب سے پرورش پاتی ہیں الفاظ انسانی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں اس لیے ان کے انتخاب میں اس کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ جس جذبے کے اظہار کے لیے جو لفظ منتخب کیا جائے وہ اس جذبے کا آئینہ بن جائے انیسؔ کے مرثیوں میں یہ انتخاب حد کمال پر پہنچا نظر آتا ہے الفاظ خواہ وہ مہذب و شائستہ تہذیب سے وابستہ ہوں یا ناخواندہ دیہی تہذیب و معاشرت سے علاقائی ہوں یا مقامی بولیوں کے، اگر مطلوبہ

جذبے، کیفیت وارد گرد کے ماحول کی صحیح عکاسی کر رہے ہیں تو انیس کے یہاں قابل احترام ہیں۔ الفاظ و تشبیہات کے انتخاب میں اسی وسیع النظری نے انیس کے مرثیوں میں جنبش، حرکت و سرعت کو متحرک فورس بنائے رکھا ہے اور انھیں متحرک قوتوں کی بدولت ہر مرثیہ جیتے جاگتے سانس لیتے منظر ناموں میں ڈھل جاتا ہے یہاں ان کے چند معروف و مشہور مرثیوں کا جائزہ لے رہا ہوں۔

(۱) انیس کا مشہور مرثیہ "فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے" امام حسین کے مدینے سے سفر کی روداد پیش کرتا ہے۔ یہ رامرثیہ کئی متحرک منظر پیش کر رہا ہے جس میں ہر منظر کا ماحول جدا اور اسی لحاظ سے الفاظ کے انتخاب سے جنبش، حرکت و سرعت کا احساس بھی مختلف ہے جو اس ماحول کی عکاسی کے لیے موزوں ترین ہے اور جس کی بدولت وہ ماحول زندہ سا بن جاتا ہے۔

پہلا منظر امام کو رخصت کرنے کا منظر کو پیش کرتا ہے جہاں اہل مدینہ گروہ در گروہ ایک اضطرابی و بے چینی کی کیفیت میں در دولت پر پہنچ رہے ہیں۔ ہر گھر میں شور و گریہ ہے اور ہر دل میں "و بستی اجڑنے" کا صدمہ ہے۔ انیس نے اس منظر کشی میں جن جذبوں کو ابھارا ہے اس میں اہل مدینہ کی امام حسین اہلبیت سے دیرینہ محبت و احترام ان کے مدینہ چھوڑنے کا فطری صدمہ جو بے چینی و اضطراب کی صورت رونما ہو رہا ہے اور پھر اس صدمے کے اظہار میں عمر، مزاج و مذاق کے فرق کا لحاظ اور ان کے جذبوں کے اظہار میں الفاظ کا انتخاب غور طلب ہے جس نے جنبش، حرکت و سرعت کے احساس کو جگائے رکھا ہے اور پورا منظر جیتا جاگتا سا بنا دیا ہے۔

رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم
ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پُرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم
غل ہے کہ چلا دلبر مخدومۂ عالم

بہ لحاظ عمر اہل مدینہ کے اس گھر سے جذباتی لگاؤ کا مختلف ہونا فطری امر ہے جس کو انیس نے منظر کو متحرک بنانے کے لیے ضروری سمجھا۔ یہاں پر جذبے کے اظہار میں جنبش، حرکت و سرعت کو محسوس کیجئے۔

حیران کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر
گر پڑتا ہے کوئی علی اکبر کے قدم پر

عباس کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ
اب آنکھوں سے چھپ جاتی ہے تصویر ید اللہ

کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسم کے ہوا خواہ
ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا
یہ انس یہ خلق حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ جو عون و محمد کے ہیں ہم سن
کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلے گا تم بن

اگر یہ گفتگو اور جذبوں کا اظہار یک طرفہ ہوتا تو منظر بے جان ہو جاتا، ضروری تھا کہ دوسری طرف سے اظہار خیال کیا جائے تاکہ کرداروں میں حرکت و زندگی کا احساس قائم رہے۔ عون و محمد کو بھی اپنے ساتھیوں کے چھٹنے کا صدمہ اسی قدر ہے لیکن وہ حسین کے گھرانے کے افراد ہیں اس لیے اس مقام پہ انیس نے ان کے جذبات کے اظہار میں اعلیٰ اقدار بشریت کی تبلیغ کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ عوام کے جذبات اور اہل بیت کے جذبات کے فرق کو ہدایت کے نقطۂ نظر سے قائم رکھنا ضروری تھا جس نے دو اقدار زندگی کو متحرک ضرور بنایا لیکن نمایاں فرق کے ساتھ۔

ہم جولیوں سے کہتے تھے وہ دونوں برادر
ہاں بھائیوں تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں تہ کیوں کر
ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حق غلامی سے ادا ہوں
تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

جنبش، حرکت اور سرعت کے اعتبار سے دوسرا منظر زیادہ

متحرک ہے۔ یہ اندرون خانہ کا منظر ہے جہاں پاس پڑوس کی خواتین جمع ہو رہی ہیں اور اہل خانہ سے اپنے قلبی لگاؤ کا اظہار کیسے فطری انداز سے کر رہی ہیں۔ یہاں ان کے تاثرات میں اندیشوں اور راہ کی صعوبتوں کا ذکر ہے۔ نصیحتیں بھی ہیں اور احتیاطیں بھی ہیں اہل خانہ کے ہمراہ ان کے برجستہ مکالمے، قلبی بے چینی بیقراری اور اضطراب کا مظہر ہیں جس میں جنبش، حرکت اور سرعت نے جان سی ڈال دی ہے۔ ہر لفظ کے پیچھے چھپے ہوئے جذبے پر نگاہ رکھئے اور ان کی ادائگی میں حرکت و سرعت کو محسوس کیجئے پہلے گھر کے باہر سفر کے انتظامات کی سرگرمیاں دیکھئے۔

تدبیر سفر میں ہیں ادھر سبط پیمبر
گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباس دلاور
تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبر
تنہ کو جنھیں لے جانا ہے وہ پاتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر در دولت پہ ہیں سب یاور و انصار
کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہے تیار
چلاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبردار
ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لیے فراش کھڑے ہیں

اس گہما گہمی کی فضا کے بعد اندرونی خانہ خواتین کی آمد اور انکے تاثرات مکالمے پر نظر کیجئے۔

عورات محلہ چلی آتی ہیں بہ صد غم
کہتی ہیں یہ دن رحلت زہرا سے نہیں کم
پرسے کی طرح رونے کا غل ہوتا ہے ہر دم
فرش اٹھتا ہے کیا، بچھتی ہے گویا صف ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہے زینب
ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینب

اندیشوں اور راستے کی صعوبتوں کا اظہار یوں کیا جا رہا ہے۔

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیر
سمجھاتی نہیں شاہ کو اے شاہ کی ہمشیر
مسلم کا خط آئے تو کریں کوچ کی تدبیر
اللہ ابھی قبر پیمبر کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

اجڑے کا مدینہ جو یہ گھر ہوئے گا خالی
بربادی یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی
زہرا ہیں نہ حیدر، نہ پیمبر نہ حسن ہیں
اب ان کی جگہ آپ ہیں یا شاہ زمن ہیں

گرمی کے یہ دن اور یہ پہاڑوں کا سفر آہ
ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ
ان کو تو نہ لے جائیں سفر میں شہ ذی جاہ
قطرہ بھی دم تشنہ دہانی نہیں ملتا
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا

ان بے ساختہ اندیشوں کے اظہار کے پیچھے خواتین کے ذہن میں اصل اندیشہ بسا ہوا ہے اور وہ ہے چھ ماہ کے کمسن علی اصغر کا ہمراہ ہونا یہ کیسے ممکن تھا کہ انیس کے ذہن سے خواتین کے ذہنوں میں بسا ہوا یہ اندیشہ محو ہو جاتا ہے۔ اس کا اظہار کر کے گویا کہ اندیشوں کی تکمیل کر دی۔ انیس نے انسانی احساسات کو کتنے پر اثر طور پر مکمل کیا۔

منہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا
آرام سے مادر کی کہاں گود میں سوتا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا
لکھا تھا اسی سن میں مسافر انھیں ہونا
کیا ہوگا جو میداں میں ہوا گرم چلے گی
یہ پھول سے کمہلائیں گے ماں ہاتھ ملے گی

انیسؔ جانتے ہیں کہ سامعین کمسن علی اصغرؑ کے انجام سے واقف ہیں۔ کربلا کی ان صعوبتوں سے بھی واقف ہیں جو چھ ماہ کے علی اصغر کو کربلا میں اٹھانی ہیں۔ اس سیاق و سباق میں اس بند کی اثر انگیزی کا اندازہ لگائیے۔

خواتین کے ان احساسات و جذبات کے سامنے اگر حضرت زینب خاموش رہتی تو مقصد حسینی پر پردہ پڑ جاتا۔ منظر و مکالمے بے جان ہو جاتے لیکن حضرت زینب کے مدلل جوابات نہ صرف منشاء حسینی کی تبلیغ کی بلکہ پورے خاندان کو جاندار و حرکی بنا دیا۔ فرمایا "اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر۔ یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیر"، کبھی فرمایا "اماں کی لحد چھوڑ کے میں یاں سے نہ جاتی۔ فاقے اگر ہوتے تو غم اس کا نہ کھاتی"، "ظاہر میں تو ما بین لحد سوتی ہیں اماں۔ میں خواب میں جب دیکھتی ہوں روتی ہیں اماں"، پھر ماں کی وصیت کا حوالہ دیا "یاد آتی ہے ہر دم مجھے اماں کی وصیت۔ کچھ جان کی تھی فکر نہ ان کو دم رحلت"، "آہستہ یہ فرماتی تھیں با صد غم و حسرت۔ شبیر سدھارے جو سوئے وادیٔ غربت"، "اس دن مری تربت سے بھی منہ موڑیوں زینب۔ اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیوں زینب"

اس مرثیہ کے اس منظر میں ایک انتہائی جذباتی و حساس موڑ آتا ہے جہاں جنبش حرکت و سرعت کی قوتیں سرگرم ہیں امام حسین اپنی بیمار بیٹی کو ساتھ نہیں لے جا رہے ہیں وہ غش میں ہیں اور ان کی بہنیں حضرت کبریٰ اور سکینہ آنکھیں کھولنے کے لیے کہتی ہیں سب کو رخصت کرنے کے لیے کہتی ہیں۔ علی اکبر جیسے بھائی سے مل لینے کا اصرار کرتی ہیں کیونکہ "تم جس کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا۔ پھر گھر میں اگر ڈھونڈو گی اکبر نہ ملے گا"، اور "علی اصغر کو پیار سے کلیجے سے لگا لینے کے لیے کہتی ہیں۔ دوسری طرف ماں کو اپنی بیمار بیٹی سے چھٹنے کا غم شدید ہے "ماں ہوں میں کلیجہ نہیں سینے میں سنبھلتا۔ صاحب مرے دل کو ہے کوئی ہاتھوں سے ملتا"، "اب کس پہ میں اس صاحب آزار کو چھوڑوں۔ اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں"

امام حسین بہ چشم تر سر کو جھکائے قریب پہنچتے ہیں اور فاطمہ صغریٰ کا منہ دیکھ کر فرماتے ہیں "کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے۔ جس صاحب آزار کا یہ حال ہو گھر میں۔ دانستہ میں کیونکر اسے لے جاؤں سفر میں" باپ کی خوشبو پا کر فاطمہ صغریٰ آنکھیں کھول دیتی ہیں اور جو پہلا ردعمل ہوتا ہے خود دیکھیے کتنا برجستہ ہے۔

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس لیے باہر
نہ فرش، نہ ہے مسند فرزند پیمبر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر
اجڑا ہوا لوگوں نظر آتا ہے مجھے گھر
کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبط پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

ماں کا فوری ردعمل دیکھئے۔ "شبیر کا منہ تکنے لگی بانوئے مغموم" چونکہ بات کھل چکی تھی اس لیے امام حسین نے بیٹی سے فرمایا "پردہ رہا اب کیا تمہیں خود ہو گیا معلوم۔ اور "تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغریٰ۔ ہم آج سے آوارہ وطن ہوتے ہیں صغریٰ" اب باپ بیٹی کے درمیان ساتھ نہ لے جانے اور ساتھ چلنے کے جو مدلل مکالمے ہیں اس میں زندگی کی لہریں ملاحظہ کیجئے۔ امام حسین بیٹی سے فرماتے ہیں۔

لو چلتی ہے خاک اڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام
جنگل میں نہ راحت، نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام
دریا کہیں حائل، کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

ایسے مضبوط دلائل کے سامنے بیمار صغریٰ اپنا موقف کیا رکھ سکتی ہیں سوائے اس کے کہ وہ بے بسی و لاچاری کی تصویر نہ بن جائیں لیکن باپ کے جواب میں جو کچھ انھوں نے فرمایا اس میں اپنی بے بسی ولاچاری کو افراد خانہ سے انسیت کے جذبے پر قربان کر دینے کا جنون سا معلوم ہوتا ہے۔

فرمایا:

کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہے سر میں
اف تک نہ کہوں پھڑکے اگر آگ جگر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہوں کی سفر میں
ہو جانا خفا راہ میں گر روئے گی صغریٰ
یاں نیند کب آتی ہے کہ واں سوئے گی صغریٰ

فاطمہ صغریٰ کو ماں باپ کی ذہنی پریشانی کا پورا احساس ہے اس لیے ان کی تسلی کے لیے فرماتی ہیں۔

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہوں مادر
ہر روز میں پی لوں گی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر

پھر جذبۂ خود سپردگی کی انتہا دیکھئے۔

میں نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

جو بیبیاں حاضر تھیں ان کے دلوں پر فاطمہ صغریٰ کے ان بیتابانہ جذبوں کا گہرا اثر ہوا اور ان سب نے رو رو کر گلے لگایا۔ جبریٰ تلقین کی اور فاطمہ صغریٰ ورمنہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بے کس و دلگیر۔ اس موقع پر امام حسین، حضرت بانو کو اشارہ کرتے ہیں کہ علی اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو لاؤ تاکہ رخصت ہوتے وقت فاطمہ صغریٰ ان سے مل سکیں۔ یہاں علی اکبر کے بیاہ سے جڑے ارمانوں کا ذکر ہے جو بہن کا ایک بھائی کے ساتھ فطری جذبہ ہے پھر انتہائی مایوسی کے عالم میں خود کلامی کے انداز میں فرمایا "ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا۔ صحت سے جو ہیں ان میں کہاں میرا ٹھکانا" بھیا! جواب آنا تو مری قبر پہ آنا"

ان گریہ وزاری کی آوازوں سے علی اصغر کا چونکنا فطری تھا۔ ماں نے فرمایا۔" میں صدقے گئی بس نہ کرو گریہ وزاری۔ اصغر مرا روتا ہے صدا سن کے تمہاری" فاطمہ چونکہ بیمار ہیں اور اس وقت جذبات کے گرداب میں ہیں۔ اس لیے کہتی ہیں۔

وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری۔ آ لے تجھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم
تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
تپ ہے تمہیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
بے بس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقت گفتار نہیں ہے

علی اصغر کا فاطمہ زہرا کی طرف جھک جانا اور ہاتھوں کو لٹکا دینا ان کو پھیا نے اور ان سے والہانہ محبت کا ثبوت ہے۔ میر انیس نے فاطمہ صغریٰ کے لیے اس عمل کو کیسا جذباتی بنا دیا۔

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار
صغریٰ کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار
جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار

بس ایک آغاز سفر ہے "عباس نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا۔ چلنے کو ہے اب قافلہ تیار ہمارا" چلتے وقت "لپٹا کے گلے فاطمہ صغریٰ کو پکارا۔ اٹھے شہ دیں گھر تہ و بالا ہوا سارا" بیرون خانہ سفر کی سرگرمیوں میں انتہائی سرعت کا احساس پیدا کیا ہے۔

اس وقت حضرت عباس نے پکار کر فراشوں کو آگاہ کیا۔

پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے
لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے
آتا ہو ادھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقہ پہ بھی کوئی نہ برابر سے گذر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کی نظر جائے

اس اہتمام کے درمیان جب حضرت زینب ناقہ کے قریب پہنچی

خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبط پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھیں گوشۂ چادر
تھے پردۂ محمل کو اٹھائے علی اکبر

فرزند نامکر بستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

غور کیجئے ایک ایک لفظ سے تہذیب و کرداروں کی شناخت کرائی جارہی ہے۔ مرثیہ سننے والوں کے ذہن میں انجام ایسا ہے اس لیے یہ انجام کس قدر رنج و اندوہ اور عبرت پیدا کردے گا اندازہ کیا جاسکتا ہے بس یہ قافلہ قبر پیمبر، قبر فاطمہ و حسن سے رخصت ہوتا ہوا مدینہ کی سرحد کو پہنچا تو:

تھا تا قنے تلک شہر کے اک شور قیامت
سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرت
رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرتے تھے رخصت
پائیں گے کہاں ہم یہ غنیمت ہے زیارت
آخر کو بچھڑ کے کف افسوس ملیں گے
دس بیس قدم اور بھی ہمراہ چلیں گے

انیس نے اس مرثیے میں جنبش، حرکت و سرعت کی قوتوں سے انسانی جذبات و احساسات کی نہ جانے کتنی سطحوں کو روشن کیا ہے اور مرثیہ کی پوری فضا کو انتہائی حساس اور متحرک بنائے رکھا ہے ان کے یہ فنی مظاہرے دیگر مشہور و معروف مرثیوں میں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں صرف مرثیوں کی ساجیات ہی نہیں بلکہ عناصر کائنات کے بیان و رزم گاہ کے منظر ناموں اور بینہ حصوں میں بھی ان قوتوں نے ماحول کو متاثر بنا کر اثر انگیزی کو دوبالا کردیا ہے۔ ان کے مختلف مرثیوں میں ان سب کا جائزہ لے رہا ہوں۔

۲۔ جنبش، جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا احساس زندگی کی پہلی لطیف سطح ہے لیکن لطیف ہوتے ہوئے یہ سطح ذہنی فکر و جذبات سے خالی نہیں ہوتی۔ اس میں حرکت و سرعت موقوف سہی گہرائی و گیرائی بہت ہوتی ہے کسی کا سکتہ آہ و بکا سے زیادہ پر اثر ہوتا ہے گفتگو کے دوران کسی کی خاموشی زیادہ باعث توجہ بن جاتی ہے جنبش کا بھی خاموش ارتعاش چاہے نظروں سے ظاہر ہو رہا ہو، چہرے کے بدلتے رنگ سے یا اعضا کی غیر محسوس جنبش سے، شخصیت کی شناخت بن جاتے ہیں۔ انیس نے اپنے تمام مرثیوں میں جنبش کے نہ جانے کتنے زاویوں کو انسانی جذبات کی ترجمانی کے لیے استعمال کیا اور اسی قوت کے ذریعہ مخصوص صورتحال کو زندہ کردیا۔

جنبش کا تعلق صرف انسانی سماج سے ہی نہیں بلکہ حیوانات چرند و پرند و تمام کائناتی عمل سے بھی ہے انسان کا ذہن ان سے پیغامات حاصل کرتا ہے۔ ان کو متاثر کرتا ہے اور خود بھی متاثر ہوتا ہے چرند و پرند کے اعضا کی جنبش کچھ پیغام دیتی ہے۔ ان کی خاموشی سے جو پنج و گردن جھکا لینے میں بھی کوئی پیغام ہوتا ہے یا پروں کی پھڑپھڑاہٹ و گردن کو تیزی سے موڑنے میں جو سراسیمگی کی کیفیت ہوتی ہے اس میں حرکت و سرعت سے جڑے پیغام ہوتے ہیں۔ نسیم صبح کے جھونکے پھولوں کی ڈالیوں کا آہستہ آہستہ جھکنا اور سر جھکا کر اٹھنا سبزے کا لہلہانا، موجوں کا ارتعاش، گرد و غبار کا اٹھنا، تیز ہواؤں کا چلنا آندھی و طوفان کا زور ان تمام ارضی و سماوی تغیرات میں بھی کوئی تاثر کوئی آگاہی پوشیدہ ہوتی ہے جس کو انسانی ذہن محسوس کرتا ہے اور متاثر ہوتا ہے یہ تغیرات انسانی کردار اور شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں انیس نے ان سب کو بطور قوت استعمال کیا اور مرثیوں میں زندگی بھر دی۔

مرثیہ "جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے"، صبح عاشور تا شہادت امام حسینؑ تمام ہنگاموں کا احاطہ کئے ہوئے ہے جس میں خصوصی توجہ شہادت امام حسین پر ہے۔ اس مرثیہ کی ابتدا کائناتی عناصر کے تغیرات سے ہوتی ہے جہاں پہلا منظر نماز فجر ادا کرنے کا ہے انیس نے نماز فجر کے لیے صبح کی پاک و پاکیزہ فضا کو پہلے سانس لیتا سا بنا دیا اور یہ تاثر دیا کہ امام کے ہمراہ پوری کائنات حمد و ثنا میں ڈوبی ہوئی ہو۔

پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
وہ دشت، وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کوکو کا شور، نالۂ حق سرہ کی دھوم
سُبحان ربّنا کی صدا تھی علی العموم
جاری وہ تھے جو ان کی عبادت کے تھے رسوم

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

چھوٹی بھی ہاتھ اٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
اے دانہ کش ضعیفوں کے رزاق ترے نثار
یا حی یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار
تسبیح تھی کہیں، کہیں تہلیل کردار

طائر ہوا میں مست، ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ گل و غنچہ و ثمر
محو ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور

اعجاز تھا کہ دلبر شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

ان بندوں میں جنبش، حرکت و سرعت کے احساس کو جگانے کے لیے الفاظ کے انتخاب پر غور کیجئے "جا بہ جا"، "جھوتکے" "بار بار"، "بھر دیے"، "ہجوم"، "کوکو کا شور"، "گونج"، "تہلیل"، "جھومتے تھے"، "وجد میں"، "محو ثنا"، "منہ نکالے"، وہ الفاظ ہیں جن میں جنبش و حرکت کی مختلف سطحوں کا احساس ہوتا ہے اور انھیں کی بدولت پوری فضا جاگتی سی محسوس ہوتی ہے۔ ایسی پاک و پاکیزہ فضا میں امام نے نماز فجر ادا کی۔ خیموں کے باہر نماز ادا کی جارہی ہے اور اندرون خیمہ

ناموس شاہ روتے تھے خیمہ میں زار زار
چپکی کھڑی تھیں صحن میں بانوئے نامدار
زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھیں بار بار
صدقے نمازیوں کے موذن کے میں نثار

کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
لوگو! اذاں سنو مرے یوسف جمال کی

حضرت شہر بانو کا صحن میں چپ کھڑا ہونا احساس کراتا ہے کہ ان کے دل و دماغ میں کیسے اندیشے پرورش پا رہے ہیں۔ دوسری طرف حضرت زینب کو علی اکبر سے جو والہانہ انسیت ہے اس نے بیقرار ہو کر لوگوں کو آگاہ کیا کہ شاید یہ آواز پھر نہ سنائی دے "لوگو! اذاں سنو مرے یوسف جمال کی"

نماز تمام ہوتے ہی دشمن کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی گویا جنگ کا اعلان کر دیا گیا۔ امام نے بھی اپنے اصحاب کو جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ اب انیس نے مرثیہ میں پر اثر تہذیبی و معاشرتی موڑ دیا ہے۔

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے
پھاڑا فلک پہ اپنا گریباں ہلال نے
ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص و عام
تیار ادھر ہوا علم سید الانام
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام
روتی تھیں تھامے چوب علم خواہر امام

تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیر علم آ کھڑے ہوئے

اس بند میں فوج کی تیاری کے آخری مرحلے کو پر احترام فضا میں بیان کیا گیا ہے جس میں خاموش جنبش کا احساس پوری طرح اجاگر ہے "ادھر/ادھر"، "کھولے سروں"، "گرد تھامے"، "پڑے ہوئے"، "آ کھڑے ہوئے"، ایسے ہی الفاظ ہیں جنھوں نے خاموش حرکت کو جگائے رکھا ہے۔ حضرت زینب کے بچوں کا علم کے پاس "آ کھڑے ہونے" میں ان کے دماغوں میں بسے ارادوں کا احساس ہو جاتا ہے جن کا انکشاف اگلے بندوں میں کیا گیا ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں انیس کی اسی قدرت نے ان کے مرثیوں کو دائمی زندگی عطا کی ہے۔ اس منظر کے بعد دوسرا منظر سامنے آتا ہے وہ اعلیٰ تہذیبی و معاشرتی اقدار میں ڈوبا ہوا ہے جہاں جنبش و حرکت کی قوتوں نے انسانی جذبات کی عکاسی کو متحرک کرداروں میں ڈھال دیا ہے۔ فوجی نشان علم کو سپرد کرنے کا مسئلہ

ہے۔ کس کو علمداری کا عہدہ سپرد کیا جائے؟ علمداری کا حق زینب کے بچوں کے دل و دماغ میں بسا ہے اس لیے تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے۔ زینب کے لال زیر علم آکھڑے ہوئے، جوش تجسس و تنبیہ کا تاثر دیکھئے۔

گہہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثار شہ امم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورہ بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم

کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا
اماں! کسے ملے گا علم نانا جان کا

ماں کے درمیان مکالموں کی برجستگی دیکھئے جہاں ایک طرف بیٹوں میں جوش و ولولہ چھلک رہا ہے تو دوسری طرف حضرت زینب کے دل و دماغ میں بے سہارا ہو جانے کا خوف بسا ہوا ہے جس نے ایک اضطرابی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے۔

زینب نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجیو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو لوگے علم کا زباں سے نام

لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سرکو، ہٹو، بڑھو، نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہ فلک اساس
کھوتے ہو اور مرے آئے ہوئے حواس
بس قابل قبول نہیں ہے یہ التماس

روتے لگو گے تم جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

نرغے میں تین دن سے ہے مشکل کشاہ کا لال
اماں کا باغ ہوتا ہے جنگل میں پائمال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال
میں لٹ رہی ہوں اور تمہیں منصب کا ہے خیال

غم خوار تم مرے ہو نہ عاشق امام کے
معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے

ماں کی تنبیہ اور نصیحت کا بچوں کے دلوں پر گہرا اثر ہوا۔ ماں کو یوں تسلی دی۔

ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام
غصہ کو آپ تھام لیں اے خواہر امام
واللہ کیا مجال جو لیں اب علم کا نام
کھل جائے گا لڑیں گے جو یہ باوفا غلام

فوجیں بھگا کے گنج شہیداں میں سوئیں گے
تب قدر ہوگی آپ کو جب ہم نہ ہوئیں گے

بچوں نے ماں کو خوش و پرسکون تو کر دیا لیکن ماں کی مامتا کو شدید چوٹ پہنچ گئی۔

بس کہہ کے یہ ہٹے جو سعادت نشاں پسر
چھاتی بھر آئی ماں نے کہا تھام کر جگر
دیتے ہو اپنے مرنے کی پیارو مجھے خبر
ٹھہرو ذرا بلائیں تو لے لے یہ نوحہ گر

کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بری لگی
بچو یہ کیا کہا کہ جگر پر چھری لگی

حضرت زینب کے مشورے کے بعد حضرت عباس کو نشان (فوج وعلم) سپرد کرتے وقت بھی حضرت زینب کے دل و دماغ میں بسے اندیشوں کا اظہار ہو رہا ہے۔

ہو جائے کوئی صلح کی صورت تو کل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لے کر نکل چلو

یہ ڈرامائی منظر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک گھر کے دیگر افراد کی شمولیت اور ان کے تاثرات کا ذکر نہ ہوتا۔ یہاں انیس نے سن شعور اور رشتوں کا پاس رکھتے ہوئے جن تاثرات کا ذکر کیا ہے۔ اس نے منظر کو زندہ سا بنا دیا ہے۔ علم ایک رتبہ ہے جو امام حسینؑ نے حضرت عباس کو دیا ہے یہاں زوجۂ عباس کا ردعمل مشرقیت کی تمام اچھوتی نازک خوبیوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔

یہ سن کے آئی زوجۂ عباس نامور
شوہر کی سمت پہلے کنکھیوں سے کی نظر
لیں سبط مصطفیٰ کی بلائیں بہ چشم تر
زینب کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر

فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا
عزت بڑھی کنیز کی رتبہ غلام کا

حضرت سکینہ حضرت عباس سے بہت مانوس تھیں۔ بچی تھیں اس لیے انیس نے ان کے جذبات کے اظہار میں شوخی اور چل بھر کا پورا لحاظ رکھا۔ "ناگاہ آ کے بالی سکینہ نے یہ کہا۔ کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا؟"

عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا
لوگو! مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا

شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی

سین کو متحرک بنائے رکھنے کے لیے فاصلے کا لحاظ رکھنا ضروری تھا۔ ان بندوں میں ایسے الفاظ استعمال کئے ہیں جنھوں نے فاصلوں کا احساس دلا کر سین کو متحرک بنائے رکھا ہے "یہ سن کے آئی"، "زینب کے گرد پھر کے"، "ناگاہ آ کے"، ایسے ہی فقرے ہیں جن سے فاصلے کا احساس ہوتا ہے۔ حضرت عباس کے جواب میں بھی فاصلے کا احساس قائم رکھا ہے۔ عباس مسکرا کے پکارے کہ "آؤ آؤ"

انیس نے اپنے مرثیے کے ہر کردار کی شخصیت کو اس کی مخصوص شناختوں کے ساتھ ابھارا ہے تاکہ وہ سامعین کے سامنے منفرد جیتے ہوئے زندہ محسوس ہوں۔ کربلا میں حضرت عباس کا کردار جتنا بہادر غیظ و غضب میں ڈوبا ہوا ملتا ہے اتنا ہی امام حسینؑ اور حضرت زینب کے سامنے سرتاپا خدمت گزار آقا کا ہے۔ مرثیوں میں متعدد مقامات پر ان دو متضاد صفات کی تصویر کشی ملتی ہے۔ ایک طرف متعارف یوں کرایا جا رہا ہے۔

ملاحظہ فرمائیں۔

ڈورے جو سرخ سرخ ہیں چشم سیاہ میں
پھرتی ہیں خون بھری تیغیں نگاہ میں

یا

بجلی کا رعب سب پہ عیاں ہے خدائی میں
بیٹھا ہے شیر پنجوں کو ٹیکے ترائی میں

تو دوسری طرف جب امام حسینؑ نے ایک موقع پر ان کے غیظ کو روکا تو:

آقا نے دی جو اپنے سر پاک کی قسم
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحب کرم
تر تھی جبیں شکن پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
چپ ہو گئے قریب جو آئے شہ امم

گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
قطرے لہو کے آنکھوں لیکن نکل پڑے

انیس کے مرثیوں میں جنبش، حرکت و سرعت کے فنی مظاہرے جب تہذیبی و معاشرتی دائروں سے نکل کر درندوں، چرندوں پرند اور دیگر کائناتی عناصر کے دائرے میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے اظہار کے لیے الفاظ انھیں کی فطرت و معاشرت میں ضم ہو جاتے ہیں، گویا الفاظ خود ان کی فطرت کی زبان بن جاتے ہیں "بیٹھا ہے شیر پنجوں کو ٹیکے ترائی میں"، یا "پھرتا ہے کیا صفوں میں فرس جھوم جھوم کے"، یا "بجلی جدھر سوار نے پھیری وہ مڑ گیا"، اس کی چند مثالیں ہیں۔

گرمی کی شدت کو انیس نے کن کن پیمانوں سے ناپ کر ابھارا ہے دیکھئے اور ان کی امیجری پر غور کیجئے "وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب۔ کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کو مثال شب۔ خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب۔" اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا۔ کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا" جھیلوں سے چار پائے نہ اٹھتے تھے تا بہ شام۔ آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام"، "سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے۔۔۔ پانی کنوئیں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے" کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھا نہ برگ و بار۔ ایک ایک نخل جل رہا تھا صورت چنار" ہنستا کوئی

گل نہ مہکتا تھا سبزہ زار۔ کانٹا ہوگئی تھی سوکھ کے ہر شاخ بار دار"
آبِ رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور۔ جنگل میں چھپتے پھرتے
تھے طائر ادھر ادھر" مردم تھے سات پردوں میں اندر عرق سے تر۔
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر" گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے
راہ میں۔ پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں" آہو نہ منہ نکالتے تھے
سبزہ زار سے۔ گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر۔ بھن جاتا تھا جو گرتا
تھا دانہ زمین پر" گرمی کی اس شدت نے انسانوں، چرندو پرند اور
تمام ارضیاتی فضا کو جس طرح متاثر ہوتے دکھلایا ہے وہ دراصل مصائب
حسین کا پس منظر ہے تاکہ اس کی شدت کو محسوس نہ کیا جا سکے۔

(۳) انیسؔ کے مرثیوں کی رزمیہ نگاری میں حرکت و سرعت کے مظاہرے
اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ رزم گاہ میں فوجوں کے درمیان رجز، گھوڑوں
اور سواروں کی چلت پھرت، مختلف اسلحوں کے ٹکرانے کی آوازیں، وار،
حرب و ضرب اور تصادم، حرکت و سرعت کے نمونے پیش کرتے ہیں۔
جن کو انیسؔ نے فنکارانہ طور سے پیش کیا ہے یہاں حرکت و سرعت کی
تصویر کشی کے لیے الفاظ کا انتخاب قابل غور ہے۔ گھوڑوں کی چلت
پھرت کے نمونے دیکھئے جو مختلف مرثیوں سے لیے گئے ہیں۔

آپے سے بد سے جو ہوئے رخش نے بدلے تیور
دونوں آنکھیں ابل آئیں کہ ڈرے باغی شمر
تھوتھنی مل گئی سینے سے کیا دم کو چنور
شکل طاؤسی اڑا گاہ ادھر گاہ ادھر

دم بدم گرد نسیم سحری پھرتی تھی
جھوم کے پھرتا تھا گویا کہ پری پھرتی تھی

چھل بل دکھائی فوج کو دوڑا تھا اڑا
صورت دکھائی جست کی سمٹا، جما، اڑا
دیکھی زمیں کبھی کبھی سوئے سما اڑا
مثل سمند باد تھمہ اتنا اڑا

جن تھا، پری تھا سحر تھا آہو شکار تھا
گویا ہوا کے گھوڑے پہ گھوڑا سوار تھا

سمٹا، جما، اڑا ادھر آیا ادھر گیا
چمکا، پھرا، جمال دکھایا، ٹھہر گیا

تیروں سے اڑ کے برچھیوں میں بے خطر گیا
برہم کیا صفوں کو، پروں سے گزر گیا
گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی فگار تھا
ضربت تھی نال کی کہ سر دہی کا وار تھا

تلوار کی سرعت [1]

چمکی گری، تڑپ کے کلیجے ہلا گئی
جو تھے ہوا پہ، خاک میں ان کو ملا گئی

چمکی، گری، اٹھی ادھر آئی ادھر گئی
خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئیں
کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی
ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اتر گئی

ترکش کٹا کمان کیانی سے رہ گئی
یہ سر گرا، وہ خود گرا یہ زرہ گری

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
پہنچوں سے ہاتھ، شانوں سے بازو، تنوں سے سر
قبضے سے تیغ، بر سے زرہ، ہاتھ سے سپر
برچھی سے پھل، کمان سے زہ، زین سے تبر
ترکش کہیں پڑے تھے، فشان زری کہیں
پیکاں کہیں تھے، مشت کہیں تھی، سری کہیں

کبھی چہرہ کبھی شانہ، کبھی پیکر کاٹا
کبھی در آئی گلے میں، تو کبھی سر کاٹا
کبھی مغفر، کبھی جوشن، کبھی بکتر کاٹا
طول میں راکب و مرکب کو برابر کاٹا

برشِ تیغ کا غل قاف سے تا قاف رہا
بہ گئی خون ہزاروں کا پہ، منہ صاف رہا

بجھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی
چمکی تو اس طرف، ادھر آئی، وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی
اس نے کہا یہاں، وہ پکارا وہاں چلی

منہ کس طرف ہے تیغ زنوں کا خبر نہ تھی
سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

اس آب پر یہ شعلہ فشانی خدا کی شان
پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان
خاموش اور تیز زبانی خدا کی شان
استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان

نہ رکی خود پہ وہ اور نہ سر پر ٹھہری
نہ کسی تیغ پہ دم بھر، نہ سپر پر ٹھہری
نہ جبیں پر نہ گلے پر، نہ جگر پر ٹھہری
کاٹ کر زیں کو، نہ گھوڑے کی کمر پر ٹھہری

جان گھبرا کے تنِ دشمنِ جاں سے نکلی
ہاتھ بھر ڈوب کے تلوار زمیں سے نکلی

(۴) انیس کا مرثیہ ”بہ خدا فارس میدانِ تہور تھا حر“ حق و باطل کے تضادی منظر نامے پیش کرتا ہے جہاں جناب حر کی حق کی طرف پلٹنے کی بے قراری و سرشاری نے منظر ناموں کو متحرک بنائے رکھا ہے پورے مرثیہ میں جناب حر کی بے چینی بے قراری جھلک رہی ہے۔ اول وہ بے چینی و بے قراری ہے جو اس کے فعل بد کے مقابلے حسینؑ کے حسن سلوک نے پیدا کی۔ مرثیہ کے متعدد بندوں میں اس کا اظہار ملتا ہے امام کے قافلے کو روکنے اور لجامِ فرس پر ہاتھ ڈالنے کا احساس جرم اس وقت بیدار ہوا جب امام نے اس کے پیاسے دستے کو سیراب کیا اور پوری ہمراہی اور توجہ سے سیراب کیا تو حر اپنے خیمے میں رات بھر ٹہلتا رہا اور اس کا ضمیر کچوکے لگاتا رہا کہ امام کے لجام فرس پر ہاتھ کیوں ڈالا یہاں احساس جرم کی بے چینیاں جنبش و حرکت کی نہ جانے کتنی تصویریں پیش کرتی ہیں۔

اب ایک دوسرے منظر کی جنبش و حرکت اس وقت سامنے آتی ہے جب امام فوج یزید سے مخاطب ہو کر اپنا تعارف کراتے ہیں اور حر کے عمل اور اپنے حسن سلوک کا حوالہ دیتے ہیں۔ فوج یزید متاثر ہوتی ہے حر اپنے دستے کے ہمراہ لشکر یزید میں امام کا خطاب سن رہا تھا۔ حر نے بالا علان اعتراف کیا۔ بولا ”اشہد باللہ۔ بجا کہتے ہیں شاہ۔ محسن و منعم و آقا ہے۔ یہ ذی جاہ۔ ان کے احسان کا کیوں کوئی منکر ہو جائے۔ سخن حق میں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے۔“ امام کا حسن سلوک وہ دیکھ چکا تھا جہاں بذات خود پیاسے لشکر کو پانی پلا رہے تھے اس لیے فوج یزید کے سامنے اعتراف کیا ”ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں۔ ہیں سخی ابن سخی بات پہ سر دیتے ہیں۔ پیٹ سائل کا یہ فاقوں میں بھی بھر دیتے ہیں۔ یاں تو زر دیتے ہیں، فردوس میں گھر دیتے ہیں۔“

ابن سعد کو یہ خوف ہوا کہ کہیں صورتحال پلٹ نہ جائے اس لیے اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا جس میں دنیاوی جاہ و حشمت اور مادی سرفرازیاں عیاں ہیں۔ یہاں انیسؔ نے خدشہ، لالچ، نفسیات، طنز، دوربینی، سازش و سزا جیسے عوامل سے منظر و مکالموں میں حرکت پیدا کر دی ہے۔

حر سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعد شریر
یہ تو ہے صاف طرف داری شہ کی تقریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر، نہ تعریفِ امیر
اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدحِ شبیر

سن چکا ہوں کہ تو مضطر ہے کئی راتوں سے
الفتِ شاہ ٹپکتی ہے تری باتوں سے

حر کی سوچ فکر اور شخصیت بدل چکی ہے۔ اس کا اندازہ ابن سعد کو ہو گیا۔

نہ وہ آنکھیں نہ وہ چتون، نہ وہ تیور نہ مزاج
سیدھی باتوں میں بگڑتا ہے یہ تیا طور ہے آج
تخت بخشا ہے محمد کے نواسے نے کہ تاج
جن کو سمجھا ہے غنی دل میں، وہ خود ہیں محتاج

کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہے
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہے

جہاں دیدہ ابن سعد حر کے چہرے پہ نظر ڈال کر کہتا ہے۔

ہونٹ بھی خشک ہیں اور چشم بھی تر ہے تیری
جسم خالی ہے ادھر، جان ادھر ہے تیری

اور اپنے شک کا اظہار یوں کر دیا۔

راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہے
تو نے فرزند ید اللہ سے سازش کی ہے

اور اس سازش کی سزا کا اعلان بھی کر دیا۔

خیر مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فطور
لکھیں گے عہدۂ اخبار پہ جو ہیں مامور
حاکم شام ہے جابر وہ سزا دے گا ضرور
گر تجھے دار پہ کھینچے تو کچھ اس سے نہیں دور
سب تری قوم کے سر تن سے جدا ہوئیں گے
زن و فرزند گرفتار بلا ہوئیں گے

حر کا ردِ عمل

حر پکارا کہ زباں بند کر او ناہموار
قابل لعن ہے تو اور وہ تیرا سردار
ابن زہرا ہے جگر بند رسولِ مختار
میرا کیا منہ جو کروں مدح امام ابرار
اک زمانہ صفت آل عبا کرتا ہے
آپ قرآں میں خدا ان کی ثنا کرتا ہے

سزا کا جواب دیتے ہوئے دوسرا منظر ابھرتا ہے۔

دولت حاکم دوں پر تو اد او مدار
دارِ دنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیندار
کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدار
خواب غفلت ہے اسے اور مرے طالع بیدار
کیا مجھے دے گا ترا حاکم ملعون و خسیس
کچھ تردد نہیں کہہ دیں کہ لکھیں پرچہ نویس

اور اس کے ساتھ حتمی اعلان کر دیا۔

ہاں سوئے ابن شہنشاہ حرم جاتا ہوں
لے ستمگر، جو نہ جاتا تھا، تو اب جاتا ہوں

حالانکہ کچھ فوجی دستوں نے حر کا تعاقب کیا لیکن وہ کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند۔ حر کا ہاتھ آنا تو کیسا نہ ملی گرد سمند'' کہتے تھے شرم سے وہ لے کے جو دوڑے تھے کمند۔ یہ چھلاوہ تھا کہ آندھی، یہ فرس تھا کہ پرند۔ ہم یہاں رہ گئے واں حر کی سواری پہنچی۔ امام حسین نے حر کا خیر مقدم یوں کیا ''حر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر۔ دوڑ کے چوم لیے پائے شہ عرش سریر'' وہ شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے با توقیر۔ میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر'' ''ہاتھ میں ہاتھ تھا جان کا اللہ رے کرم۔ داس و چپ قاسم و اکبر تھے زہے شان حشم'' سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرت عباس علم۔ دور سے اہل خطا تیر جو برساتے تھے۔ رفقا سامنے میں ڈھالوں کے لیے آتے تھے۔

اب تیسرا منظر حر کا امام سے جنگ لڑنے کی اجازت لینے اور جنگ کرنے کا ہے۔ اس رزمیہ حصہ میں انیس نے حر کی طرف سے جس سرعت و حرکت کا مظاہرہ پیش کیا ہے۔ ان میں دبے ہوئے ان جذبوں کا اظہار ملتا ہے جو سابقہ تمام واقعات سے حر کے دل و دماغ میں بسے ہوئے تھے۔ امام نے رخصت سے پہلے تین پہر کی تشنہ لبی کا ذکر کیا۔ بچوں کی العطش کی صدائیں بھی کانوں میں گئیں۔ بھوک و قید و بند کی تمام صعوبتوں کا بھی مشاہدہ تھا اور دوسری طرف امام حسینؑ کے لطف و کرم کا ناقابل برداشت احساس۔ ان جذبوں کا احساس ان ان جذبوں کے ساتھ جب وہ فوج مخالف کی طرف چلا تو: وہ جلال اور وہ شوکت و غضب کی چتون ہاتھ میں تیغ، کماں دوش پہ۔ بر میں جوشن۔

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے
دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
برچھیوں اڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے
آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے
خود روی کی جو ضو تا بہ فلک جاتی تھی
چشم خود تید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

جنگ میں حضرت حر کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ "لشکر شام کے بادل میں قمر ڈوب گیا۔ تھا کبھی تیر سا بپھرا ہوا شمشیروں میں۔ کبھی نیزوں کے نیستاں میں کبھی تیروں میں۔ گھسے اس صف میں دو آیا گئے روندی وہ صف۔ گئے دریا کے کنارے گئے صحرا کی طرف۔ گئے نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہ نجف"، اور پھر اسی جنگ کے ہنگام میں۔ باگ گھوڑے کی پھرانا تھا کہ برچھی کھائی۔ آگیا موت کے پنجے میں نہ کچھ دیر لگی۔ فرق پہ گرج لگا، دوش پہ شمشیر لگی۔

امام حسین حضرت عباس اور حضرت علی اکبر حر کی جنگ دیکھ رہے تھے۔ علی اکبر نے فرمایا: "علی اکبر نے یہ حضرت سے کہا چلّا کے۔ گر ہو ارشاد تو مہماں کو سنبھالوں جا کے۔ خادم حضرت زہرا دعلی گرتا ہے۔ خاک پر اب وہ سعید ازلی گرتا ہے۔" حضرت عباس بھی آگے بڑھے لیکن یہ جوش رقت میں کہا شہ نے نہیں اے گلفام۔ اس کے لاشے پہ نہ جائیں یہ مروت سے ہے دور۔ اس سے ہم شاد ہوئے وہ بھی تو ہو کچھ مسرور" اور جب حر گھوڑے سے گرے تو حر نے "زیر سر زانوئے شبیر کا تکیہ دیکھا"، بس یہی وہ مقام ہے جہاں حر کی بے قراری کو قرار آگیا اور اس قرار و سکون کو انیس نے کتنی موثر خاموش جنبش سے واضح کردیا۔

"کچھ اڑھا دیجئے مولا مجھے نیند آتی ہے

انیس کے مرثیوں میں بین کے بند مختصر ضرور ہیں لیکن جو ہیں وہ بہت پر اثر ہیں۔ ان کے بیشتر بند محض آہ و بکا نہیں بلکہ تہذیب و معاشرت میں ڈوبی درسگاہیں جہاں جنبش، حرکت و سرعت کی قوتوں نے حزن و ملال کی کیفیتوں کو انتہائی پر اثر اور گہرا بنا دیا ہے مختلف مرثیوں سے چند مصرعے اور بند دیکھئے۔" عون و محمد کی لاشوں کو دیکھ کر حضرت زینب کی ماتا میں ڈوبی ہوئی اضطرابیت دیکھئے۔ لاشوں کو خیموں میں لاتے وقت جو وقتی اتھل پتھل اور بین برپا ہو جاتے ہیں انیس نے اس پر بھی نگاہ رکھی ہے تاکہ تاثرات میں حقیقت کا رنگ بھرا جاسکے

کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں

لوگو نہ غل مچاؤ مرے بچے سوتے ہیں

لیکن اس ہیجانی کیفیت میں بھی حضرت زینب کے ہاتھوں تہذیب کا دامن نہیں چھوٹتا بچوں کی لاشوں کو دیکھ کر فرماتی ہیں۔

یہ بے حجابیاں شہ والا کے سامنے

پھیلا کے پاؤں سوتے ہو آقا کے سامنے

حضرت عباس کی شہادت کے بعد علی اکبران کا علم خیمے میں لاتے ہیں، اس موقع پر انیس نے بے خبری، فاصلے اور ناسمجھی کے ذریعہ حرکت و سرعت میں حزن و ملال پیدا کردیا ہے۔

فضہ کھڑی تھیں خیمہ سے باہر جو بے خبر

حضرت کو اس نے دور سے دیکھا برہنہ سر

پردہ الٹ کے خیمہ کا بولی وہ نوحہ گر

سیدانیاں اٹھو، علم آتا ہے خوں میں تر

اکبر علم لیے ہیں علی کا نشاں نہیں

کوتل فرس تو آتا ہے، وہ نوجواں نہیں

ناگاہ سب کو دور سے آیا نظر نشاں

تھا خاک سے بھرا ہوا وہ جلوہ گر نشاں

گویا کہ تھا شبیہ علم سر بسر نشاں

ڈوبا تھا خوں سے پنجۂ پر نور در فشاں

چھپ جاتا تھا پھریرے میں یوں کانپ کانپ کے

روتا ہے جس طرح کوئی منہ ڈھانپ ڈھانپ کے

(اف ہا)

پرچم میں یوں لچکتا تھا پنجہ وہ بار بار

سر پیٹے جس طرح کوئی مظلوم و سوگوار

علی اکبر کی شہادت پر جب امام لاش کو خیمے میں لائے تو یہاں بھی جنبش و حرکت کی زبان تمام حزن و ملال کو سمیٹے ہوئے ہے۔

سر ننگے شہ کے گرد تھیں سیدانیاں تمام

تھے بیچ میں شہید کا لاشہ لیے امام

بانو پکارتی تھیں کہ یا شاہ تشنہ کام

جیتا ہے یا جہاں سے گیا میرا لالہ فام

منہ کا ڈھلا ہے ہونٹوں پہ سوکھی زبان ہے

اے جان فاطمہ مرے بچے میں جان ہے

زینب تڑپ تڑپ کے یہ کہتی تھی بار بار
یہ لاش میری گود میں دیجئے، بہن نثار
طاقت نہیں ہے آپ میں یا شاہ نامدار
صدقے گئی تڑپتا ہے فاقوں سے جسم زار
شہ کہتے تھے یہ کام ہے مجھ خستہ جان کا
تجھ سے بہن اٹھے گا نہ لاشہ جوان کا

اور اب بس قتل حسین کا منظر دیکھئے جہاں جنبش و حرکت کی قوتیں اپنے عروج پر پہنچتی نظر آتی ہیں۔ وہ المیہ کی زبان بن گئی ہیں۔

نکھا تھا تین خیال کا تھا ناوک ستم
منہ کھل گیا، الٹ گئی گردن، رکا جو دم
کھینچی چھری گلے کی طرف سے بہ چشم نم
بھالیں نکالیں پشت کی جانب سے ہو کے خم
ابلا جو خوں، نکلتا ہوا دم ٹھہر گیا
چلو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا

گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہے غضب
نکلی رکاب پائے مطہر سے ہے غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب
غش میں گرے، عمامہ گرا سر سے ہے غضب
قرآن رحل زیں سے سر فرش پر گر پڑا
دیوار کعبہ بیٹھ گئی، عرش گر پڑا

گر کر کبھی اٹھے، کبھی رکھا زمیں پہ سر
اگلا لہو، تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر
کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی، کبھی ادھر
اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے

حضرت زینب کی تڑپ دیکھئے۔

پردہ اٹھا کے بنت علی نکلی ننگے سر
لرزاں قدم خمیدہ کمر، عرق خوں جگر
چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر
اے کربلا بتا ترا مہماں ہے کدھر
اماں قدم اب اٹھتے نہیں تشنہ کام کے
پہنچا دو لاش پر مرے بازو کو تھام کے

اس وقت سب جہاں مری آنکھوں میں ہے سیاہ
لوگو خدا کے واسطے مجھ کو بتا دو راہ
سید کدھر تڑپتا ہے، اماں کدھر ہیں آہ
کس سمت ہے نبی کے نواسے کی قتل گاہ
شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے
یہ کون نام لیتا ہے میرا کراہ کے

بھیا میں اب کہاں سے تمہیں لاؤں کیا کروں
یہ کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں کیا کروں
کس کو دہائی دوں، کسے چلاؤں کیا کروں
بستی پرائی ہے میں کدھر جاؤں کیا کروں
دنیا تمام اجڑ گئی، ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزا خانہ ہو گیا

اختتامیہ

انیس نے مرثیہ کی محدود دنیا کو لامحدود بنادیا۔ مرثیہ جو اپنے مذہبی عقیدے اور تاریخ کے حصار میں محصور ہوتا ہے اس کو انیس نے تہذیب و معاشرت اور اعلیٰ انسانی اقدار کی قوتوں کے ذریعہ کشادہ اور متحرک بنا کر زمان و مکان سے بلند کر دیا۔ اردو ادب کے پاس انیس کا یہی بے بہا سرمایہ اس کو عالمی ادب سے آنکھ ملانے کا اہل بنا دیتا ہے۔

انیس کے تمام مرثیے داستان نہیں متحرک ڈرامے ہیں جہاں زندگی چلتی پھرتی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ انیس نے جنبش، حرکت اور سرعت کی قوتوں سے ان میں زندگی بھری ہے۔ ان قوتوں کے برمحل استعمال پر قدرت وہی رکھ سکتا ہے جو ماہر لسانیات سماجیات اور انسانیت ہو۔ انیس نے اپنے مرثیوں میں عقائد پر حرف آئے بنا ان قوتوں کا ایسا استعمال کیا ہے جس نے مرثیہ جیسی

محدود صنف کو ادبی شاہکار میں ڈھال دیا۔ مذہبی عقائد، سماجی تہذیبی سانچوں میں ہی پرورش پاتے ہیں۔ سانحہ کربلا کے بیان میں انیسؔ نے انھیں عوامل کے حصار میں اس کو وسعت دی ہے۔ اور دائمی زندگی بخشی ہے۔ ان عوامل کی اثر انگیزی کے لیے ضروری تھا کہ ان میں پائی جانے والی جنبش حرکت اور سرعت پر نگاہ رکھی جائے اور ان کو جذبات کے اظہار کی زبان بنا دیا ہے انیسؔ نے اس فن میں کمال حاصل کیا۔ اسی فن کی بدولت آج مراثی انیسؔ محض گریہ وبکا کی رثائی صنف نہیں بلکہ اعلیٰ ادب کی کسوٹی کا ماڈل تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ◇◇

صفحہ ۲۰۸ کا بقیہ

شبلی کی اس تالیف کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن:

"یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا کے نوک قلم سے مرزا دبیر کو جو گھاؤ لگا وہ ہر قسم کی مرہم پٹی سے ابھی تک مندمل نہیں ہو سکا ہے۔ اسی کے ساتھ انیسؔ کو جس طرح سمجھا گئے ہیں اس سے بہتر آج تک کوئی سمجھا نہ سکا ہے۔ اس کتاب کی رو میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ بھلا دی گئیں محض ان کا ذکر مضمون میں سرسری طور پر آجاتا ہے لیکن موازنہ انیسؔ و دبیر کا سدا بہار پھول اردو شعر و ادب کے چمن کے لیے زینت بنا ہوا ہے یہ اردو کی ان چند کتابوں میں سے ہے جس سے اقلیم اردو کے رہنے والوں کا ادبی اور تنقیدی ذوق بنا اور پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں جو ادبی درس دیا گیا ہے وہ اس سے بہتر طریقہ سے اردو زبان و ادب میں نہیں دیا گیا۔" [۹]

حوالہ جات:

۱۔ اردو تنقید کا ارتقا — ڈاکٹر عبادت بریلوی — صفحہ ۸۴

۲۔ مقدمہ شعر و شاعری — الطاف حسین حالی — " ۲۳۰

۳۔ ایضاً — " ۲۳۱

۴۔ شبلی اور تقابلی تنقید — ڈاکٹر رحمت یوسف زئی — بحوالہ اردو ادب شبلی نمبر ۱۹۹۲ — " ۱۰۲

۵۔ شبلی بحیثیت نقاد — ڈاکٹر عبدالمغنی — ایضاً — " ۹۲

۶۔ موازنہ انیس و دبیر — شبلی نعمانی — صفحہ اول تمہید

۷۔ ایضاً — " ۲

۸۔ اردو مرثیہ کا ارتقا — ڈاکٹر مسیح الزماں — ص ۳۰۰، ۳۰۱

۹۔ شبلی پر ایک نظر — سید صباح الدین عبدالرحمٰن — " ۷۱، ۷۲

◇◇

سلام

سدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو
ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

غضب ہے اہل ستم اس میں جائیں دوانہ
جس آستاں پہ ملائک رکھیں جبینوں کو

بجا ہے اس لیے اکبر سے تھا حسین کو عشق
کہ دوست رکھتا ہے اللہ بھی حسینوں کو

لگا وغا میں ٹپکنے لہو جو قبضے سے
چڑھا لیا شہ والا نے آستینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

◇

شمیم فاطمہ
بڑا باغ حسین آباد لکھنؤ
7007875353

میر انیسؔ کا لسانی ادراک

چونکہ میرا عنوان دو لفظوں پر مشتمل ہے لسان اور ادراک اس لیے مناسب ہے کہ پہلے ان دونوں الفاظ کی تفہیم ہو جائے تاکہ آئندہ ہونے والی گفتگو آسانی سے سمجھی جا سکے پہلا لفظ لسان، فارسی قبیلہ سے تعلق رکھتا ہے یہ سب سے پہلا صوتی وسیلہ ہے جس کے ذریعہ انسان اپنے احساسات، جذبات اور تجربات دوسروں تک منتقل کرتا ہے یعنی ہم بالفاظ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آواز جو انسان کی زبان سے نکل کر کسی معنی کی ترسیل کرتی ہو لسان کہی جاتی ہے اس کی تشکیل بھی یکلخت نہیں ہوتی ہے بلکہ تدریجی مراحل سے گزر کر آوازیں لسان کہے جانے کی اہلیت پاتی ہیں۔

نوع انسان جیسے جیسے کثرت پذیر ہوتی گئی زمیں پھر پھیلتی گئی جس طرح انسانوں کی شکل وصورت رنگ و روپ پر جغرافیائی کیفیت کا اثر نمودار ہوا۔ ناک نقشے اور رنگ کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان علاقائی فرق قائم ہوا۔ اسی طرح سے لسانی پیکر پہ بھی صوتی آہنگ اور معنوی پس منظروں کی سطح پر علاقائی فرق ظاہر ہوتا گیا اور لاتعداد لسانی قبائل معرض وجود میں آتے گئے۔

بہت سے لسانی سلسلے اپنے مزاج کی بنیاد پر وقت کے ساتھ ختم ہو گئے اور بہت سے اپنے سیال مزاج کے باعث استمرار زمانہ کے ساتھ ختم ہوتے رہے لسانی قبیلے ختم ہو گئے وہ بھی اپنی یادگار کے طور پر بہت سے معنوی سالمے (جنھیں ہم لفظ کہتے ہیں) چھوڑ گئے اور انھیں سیال مزاج السنہ نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ جو کلی طور پر ان ہی مختلف زبانوں کے ہو کر اب تک رائج ہیں۔ ان معنوی سالموں میں کئی ایسے صوتی آہنگ کے ساتھ اپنے حقیقی معنوں میں برقرار ہیں اور کچھ صوتی آہنگ کے خفیف سے فرق کے ساتھ کچھ سالموں نے نیا معنوی پس منظر اپنا لیا۔ جو سالمے صوتی اور معنوی دونوں پہلوؤں سے جوں کے توں اب بھی رائج ہیں ان کی مثال بھیا نک ہے اور جن کے صوتی آہنگ میں تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ ان کی ایک مثال بے بس ہے۔ اس کا صوتی آہنگ "ڈیبی" "نبیہ" ہے اور معنوی پس منظر بدلنے والے سالموں کی ایک مثال دیو ہے جو جغرافیائی سفر میں اپنے اصلی صوتی آہنگ کے ساتھ مختلف معنوی پس منظروں کے سفر میں رہا یعنی یہ ہندی میں عظیم المرتبت عربی میں عظیم الجثہ اور فارسی میں کے مختلف معنوی پس منظر میں بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح تمام لسانی سلسلوں کے معنوی سالموں میں کہیں بعد کہیں آہنگ کی مطابقت اور مماثلت پائی جاتی ہے اگرچہ معنوی فرق موجود ہو۔

اس سے یہ مفروضہ یقین پاتا ہے کہ بنیادی طور پہ تمام السنہ ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں ہیں جیسے جیسے ذہن انسان بالغ ہوتا گیا نئے نئے لسانی تجربے کرتا گیا اور لسانی قبائل کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان تجربات نے یہ ثابت کر دیا کہ کسی بھی زبان کی بقاء کا سبب اس کی سیال

مزاجی ہے جو زبان باعتبار ضرورت دوسری السنہ کے معنوی سالموں کو جتنی آسانی سے سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے اتنے ہی زیادہ دنوں تک زندہ رہتی ہے اور جو زبان تحجر پسند ہوتی ہے یعنی نئے معنوی سالموں سے دامن کش رہتی ہے وہ ایک معین مدت کے بعد جدید معنوی ترسیل کی ضرورتوں کو پورا نہ کرپانے کی وجہ سے مرجاتی ہے۔ اس نتیجۂ تحقیق کی روشنی میں ہم اردو زبان کو انتہائی سیال مزاج پاتے ہیں کیونکہ یہ زبان عربی فارسی، سنسکرت کے وسیلہ سے زردشتی عربی کے وسیلہ سے عبرانی موجودہ دور کے کاروباری ضرورتوں کے وسیلہ انگریزی اور اس کے علاوہ لاتعداد علاقائی زبانوں کے معنوی سالموں سے مرکب ہے۔ عربی اور فارسی کے صوتی سالمے جنھیں ہم حرف کہتے ہیں اپنے آہنگ کی تاثیر کی بنیاد پر دو خاندانوں میں بٹے ہوتے ہیں۔ شمسی جن کے آہنگ کی تاثیر گرم ہوتی ہے اور قمری جن کے آہنگ کی تاثیر سرد ہے۔ ان صوتی سالموں کی خاندانی پہچان کا اصول یہ ہے کہ جس حرف سے پہلے لکھا جانے والا ال پڑھا جائے وہ قمری اور جس کا نہ پڑھا جائے وہ شمسی ہے۔

مثلاً والشمس ، والقمر

گفتگو کا پہلا دور ختم ہوا۔ اب دوسرے حصہ یعنی ادراک کے پہلو سے گفتگو ہوگی۔ دراک یہ معنوی سالمہ زردشتی قبیل سے متعلق ہے اس کا معنی کسی چیز کا کسی چیز میں پیوست ہوجانا ہے یا کسی مخصوص چیز کا کلی علم لسانی قبیلہ کے تمام صوتی اور معنوی سالموں کے خاندانی اور قبائل کے علاوہ ان کے آہنگ و تاثرات کے علم کے ساتھ ان کا بروقت و برمحل استعمال یہی وہ چیزیں ہیں جسے ہم لسانی ادراک کہتے ہیں۔ اردو زبان چونکہ بے شمار السنہ کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اس کا لسانی ادراک حاصل کرنے کے لیئے۔ ان تمام زبانوں پر کافی دسترس ہونا ضروری ہے جو اس زبان میں شامل ہیں۔ اب کلام انیس کی روشنی میں صوتی، معنوی سالموں کے برتاؤ میں ان کی فنی مہارت کی بنیاد پر ان کے لسانی ادراک کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اردو زبان میں مسلم الفاظ دوسری زبانوں کے تو رائج ہیں ہی ایسے مرکب الفاظ بھی رائج ہیں جو دو دو تین تین ٹکڑوں میں بٹے ہوتے ہیں اور ہر ایک ٹکڑا مختلف قبیل سے متعلق ہے۔ عربی فارسی کے ایسے مرکبات تو لاتعداد ہیں جنھیں ہم شمار ہی نہیں کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندی علاقائی اور عربی فارسی کے ٹکڑے بھی مربوط ہوکر ایک صوتی اور معنوی اکائی بناتے ہیں مثلاً کمبختی کا مارا۔ بیاں کے دھاگے میں مختلف زبانوں کے معنوی اور صوتی سالمات کو اس طرح پرونا کہ کوئی لفظ اپنے ساتھ پروئے جانے والے دوسرے لفظ کے تناظر میں اجنبی نہ محسوس ہو اور بغیر غور و فکر قاری معنوی دھاگے کی مسلسل روانی میں محسوس ہی نہ کرسکے کہ یہ مختلف قبائل کے سالمے ہیں جو ایک شیریں رواں اور خوشگوار لسانی تہذیب کی تشکیل کررہے ہیں یہ میر صاحب کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے لسانی ادراک کی تفہیم کرنے کے لیے ہم مطالعے کی چند اساسات مخصوص کرکے ان میں سے ہر ایک کے تحت الگ الگ غور و فکر کرنے اور ان کے کلام سے اپنے موضوع کے لیے شواہد فراہم کرتے ہیں۔

مختلف السنہ کے معنوی اور صوتی سالموں کا پیوستہ اور برمحل استعمال اس طرح کہ مستعار سالمے ایک دوسرے کے ساتھ یوں مربوط ہوجائیں کہ ان کا ارتباط ایک لسانی اکائی کا احساس دیتا ہے۔ ع

نزدیک تھا کہ چاند کے ندی کے پار ہو
روکے وہی حسین سا جو شہ سوار ہو
دیکھا پچھاڑیں کھاتے ہیں سبطین مصطفٰے
روتے ہیں دہاڑیں مار کے اصحاب باوفا
بستر نگار شوق سے اس ارض پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آب بقایاں کی خاک پر
زلفیں ہوا میں اڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے
اکبر شگفتہ ہوگئے صحرا کو دیکھ کے
عباس جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

پہلے شعر میں چھاند، ندی اور پار جو علاقائی، لسانی معنوی سالمے ہیں انیس نے ان کا پیوند شہسوار جو فارسی لسانی سالمہ ہے کے ساتھ کیا ہے اس طرح اڑی۔ ہاتھوں لٹکے گھوڑے اور ساتھ کو بند اور زلفیں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ اگرچہ جغرافیائی اعتبار اور صوتی اعتبار سے یہ تمام سالمے ایک دوسرے سے بہت دوری پر ہیں لیکن سلک کے معنی میں پرو دیئے جانے کے بعد معنوی تسلسل اور صوتی خوش گواری کا خوبصورت امتزاج بن گئے ہیں اسی طرح انھوں نے عربی کے ثقیل الصوت سالموں کو اردو کی نرم اور رواں صوتی آہنگ میں اس خوبصورتی اور مہارت سے سمو دیا ہے کہ سننے اور پڑھنے میں ذہن اس کی ثقالت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو پاتا۔

مثلاً

حر پکارا بابی انت وامی یا شاہ
قابل عفو نہ تھے بندہ عاصی کے گناہ

مختلف قبائل کے صوتی اور معنوی سالموں کی مدد سے معنی کے اظہار و ادا کے ہنر میں دو پہلوؤں پر پوری طرح گرفت رکھنا کلام کی سلاست و بلاغت کے انتہائی اہم ہے۔ محاوروں اور ضرب الامثال کی مطابقت صوتی آہنگ کے تناسب کا لحاظ رکھتے ہوئے رعایت لفظی کو ملحوظ خاطر رکھنا کہ اگر استعمال کئے ہوئے لفظ کو شعر سے ہٹا کر کوئی دوسرا ہم معنی لفظ وہاں رکھا جائے جو بحر مذکور میں بھی مناسب ہو مگر وہ اس طرح لطف سماعت کا سبب نہ بن سکے جس طرح شاعر کا استعمال کردہ لفظ تھا۔ انیس کے کلام میں ہم یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پاتے ہیں۔ انھوں نے جس قبیلے اور جس صوتی آہنگ کے جس لفظ کو جہاں استعمال کر دیا ہے وہ وہاں ایسا چسپاں اور سامعہ نواز ہے جیسے اسی استعمال کے لیے وضع کیا گیا ہو۔

کسی منظر نامے کی مجموعی کیفیات کو کسی ایک صوتی یا معنوی سالمے کی مدد سے یکسر بدل دینا یہ میری فکر کی دوسری سمت ہے جس کے تحت ہم انیس کے کلام سے چند اشعار اپنے دعوے کی تائید میں پیش کرتے ہیں مثلاً جنسی الفت اور وابستگی کے اظہار کی علامتوں کا بیان عموماً رکاکت اور ابتذال کی آلودگیوں سے پاک نہیں رہتا لیکن انیس کا کمال یہ ہے کہ اس پہلو سے جو منظر پیش کرتے ہیں ان میں الفت و وابستگی کی جمالی کیفیت کے توام وقار اور عظمت کی ایسی جلالتی فضا قائم کر دی ہے کہ ابتذال اور رکاکت کا تصور دور سے چھو کر بھی نہیں گزرا ہے چند مثالیں۔

جناب شہر بانو امام حسین سے وقت رخصت آخر فرماتی ہیں۔

چھبیس برس تک نہ چھٹا آپ کا پہلو
اب ہجر ہے تقدیر میں یا سید خوشخو
شب بھر رہے تکیہ سر اقدس کا جو بازو
ہے ہے اسے اب رسی سے باندھیں گے جفا جو

شوہر اور بیوی کی باہمی وابستگی کو ظاہر کرنے والے ہر وسائل جو منظر نامہ تیار کرتے ہیں وہ طبعی طور پر نچلی سطح کی جذباتیت کو برانگیختہ کرتا ہے۔ اس بند کے تیسرے مصرع میں انیس نے لفظ اقدس کا استعمال کر کے احترام و عقیدت سے مخلوط محبت و الفت کی ایسی فضا قائم کر دی جس میں رکاکت کا شائبہ تک نہیں آسکتا۔ یا امام حسین کی ولادت با سعادت کے بعد رسول مقبول پہلی بار نواسے کو آغوش میں لیتے ہیں۔ پورا منظر نامہ تہنیت اور مبارک بادیوں کا ہے محبت اور محبوب کے وصل کی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔

منہ چاند سا دیکھا جو رسول عربی نے
لپٹا لیا چھاتی سے نواسے کو نبی نے
اس پر مسرت ماحول میں یکایک
دل ہل گیا پڑی جبکہ نظر سینہ و سر پر
چوما جو گلا چل گئی تلوار جگر پر

ایک لفظ "دل ہل گیا" نے منظر کی کیفیت کو یکسر بدل دیا وہی والہانہ اظہار محبت جو باعث مسرت و انبساط بن گیا اور گلا چومنے کے عمل نے چشم تصور کو کند خنجر تک پہنچا دیا۔ ایک اور منظر دیکھئے۔

جناب صغریٰ جو امام کی منجھلی دختر ہیں عالم مرض میں ہیں امام انھیں مدینہ میں چھوڑ کر عازم سفر ہیں رخصت کے وقت صغریٰ کی فطری بیتابی و بیقراری کے اظہار میں ان کے خاندانی وقار قوت، تحمل اور رضائے الٰہی کے حصول کی خواہش ان تمام کیفیات کو سمیٹے ہوئے انیسؔ کے مرثیے کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

جناب صغریٰ سے امام کی آخری رخصت، شہزادی کی بیقراری امام کی تلقین صبر اور اس کے نتیجہ میں انتہائی فرماں برداری کے مظاہرہ کرتے ہوئے صغریٰ کا خاموش ہو جانا مگر اس صبر و خموشی کے علی الرغم فطری بیتابی کا جوش کرنا ان دونوں متضاد کیفیتوں کا ایک بیت میں ادا کر دینا میر صاحب ہی کا حق ہے۔

نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پر آنسو نکل آئے

صرف ایک لفظ اچھا کے صوتی آہنگ کے جبری تاثر نے ایک تنہا رہ جانے والی مریضہ کے سینے سے نکلی ہوئی آہ سرد کو صوتی آہنگ کی مدد سے اور صبر گراں کا بار اٹھا لینے والی ایک نیم جاں ہستی کے تحمل کو جبری تاثر کے ذریعہ سامع اور قاری تک بلا تکلف و تکلیف بعینہ پہنچا دیا۔

جب سالار سپاہ حسین آخری رخصت کے لیے خیمہ میں آتے ہیں تو ان کی زوجہ محترمہ فطری تقاضوں کے تحت تصور فراق سے مضطرب ہو کر شوہر کے پیچھے پیچھے در خیمہ تک آ جاتی ہیں جہاں مولیٰ حسین بھی موجود ہیں اس وقت جناب عباس زوجہ سے جو خطاب کرتے ہیں اس میں تنبیہہ محبت اور دلداری تمام عناصر بیک لفظ جمع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہر ایک شخص کی اپنی زبان اس کی ذاتی زبان ہوتی ہے جو اس کی شخصیت کی مکمل آئینہ داری کرتی ہے۔ دیکھئے حضرت عباس کا کردار اس مکالمہ میں کیسا ابھر کر سامنے آتا ہے۔

آؤ ادب سے دلبر زہرا کے سامنے
روتی ہیں لونڈیاں کہیں آقا کے سامنے

ایک لفظ "کہیں" کا صوتی اور معنوی اعجاز بول اٹھتا ہے۔

صدقے ہوں ابن زہرا پہ مجھ سے کئی غلام
دیکھو نہ روتے دیکھ لیں تم کو کہیں امام

دیکھو اور کہیں کے برمحل استعمال کی ڈرامائی کیفیت آئینہ ہے۔

پوچھیں اگر حضور تمہیں کیسا قبول ہے
صاحب یہ کہیو تم کہ رنڈاپا قبول ہے

صاحب لفظ کی دل گدازی منت و محبت امید و التجا کا جواب نہیں۔ الفاظ کی برجستگی ہی لسانی ادراک کا ثبوت ہوتی ہے۔

انیس نے اپنے لیے جو میدان عمل چنا تھا اس کا تعلق روحانیات تصوف، فلسفے اور تصور سے ہی استوار تھا۔ اس میں مادیت نفسیات کی گنجائش بالکل بھی نہیں تھی۔ یہ وہ میزان تھا جہاں اعتدال کا برقرار رکھنا بہت دشوار امر تھا۔ عقیدت ممدوح کو اور نفرت کو غیر فطری کردار بنا کر پیش کرتی تھی مگر میر انیس نے اپنے ممدوح اور منقوص دونوں ہی کو فطری حدود میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کردار نگاری کے تحت کلام انیس سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جناب زینب و عباس جو باہم سوتیلے بھائی بہن ہیں ان کے درمیان گفتگو کی اعلا تہذیب اور روابط کے بلند معیار کو ظاہر کیا ہے۔

زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھیں بار بار
منصب مبارک اے شہ مرداں کے یادگار
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباس ذی وقار
مجھ کو سمجھتے عون محمد کا جاں نثار
ان کی طرف سے مہتمم بندوبست ہوں
مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیش دست ہوں

عباس علمدار جو جناب زینب کے سوتیلے بھائی تھے مگر آغوش محبت میں بیٹوں کی طرح پلے ہیں ان کو جب جناب زینب نے علمداری کی تہنیت دی ہے ان اشعار میں کیا خوب تصویر کشی کی ہے۔

عون و محمد جو جناب زینب کے فرزند ہیں جن کے نانا اور دادا دونوں رسول خدا کے علمدار تھے علم نہ ملنے پر اظہار اہلبیت وراثت کرتے ہوئے۔

کیا ورثہ دار جعفر طیار ہم نہ تھے
اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

اس پہ جناب زینب دونوں بچوں کی دلدہی کے ساتھ تنبیہہ کرتی ہیں۔

صدقے گئی خلاف ادب کچھ سخن نہ ہو
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

پھر انیس بچوں کو عالم فرماں برداری میں دیکھئے، کہتے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پر گر پڑیں" ان کمسنوں کی شجاعت کے ولولے بھی ملاحظہ ہوں۔

بچے ہیں شیر کے جنھیں بچہ سمجھتی ہیں
کیا آپ ماموں جان کو تنہا سمجھتی ہیں

فراق فرزند میں جگر کباب ماں کے صبر واضطراب کی ملی جلی کیفیت دیکھئے۔

تڑپے گا دل تو لے کے اجازت حضور سے
میں دیکھ لوں گی در پہ کھڑی ہو کے دور سے
زلفوں میں جلوہ گر ہو جو چہرہ جناب کا
ہے نصف شب میں آج ظہور آفتاب کا

دندان امام

میرے حسین نجوم سعادت اثر نہیں
یہ شیر فاطمہ کے ہیں قطرے گہر نہیں

شبیہ علمدار اور حسین

رتبے کو اوج نخل ترقی مراد پر
گویا علی کھڑے ہیں مہیا جہاد پر

منظر نگاری

آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

میر صاحب نے جس طرح معنوی سالموں سے کام لے کر ماحول سازی اور خیال آرائی کی ہے محض صوتی سالموں کا استعمال بھی کیا ہے۔

انگشت رکھ کے دانتوں پہ ماں نے کہا تھا یہ
نیزوں کے سنسنانے کی آواز آتی ہے
ابلا لہو جو زخم سے جی سنسنا گیا
گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر

کیسی دھڑا دھڑی ہے یہ کیوں بین ہوتے ہیں

ایسی لاتعداد مثالیں کلام انیس میں موجود ہیں جن کا احاطہ کر پانا ناممکن ہے۔ ان مثالوں سے انیس کے لسانی ادراک کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ ہر فنکار کے پیش نظر ایک پہلو فنی حسن اظہار کا اور دوسرا مقصدیت و معنویت کا ہوتا ہے۔ مقصدیت و معنویت کے لئے "جان رکسن نے ایک جگہ لکھا ہے۔
"مفید ترین آرٹ وہ ہے جو خدا کی شان و بزرگی ہم پر آشکار کرے"
میر انیس نے خدا ترسی اعلیٰ ہمتی، سخاوت، ہمدردی ایثار وغیرہ کی اہمیت کو واقعات اور کرداروں کے ذریعہ ابھارا ہے۔

کلام انیس فنی معجزات کا ایک بحر زخار ہے جسے چند گہر ہائے آبدار میں نے چننے جانے کی سعادت حاصل کی ہے۔

◇◇

صفحہ ۲۶۵ کا بقیہ

سبزی منڈی لائی گئی۔ غسل وکفن کے بعد اپنے بڑے بھائی میر انیس کے پہلو میں سپرد لحد کئے گئے۔

اس عہد کے کسی شاعر نے کہا۔

واحسرتا شکار اجل شیر ہو گیا
مجلس کی شمع بجھ گئی اندھیر ہو گیا

متذکرہ تذکرہ سراپا سخن میر محسن علی محسن لکھنوی مطبوعہ اودھ اخبار منشی نول کشور پریس میں ۱۲۷۷ھ میں چھپا اور اب ذخیرہ سید علی احمد دانش کے پاس موجود ہے۔ ◇◇

رفعت عزمی
حبیب کدہ ۱۰۵ قضیانہ ردولی فیض آباد۔ ۲۲۴۱۲۰
9451818310

میر انیس

میر ببر علی رضوی انیس ۱۸۰۳ میں اودھ کی دارالسلطنت فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی میں میر خلیق کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر خلیق ہی ان کی شاعری کے استاد تھے۔ انیس کے دادا میر حسن جو اپنی شاہکار مثنوی سحرالبیان کی وجہ سے ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ نے دہلی اجڑنے کے بعد لکھنؤ کو اپنا مسکن بنانے کی غرض سے پہلے وہاں قیام کیا۔ اس دور میں لکھنؤ کی کوئی تہذیبی، ثقافتی اہمیت اور زبان کا کوئی امتیازی وجود نہیں تھا اور نہ ہی وہ جگہ شہر کہلانے کی لائق تھی۔ اس لیے میر حسن نے فیض آباد میں سکونت اختیار کرنا مناسب سمجھا۔

یہی نہیں میر حسن نے لکھنؤ کی ایک ہجو بھی کہہ ڈالی کہ یہ انسانوں کے رہنے کے قابل بستی نہیں ہے۔ ناہموار زمین جنگل اور بیماریوں کو دعوت دیتا یہ خطہ یعنی لکھنؤ کو فنا کا ہم عدد ہے بہت پہلے میں نے ایک مضمون میں پڑھا تھا جس میں لیفٹیننٹ کرنل جیمس ٹاڈ کے حوالے سے اودھ کی دارالسلطنت فیض آباد ہونے کے دوران لکھنؤ کے قیصر باغ کو کچھ سو کچے مکانوں کی بستی اور حسین آباد کو گھنا جنگلی علاقہ بتایا گیا تھا۔ اس طرح یہاں شاعری اور تاریخ ہم زبان ہو جاتی ہیں۔

معلوم ہو کہ اس وقت فیض آباد میں میر انیس کے آبائی مکان میں انیس و چکبست لائبریری قائم ہے۔ عجیب بات ہے کہ صنف مرثیہ کو ادبی زمرے میں شامل کرنے کے لیے ارباب نقد و نظر طویل مدت تک علامہ شبلی نعمانی کی تصنیف موازنۂ انیس و دبیر کا کیوں انتظار کرتے رہے یہ معاملہ بالکل ویسا ہی ہے کہ اندھیرا دور کرنے کے لیے کوئی شمع جلانے کے بجائے سورج نکلنے کی راہ دیکھی جائے۔

اکابرین نے حمد و نعت کو اصل دھارے کی شاعری بنانے سے غالباً اس لیے اجتناب کیا ہوگا کہ انھیں تنقید کے دائرے سے محفوظ رکھا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ انسانی کلام ادب میں شامل ہونے کے بعد تنقید سے کیسے بچ سکتا ہے۔ میرے خیال سے مرثیہ کو بھی اصل دھارے کی شاعری کا جز بنانا دانشمندی نہیں ہے کیونکہ رثائی ادب مذہبی نوعیت کی شاعری ہونے کے باوجود مسلکی حیثیت رکھتی ہے۔

مرثیے کو جب اودھ کا حصّہ بنا کر نصاب میں داخل کیا گیا تو ظاہر ہے اس کی رگ رگ میں دبیر و انیس کی شاعرانہ توانائی رواں دواں تھی۔ علامہ شبلی نعمانی نے ہوشیاری سے انیس کا پلہ بھاری رکھنے کے منصوبہ کے تحت کتاب کا موازنۂ انیس و دبیر رکھا، موازنۂ دبیر و انیس، نہیں حالانکہ مرزا اسلامت علی دبیر کی شہرت پہلے ہی سے عام تھی۔

میر انیس کے فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہونے سے قبل ہی دبیر رثائی ادب کے میدان میں اتر کر اپنے جوہر دکھا رہے

اس کا تذکرہ رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب کے دیباچے میں کیا ہے اور اس میں صرف دبیر کا نام شامل ہے ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک انیس کی شہرت فیض آباد سے لکھنؤ نہ پہنچی ہو۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی تصنیف سے میر انیس کی بالادستی قائم کر دی اور دبیر کے کلام کے محاسن کو اجاگر نہیں کیا۔ البتہ چودھری سید نظر الحسن مہابنی نے المیزان تحریر کر کے دبیر کی شاعری کے ان نکات کو ابھارنے کی کوشش ضرور کی ہے جن کا ذکر علاّمہ نے نہیں کیا تھا اس کے باوجود یہ کتاب موازنہ انیس و دبیر کا جواب نہیں دے سکی ایسا ناقدین کا خیال ہے اور یہ مفروضہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تسلیم کر لیا گیا کہ دبیر کا نام انیس کے بعد لیا جائے۔ حال یہ ہو گیا ہے کہ اب اردو کا معمولی طالب علم ہو یا جید دانشور انیس و دبیر کی ترتیب ہی رائج کئے ہوئے ہے۔

میر انیس جب فیض آباد سے لکھنؤ آئے تو اسے اودھ کی راجدھانی قرار دیا جا چکا تھا کیونکہ نواب آصف الدولہ نے اپنی والدہ بہو بیگم کی دخل اندازی کو گوارہ نہیں کیا اور نواب شجاع الدولہ دنیا سے رخصت ہو کر گلاب باڑی فیض آباد میں آسودۂ خاک ہو چکے تھے۔

میر انیس کا لکھنؤ آنا اہالیان شہر کے لیے ایک ایسا خداداد عطیہ ثابت ہوا کہ لکھنؤ لکھنؤ کہلایا جانے لگا۔ غور طلب ہے کہ لکھنؤ آنے کے وقت انیس کی عمر ۴۰ سال سے تجاوز کر چکی تھی اور وہاں اس وقت دبیر کی شاعری کا طوطی بول رہا تھا بات بالکل واضح ہے کہ میر انیس زبان کا جو سرمایہ اپنے ساتھ فیض آباد سے لائے تھے اسے لکھنؤ کے حوالے کر دیا اور لکھنؤ والوں نے بھی اس کی پذیرائی کی۔ انھوں نے لکھنؤ کو ایک نئی شائستگی اور تہذیب و تمدن سے متعارف کرایا ہے جس کی جڑیں فیض آباد میں تھیں۔ میر انیس نے لکھنؤ سے سیکھنے کے بجائے اسے اپنے گھر کی بولی سے سرفراز کیا جو زبان کہلانے لگی اور جسے اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔

یہاں یہ لکھنا ضروری ہے کہ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش دونوں ہی فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے اور میر انیس کے صاحب کمال ہونے کا اعتراف کرتے ہوئے ان کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر چکے تھے۔

اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ دبستان فیض آباد کا وجود دبستان لکھنؤ سے قبل ظاہر ہو چکا تھا تو کوئی مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ چلبست بھی ادب کو فیض آباد کی دین ہیں اس سلسلہ میں مزید تحقیق و جستجو درکار ہے۔

میں یہاں عمداً انیس و دبیر کے کلام سے مثالیں پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ دونوں شاعروں کو اپنے اسلوب میں ملکہ حاصل تھا مسلکی اعتبار سے ان میں کوئی تضاد نہیں تھا دونوں ہی شبیر کے مداح اور اہلبیت کے قدر دان تھے زبان و بیان پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ ویسے بھی کوئی صاحب بصیرت شہدائے کربلا کی قربانیوں کو نظرانداز کر کے اپنے لیے گناہ کی دولت جمع نہیں کرنا چاہے گا۔

اس وقت میرے سامنے ۷۲ شہدائے کربلا کے ناموں کی فہرست موجود ہے ان میں سے بیشتر ناموں کا تذکرہ اردو مرثیوں میں نہیں کیا جاتا ہے جبکہ ان کی عظمت سے کسی کو انکار نہیں ہے یہ نام کسی بھی لحاظ سے متنازعہ نہیں ہیں۔ یہاں میں ان ناموں کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھ رہا ہوں (حالانکہ ان میں حضرت علی اور حضرات حسنین کی اولاد کے نام سر فہرست ہیں) کہ مرثیہ کو ادب کے دائرے میں لانے کے باوجود اس پہلو کو کیوں نظرانداز کیا گیا ہے اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ میں عربی اور فارسی مراثی سے واقف نہیں ہوں لیکن اردو مرثیوں میں تمام شہدائے کربلا کے ناموں کو شامل نہ کرنا ایک قسم کی عصبیت کی دلیل ہے جس میں مسلکی اختلاف کی بو آتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ نئے

(بقیہ صفحہ ۲۶۱ پر)

پروفیسر سیّد فضل امام رضوی
۲۰۳/۲۵۱ امامیہ مارگ، جعفریہ کالونی، لکھنؤ
9415316152

میر انیسؔ: دہلی اور لکھنؤ کے لسانی امتیازات و اتّصالات

میر انیسؔ نے پوری زندگی فیض آباد اور لکھنؤ میں گزاری لیکن زبان کے مسئلہ میں جداگانہ حیثیت کے حامل تھے ان کے آباء و اجداد نے دہلی سے نقل مکانی کر لی تھی میر حسنؔ دہلوی میر انیسؔ کے دادا تھے۔ ان کے موروثی اثرات زبان پر نمایاں تھے وہ ایک ایسے تنہا شاعر تھے جن پر دہلویت اور لکھنویت دونوں کا اطلاق ہوتا ہے۔ بقول خواجہ الطاف حسین حالیؔ

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ
اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا تھا انیسؔ
دلی جڑ تھی تو لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

میر انیسؔ کے یہاں دہلی اور لکھنؤ کی لسانی ملاپ کی سرحدیں مل جاتی ہیں اور وہ بارہا منبر سے پڑھتے ہوئے اپنے سامعین کو اپنی زبان کی انفرادیت کی طرف بڑے فخر سے متوجہ فرماتے تھے۔

"صاحبو! اربابِ لکھنؤ اس طرح نہیں بولتے یہ میرے گھر کی زبان ہے "وہ جا بجا" کی جگہ "جاگہ" لکھا ہے اور کہا ہے کہ جب کبھی ان کی مجلس میں پہلی صف میں سامعین آکر نشست اختیار کر لیتے تو وہ فراز منبر سے فرماتے کہ صاحبو! جاگہ ادھر ہے۔"

دراصل میر انیسؔ کی زبان دہلی اور لکھنؤ کا حسین امتزاج ہے اور اس امتزاجی کیفیت کو وہ اپنے گھر کی زبان فرماتے ہیں اور بڑی شان اور طمطراق سے بہانگ دہل اس بات کا اعلان و اعتراف کرتے ہیں کہ۔

"حقا کہ یہ خلیق کی ہے سربسر زبان"

اور شیخ امام بخش ناسخؔ جیسے استاد سخن کا یہ اصرار کہ۔ اگر زبان سیکھنا ہے تو خلیق کے گھرانے سے سیکھو۔"

ہاں جب اہل لکھنؤ انیسؔ کی زبان پر اعتراض کرتے تو وہ بغیر ہچک فارسی اساتذہ کے کلام سے سند پیش کرتے چنانچہ ایک شخص نے اعتراض کیا کہ لفظ "کمتی" کا استعمال بجائے "کمی" غیر مانوس ہے میر انیسؔ کا مصرع ہے۔

"کمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عباسؑ"

میر انیسؔ نے اس کے لیے غلام ہمدانی مصحفیؔ کے دیوان پنجم سے مثال دی۔

تو اگر اے چشم تر تھمتی نہیں
یاں بھی خونِ دل کی کچھ کمتی نہیں

یہ لفظ انیسؔ نے حضرت سکینہؑ کی زبان سے کہلایا ہے جن کی عمر صرف ساڑھے تین یا چار سال کی تھی لہٰذا اس سن کے بچے کی زبان سے اس لفظ کا ادا ہونا غیر مانوس نہیں کہلائے گا یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ "کمتی" کا لفظ لکھنؤ اسکول یا دہلی اسکول کا نہیں ہے بلکہ یہ صاف اور خالص پوربی زبان کا یعنی بھوجپوری کا ہے جسے میر انیسؔ نے باکمال فصاحت استعمال کیا ہے۔ یہ بات بھی عرض کر دینی ضروری ہے کہ مغرب و مشرق کے سبھی باکمال شعراء و ادباء کی یہ کاوش رہی ہے کہ وہ اپنی زبان کو معاشرہ و تہذیب حاضر کا ترجمان بنا سکیں۔ ملٹن نے اپنی زبان کو نکھارنے سنوارنے

اور حظری بنانے کے لیے بڑی سعی بلیغ کی لیکن پھر بھی مغربی ادب کے ناقدین کو ملٹن سے یہ شکایت رہی ہے کہ اس کا اسلوب پورے طور پر انگریزی اسلوب نہیں ہے۔

یہ بھی ایک کلیہ ہے کہ خاندان انیس اور خود انیس زبان دہلوی کے پابند تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے کلام پر لکھنوی زبان کا بھی اثر نمایاں ہے اور ایک ایسا بھی دور آتا ہے جب زبان دہلوی اور زبان لکھنوی کے امتزاج سے ایک تیسری زبان جنم لیتی ہے تاریخی حیثیت سے میر انیس کا یہ اصرار کہ یہ لکھنؤ کی زبان نہیں بلکہ میرے گھر زبان ہے یا خدا کی قسم کھا کر یہ کہنا کہ یہ سر بسر خلیق کی زبان ہے یا میر مونس کو متنبہ کرتے ہوئے یہ جملہ فرمانا کہ کیا اب میں اپنے گھر کی زبان بھول گیا ہوں "۔ اس طرح کے اظہار میر انیس کی زبان کی انفرادیت تلاش و تحقیق پر مجبور کر دیتے ہیں اور یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ میر انیس کی زبان دہلی اور لکھنؤ کی زبان سے ضرور کسی نہ کسی حد تک مختلف اور منفرد ہے۔ یہ زبان بقول انیس ان کے گھر کی زبان ہے جس کی پرورش میں ان کا خانوادہ سیکڑوں برس تک بے لوث خدمات انجام دے رہا تھا جس میں انیس کے گھرانے کی ذاتی پسند اور ناپسند کو بھی دخل رہا ہے اور دہلی اور لکھنؤ کی زبانوں کے بہترین و منتخب الفاظ استعمال کیے گئے جس میں اضافہ کا عمل بھی جاری رہا۔ یہ انفرادیت صاحب سحرالبیان اور میر خلیق کے یہاں بھی نمایاں ہے لیکن چونکہ میر انیس نے اپنی طبیعت کا سارا زور مرثیہ پر صرف کیا اور مرثیے کی وسعتوں کے پیش نظر لفظیات کے سرمایے میں مزید اضافہ کی ضرورت بھی تھی۔ اس لیے انیس نے لفظوں کی تعمیر و تشکیل میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا۔ درج ذیل الفاظ دہلی اور لکھنؤ میں نہیں بولے جاتے اور نہیں لکھے جاتے ہیں جسے انیس نے بطور خاص اپنایا ہے یا یوں کہئے کہ ضرورت شعری کے باعث اختراع اور وضع کیا ہے جیسے

ھتوالنسا :- (سیہو تنے کے معنی میں)

ھتوالنس کے تیغ دو سپر اکبر یہ پکارے
کیا بکتے ہوئے بیہودہ سخن منہ پہ ہمارے

- **لمتی**۔ (کمی کے معنی میں)

  لمتی نہیں پانی کی سلامت رہیں عباسؑ

- **سجائی**۔ (سجاوٹ کے معنی میں)

  چہرے کی سجائی سے قبا چست ہے تن کی

- **شمشیر کرنا** (تلوار چلانا، شمشیر زنی)

  میں مرا جاتا ہوں للہ نہ شمشیر کرو
  بخشوانے کی گنہ گار کی تدبیر کرو

- **تربھر**۔ (تتر بتر، پراگندہ، منتشر ہونے کے معنی میں)

  تربھر تمام ہو گئی وہ شام کی سپاہ
  پہنچا کچھار میں پسر ضیغم اللہ

- **کلھم**۔ (کل پورا، مجموعی)

  سب آزمودہ کار و قوی تن جوان ہیں
  اور کلھم ادھر تو بہتر جوان ہیں

- **شمشیر اگلنا**: (تلوار سونتنا

  کس قہر سے دیکھا طرف لشکر بے پیر
  بل آ گیا ابرو پہ اگلنے لگے شمشیر

- **گھمسان کرنا** (گھمسان کے لفظ کو اسم صفت کے بجائے فصل کے طور پر صرف انیس نے ہی استعمال کیا ہے۔

  جس صف میں چمک کر گری گھمسان کرآئی
  جمعیت اعدا کو پریشان کر آئی

اردو اور مراثی کی طویل تاریخ میں اس طرح کے الفاظ کی تشکیل اور ان کا استعمال پہلی مرتبہ نظر آتا ہے جس میں انیس نے شان اجتہادی سے کام لیا ہے۔ اردو زبان کے ذخیرے کو زیادہ سے زیادہ مالا مال کرنے کا فخر بھی انیس کو حاصل ہے۔ انھوں نے اپنے گھر کی زبان میں جب اردو مرثیہ بخشا تو اردو زبان اور بھی عظمتوں کی حامل ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میر انیس نے زبان کی حد بندیوں کے دبستانی اصول اور ناسخ اور رشک کی پابندیوں کے برخلاف توسیع زبان کے لیے تراکیب و الفاظ کا ذخیرہ اور راسب کو معتدل

لطیف اور قیمتی سرمایہ بخشتا ہے۔ روایت ہے کہ میر خلیق فیض آباد میں نواب بہو بیگم کے یہاں دفتر زبان کے علمہ سے متعلق تھے اور الفاظ و محاورات منضبط فرماتے تھے گو کہ آج بہو بیگم کا دفتر تو موجود نہیں ہے لیکن خلیق اور اولاد خلیق کا ذخیرۂ الفاظ زبان و بیان کی سند کے لیے موجود اور محفوظ ہے۔

میر انیس نے زبان لکھنؤ میں رنگ دہلی کی نمود کو ملواں زبان کے طور پر استعمال کیا ہے جس سے دبستانوں کے تفہیم اور پھر ایک دوسرے پر تفاخر کا جذبہ نہیں رہ گیا ہے۔ ملواں زبان کے طور پر انیس کے یہاں کچھ خاص بول درج ذیل طور پر ملتے ہیں۔ جیسے۔

- صفا (صاف کے لیے)

معروف اہتمام تھیں ازواج انبیاء
پلکوں سے کر رہے تھے ملک کعبے کو صفا

- مقرر (ضرور کے لیے)

لوٹے کا جو تو خانۂ پروردگار میں
تڑپے گی میری روح مقرر مزار میں

- صرفہ (دریغ)

جیتے ہیں تو حضرت کی غلامی میں مریں گے
ہم جان بھی دے دینے میں صرفہ نہ کریں گے

- کبھو (کبھی)

دنیا میں آج تک نہ ہوا ظلم یہ کبھو
خنجر گلے پہ چلنے والے ہوں چار سو

- پرچھا (تنہائی تخلیہ)

فرمایا کہ سیراب ہوا اسپ وفادار
پرچھا ہے ابھی گھیر نہ لیں پھر کہیں کفار

- سسرا (سسر، خسر)

سسرا وہ کہ جس شیر کے قبضے میں خدائی
کہ جس نے رسولوں سے دا عقدہ کشائی

- جُٹنی (ملی ہوئی)

وہ اوج ذوالفقار وہ جٹی بھوؤں کا بل
اک نخل قدد کھاتا تھا تیغوں کے تیں پھل

- آپی (آپ ہی)

آج ہیں ہنستے روتے ہوئے گھر میں جاتے ہیں
شفقت بھی آپی کرتے ہیں آپی رلاتے ہیں

- میر انیس کہیں کہیں عربی جمع کو واحد میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

موقع بہن ابھی نہیں فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

صاف باطن ہیں دغا کی نہیں باتیں ہم میں
جمع ہیں سارے بزرگوں کی صفاتیں ہم میں

میر انیس کے یہاں اسماء کی جنس بھی خالص ہے۔ انھوں نے بلبل فردوس، فاتحہ، دسترس کو مذکر اور سراپا، قامت، ایال، ایالی اور عنبر کو مونث نظم کیا ہے۔ مثلاً۔

(مذکر) تھے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

مشتاق ہے فردوس بریں یاں کی فضا کا
پانی میں بھی یاں کے ہے مزا آب بقا کا

ہوگا کہاں نبی کے نواسے کا فاتحہ
شربت پہ کون دے گا پیاسے کا فاتحہ

گو نہر تھی قریب مگر دسترس نہ تھا
تم خوب جانتے ہو کہ بابا کا بس نہ تھا

(مؤنث) یکتائے جہاں حضرت عباس کا صفدر
تھی جس کے سراپا سے عیاں شوکت حیدر

ہے سرو بھی خوش قد پہ یہ قامت نہیں پائی
گل نے یہ لطافت یہ نزاکت نہیں پائی

صدقے گندھی ایال یہ گیسوئے مشک بیز
گرد اوڑی ہیں ابر تو بجلی دم ستیز

گردن پہ عجب حسن سے یال اس کی پڑی ہے
گویا کہ پری کھولے ہوئے بال کھڑی ہے

افعال میں پھیرنے سے زیادہ پھرانا، چھوٹنے سے زیادہ چھٹنا بکھرنے سے زیادہ بکھرانا، ڈھانکنے سے زیادہ ڈھانپنا مصادر کے شکل دکھائی دیتے ہیں جیسے منہ پھرانا، باگ پھرانا، گردن پھرانا تیور پھرانا، سر پھرانا، خنجر پھرانا وغیرہ وغیرہ۔ جیسے

کافر ہوں کہ منہ قبلۂ ایماں سے پھراؤں
تو کوہ طلا دے تو میں لالچ میں نہ آؤں

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرف لشکر شام
پڑ گیا خیمۂ ناموس نبی میں کہرام

دہلی میں مرکب حالیہ ناتمام کی ایک اور شکل میں مستعمل ہے جیسے "میں کر دیتا ہوں (کئے دیتا ہوں) بتا دیتا ہوں (بتائے دیتا ہوں۔ یہی شکلیں میر انیس کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ جیسے۔

زورِ اسد اللہ دکھا دیتا ہوں ان کو
ایک حملے میں دریا سے ہٹا دیتا ہوں ان کو

حلق پر خنجر خونخوار پھرا دیتے ہیں
اب تمہیں بھی اسی مقتل میں گرا دیتے ہیں

میر انیس کی زبان میں کچھ نحوی بل بھی ملتا ہے جس کا رشتہ کہیں لکھنوی اردو سے اور کہیں دہلوی اردو سے قائم کیا جا سکتا ہے۔

اضافت یا نسبت کی آواز "اے"، "یا"، "کے"، جیسے

سجاد نے فرمایا کلیجے سے لگا کر
گردن میں مرے ڈال دو باہوں کو برادر

ایک حشر کا عالم تھا عجب جنگ ہوئی تھی
افراط سے کشتوں کے زمیں سنگ ہوئی تھی

کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کے بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

میر انیس روزمرہ میں "کہ" بہت استعمال کرتے ہیں مثلاً جس طرح کہ، جس روز کہ، جو کچھ کہ، جس وقت کہ، گو کہ، یعنی کہ جبکہ، جو کہ وغیرہ۔

یہ جوش تھا رقت کا شہ جن و بشر کو
جس طرح کہ روتا ہے کوئی باپ پسر کو

جس روز کہ بانی کو ستم گار نے مارا
عبرت تھی غضب شہر لرزتا رہا سارا

ماں نے جو کچھ کہا ہے وہ کریں گے دونوں
دشت جنگاہ کو لاشوں سے بھریں گے دونوں

جس وقت کہ دربار ید اللہ میں جانا
اس مرقد پر نور کو آنکھوں سے لگانا

ہے گو کہ تین روز کے فاقے سے وہ جناب
پر نور ہے شکم صفت قرص آفتاب

گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر
یعنی کہ لاش آپ کے پیارے کی ہے کدھر

اس کے علاوہ میر انیس کی زبان میں جو روزمرے ملتے ہیں

وہ درج ذیل ہیں۔ جیسے۔
مصدر پڑنا کے روپ غیر ضروری طور پر مستعمل ہیں اور یہ خالص
دہلوی روزمرہ ہے۔

لاش اس کی لیں کھینچے لیے جاتے تھے جب آہ
سرننگے پڑی پھرتی تھی میں لاشں کے ہمراہ

اشک آنکھوں سے دم نزع پڑے بہتے تھے
ماہ کو مرتے ہوئے دیکھا نہ یہی کہتے تھے

دو فقروں کے درمیان "یہ" کا استعمال تاکید کے لیے ہے جو
دہلی والوں کی بول چال ہے۔ جیسے۔

ع نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب (ذوق)

میر انیس فرماتے ہیں۔

آب شمشیر سے پیاس اپنی بجھانا یارو
طرف نہر نہ جانا پہ نہ جانا یارو

"پر سے" "میں سے" کے روزمرے بھی انیس کے
یہاں کثرت سے مستعمل ہیں

بیٹی کی سنی زوجۂ مسلم سے زاری
سر پر سے ردا گر گئی گھبرا کے پکاری

ہم میں سے پدر کیا ہوئے واحسرت و دردا
بن بھائی کے آقا ہوئے واحسرت و دردا

میرانیس کے مراثی مسدس میں ہیں جس میں چھ مصرعوں کے
بند کی یہ خوبی ہے کہ ایک مصرع سے دوسرا مصرع بلند ہوتا رہے
یہاں تک کہ چھٹا مصرع پورے بند کی روح کو جگمگا دے اور کوئی
کمی نہ رہ جائے۔ یوں تو خواجہ الطاف حسین حالی نے بھی مسدس کہا
ہے اور مسدس حالی بہت شہرت رکھتا ہے لیکن حالی کو یہ فن
یا یوں کہا جائے کہ گر نہیں آتا۔ میرانیس اس یا گر کے بہت باکمال
فن کار ہیں۔ ان کے مقابلے میں اردو کا کوئی بھی شاعر نہیں ٹھہرتا ہے
ملاحظہ ہو حضرت عباس غیظ و غضب کے عالم میں ہیں

برہم ہوئے یہ سنتے ہی عباس خوش خصال
غازی کو بہر حق کی طرح آگیا جلال
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے یہ بولا علی کا لال
اب یاں سے کوئی ہم کو ہٹائے یہ کیا مجال
حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت الٹ دیں زمین کو

فخر و مباہات کا انداز بیان ملاحظہ ہو جس میں مسدس اپنی پوری
متانت اور جلالت سے نظر آرہا ہے۔

کس جنگ میں سینے کو سپر کر کے نہ آئے
کس مرحلۂ صعب کو سر کر کے نہ آئے
کس فوج کی صف زیر و زبر کر کے نہ آئے
تھی کون سی شب جس کو سحر کر کے نہ آئے
تھا کون جو ایمان تہہ صمصام نہ لایا
اس شخص کا سر لائے جو اسلام نہ لایا

محاوراتی نظام میں بھی انیس نے اودھ کی زبان کے محاوروں
کو ہندوستانی تہذیب کے پس منظر میں نظم کیا ہے۔ حضرت
عباس علمبردار حسینی، حضرت قاسم ابن حسن کو داد شجاعت دیتے ہوئے
فرماتے ہیں۔

بیٹا تمہیں خدا نے دیا ہے علی کا زور
گو پیسل ہے یہ ہم تو سمجھتے ہیں اسکو مور
بہرام کی طرح سے چلا اب یہاں گور
دیکھو گے دیکھنے کا فقط ہے یہ زور و شور
چنگلے ہیں جتنے سانپ وہ ڈستے نہیں کبھی
گرجے ہیں جو بہت وہ برستے نہیں کبھی

درج بالا بیت میں اودھی زبان کا مشہور محاورہ نظم کیا ہے۔
اسی طرح سے "پاتراب" کا محاورہ بھی انیس نے اودھی تہذیب کے
تناظر میں کہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

غازی نے رکھ دیا قدم شاہ دیں پہ سر
بولے گلے لگا کے شہنشاہ بحر و بر

اے تن کی جان اے سببِ قوتِ جگر
یوں ہے خوشی تو خیر جہاں سے کرو سفر

بھائی نہ ہو تو بھائی کی مٹی خراب ہے
اچھا تمہارا کوچ مرا "پا تراب" ہے

"پا تراب" محاورہ کے طور پر نظم کیا گیا ہے۔
اسی طرح کے بہت سے محاوروں کا استعمال مراثی انیس میں ملتا ہے جس کی تفصیل اس مقالے میں پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔
مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب تک کے اجمالی مباحث سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ میر انیس اس باکمال شاعر کا نام ہے جس کے یہاں دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہوں کی زبانوں کا حسین سنگم ہے

مل جل کے یہ رنگ شیر و شکر دونوں کے نکھرتے ہیں جو ہر
دریاؤں کے سنگم سے بڑھ کر تہذیبوں کا سنگم ہوتا ہے
(اقبال سہیل اعظمی)

عربی اور فارسی زبانوں کے اثرات کے ساتھ اودھی تہذیب و روایت کے تناظر میں انیس کا لسانی ادراک گل افشانیاں پیش کرتا ہے۔ انھوں نے جس طرح کے تہذیبی منظر نامے لسانی رنگ و بو کے تناظر میں دکھلائے ہیں وہ جتنی بار دیکھے نئے اور اچھوتے معیار و میزان سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں اور یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ میر انیس کا اردو زبان پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے جس سلیقے اور بھرپور فنی شعور سے زبان اور اس کے انسکلات کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے وہ کسی اور شاعر کے بس کی بات نہیں تھی۔ نہیں ہے اور نہیں رہے گی۔ ◇◇

صفحہ ۲۵۵ کا بقیہ

مرثیہ کو اس ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہیں اور انیس و دبیر کی روایت کو آگے بڑھانے پر ہی قانع رہیں گے یا نئی راہیں تلاش کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔
جہاں تک میر انیس کی مرثیہ نگاری کا تعلق ہے تو یہ کہنے میں کوئی منطق یا جواز نہیں پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کا کوئی ثانی یا بدل موجود ہے البتہ دبیر کو شامل کئے بغیر رثائی ادب کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات بالکل اسی طرح درست ہے کہ غزل کے میدان میں جس طرح میر اور غالب دونوں ہی بے مثل ہیں۔ اکیلے میر یا غالب سے اصل دھارے کی اردو شاعری کا تصوّر مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔
میر انیس نے خود کو سلام اور مرثیہ تک محدود رکھا۔ ہاں انھوں نے جو رباعیات کہیں ان میں بھی رثائی فضا کا احساس ہوتا ہے اس لیے میر انیس کو ادب میں وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا جو میر یا غالب کے حصہ میں آیا اور اسی سبب سے انھیں اردو کی اصل دھارا کا شاعر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔
یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میر انیس نے مسلکی شاعری کے میدان میں وہی کارنامہ انجام دیا ہے جو کہ تلسی داس نے رام چرتر مانس، لکھ کر ہنود کو عطا کیا تھا۔
اتفاق کی بات ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر دونوں ہی ۱۸۰۳ء میں پیدا ہوئے انیس کا انتقال ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۴ء کو ہوا۔ انیس و دبیر کے خوشگوار تعلقات کے بارے میں متعدد واقعے تذکروں درج ہیں۔
◇◇

صفحہ ۲۹۸ کا بقیہ

اس سے نہ صرف میر انیس کے کلام کے نئے جوہر کھل کر سامنے آئیں گے بلکہ مطالعہ کرنے والوں کا ادبی افق بھی وسیع ہو جائیگا۔
اس تجویز کا مقصد عزاداری سے میر انیس کو الگ کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ میر انیس کے کلام کی مقصدیت اور اردو شعر و ادب کے حوالے سے اس کی اہمیت اور اس کی عظمت کو اجاگر کرنا ہے لہٰذا بجائے اس کے کہ میر انیس کا ایک ایک مرثیہ جو ڈیڑھ سو بند پر مشتمل ہوتا ہے اس کو ایک مجلس میں پڑھا جائے۔ ہونا یہ چاہئے کہ مجالس میں میر انیس کا کلام جستہ جستہ پڑھا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی وافر تشریح کی جائے
◇◇

ضمیر نقوی
شیش محل۔ لکھنؤ
9415519498

میر انیسؔ کے فن کی اہمیت اور عظمت کا ایک جائزہ

میر انیسؔ طاب ثراہ اردو شاعری کی تاریخ ساز شخصیت ہیں جن کی اہمیت کو بلا تفریق مذہب و ملت سبھی تسلیم کرتے ہیں انھوں نے اردو زبان و ادب کو جو کچھ دیا وہ ادب کی تاریخ کا اٹوٹ حصّہ ہے۔ میر انیسؔ نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی۔

زبان و بیان کے اعتبار سے ان کی غزلوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اگر چہ ان کی غزلوں کی تعداد بہت کم ہے مگر کیفیت کے اعتبار سے ان کی غزلیں بھی بے مثال ہیں۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غزل ان کا اصل میدان نہیں تھا کیونکہ جلد ہی انھوں نے غزل گوئی ترک کر دی کہا جاتا ہے کہ ان کے والد نے ان سے کہا تھا کہ غزل کو سلام کرو۔ یہ تاریخی جملہ ذو معنی ہے چنانچہ انھوں نے غزل کا دامن چھوڑ دیا سلام اور مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہو گئے قدرت کو غالبًا ان سے بھی کام لینا منظور تھا۔

میر انیسؔ نے اپنے مرثیوں کے ذریعہ مرثیہ گوئی کی ایک نئی تاریخ مرتب کی اور اس طرح بتصدق شہدائے کربلا علیہم السلام لازوال ہو گئے۔ علامہ شبلی نعمانی نے موازنۂ انیسؔ و دبیر لکھ کر اردو شعر و ادب میں علمی تنقید کا آغاز کیا شبلی نے میر انیسؔ کی اہمیت کا جس طرح اعتراف کیا ہے وہ کچھ اختلافی نوعیت بھی رکھتا ہے کیونکہ متعدد دانشوران سخن نے شبلی پہ یہ الزام عائد کیا کہ انھوں نے مرزا دبیر کے غیر اہم اشعار کا موازنہ میر انیسؔ کے بہت اہم اشعار سے کرتے ہوئے میر انیسؔ کے مرتبے اور عظمت کا تعین کیا ہے لیکن یہاں اس سلسلے میں بحث سے اجتناب کیا جا رہا ہے۔ فکر کے دو دھارے اس میں بھی پائے جاتے ہیں یعنی کچھ اس طرح موازنہ کو میر انیسؔ کے مرتبہ بڑھانے کی کوشش کے طور پہ پیش کرتے ہیں مگر میں یہ کہتا ہوں کہ کسی شاعر کے بہترین کلام کو کسی دوسرے شاعر کے کمزور کلام سے موازنہ کرنا یہ ثابت کرتا ہے کہ موازنہ کرنے والا اپنے کلام کو اچھے کلام کے برابر لانے کے قابل نہیں سمجھتا۔

جہاں تک موازنے کا تعلق ہے اس کے بغیر بھی میر انیسؔ کی اہمیت اور عظمت کا جائزہ لیا جا سکتا تھا میر انیسؔ نے مرثیہ گوئی کے توسط سے اردو شاعری کو جس زبان اور روزمرہ کے خصوصی استعمال سے روشناس کرایا وہ عدیم المثال ہے۔ اس کے علاوہ میر انیسؔ کی ایک بہت ہی اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے واقعاتِ کربلا اور جنگ کربلا کی تصویر کشی ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے وسیلے سے کی اسی لیے ان کی مرثیہ گوئی سرزمین عرب سے بہت دور واقع سرزمین ہند کی چیز بن گئی۔

مثال کے طور پر یہ شعر ملاحظہ کریں۔

یارب رسول پاک کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

اس شعر میں عرب کا کلچر بالکل نہیں ملتا خالص ہندستانی تمدن ملتا ہے ہندوستان کی تہذیب ملتی ہے۔ اس طرح میرانیس نے مرثیہ گوئی کے ذریعہ ہندوستانیت کو فروغ دیا ہندوستانی کلچر کو پیش کیا۔ میرانیس کے یہاں ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا پرتو نمایاں نظر آتا ہے۔ وہی ملی جلی تہذیب کو گنگا جمنی تہذیب کہا جاتا ہے اس کے نتیجے میں میرانیس کے مرثیے ہندو، مسلم، سکھ عیسائی، شیعہ، سنی سبھی کے لیے متاثر کن ثابت ہوئے۔

جہاں تک میرانیس طاب ثراہ کی منظر نگاری کا تعلق ہے وہ اپنی متاثر کن، دلپذیر اور جاں سوز ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال کسی اور کے یہاں نہیں ملتی۔ اس سلسلے میں مجھ حقیر کے والد بزرگوار مولوی سید کرار حسین نقوی صاحب طاب ثراہ نے ایک واقعہ یوں بیان کیا تھا کہ مرحوم پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب نے برسوں پہلے ایک موقع پر منظر نگاری کی زمرہ بندی کرتے ہوئے میرانیس طاب ثراہ کی منظر نگاری کو سب سے زیادہ متاثر کن اور اعلیٰ ترین قرار دیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا کہ منظر کشی یا منظر نگاری کو تین زمروں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ایک یہ کہ جیسا اصل منظر تھا یا ہے اس کی تصویر کشی وہ تاثر نہیں پیدا کرتی جو اصل منظر کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔

دوسرا زمرہ یہ ہے کہ تصویر کشی اصل منظر کے مطابق ہوتی ہے یعنی جو تاثر اصل منظر سے پیدا ہوتا ہے اس کی تصویر کشی بھی وہی تاثر مرتب کرتی ہے۔

تیسرا زمرہ یہ کہ تصویر کشی اصل منظر سے بھی زیادہ متاثر کرتی ہے یعنی اصل منظر سے بھی وہ تاثر نہیں پیدا ہو سکتا ہے جو منظر کی تصویر کشی نے پیدا کر دیا۔ کیونکہ ہر انسان اپنی زبان اور اپنے تاثرات کے اعتبار سے واقعات کی تفہیم کرتا ہے۔ آج کل اس کا تجربہ بہت آسان ہے۔ کسی اجنبی زبان کی مووی دیکھئے اور اپنے علاقے کی زبان میں بھی ہوتی ہے مووی دیکھئے اور دونوں کے تاثراتی فرق کو محسوس کیجئے اگرچہ واقعات چشم دید ہیں خدائے سخن کا کمال یہ ہے کہ عربی لسانی تہذیبی واقعات کو بہترین انداز سے ہندوستانی پیکر میں ڈھالا مرحوم مسعود صاحب نے بجا طور پر میرانیس طاب ثراہ کی منظر نگاری کو تیسرے زمرہ کی منظر کشی قرار دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ بہت بڑی بات ہے اور یہ بات انھوں نے ایسے ہی نہیں کہہ دی ہوگی۔ کیوں کہ ڈاکٹر مسعود حسن ادیب مرحوم میرانیس کی مرثیہ نگاری کے روح شناس تھے۔ میرانیس کے فن کی باریکیوں اور نزاکتوں سے جتنا وہ واقف تھے اتنا شاید ہی کوئی اور ہو۔

صالحہ عابد حسین نے میرانیس کے مرثیہ کے عنوان سے جو انتخاب مرتب کیا تھا اس کی جلد دوم کے صفحہ نمبر ۱۱ پر رقم دیباچہ میں انھوں نے لکھا ہے اور بالکل درست لکھا ہے کہ ''یہ وہ مراثی ہیں جن میں انیس کا کلام اس قدر سہل رواں ہے جیسے کہ کوئی سبک روندی دھیرے دھیرے بہہ رہی ہو۔ زبان میں شہد سے بڑھ کر حلاوت خیالات میں گہرائی اور درد کی اتھاہ کیفیت! پڑھنے والے اور سننے والے مبہوت ہو جاتے ہیں۔ مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے سر خاندان رسالت کے ان شہیدوں کے اعلیٰ اخلاق اور سیرت کے سامنے

(بقیہ ص ۲۷۲ پر)

ڈاکٹر ریحان حسن
شعبہ اردو فارسی گرو نانک دیو یونیورسٹی امرتسر
8847273022

مراثیِ انیسؔ میں درسِ مساوات

اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں عدل و مساوات کو اولین درجہ ہی نہیں دیا گیا بلکہ انسانی فلاح و بہبود کے پیش نظر ایسے قوانین بھی بنائے گئے ہیں جس میں امن و آشتی کی بستیاں آباد ہو سکیں چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

"اللہ تمہیں عدل و انصاف کا حکم دیتا ہے"
(سورہ نحل آیت ۹)

بندوں پر احسان کرنا اور ان کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آنا بظاہر معاشرتی نظام کا حصہ معلوم ہوتا ہے لیکن باطن میں یہ انسانی برابری اخلاق کی راہوں کو ہموار کرتا ہے۔ جہاں عدل و انصاف کے ذریعہ معاشرہ سے بے ایمانی اور بے راہ روی کا خاتمہ مقصود ہے وہیں احسان سے اسے مساوات کے جذبے سے سرشار کرنا بھی ہدف ہے۔ انسانوں کو یہ درس قرآن کریم کی ابتدائی آیتوں ہی میں ملتا ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں ارشاد احدیت ہے۔

"اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن" تمام تعریفیں اس خدا کے لیے جو عالمین کا رب ہے۔ قرآن کریم کی اس آیۂ کریمہ میں عالمین کا تصوّر اور خدا کی ربوبیت کا پہلو قابل توجہ ہے۔ آیت میں عالمین عالم کی جمع ہے لہٰذا ہم اپنے عالم کو دیکھتے ہیں کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہاں خدا کی عبادت کرنے والے بھی ہیں اور خدا کی عبادت اور پرستش سے بیگانے بھی مگر خدا بیگانے کو بھی رزق اسی طرح دیتا ہے جس طرح عبادت گزار کو رزق عطا کرتا ہے۔ سورج نکلتا ہے مگر ایسا نہیں کہ سورج کی روشنی سے صرف وہی مستفیض ہوں جو عبادت گزار ہیں بلکہ خالق کائنات کے منکر بھی اس سے ویسے ہی فیض پاتے ہیں کہ جیسے خدا کا ایک عبادت گزار بندہ مستفیض ہوتا ہے۔ مساوات کا یہی سبق خالق کائنات نے اپنے رسول کو بھی پڑھا کر اس خاکدان عالم پر بھیجا یعنی رحمۃ للعالمین (پوری دنیا کے لیے رحمت) بنا کے بھیجا ایسی رحمت کہ جس سے فرزندان توحید بھی فیض حاصل کرتے ہیں اور خون کے پیاسے بھی استفادہ کرتے ہیں اس ضمن میں قرآن کریم میں محمدؐ عربی کی رحمت کا ذکر کچھ اس طرح ہوتا ہے۔

"اللہ کے لیے یہ مناسب نہیں کہ ان پر عذاب کرے اور آپ ان کے درمیان ہوں۔" (سورۂ انفال آیت ۳۳)

پروردگار عالم جن لوگوں کو کعبہ میں عبادت سے روک رہا ہے وہی پروردگار ان پر اس لیے عذاب نازل نہیں کرتا کہ ان کے درمیان وہ ذات موجود ہے جو عالمین کے لیے رحمت ہے یعنی خالق کائنات نے مومن اور منکر کے درمیان رحمت مصطفوی کو برابر تقسیم کر دیا۔

اسی طرح حضرت علی کی حیات زندگانی میں بھی عدل و مساوات کی اعلا مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ آپ کا مشہور عہد نامہ جسے جامع نہج البلاغہ علامہ سیوطی نے نہج البلاغہ میں جگہ دی ہے قابل غور ہے یہ عہد نامہ اس وقت کا تحریر کردہ ہے کہ جب حضرت علی نے مالک اشتر کو گورنر بنا کر مصر کی جانب روانہ کیا تھا۔

"اے مالک اشتر جس جگہ عامل بنائے گئے ہو
وہاں تمہیں دو قسم کے لوگ ملیں گے ایک وہ
جو دین میں تمہارے بھائی ہیں اور دوسرے وہ
لوگ کہ جو خلقت میں تمہارے بھائی ہیں یعنی
جیسے دو ہاتھ دو آنکھیں تمہارے پاس ہیں ویسے
ہی ان کے پاس بھی ہیں یعنی جس خدا نے تمہیں
پیدا کیا ہے اسی نے انھیں بھی خلق فرمایا ہے"
(نہج البلاغہ مکتوب نمبر ۹۳)

حضرت علی کے اس عہد نامہ سے یہ واضح ہے کہ خدا نے انسانوں کو مساوی حقوق عطا کئے ہیں۔ دراصل حضرت علی کا یہ عہد نامہ رہتی دنیا تک قابل تقلید ہے۔ آپ نے بنی نوع انسان کو محض اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے افعال و اعمال کے ذریعہ بھی انسانوں کے دکھ اور درد کے بانٹنے کا درس دیا۔ حق تو یہ ہے کہ یہ درس ہمیں خاندان رسالت سے تعلق رکھنے والوں کے یہاں جس قدر بھرپور انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے وہ کہیں اور نہیں خواہ حضرت علی کی ذات گرامی ہو یا فاطمہ زہرا کی۔ امام حسن و حسین کی نصیحت ہو یا امام زین العابدین اور جناب زینب وغیرہ کی۔ سبھی کی حیات طیبہ میں اسلامی مساوات کا رنگ مکمل طور پر موجود ہے خصوصاً واقعۂ کربلا تو اس کی واضح آئینہ دار ہے۔ لہٰذا جتنے دانشور ادباء اور شعراء اہلبیت رسالت خصوصاً حسینیت سے وابستہ ہیں ان کی تخلیقات حسینی مساوات سے لبریز ہیں چنانچہ ہر عہد کے مکمل اور عظیم شاعر میرانیس کے مراثی کو جب ہم دیکھتے ہیں تو اس عظیم صفت کا ذکر بصورت پیغام ملتا ہے۔ حضرت علی کی حیات زندگانی کے ذکر میں انسانوں کے ساتھ برابری کے سلوک کا ذکر انیس کچھ یوں کرتے ہیں۔

مغموموں کے مظلوموں کے گھر آپ ہی جاتے
اور ہاتھ سے اپنے انھیں کھانے کھلاتے
سر اپنے شفقت سے کہیں پاؤں دباتے
آہستہ اٹھاتے انھیں آہستہ لٹاتے
عزت سے فقیروں کو کھلاتے تھے اکثر
ننگوں کو ردا اپنی اڑھاتے تھے اکثر
(مراثی انیس جلد دوم صفحہ ۵۱)

سچ تو یہ ہے کہ محمد عربیؐ اور حضرت علی نے حیات طیبہ میں اپنے قول و عمل اور کردار کے ذریعہ یہ باور کرایا کہ بارگاہ خداوندی میں انسان کو اس کے عمل کی بنیاد پر برتری حاصل ہوگی۔ اس کی نظیر میں بقول انیس۔

ہوگا عمل نیک سبب لطف خدا کا
واں مرتبہ یکساں ہے شہنشاہ و گدا کا
(مراثی انیس جلد دوم صفحہ ۲۰)

درس مساوات کے اعتبار سے انیس کے مرثیوں کا ذکر اس لیے ناگزیر ہے کیونکہ ان کے تمام کلام میں یکجہتی اتحاد و یگانگت، حقوق کی حفاظت اور برابری کا سبق ملتا ہے۔ انیس نے اپنے مرثیوں میں یہ باور کرایا ہے حضرت علی نے فقراء و غرباء کی جس طرح دستگیری و خبر گیری کی ہے وہ انسانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ یقیناً آپ غریبوں کے ساتھ ایسے لطف و کرم کے ساتھ پیش آتے تھے کہ ان میں احساس غربت باقی نہ رہتا تھا اور جب کوئی سوال کر ہی لیتا کہ آپ کون ہیں تو یہی جواب ہوتا کہ ایک امیر کے پاس بیٹھا ہے اور ایک غریب غریب کے پاس بیٹھا ہے۔ آپ کے اس خلق اور برابری کا ذکر انیس کچھ یوں کرتے ہیں۔

فرماں روائے خلق تھا ہر چند وہ امام
لیکن نمک سے کھاتا تھا نانِ جویں مدام
بھوکوں کو کھانا دیتا تھا جاری تھا فیضِ عام
کس لطف سے غریبوں سے ہوتا تھا ہم کلام
غم بیکسوں کے حال پہ کھانے سے کام تھا
بھوکوں کو آپ جاکے کھلانے سے کام تھا

(کلامِ انیس، انتخاب، مرتب فاروق ارگلی مطبوعہ فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹیڈ ۲۰۰۳ء) تاریخ گواہ ہے کہ حضرت علی کی شہادت ابن ملجم مرادی کی زہر آلود تلوار سے ہوئی تو فقراء، یتیموں اور رانڈوں کو جب یہ علم ہوا کہ رات کی تاریکی میں ہماری خبر گیری کرنے والا کوئی اور نہ تھا بلکہ وہ حضرت علی کی ذاتِ گرامی تھی جو ہمارے درمیان نہ رہی۔ اس خبر کا علم غرباء، فقراء اور یتیموں کے لیے کس قدر جاں گداز تھا۔ اس کا ذکر میر انیس یوں کرتے ہیں۔

سر اپنا پیٹ پیٹ کے چلاتے تھے فقیر
ہم لوگ مر گئے ترے مرنے سے اے امیر
قیدی پکارتے تھے کہ اے کل کے دستگیر
اب کس کی راہ رات کو دیکھیں گے ہم اسیر
کہتی تھیں رانڈیں خلق سے وارث گزر گیا
چلاتے تھے یتیم کہ باپ آج مر گیا

(کلامِ انیس انتخاب مرتب فاروق ارگلی ص۳-۱۰۸)

یقیناً حضرت علی کی حیات کا ہر لمحہ انسانوں کے لیے مشعلِ ہدایت ہے۔ انھوں نے شاہ و گدا میں نہ صرف کوئی امتیاز باقی رکھا بلکہ اپنے غلاموں کے ساتھ بھی جس انداز سے زندگی بسر کی وہ دعوتِ مساوات سے پر ہے۔ دراصل ظہورِ اسلام سے قبل غلاموں کی حیثیت نہایت کمتر اور بدتر تھی۔ ان کے ساتھ جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا لیکن اسلام نے غلام کی اس پست حیثیت کو ختم کر کے معاشرہ کی ایک اہم فرد بنایا۔ مذہب اسلام غلاموں کے تئیں برابری کے سلوک پر صرف مرور ہی بہتر تھا بلکہ محمد عربیؐ اور حضرت علی وغیرہ نے عملی تصویر بھی پیش کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علی نے اپنے غلاموں کو مساوی حقوق ہی عطا نہ کئے بلکہ اپنے سے بہتر غلاموں کو کھانا کھلایا حتیٰ کہ لباس بھی اپنے سے بہتر پہنایا۔

میر انیس کے مرثیہ "خورشید فلک عکس در تاج علی ہے" میں حضرت علی کے ایک ایسے ہی خادم "احمد کوفی" کا تذکرہ ملتا ہے کہ جس سے حضرت کا اپنے خادموں کے ساتھ حسن سلوک کا اندازہ ہوتا ہے۔

لکھا ہے کہ جب احمد کوفی نے قضا کی
حیدر نے جنازے کی نماز اس کے ادا کی
کیا بندہ نوازی ہے شہ عقدہ کشا کی
جب دفن کیا اس کو تو بخشش کی دعا کی
تشریف دم دفن و کفن لاتے ہیں مولا
شیعوں کے اسی طرح سے کام آتے ہیں مولا

(کلامِ انیس، انتخاب۔ مرتب فاروق ارگلی۔ مطبوعہ۔ فرید بک ڈپو دہلی ۲۰۰۳، صفحہ ۶۷)

حضور اکرمؐ نے جس طرح اپنے قول و عمل اور کردار کے ذریعہ اپنے رحمۃ اللعالمین ہونے کا ثبوت بہم کیا اسی طرح دختر رسول حضرت فاطمۃ الزہراؑ نے بھی اپنے کردار کے ذریعہ اعلیٰ انسانی اقدار کے تحفظ کا درس دیا چنانچہ آپ نے کنیزوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کیا اور یہ باور کرایا کہ دنیا کی تمام عورتیں دراصل خدا کی ہی کنیز ہیں۔ آپ نے جناب فضہؑ کے رہتے ہوئے بھی گھر کے کاموں میں ویسی ہی دقتیں برداشت کیں جیسے کہ اپنی کنیز کو گھر کے کاموں میں مشقتیں اٹھانی پڑتی تھیں۔

زہرا کا حال دیکھ کے دل ہو گیا کباب
کی عرض فاطمہ سے بہ بادیدۂ پُر آب
اے دختر رسول خدائے فلک جناب
ان محنتوں کی آپ کے دل میں کہاں ہے تاب
جو پیتی ہیں دودھ پسر کو پلاتی ہیں
فضہؑ کے ہوتے آپ یہ ایذا اٹھاتی ہیں

فرمایا فاطمہ نے پس از شکر کردگار
اک دن فضہ کرتی ہے سب گھر کا کاروبار
اور کی ہے میں نے محنت یک روزہ اختیار
ایذا ہو اس کو یہ نہیں منظور زینہار
گو میں محمد عربی کی عزیز ہوں
حق کی کنیز وہ بھی ہے میں بھی کنیز ہوں
(مراثی انیس جلد دوم صفحہ ۵۵-۵۴)

حضرت فاطمۃ الزہرا کا کنیز کے ساتھ یہ حسن سلوک رہتی دنیا تک ان لوگوں کے لیے نمونہ عمل ہے جو اپنے گھروں کے کاموں کی انجام دہی کے لیے نوکرانیاں (کنیزیں) رکھتے ہیں در اصل میر انیس نے مرثیوں کے ذریعہ خانوادۂ رسولؐ کے افراد کی حیات طیبہ کو نظم کر کے ایک پیغام کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا تاکہ انسان اپنا محاسبہ کرے اور اس طرح اپنے کردار کو سنوارے۔

انھیں حضرت علی و فاطمہ کے فرزند اور محمد عربی کے نواسے امام حسین ہیں جنھیں پروردگار عالم نے عالمین کے لیے رحمت بنایا تھا۔ چنانچہ یہ تمام اعلیٰ قدریں امام حسین میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ آپ نے جہاں جوان بھائی حضرت عباس کی لاش پر گریہ کیا وہیں جناب جون جو بظاہر غلام تھے۔ ان پر بھی اسی انداز سے گریہ کیا جیسے ایک بھائی کو بھائی روتا ہے۔ جہاں امام حسین نے اپنے جوان فرزند علی اکبر کا لاشہ اٹھایا وہیں بچپن کے دوست حبیب ابن مظاہر کا لاشہ اٹھایا۔

امام حسین نے اقربا، اعزہ، غلام اور صحابۂ کرام کو ہی برابری کا درجہ نہ دیا بلکہ انھوں نے خون کے پیاسوں کے ساتھ بھی مساوات کا برتاؤ کیا غلاموں کے ساتھ بھی آپ کا اس قدر مشفقانہ رویہ تھا کہ جس کی نظیر تاریخ لانے سے قاصر ہے۔ میدان کربلا اس بات کا گواہ ہے کہ آپ غلاموں کے ساتھ بھی گود کے پالوں کی طرح شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔

لڑتے تھے مگر غیظ سے رحمت تھی زیادہ
شفقت بھی نہ کم تھی جو شجاعت تھی زیادہ
نانا کی طرح خاطر امّت تھی زیادہ
بیٹوں سے غلاموں کی محبت تھی زیادہ
تلوار نہ ماری جسے منہ موڑتے دیکھا
آنسو نکل آئے جسے دم توڑتے دیکھا
(مراثی انیس جلد اول صفحہ ۸۱)

میر انیس کے مرثیوں میں امام حسن کے خلق اور مشفقانہ کردار کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے ان میں امام حسین کے رحم و کرم اور انسانی اقدار کی اعلیٰ مثالیں ملتی ہیں۔ خواہ اقربا و اصحاب کا ذکر ہو یا صف اعدا کا تذکرہ ہر جگہ برابری کے اس عمل کا بیان ہے جو آپ نے عملی طور پر پیش کیا جب امام حسین اپنی چہیتی بیٹی سکینہ کے رخصت ہونے کے لیے آتے ہیں تو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ سامنے جو خون کی پیاسی فوج کھڑی ہوئی ہے۔ وہ ہماری نظروں میں بھی عزیز ہیں اور وہ اس لیے کہ یہ ہمارے نانا کی امت ہیں انیس کہتے ہیں۔

بیٹی سے جدا ہو کے کہاں جاتے ہو حضرت
کس کے لیے ہم سب کی گوارا ہوئی فرقت
وہ کون ہے جس کی ہے یہ الفت یہ محبت
حضرت نے کہا وہ مرے نانا کی ہے امّت
جو خاص ہیں ان میں وہ ہمارے ہیں سکینہ
وہ تم سے زیادہ ہمیں پیارے ہیں سکینہ
(مراثی میر انیس جلد اول صفحہ ۶۵)

مساوات کا یہ درس اور خون کے پیاسوں کے ساتھ یہ بھی شفقت خدا کے ان خاص بندوں کا کردار ہے جنھیں پروردگار عالم کی نظر عنایت نے انھیں انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے منتخب کیا تھا جیسا کہ کہا گیا ہے کہ حضرت امام حسین نے جس طرح اپنے گود کے پالوں اور بھائی کے لاشے پر پہنچے۔ اسی قبیل اپنے دوستوں اور غلاموں کی بھی

وقت آخر مدد کو پہنچے۔ حضرت حر جو فوج یزید کا کمانڈر تھا اور اسے اس بات پر متعین کیا گیا تھا کہ وہ امام حسین کو راستے سے گھیر کر میدان کربلا تک پہنچائے ابھی وہ امام حسین کے لشکر میں داخل نہیں ہوا تھا بلکہ آپ کا دشمن تھا لیکن جب اسے اور اس کے لشکر کو پیاس سے مضطرب دیکھا تو اس کی نہ صرف یہ کہ ذخیرہ آب سے پانی دے کر پیاس بجھائی بلکہ حر کے پورے لشکر کو سیراب بھی کیا اور جب وہ اپنی خطا پر نادم ہو کر امام کی جانب چلا تو امام اس سے اس قدر لطف و کرم سے پیش آئے کہ جس کی نظیر تاریخ لانے سے قاصر ہے بقول میر انیس

استغاثہ یہ کیا حر نے جو بادیدۂ نم
جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم
خود بڑھا ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہ امم
حر کو یہ ہاتف غیبی نے صدا دی اس دم
شکر کر سبط رسول الثقلین آتے ہیں
لے بہادر ترے لینے کو حسین آتے ہیں

(مراثی انیس۔ جلد اول صفحہ ۱۰۰)

حر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیر
دوڑ کر چوم لیے پائے شہ عرش سریر
شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا اے باتوقیر
میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر
میں رضا مند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجھ کو عباس دلاور کے برابر ہے تو

(مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۰۱)

حضرت امام حسین نے جیسے حر کے ساتھ کریمانہ اخلاق کا مظاہرہ کیا ویسے ہی حضرت حر نے بھی احساس خطا کے بعد انتہائی عاجزانہ کردار پیش کیا چنانچہ جب امام حسین کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے حر آگے بڑھے تو بیٹے سے کہا کہ تیرے باپ نے بڑی گستاخیاں کی ہیں میرے ہاتھوں کو اس طرح رومال سے باندھ کر لے چلو کہ جیسے ایک مجرم عدالت میں جاتا ہے اور جب حر خدمت امام حسین میں حاضر ہوا تو فرزند رسولؐ نے اس کے ہاتھوں سے رومال کو کھول کر دنیا و آخرت میں آزادی کا پروانہ دیتے ہوئے فرمایا۔ حر تیری ماں نے تیرا کیا خوب نام "حر" رکھا ہے کہ تو دنیا میں بھی آزاد ہے اور آخرت میں بھی۔ یہی نہیں وقت ملاقات اس انداز سے ملے کہ اسے احساس کمتری نہ ہو بلکہ برابری کا احساس ہو۔ انیس کہتے ہیں۔

جب ہاتھ کھلے رکھ دیا سر حر نے قدم پر
کی عرض مجھے سمجھو غلام اے شہ صفدر
فرمایا اسے شاہ نے چھاتی سے لگا کر
پیارا ہے مجھے تو علی اکبر کے برابر
ماں تیری ترے واسطے مصروف دعا ہے
بیگانہ تھا پر اب تو یگانوں سے سوا ہے

(مراثی میر انیس مرحوم جلد سوم باہتمام محترمہ اسما ٹھور دھن مینجنگ ڈائرکٹر تیج کمار بکڈپو پرائیوٹ لمیٹڈ وارث نولکشور پریس بکڈپو لکھنؤ نے اودھ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا ۲۰۰۴ء صفحہ ۲۳)

امام حسین نے حر کے احساس ندامت کو ختم کرتے ہوئے جس انداز سے ہمت افزائی کی ہے وہ تاریخ کربلا میں بے مثال ہے یعنی امام عالی مقام نے وقت آخر رومال زہرا کو حضرت حر کی پیشانی اقدس پر باندھا۔ میر انیس نے امام حسین کی خدمت میں حر کی آمد اور امام عالی مقام کی عطا و بخشش کا ذکر کس خوبی سے کیا ہے ملاحظہ ہو

کی حر نے فصاحت سے جو مداحی سرور
نہوڑا لیا شرما کے سخی نے سر انور
اکبر سے اشارے میں یہ فرمایا کہ دلبر
کہہ دو کہ خوشی تیری اسی میں ہے تو بہتر
مدّاح کا مہماں کا بہادر کو صلا دو
آؤ یہ عبا لے کے مری حر کو اڑھا دو

اکبر نے عبا لے کے جو مہماں کو اڑھائی
نعرہ بولے کہ نانا کا تبرک ہے یہ بھائی
عباس پکارے کہ زہے عقدہ کشائی
بے خلعتِ رحمت تری امید بر آئی
کونین کا اقبال و حشم جانیو اس کو
فردوس کے حلّے سے نہ کم جانیو اس کو

حضرت امام حسین کا یہ الطاف و کرم مساوات کا وہ اعلیٰ نمونہ ہے کہ جو بنی نوع انسان کے لیے رہتی دنیا تک مشعلِ ہدایت بنا ہوا ہے۔ میر انیسؔ کے کائنات مرثیہ میں برابری و یگانگت کا ذکر حضرت حر کے ذکر میں زیادہ ملتا ہے۔

میر انیسؔ نے واقعہ کربلا کے کرداروں میں حر کے کردار کو مختلف طریقوں سے مراثی میں غالباً اس لیے بھی پیش کیا کہ امام حسین کے خلق و اخلاق کا اندازہ ہونے کے ساتھ ساتھ حر نے اپنی خطاؤں کا مداوا کس انداز سے کیا ہے اس کا علم ہو سکے نیز امام عالی مقام نے حر کے ساتھ جو برابری کا سلوک کیا ہے اس سے بھی انسان واقف ہو سکے۔ کربلا کے کرداروں میں امام کے درس مساوات کے لیے حر کے کردار کا انتخاب انیسؔ کے ندرت فکر کا ثبوت بھی ہے اس لیے کہ حر کے کردار میں انسانی اقدار کا بیان جس خوبی سے ہو سکتا تھا وہ کسی اور کے کردار کے بیان میں جناب جون کے علاوہ غالباً ممکن نہ تھا چنانچہ انیسؔ نے مختلف مرثیوں میں نت نئے جہات سے حر کے کردار کو بیان کرتے ہوئے امام کے حسن سلوک کا ذکر جا بجا کیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب حر نے وقت آخر امام کو آواز دی تو خود امام نے حر کی آواز پر لبیک کہا۔

حر نے نعرہ کیا یا حیدر صفدر مدد ے
وقت امداد ہے یا فاتح خیبر مدد ے
زوج زہرا مدد نفس پیمبر مدد ے
بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر مدد ے

تن تنہا ہے غلام اور بہت ظالم ہیں
آئی آواز کہ اے حر ترے حامی ہم ہیں

(مراثی اول۔ جلد اول صفحہ ۹۹)

حضرت حر کے زخموں سے چور چور زمین کربلا پر لانے کی خبر امام کے لیے کس قدر جانکاہ تھی انیسؔ کہتے ہیں۔

شاہ رونے لگے یہ سنتے ہی مہماں کی خبر
ہوگئی آنسوؤں سے ریش مبارک سب تر
علی اکبر سے کہا تم ابھی ٹھہرو دلبر
حر کی امداد کو ہم جائیں گے اے نور نظر
کس سے اس وقت کہوں میں جو قلق مجھ پر ہے
لاش اٹھاؤں گا کہ مہمان کا حق مجھ پر ہے

(مراثی انیسؔ جلد اول صفحہ ۱۰۴)

حضرت امام حسین نے میدان کربلا میں ایک غلام کو جو عزت و توقیر دی اور اہل دنیا کے سامنے غلام کے ساتھ برابری کے برتاؤ کا جو عملی نمونہ پیش کیا ہے اس پر قیامت تک صدیاں سلام کرتی رہیں گی۔ امام حسین کے اس عملی کارنامے کا ذکر انیس کی زبان سے یوں ادا ہوتا ہے۔

کسی آقا نے کبھی کی ہے یہ توقیر غلام
دیکھ تو مر تم ترے واسطے روتے ہیں امام
بھائی فرماتے تھے شفقت سے شہ عرش مقام
اے خوشا حال خدا سب کا کرے نیک انجام
حشر تک خلق میں یہ ذکر غم انگیز رہا
تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی کچھ تیز رہا

(مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۰۷)

سچ تو یہ ہے کہ حضرت امام حسین نے حر کے ساتھ مشفقانہ رویہ ہی نہیں برتا بلکہ جس طرح حضرت عباس کو بھائی سمجھا اسی قبیل حر کو بھی بھائی کہہ کر مخاطب کیا۔ انیس کہتے ہیں۔ شعر ملاحظہ کریں ے

ٹکڑے ہے بدن زخم عجب کھائے ہیں بھائی
لے ہوش میں آلاش پہ ہم آئے ہیں بھائی
(مراثی انیس جلد دوم ص ۲۲۵)

حضرت حر نے جب آنکھیں کھولیں تو حضرت حر امام حسین سے یوں مخاطب ہوئے۔

سن کر یہ صدا حر نے جو آنکھوں کو کیا وا
سر حضرت شبیر کی آغوش میں دیکھا
جلدی قدم شاہ پہ منہ مل کے یہ بولا
صدقے ترے الطاف کے اے سید والا
تکیہ ترے زانو کا میسر ہوا آقا
ذرہ تھا پہ اب مہر منور ہوا آقا
(مراثی انیس جلد دوم صفحہ ۲۲۵)

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت حر کے لاشے پر امام عالی مقام بہ نفس نفیس پہنچے لیکن حر نے کثرت جراحت سے جب آنکھیں نہ کھولیں تو انیس تخیل کی مدد سے اس موقع کی گفتگو کو یوں نظم کرتے ہیں ؎

زانو پہ رکھ لیا سر حر اور یہ کہا
بھائی حسین آیا ہے آ ہوش میں ذرا
آنکھیں قدم پہ رکھ کے یہ بولا وہ باوفا
مولا ہزار جان سے میں آپ پر فدا
جن کے لیے زمیں پہ ملک سر جھکاتے ہیں
وہ لوگ خلد سے مرے لینے کو آتے ہیں
(مراثی انیس جلد اول صفحہ ۱۲۳)

امام حسین نے حضرت حر کو صرف یہ عزت و توقیر ہی نہ دی بلکہ اس کے ذکر کو دوام تاریخی بخشتے ہوئے اپنے چاہنے والوں کو یہ تلقین بھی کی۔

بند ملاحظہ فرمائیں ؎

میری جانب سے کہو لاش پہ آئیں سجاد
بعد مرنے کے ہو تا روح مرے دوست کی شاد
یہ وصیت مرے شیعوں کو ہے رکھیں اسے یاد
نام حر سن کے کریں آہ و فغاں و فریاد
جس عزا خانے میں وہ تعزیہ میرا رکھیں
اس کا ماتم بھی اسی بزم میں برپا رکھیں
(مراثی میر انیس جلد اول صفحہ ۱۰۸)

انیس کے مرثیوں میں برابری کے حساب سے امام حسین کی کنیز شیریں کا ذکر بھی قابل توجہ ہے اس لیے کہ انیس نے اپنے مرثیہ در اے مومنو! کیا صادق الاقرار تھے شبیر،، کو جس نرالے انداز سے نظم کیا ہے اس کا ہر ہر مصرعہ درس مساوات کا داعی ہے۔ شیریں امام حسین کی کنیز تھیں کہ جس نے امام سے یہ اقرار لیا تھا کہ آپ ہمارے گھر پر تشریف ضرور لائیں گے تاکہ میری عزت و عظمت میں اضافہ ہو سکے۔ جب اسے خبر ملی کہ خانوادۂ رسالت کا قافلہ آ رہا ہے تو شیریں کے قلب کی کیفیت کو انیس یوں بیان کرتے ہیں۔

مدت میں بر آئی ہے مرے دل کی تمنا
صدقے گئی نوشش آج وہیں کیجئے کھانا
آپ آئیں یہ ہر چند نہیں ہے مرا رتبا
عزت مگر اس لونڈی کی ہو جائے گی شاہا
روشن مرا گھر کیجئے گر فیض قدم سے
کچھ دور نہیں آپ کے الطاف کرم سے
(جلد چہارم صفحہ ۲۵۴)

شیریں قافلہ اہلبیت کی آمد کی خبر سن کر اپنے شوہر کو انھیں لانے بھیجتی ہے تو وہاں عجیب عالم نظر آتا ہے ؎

جس جا پہ تھا خیمہ عمر سعد کا برپا
واں جا کے یہ ڈیوڑھی کے نگہبانوں سے پوچھا
کب ہوگا برآمد پسر فاطمہ زہرا
فرماتے ہیں آرام کہ بیدار ہیں مولا
گر اتنی خبر کر دو تو احسان بڑا ہے
اک تازہ غلام آپ کے مجرے کو کھڑا ہے

(جلد چہارم صفحہ ۲۵۸)

شیریں کے شوہر کو جب حقیقت کا علم ہوتا ہے تو وہ شیریں سے اس طرح مخاطب ہوتا ہے۔

تو منتظر کس کی ہے کون آئے گا بی بی
عابد ہے سو بیمار ہے رانڈیں ہیں سو قیدی
شیریں نے کہا پیٹ کے سر کوٹ کے چھاتی
ہے ہے مرے سیّد مرے آقا مرے والی
لٹوا کے گھر اور تیغ سے کٹوا کے سر آئے
فرمایا تھا آؤں گا سو یوں میرے گھر آئے

(جلد چہارم صفحہ ۲۵۴)

امام حسین نے شیریں سے کئے ہوئے وعدے کی وفا کی انداز سے کی ہے وہ خانوادۂ رسالت کے خلق و اخلاق اور برابری و یگانگت کا ایسا درس ہے کہ جس سبق کے لیے رہتی دنیا تک انسانیت ان کی کرانبار رہے گی۔

سچ تو یہ ہے کہ خاندان رسالت کے ہر فرد نے اپنے کردار، اعمال و افعال کے ذریعہ غلامی اور کنیز کے تصوّر کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ امام حسین کے فرزند حضرت امام زین العابدین نے بھی اپنے غلاموں کے ساتھ ایسا حسن سلوک برتا کہ غلام میں ذرہ برابر بھی احساس غلامی نہ رہا امام زین العابدین کے اس کردار کا ذکر انیس کے مرثیہ میں اسطرح ہوتا ہے۔

یکساں تھا خلق آپ کا شاہ و فقیر سے
بٹھلاتے تھے فقیر کو برتر امیر سے
باتیں تھیں پرورش کی یتیم و اسیر سے
کرتے تھے سیر انھیں رطب شہد و شیر سے
ہر شب کو قیدیوں کی خبر لینے جاتے تھے
دو دن کے بعد نان جویں آپ کھاتے تھے

(جلد چہارم صفحہ ۲۸۵)

میدان کربلا میں حضرت امام حسین کے کردار میں ہی اپنے سے کمتر لوگوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ نظر نہیں آتا بلکہ حضرت عباس و علی اکبر حضرت عون و محمد اور جناب قاسم کے یہاں بھی یہی مشفقانہ خلق و اخلاق ملتا ہے۔ ایسا نہیں کہ کربلا کے میدان میں صرف مردوں نے برابری کا درس دیا ہو بلکہ خواتین کربلا نے بھی مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا یعنی جس طرح اپنے گود کے پالوں بھائیوں اور بھانجوں کی شہادت پر اظہار غم کیا اسی قبیل غلاموں کی شہادت پر بھی رنج و غم کا اظہار کیا۔ انیس کہتے ہیں۔

یہ سنتے سنتے غیر ہوا اس جری کا حال
زانوئے شاہ دیں پہ کیا حر نے انتقال
خیمے کے در پہ لاش کو لایا علی کا لال
سب بیبیوں نے کھول دئے اپنے سر کے بال
زینب یہ روتی شہ کے فدائی کے واسطے
جیسے بہن تڑپتی ہے بھائی کے واسطے

(مراثی میر انیس جلد اول ۱۲۳)

بہر حال سچ تو یہ ہے کہ انیس نے مراثی میں اسلام کے رہنماؤں کے کرداروں کی سیرت کو پیش کرکے ہر مکتبۂ فکر کے افراد کو جس اخلاق فاضلہ کی تعلیم دی ہے وہ ہر دور کے انسانوں کے لیے مشعل ہدایت ہے نیز اسلام کے رہنماؤں کی سیرت کو پیش کرکے اردو زبان کے سرمایہ میں جو انھوں نے اضافہ کیا ہے وہ اخلاق و نصائح اور پند و موعظت کی کسی کتاب سے بھی ممکن نہ تھا۔ ◇◇

گوہر کو صدف میں آبرو دیتا ہے
بندے کو بغیر جستجو دیتا ہے
انسان کو رزق گل کو بو سنگ کو لعل
جو کچھ دیتا ہے جس کو تو دیتا ہے

ڈاکٹر نکہت جہاں
ایسوسی ایٹ پروفیسر اردو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد
9346258763

انیسؔ کے مرثیوں میں نسوانی کردار

کربلا ابتلا و مصائب کی داستان ہے، سفر کی صعوبتوں موسم کی شدت بھوک اور پیاس کی روح فرسا تکلیفوں سے نبرد آزما ہوتے اور عزیزوں کے قتل ہوتے، لٹنے، برباد ہونے اور اسیر ہونے کے لامتناہی واردات کا سلسلہ ہے ان تمام مراحل سے امام حسینؑ اور ان کے رفقاء اور اہل حرم کو گزرنا پڑا۔ انیس نے کربلا کے تاریخی واقعہ کو مثالی کرداروں کے اخلاقی فضائل و تفوق اور انسانی نفسیات کی گوناگوں کیفیتوں کی مرقع کشی کے لیے استعمال کیا۔

واقعہ کربلا میں شہادت امام حسین کے بعد خاندان رسالت کی خواتین کا جہاد شروع ہوا۔ یہی وہ خواتین تھیں جن کے سروں سے چادریں چھین لی گئی تھیں۔ ان کے سامنے یتیم بچوں کو طمانچے مارے گئے تھے۔ بیمار کربلا سید سجادؑ کو درے لگائے گئے تھے۔ اسباب لوٹ کر خیموں کو آگ لگادی گئی تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ انھیں کربلا سے شام تک کا سفر اس طرح طے کرنا تھا کہ اپنے پیاروں کے سر نیزوں پر بلند ہیں اور امام وقت سید سجادؑ پیادہ پا تپتی ریت اور کانٹوں پر چل رہے تھے لیکن ان خواتین نے ہمت نہیں ہاری۔ ان کے پائے استقلال میں جنبش نہیں ہوئی۔ انھوں نے دشمن کے ہر وار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا راستے میں ہر مقام پر جناب زینبؑ و کلثومؑ نے پُر درد خطبے دئے اور لوگوں کو حق سے آگاہ کیا۔ ان خواتین نے لوگوں کو بتایا کہ یہ سر جو نیزوں پر بلند ہیں حسینؑ اور ان کے اصحاب اور اقربا کے سر ہیں اور یہ خواتین جو سر برہنہ ایک ہی رسی میں بندھی ہوئی ہیں یہ کوئی اور نہیں بلکہ خاندان رسالت کی خواتین ہیں۔ اس طرح یہ خواتین جس میں ۵۵ سالہ بی بی زینبؑ سے کر ۵ سالہ بی بی سکینہ شامل تھیں۔ دنیا کو امام حسین کے مقصد سے روشناس کرایا اور ان کی تعلیمات کی تبلیغ کا کام کیا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورتیں کم حوصلہ ہوتی ہیں وہ حالات کے زیر اثر بہت جلد ہمت ہار جاتی ہیں لیکن واقعہ کربلا میں ہر خاتون باحوصلہ اور باہمت نظر آتی ہے۔ ان میں خاندان رسالت کے ساتھ عام خواتین بھی تھیں۔ ان خواتین نے کربلا میں جو کچھ مصائب جھیلے وہ کسی مجبوری یا بے بسی کی وجہ سے نہیں وہ چاہتیں تو امام نے شب عاشور جب اپنے رفیقوں اور عزیزوں سے بیعت اٹھالی تھی اور اصرار سے کہا تھا کہ جو بھی جانا چاہتا ہے بخوشی چلا جائے۔ اس وقت یہ خواتین اپنے بیٹوں یا شوہروں کو مجبور کر کے وہاں سے لے جاسکتی تھیں کیونکہ اپنے پیاروں کی موت سامنے دیکھ کر عورت سب کچھ بھلا دیتی ہے مگر ان حق پرست اور ایمان پر جان دینے والی خواتین نے اپنی جیتی ہستیوں کی قربانی دے کر اپنی شخصیت کی مضبوطی اور سیرت کی بلندی کا بے نظیر مظاہرہ کیا۔

مرثیوں میں ہمیں جو نسوانی کردار ملتے ہیں ان میں جناب ام البنین جناب۔ ام فروا جناب شہربانو، شہزادی فاطمہ کبریٰ

شہزادی فاطمہ صغریٰ اور بی بی سکینہ کے کردار اہم ہیں۔ ان تمام کرداروں سے مذہبی عقیدت کے جذبات وابستہ ہیں اس کے علاوہ یہ تمام کردار عالم انسانیت کے لیے بھی مشعل راہ ہیں انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان کرداروں کو ہندوستانی ماحول میں یہاں کی تہذیب کے جیتے جاگتے مرقعوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

ان آفاقی کرداروں کو سمجھنے کے لیے ہمارے اذہان کو شب عاشور کی اس تاریکی میں جانا ہوگا جہاں ان کی محبت، ہمت، وفا اور ثابت قدمی کی روشنی خیموں کے روزنوں سے چھن کر سارے عالم کو منور کر رہی تھی کہیں کوئی اپنے بچوں کو ہتھیار سجا کر کس طرح جنگ کی جاتی ہے۔ میدان جہاد میں کس طرح جوہر دکھائے جاتے ہیں سمجھا رہی تھیں تو کہیں بھائیوں اور شوہروں کو حق کی راہ میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کی جا رہی تھی۔ کہیں آہ و زاری و مناجات تھی تو کہیں سلطان کربلا کی سلامتی کے لیے دست دعا بلند تھے۔

انیس کے مرثیوں میں عورت کا تصور منفرد ہے نسوانی کرداروں کی سیرت اور اعلیٰ کردار کے نمونے اگرچہ خاندان رسالت کی خواتین کے روپ میں ملتے ہیں لیکن ان سے ایک عام عورت کی نفسیات بھی سامنے آتی ہے۔ انیس کا کمال یہ ہے کہ وہ جس کردار کو پیش کرتے ہیں اس کی شخصیت اور رتبے کا خیال رکھتے ہیں۔ اس کی جذباتی کیفیت، نفسیاتی کیفیت، بات چیت کا انداز، دکھ دکھاؤ ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ اس کردار کا ہونا چاہیے جس سے اس کردار کی انفرادیت سامنے آتی ہے۔

یہاں سب سے پہلے جس ہستی کا تذکرہ ہوگا وہ ہے سیدہ عالمیان خاتون جنت ہیں۔ آپ کے عزّ و شرف کا کیا کہنا لخت جگر محمدؐ، زوجہ علی مشکل کشا اور حسنینؑ کی ماں۔ باپ بھی معصوم، شوہر بھی معصوم اور بچے بھی معصوم اور پھر آیۂ تطہیر تعارف کروا رہی ہے۔ فاطمہؑ کے باپ ہیں۔ یہ فاطمہؑ کے شوہر ہیں اور فاطمہؑ کے بچے ہیں۔ یہ شرف سوائے سیدہ کونین کے اور کسی کو نہیں ملا ہے۔ کہ خدا آپ کی ذات سے پہچان کروا رہا ہے جس کی تعظیم کے لیے پیغمبر اٹھ کھڑے ہوں۔ آپ کی عظمت انیس نے اس طرح بیان کی ہے۔

مہر سپہر عزّ و شرافت ہے فاطمہ
شرح کتاب عصمت و عفت ہے فاطمہ
مفتاح باب گلشن جنت ہے فاطمہ
نور خدا و آیۂ رحمت ہے فاطمہ
رتبے میں وہ زنان دو عالم کا فخر ہے
حوا کا افتخار ہے مریم کا فخر ہے

اب زہد و فقر فاطمہ کا کچھ سناؤں حال
فاقے پہ فاقے کرتی تھی اکثر وہ پُر ملال
لائے جو مزد آب کشی شیر ذوالجلال
تب جو منگا کے پیستی تھی وہ نکو خصال
دولت سے کچھ غرض تھی نہ حشمت سے کام تھا
آٹھوں پہر خدا کی عبادت سے کام تھا

انیس نے جناب فاطمۃ الزہرا کے ذکر میں ان کی عصمت و عفت کے ساتھ ساتھ ان کی محنت کش زندگی اور عسرت سے ان کے کردار کے مثبت پہلوؤں کو ابھارنے کا کام کیا ہے۔

نسوانی کرداروں میں جناب ام البنین کے کردار کو انیس نے ایک خاص انداز سے پیش کیا ہے۔ ام البنین حضرت عباسؑ کی والدہ ہیں۔ وہ ایک عالی ہمت خاتون ہیں۔ خاندان رسول سے گہری محبت و عقیدت رکھتی ہیں واقعہ کربلا میں ام البنین کے چار بیٹوں نے شہادت پائی جن میں سب سے بڑے حضرت عباس تھے۔ یہ کردار اس لیے بھی اہم ہے کہ آپ نے اپنے بیٹوں کی پرورش اس انداز سے کی تھی کہ وہ امام عالی مقام کو ہمیشہ اپنا سمجھیں اور ان پر اپنی جانیں قربان دیں۔

انیس نے اپنے مرثیے "عباس علی شیر نیستان نجف ہیں" کی ابتدا ہی میں ام البنین کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔

جب خلد کو دنیا سے ہوئیں فاطمہ رہگیر
یا ور تھی زلبس مادر عباسؑ کی تقدیر
جس روز سے آئی تھیں ید اللہ کے گھر میں
رہتی تھی شب و روز تمنائے پسر میں

دعوائے کنیزی تھا اسے بنت نبی سے
تھا انس بہت آل رسولؐ عربی سے
مطلب نہ تھا اپنی اسے حاجت طلبی سے
آگاہ تھی شبیر کی عالی نسبی سے

مصروف وہ تھفہ سے بھی خدمت میں سوا تھی
سو جان سے فرزندوں پہ زہرا کے فدا تھی

خاندانی محبت اور آپس کے رشتوں کا پاس تہذیب کی ابتدائی شرط ہے انیس کے ان بندوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک غیر معمولی صفات کی خاتون ہیں جنھیں خاتون جنت سے عقیدت ہے تو ان کے بچوں سے گہری محبت۔ وہ گھر کی تمام ذ۔ داری بحسن و خوبی انجام دے رہی ہیں۔ ان کے دل میں یہ تمنا تھی کہ ان کے بھی کوئی بیٹا ہو جو دنیا میں کچھ ایسا کام کرے جس سے شہرت ملے اور وہ اسے فرزند پیمبر حسینؑ پہ قربان کر سکیں۔

جب مصحف ناطق سے سنی اس نے یہ تقریر
کی حق سے مناجات کہ اے مالک تقدیر
گر دے تو مجھے ایک پسر صاحب توقیر
میں اس کو خوشی ہو کے کروں فدیۂ شبیرؑ
ممتاز غلاموں میں جو ضرغام ہو میرا
زہراؑ کی کنیزوں میں بڑا نام ہو میرا

آپ کی دعا قبول ہوتی ہے اور حضرت عباسؑ کی ولادت ہوتی ہے۔ امیر المومنین نے آپ کا نام عباس رکھا حضرت عباس کے بعد جناب ام البنین کو تین فرزند اور تولد ہوئے چار بیٹوں کی ماں ہونے کی وجہ سے آپ کا لقب ام البنین پڑا۔

یہاں ایسا لگتا ہے کہ ایک ہندوستانی خاتون ہے جو اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر رہی ہے۔ ماں نے اپنے بیٹے کے دل میں امام عالی مقام کی محبت اس قدر بھر دی تھی کہ تاریخ شاہد ہے حضرت عباس نے تاحیات امام حسین کو اپنا آقا ہی سمجھا حضرت ام البنین نے اپنے فرزندوں کی ایسی تربیت کی کہ دنیا کی تاریخ الفت و وفا میں ان کا نام لافانی ہو گیا حضرت عباس نے میدان کربلا میں اپنی وفاداری کے جس طرح جوہر دکھائے وہ لاثانی ہیں یہ ماں کی تربیت ہی کا کمال تھا کہ دنیا آج حضرت عباس سے وفاداری کا درس لیتی ہے جب بھی کہیں وفاداری کا ذکر ہوتا ہے وہاں عباس کا نام آنا ضروری ہے۔

مرثیوں میں ایک اور مقام پر جناب ام البنین کا تذکرہ ملتا ہے کربلا میں شہادت کے تقریباً ایک سال بعد قید و بند کی مصیبتیں برداشت کر کے جب اہل حرم کا قافلہ مدینے واپس آتا ہے تو سارے مدینے میں رونے کا کہرام ہے مائیں تڑپ رہی ہیں بہنیں پچھاڑیں کھا رہی ہیں جناب صغریٰ تڑپ تڑپ کر رو رہی ہیں لیکن ایسے میں جناب ام البنین کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ کہیں ان کے فرزندوں نے بھائی کی نصرت میں دیر تو نہیں کی۔ کوئی کوتاہی تو نہیں کی سب سے زیادہ فکر حضرت عباس کی ہے کہ کہیں ان کے لاڈلے بیٹے نے ان کی محبت اور وفا پہ آنچ تو نہیں آنے دی۔ بیبیوں سے اپنے بیٹوں کی شہادت کا حال سن کر بے اختیاری کے عالم میں پوچھتی ہیں۔

میں سن چکی اتنا تو کہ مارا گیا عباس
مرنا تو یقیں ہو گیا لیکن ہے یہ وسواس
کس وقت تلک جنگ میں بھائی کے رہا پاس
پیچ کہہ دو جو گذری ہے تو ٹوٹو نہ مری آس
کچھ قاسم و اکبر پہ تو آفت نہیں دیکھی
شبیر کی خیمے سے تو رخصت نہیں دیکھی

جناب ام کلثوم جو حضرت عباسؑ کو نسل اولاد کے چاہتی تھیں۔ حضرت عباس اور ان کے بھائیوں کی جاں نثاری اور بہادری کے کارنامے سناتی ہیں۔
اور کہتی ہیں۔

اس خوبی سے مارا گیا فرزند تمہارا
دودھ اس کو نہ بخشا ہے تو اب بخشو خدارا
پھر فاطمہ زہرا کا وہ کیوں کر نہ ہو پیارا
واللہ سر اس نے قدم شاہ پہ وارا

دکھلائی وہ جاں بازی تشنہ دہن کو
راضی کیا حیدر کو محمد کو حسن کو

یہ سن کر ام البنین سجدۂ شکر بجا لاتی ہیں۔

یہ سنتے ہی بس مادر عباس دلاور
قبلہ کی طرف گر پڑی سجدہ کو زمیں پر
جب کر چکی سجدہ تو وہ کہنے لگی رو کر
سب مل کے کرو ماتم فرزند پیمبر

یہ جو کہا غل ہونے لگا سینہ زنی کا
اور ذکر تھا شبیر کی تشنہ دہنی کا

انیسؔ نے حضرت ام البنین کی کردار نگاری اتنی خوبی سے کی ہے کہ وہ مثالی ماں ہی نہیں بلکہ ایک مثالی خاتون کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

انیسؔ کا ایک مرثیہ ہے "فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے" اس میں امام حسینؑ مدینہ سے سفر کی تیاری کر رہے ہیں خاندان کے بیشتر افراد آپ کے ساتھ سفر میں شامل ہیں لیکن گھر میں ایک بیٹی فاطمہ صغریٰ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں جو ایک طویل عرصہ سے بیمار ہے۔ اس لیے امام حسینؑ جانتے ہیں کہ وہ اس طویل سفر کی صعوبتیں برداشت نہیں کر سکتیں چنانچہ اپنی اس بیمار چہیتی بیٹی کو اپنی نانی ام سلمیٰ اور ماں ام البنین کے حوالے کر کے سفر پر روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ فاطمہ صغریٰ اپنے خاندان کے ساتھ رہنا چاہتی ہیں ان سے دور نہیں ہونا چاہتیں۔ وہ ایک ایک سے ساتھ چلنے کی التجا کرتی ہیں۔ پہلے امام حسینؑ سے التجا کرتے ہوئے فرماتی ہیں اور پھر کہتی ہیں۔

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بے چین ہوں مادر
ہر صبح میں پی لوں کی دوا آپ بنا کر
دن بھر مری گودی میں رہیں گے علی اصغر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر

میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو

ایک بیمار بچی کے دل کی شاید ہی کوئی کیفیت ہو جو انیس نے اس مرثیہ میں بیان نہ کی ہو۔ ساتھ لے جانے کی معصوم سی تاویلیں، بے بسی، دکھ، رنج اور وفور جذبات کی کیسی عجیب آمیزش ہے اور جب امام حسینؑ بیٹی کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور ساتھ نہ لے جانے کی وجہ بتاتے ہیں تو جناب صغریٰ ناراضگی سے کہتی ہیں۔

صغریٰ نے کہا کوئی کسی کا نہیں زنہار
سب کی یہی مرضی ہے کہ مر جائے یہ بیمار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہے نہ وہ پیار
اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب کے ہیں غمخوار

بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا
سچ ہے کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

یہ الفاظ سن کر ماں کو ضبط کا یارا نہیں رہتا اور وہ انتہائی پیار بھرے لہجہ میں بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغریٰ ترے قربان
گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہبان
صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن

انیس کے مرثیوں میں انسانی برتاؤ اور جذباتی ردّ عمل کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں۔ غم، خوشی، شجاعت کے سادہ جذبات ملیں گے جو دوسرے شعراء کے یہاں بھی کامیابی کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں لیکن جب ان جذبات میں مختلف احساسات کی کشمکش رونما ہوتی ہے یعنی کہیں محبت اور حیا۔ کہیں غصہ شجاعت اور پاس ادب، کہیں فرض و محبت آپس میں دست و گریباں نظر آتے ہیں تو انیسؔ کی مہارت کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ان ملے جلے جذبات کی مجموعی تصویر وہ کتنی کامیابی سے

پیش کرتے ہیں۔

ام فروہ امام حسنؑ کی بیوی تھیں جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں انھیں اپنے بڑے بیٹے قاسم سے زیادہ محبت تھی روز عاشورہ انھوں نے امام حسینؑ پر اپنے دو فرزندوں کو قربان کیا انیسؔ کے مرثیوں میں ان کا کردار صحیح صحیح نظر آتا ہے۔ ان میں ایک ماں، چاہنے والی ساس، فرض شناس خاتون کی شان نظر آتی ہے انیسؔ نے ان کی شخصیت کے اس پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ بیٹے کی روح فرسا جدائی کے صدمے کے ساتھ ساتھ ان کو شدت سے اپنی بہو کی مصیبت کا احساس ہے مگر یہ احساس بھی انھیں اس فیصلہ سے ہٹا نہیں سکتا جو بیٹے کو قربان کرنے کے لیے کر چکی تھیں۔ انیسؔ دکھاتے ہیں کہ خاندان نبوت کی سبھی خواتین کو اپنی عزت و وقار کا بڑا پاس تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بڑھ کر ایثار کرنا چاہتی تھیں۔ روز عاشورہ جب حق و باطل کا بازار گرم ہوا سب رفیق، عزیز و انصار شہادت پا چکے اب صرف تین نوجوان باقی رہ گئے۔ عباسؑ علی اکبر اور قاسم۔ اس وقت ام فروہ کی حالت کو انیسؔ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

مل مل کے ہاتھ کہتی تھی دل سے کہ ہے غضب
ہم شکل مصطفےٰ کہیں مرنے نہ جائیں اب
اولاد اپنی آج کے دن گر بچاؤں گی
منہ فاطمہ کو حشر کے دن کیا میں دکھاؤں گی

دل میں یہ سوچتی ہوئی اٹھی وہ خوش خصال
قاسم کو اپنے پاس بلایا بصد ملال
رو کر کہا کہ اے حسن مجتبیٰ کے لال
کچھ اس ضعیف ماں کی بھی عزت کا ہے خیال

جاری ہیں اشک خوں میری چشم پر آب سے
زینب کے آگے جا نہیں سکتی حجاب سے

زینب کے کمسن بیٹے شہید ہو چکے اور میرا جوان بیٹا ابھی زندہ ہے یہ احساس اس غیرت دار خاتون کے لیے بڑا تکلیف دہ ہے۔

گھر لٹ رہا ہے فاطمہ زہرا کا ہائے ہائے
دشمن وہ دوست ہے جو نہ اس وقت کام آئے
غیروں نے یاں حسین کے قدموں پہ سر کٹائے
کیا قہر ہے کہ بھائی کا جایا نہ مرنے پائے

گھیرا ہے بے وطن کو عدو کی سپاہ نے
منہ دیکھنے کو کیا تمھیں پالا ہے شاہ نے

یہاں وہ ماں ہے جس نے اپنی ممتا کو کچل ڈالا ہے آرزوؤں اور تمناؤں کو خاک میں ملا دیا ہے بیٹے کو مرنے کی صرف اجازت ہی نہیں دے رہی ہے بلکہ اکسا رہی ہے کہ موت کو لبیک کہو اور چچا کا حق محبت ادا کرو حق پر جان قربان کر دو۔ دل میں ڈر رہی ہے کہ جوانی کی عمر ہے کل ہی بیاہ ہوا ہے ایسا نہ ہو عزم کمزور پڑ جائے علی اکبرؑ سے پہلے شہید ہونے کی ترغیب دیتی ہیں اور آخر میں یہ کہ اگر ایسا نہ ہوا تو قیامت میں ہم تم رسول اکرمؐ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ باپ کی وصیت یاد دلائی جاتی ہے۔ بہادری کو للکارا جاتا ہے۔

جو مرد ہیں وہ دیتے ہیں مردانگی کی داد
کچھ اپنے باپ کی بھی وصیت ہے تم کو یاد
جلدی دلہن سے مل کے سدھارو پئے جہاد
قربان ہو چچا پہ یہی ماں کی ہے مراد

بیاہا تمھیں بر آئی ہر اک آرزو مری
اب وہ کرو کہ جس میں رہے آبرو مری

آخری شعر میں حسرت و یاس کس انداز میں سامنے آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بیٹے کو اپنی طرف سے بے فکر کیا جا رہا ہے۔ حضرت قاسمؑ تو پہلے سے ہی جنگ کے لیے تیار تھے۔ امام حسینؑ اجازت نہ دینے کی وجہ سے مجبور تھے۔ حضرت قاسمؑ دلہن سے رخصت ہوتے ہیں۔ اب اس بدنصیب ماں کا تصور کیجیے کہ انیسؔ نے دو بندوں میں ممتا کے جذبات کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔

فرما کے الوداع اٹھا دلبر حسن
برہم ہوئی وہ بزم وہ صحبت وہ انجمن

غل پڑ گیا کہ لٹ گئی اک رات کی دلہن
اس وقت سب سے دولہا کی ماں کا یہ تھا سخن

جاتی ہے اب برات مرے نونہال کی
رخصت ہے بیبیو زنِ بیوہ کی لال کی

وفورِ محبت اور جذبات میں یہ باتیں فطرت کے عین مطابق ہیں جب حضرت قاسم شہید ہو جاتے ہیں اور امام لاشں خیمہ میں لاتے ہیں تو اس ماں کے جذبات دیکھئے۔

چلائی ماں یہ گر کے تنِ پاش پاش پر
قاسم بنے اٹھو دلہن آئی ہے لاش پر

صدقے گئی بچی کو نہ ہووے کہیں ملال
دکھو دلہن کی پیٹھ پہ ہاتھ اے حسن کے لال
واری بس اب اٹھو کہ پریشاں ہے اس کا حال
کیسا یہ خواب ہے کہ دلہن کا نہیں خیال

کروٹ تو لو کہ ماں کے جگر کو قرار ہو
اس بچپنے کی نیند کے اماں نثار ہو

ماں کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ اپنوں سے چھوٹوں کے صدمے کی وجہ سے ممتا کی تڑپ تک چھپا لیتی ہے اور ان کی تسلی میں لگ جاتی ہے۔

فاطمہ کبریٰ امام حسینؑ کی نو عمر بیٹی ہیں جو کربلا میں ایک رات کے لیے دلہن بنیں اور صبح کو بیوہ ہو گئیں۔ فاطمہ کبریٰ کے کردار میں ہمیں عرب کی کوئی حوصلہ مند اور بہادر لڑکی نہیں ملتی بلکہ شرم و حیا کا پیکر رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑی ایک قدیم ہندوستانی لڑکی ملتی ہے۔ شادی کی رسومات، دولہا دلہن کی بات چیت، گھونگھٹ، دولہا کی لاش پر بین یہ سبھی ہندوستانی تہذیب ہیں۔

آخر جب حضرت قاسم جام شہادت نوش کرتے ہیں اور امام حسینؑ لاشۂ حضرت قاسم خیمہ میں لاتے ہیں تو اس وقت ایک رات کی بیاہی بیوہ کی زبان سے جو دلخراش بین نکلتے ہیں وہ فطری رنج و غم کے ترجمان ہیں۔

صاحب بتا تو دو تمہیں رونے میں کیا کہوں
بیکس کہوں کہ فدیۂ راہِ خدا کہوں
پیاسا کہوں شہید کہوں یا بنا کہوں
دولہا کہوں کہ قاسم گلگوں قبا کہوں

ماتم بھی یوں تو ہوتا ہے شادی بھی ہوتی ہے
اک شب کی رانڈ دولہا کو کیا کہہ کے روتی ہے

مرثیوں میں جہاں حضرت قاسمؑ اور جناب فاطمہؑ کبریٰ کا بیان ملتا ہے بقول صالحہ عابد حسین "یہ شادی و بیوگی، یہ وصال و فراق، یہ درد و الم پر اثر سہی مگر یہ داستان کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے موقعوں پر انیس جو جذبات اور احساسات دکھاتے ہیں ان میں ہمہ گیری ہے، آفاقیت ہے۔ یہاں تصنع اور آورد ہے۔ مقامی رنگ بھی اتنا غالب آ گیا ہے۔ کہ اس میں وہ گہرائی اور تاثیر پیدا نہیں ہوتی جو انیس کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔"

زوجۂ عباس کا کردار بھی انیس کے مرثیوں کا ایک خاص جزو ہے اس میں ایک سچی رفیقۂ حیات کی تمام خوبیاں موجود ہیں یعنی فطری نیکی اور شرافت، انسانیت اور نسوانیت کی آن بان اس کردار میں ملتے ہیں۔ انھیں اپنے شوہر اور ان کے خاندان پر فخر ہے۔ امام حسین سے گہری محبت اور ان کے بچوں سے دلی محبت ہے جناب زینبؑ ام کلثوم کا احترام کرتی ہیں اور ساتھ ہی امام حسین کے اس بلند مقصد سے واقف ہیں جس کی وجہ سے وہ کربلا میں آئے ہیں۔

انیس کے مرثیے "جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا" میں ہم اس کردار سے اس طرح روشناس ہوتے ہیں واقعہ یہ ہے کہ تین محرم کو امام حسینؑ کا قافلہ وارد کربلا ہوا! حضرت عباس ترائی کے قریب خیمے نصب کر رہے ہیں کہ یکایک شام کی فوجیں نمودار ہوتی ہیں اور انھیں نہر کے کنارے خیمے نصب کرنے سے روکتی ہیں۔ حضرت عباس کو جلال آ جاتا ہے اور وہ مقابلے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن امام حسینؑ انھیں سمجھا کر صحرا کربلا

میں خیمے نصب کرنے پر آمادہ کرتے ہیں بہنیں ان کی سلامتی سے واپسی پر شکر ادا کر رہی ہیں۔ اس موقع پر زوجۂ عباس کہتی ہیں۔

کہنے لگیں یہ زوجۂ عباس خوش بیان
غصہ میں ان کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
ہر بات میں ہے شیرِ الٰہی کی آن بان
یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں
یہ تو فقط حسینؑ کے صدقے میں جیتے ہیں

یہاں ایک ایسی خاتون کا تصور آتا ہے جو اپنے شوہر اور خسر پر فخر کر رہی ہے اور دونوں بھائیوں کی لاثانی محبت کا اظہار اس طرح ہوتا ہے " یہ تو فقط حسین کے صدقے میں جیتے ہیں "

ایک اور موقع پر۔ موقع یہ ہے کہ علم کا دیا جانا ہر بہادر کے دل میں یہ سوال ہے کہ علم کسے دیا جائے گا۔ جناب عون و محمد اپنے کو علم کا حق دار سمجھتے ہیں اس لیے کہ وہ محمد و علی کے نواسے اور جعفر طیار کے پوتے ہیں زوجہ عباس کی یہ تمنا ہے کہ یہ اعزاز ان کے شوہر حضرت عباس کو ملے۔ اس موقع کو انیس نے اس طرح بیان کیا ہے۔

عباس کی زوجہ یہ بیاں کرتی تھی رو رو
کیوں صاحبو دیکھیں یہ علم ملتا ہے کس کو
زینب کے پسر عمر میں چھوٹے ہیں ابھی تو
ہم شکل نبی کے ہیں علی اکبر خوش خو
خادم شہ دیں کے ہیں تو عباس علی ہیں
اس عہدے کے لائق جو اگر ہیں تو وہی ہیں

انیس اپنے دور کے شرفاء کے نسوانی زندگی کے ہر پیچ و خم سے واقف تھے۔ یہاں ایک ایسی خاتون کی شبیہ ابھرتی ہے جو مدبر و دانشور ہے جو تجزیہ کر رہی ہے اور اپنی خواہش کے پورا ہونے کے لیے دلائل کی روشنی میں سوچ رہی ہے۔ زینبؑ کے بیٹے کم سن ہیں علی اکبر کا رتبہ تو بہت بلند ہے کیونکہ وہ ہم شکل رسولؐ عربی ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کی جان کو خطرے میں ڈالنے کی ذمہ داری نہیں ملنی چاہئے اب امام حسین کے خادم عباس ہی تو رہ جاتے ہیں اور ان ہی کو یہ عہدہ ملنا چاہئے۔ اور جب یہ خوش خبری ملتی ہے کہ علم کا عہدہ حضرت عباسؑ کو ملا ہے تو مسرت اور شکر گزاری کے ملے جلے احساسات کو انیس نے اس طرح پیش کیا ہے۔

مژدہ یہ سنا زوجۂ عباس نے جس دم
منہ سرخ خوشی سے ہوا تشویش ہوئی کم
بولی بڑی فکر تھی پر اب نہیں کچھ غم
قربان تمہارے میں شہنشاہ دو عالم
مخدومۂ کونین کے جانی کے تصدق
مولا میں تری تشنہ دہانی کے تصدق

امام حسین کی سب سے چھوٹی صاحبزادی بی بی سکینہ ہیں جن کا سن چار سال ہے جو باپ اور چچا کی چہیتی، بہنوں اور بھائیوں کی پیاری اور ماں اور پھوپھیوں کی لاڈلی ہیں وہ تمام خوبیاں پائی ہیں جو فاطمۃ الزہرا کی پوتی اور امام حسین کی بیٹی کو مل سکتی تھیں۔ مرثیوں میں بی بی سکینہ کا کردار دو طرح سے ملتا ہے۔ ابتدا میں ایک انتہائی چہیتی اور لاڈلی بیٹی جو کہ اپنے چچا اور باپ سے اپنی ضدیں منوالیتی ہے لیکن جیسے ہی مصائب، غم و آلام بڑھتے گئے آپ کا کردار ایک صابرہ مظلوم اور انتہائی سنجیدہ بچی کی حیثیت سے ابھرتا ہے۔

کم سن بچوں کی نفسیات ہوتی ہے کہ وہ ہر پل اپنا مزاج بدلتے رہتے ہیں ویسے ہی انیس نے بی بی سکینہ کو اپنے مرثیوں میں پیش کیا ہے۔ کبھی وہ بھولی بھالی باتیں کرتی ہیں۔ کبھی باپ اور چچا کی شہادت پر گریہ کرتی ہیں تو کبھی اپنی ماں اور پھوپھی سے ضد کرتی ہیں کہ بابا کہاں ہیں انھیں بلا لاؤ۔

مدینے سے سفر کا آغاز ہوتا ہے تمام بچے اور خواتین اونٹوں کی محملوں میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ گرمی اور پیاس سے سب بے حال ہیں خاص طور پر بی بی سکینہ زیادہ بےچین ہیں

چچا عباس کی لاڈلی ہیں اسی لیے پریشانی کا اظہار ان سے ہو رہا ہے ؎

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھا مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کہیں خیمے کریں بپا
ٹھنڈی ہوائیں لے کے چلو تم پہ میں فدا

سایا کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ چاہ ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت تباہ ہے

آخری مصرعہ میں بچوں کا تسکایتی انداز کتنی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ بہرحال جب قافلۂ حسینؑ کربلا پہنچتا ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سا تویں محرم سے پانی بند ہو جاتا ہے خیمہ حسینی میں بچے پیاس کی شدت سے نڈھال ہیں۔ دسویں محرم کی صبح حضرت عباسؑ کو علم دیا جاتا ہے اعزّا و اقربا حضرت عباس کو مبارکباد دیتے ہیں جب بی بی سکینہ یہ سنتی ہیں کہ چچا کو علمدار کا عہدہ ملا ہے تو وہ خوش ہو کے مبارکباد دیتی ہیں ؎

ناگاہ آ کے بالی سکینہ نے یہ کہا
کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا
عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا
لوگو مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا

شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی

مرثیے کا یہ بند معصومیت اور حقیقت کا آئینہ دار ہے حضرت عباس اپنی چہیتی بھتیجی کو بلاتے ہیں

عباس مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ
عمو نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ

یہاں بی بی سکینہ کا جواب ایک کمسن بچی کی حالت کے عین مطابق ہے ؎

بولی لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ
اب تو علم ملا تمہیں پانی ہمیں پلاؤ

حضرت عباسؑ مشکیزہ لے کر جاتے ہیں جنگ کا میدان گرم ہوتا ہے۔ حضرت عباس واپس نہیں آتے تو بی بی سکینہ بے چین ہو اٹھتی ہیں کم سن ہیں مگر جانتی ہیں کہ صبح سے جو بھی میدان کارزار میں گیا زندہ واپس نہیں آیا۔ چچا کی فکر ہو رہی ہے کہ میں نے پانی لانے کے لیے بھیجا تھا چچا ابھی تک واپس نہیں آئے۔ معصومیت سے سوچتی ہیں کہ اگر چچا مشک بھر کر جلدی خیمہ میں واپس آجائیں تو ان کی جان بچ جائے گی۔

جلدی خدا کے واسطے دریا پہ جائیے
قربان جاؤں بھر کے مرے مشک لائیے
پھنکتا ہے سینہ آگ جگر کی بجھائیے
اچھے مرے چچا مجھے پانی پلائیے

کانٹے مری زبان کے اب آ کے دیکھئے
رونے کو شاہ بیکس و تنہا کو دیکھئے

اور پھر بیقرار ہو کر امام حسینؑ سے پوچھتی ہیں۔

حضرت سے پوچھتی ہیں سکینہ بچشم تر
میرے چچا کب آئیں گے یا شاہ بحر و بر

اور جب حضرت عباسؑ شہید ہو جاتے ہیں اور امام حسینؑ لاش عباس کی جانب جاتے ہیں تو آپ کے پیچھے بی بی سکینہ بھی جاتی ہیں اس وقت کی تصویر کشی ملاحظہ کیجئے ؎

زلفیں تو ہیں بکھری ہوئی ٹوپی نہیں سر پہ
جو روکتا ہے کہتی ہے گھبرا کے وہ مضطر
لوگو تمہیں کچھ میرے بہشتی کی خبر ہے
بتلا دو مجھے بہر خدا نہر کدھر ہے

امام بچی کو سمجھاتے ہیں وہ صرف اتنا سمجھ پاتی ہیں کہ بابا مصیبت میں ہیں اس لیے سوچتی ہیں کہ اگر یہاں سے چلے جائیں تو مصیبت دور ہو جائے گی۔

سن کر مصیبت پدر بے کس و حزیں
بولی بلائیں باپ کی لے کر وہ مہ جبیں

نکلو بلا کے بن سے کہیں یا امام دیں
آقا سوا حضور کے میرا کوئی نہیں
صدقے گئی مدینے چلو یا نجف چلو
للّٰہ ساتھ لے لو مجھے جس طرف چلو

امام حسینؑ بیٹی کی باتیں سن کر اسے آنے والے وقت کی سنگینی سے واقف کرانا ضروری سمجھتے ہیں ؎

جاتا ہے دور شب کو جو آتا نہ ہو ادھر
ضد کر کے رو ئیو نہ ہمیں چاہتی ہو گر
پہلے پہل ہے آج شب فرقت پدر
سو رہیو ماں کی چھاتی پہ غربت سے رکھ کے سر
راحت کے دن گذر گئے اب فصل اور ہے
اب یوں بسر کرو جو یتیموں کا طور ہے

بی بی سکینہ نے پہلے کبھی یتیمی کا نام نہیں سنا تھا اس کے معنی کیا جانتیں ؎

ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولی وہ تشنہ کام
بتلائیے مجھے کہ یتیمی ہے کس کا نام
آنکھوں سے خوں بہا کے یہ کہنے لگے امام
کھل جائے گا یہ درد والم تم پہ تا بہ شام
بی بی نہ پوچھو کچھ یہ مصیبت عظیم ہے
مر جائے جس کا باپ وہ بچہ یتیم ہے

جیسے جیسے روز عاشور گزر تا رہا معصوم سکینہ نئی نئی مصیبتوں سے آگاہ ہوتی گئیں۔ امام حسین ہتھیار سجا کر عزیزوں دوستوں اور ساتھیوں کو ساتھ لے کر گئے پھر بہادروں کی موت کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ اس کے بعد عزیزوں کی لاشیں۔ چچا نے شہادت پائی۔ قاسم نے جان گنوائی۔ پھوپھی کے بیٹے شہید ہوئے۔ جوان بھائی کی لاش آئی یہاں تک کہ چھوٹا بھائی چھ مہینے کے علی اصغر کا گلا چھدا۔ یہ چار سالہ ننھی بچی سب دیکھتی رہی۔ آخر میں اپنے بابا امام حسین کو بھی شہید ہوتا دیکھا۔ نالہ وزاری کرتے ہوئے شمر سے التجا کی۔

للّٰہ شمر سبط پیمبر کو چھوڑ دے
سید کو بے گناہ کو مضطر کو چھوڑ دے
حاجی کو بے وطن کو مسافر کو چھوڑ دے
مجھ کو تو ذبح کر مرے سرور کو چھوڑ دے
لپٹوں گلے سے میں پدر ناتوان کے
چھینے سے تو سرک تو مرے بابا جان کے

یہیں انتہا نہیں ہوتی بلکہ شام غریباں کانوں سے گوہر اس طرح اتارے گئے کہ کان زخمی ہو گئے۔ طمانچے لگائے گئے اور پھر بی بی سکینہ اپنی ماں اور پھوپھیوں کے ساتھ اسیر ہوئیں بارہ اسیروں کو ایک ہی رسن میں باندھا گیا جس میں بی بی سکینہ سب سے کم سن تھیں۔ اور جب ان اسیروں کو زندان شام میں قید کر دیا جاتا ہے جب زوجۂ یزید ہند زندان میں آتی ہے اور سر سید الشہداء منگواتی ہے تو تمام بیبیاں نالہ و فریاد کرنے لگتی ہیں۔ شہزادی سکینہ کو جیسے ہی امام حسینؑ کا سر اقدس نظر آتا ہے دوڑ کر سر اقدس سے لپٹ جاتی ہیں۔

منہ رکھ کے منہ پہ شہ کے جو روئی وہ دلفگار
صدمہ ہوا نکلنے لگی تن سے جان زار

تمام ظلم وستم اور قید کی مصیبتیں سہ کر بھی معصوم بچی کو یہ یقین تھا کہ بابا سے ملاقات ضرور ہوگی بابا کے سر سے مل کر تمام دکھ دور ہو گئے۔

جنبش ہوئی لبوں کو بس اور دم نکل گیا

شہزادی سکینہ نہ صرف انیس کے لیے بلکہ عام لوگوں کے لیے بھی محبوب اور محترم رہیں۔ انیس نے اس کردار کو پیش کرنے میں خون جگر کو صرف کر کے معجزۂ فن دکھایا ہے۔

شہر بانو امام حسین کی پہلی زوجہ اور شاہ ایران کی بیٹی تھیں۔ فتح ایران کے بعد شہر بانو کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ قیدی بنا کر مدینہ لایا گیا جہاں حضرت علیؑ نے شہزادی کو آزاد کر کے امام حسینؑ سے شادی کرا دی۔ میر انیسؔ شہر بانو کی زبانی اس خواب کو بیان کرتے ہیں جس میں حضرت فاطمۃ الزہرا

نے انھیں اپنی بہو بنایا تھا۔ انیسؔ نے ایک مرثیے میں امام حسین اور جناب شہر بانو کی گفتگو کے درمیان اس واقعہ کا ذکر کیا ہے جناب شہر بانو امام حسین سے کہہ رہی ہیں ؎

جب خواب میں آئی تھیں میرے آپ کی مادر
کس پیار سے چھاتی سے لگایا تھا مرا سر
ارشاد کیا تھا یہ دلہن مجھ کو بنا کر
میں فاطمہ ہوں اور ترا دولہا مرا دلبر
لائی ہوں کمائی کو شہ عقدہ کشا کی
لے دیکھ لے صورت تو مرے ماہ لقا کی
لونڈی نے جو گردن سر زانو سے اٹھائی
حضرت کی یہی چاند سی صورت نظر آئی
اس حسنؑ کے نظارے کی میں تاب نہ لائی
پر بے کسی ویاس سی تھی چہرے پہ چھائی
قطرے کئی رخساروں پہ آنکھوں سے ڈھل آئے
حضرت تو ہنسے اور مرے آنسو نکل آئے

امام حسینؑ اور شہر بانو میں گھر کی محبت و رفاقت تھی جناب شہر بانو کو امام حسین کی عظمت کا احساس بھی تھا جناب شہر بانو کے کردار میں ایک وفا شعار بیوی، جان نثار ماں اور ایک حق پرست اور ایثار پرست دوسروں کے جذبات و احساسات کا احترام کرنے والی خاتون کا کردار نظر آتا ہے۔

جناب شہر بانو کا بھرپور کردار روز عاشورہ سامنے آتا ہے جب اس بی بی نے راہ خدا میں اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ انیسؔ نے مختلف مرثیوں میں ان واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے کبھی وہ اپنی نو بیاہی بیٹی کبریٰ کو بیوہ ہونے پر سنبھالتی نظر آتی ہیں تو کبھی ام فروہ کو بیٹے کا پرسا دیتی ہیں۔ کہیں جناب زینبؑ سے محبت و عقیدت کا اظہار کرتی ہیں تو کہیں اپنے کڑیل جوان بیٹے کی دلداری کرتی ہوئی ملتی ہیں اور کبھی اپنے شیر خوار کو میدان جنگ میں بھیجنے پر سر تسلیم خم کرتی نظر آتی رہیں۔ ان کی ہر کیفیت پر عورت کے نازک حساس ماتا کا دل جلتا ہے جوان بیٹے کی شہادت پر۔ شیر خوار چھ مہینے کے اصغر کی موت کی خبر سن کر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے مگر شکوہ زبان پر نہیں آتا۔ امام کی سلامتی سب پر مقدّم ہے

موقع ہے روز عاشورہ کا جب امام حسینؑ کے سب جان نثار اپنی جانیں آقا پر سے قربان کر چکے اب صرف علی اکبر باقی ہیں جو صبح سے اجازت مانگ رہے ہیں۔ امام حسینؑ انھیں جنگ کی اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ماں اور پھوپھی سے اجازت لے لو۔ اگر وہ اجازت دیدیں تو شوق سے میدان میں چلے جانا۔ علی اکبر خیمے میں ماں اور پھوپی سے اجازت طلب کرنے آتے ہیں جانتے ہیں کہ یہ دونوں اجازت دے دیں گی کیونکہ ان دونوں کو ہی امام حسین سے الفت ہے پھر بھی دل میں خوف ہے کہ ماں کی ماتا نہ مانے تو کیا ہوگا۔

ماں کے دل پر کیا بیت رہی ہے مگر اس کے باوجود یہ حوصلہ ملاحظہ کیجئے کہ بیٹے کو مرنے کی اجازت دے رہی ہیں پھر خیال آتا ہے کہ علی اکبر کو تو پھوپی زینب نے پالا ہے اسی لیے مجھ سے زیادہ حق ان ہی کا ہے بیٹے سے کہتی ہیں ؎

رخصت کا صدقے جاؤں پھوپی سے کرو سوال

ہم سب کنیزیں بنت امیر عرب کی ہیں
اصغر ہو یا کہ تم وہی مختار سب کی ہیں

یہاں جناب زینبؑ کے احترام کا اظہار ہو رہا ہے پھر جناب زینب سے بیٹے کی سفارش اس طرح کر رہی ہیں ؎

آپ اس کی ماں ہیں آپ کا فرزند ہے یہ لال
دخل اس معاملے میں کوئی دے یہ کیا مجال
یہ عازم جدال ہے اور آپ کا یہ حال
قدموں کو چھوڑتا نہ کبھی یہ نکو خصال
آپ اس کو چاہتی ہیں یہ صدقے ہے آپ پر
پر کیا کریں کہ آج مصیبت ہے باپ پر

جب جناب زینبؑ بھی علی اکبر کو اجازت دے دیتی

ہیں یہ سن کر امام حسینؑ حسرت سے کہتے ہیں ؎

بانو کے منہ کو دیکھ کے حضرت نے یہ کہا
کیوں سچ ہے تم نے بیٹے کو مرنے کی دی رضا
وہ چپ رہیں تو بولے بہن سے شہہ ہُدا
کہئے پھوپی بھتیجے میں کیا فیصلہ ہوا
راہیں سب ان کے روکنے کی بند ہوگئیں
سنتا ہوں میں کہ تم بھی رضا مند ہوگئیں

ماں اور پھوپی کے بجائے اکبر جواب دیتے ہیں

اماں نے بھی رضا ہیں دی اور پھوپی نے بھی
زہرا کی وہ بہو ہیں تو یہ دختر علی

بالآخر امام حسین بھی علیؑ اکبر کو جنگ کی اجازت دے دیتے ہیں۔ علی اکبر میدان جنگ میں جاتے ہیں اور شجاعانہ جنگ کرتے ہیں۔ ایک نیزہ سینہ میں آر پار ہوتا ہے۔ بابا کو پکارتے ہیں۔ امام حسینؑ بیٹے کی آواز سن کر ایک آہ کرتے ہیں۔

سید نے آہ کی کہ ہلا عرش ذوالجلال
بانو پکاری خیر تو ہے اے علی کے لال

جناب شہر بانو در خیمہ پہ کھڑی دور سے بیٹے کی جنگ دیکھ رہی ہیں اور ہر دم یہ خوف ہے کہ کہیں بیٹے کی شہادت کی خبر نہ آئے۔ ماں کی ممتا بیقرار ہے۔ امام حسین کی آہ سن کر پوچھتی ہیں ؎

ہے ہے پسر سے کون سی مادر بچھڑ گئی
صاحب بتاؤ کیا مری بستی اجڑ گئی
نیزے سے کس کے لال کا زخمی ہوا جگر
کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہل شر
کہتا ہے کون رن میں تڑپ کر پدر پدر
اب گھر سے نکلتی ہوں میں یا سید البشر
پردہ نہ مجھ سے کیجئے سب جانتی ہوں میں
آواز یہ اسی کی ہے پہچانتی ہوں میں

انیسؔ نے ممتا کے کتنے حقیقی جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

جناب شہر بانو کے مصائب کا خاتمہ یہیں نہیں ہوا۔ ابھی علی اصغرؑ کی شہادت باقی ہے۔ ششماہے علی اصغر بھوک پیاس سے جاں بلب ہیں۔ امام حسینؑ اپنے شیر خوار کو ماں کی گود سے لیکر فوج یزید کے سامنے جاتے ہیں اور بچہ کی حالت بتا کر اس کے لیے ایک گھونٹ پانی طلب کرتے ہیں دشمنوں نے سوال آب پر ایسا تیر مارا کہ امام کا بازو اور علی اصغر کا گلا چھد گیا۔ علی اصغر نے امام حسینؑ کے ہاتھوں پر تڑپ کر اپنی جان دے دی۔

یہ بات فطری ہے کہ ماں کو اپنے شیر خوار بچے سے بیحد محبت ہوتی ہے۔ چھوٹا بچہ پیاس کی شدت سے جاں بلب ہے ماں کی بیقراری بڑھ جاتی ہے اور وہ امام حسین کو بیٹے کی حالت بتاتی ہیں۔

کیا ہوگیا صاحب اقبال کو مرے
ہے ہے لیے جاتی ہے اجل لال کو مرے

اور جب امام حسینؑ علی اصغرؑ کو گود میں اٹھا کر خیمہ سے جانے کا قصد کرتے ہیں تو ماں بے حال ہوجاتی ہے۔

گہوارہ پہ سر دھرتے جو غش کر گئی بانو
ہر بی بی پہ ثابت یہ ہوا مر گئی بانو

اور پھر جب امام حسینؑ کی شہادت ہوتی ہے اس وقت جناب شہر بانو کی حالت کو انیسؔ نے اس طرح پر درد انداز میں بیان کیا ہے ؎

چلاتی تھی بانو مرے سید مرے سرتاج
اللہ مرا بخت آپکے مرنے سے لٹا راج

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جناب شہر بانو کی مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ انھیں اور سخت مصائب سے گزرنا پڑا اسیر کی گئیں قید و بند کی مصیبتیں سہیں۔ زندان شام میں چار سالہ بیٹی سکینہ بی بی کو دفن کیا۔ انیسؔ نے مختلف مرثیوں میں جناب شہر بانو کا جو کردار پیش کیا ہے وہ ایک منفرد کردار ہے۔ بی بی زینبؑ کے ساتھ ساتھ جناب شہر بانو واقعہ کربلا سے

متعلق ہر مصیبت میں شریک تھیں۔ اپنی بیمار بیٹی سے جدائی کا صدمہ، دوسری بیٹی کی بیوگی، شیر خوار کا غم اور پھر چھوٹی بیٹی سکینہ نے زندان میں بابا کے لیے تڑپ کر جان دے دی۔ یہ تمام مصائب آپ نے بہت صبر و استقامت سے سہے۔ زبان پہ کبھی حرف شکایت نہ لایا ہمیشہ امام حسینؑ اور جناب زینبؑ کی اطاعت اور خوشنودی کا خیال رکھا۔ اس طرح جناب شہربانو کے کردار میں انیسؔ نے ایک مثالی خاتون کی ایک ایسی تصویر پیش کی ہے جو مرثیہ کے قارئین کے ذہن میں ہمیشہ تابندہ رہے گی۔

واقعہ کربلا میں جناب زینبؑ کی شخصیت امام حسینؑ کی طرح مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ انیسؔ کو آپ سے والہانہ عقیدت تھی اس کے باوجود انھوں نے جناب زینب کے کردار کو پیش کرتے ہوئے آپ کی سیرت اور زندگی میں انسانی فطرت کی خصوصیات کو نظر انداز نہیں کیا۔

انیس کا مرثیہ ہے "فرزند پیمبر کا مدینے سے سفر ہے" اس میں امام حسین مدینے سے سفر کی تیاری کرتے ہیں خاندان کے بیشتر افراد آپ کے ساتھ سفر میں شامل ہیں لیکن گھر میں ایک بیٹی فاطمہ صغریٰ کو چھوڑ کر جا رہے ہیں جو بیمار ہے۔ خواتین اہل محلہ بیبیوں سے ملنے کے لیے آتی ہیں تو جناب زینبؑ ان سے فرماتی ہیں۔

ان بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر
بہنو ہمیں یثرب سے لیے جاتی ہے تقدیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر
یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہے شبیرؑ
مجھ کو بھی ہے رنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی

- - - - - - - -

یاد آتی ہے ہر دم مجھے اماں کی مصیبت
گھر بھائی سے تھا بھائی نہ ہوگا تو کہاں گھر

دو بہنیں ہیں ماں جائیاں اور ایک برادر
رسی میں بندھی ہاتھ کے بلوے میں کھلے سر
جو ہو سو ہو بھائی کے ہمراہ ہے زینب
اس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینب

اپنے گھر اور عزیزوں سے خواتین کو کتنا لگاؤ ہوتا ہے یہ سب جانتے ہیں مگر جناب زینب کو یہ سب چھوڑنے پر بھائی کی محبت مجبور کر رہی ہے۔ نانا محمد مصطفیٰؐ آنے والے واقعہ کی خبر دے چکے تھے۔ جناب زینب کو یہ معلوم تھا کہ اب وہ وقت آچکا ہے۔ یہاں جناب زینب کی جس کیفیت کو انیس نے پیش کیا ہے وہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے کیسے کیسے جذبات کی آمیزش ہے۔ بھائی کی محبت سے مجبور ہیں لیکن اپنے وطن کو چھوڑنا بھی آسان نہیں اور خاص طور پر ماں کی تربت سے جدا ہونا ماں کی وصیت کا بھی پاس ہے۔ اس مشکل گھڑی میں ماں کو خواب میں دیکھنے کا بیان انسانی فطرت کا کتنا بھرپور ادراک ہے۔

اور پھر مدینے سے روانگی کے وقت کا جو نقشہ انیسؔ نے کھینچا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مدینے میں اس خاندان کا کیا وقار تھا۔ پہلے یہ آواز بلند ہوتی ہے۔

باہر حرم آتے ہیں رسول دوسرا کے
مریم سے سوا حق نے شرف ان کو دئے ہیں
افلاک یہ آنکھوں کو ملک بند کئے ہیں
آ پہونچی جو ناقہ کے قریں دختر حیدر
خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبط پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشہ چادر
تھے پردۂ محمل کو اٹھائے علی اکبر
فرزند کمر بستہ چپ و راست کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباسؑ کھڑے تھے

انیسؔ کے مرثیوں میں انسان کے رنج و مسرت، کشمکش و اضطراب، جوش و ولولہ، غم و غصہ، عشق و محبت، وفا و جاں نثاری

بے بسی اور مظلومی، ہجر و وصال کی ایسی ایسی کیفیات بیان
کی گئی ہیں جو شاید کسی ایک شاعر کے کلام میں مشکل سے ملتی
ہیں۔ ان کے کرداروں میں نفسیات انسانی کے وہ پیچ و خم
ملتے ہیں جو محض ان کی قادرالکلامی کی ضمانت نہیں بلکہ ان کی گہری
وجدانی آگہی کے ترجمان بھی ہیں۔

امام حسینؑ جب تین محرم کو کربلا میں وارد ہوئے اس وقت
خیمے لگانے کے لیے حضرت عباس امام حسین سے دریافت
کرتے ہیں کہ خیمے کہاں نصب کئے جائیں۔ امام عالی مقام
فرماتے ہیں کہ بہن زینب سے پوچھ لو وہ جہاں کہیں وہیں
خیمے نصب کئے جائیں۔

امام حسینؑ کا "زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا"
فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ جناب زینب کی شخصیت
کتنی پروقار اور باعظمت تھی اور وہ امام حسینؑ کی کتنی مزاج شناس
تھیں۔ اس سے بہن کے احترام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

جب نہر کے کنارے خیمے نصب کئے جاتے ہیں اچانک
لشکر شام کا ایک رئیس وہاں اپنی فوج کے ساتھ پہنچتا ہے
اور وہاں سے خیمے ہٹا لینے کا مطالبہ کرتا ہے اور اپنی فوج
کی عظمت کو بڑے گھمنڈ سے بیان کرتے ہوئے حکم کی عدم تکمیل
پر لڑائی کی دھمکی دیتا ہے۔ اس کی ان بے ادب باتوں کو
سن کر حضرت عباسؑ جوش میں آ جاتے ہیں۔ یہ سن کر جناب
زینب پریشانی سے کہتی ہیں۔

زینب پکاری بیٹھ کے زانو بصد ملال
ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال
کہہ دے کوئی کہ اے اسد کبریا کے لال
غربت پہ ابن فاطمہ کی تم کرو خیال
قربان ہوں گی بس نہ لڑائی کا نام لو
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصّہ کو تھام لو

اس بند سے حضرت زینبؑ کے کردار کے علاوہ جنگ
کے تعلق سے ان کے رویّے کا اظہار ہوتا ہے کہ خاندانِ رسالت
کی خواتین بھی کتنی صلح پسند تھیں۔ احساس ہے کہ عباس شیر خدا
کے فرزند ہیں غصہ بھی حق بجانب ہے لیکن مصلحت کا تقاضا ہے
کہ اس وقت غصہ کو روک لیا جائے اور پھر جب امام حسین حضرت
عباسؑ کو سمجھا کر واپس لاتے ہیں تو اس وقت جناب زینب بھائی
سے کہتی ہیں ؎

لے کر بلائیں کہنے لگی وہ جگر فگار
کیا جی میں آ گئی تھی یہ بھیا بہن نثار
محل میں میں تو سر کو پٹکتی تھی بار بار
صدقے کروں وہ نہر کہیں جس پہ نابکار
پیارا رہے انھیں جنھیں پانی عزیز ہے
بھیا ہمیں تمہاری جوانی عزیز ہے

انیس نے مرثیوں میں جن کرداروں کو پیش کیا ہے وہ
سب حقیقت میں جیتے جاگتے کردار تھے فرضی نہیں۔ تھے انھوں
نے اپنے کرداروں کی داخلی اور خارجی اعمال و کیفیات کو جس
تفصیل اور فنکاری سے پیش کیا ہے۔ اس نفسیات شناسی کی منزل
تک کوئی اور نہیں پہنچ سکتا یہ کردار ان کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ
تاریخ کی حقیقی اور زندہ شخصیتیں ہیں اور وہ شخصیتیں جن کا مذہب
اور اس کے عقائد سے گہرا رشتہ ہے۔ گویا "انیس ٹھیس نہ
لگ جائے آبگینوں کو" والا معاملہ تھا لیکن انیس نے اس مرحلہ
کو باسانی طے کیا۔

ماں کی حیثیت سے جناب زینبؑ کا کردار جس طرح
ابھر کر سامنے آتا ہے وہ ان کی شخصیت کی انفرادیت اور
عظمت کا گواہ ہے۔ عزم و ارادے کی مضبوطی، صبر و رضا کی کیفیت
حق کی خاطر قربانی کا بے پناہ جذبہ وہ ایک مثالی خاتون کا ہی ہو
سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مامتا کے فطری جذبہ کی کمزوری
یعنی گریہ و ماتم کو بھی انیس نے نظر انداز نہیں کیا ہے۔
جناب زینبؑ کو بحیثیت ماں کے دیکھئے۔

تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں

بچوں کے لیے میدان جنگ میں جانے پر جب دیر ہوتی ہے تو جناب زینب کی محبت برہمی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے

منہ پھیر کے یہ کہنے لگی شاہ کی ہمشیر
غیرت کی ہے جا غیر تو ہوں فدیۂ شبیر
منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحب شمشیر
شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر
انصاف تو کیجے مجھے کیوں کر نہ گلہ ہو
وہ پہلے تو بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہو

تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار
سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار
موقع ہو تو دنیا سے گزرتے ہیں وفادار
سردار سے پہلے کہیں مرتے ہیں وفادار
کھلتا نہیں یہ جوشش شجاعت انھیں کیوں ہے؟
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہے؟

ماں کو تو سبک کر چکے کنبے کی نظر میں!
میں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی ان سے یہ کیوں آئے ہیں گھر میں
کھولیں انھیں باندھے ہیں جو ہتھیار کمر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے
لو ناز ہے ان پر کہ نواسے ہیں علی کے

جب یہ کمسن بچے میدان جنگ کو جانے لگتے ہیں تو جن تیوروں سے ماں انھیں رخصت کرتی ہے وہ محبت اور شجاعت کے ساتھ ساتھ خاندانی وقار کے ملے جلے جذبات کو ظاہر کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ بچے مرنے کے لیے جارہے ہیں۔ وہ انھیں انسانی شرافت، وفاداری اور قربانی کا نمونہ بنا کر بھیجتی ہیں اور ان قدروں کا اظہار کرتی ہیں جو انھیں زندگی سے زیادہ عزیز ہیں۔

تلواریں ہیں موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

اور جب ان بچوں کی لاشیں خیمے میں آتی ہیں تو پہلے تو آپ سجدۂ شکر بجا لاتی ہیں کہ آپ کا یہ فدیہ قبول ہوا لیکن جب لاشوں پہ نظر جاتی ہے تو ماں کی محبت اُمڈ آتی ہے۔ صبر کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور ممتا کے وہ جذبات سامنے آتے ہیں جو فطری ہیں۔

بانو نے رکھے زانوئے زینب پہ سر ان کے
جو بیبیاں تھیں آ گئیں منہ کو جگر ان کے
زینب نے جو کی جھک کے رخوں پر نظر ان کے
دکھلائی دیے چاند سے منہ خوں میں تر ان کے
رخسار بھی مجروح تھے ابرو بھی کٹے تھے
شانے بھی جدا چاند سے بازو بھی کٹے تھے

منہ چھاتیوں پہ رکھ کے یہ ناشاد پکاری
آرام میں ہو یا ہے غشی پیاس سے طاری
ہوتا ہے بیاں شوکت و ہمت کا تمہاری
تسلیم کرو قبلۂ کونین کو واری
سمجھی میں کہ باعث ہے یہ شب بیداری کا
پیارو یہ طریقہ نہیں ارباب ادب کا

تاریکی میں واری تمہیں نیند آئے گی کیوں کر
شب ہوگی تو بچوں کو یہ ماں پائے گی کیوں کر
مادر دل بیتاب کو سمجھائے گی کیوں کر
واں تک مرے رونے کی صدا آئے گی کیوں کر
نکلوں تو تجسس میں تو بیجا نہیں واری
ماں ہوں مرا پتھر کا کلیجہ نہیں واری

اپنی گود کے پالوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے شہید ہوتا دیکھ کر ماں کا متاثر ہونا فطری ہے۔ ان بندوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیس نے کتنی قادر الکلامی سے ایک ماں کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے جناب زینب کی سیرت میں انیس نے روحانیت کے ساتھ ساتھ انسانی اور نسوانی جذبات کا جو امتزاج پیش کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

جناب زینبؑ اور امام حسینؑ دونوں کو ایک دوسرے سے

جو شدید تر محبت تھی اس کا انیسؔ نے اپنے مرثیوں میں بیشتر جگہ اظہار کیا ہے بچپن سے لیکر واقعہ کربلا تک جناب زینب نے اپنے بھائی کا اس طرح ساتھ دیا کہ شریکۃ الحسین کہلائیں۔ روز عاشور انیس نے دو بار بہن بھائی کی رخصت کا بیان کیا ہے پہلی بار صبح عاشور امام حسینؑ اٹھارہ بنی ہاشم جوانوں کے ساتھ رخصت کے لیے آئے تھے اور دوسری بار جب امام حسین یکہ و تنہا رہ گئے تھے سب عزیز و اقرباء شہید ہو چکے تھے۔

صبح عاشور کی رخصت بھی قیامت سے کچھ کم نہیں تھی پھر بھی ایک امید تھی کہ بھائی، بھتیجے، بیٹے سب سلامت ہیں اور حسینی فوج نصرت کے لیے تیار کھڑی ہے۔ اس وقت کا حال انیسؔ نے اس طرح بیان کیا ہے۔ امام حسینؑ نماز فجر کے بعد رخصت کے لیے خیمہ میں جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ؎

خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال
چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینبؑ کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذو الجلال
بچ جائے اس فساد سے خیر النساء کا لال
بانوئے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

امام حسین سب بیبیوں سے رخصت ہوتے ہیں تمام کنبہ کو زینب کے حوالے کر کے بہن کو صبر کی تلقین کرتے ہیں اور جب گھوڑے پر سوار ہونے کے لیے خیمہ سے باہر آتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ رکاب تھامنے والا نہیں جناب زینب کو احساس ہوتا ہے کہ بھائی اکیلے ہیں فوراً خیمہ سے باہر آتی ہیں۔

اے بھائی دکھاؤں کیسے تنہائی تمہاری
تھامے گی رکاب آج یہ ماں جائی تمہاری
زینب نے رکھا ہاتھ رکاب شہ دیں پر
شبیر ہوئے جلوہ نما خانۂ زیں پر

جب امام حسینؑ زخمی ہو کر گھوڑے سے زمین پر گرتے ہیں۔ اور شمر ذبح کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ اس وقت جناب زینب بے ساختہ بلکتی ہوئی بھائی کی طرف دوڑتی ہیں ؎

اس وقت سب جہاں میری آنکھوں میں ہے سیاہ
لوگو خدا کے واسطے مجھ کو بتاؤ راہ
سید کدھر تڑپتا ہے اماں کدھر ہیں آہ
کس سمت ہے نبیؐ کے نواسے کی قتل گاہ
شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے
یہ کون نام لیتا ہے میرا کراہ کے

لیکن جب پہنچتی ہیں ؎

پہنچی جو قتل گاہ میں اس روک ٹوک پر
دیکھا سر حسین کو نیزے کی نوک پر

یہ وہ مقام ہے جس کا بیان ممکن نہیں کہ بہن پر کیا گزری ہوگی۔

امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جناب زینبؑ پر بیواؤں یتیم بچوں اور امام وقت زین العابدینؑ کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ مقصد حسینؑ کو پورا کرنے کی بھی عظیم ذمہ داری تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جناب زینبؑ نے یہ ذمہ داری کس طرح نبھائی۔

انیسؔ نے مرثیوں میں خاندان نبوت کی خواتین کے علاوہ عام خواتین کے کردار بھی پیش کئے ہیں جن میں کچھ کنیزیں بھی ہیں جیسے فضہ ہند اور شیریں اور بعض دوسری خواتین بنی اسد کی عورتیں، کوفی عورتیں اور شامی عورتیں شامل ہیں۔ ان کی بھی سیرت اور کارناموں کو بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان سب کا احاطہ ممکن نہیں۔

بہر حال انیس نے مرثیوں میں نسوانی کرداروں کو ان کی سیرت اور شخصیت کی تمام تر باریکیوں اور نزاکتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین، ”ان کے کرداروں کے جاندار ہونے کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ میر انیس نے یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ امام حسینؑ اور ان کے ساتھی الوہی شان رکھتے تھے۔ عام طور سے کردار کے انسانی پہلوؤں پر ہی زور دیا ہے۔

ڈاکٹر سید علی سلمان رضوی
عباس نگر، مفتی گنج۔ لکھنؤ
9919698660

مراثیٔ انیس میں اہلبیتؑ کا تعارف

خداوند عالم نے ارشاد فرمایا قُلۡ لَّا اَسۡئَلُکُمۡ عَلَیۡہِ اَجۡرًا اِلَّا الۡمَوَدَّۃَ فِی الۡقُرۡبٰی اے رسول کہہ دو کہ میں تم سے کوئی سوال نہیں کرتا مگر یہ کہ تم میرے قرابت داروں سے محبت کرو۔ [1]

صاحب "کشاف" صاحب "بحر المحیط" صاحب "روح البیان" اور صاحب "تفسیر کبیر" نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ آیت مبارکہ کے نزول کے بعد اصحاب نے پیغمبر سے سوال کیا تھا کہ ان قرابتداروں سے کون حضرات مراد ہیں تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ حضرت علیؑ و فاطمہ (س)، حسنؑ اور حسینؑ۔ میر انیسؔ بھی اس سے متفق ہیں۔

اب ہم انھیں ہستیوں کے مختصر تعارف کے ساتھ مراثی انیس کو پیش کریں گے تاکہ یہ بھی واضح ہوسکے اہلبیت کی عظمت سے متعلق میر انیسؔ کی تاریخی معلومات کس قدر ہے اور کس طرح اپنے مرثیے میں جگہ دی ہے۔

۱۔ **حضرت محمدؐ:** حضرت محمد کی ولادت کے دن آپ کے والد حضرت عبداللہ شام سے مدینہ آرہے تھے کہ راستہ ہی میں انتقال ہوگیا اور انھیں وہیں دفن کر دیا گیا جس کی بنا پر آپ کی والدہ آمنہ جب ہمیشہ کے لیے تنہا ہوگئیں اور جس وقت آنحضرت کی ولادت ہوئی اس وقت زمین و آسمان میں عجیب حادثے رونما ہوئے خاص کر مشرق میں جو اس کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا۔ ولادت کے پہلے ہی ان بے فرسودہ اور جاہل نظام کے لیے خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

نوشیرواں کا وسیع و عریض محل جس کی ابدیت کا خواب دیکھا دیکھا جارہا تھا اس کی عمارات میں زلزلہ آیا اور اس کے چودہ کنگورے گر گئے فارس کے آتش کدہ میں جو آگ ہزار سال سے روشن تھی وہ خاموش ہوگئی۔ خیالی خداؤں کے پجاری جن کا تعصب انھیں کوئی اور فکر نہیں کرنے دیتا تھا وہ بھی ان واقعات کے بعد سوچنے پر مجبور ہوگئے اسی طرح "ساوہ" کے دریا نے خشک ہوکر بیداری کا پیغام دیا۔

جس طرح پیغمبر کی ولادت اور اس کے بعد رونما ہونے والے غیر معمولی واقعات آنحضرتؐ کی شخصیت اور عظمت کی ترجمانی کر رہے تھے اسی طرح بچپن میں آپؐ کی باتیں اور آپ کا کردار آپ کو دوسرے تمام بچوں سے ممتاز کر رہا تھا جب عبدالمطلب کو اس بات کا اندازہ ہوگیا تھا اسی لیے وہ حضرت محمدؐ کا غیر معمولی احترام کرتے تھے۔

حضرت رسول اکرمؐ کے چچا جناب ابو طالبؑ کا بیان ہے کہ ہم نے کبھی حضرت محمدؐ سے غلط بیانی اور کوئی نازیبا بات نہیں دیکھی نہ کبھی بیجا ہنستے دیکھا اور نہ کبھی بیجا گفتگو کرتے دیکھا [2]

ان تمام تاریخی واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے اہلبیتؑ کی پہلی کڑی حضرت محمدؐ کی شخصیت و عظمت کو میر انیسؔ اس طرح نظم کرتے ہیں۔

فخر ملک و اشرفِ آدم ہے محمدؐ
اکلیل سرِ عرشِ معظم ہے محمدؐ
حقا کہ خداوند دو عالم ہے محمدؐ
آخر ہے مگر سب سے مقدم ہے محمدؐ
ایسا کوئی محرم نہیں اسرار خدا کا
حال اس سے ہے پوشیدہ ازل کا نہ ابد کا [3]

مختارِ زمیں باعثِ افلاک نبیؐ ہے
والا گہرِ قلزمِ لولاک نبیؐ ہے
مصباحِ حریمِ حرمِ پاک نبیؐ ہے
شیرازۂ مجموعۂ ادراک نبیؐ ہے

عالم میں وہ آیا تھا پہ دل سوئے خدا تھا
حق اس کا رضا جو وہ رضا جوئے خدا تھا [۴]

اللہ نے دی تھی اسے کونین کی شاہی
انگشت پہ تھا دل میں بھرا رازِ الٰہی
دی سنگ نے اس شہ کی رسالت پہ گواہی
اشجار بھی اعجاز سے اس کے ہوئے راہی

دی مردوں کو جاں، سبز کیا خشک شجر کو
دو کر دیا انگلی کے اشارے سے قمر کو [۵]

کائنات کی تمام چیزیں اہلبیتؑ کی محبت میں خلق ہوئی ہیں۔ جیسا کہ خداوند عالم نے فرمایا کہ فَقَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ یا مَلَآئِکَتِی وَیا سُکَّانَ سَمٰوٰاتِی اِنِّی مَا خَلَقْتُ سَمَآءً مَّبْنِیَّةً وَّ لَا اَرْضًا مَّدْحِیَّةً وَّلَاقَمَرًا مُّنِیْرًا وَّلَا شَمْسًا مُّضِیَّةً وَ لَا فَلَکًا یَّدُوْرُ وَلَابَحْرًا یَّجْرِیْ وَلَافُلْکًا یَّسْرِیْ اِلَّا فِیْ مَحَبَّةِ هٰؤُلَآءِ الْخَمْسَةِ الَّذِیْنَ هُمْ تَحْتَ الْکِسَاءِ [۶]

ترجمہ: پروردگار نے بزمِ ملائکہ اور ساکنانِ عرش سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ اے میرے ملائکہ اور میرے عرش پہ بسنے والوں، میں نے بنائے آسمان، بچھائی گئی زمین، روشن چاند، چمکتا ہوا سورج، گردش کرتے ہوئے سیّارے، رواں دواں دریا و سمندر، سیر کرتی ہوئی کشتیاں صرف ان پانچ حضرات کی محبت میں خلق کی ہیں جو زیرِ چادر جمع ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو کچھ خلق نہ کرتا۔

اسی تاریخی پس منظر میں میرانیسؔ کا یہ بند دیکھئے۔

اس نور سے فرماتا تھا یہ حضرتِ معبود
ہے خلق سے تو میری مراد اور مرا مقصود
عزت کی قسم اپنی جو تو ہوتا نہ موجود
تو رہتی بنا عالمِ ایجاد کی نابود

پیدا کبھی کرتا نہ زمیں کو نہ فلک کو
دوزخ کو نہ جنت کو نہ آدم نہ ملک کو [۷]

اس مرثیے میں کل ۹۵ بند ہیں۔ میر انیسؔ نے اہل بیتؑ کے کردار کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور ان کے خط و خال اور سیرت کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ جناب زہراؑ کی عزت و شرافت کو بھی پیش کیا ہے۔ میر انیسؔ ایک جگہ اہل بیت کی خلقت کو حضرت رسول اعظم کی حدیث اَنَا عَلِیٌّ مِنْ نُوْرٍ وَّاحِدٍ کے پیش نظر اس طرح تعارف کراتے ہیں۔

اس نور کے دو حصّے کیا حق نے برابر
اور پھر کیے ہر حصّے کے دو حصّے مکرر
دو ٹکڑوں سے مخلوق ہوئے احمدؐ و حیدرؑ
پیدا ہوئے دو حصوں سے سبطین پیمبر
زہراؑ کو پھر اس نور سے تنہا کیا پیدا
یوں پنجتن پاک کا نقشہ کیا پیدا [۸]

انساں سے بھلا ہو سکے ایسوں کی ثنا کد
اک نورِ محمدؐ سے ہیں یہ تا بہ محمدؐ
واللہ علی سے ہیں علی تک سبھی امجد
بعد ایک کے اک ان میں سے ہے صاحبِ مسند
سمجھے نہ کوئی یہ کہ محمدؐ سے جدا ہیں
اک سیب کے ٹکڑے ہیں یہ سب نورِ خدا ہیں [۹]

حضرت محمد مسلمانوں کی بہت عظیم شخصیت اور محترم ہستی ہیں اور سب سے زیادہ خود فاطمہ (س) کے لیے مگر وہ ان کے چاہنے والے باپ بھی ہیں۔ میر انیسؔ نے حضرت مرسل اعظم کی اس شفقت و محبت کی بہت سی روایتیں مرثیوں میں بیان کی ہیں اس سلسلے میں یہ بند دیکھئے۔

واللہ ستاتا مری بیٹی کا زبوں ہے
وہ مریم و حوا سے بھی رتبے میں فزوں ہے
تسلیم کو اس کی فلک پیر نگوں ہے
وہ پارۂ تن ہے مرا اور یہ مرا خوں ہے

جو لبد مرے نیک سلوک اس سے کرے گا
میں قبر میں آؤں گا وہ جس روز مرے گا

مرثیے کے آخری بند میں اہل بیت کی مصیبتوں کا احساس کرتے ہوئے سَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ کی آیت کو ضامن قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

جو احمدؐ و زہراؑ و علیؑ کو ہوئی ایذا
جو ظلم و ستم شبّرؑ و شبیرؑ پہ گذرا
ہو وین گے کبھی ظالم و مظلوم بھی یکجا
اب جائے خموشی ہے انیسؔ آگے کہے کیا
جب حشر کو یہ دفتر جاں سوز کھلے گا
اس ظلم کا بھی حال اسی روز کھلے گا

۹۵ ویں بند کے اس مرثیے میں میر انیس نے حضرت رسول اکرم کے کردار، محبت، جاں نثاری، خلوص اور وفا کو بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ روشناس کرایا ہے۔ ترتیب و تسلسل بھی انیسؔ کے کلام کی ایک خوبی ہے یہ صفت ان کے کلام میں اس قدر نمایاں ہے کہ ہر شخص خود محسوس کر سکتا ہے۔ اگر انیس کے متعدد مرثیے پڑھنے کے بعد کسی بھی مرثیہ نگار کا کلام پڑھا جائے تو اس صفت کا احساس شدت کے ساتھ ہو جاتا ہے کہ میر انیس جب ایک بات کو تمام کرکے دوسری بات کا آغاز کرتے ہیں تو دونوں کو اس طرح ملاتے ہیں کہ جوڑ معلوم نہیں ہوتا۔ بات میں بات نکلتی چلی جاتی ہے اور جملے میں لفظوں اور عبارت میں جملوں کو اس ترتیب کے ساتھ رکھتے ہیں کہ ایک بات سن کر اس کے بعد آنے والی بات کے لیے ذہن خود آمادہ رہتا ہے۔

حضرت امام علیؑ

اہل بیت کی دوسری کڑی حضرت امام علیؑ ہیں جو حضرت ابو طالب کے بیٹے حضرت محمدؐ کے داماد اور وصی ہیں نیز فاطمہ (س) کے شوہر ہیں اور امام حسنؑ و امام حسینؑ کے والد ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی میں جنگ بدر، جنگ احد، جنگ خندق، جنگ خیبر اور جنگ حنین میں حصہ لیا اور مجاہدانہ کارنامے انجام دے کر کامیابی حاصل کی میر انیس ان تمام جنگوں کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں۔

بدر و حنین و کعبہ و خیبر سے تا احد
ہر جنگ میں علیؑ نے محمدؐ کی، کی مدد
دستِ خدا کا وار کسی سے ہوا نہ رد
اس ادعائے راست پہ ہے لافتیٰ سند
برش پہ ذوالفقار کی قاطع دلیل ہے
اب تک دو نیم جس سے پر جبرئیل ہے ۱۰؎

حضرت امام علیؑ کے فضائل و کمالات قلم بند کرنا طاقت بشری سے بالا ہے خود سرور کائنات نے اس کے محال ہونے پر بھی نص فرما دی ہے۔ حضرت رسول اعظم کا ارشاد ہے کہ "اگر تمام دنیا کے دریا سیاہی بن جائیں اور درخت قلم ہو جائیں اور جن و انس لکھنے اور حساب کرنے والے ہوں تب بھی علی ابن ابی طالب کے فضائل کا احصاء نہیں کر سکتے۔" ۱۱؎

علماء اسلام نے بھی اکثریت فضائل کا اعتراف کیا ہے۔ علامہ عبدالبر نے کتاب استیعاب ج ۲ کے ۴۷۸ پر تحریر فرمایا ہے کہ فضائلہ لایحیط بھا کتاب۔ آپ کے فضائل کسی ایک کتاب میں جمع نہیں کئے جا سکتے۔ علامہ ابن حجر مکی "صواعق محرقہ" اور "منح مکیہ" میں تحریر کرتے ہیں کہ "مناقب علی و فضائلہ اکثر من ان تحصیٰ" حضرت علیؑ کے مناقب و فضائل حد احصاء سے باہر ہیں۔

احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ حضرت علیؑ کے لیے جتنے فضائل و مناقب موجود ہیں کسی کے لیے نہیں ہیں۔ علامہ محمد بن طلحہ شافعی تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے جو فضائل ہیں وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ رسول اللہؐ نے آپ کو "رایۃ الھدیٰ، منار الایمان، اور امام الاولیا فرمایا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ علیؑ کا دوست میرا دوست ہے اور علی کا دشمن میرا دشمن ہے۔ ۱۲؎

مذکورہ تمام معتبر روایات کو میر انیس نے اپنے مرثیوں میں نظم کر کے اپنے فنّی کمال کا مظاہرہ کیا ہے اور حضرت علی کا تعارف

حدیث رسولؐ کے ضمن میں اس طرح کراتے ہیں۔

پھر یوں کہا حیدرؑ کی طرف کر کے اشارا
عاشق ہوں میں اس کا کہ خدا کا ہے یہ پیارا
واللہ مرے بعد یہ رہبر ہے تمہارا
رنج اس کا کوئی دے یہ نہیں مجھ کو گوارا
سمجھے نہ وصی جو اسے باعث ہے وہ شر کا
مختار ہے یہ احمد مختار کے گھر کا ؁۱۳

بھائی بھی یہ میرا ہے وصی بھی ہے یہ میرا
اک نور سے میں اور یہ ہوا خلق میں پیدا
جو دین پہ ہے مجھ پہ یہ ادا اس کو کرے گا
جو وعدے ہیں میرے یہ کرے گا انھیں ایفا
یہ واقف گنجینۂ اسرار نہاں ہے
یہ حجت حق ہے یہ امام دو جہاں ہے ؁۱۴

جو دوست ہے اس کا وہ مرا دوست ہے واللہ
دشمن ہے جو اس کا مرا دشمن ہے وہ گم راہ
رتبے سے علیؑ کے میں تمہیں کرتا ہوں آگاہ
جو اس سے لڑے ہوئے گا کافر ہے وہ بدخواہ
جس کو کہ یقیں اس کی امامت کا نہیں ہے
قائل وہ محمدؐ کی رسالت کا نہیں ہے ؁۱۵

جو حکم علیؑ ہے یہ وہی حکم خدا ہے
نہی اس کی جو ہے نہی رسول دوسرا ہے
جو کام یہ کرتا ہے مناسب ہے بجا ہے
ناحق کوئی حق اس کا جو چھینے تو خطا ہے
میں دشمن حیدر پہ رعایت نہ کروں گا
محشر میں کبھی اس کی شفاعت نہ کروں گا ؁۱۶

میر انیسؔ نے اپنے پیش روؤں کے تاریخی روایات کو اپناتے ہوئے اردو مرثیے کو قابل قدر اضافوں سے نوازا ہے، تاریخ اسلامی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جسے مرثیے میں پیش نہ کیا گیا ہو۔ مثلاً حدیث رسولؐ یہ ہے کہ اگر تمام دریا روشنائی بن جائیں اس کے باوجود بھی حضرت علیؑ کے فضائل کا احصاء نہیں کر سکتے۔ میر انیسؔ مذکورہ حدیث کو فراموش نہ کرتے ہوئے زندگی کے مختلف اقدار کی عکاسی کرتے ہیں اور حفظ مراتب و آداب و اخلاق کا بھی خصوصاً خیال رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند بند قابل غور ہیں۔

اکثر بیان کرتے تھے محبوب کردگار
اشجار شش جہات قلم ہوں جو ایک بار
اور ہوں مداد بن کے رواں ایک بحار
لکھیں ازل سے تا بہ ابد اہل روزگار
دریا ہوں صرف اور قلم اختتام ہوں
لیکن نہ شیر حق کے فضائل تمام ہوں ؁۱۷

دیکھو تو نام پاک کی تم خوب صورتی
شیر خدا امیر عرب، مرتضیٰ علیؑ
زوجہ ملی تو فاطمہؑ سی دختر نبیؐ
بیٹے حسنؑ حسینؑ سے جن پر فدا ہے جی
حیدر سے لاکھ طرح کی مشکل کشائی ہے
اس نام میں بھری ہوئی مشکل کشائی ہے ؁۱۸

اس بند کو بھی دیکھئے کہ جس میں میر انیس نے آیۂ مباہلہ کے پس منظر میں علیؑ کا تعارف کرایا ہے۔

شمس الضحیٰ نبی ہیںؐ تو بدر الدجیٰ ہیں یہ
بحر کرم جو وہ ہیں تو کان سخا ہیں یہ
وہ فخر انبیاء تو شہ اولیاء ہیں یہ
وہ شاہ انّما شرف اوصیاء ہیں یہ
دیکھے حدیث کو جسے کچھ اشتباہ ہے
اس پر حدیث نفسک نفسی گواہ ہے ؁۱۹

عرش خدا مقام جناب امیرؑ ہے
کرسی بھی تخت بام جناب امیرؑ ہے
مسطور لوح نام جناب امیرؑ ہے
آیات حق کلام جناب امیرؑ ہے

ایسا کسی کو خلق میں رتبہ ملا نہیں
ساری خدا کی شان ہے لیکن خدا نہیں [20]

فاطمہ زہرا (س) بنت محمدؐ

فاطمہ زہرا (س) اسلام کی وہ عظیم شخصیت ہیں جن کا احترام ہر فرقے کے مسلمان کرتے ہیں۔ جناب فاطمہ زہد و تقویٰ علم و فضل ایثار و قربانی، خدمت و جفاکشی، خدا ترسی اور صبر و ضبط کی بے شمار صفات کی حامل تھیں۔ جس طرح پیغمبر اسلام مکارم الاخلاق کا مجموعہ اور مسلمانوں کے ہادی و رہبر تھے۔ اسی طرح ان کی بیٹی بھی دنیائے اسلام کی عورتوں کے لیے نمونہ تھیں علامہ اقبال بھی جناب فاطمہ (س) کی عظمتوں اور جلالتوں سے متاثر ہوئے ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں۔

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز — از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز
نور چشم رحمت للعالمیں — آں امام اولیں و آخریں
بانوئے آں تاجدار ھل اَتیٰ — مرتضیٰ، مشکل کشا شیر خدا
مادر آں مرکز پرکار عشق — مادر آں کارواں سالار عشق [21]

میر انیسؔ بھی جب اپنے مرثیے میں فاطمہ زہرا (س) کا تعارف کرتے ہیں تو ان کے اخلاق و کردار کو بڑی خوبی سے دکھاتے ہیں۔ اور مرثیے میں یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک مثالی عورت ہونے کے علاوہ دنیا کی سبھی عورتوں کے لیے نمونہ ہیں ؎

مہر سپہر عز و شرافت ہے فاطمہؑ
شرح کتاب عصمت و عفت ہے فاطمہؑ
مفتاح باب گلشن جنت ہے فاطمہؑ
نور خدا و آیۂ رحمت ہے فاطمہؑ

رتبے میں وہ زنان دو عالم کا فخر ہے
حوا کا افتخار ہے مریم کا فخر ہے [22]

زہرا کو کیا خدا نے دیے رتبۂ جلیل
خدمت گذار جن کے سرافیل و جبرئیل
اس سیدہ کا کوئی جہاں میں نہیں عدیل
جس کی کفیل فاطمہؑ اس کا خدا کفیل

ہے فوق اس کے مرتبہ کو مہر و ماہ پر
لکھا ہے نام فاطمہ عرش الٰہ پر [23]

وہ فاطمہ کہ جو ہے سراپا خدا کا نور
پروانہ جس کے چہرۂ اقدس کی شمع طور
گر حور اس کو کہئے تو ہے عقل کا قصور
اس کے قدم کی خاک ہے سرمہ برائے حور
کس کو ملا یہ رتبۂ اعلیٰ جہان میں
بھیجا خدا نے آیۂ تطہیر شان میں [24]

جناب فاطمہ زہرا کی ریاضت و عبادت، جفاکشی و تنگ دستی اور رضائے الٰہی پر راضی رہنے کا تذکرہ میر انیسؔ اس طرح کرتے ہیں۔

اب زہد و فقر و فاطمہ کا کچھ سناؤں حال
فاقے پہ فاقے کرتی ہیں اکثر وہ پر ملال
لاتے جو مزد آپ کشتی شیر ذوالجلال
تب جو منگا کے پیستی تھی وہ نکو خصال
دولت سے کچھ غرض تھی نہ حشمت سے کام تھا
آٹھوں پہر خدا کی عبادت سے کام تھا [25]

۸۷ بندوں پر مشتمل مرثیے میں میر انیسؔ نے جناب فاطمہ زہرا کی ولادت سے لے کر شہادت تک کے مراحل کو بیان کیا ہے۔ جناب فاطمہ کی شادی، جہیز کا سامان، فقر و فاقہ، شہادت محسن وغیرہ کی روایت کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔

جناب فاطمہؑ کی عظمت و جلالت کو ایک اور مرثیے میں میر انیسؔ نے بیان کیا ہے اور یہ مرثیہ ۹۶ بندوں پر مشتمل ہے میر انیسؔ جہاں بھی فاطمہ زہراؑ کی سیرت کا تذکرہ کرتے ہیں ان کی مضبوطی کردار کی عظمت اور ان کی صفات کو بڑی خوبی سے دکھاتے ہیں۔ وہ ان کو ایک مثالی عورت سمجھتے ہیں جو دنیا کی سبھی عورتوں کے لیے نمونۂ عمل ہیں۔

کیا پیش خدا صاحب توقیر ہے زہراؑ
خاتون جناں مالک تطہیر ہے زہراؑ

ام الحسنؑ و مادر شبیرؑ ہے زہرؑا
سرتا بہ قدم نور کی تصویر ہے زہرؑا
شوہر کو جو پوچھو تو شہنشاہ عرب ہے
بیٹی ہے نبی کی یہ حسب ہے یہ نسب ہے [۲۶]

باپ پر واجب نہیں ہے کہ فرزند کا احترام کرے مگر تاریخ اسلام میں ایک بیٹی اس قدر باعظمت ہے کہ رسول اکرمؐ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کا تذکرہ کئی جگہ میر انیس نے کیا ہے۔

ماں باپ پہ واجب نہیں فرزند کی تکریم
اس امر میں سب خلق پہ زہرؑا کو ہے تقدیم
لکھا ہے کہ جب آتی تھیں زہرا پئے تسلیم
خود اٹھ کے رسول عربی کرتے تھے تعظیم
الطاف محمدؐ ہو یہ جس باب کرم پر
دروازہ گرا دیں اسی بی بی کے شکم پر [۲۷]

میر انیس نے جناب فاطمہ زہرا کی شہادت کے واقعات کو بھی نہایت دردناک لہجہ میں قلم کیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میر انیس سلمان فارسی کی طرح تمام حالات و کیفیات کو ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔

غاصب فدک کے دو ز ستا دیں گے کس کو آہ
اب کس کا گھر جلانے کو جائیں گے روسیاہ
محسن کے خون کی ہوئیں گی اب حق سے دادخواہ
بنت رسولؐ پاک کو ایذا دی بے گناہ
کس درد سے نواسے پیمبرؐ کے روتے ہیں
دونوں کی بے کسی پہ جگر ٹکڑے ہوتے ہیں [۲۸]

جناب حسنینؑ

حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ حضرت علیؑ کے فرزند اور رسولؐ اکرم کے نواسے تھے۔ سرور کائنات نے بے شمار حدیثیں اپنے نواسے کے لیے ارشاد فرمائی ہیں۔ جناب حذیفہ یمانی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت کو ایک دن بہت زیادہ مسرور پا کر عرض کیا مولا آج اس قدر مسرت کی وجہ کیا ہے۔ ارشاد فرمایا مجھے آج جبرئیل نے بشارت دی ہے کہ میرے دونوں فرزند حسنؑ و حسینؑ جوانان بہشت کے سردار ہیں اور ان کے والد علی ابن ابی طالبؑ ان سے بھی بہتر ہیں (کنز العمال ص ۱۰۷۔ ج ۷ صواعق محرقہ ۱۱۷)

ایک صحابی کا بیان ہے کہ ایک دن آنحضرت نماز پڑھ رہے تھے اور حسینؑ آپ کی پشت پر سوار ہو گئے۔ کسی نے روکنا چاہا تو حضرت رسولؐ نے اشارہ سے منع فرمایا۔ (اصابہ ج ۲، ص۱۲)

یہاں پر مختصر طور پر اسلامی تواریخ کی معتبر کتابوں کے ذریعہ جناب حسنینؑ کے متعلق احادیث رسولؐ اکرم کو پیش کیا ہے اب انھیں مذکورہ روایات کے پیش نظر میر انیس کے مرثیے پر نظر کریں کہ میر انیس نے کس طرح سے اہلبیتؑ کی ان آخری ہستیوں کا تعارف کرایا ہے۔ چند بند قابل غور ہیں کہ جس میں رسول اکرمؐ حضرت علیؑ سے گفتگو کرتے ہوئے جناب امام حسن و امام حسینؑ کی عظمتوں سے روشناس کراتے ہیں۔

بیٹے ہیں جو اس کے وہ مرے لخت جگر ہیں
دونوں فلک عز و شرافت کے قمر ہیں
بحرین ہیں زہرا و علی اور وہ گہر ہیں
اللہ کے پیارے ہیں محمدؐ کے پسر ہیں
ناخوش کیا خالق کو اگر ان پہ جفا کی
کیجو نہ خیانت یہ امانت ہیں خدا کی [۳۱]

سن سن کے یہ کہنے لگے اصحاب موافق
فرماتے ہیں وہ آپ جو ہے مرضیٔ خالق
کس پر نہیں روشن شرف مصحف ناطق
ان باتوں سے جل جل کے ہوئے خاک منافق
موذی تھے عداوت سے نہ باز آتے تھے ظالم
جوں مار سیہ طیش سے بل کھاتے تھے ظالم [۳۲]

مزید بند ملاحظہ فرمائیں۔

رکن رکین کعبۂ ایماں حسینؑ ہے
کرسی اگر ہے رحل تو قرآں حسینؑ ہے

پیدا ہے تو حسینؑ ہے پنہاں حسینؑ ہے
عالم تمام جسم ہے اور جاں حسینؑ ہے
حق اس سے ہے قریب وہ حق سے جدا نہیں
جو کچھ کہو وہ سچ ہے مگر اک خدا نہیں [۳۳]

لکھا ہے یہ سجدے میں تھے ایک دن رسولؐ
پشتِ نبیؐ پہ آ کے چڑھا دلبرِ بتولؑ
خیر الوریٰ نے سجدۂ حق کو دیا یہ طول
سمجھا ہر اک کہ وحیِ خدا کا ہوا نزول
سر پیٹنے کی جا ہے یہ جس کا وقار ہو
سینے پہ اس حسینؑ کے قاتل سوار ہو [۳۴]

میر انیسؔ اپنے ایک مرثیے میں پنجتن پاک کی مدح اس طرح کرتے ہیں۔

ہے زیورِ عروسِ سخن پنجتن کی مدح
زینت کلام کی ہے رسولِ زمن کی مدح
ہے لذتِ زباں شہِ خیبر شکن کی مدح
آرام جان و دل ہے حسینؑ و حسنؑ کی مدح
ہر دم یہ ذکر باعثِ عیش و سرور ہے
دل کی جو روشنی ہے تو آنکھوں کا نور ہے [۳۵]

ایک مرثیہ جس کا مطلع ہے۔ ”شک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری“۔ اس مرثیے میں ۱۰۲ بند ہیں۔ اس مرثیے میں امام حسینؑ کا تعارف میر انیسؔ یوں کراتے ہیں

تھا یہ نعرہ کہ محمدؐ کا نواسا ہوں میں!
مجھ کو پہچانو کہ خالق کا شناسا ہوں میں!
زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں
تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں
اس پہ شکوہ نہیں کچھ صبر اسے کہتے ہیں

میر انیسؔ نے اردو ادب کے دامن کو الفاظ کے ذخیرے سے بھر دیا ہے۔ چار جلدوں پر مشتمل ”مراثی انیسؔ“ میں ۱۰۶ مرثیے ہیں جسے ۲۰۰۴ء میں وارث نولکشور پریس بکڈپو لکھنؤ نے اودھ پبلشنگ ہاؤس لکھنؤ میں چھپوا کر شائع کیا ہے۔ مجموعہ مراثی میں میر انیسؔ نے اہلبیتؑ و خاندان اہلبیتؑ اور واقعات کربلا کی عکاسی مکمل طور پر کی ہے مگر راقم نے فقط اہلبیتؑ سے متعلق مختصر بحث کی ہے۔ میر انیسؔ کا کلام اتنے صفات کا حامل ہے جو کسی مختصر تبصرے میں واضح شکل میں نہیں بیان کیا جا سکتا۔ مراثی انیسؔ کو سمجھنے کے لیے اہلبیتؑ اور خاندان اہلبیتؑ اور اس کے سارے کرداروں کے حرکات و سکنات و عادات و اطوار القاب و خطابات سے باقاعدہ واقفیت ضروری ہے۔ عدم واقفیت کی بنا پر لوگ غلط فہمی کا شکار ہو کر غلط نتیجہ نکالتے ہوئے واقعاتِ کربلا کو مجروح کرتے ہیں اور مراثی انیسؔ کو فقط ڈراموں، رزمیوں سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ اس ڈرامائی عناصر کا اثر ان کے کسی مرثیے میں نہیں ہے۔

انیسؔ کی شاعری کا موضوع مذہبی ہونے کے لحاظ سے بھی اخلاقیات میں شامل ہو جاتا ہے۔ زندگی کے مشاہدات و تجربات کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ انھوں نے ان حقائق کے بیان کرنے میں زبان کی سادگی، محاورات کی بندش اور بیان کی خوش اسلوبی سے ہر جگہ کام لیا ہے۔ مضامین کے ہر پہلو سے بحث کی جزئیات کا پورا پورا جائزہ لیا اور ہر بات کو نہایت شرح بسط کے ساتھ بیان کیا ہے ؎

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

میر انیسؔ کا مرتبہ فن کے لحاظ سے اور وسعتِ مضامین کے لحاظ سے اردو مرثیہ نگاری میں اہم اور اعلیٰ ہے۔ ان کے یہاں مضامین گوناگوں، اندازِ بیان حسبِ معمول نہایت لطیف و سادہ اور زبان شیریں اور نکھری ستھری ہے اگر شاعر نے اپنی قدر پہچانی ہے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے تو کوئی تعجب اور اظہار کی بات نہیں ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہنا بھی حق بجانب ہے کہ میر انیسؔ نے

مرثیے کو فقط گریہ و بکا کے لیے تحریر نہیں کیا بلکہ وہ واقعہ کربلا کو درس ابدی مانتے ہوئے انسانی جذبات، محبت و نفرت، زندگی و موت جنگ و صلح، فکر و عمل، حکایات و تمثیل، عدل و ظلم، شرک اور کفر، سعادت و شقاوت، علم و جہل، امانت و خیانت، صدق و کذب اطاعت و معصیت اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کا شعور بھی پیدا کرنا چاہتے تھے جس میں میر انیس مکمل طور پر کامیاب بھی ہوئے۔

حوالے:

[1] سورہ شوریٰ آیت ۲۳، [2] بحارالانوار ج ۱۵ ص ۳۸۲، ۲۰۲، ۴۰۲
[3] مراثی انیس مرحوم ج ۲ بند ا ص ۲ مطبوعہ۔ وارث نولکشور پریس بک ڈپو لکھنؤ ۲۰۰۴ء [4] ایضاً بند ۲ [5] ایضاً بند ۴۔
[6] حدیث کساء، ص ۱۶ [7] مراثی انیس ج ۲ بند ۱۰ ص ۳
[8] ایضاً بند ۱۶ ص ۴ [9] ایضاً بند ۱۷ ص ۴
[10] ایضاً بند ۸۱ ص ۲۳ [11] کشف الغمہ ص ۵۳
[12] مطالب السئول ص ۵۷ [13] مراثی انیس بند ۴۳ ص ۸
[14] مراثی انیس ج ۲ بند ۳۴ ص ۷ [15] ایضاً بند ۴۵ ص ۸
[16] ایضاً بند ۴۶ ص ۷ [17] ایضاً بند ۴ ص ۳۵
[18] ایضاً بند ۳ ص ۲۷ [19] ایضاً بند ۴۲ ج ۲ ص ۳۹
[20] ایضاً ص ۳۵ [21] رموز بیخودی علامہ اقبال [22] ایضاً بند ۱ ص ۳۵
[23] ایضاً بند ۲ ص ۵۳ [24] ایضاً بند ۵ ص ۵۳ [25] ایضاً بند ۱۳ ص ۵۴
[26] مراثی انیس ج ۳ ص ۱۳ بند ۱ [27] ایضاً بند ۵
[28] ایضاً ج ۲۔ بند ۸۱ ص ۹۱۔ [29] مراثی انیس ص ۹ بند ۵۴
[31] ایضاً ص ۸ بند ۵۵ [33] مراثی انیس ج ۴ ص ۱۸۹ بند ۶
[34] مراثی انیس ص ۱۹۱ بند ۲۳ [35] مراثی انیس ص ۱۳ بند ۱۔ ◆

صفحہ ۳۴۰ کا بقیہ

علی مجبر، علی صادق، علی بینا علی سامع
علی فائق، علی فاتح، علی مانع، علی قانع
علی امر و علی نہی علی حاکم و علی ناقع
علی شافع، علی نافع، علی رافع، علی واقع
علی جامع، علی قاطع، علی حجت، علی برہاں

علی سائق علی صادق علی ثابت علی قائد
علی اشرف علی اعلیٰ علی ناصر علی ماجد
علی کافی علی وافی، علی واجد علی شاہد
علی واحد علی زاہد علی راکع علی ساجد
علی مرشد علی ہادی علی رہبر علی رہباں

امام شرق و مغرب شریف یثرب بطحا
امین وحی پیغمبر، امام مسجد اقصیٰ
علیم و عالم اسرار سبحٰن الذی اسریٰ
علی والی علی عالی علی والا علی اعلا
علی جامع علی فارق علی ادنیٰ علی فرقاں

انیسؔ ان چند بندوں کا صلہ ہے گلشن جنت
نہ گھبرا اس مرض سے بعد ہے ازار کے راحت
نئی طاقت بھی دیں گے ان کو ہے ہر طرح کی قدرت
علی فرحت علی نصرت علی شوکت علی حشمت
علی حکمت علی صحت علی دارو علی درماں

◇◇

صفحہ ۳۲۰ کا بقیہ

مزید ہو گئے ہیں وہ ان کو کل دے دوں گا اور رسید دے دوں گا۔

۲۔ میر انیسؔ کے مراثی کے علاوہ غیر مطبوعہ کلام مسعود صاحب کی قلمی جلدوں میں رہ گیا ہے وہ نقل کر کے دے رہا ہوں یا اس کے ہر بند کی مطابقت کر کے نشاندہی کر رہا ہوں۔ یہاں شہاب صاحب اور اطیب صاحب بذاتِ خود بہت مشغول ہیں لہٰذا ان کو ایک نقل کرنے والے کی ضرورت ہے اس کی اجازت ان کو دے دی جائے وہ بھی خط آج لکھ رہے ہیں۔

۳۔ نفیسؔ کے مخطوطے کا فوٹو کرا کر پرسوں سے آؤں گا...... تمہارا انتظار ہے۔ ایک لڑکا ہو اس کے ساتھ آجاؤ۔ آج میری طبیعت ٹھیک ہے کھانا بھی کھایا۔

تمہارا نائب
۳ رجنوری شام ۱۹۷۵ء علی گڑھ

سید محسن نقوی
نیو جرسی ۔ امریکا

میر انیس: مکالموں کا شاعر

ماں اور بیٹے کی گفتگو

انگریزی زبان کی شاعری میں شیکسپیئر کو سب سے بڑا شاعر ماننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں بہترین شاعری کے ساتھ کرداروں کے مکالمے اتنی خوبی سے پیش کئے ہیں کہ کرداروں کے جذبات اور صورتحال جس میں وہ گفتگو ہو رہی ہے اس کا پورا پس منظر ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔
یہی بات ہم اردو شاعری میں میر انیس کے لیے بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

یہاں منظر یہ ہے کہ عاشور کی صبح طلوع ہو چکی ہے۔ بچہ بچہ جان دینے کی تیاری کر چکا ہے اور ایسے میں خیمہ کے اندر علم سجا کر رکھ دیا گیا ہے۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا ہے کہ علمدار کون بنے گا۔ امام حسین (ع) کی بہن زینب بنت علی (ع) کے دو بیٹے ہیں۔ یہ دونوں جعفر طیار کے پوتے اور امام علی (ع) کے نواسے ہیں۔ جعفر طیار جنگ موتہ میں علمدار تھے اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ امام علی (ع) زیادہ تر جنگوں میں رسول اکرم (ص) کے علمدار رہے۔ اس رشتہ سے یہ دونوں نوجوان اپنے آپ کو علم کا حقدار سمجھ رہے ہیں جناب زینب اس گفتگو کو سن کر بچوں کو تنبیہ کرتی ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں۔

ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص و عام
تیار ادھر ہوا علم سید الانام
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام
روتی تھی تھامے چوب علم خواہر امام
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے
زینب کے لال زیر علم آکھڑے ہوئے

گرد آنے دامنوں کو قبا کے وہ گلعذار
مرفق تک آستینوں کو الٹے بصد وقار
جعفر کا رعب و دبدبۂ شیر کردگار
بوٹا سے ان کے قد پہ نمودار نامدار
آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کے
رایت کے گرد پھیرنے لگے جھوم جھوم کے

گہہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثار شہ امم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا
اماں! کسے ملے گا علم نانا جان کا

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہ خوشخصال
ہم بھی محق ہیں آپ کو اس کا رہے خیال
پاس ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال
اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں نام کے امیدوار ہیں

بے مثل تھے رسول کے لشکر کے سب جواں
لیکن ہمارے جد کو نبی نے دیا نشاں
خیبر میں منہ دیکھتا رہا لشکر گراں
پایا مگر علی نے علم وقتِ امتحاں

طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں کے ہم ہیں انھیں کے نواسے ہیں

زینب نے تب کہا کہ تمہیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجھ کو؟ مالک ومختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجیو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو لوگے زباں سے علم کا نام

لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سر کو ہٹو، بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس
بس قابل قبول نہیں ہے یہ التماس

رونے لگو گے پھر جو برا یا بھلا کہوں
اس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قلیل اور ہوس منصب جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمہارا نہیں عدیل

لازم ہے سوچے، غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

ان ننھے ننھے ہاتھوں سے اٹھے گا یہ علم
چھوٹے قدوں میں سب سے، سنوں میں سبھوں سے کم
نکلیں تنوں سے سبطِ نبی کے قدم پہ دم
عہدہ یہی ہے بس یہی منصب، یہی حشم

رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہے
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہے

پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخر روزگار
زیبا نہیں ہے وصف اضافی پہ افتخار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار
دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کارزار

تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں

کیا کچھ علم سے جعفر طیار کا تھا نام؟
یہ بھی تھی اک عطائے رسول فلک مقام
بگڑی لڑائیوں میں بن آئے انھیں سے کام
جب کھینچتے تھے تیغ تو ہلتا تھا روم و شام

بے جاں ہوئے تو نخل وفا نے ثمر دئے
ہاتھوں کے بدلے حق نے جواہر کے پر دئے

لشکر نے تین روز ہزیمت اٹھائی جب
بخشا علم رسول خدا نے علی کو تب
مرحب کو قتل کر کے بڑھا جب وہ شیر رب
در بند کر کے قلعے کا بھاگی سپاہ سب

اکھڑا وہ یوں گراں تھا جو در سنگ سخت سے
جس طرح توڑے کوئی پتا درخت سے

یہاں قابل توجہ بات یہ ہے کہ میر انیس نے ماں بیٹوں کی گفتگو کتنے سلیقے سادگی اور خوبصورت انداز میں نظم کی ہے۔ آج بھی اگر اودھ کے ماحول میں رہنے والے خاندان کی کوئی ماں اپنے بچوں کو سمجھائے گی تو اس سے اچھے مکالمے کوئی تجویز نہیں کر سکتا۔ یہ شاعری جذبات انسانی کی اتنی اچھی تفصیل ہے اور اس کی زبان اتنی سلیس ہے کہ یہ آج بھی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ سننے والے بے انتہا متاثر بھی ہوتے ہیں۔ ان اشعار پر تنقید کرتے ہوئے حضرت شبلی نعمانی نے اپنی کتاب موازنۂ انیس و دبیر میں بڑی لے دے کی ہے کہ اس قسم کا کوئی واقعہ تاریخ میں نظر

نہیں آتا ہے میر انیسؔ نے یہ سب کچھ کہاں سے لکھ دیا؟
ہم کو یہ واقعہ واجد علی شاہ کے ایک مرثیہ میں بھی ملا ہے
اس کا مطلب یہ ہے کہ میر انیسؔ کے دور میں یہ روایت عام
طور سے دہرائی جا رہی تھی اس کی مقبولیت کی وجہ سے میر انیسؔ نے
اس کو نظم کر دیا ہے اس طرح کی بہت سی کمزور روایتیں مرثیوں
میں نظم ہو گئیں لیکن ان کے لیے شاعر کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ
سب تو آپ تاریخ کے درسی مطالعہ کے وقت طے کریں گے کہ
کون سی روایت قابل قبول ہے اور کون سی نہیں۔ اصل میں یہ دیکھنا
ہے کہ تہذیب اور تمدن کی روشنی میں ایک پورے ڈائلاگ کی افادیت
کیا ہے اور انسانی نفسیات کی روشنی میں یہ مکالمہ حقیقت سے کتنا
قریب تر ہے اس سلسلہ میں پروفیسر احتشام حسین کی رائے بھی قابل
توجہ ہے۔ جہاں تک واقعہ کربلا کا تعلق ہے وہ ایک تاریخی
واقعہ ہے لیکن جب وہ شاعر کی زبان سے بیان ہوتا ہے تو
تاریخ کے مفہوم میں تاریخ نہیں رہ جاتا کیونکہ مرثیہ نگار تاریخ نگار
نہیں ہو سکتا۔

شوہر و زوجہ کی گفتگو

مندرجہ بالا اشعار میں ہم نے میر انیس کے کلام کا ایک نمونہ پیش
کیا جس میں ماں بیٹوں کی گفتگو نظم کی گئی ہے۔ ایک مثال اور ملاحظہ
فرمائیے اس میں شوہر و زوجہ کی گفتگو نظم کی گئی ہے۔ منظر یہ ہے
کہ علم سجا کر خیمہ میں رکھ دیا گیا ہے اور امام حسین (ع) جو کہ
اس مختصر سی سپاہ کے قائد ہیں اپنی بہن زینب بنت علی (ع) سے
کہتے ہیں کہ علم عباس کو دیا جائے۔ عباس بڑے انکسار سے اس
عہدہ کو قبول کرتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں وہیں پر عباس کی
زوجہ بھی موجود ہیں وہ شوہر کی اس عزت افزائی پر خوش بھی ہیں
لیکن ایک ذہین اور سمجھدار خاتون ہوتے ہوئے یہ بھی سمجھ رہی
ہیں کہ علم کا ملنا اصل میں موت کا پیغام ہے کیونکہ آج تو ہر سپاہی
جہاد کر کے اللہ کی راہ میں جان دے دے گا۔ اس تصور کا آنا تھا
کہ بے اختیار آپ پر گریہ طاری ہوتا ہے لیکن چونکہ رشتہ میں
چھوٹی ہیں لہٰذا تہذیب مانع ہے اور وہ بڑے صبر و ضبط کے ساتھ
سامنے کھڑی ہیں۔ گود میں چھوٹا سا بیٹا ہے۔ ماں کی آنکھوں میں
آنسو دیکھ کر بچہ بھی رونے لگتا ہے۔ ایسے میں عباس زوجہ کو تسلی
دیتے ہیں یہ خیال رہے کہ یہ گفتگو شوہر و زوجہ کی پرائیویٹ
گفتگو نہیں ہے بلکہ چھوٹے بڑے سب سامنے ہیں اور سب کچھ
دیکھ رہے ہیں اور سن رہے ہیں۔

کھولا ہے گوندھے بالوں کو صاحب یہ کیا کیا
پیٹو نہ سر کو روتا ہے فرزند مہ لقا
خیر النساء کے لال پہ ہوتے ہیں ہم فدا
شادی کا ہے مقام کہ ماتم کی ہے یہ جا
ایذا میں صبر صاحب ہمت کا کام ہے
میری بھی آبرو ہے تمہارا بھی نام ہے

یہاں ایک بار ہم پھر دیکھتے ہیں کہ میر انیس نے کس حسن اور
مہارت کے ساتھ انسانی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے اشعار
میں اس منظر کو مقید کر لیا ہے۔ شاعری کی سب سے مشکل منزل یہ ہے
کہ کرداروں کے ڈائلاگ کو ایسا نظم کیا جائے کہ پڑھنے والے
اور سننے والے کے سامنے پورا منظر ایک متحرک تصویر بن کر سامنے
آ جائے۔ میر انیسؔ اس آرٹ کے ماہر ہیں۔ اس بند میں میر انیس
تین پیغامات بیک وقت دے رہے ہیں۔

۱۔ حضرت عباس ایک ماہر سپاہی اور جنگ جو قائد ہیں۔ سپاہی
کی طبیعت میں سختی کا ہونا ضروری ہے ورنہ وہ کسی کو قتل کرنے کے
لیے تلوار کیسے اٹھائے گا؟ لیکن وہی جنگ جو سپاہی جب اپنی
زوجہ سے بات کرتا ہے تو اس کا لہجہ کتنا نرم ہو جاتا ہے۔ میر انیس
بتانا یہ چاہ رہے ہیں کہ رسول (ص) کے گھرانے کی تہذیب کیا ہے
اور اس خاندان کے مرد اپنی خواتین کا کس قدر احترام کرتے ہیں
تیسرے مصرع میں اس نکتہ کو مزید تقویت ملتی ہے۔ اس ڈائیلاگ
میں تہدید تو ہے لیکن تسکین کے ساتھ اور ایک شریف اور پروقار
مرد مشکل وقت اور مصیبت کے سامنے اپنی زوجہ کو ہمت دلاتا ہوا
نظر آ رہا ہے۔

(۲) دوسرا پیغام شاعر کا یہ ہے کہ اودھ کی تہذیب میں گھر کے اندر مرد عورتوں سے کیسے مخاطب ہوتے تھے شوہر و زوجہ ایک دوسرے کو لفظ صاحب سے مخاطب کرتے ہیں۔

(۳) تیسرا پیغام یہ ہے کہ اودھ کی تہذیب جو بن رہی تھی وہ اہل بیت اطہار (ع) کی تعلیمات کے عین مطابق تھی۔

تیسرا مصرعہ خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ میرانیس چاہتے تو اس کو یوں بھی نظم کر سکتے تھے۔

خیر الوری (ص) کے لال پہ ہوتے ہیں ہم فدا

چونکہ امام حسین کی سب سے بڑی فضیلت یہی ہے کہ وہ رسول (ص) کے نواسے ہیں اور یہ مصرع یوں بھی ہو سکتا تھا۔

مشکل کشا (ع) کے لال پہ ہوتے ہیں ہم فدا

لیکن یہاں عباس اپنی زوجہ کی نفسیات کی روشنی میں ان کے ان کے نسوانی وقار اور احساس تفاخر کی طرف خود ان کی توجہ دلا رہے ہیں کسی بھی خاتون کے لیے اس کی بڑی فضیلت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا شوہر اس صاحب مرتبہ انسان پر قربان ہو جائے جو اس خاتون کا بیٹا ہے جس کو اللہ اور رسول نے خیر النساء کہا ہو۔

یہاں پر میرانیس کے سامنے تاریخ کی وہ سب روایتیں ہیں جس میں ہم نے دیکھا ہے کہ رسول اکرم (ص) اپنی بیٹی کی کتنی قدر کرتے تھے مسجد میں جب جناب سیدہ (ع) تشریف لائیں تو سروقد کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے تھے اور آپ کو اپنی جگہ بٹھاتے تھے۔ صحابہ (رض) میں سے جو بھی موجود ہوتا تھا ان سب سے تعارف کرواتے تھے جب کہیں سفر پر تشریف لے جاتے تو سب سے آخر میں بیٹی سے رخصت ہوتے تھے جب سفر سے واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے بیٹی کے دروازے پر آکر خیریت پوچھتے۔ پھر آیات قرآنی کی روشنی میں وہی خاتون جھوٹوں کے مقابلہ میں صدیقہ اور طاہرہ بن کر آئی تھی اسی لیے خیر النساء کہہ لائیں۔

ہم یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہ گفتگو عقیدہ کی نہیں ہے بلکہ یہ وہ تفصیلات ہیں جن کے بغیر میرانیس کے کلام کی روح تک پہنچانا ناممکن ہے ہمیں یہ جاننا ہے کہ شاعر کن جذبات اور احساسات کے تحت یہ اشعار نظم کر رہا تھا۔

اس منزل پر ہم ایک دوسرا نکتہ بھی واضح کرتے چلیں اب جبکہ عزاداری کا انداز بہت بدل گیا ہے اور طویل مرثیہ خوانی کی جگہ مجلسوں میں تقاریر نے لے لی ہے تو اب میرانیس کے مرثیوں کی افادیت کیا رہ گئی ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میر انیس کے کلام کی پوزیشن اردو ادب میں وہ ہے جو انگریزی ادب میں شیکسپیئر کی ہے۔ فی زمانہ کوئی انگریزی داں شیکسپیئر کی زبان میں گفتگو نہیں کرتا لیکن انگریزی زبان و ادب کو سیکھنے کے لیے شیکسپیئر کا مطالعہ بہت ضروری ہے بلکہ اب جو شیکسپیئر درسگاہوں کو پڑھایا جا رہا ہے وہ اصلی شیکسپیئر ہے ہی نہیں شیکسپیئر کا سارا کلام آسان اور جدید انگریزی میں منتقل کر دیا گیا ہے اور کم سے کم شروع کے درجات میں وہی آسان شیکسپیئر پڑھایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ شیکسپیئر نے زبان و بیان کے جو اصول اپنی تصنیفات میں وضع کرد ئے ہیں ان کا اطلاق آج بھی اسی طرح سے ہو رہا ہے جیسا کہ آج سے پانچسو برس پہلے تھا۔ اور شیکسپیئر نے انسانی نفسیات کے جو مظہر پیش کئے ہیں ان کی حقیقت اتنی مسلم ہے کہ وہ آج بھی ویسے ہی انسانی معاشرہ پر پورے اتر رہے ہیں جیسے کہ شیکسپیئر کے زمانے میں تھا بالکل یہی مقام میرانیس کے کلام کا اردو میں ہے لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں اردو کی اصلی روح سے متعارف ہو سکیں تو پھر ہمیں بھی شروع سے آخر تک تعلیم کی ہر منزل پر میرانیس کا کلام پڑھانا ہوگا۔ یہ ضروری ہو گیا ہے کہ میر انیس کے کلام کو عزا خانوں سے نکال کر درسگاہوں تک پہنچایا جائے۔ زبان سکھانے اور شعر کا صحیح شعور حاصل کرنے کے لیے میرانیس کا گہرا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ جوش سے لیکر اقبال اور فیض تک سبھی نے میرانیس سے استفادہ کیا ہے یہ بھی ضروری ہے کہ میرانیس کے کلام کو مذہبی جذباتیت سے الگ ہو کر خالص تنقید اور تبصرہ کی نظر سے دیکھا جائے۔

(بقیہ صفحہ ۳۶۱ پر)

تقی شبیر رضا
۱۴/۷ صوفیانہ، ردولی فیض آباد ۲۲۴۱۲۰
9651510225

مرثیہ خوانی اور دبستان انیسؔ

کتنی عجیب بات ہے کہ میر صاحب کی مرثیہ گوئی پر تو اہل علم نے دریا بہا دئے ہیں دعا دیجئے علامہ شبلی نعمانی کو کہ انھوں نے ''موازنۂ انیس و دبیر'' لکھ کر مرثیہ کی اصل قدر و قیمت سے اہل اردو کو روشناس کیا اور فصاحت و بلاغت کے ان رموز سے اردو والوں کو آگاہ کیا جو باقاعدہ کتابی شکل میں موجود نہ تھے اور انھیں کی وجہ سے فصاحت و بلاغت کے وہ مدارج جو صرف عربی زبان کی کتابوں میں تھے ہم تک اتنے آسان اسلوب میں پہنچ سکے جس پر سر تیج بہادر سپرو کو لکھنا پڑا کہ جس نے میر انیس کے پاکیزہ اور شفاف چشمے کا پانی نہیں پیا وہ طالب علم اپنے کو اردو ادب کا شناور نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اب مجھے کہنے دیجئے کہ جس نے میر صاحب کے طرز خواندگی کو نہیں سمجھا وہ اپنے کو طرز گفتگو کا ماہر نہیں کہہ سکتا اور وہ اردو زبان کے روزمرہ اور ساختیات کو اس طرح ادا نہیں کر سکتا کہ سننے والا اس کے حسب منشاء متاثر ہو سکے۔

اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بات کرنے والے نے مناسب اور شائستہ الفاظ میں بات کہی لیکن مخاطب پر وہ اثر نہیں ہوا جو مطلوب تھا کیونکہ وہ اردو لہجہ پر قدرت نہیں رکھتا تھا روزمرہ کے درست لہجہ سے ناواقفیت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی اور اب صورتحال یہ ہے اساتذہ راشد الخیری اور ڈپٹی نذیر احمد کے افسانوں اور ناولوں کو اسی لہجہ کے ساتھ نہیں پڑھا سکتے جو فرق ہے اسی وجہ سے طلباء بھی اس طرح بات نہیں کر پا رہے ہیں جس طرح کرنا چاہئے مگر اس مسئلہ کو دو سو سال پہلے مرثیہ گویوں نے محسوس کر لیا تھا۔ ان کے اصل سامع عوام الناس تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ان کی دلچسپی کا بھی سامان ہو اور مقصد یہ تھا کہ وہ بھی مہذب زبان سیکھ جائیں اور ویسی ہی زبان بولیں۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے جس کا اندازہ لکھنؤ کی اس زبان سے ہوتا ہے جو بیسویں صدی کے نصف اول تک رائج تھی جس نے لکھنؤ کو تہذیب و شائستگی کا گہوارا بنا دیا تھا۔ وہ عوام جو لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتے تھے ایسے انداز سے بات کرتے تھے کہ باہر سے آنے والے منہ دیکھتے رہ جاتے تھے مگر انقلاب زمانہ کو کیا کہئے کہ ان باتوں کو بیان بھی کیجئے تو شاید لوگ یقین بھی نہ کریں لیکن ہوا یہی تھا۔ پورے کا پورا معاشرہ اس مرثیہ خوانی اور اس کے لب و لہجہ سے متاثر ہوتا تھا اور ایسی بات چیت میں وہی شریفانہ نرم گفتاری اور شائستگی کا خیال رکھتا تھا جو مرثیہ کی طرز خواندگی نے معاشرہ کو غیر محسوس طور پر بہم پہنچائی تھی۔

مجالس بڑے بڑے امام باڑوں کے عالیشان بارہ دریوں میں ہوتی تھیں جہاں شفاف چاندنیوں اور نرم و گداز

قالینوں پر منبر کے قریب دیدہ زیب گاؤ تکیے بھی لگے ہوتے تھے اس لیے عوام بھی صاف ستھرے کپڑے پہن کر مجلس میں آتے تھے۔ نہایت تہذیب و شائستگی کے جامہ میں رہ کر بیٹھتے تھے تعریف کے لیے زیادہ تر ہاتھ بلند کرتے تھے کہ ناحق کا شور نہ ہو۔ مرثیہ خوان کی نظر پورے مجمع پر خود اعتمادی کے ساتھ رہتی تھی جس کی وجہ سے مجمع ہمہ تن گوش ہوکر مرثیہ کو بڑے دھیان سے سنتا تھا اور یہ دیکھنے کے لیے منتظر رہتا تھا کہ کس لفظ اور فقرہ کو کس خوبی سے ادا کیا اور کہاں پر مناسب طور پر ایسا اشارہ کیا کہ لطف آگیا۔

مرثیہ خوانی کا لطف جو ہم سنتے چلے آرہے ہیں اس موضوع پر کسی نے قلم اٹھایا ہی نہیں ۱۹۵۲ء میں جب میں سلطان المدارس میں زیر تعلیم تھا اور اسی زمانہ میں چودھری محمد علی ردولوی بلرام پور کے اسپشل وارڈ میں زیر علاج تھے میں ان کو دیکھنے کے لیے گیا تو وہ احتشام صاحب سے فرما رہے تھے کہ انھوں نے ممتاز حسین جونپوری سے سرفراز اخبار میں اپیل کی ہے کہ میر انیس نے جب یہ مصرع پڑھا۔

لشکر ہے چاروں سمت میں چاروں سے لڑائی ہے

تو میر صاحب نے صرف "لشکر ہے چاروں سمت میں" پڑھ کر کچھ اشارہ کیا اور حاضرین مجلس نے خود "چاروں سے لڑائی" کو دہرا دیا تو آخر وہ کیا اشارہ تھا۔ اب میں نے تو اپیل کر دی ہے دیکھیں وہ کیا لکھتے ہیں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ممتاز حسین صاحب جونپوری نے ان کی فرمائش پوری کی یا نہیں پوری کی۔ غالباً چودھری صاحب ان سے طرز خواندگی پر مضمون لکھوانا چاہتے تھے مگر جب میں نے ایک موقع پر جونپوری مرحوم سے اس کا تذکرہ کیا تو انھیں نے کہا کہ میر صاحب کے لیے کچھ مشکل تھا۔ انھوں نے صرف چار انگلیوں سے اشارہ کر دیا ہوگا۔ اس زمانے کے لوگ زبان اور قافیہ و ردیف سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ اور مصرع اٹھانے کا ان میں شوق بھی تھا۔

آج سے ۴۷-۴۸ سال قبل میں نے ایک مضمون طرز خواندگی پر حسّان جونپوری کے طرز خواندگی کے حوالے سے لکھا تھا اور وہ سرفراز لکھنؤ میں شائع بھی ہوا تھا امید تھی کہ اس کے بعد اور بھی شاید چھپیں لیکن جہاں تک مجھے علم نہیں ہے کہ ایسا ہوا تھا۔

مجھے ایک مخطوطہ مضمون مجاہد آزادی اویس قرنی مرحوم کے بیٹے وہب کلبی کے بدست ملا جو صفدر عباس صاحب کے پاس تھا جس میں میر اولاد حسین آہؔ تعلقہ دار کنتور کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے اور میر انیسؔ مرحوم کے طرز خواندگی کے متعلق ہے لیکن اس کا ایک خاص حصہ جو میر انیسؔ کی طرز خواندگی سے متعلق ہے روزنامہ آگ لکھنؤ میں اودھ دربار کے زیر عنوان بھی ۵ جون ۲۰۱۱ء کے میگزین میں شائع ہو چکا ہے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی درج کر دوں جس سے طرز خواندگی کی خوبیوں پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

میر انیس صاحب قبلہ کی وفات کے بعد ہر سال کی ۲۵ رجب کی اس مجلس میں جو میر انیسؔ کے لیے تھی۔ اسی دلارام کی بارہ دری میں میر نفیسؔ ہر سال اپنا نو تصنیف مرثیہ پڑھا کرتے تھے۔ تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی تھی۔ لوگ بارہ دری کے باہر کھڑے کھڑے میر نفیسؔ کی مرثیہ خوانی محویت کے عالم میں سنا کرتے تھے۔ خواندگی کے اعتبار سے میر نفیسؔ کا جواب نہ تھا۔ دلارام کی بارہ دری میں ۲۵ رجب کی مجلس تاریخی اہمیت رکھتی تھی۔ میر نفیسؔ کے طرز خواندگی سے متعلق ایک واقعہ مشہور ہے۔ میر نفیسؔ مرثیہ پڑھ رہے ہیں صاحبزادگان زینب کا حال ہے میر اولاد حسین صاحب آہؔ تعلقہ دار کنتور جو انیسؔ و مونسؔ کو دیکھے ہوئے تھے بندگانہ انداز سے شہ نشین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میر نفیسؔ نے جب

یہ بیت پڑھی ،،ستم شعاروں نے یوں گھیر گھیر کر مارا،،
تعلقدار صاحب نے کہا مصرعہ نہیں کھینچا۔ ان کو اتنے بڑے
شخص پر تنقید پر تکلف نہ ہوا اور آواز اس قدر بلند تھی
کہ مجمع نے بھی سنا اور میر صاحب کے کان میں صدا گئی
اس نقد و نظر کے بعد زیر منبر لاتعداد حاضرین کی نگاہیں
میر اولاد حسین آج تک پہنچیں اور میر اولاد حسین آہ نے کہا دیکھو میں
اس مصرعہ کو پڑھتا ہوں۔ اس ولولہ اور شان سے مصرعہ کو پڑھا
کہ پوری مجلس قابو میں آگئی اور سامعین کو زیر و زبر کر دیا۔۔۔
جب میر اولاد حسین مصرعہ کو ادا کر چکے تو میر صاحب نے فرمایا
اچھا اب مجھے دیکھئے پھر اس مصرع کو ٹھاٹ سے ادا کیا
مجمع کا جو ماحول تھا نہ پوچھئے۔ میر اولاد حسین نے اپنی جگہ سے
کہا۔ آج تو آپ نے بڑے میر صاحب کو یاد دلا دیا۔ میر نفیس
نے جواب الجواب میں صرف نگاہیں نیچی کرکے کہا ادنیٰ کو
اعلیٰ سے کیا نسبت۔

یہ بیت میر نفیس کے اس مرثیہ کی ہے جس کا مطلع ہے۔

بیاض صبح کا جب چرخ پر ظہور ہوا

پورا بند یہ ہے۔

ادھر تو اس نے دبا کر پرے کئے مسمار
ادھر سے رول لیا اس نے فوج کو یک بار
وہ سوئے میمنہ پہنچا علم کئے تلوار
یہ میسرہ پہ اڑاتا ہوا گیا رہوار
غنائیں تازیوں کی پھیر پھیر کر مارا
ستم شعاروں کو یوں گھیر گھیر کر مارا

مندرجہ بالا اقتباس میں ،،مصرع نہیں کھینچا،، اور ٹھاٹ
سے ادا کیا۔ مرثیہ خوانی کی اصطلاحی زبان کے فقرے ہیں
جن کے خاص معنی ہوتے ہیں۔
مصرع نہیں کھینچا کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کھینچ کر نہیں
پڑھا بلکہ یہ ہے جس خاص لفظ کو کھینچ کر یا جتنا کھینچنا
چاہئے تھا نہیں کھینچا۔

بند کو غور سے پڑھیں تو صورتحال یہ ہے کہ دونوں
بھائی عون و محمد جنگ کر رہے ہیں ایک لشکر کے میمنہ
(دایاں حصہ لشکر) پر گیا اور دوسرا میسرہ (بایاں حصہ لشکر)
دونوں طنابیں پھیر پھیر کر حملہ کر رہے ہیں۔ بیت کے دوسرے
مصرع میں ،،یوں،، کا لفظ بہت اہم ہے۔ اگر مصرعہ کو سرسری
طور پر پڑھیں تو مصرع بالکل بے جان ہے لیکن ،یوں،
کے لفظ کے اشاروں سے وضاحت کرتے جائیں تو یہی
بے جان سا ،یوں، کا لفظ معنویت سے بھرپور ہو جائیگا۔
،ٹھاٹ، سے ادا کیا۔ مرثیوں میں رجز اور جنگ کے
مناظر کی ویسی ہی تصویر کشی کرنا جیسی حالت جنگ میں ہوتی
ہے جس میں تلوار، نیزے، خنجر کو اسی طرح استعمال کرتے
ہوئے دکھاتے ہیں جس طرح جنگ میں کوئی کرتا ہے
مگر مجلس میدان جنگ نہیں ہے اس لیے اشارے
بہت سبک اور نازک ہوتے ہیں اور صرف وہ ہیں
پر کئے جاتے ہیں جہاں مرثیہ گو نے خاص لفظ اشارے
کے لیے رکھ دیا ہے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو مرثیہ خواں
مجمع کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ یوں تو اشارے چہرہ
سے لیکر دعا بد دعا تمام ارکان میں کئے جاتے ہیں۔
میر صاحب حالات جنگ، آلات جنگ اور ان کے صحیح
استعمال سے واقف تھے اس لیے وہ کامیاب ترین شخص
تھے ساتھ ہی ساتھ آداب مجلس و منبر کا لحاظ بھی
رکھنا ہوتا ہے اس لیے تیوریوں اور چتون سے چہرہ
پر موقع کے مناسب جذبات طاری کرکے زیادہ فائدہ
اٹھایا جاتا ہے ورنہ مجلس کی سنجیدگی اور تہذیب قائم
نہیں رہ سکتی۔ خاص طور پر مرثیہ خوانی کی شخصیت کا دبدبہ
اور سنجیدگی اور بردباری کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ یہی
سبب تھا کہ میر انیس تازہ مرثیہ پڑھنے سے پہلے ایک
ایسے آئینہ کے سامنے بیٹھ کر پڑھتے تھے جس میں وہ اپنے
چہرہ ہاتھوں اور جسم کے گھماؤ پھراؤ کو بھی دیکھ سکیں

اور جہاں کہیں نامناسب ہو اس کو صحیح کر لیں ان کے لیے
مشہور ہے کہ ان کو اپنی ٹوپی کو درست کرنے میں کافی وقت
لگتا تھا اور پھر وہ اپنے قدموزوں کے ساتھ چہرے پر
بڑی وجاہت رکھتے تھے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں چوڑی
روشن پیشانی، کتابی چہرہ شفاف چہرہ پر مردانہ مونچھیں
لمبی گردن اور زیب تن محض براق کرتا جن کی آستینیں سلیقہ
سے چنی ہوئی ہوتی تھیں اور سر پر نزاکت سے رکھی
ہوئی ٹوپی جو شخص اتنی محنت کرتا ہو اگر وہ اپنے
فن مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی میں اعلیٰ نہ ہو گا تو کون ہو گا۔

میر صاحب کا طرز خواندگی جادوئی کرشمہ سازی کی
حد تک پہنچا ہوا تھا جس کی طرف منشی ذکاء اللہ نے اشارہ
کیا ہے وہ الہ آباد میں تھے انھیں معلوم ہوا کہ آج میر
صاحب مرثیہ پڑھیں گے۔ یہ بھی گئے لیکن مجمع اس
قدر تھا کہ وہ منبر سے اتنا زیادہ دور رہ گئے کہ میر
صاحب کی آواز بھی سن نہیں پا رہے تھے مگر مجمع محو سماعت
تھا ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی بوڑھی جادوگرنی اپنے
جادوئی ڈنڈے کو گھما گھما کر جادو کر رہی ہو۔

ایک بار ذوالقدر محمد محسن حسان جونپوری میر نفیس مرحوم
کے طرز ادائگی کے بارے میں فرمانے لگے۔ مرثیہ حضرت
عباس کی شان میں ہے۔ اس کے ایک مصرعہ "ہم سے
اور جنگ کریں یہ عرب صحرائی" کو پانچ طریقے سے ادا
کرتے تھے۔ اور پھر خود پڑھ کر سنایا۔

۱۔ ہم کی میم پر تفاخر کے جذبے کے ساتھ زور دیکر پڑھا
۲۔ دوبارہ حیرت کے تاثر کے ساتھ جنگ پر زور دیکر پڑھا
۳۔ یہ پر زور دے کر، چہرہ پر تحقیر کے تاثرات کے ساتھ پڑھا۔
۴۔ نہایت حقارت کا تاثر صحرائی پڑھتے وقت کیا۔
۵۔ نہایت یاس و مایوسی کے ساتھ ذرا دھیمے لہجہ میں ادا کیا۔

خود حسان جونپوری مرحوم بھی کبھی کبھی ایک ہی مصرعہ کو
دو یا تین طرح سے پڑھتے تھے اور مجمع ان کے کمال خواندگی
کو حیرت سے دیکھتا اور سنتا تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ حضرات طرز خواندگی کا
کمال کیوں دکھاتے تھے؟ اس کے مختلف اسباب تھے۔

۱۔ مرثیہ بہت طویل ہوتے تھے دو سو بند تک کے ان
حضرات کے مرثیے ہوتے تھے ان کو پڑھنے میں وقت بھی
بہت لگتا تھا۔ اگر وہ یوں ہی پڑھ دیا کرتے تو مجمع اکتا
جاتا اور محو سماعت نہیں ہوتا۔

دوسرا سبب یہ تھا کہ طرز خواندگی ہی کی وجہ سے
مرثیہ خواں مجمع کو متوجہ رکھنے میں کامیاب رہتا تھا ان کو
ذاکرین کی طرح توجہ چاہتا ہوں نہیں کہنا پڑتا تھا
مرثیہ گو۔ کہتے وقت طرز خواندگی کی ضرورت کو پیش
نظر رکھتے ہیں یہ بات ایک واقعہ سے واضح ہو جائے
گی۔ میر انیس نے جب مرثیہ کہنا شروع کیا تو اپنے والد
میر خلیق کو سناتے تھے میر انیس نے مصرعہ پڑھا۔

جس طرح سے ہے مدّالف آفتاب پر

میر خلیق نے کہا اسے یوں پڑھو۔

جس طرح سے ہے 'مدّ الف' آفتاب پر

آپ توجہ دیں کہ پہلا مصرع کس قدر سبک ہے
جبکہ دوسرے مصرعہ میں مدّ کے ادا کرنے میں خود بخود زور
پیدا ہو گیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ وہی ہیں صرف
اعراب میں فرق آیا ہے اور نتیجہ یہ نکلا کہ اشارہ کرنے
میں بھی آسانی پیدا ہو گئی اور لسانی خوبی بھی پیدا ہو گئی۔
یہی وجہ تھی کہ جونپور کے ذوالقدر اپنے بچوں کو چار سال
کی عمر سے مرثیہ خوانی کی مشق کراتے تھے اور تبھی اچھی
مرثیہ خوانی ممکن بھی ہے۔ مرثیہ کے کچھ مبادیات ہیں جن
سے واقفیت ہونا چاہئے۔

۱۔ مرثیہ تحت اللفظ میں پڑھا جاتا ہے اس میں بھی

ایک دھن ہوتی ہے اور دھن کا مطلب ہوتا ہے۔ ایک متعین وقفہ اس وقفہ کی پابندی ہر قیمت پر کرنا چاہئے بعض لوگ زور بیان یا جوش میں اس امر کا خیال نہیں کرپاتے اس وقفہ کا تعین اس بحر کے وزن سے ہوتا ہے جس میں مرثیہ نظم کیا جارہا ہے۔

۲۔ لہجہ کا اتار چڑھاؤ یہ سب سے مشکل کام ہے کیونکہ لہجہ کے اتار چڑھاؤ کا تعلق روزمرہ سے ہے جو لوگ روزمرہ ہی نہ جانتے ہوں وہ صحیح لہجہ سے پڑھنے میں ناکام رہیں گے۔ دور حاضر میں ناکام مرثیہ گوئی کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

۳۔ بحری اور نثری ترتیب کے لحاظ سے اتار چڑھاؤ۔

عرش اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں ان کی
وجد کرتے تھے ملک سن کے صدائیں ان کی
وہ عمامے، وہ قبائیں، وہ عبائیں ان کی
حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں ان کی

دوران خواندگی لہجہ میں اتار چڑھاؤ لازمی ہے خواندگی کے لحاظ سے جہاں جہاں ہلکا سا وقفہ دینا چاہئے وہاں پر میں نے کاما (،) لگا دئے ہیں۔

تیسرے مصرعہ میں تین اشارے بھی کئے جاسکتے ہیں سر کی طرف اشارہ کرکے وہ عمامے کہا جائے پھر سینے سے گھٹنے تک اشارہ کرکے وہ قبائیں کہا جائے پھر گردن سے کمر تک اشارہ کرکے وہ عبائیں کہا جائے۔

پہلے مصرعہ کی ابتدا میں عرش اعظم کہتے وقت ہم پر زور دینے کی وجہ سے عرش اعظم کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے

روزمرہ کی ادائگی: اہل زبان کی طرح روزمرہ کا تلفظ اور ادائگی جتنی مشکل ہے اس سے زیادہ اہم ہے غیر اہل زبان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔

پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

پہلے مصرعہ میں آ آ کے پہلے آ کو ہلکا لیکن دوسرے آ کو ذرا زیادہ کھینچا جائے گا۔ اس طرح کی نازک غلطیاں بھی تنک مزاج اہل زبان کو ناگوار گزرتی ہیں۔

۴۔ جذبہ کی مناسب عکاسی: جو بات شعر میں کہی گئی ہے چہرہ پر وہی جذبہ طاری ہونا چاہئے۔

۵۔ ارکان مرثیہ کے لحاظ سے چہرہ کے تاثرات میں فرق آنا چاہئے۔ میر انیس لفظ وہ کا استعمال بکثرت کرتے تھے جس سے عام طور پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ شعر کو موزوں کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں بلکہ یہ ان کی چابکدستی ہے خواندگی کے لیے انھوں نے وہ کا لفظ استعمال کیا ہے اس طرح وہ سامعین کو اسی تخیلی فضا میں لے جاتے ہیں جہاں وہ خود ہوتے ہیں۔

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوان طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

پہلے مصرع میں وہ کو تین بار لائے ہیں اور ہر مرتبہ ایک الگ اشارہ اس طرح کرتے تھے کہ سامعین دم بخود ہو کر اسی مینو اساس منظر میں کھو جاتے تھے۔

میر انیس کو یہ فن بھی آتا تھا کہ نہایت گوارا فضا میں سامعین کو لانے کے بعد ایک دم سے ایسی بات کہہ دیتے تھے کہ مجلس میں کہرام مچ جاتا تھا۔

حسب ذیل بند میں بھی میر انیس وہ کی خوشبو سے مجلس کو معطر کر گئے۔

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جا بجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار

خواہاں تھے زہر گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

کٹورے گلاب کے، کہتے وقت ہاتھ کو اس طرح بناتے جیسے کٹورا پانی بھرا لیے ہوئے ہوں اور اس طرح سنبھالتے کہ کہیں گر نہ جائے لیکن بالکل لمحاتی طور پر اور نہایت سنجیدگی سے اور آنکھیں فرط غم سے ڈبڈبا آتی تھیں لیکن نہ منہ بنتا تھا اور نہ آواز بھراتی تھی اور مجلس میں آہ و بکا سے کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

میر انیسؔ کا فن شاعری

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً میر صاحب کے فن کے اس پہلو کو اجاگر کر دوں جس پر قریب قریب قلم اٹھایا ہی نہیں گیا ہے ”موازنۂ انیس و دبیر“ میں صنائع و بدائع کا ذکر ملتا ہے اور پوری وسعت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے لیکن یہ تو اس زمانے کے تمام شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے مگر میر صاحب نے مناظر قدرت، جذبات نگاری اور مرقع نگاری میں حقیقی زندگی کو کبھی نظر انداز کیا جس کی وجہ سے ان کے کلام میں صنائع و بدائع ہاتھ جوڑے کھڑے نظر آتے ہیں سر دست صرف ایک بند کو مثالاً پیش کر رہا ہوں۔

گرمی کی شدت کا بیان

گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ، گرمیٔ روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

محولۂ بالا بند میں نو صنعتوں کا استعمال ہے جو خود انسان کو حیرت میں ڈالنے کے لیے کافی ہے لیکن صنعتوں کا استعمال اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ میر صاحب کا کلام کہیں صنعتوں سے خالی نہیں ہے بلکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ میر صاحب کے معاشرہ کی زبان ہی صنائع و بدائع کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی جب ان کے گھر کی ان پڑھ خادمہ نے مصرعہ لگا دیا: صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے، جس میں تلمیح پائی جاتی ہے یعنی نادر صنعت سے مزین ہے اور مجاز مرسل بھی۔ (۱) پہلے مصرع سے لے کر آخری مصرعہ تک رعایت لفظی ہے (۲) گرداب کو شعلہ جوالہ سے تشبیہہ دی گئی ہے (۳) دوسرے مصرع میں استعارہ سے کام لیا گیا ہے۔
(۴) تیسرے مصرعہ میں حسن تعلیل ہے (۵) چوتھے مصرع میں مگر سے ابہام پیدا کی گئی ہے (اور اسی اس مصرعہ کو دوبار پڑھتے رہے ہوں گے۔ (۶-۷) تضاد اور اتفاق کو ایک دوسرے سے ملا کر دو آتشہ کر دیا ہے (۸-۹) مبالغہ اور غلو پانی تھا آگ مبالغہ ہے۔ ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی غلو ہے۔

انیسؔ کے ارشد تلامذہ میں جون پور کے ذوالقدر بہادر سید ناصر علی ذوالقدر کے ولی عہد ذوالقدر محمد محسن جن کا تخلص بھی محسن تھا۔ سینہ بہ سینہ ذوالقدر محمد محسن حسانؔ جونپوری تک پہنچا۔

میں نے ۱۹۶۰ میں بی ایڈ کا سرٹیفکیٹ جون پور کے راج کالج ہی سے حاصل کیا ہے اس زمانے میں ذوالقدر راہی میں قیام پذیر تھا۔ اس وقت ذوالقدر ناصر علی مرحوم زندہ تھے لیکن ضعیفی کی وجہ سے پڑھنا بند کر دیا تھا۔ اور محمد محسن خاں جونپوری طرز خواندگی میں نقطۂ کمال تک پہنچ گئے تھے۔

میں نے طرز خواندگی کے سلسلہ میں کچھ ایسی باتیں اس طرح لکھی ہیں گویا میں نے خود انیس کو سنا ہو تو اس کی وجہ وہ علم ہے جو محمد محسن حسانؔ جون پوری کے ذریعہ مجھ تک پہنچا۔

○○

ڈاکٹر جاوید احمد

اسسٹنٹ پروفیسر امر سنگھ کالج سرینگر

9906513840

اردو مرثیہ اور انیسؔ کی مرثیہ خوانی کے چند پہلو

اردو شاعری میں غزل کے بعد مرثیہ کو ہی عوام میں مقبولیت حاصل رہی ہے یہی وہ صنف ہے جو اپنے آغاز سے آج تک زندہ اور مسلسل ترقی کر رہی ہے مرثیہ کی مقبولیت کا راز جہاں مذہب سے وابستگی ہے وہیں تہذیبی، اخلاقی اور ادبی محاسن میں بھی مضمر ہے۔ اس کی مقبولیت کے کئی اسباب ہیں جن میں سے زیادہ موثر اور مقبول عام سبب مرثیہ کی جذباتی اور مذہبی نوعیت ہے مرثیہ گویوں خصوصاً میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے اپنی بے پناہ تخلیقی قوت سے مرثیہ کو اعلیٰ و عظیم شاعری کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جس کی مثال عالمی ادب میں بھی نہیں مل سکتی ان ہی مرثیہ نگاروں نے انسانی رشتوں، جذبات و احساسات کی آفاقیت، جمالی اقدار اور شعر کے جملہ محاسن کو پیش نظر رکھا جس کی وجہ سے ادبی ذوق کی بھی تسکین ہوتی ہے۔

میر انیسؔ مرزا دبیرؔ کے ہمعصر تھے زبان کی سلاست و فصاحت کی وجہ سے انیسؔ کے مرثیے عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ محرم کی مجالس میں آج بھی ان کے مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ اپنی قادر الکلامی اور اثر آفرینی سے انیسؔ نے مرثیہ کی زمین کو آسمانی بنا دیا۔ میر انیسؔ زبان کی صفائی بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی عکاسی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ انیسؔ کو فن حرب میں بڑا درک تھا اس لیے جب جنگ کا منظر کھینچتے ہیں تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مرثیوں کا مطالعہ ہم مختلف جہتوں سے کر سکتے ہیں۔ ان میں انسانی رشتوں سے وابستہ جذبات کا اظہار بھی ہے، تہذیب کی عکاسی بھی ہے اور فطرت کے مناظر بھی ہیں لیکن مرکزی موضوع رزم کا بیان ہے مرثیہ نگاروں نے رزمیہ کو جس مقام تک پہنچایا اس کی دوسری مثال اردو میں داستان امیر حمزہ یا بوستان خیال کے سوا کہیں نہیں ملتی۔ اردو میں رزمیہ کی مثال صرف مرثیوں اور داستانوں ہی میں نظر آتی ہے۔ داستان سے میرا مطلب منظوم اور نثری دونوں سے ہے لیکن مرثیہ اور داستان میں بنیادی فرق یہ ہے کہ داستان میں متعدد بادشاہوں اور شہزادوں کے لشکروں کے مابین جنگیں ہوتی ہیں لیکن مرثیہ میں ایک خاندان کے چند افراد ہزارہا سپاہیوں پر مشتمل لشکر سے برسرپیکار ہیں۔ داستانوں کی لڑائیاں مہینوں اور برسوں تک جاری رہتی ہیں جبکہ مرثیہ کی جنگ صرف ایک دن کی جنگ ہے۔ اس کے باوجود مرثیہ نگاروں کی قوتِ بیان نے اس مختصر جنگ کو شاہنامہ کے بیان رزم کے مقابل لا کر کھڑا کر دیا۔

دراصل رزمیہ یا ایپک میں خیر و شر کی جنگ کو پیش کیا جاتا ہے اس میں اچھے اور برے کردار صف آرا

ہوتے ہیں اچھے کردار کی فتح ہوتی ہے کربلا کی جنگ دنیا کی واحد جنگ ہے جہاں امام حسین ہار کر بھی فاتح کہلائے اور یزیدی فوج کو جیت کر بھی ذلت ملی۔ مرثیوں میں واقعات کا بیان حضرت امام حسین کی مدینہ سے روانگی سے شروع ہوتا ہے اس سفر میں راستے کی دشواریاں بھی رزم ہی کا حصہ ہیں پھر جب میدان کربلا میں یزیدی فوجیں انھیں پیش قدمی سے روک لیتی ہیں اور امام حسین وہیں خیمہ زن ہوتے ہیں۔ فرات قریب ہونے کے باوجود انھیں پانی تک نہیں ملتا عجیب بے کسی اور بے کسی کا عالم ہوتا ہے جنگ سے قبل ان واقعات کو بیان کر کے مرثیہ نگاری نے خاص کر میر انیس نے جو فضا سازی کی ہے وہ جنگ کے بیان کو اور زیادہ دردناک بنا دیتے ہیں۔ رزمیہ صرف فوجوں کا مقابل آنا، حملہ کرنا، تلواریں چلانا، گھوڑوں کا دوڑنا ہی شامل نہیں ہے بلکہ اطراف کا ماحول، خیموں کی آراستگی میدان جنگ کا موسم گرمی کی شدت، رات کی ہولناکی غرض کرداروں کے احساسات و جذبات کا بیان بھی رزمیہ کا حصہ ہے دراصل مرثیہ نگار اپنے بیان سے ایک ایسی فضا تشکیل کرتے جو کہ سامعین کو میدان جنگ کا حصہ بنا دیتی ہے شاہنامہ کی روایت کو لے کر چلتے چلتے اردو کے مرثیہ نگار اس سے آگے نکلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور ان سے بھی آگے بلکہ بہت آگے میر انیس بھی نظر آتے ہیں پھر چاہے وہ رزم کے ہنگامے ہوں یا بزم کی رعنائیاں، کردار نگاری ہو یا سراپا نگاری، جذبات نگاری ہو یا منظر نگاری یا پھر فصاحت و بلاغت کی روانی ہو۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف میر انیس کے یہاں نظر آتا ہے اور وہ بھی بڑی ہنر مندی اور کامیابی کے ساتھ۔ ایسا شاید اس لیے کہ میر انیس نے ہندوستانی اور سیکولر عناصر کو اپنے کلام میں جگہ دی اور اس نے عام انسانوں کو مرثیے کی طرف آنے کی دعوت دی۔ انھوں نے اس لکھنوی تہذیب کو اپنے مرثیوں میں محفوظ کر دیا جس کا چرچا آج بھی لوگ فخریہ انداز میں کرتے ہیں یہ مرثیے شرافت کے اعلاترین معیار کا نمونہ ہیں۔

لکھنؤ میں داستان گوئی مثنوی خوانی اور مشاعروں کا رواج عام تھا۔ اس کے پڑھنے والے الفاظ کی ادائگی آواز کے اتار چڑھاؤ اور اپنے حرکات و سکنات سے ایسا سماں باندھتے تھے کہ مجمع مسحور ہو جاتا تھا اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہتا۔ مرثیہ کا شمار بھی ان اصناف میں ہوتا ہے جس میں ڈرامائی عناصر کی کثرت ہے۔ ایک طویل مرثیہ پڑھنے کے لیے زبان و بیان کے ساتھ ساتھ حرکات و سکنات سے کام لینا بھی ضروری ہے اس حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انیس اپنے دور کے سب سے مقبول مرثیہ خواں تھے جو مرثیہ گوئی کے ساتھ مجمع کی نفسیات سے بھی خوب واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی مرثیہ خوانی کے بارے میں بڑے بڑے شعرا اور ادبا ہم خیال ہیں کہ انھوں نے انیس جیسا ماہر فن مرثیہ خواں کبھی نہیں دیکھا وہ لفظوں سے زمین، آسمان، صحرا، فرات وغیرہ ایسی تصویریں کھینچتے ہیں کہ مجمع سحر و مبہوت ہو جاتا تھا اور وہ ساری چیزیں اس کی نگاہوں کے سامنے تصویر بن کر کھڑی ہو جاتی تھیں رزم خوانی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ایسا سماں باندھتے تھے کہ مجمع کھڑا ہو جاتا تھا۔ رزم نگاری میر انیس کے مرثیوں کا ایک اہم پہلو ہے۔

اردو شاعری پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس میں عشق و محبت، ہجر و وصال، شمع و پروانہ گل و بلبل کے تذکروں کے سوا کچھ نہیں۔ اردو شاعری کا مرد محبوب کی جدائی میں روتا رہتا ہے جو انسانی فطرت کے خلاف تھا۔ حوصلہ ہمت بہادری، شجاعت، استقلال، جوانمردی جیسے جذبات اردو شاعری سے تقریباً مفقود تھے۔ قصیدے میں کہیں کہیں ممدوح کی تعریف میں اختصار کے ساتھ جنگ، گھوڑے اور تلوار کا ذکر ملتا ہے لیکن نہایت مبالغے کے ساتھ۔

◇◇

سید علی احمد دانش
انیس ہاؤس۔ کوچۂ میر انیس، چوک لکھنؤ
9839181230

مرثیہ گوئی، مرثیہ خوانی اور سپاہ گری

اردو میں رثائی ادب کی ابتدا تقریباً چار یا پانچ سو برس پہلے دکن میں ہوئی تھی اور اس تحریک عزا نے کچھ ہی عرصہ میں ہندوستان کی چھوٹی بڑی ریاستوں میں اپنے لیے جگہ بنا لی تھی۔ دکن میں محمد علی قطب شاہ، وجہی، ہاشم اور مرزا کے رثائی فن پاروں نے رسول اسلامؐ کے نواسے کی شہادت کے واقعات کو دو دلوں کی دھڑکن بنا دیا تھا۔

رثائی ادب سے خواص اور عوام الناس کی والہانہ دلچسپی اس کی ترقیوں کی ضامن بنی ہوئی تھی۔ ہندوستانی ریاستوں بالخصوص اودھ کے خطۂ پاک میں رثائی ادب کے معماروں کی قدر و منزلت، عقیدت و احترام نے مرثیہ گو اور مرثیہ خواں شاعروں کے حوصلے کو دوچند کر دیا تھا۔ برہان الملک سعادت علی خاں سے جان عالم محمد واجد علی شاہ اختر تک وزیر و امیر اور شاہ و گدا سبھی کے لیے یہ صنف سخن محبوب تھی اور نجات اخروی کا سبب سمجھی جاتی تھی۔ عقیدت کی نرم و لطیف چاندنی میں عود و اگر سے مہکی ہوئی مجلسی فضاؤں نے بلاتفریق مذہب و ملت ہر خاص و عام کے دل کو مسحور کر رکھا تھا۔ حیدری، سکندر، سودا، گدا، احسان، افسردہ، فصیح، دلگیر، ضمیر اور خلیق کی شب و روز کی ریاضتوں اور کاوش سخن نے اردو کے رثائی ادب کو نہ صرف مالا مال کر دیا تھا بلکہ مستقبل کی ترقیوں کے دریچے بھی باز کر دیے تھے۔

مرثیہ گو شعراء کے دوش بدوش ایک طبقہ علماء و واعظین کا بھی سرگرم عمل تھا۔ روضہ خوانوں اور سوز خوانوں کے گروہ میں بھی قابل لحاظ اضافہ ہو چکا تھا۔ "ذکر شہادت" کی فکر نے اردو نثر میں مقالے و دفتر کے لیے بھی راستہ صاف کر دیا تھا۔ ذاکرین اپنے مسودات کی ترتیب، مضامین کی تراش خراش اور لفظوں کے در و بست کی طرف اور زیادہ متوجہ ہو چکے تھے ذاکرین کے گروہ میں صورت امتیاز قائم کرنے کے لیے ان کے اسلوب تقریر کو ذریعہ بنایا گیا تھا۔ اب روضہ خوانوں کی قائم مقامی قاری نثّار اور خطیب بھی کر رہے تھے۔

غرض کہ لکھنؤ میں نظم کے شانہ بشانہ چل کر نثر نے بھی رثائی ادب کی ترقی میں اپنا حق ظاہر کرنے کی کوشش کی منظوم رثائی ادب میں ضمیر و خلیق کی وراثت جس وقت مرزا دبیر اور میر انیس کے ہاتھوں میں پہنچی تو اس وقت ہندوستان کے سیاسی حالات دگرگوں تھے ۱۸۵۷ء کی انقلابی جد و جہد کے بعد ہر طرف پراگندہ ذہنی اور انتشار کا دور دورہ تھا۔ انگریزوں کے دور استبداد کے سائے میں ہندوستان

کا معاشرہ کراہ رہا تھا لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ فرنگی
حاکم اور ان کے فرستادہ دونوں سے مال و دولت سمیٹ
رہے تھے۔ غریبوں کا کیا ذکر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں
جس کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے
علّامہ
جوشؔ
ملیح آبادی نے کہا ہے ؎

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

یہ دَور وہی تھا جسے ادبی تاریخ میں انیسؔ و دبیرؔ سے
منسوب کیا جاتا ہے۔ اسی دَور میں رثائی ادب نے
اپنے عروج کی اہم منزلیں طے کیں اور میر انیسؔ
خدائے سخن بن گئے۔
لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کی جن شعرا نے
بنیادیں استوار کرکے اردو شاعری
کا رفیع الشان قصر
تعمیر کیا اور اسے عالمی ادب
پر عزت و وقار عطا کیا۔ ان
میں تذکرہ دونوں اہم شخصیتیں انیسؔ
و دبیرؔ کی ہیں جو نہ صرف اپنے عہد
کے عدیم المثال مرثیہ گو تھے
بلکہ آج بھی ان کا کلام ساری دنیا
سے خراج تحسین وصول کرتا نظر آرہا
ہے یہ دونوں شاعر ایک ایسے عہد
زریں میں منظر شہود پر آئے جبکہ اہل علم اور اہل زبان کثیر تعداد
میں موجود تھے اور فن شاعری کے قدردانوں سے
لکھنؤ ہی نہیں بلکہ ہندوستان کا طول و ارض چھلک
رہا تھا

دبستانِ میر انیسؔ کے شعرا انسؔ، مونسؔ، نفیسؔ، رئیسؔ، سلیسؔ
جلیسؔ، عروجؔ، عارفؔ، وحیدؔ، سلیمؔ، قدیمؔ، ذکیؔ، جلیلؔ
غیورؔ، فرقتؔ، واثقؔ، واصفؔ، عاکفؔ، فائقؔ، لائقؔ

مشائق، حزیں، جمیل، فائز، مانوس، وحشی وغیرہ پورے ہندوستان میں اپنے رثائیہ کلام کی بدولت بذریعہ خوانندگی ضیا پاشیاں کر رہے تھے۔

دبستان دبیر کے شعرا میں اوج، رفیع، صادق اپنے اپنے طور پر فنی اعتبار سے مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے مظاہرل سے مومنین کے دلوں کو مسحور کر رہے تھے۔

دلستان دبیر کے علاوہ ایک تیسرا خاندان یعنی میر عشق کا کا بھی خاندان تھا اس گروہ کی سربرآوردہ شخصیتوں میں میر عشق کے علاوہ تعشق، ادیب، مودب، رشید حمید، مہذب، تسیم اور شدید اپنے اپنے مرثیوں کی رنگ آمیزیوں سے لکھنؤ اور بیرون لکھنؤ کے رثائی ادب کے پرستاروں کے قلوب کو تازگی اور تابندگی عطا کر رہے تھے۔

یزیدی لشکر

مذکورہ سطور میں جن مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا گیا ان کو سننے کے لیے عوام و خواص بھی زحمتیں برداشت کر کے دور دور سے لکھنؤ آتے اور داد سخن دیتے تھے۔

اس زمانے میں ہندو مسلم کی تخصیص نہ تھی یہاں کے تمام غیر مسلم اردو شعر و ادب کے رموز سے کما حقہ واقف تھے۔ ان میں برج نرائن چکبست پنڈت بشن نرائن دربار، نوبت رائے نظر دھنپت رائے الفت دوارکا پرشاد افق، بی این شر رغا، درگا پرشاد مہر اپنی وہاں موجودگی پر فخر و ناز کرتے تھے۔ انیس بذات خود ہندو شعراء کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ انھوں نے گذشتہ لکھنؤ کی اس رنگا رنگ تقریب کا بر سر منبر اس طرح اظہار فرمایا تھا۔ ؎

تعریف کریں خاص تو ہے کام کی تعریف
کب اہل سخن مانتے ہیں عام کی تعریف

مرثیہ نگاری کا فن اپنی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے لیے اردو عربی، فارسی اور علاقائی زبانوں اور قدیم لکھنؤ کے محاورات، مہذب انداز تخاطب اور فکر کی بلندی کے ساتھ ساتھ وسیع مطالعہ اور مشاہدے کی ضرورت ہے اور سب سے ضروری امر یہ ہے کہ مرثیہ گو/مرثیہ خواں کو مذکورہ تمام باتوں سے کما حقہ واقفیت ہو جو اجزائے مرثیہ کے لیے استادان فن مرثیہ نگاری نے مقرر کئے تھے۔

(۱) مرثیہ نظم کرنے والے کو فن سپاہ گری یعنی فنون جنگ کا جاننا ضروری ہے۔

(۲) اسے ان اسلحہ کے نام بھی معلوم ہونا چاہئے جو معرکوں کے

ادا کرنے کے وقت اسے اسی طرح ادا کرنا بھی مرثیہ خواں کا فرض ہے۔
مثلاً۔ زرہ، ذوالفقار، تلوار شمشیر، تیغ، خدنگ
حسام، تیغ صفہانی، تیغ دودستی
صمصام، پرتلا، شمشیر دودم، دو تیغہ
سروہی، ڈنکا، بھالا، بلّم،
خنجر، بُرچھا، بُرچھی، ڈنکے
ہیکل، قرولی
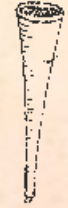
پیش دست
کٹاری، چاؤنش، ترکش
بانک، پٹہ، گرز، طوق، ہتھکڑی
بیڑی، جوشن، بکتر بند، کٹار، ناوک،
شہپور، بانا، دھلکڑی، چار آئینہ، بنوٹ، مگدر
چلّہ، سوفار، شہتا، پیکاں، دَف، بوق، تفنگ، لیزم،
نیزہ، تیر، بکتر، خود، کمان کیانی، تفنگ
نیمچہ، گپتی، شہسواری، چتر سایہ دار
علی مَد، قرنا، کوس، دوٹانک
گدا، کمان، تیر، سیف زنی،
طبل، فرس، نقارہ، جلاجل،
جھانجھ۔

لکڑی کا ٹھاٹ جسم کی
درستگی کے لیے ہلکی ورزش اور قبول صورت
بھی ہونا ضروری ہے۔ مرثیہ کے رزمیہ حصول
کے پڑھتے وقت بندوں کا انتخاب موقع کی
مناسبت سے موزوں و مناسب ہونا
چاہئے۔ اسی طرح گھوڑوں کی اقسام و
صفات کا معلوم ہونا بھی ضروری ہے
میر انیسؔ صاحب کے زمانہ میں اور

ان کی وفات کے بعد بھی
سید ظفر حسین المعروف
بہ بابو صاحب فائقؔ
(خلف) میر عارفؔ کے
زمانے تک میر انیسؔ کے
احاطہ میں جو زنانہ مکان
کے برابر تھا ہر طرح کے
اسلحہ کو چلانے/بتانے کے لیے
روزانہ مشقیں ہوا کرتی تھیں جنھیں نواب سجاد علی صاحب اور
سید ابوالحسن صاحب کرواتے تھے۔

جس طرح اس فن کی مشق
ہوتی تھی اسی طرح دو دو
ڈھائی ڈھائی گھنٹے مرثیہ
پڑھنا بھی بتایا/
سکھایا جاتا تھا۔ فائقؔ
صاحب کے چھوٹے بھائی ہادی
صاحب لائقؔ کے

تلوار کی کاٹی ہے مگر ہاتھ چلایا ہے

نام مردوں کا قسم بازھ پہ تلوار کی ہے

زمانے تک یہ سلسلہ چلتا رہا
وہ فن سپہ گری کے اصولوں
سے خوب واقف تھے۔ گھوڑسواری
شمشیر زنی، لکڑی کا چلانا، فن تیراکی و
پیراکی اور کشتی کے ماہرین میں سے تھے
گاما پہلوان جن کا خطاب رستم زماں تھا
لائے توان سے آکر ملے۔ ملک کی تقسیم کے

یہی وجہ تھی کہ
لکھنؤ تشریف
بعد حالات

بدل گئے اور یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

اس فن سے متعلق تمام سامانِ حرب سرکاری تحویل میں چلا گیا۔

میر انیس صاحب فرماتے ہیں ؎

'تلوار کاٹتی ہے مگر ہاتھ چاہئے'

یعنی تلوار کی اچھی مہارت نہیں تو دشمن مد مقابل چشم زدن میں اسے چھین لے گا یا جدا کر دے گا۔ خود ان کی مہارت فن کا یہ عالم تھا کہ ترنج اور ریشمی رومال کو پلک جھپکتے ہی ایک وار میں دو ٹکڑے کر دیتے تھے اور اکثر صبح کی مشق سپہ گری کے دوران مدِ مقابل کو گٹھری بنا کر انگنائی میں ڈال دیتے تھے۔ وہ تکلیف کی شدت سے پریشان ہو کر چیختا اور کہتا۔ میر صاحب ہمیں معاف کر دیجئے میں مر جاؤں گا تو وہ اپنی نرم مزاجی کی وجہ سے اسے آزاد کر دیتے تھے۔

مرثیہ نگاری و مرثیہ خوانی کے لیے چرند و پرند سے آگاہی اور ان کی آوازوں کے فرق کو جاننا بھی ضروری تھا ورنہ پڑھتے وقت مصرعے بے کیف ہو جائیں گے اور مرثیہ خواں میں مردانہ وجاہت بھی ہو تو اچھا ہے۔ ہم نے جن اسلحہ جات کا ذکر کیا ہے ان کا خاندانِ انیس کے ہر مرثیہ گو شاعر نے اپنے اپنے مرثیوں میں ذکر کیا ہے۔

مضمون کو طوالت کی وجہ سے میں اپنی بات کو یہیں روکتا ہوں اور اپنے بڑے چچا جناب سید ظفر حسین معروف بہ بابو صاحب فائق کے مرثیہ خوانی کی مجلس کا ذکر کرتا ہوں جو اس فن پر بے پناہ عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے یہ فن براہ راست میر عارف میر نفیس اور میر انیس سے حاصل کیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ میں فلم مہندی کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ فلم مہندی میں مجن کمار جو بین دینے والے تھے۔ ابیت اجے شری ریحانہ اور سہراب مودی اپنی فلم شیش محل کے سلسلے میں (بنجاری ٹولہ) آئے ہوئے تھے انھیں دنوں ریحانہ صاحبہ کے یہاں جو لکھنؤ کے محلہ بزازہ میں رہتی تھیں انھوں نے مرثیہ خوانی کی ایک مجلس اپنے دولت کدہ پر پاکی تھی جسے بابو صاحب فائق خطاب کر رہے تھے

ریحانہ سال بھر کے بعد محرم کے زمانہ میں اپنے گھر کے مجلسوں کے منعقد کرنے کے لیے بمبئی سے لکھنؤ آجاتی تھیں۔ ان کے یہاں کی مجلس میں پورا لکھنؤ امنڈ آتا تھا کٹوریوں میں برفی تبرک میں تقسیم کی جاتی تھی جن پر ریحانہ کندہ کیا ہوا ہوتا۔ وہ سیاہ لباس میں بہت اچھی لگتی تھیں ماشاء اللہ ابھی وہ حیات ہیں اور پاکستان کے شہر کراچی میں سکونت پذیر ہیں۔ مومنین کی کثیر موجودگی کی بنا پر ان کے گھر کے اندرونی حصہ تک پہنچنا آسان نہ تھا۔ بابو صاحب کی آواز کا یہ عالم تھا کہ دور دور تک کے لوگ انھیں بغور سن لیتے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کہیں نہیں تہذیب مجلس یہ تھی کہ ہر کس و ناکس خاموشی سے پڑھنے والے کو سنتا تھا۔ اور موقع و محل کے اعتبار سے واہ واہ

اور سبحان اللہ کہتا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ چہرے پر سہراب مودی صاحب منبر سے کافی دور کھڑے رہے ۔ ان کے چہرے پر سیاہ چشمہ لگا تھا ۔ دھوپ تیز تھی وہ سفید سوٹ میں ملبوس تھے ۔ وہ پوری مجلس کو غور سے سنتے رہے ۔ اختتام مجلس کے بعد وہ ان کے پاس آئے اور مصافحہ کرنے کے بعد بابو صاحب سے مخاطب ہو کر کہا ،، میں آپ کو دور سے سن رہا تھا مجھے حیرت ہے کہ آپ موقع و محل کے اعتبار سے آواز میں تبدیلی کے ساتھ ایک ہی وقت میں ہر شخص کے کردار کو اس کے اعتبار سے اس کی تصویر بن جاتے ہیں ،، بابو صاحب نے جواب میں بڑے انکسار کے ساتھ کہا ۔ یہ عطائے مولا ہے ورنہ میں کیا اور میرا پڑھنا کیسا ،، بقول سید محمد ہادی صاحب لائق مرحوم ،، بھیا مرثیہ پڑھتے وقت اپنا پورا پورا زور لگا دیتے تھے ۔ اس لیے جب وہ منبر سے اترے تو ان کا پورا انگرکھا ان کے جسم میں چپک گیا تھا ،، سہراب مودی نے ان سے کہا ...... ہم تو فلم والے ہیں ہر شخص کو اس کے کردار کے اعتبار سے مکالمے لکھوا دئے جاتے ہیں ...... جیسے وہ یاد کر کے ضرورت کے وقت بولتا ہے جناب سید ہاشم رضا صاحب جو عروج و زوال کو لکھنؤ میں سن چکے تھے خود ان کے بھائی آل رضا صاحب جو اچھے مرثیہ گو تھے ان کا ارشاد ہے کہ ،، بابو صاحب پر مرثیہ خوانی کا خاتمہ ہو گیا ،،

فی زمانہ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری و مرثیہ خوانی بس اسی طرح ہو رہی ہے کہ جیسے باغیچہ کا کوئی باغبان و مالی نہ ہو جو وہاں کے پیڑ پودوں کی تراش و آبیاری کرے .... لیکن قدرت خدا کے تحت ہر پھول اپنی نکہت رنگوں سے بظاہر مہکتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اسی طرح کچھ خود رو درخت اور پھول ہیں جو لٹے ہوئے دبستان لکھنؤ میں اپنی مشام جاں سے عطر بیزیاں کر رہے ہیں مگر آخر وہ کب تک ؟ بطور خود اپنے آپ میاں مٹھو بننے سے کیا فائدہ ۔ ہر فن کی ترقی اس کی قدر دانی پر منحصر ہے اور اب ناقدری کا یہ عالم ہے کہ اس فن سے اپنے بچوں کا پیٹ پالنا بھی تو ممکن نہیں نتیجہ یہ ہے کہ جو افراد مرثیہ پڑھ رہے ہیں یا کہہ رہے ہیں وہ دوسرے ذریعوں سے اپنے لواحقین کی تعلیم و تربیت کر رہے ہیں ۔ نئی نسل اردو زبان سے دور ہو گئی ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ غزل صحیح ہے یا مجمل یا یہ مصرع ۔ زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے ۔

اور اسی طرح مذکورہ مصرع زور و شور سے زبانوں پر ہے ۔ بس اب ہر ایک کی زبان پر ٹڈا ہی ٹڈا ہے ۔ میں اس عظیم الشان ملک ہندوستان کسی بھی زبان سے پرہیز نہیں کرتا لیکن ہر لفظ موقع و محل سے استعمال کیا جائے تو بھلا لگتا ہے ، ہر لفظ کو اس کے اپنے لہجہ میں ادا کرنا چاہئے تب ہی اس کا حسن برقرار رہے گا ۔ علامہ شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی صاحب نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر انگ میں پرو کے کرن آفتاب کی
دو پتیاں ہوا میں اڑا دیں گلاب کی

دیکھئے انھوں نے مصرع اول میں لفظ ،، انگ ،، کا کتنا برمحل استعمال کر کے شعر کے لطف کو دوبالا کر دیا کہ اسے ہٹانا ممکن نہیں ۔ اسے کہتے ہیں ،، ہر سخن موقع و ہر نقطہ مقامے دارد ،، خدا اردو پر دوبارہ رحمتیں نازل فرمائے ۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب کے درج ذیل شعر پہ مضمون تمام کرتا ہوں ؎

دکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج اک درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہم نے اس مضمون میں کوشش کی ہے کہ کربلا میں امام عالی مقامؑ اور ان کے رفقا پر جس جس شکل میں تکلیف دہ ایذا رساں اسلحوں اور جن سے ظلم روا رکھے گئے ان کی تصاویر بھی پیش کر دی جائیں ورنہ نئی بدلتی فضا میں کل کون سمجھے گا کہ رسولؐ اسلام کے گھرانے پر کیا کیا شقاوتیں کی گئیں ۔ ٥٥

سید محمد حسن زیدی
حیدری ہوسٹل، گلی شاہ چھڑا ۴۵/۲۳۵ وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ
8527168617

میر انیسؔ کا قدیم ترین مرثیہ

لہو سے لال جو رَن میں علیؑ کا لعل ہوا

اردو کے شعری ادب میں غزل، قصیدہ، سلام، رباعی اور مرثیہ کو زمانۂ قدیم سے اولیت حاصل رہی ہے۔ قصیدہ نگاری کو اہمیت اس لیے ہے کہ اسلام کے اولین دور میں اسے بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ عربی زبان کے شعراء نے ایسے ایسے قصیدے کہے جو عربی ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہی حال غزل کا بھی ہے۔ عربی و فارسی زبان کے شعراء نے اس صنف سخن کی بھی خوب خوب آبیاری کی اور ہمارے ملک ہندوستان میں پہلے فارسی پھر اردو میں یہاں کے باذوق شعراء نے اپنے ندرت خیال اور رنگینیٔ طبع کے جوہر دکھائے ان میں میرؔ، مومنؔ، ذوقؔ، حسنؔ اور غالبؔ بڑی افادیت کے حامل ہیں۔

اسی طرح کا انداز سلام گوئی کا بھی رہا قطب شاہی دور سے اب تک یہ صنف سخن خوب پھول پھل رہی ہے۔ دکنی شعراء کے بعد دہلی میں میر ضاحکؔ، سوداؔ اور میر حسنؔ نے صنف سلام میں خوب خوب گل بوٹے کھلائے اور اپنے سلاموں میں اپنی شعری صلاحیتوں کی بدولت اسے مالا مال کر دیا۔ میر حسنؔ صاحب کے بیٹے خلیقؔ تھے۔ ظاہر ہے انھوں نے اپنے باپ کی روش اختیار نہیں کی بلکہ انھوں نے غزل، رباعی، سلام اور مرثیہ کو اپنا موضوع سخن بنایا اور ایسے لاجواب شعر کہے کہ اس عہد کے متقدمین نے

> یہ تاریخی حقیقت ہے کہ میر انیسؔ نے اپنی تخیلوں کے ذریعہ صنف مرثیہ کو جس عروج پر پہنچایا اب اس کے آگے کسی بلند سے بلند پرواز کا پہنچنا ممکن نہیں ہے۔ مذکورہ بالا مرثیہ "لہو سے لال جو رن میں علی کا لعل ہوا" ہمیں خاندان انیس کی فعال شخصیت جناب سید علی احمد دانشؔ کے قلمی ذخیرے سے حاصل ہوا۔ ان کے پاس ان کے اسلاف کا بیحد قیمتی اثاثہ موجود ہے۔

انھیں اردو زبان کا پارکھ تسلیم کر لیا اور کہا کہ زبان سیکھنا ہو تو خلیق کے گھرانے میں جاؤ یہی وجہ تھی کہ میر انیسؔ اور خلیقؔ کی زبان کو کوثر سے دھلی ہوئی زبان قرار دیتے تھے۔ انیسؔ نے کہا۔

خلق میں مثل خلیق اور تھا خوش گو کوئی کب
نام لے دعوے زباں کوثر و تسنیم سے جب
بلبل گلشن زہرا و علیؑ عاشق رب
متبع مرثیہ گوئی میں ہوئے ان کے سب
ہے اگر ذہن میں جودت تو وہ موزونی ہے
اس احاطے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

نتیجہ میں میر انیسؔ نے اس احاطے میں رہ کر اپنے والد کی اتباع میں وہ گل افشانیاں کیں کہ زمانہ آج تک ان کی ساحرانہ شاعری اور مرثیہ خوانی کے گیت گا رہا ہے۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں غزلیں کہیں لیکن خلیقؔ کی تنبیہ کے بعد اس صنف سے ایسے کنارہ کش ہوئے کہ جیسے انھوں نے کبھی غزل کہی ہی نہیں ظاہر ہے اس بدلی ہوئی صورت حال میں انھیں کچھ نہ کچھ کہنا تھا لہٰذا انھوں نے غزل کی زلف گرہ گیر سے آزاد ہو کر اس موضوع کو اپنایا جس سے دین و دنیا دونوں جگہ انھیں آبرو نصیب ہوئی۔

انھوں نے فیض آباد کے قیام کے دوران رباعی، سلام، مخمس اور مسدس پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ تاریخی اعتبار سے زیر نظر مرثیہ کو قدیم ترین مخطوطہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

لہو سے لال جورن میں علیؑ کا لعل ہوا

جسے میر انیس صاحب نے ۱۲۴۸ھ میں فیض آباد کی سکونت کے زمانے میں نظم کیا تھا۔ اس زمانے میں مرثیہ کیونکہ بہ طرز سوز پڑھا جاتا تھا اس لیے اس عہد کے شعراء دیگر، فصیح، ضمیر اور خلیق بھی چھوٹے چھوٹے مرثیے جو خالص بیانیہ انداز میں لکھے جاتے تھے۔ یہی انداز انیس کا بھی تھا۔ لکھنؤ میں آنے کے بعد ادبی موشگافیوں کی وجہ سے انھوں نے اپنے اپنے کلام میں نئے رنگ بھرے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ انیس اگر ہجرت کر کے یہاں نہ آئے تو انیس ہی رہتے خدائے سخن نہ کہلاتے۔ لکھنؤ میں سکونت کے بعد وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ..... میں یہاں بتیس ۳۲ دانتوں کے درمیان ہوں" اس وقت کے لکھنوی افراد اپنے کو صاحب زبان سمجھتے تھے وہ ان کی مجلس میں چلے تو آتے تھے مگر پتھر بنے بیٹھے رہتے تھے نہ آہ نہ واہ انھیں جیسوں کے لیے انیس نے کہا تھا۔

خاموش ہیں گو شیشۂ دل چور ہوئے ہیں
آنسو کے ٹپک پڑنے سے مجبور ہوئے ہیں

لیکن انھوں نے اپنے جوہر ذاتی اور عطیۂ مولا کی مدد سے کچھ ہی دنوں میں ان لوگوں کے دلوں میں جگہ کر لی۔ انیس نے کہا۔

مری قدر کر اے زمین سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا

اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی تخئیلوں کے ذریعہ صنف مرثیہ کو جس عروج پر پہنچایا اب اس کے آگے کسی کی بلندئ پرواز کا پہنچنا ممکن نہیں۔ مذکورہ بالا مرثیہ "لہو سے لال جورن میں علیؑ کا لعل ہوا" ہمیں خاندان انیس کی فعال شخصیت جناب سید علی احمد انتس کے قلمی ذخیرے سے حاصل ہوا۔ ان کے پاس ان کے اسلاف کا بیحد قیمتی اثاثہ موجود ہے۔ ہم ان کے شکریہ کے ساتھ اس قدیم ترین مرثیہ کو پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔

زیر نظر مرثیہ کا مخطوطہ عہد شاہی میں موجود بادامی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔

سرورق کی عبارت یہ ہے۔

تصنیف مرثیہ میاں انیس صاحب سلمہ اللہ

لہو سے لال جورن میں علیؑ کا لعل ہوا

بند نمبر ۴۳

یہاں انیس سلمہ اللہ کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مرثیہ وہاں کے کسی بزرگ مرثیہ خواں کا تحریر کردہ ہے اس کے بعد صفحہ ۱ سے مرثیہ شروع ہوا ہے۔ ہر صفحہ پر چار بند تحریر کئے گئے ہیں کل مرثیہ گیارہ صفحوں تک پھیلا ہوا ہے یہ مرثیہ مطبوعہ نولکشور کی طبع شدہ جلد چہارم میں ۴۳ بندوں میں شائع کیا گیا ہے۔ اس قدیم ترین نسخہ اور نول کشوری جلد میں بعض بعض جگہ شعروں میں اختلاف نظر آتا ہے جسے ہم پیش کر رہے ہیں ظاہر ہے کہ یہ مرثیہ میر خلیق کی وفات ۱۲۶۰ھ سے بارہ سال پہلے کی تصنیف ہے اس لیے ممکن ہے کہ مطبوعہ اور قلمی نسخہ میں جو اختلافی شعر موجود ہیں وہ شاید خلیق ہی کی اصلاحیں ہوں کیونکہ وہ جب تک حیات رہے اپنے تینوں بیٹوں انیس، انس اور مونس سب کے کلام پر چاہے وہ غزل ہو، رباعی ہو، سلام ہو یا مرثیہ بغیر دیکھے پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔

مطلع بند ملاحظہ کیجئے

لہو سے لال جو رن میں علی کا لعل ہوا
عجب وفور جراحت سے تن کا حال ہوا
بہا جو زخموں سے جسم شہؑ نڈھال ہوا
سنبھلنا خانۂ زیں پر اسے محال ہوا
حسین امامؑ تو گھوڑے پہ ڈگمگانے لگے
قریب آ گئے عدو برچھیاں لگانے لگے

متذکرہ بند کی بیت میں میر انیس نے مصرع اول میں حسین امامؑ کی جو لفظی ترکیب رکھی وہ بعد کے مرثیوں میں ترک کر دی تھی۔ یہ انداز ان کے پیش رو شعراء کا تھا۔ اسی دوسرے بند کا چوتھا مصرع: وضا رضا کے سوا کچھ نہ تھا زباں پہ کلام
یہ ترکیب بھی اچھی نہیں۔ اسی طرح بند نمبر ۱۰ کا تیسرا مصرع کو انیس نے اس طور پر نظم کیا۔

ہر ایک سمت سے پڑتی تھی تیر کی بوچھار

اسے خلیق نے اس طرح کر دیا

ہر ایک صف سے جو پڑتی تھی تیروں کی بوچھار

اس تبدیلی سے مصرع اولیٰ میں جو شعری عیب تھا وہ دور ہو گیا۔ لفظ صف اور تیروں سے مصرع بلند ہو گیا۔ بند نمبر ۱۹ کی بیت یوں چھپی ہے۔

لگام گھوڑے کی اس دم پھرا نہیں سکتے
یہ زخمی ہیں کہ وہاں تک ہم آ نہیں سکتے

بیت کا مصرع دوم پر اصلاح دی گئی۔

یہ زخم ہیں کہ وہاں تک ہم آ نہیں سکتے

اس طرح مصرع دوم میں لفظ زخمی کی جگہ زخم کئے جانے سے شعر اچھا ہو گیا۔

بند نمبر ۲۱ کی بیت اس طرح سے شائع ہوئی ہے۔

نہ جانیو کہ مجھے زخموں کی اذیت ہے
خدا کی راہ میں جو رنج ہے سو راحت ہے

قلمی میں اصلاح دے کر یوں کر دی گئی ہے۔

نہ سمجھو کہ مجھے زخموں کی اذیت ہے

بند نمبر ۲۲ کا دوسرا مصرع:

کہ آج ہوتا ہے بیٹا شہید راہِ خدا

قلمی نسخہ میں اصلاح دے کر یوں بنا دیا گیا ہے۔

کہ آج ہوتا ہوں

ہے اور ہوں کی تبدیلی سے ثقالتِ شعری دور ہو گئی۔ لفظ بیٹا بھی قدیم طرز تھا اسے بھی انھوں نے ترک کر دیا تھا۔ اس طرح اس بند کی بیت پر اصلاح موجود ہے جو یوں ہے۔

خدائے خالق اکبر نواز ہو شبیرؑ
چڑھے سناں پہ جو سر سرفراز ہو شبیرؑ

مصرع اولیٰ میں ترمیم کر دی گئی خالق اکبر کی جگہ خالق بندہ نواز کیا گیا ہے۔

بند نمبر ۲۸ ملاحظہ فرمائیے۔ انیس فرماتے ہیں۔

زمیں پہ خون میں غلطاں تھے حضرت شبیرؑ
کہ گرد شہؑ ہوا انبوہِ فرقۂ بے پیر
کماں کو کوزہ کئے نکلا حصین ابن نمیر
گلوئے خشک پہ حضرت کے اس نے مارا تیر
دوسار ہو کے وہ تیر ستم لٹکنے لگا
گلے میں آ کے رکا دم لہو ٹپکنے لگا

مذکورہ بند کے مصرع کماں کوزہ کیے .... قابل غور ہے۔
اسی طرح دوسار ہو کے کا مفہوم بھی سمجھ میں نہ آ سکا۔
بند نمبر ۴۳ کے آخری شعر کچھ اس طرح ہیں۔

یہ سن کے آئے پئے قتل شمر وہ نابکار
امام دیں پہ کیا چھرا آ کر ہر ایک نے وار
تن شریف میں جنبش رہی نہ جب زنہار
چڑھا حسینؑ کی چھاتی پہ شمر بد کردار
اب آگے حال کہوں کیا گلو و خنجر کا
انیس تازہ ہے غم تا بہ حشر سرورؑ کا

ترقیمہ کی عبارت یہ ہے۔

۱۲۴۸ھ

◇◇

حبیبہ بانو
۴/۹ بی اکھلا وہار جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

فرہنگِ انیسؔ: تعارف و تجزیہ

ھندوستان میں موجود گذشتہ صدی کے محققین میں ایک شخصیت نائب حسین نقوی امروہوی (ولادت ۱۳؍ اکتوبر ۱۹۱۷ء) کی بھی تھی، جنھوں نے اردو ادب کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں فسانۂ عجائب اور داستان امیر حمزہ کی پر لطف کہانیاں انیسؔ از برتھیں اور خاندانِ انیسؔ کے تمام شعراء خصوصًا انیسؔ کے مرثیے بے حد پسند تھے انھوں نے وہیں تعلیم حاصل کی اور مدرسہ سید المدارس میں بحیثیت مدرس ملازمت کرلی۔ عربی، فارسی اور اردو ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ ان کے بہنوئی جناب قائم رضا صاحب نسیم امروہوی اسلامیہ امیر الدولہ انٹر کالج میں مدرس تھے انھوں نے ۱۹۴۲ء میں نائب حسین کو لکھنؤ بلا کر رام آدھین کالج میں نوکری دلوا دی اور وہ یہاں قیام کے بعد ادبی و مجلسی زندگی میں رچ بس گئے۔ تقسیم ملک کے اندوہ ناک المیے کے بعد اردو زبان کے لیے راستے مسدود ہو گئے۔ اس ملازمت کے ختم ہونے کے بعد وہ آنجہانی منشی نول کشور صاحب کے قائم کردہ ادارے تیج کمار بک ڈپو میں بہ حیثیت نگراں ملازم ہو گئے۔ وہاں ان کے ذمہ اردو، فارسی اور عربی کی ان کتابوں کی مختلف مراحل نیز تصحیح و ترتیب کا کام تھا۔ کچھ عرصہ بعد انھیں اس ادارے کی طرف سے مطبوعہ کتابوں کی ترویج و اشاعت کا کام بھی سپرد کر دیا گیا اور بیرونِ ملک سفر کرنے کی بھی اجازت مل گئی۔ ایک سفر کے دوران ان کی پاکستان (لاہور) کے ایک بڑے تاجر شیخ غلام علی اینڈ سنز کے مالک سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں ان سے فرمائش کی کہ وہ ان کے ادارے کے لیے عربی کی کچھ کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر دیں۔ وہ اپنی تعلیم و تربیت کی وجہ سے اس کام کے لیے اہل تھے لیکن پھر بھی ان کے لیے یہ میدان نیا تھا انھوں نے اس کام کو بڑی تندہی سے انجام دیا اور وہ اس نئے تجربے میں کامیاب رہے پھر انھوں نے تیج کمار بک ڈپو کی ملازمت ترک کر دی۔ شیخ صاحب نے انھیں باقاعدہ طور سے اپنے ادارے میں ملازمت کی دعوت دی جسے انھوں نے نامنظور کر دیا اور اپنی وطنیت ترک نہیں کی اور نہ ہی پاکستان میں مستقل قیام کیا سال چھ مہینے کے لیے جاتے اور واپس چلے آتے تھے یہ سلسلہ ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۱ء تک چلتا رہا اس درمیان انھوں نے بیسیوں کتابیں عربی، فارسی اور اردو میں ترجمہ کیں جو شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے میر انیسؔ کے مطبوعہ کلام پر مبنی یکے بعد دیگرے چار جلدیں ترتیب دیں جو شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور سے شائع ہوئیں۔

فرہنگِ انیسؔ
(جلدِ دوم)
ترتیب و تدوین
نائب حسین نقوی
:- ناشر -:
حبیبہ بانو ایم اے
پی۔ ایچ۔ ڈی
نئی دہلی

میر انیسؔ کے غیر مطبوعہ کلام کی تلاش کا سلسلہ بھی جاری رہا جو بڑا اہم موضوع تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ "فرہنگ انیسؔ" کا سا دقیق کام بھی کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ میر انیسؔ کے کلام کے کئی گوشے ایسے ہیں جن کی تشریح ضروری ہے اور مرورِ زمانہ سے رفتہ رفتہ ان کے جاننے والے ناپید ہوتے جارہے ہیں اگر یہی لیل و نہار رہے تو وہ دن دور نہیں جب انیسؔ کے کلام کا اچھا خاصہ حصہ چیستان بن کر رہ جائے گا۔ ان کے یہی خیالات 'فرہنگ انیسؔ'

فرہنگِ انیسؔ

(جلدِ دوم)

ترتیب و تدوین

نائب حسین نقوی

—ناشر—

حبیبہ بانو ایم اے

نئی دہلی
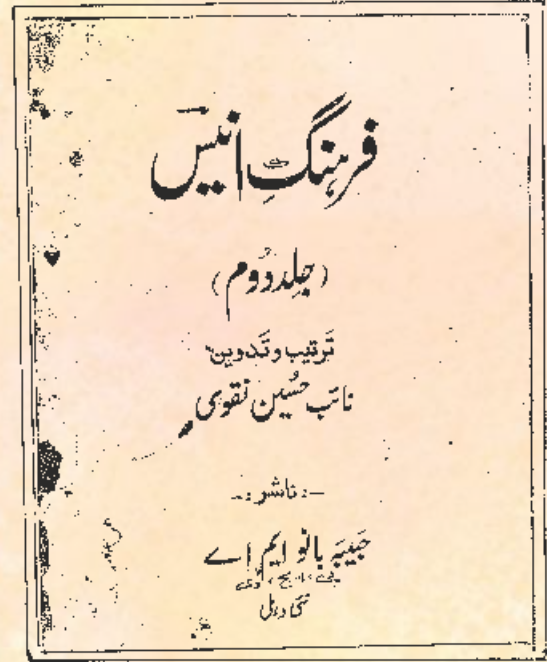
عکس "فرہنگ انیسؔ" (صفحہ نمبر ۱)

کی تالیف کا سبب بن گئے۔

ظاہر ہے تحقیقی کاموں کے لیے پرسکون ماحول ہونا بیحد ضروری ہے اس لیے جناب کرنل بشیر حسین زیدی صاحب اور مالک رام صاحب نے ان کی رہائش کا 'زیدی ولا' میں بندوبست کردیا اور وہیں پر مراثی انیسؔ اور غیر مطبوعہ کلام نیز "فرہنگ انیسؔ" کا کام بحسن و خوبی انجام پایا۔ یہاں تک میرے شوہر کے انتقال کے بعد بھی ان برگزیدہ شخصیتوں نے ہمارے ساتھ وہ رویہ رکھا جو ایک باپ اور بیٹی کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ دونوں فرشتہ صفت، نیک خصال تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ دہلی میں شاد و آباد ہوں۔

"فرہنگ انیسؔ" جلد اول و جلد دوم کا سارا مسودہ انھوں نے ۱۹۷۵ء میں تیار کرلیا تھا اور اس کی پہلی جلد انھوں نے اپنی حیات میں شائع کردی تھی۔ دوسری جلد کی کتابت بھی شروع کرادی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ جلد ہی اسے بھی شائع کرادیں لیکن ان کی علالت نے انھیں مجبور کردیا اور وہ تپ دق میں مبتلا ہوگئے۔ مختلف ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا...... لیکن وہ اسی حالت میں دوسری جلد کی تیاری میں بھی مصروف رہے۔ "فرہنگ انیسؔ" میں وہ رقم طراز ہیں کہ:

"اس میں میر انیسؔ کے تقریباً دس ہزار الفاظ، محاورات اصطلاحات اور مرکبات مع استناد شامل ہیں جو اردو زبان و ادب کے لیے بیش بہا اضافہ اور لازوال خزینہ ہیں"

آگے نائب حسین نقوی خود رقم فرماتے ہیں کہ:

"... فرہنگ کے سلسلہ میں خاصے محاورات، روزمرہ یا بعض لکھنوی رسوم سے متعلق ایسے مواقع ملے جن کی معلومات محض ذاتی گفتگو اور ماحول سے ہوسکی مثلاً

پچادر ڈھلکنا

لکھنؤ کی مستورات کا محاورہ ہے اور اس کو بدشگونی تصور کیا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں عورت کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے وہ یا تو بیوہ ہوجائے گی یا اس کا بیٹا اس سے بچھڑ جائے گا۔"

(فرہنگ انیسؔ صفحہ ۲۲)

آگے وہ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ:

"... میری کتاب "فرہنگ انیسؔ" کوئی افسانہ، ناول تنقیدی و ادبی مضامین کا مجموعہ نہیں ہے، یہ فرہنگ ہے، اور فرہنگ یا لغت کسی مخصوص آدمی کے قلم کی سنت کش نہیں ہوتی اس سے علماء اور شائقین ادب نیز دوسری زبان کے عالموں اور طالب علموں کو بھی استفادہ ہوسکتا ہے یہ کسی مخصوص گروہ یا فرقے سے متعلق نہیں ہے بلکہ

اردو ادب میں ایک دوامی اضافہ ہے۔"

(فرہنگ انیس ص ۲۹)

متذکرہ فرہنگ کے کام کی پیش رفت کے سلسلہ میں مرحوم نے جن بنیادی کتب اور لغات سے استفادہ کیا ان میں آئین اکبری' مطبوعہ نول کشور پریس ۱۸۶۲ نفس اللغات، فرہنگ آصفیہ لغات کشوری، غیاث اللغات، فیروز اللغات، نور اللغات، امیر اللغات، مہذب اللغات، فرہنگ امثال اور فرہنگ اثر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ وہ خود رقمطراز ہیں کہ:

"...... میں نے ایک ایسے شاعر کی ترتیب کا بیڑہ اٹھایا ہے جس کا کلام فارسی، عربی، ہندی، سنسکرت بہت سی زبانوں کے الفاظ و محاورات و مرکبات شامل ہیں مجھے امید ہے کہ موجودہ فرہنگ سے اردو زبان میں آئندہ ترتیب دئے جانے والے لغات کو خاصا مواد مل سکے گا نیز روزمرہ بول چال اور محاورات و مرکبات میں باہمی امتیازات کا ایک اندازہ ہو گا جو اردو لغات میں ہنوز شامل نہیں مگر ان کی ضرورت بہرحال ہے۔"

(فرہنگ انیس صفحہ ۳۱)

"فرہنگ انیس" کی دونوں جلدوں میں کل ملا کر ۱۰۳۶ صفحات ہیں یہ ایک ایسی شخصیت کا کارنامہ ہے جو بہت ناساز گار حالات میں اس عظیم کام کو انجام دے رہا تھا اور اردو مرثیے کے بعض محققین ان پر طرح طرح سے اوچھے حملے کر کے ان کے دماغ کو پراگندہ کر رہے تھے وہ ان کے بیجا اعتراضوں کے جوابات بھی لکھا کرتے تھے جو قومی آواز لکھنؤ کے گذشتہ صدی سنڈے ایڈیشنوں میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ ان کی پوری زندگی اردو ادب خصوصاً میر انیس کے مراثی کی تدوین و اشاعت نیز غیر مطبوعہ کلام کی جمع آوری میں گزری۔ افسوس کہ ان کی یہ تلاش ان کے زندہ رہتے پر جناب شہاب سرمدی صاحب کے نام سے منظرِ عام پر لائی گئی۔ جہاں تک فرہنگ کی ترتیب و تہذیب کا معاملہ ہے اسے انھوں نے الف ممدودہ (آ) سے شروع کیا اور ردیف (ی) الف پر تمام کر دیا ہے جو صفحہ ۵۷ سے ۴۸۲ تک پھیلا ہوا ہے اردو کے معتبر محققین کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہمارے بارے میں بھی انھوں نے اس طرح تحریر کیا ہے۔

"..... ان محترم شخصیتوں کے علاوہ مجھ سے زیادہ میری شریک زندگی حبیبہ بانو صاحبہ میری برابر کی شریک کار رہیں ... جب وہ میری بیماری کی غفلتوں سے بیدار کر کے میری ذمے داریوں کا احساس دلاتے ہوئے مجھے چونکا دیا کرتی تھیں کہ وقت کم ہے اور کام زیادہ ..."

(فرہنگ انیس صفحہ ۱۳)

بالآخر اردو مرثیہ کا یہ پرستار اپنی سنگین بیماری سے لڑتا ہوا فرہنگ انیس کی تکمیل کے بعد اک دم مفلوج سا ہو گیا۔ انھیں ہولی فیملی اسپتال میں داخل کیا گیا کئی روز کی تمام تر کوششوں کے باوجود بروز بدھ ۹ مئی ۱۹۷۹ء کو اس دنیا کو چھوڑ کر چلا گیا۔ غسل و کفن زیدی ولا، ابو الفضل جامعہ نگر میں ہوا اور عزیزین شہر نے جامعہ ملیہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا۔

جلد دوم کو میں نے ان رحلت کے بعد بڑی کاوش سے شائع کیا۔ اس پر تفصیلی طور سے کچھ لکھنا تحصیل لا حاصل ہے، اس جلد میں بھی اصول ترتیب و تدوین وہی ہیں جن کی گذشتہ جلد میں پیروی کی گئی تھی۔ پہلی جلد کی اشاعت کے بعد ملک کے مشاہیر نے جس گرمجوشی سے اس کا خیر مقدم کیا تھا نیز رسائل و اخبارات میں "فرہنگ انیس" سے متعلق جو تبصرے سامنے آئے تھے وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں اس امر کا کہ اصحاب علم و دانش کے نزدیک مرحوم کی یہ کاوش کتنی اہم اور بروقت تھی۔ مولف کے جواہم کاغذات میری تحویل میں ہیں ان میں سے چند خطوط شائع کئے جا رہے ہیں، یہ تمام خطوط ان کے لیے ہی نہیں بلکہ میرے لیے بھی باعث افتخار ہیں وہ اس لیے کہ میں ان کے ادبی کاموں میں ہمیشہ ساتھ ساتھ شامل رہی۔ مشاہیر کی رائیں پیش کی جاتی ہیں۔

"لغت مرتب کرنا بڑا جان لیوا کام ہے اول تو اس میں جس طرح کے متنوع علم اور زبان پر قدرت کی بنیادی ضرورت ہے وہ قدرت کی طرف سے ہر ایک کو ودیعت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد

محنت اور دیدہ ریزی کا ہے اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

انیسؔ اردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جن کے ہاں الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ ان کے کلام میں بزم و رزم کے سیکڑوں مرقعے ملتے ہیں۔ انھوں نے موقع اور ماحول کے مطابق ایسے موزوں الفاظ استعمال کیے ہیں کہ ان سے بہتر خیال میں نہیں آسکتے چونکہ ان کا اردو کے مستند اساتذہ میں شمار ہوتا ہے اس لیے تمام مرتبین لغت نے انھیں بطور سند پیش کیا ہے لیکن ضرورت اس امر کی تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ ان کی تمام لفظیات کو یکجا کر دے یہ کام بہت مشکل تھا کیونکہ ہنوز ان کا کلام منظر عام پر نہیں آیا اور دوسرے اس باعث کہ ان کے مراثی کے جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں وہ بھی اب آسانی سے مہیا نہیں ہوتے۔ بس یہ خوشی کا مقام ہے کہ سید نائب حسین نقوی نے مراثی انیسؔ کے جلد دفتر چھان کر ان کے مستعملہ الفاظ و محاورات کو جمع کر دیا اور ہر ایک کے ساتھ انیسؔ کا شعر یا مصرع بہ طور سند درج کیا ہے۔ یقیناً وہ اس کے لیے پوری اردو دنیا کے شکریہ کے مستحق ہیں۔"

——— مالک رام۔ نئی دہلی

"۔۔۔ میر انیسؔ کی شاعرانہ عظمت کا بڑا سبب ان کے یہاں الفاظ کے ماہرانہ انتخاب اور صناعانہ استعمال ہے۔ انیسؔ کا تنقیدی مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے لفظیات پر غور نہ کیا جائے لیکن محض اس مقصد سے انیسؔ کے کثیر المقدار کلام کا بار بار مطالعہ کرنا آسان کام نہیں ہے اس کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ کلام انیسؔ میں استعمال ہونے والے الفاظ پر کوئی جامع کتاب سامنے ہو۔ سید نائب حسین نقوی ایک عرصہ سے انیسؔ کے کلام کا مطالعہ کر رہے ہیں انھوں نے اسی ضرورت کے پیش نظر "فرہنگ انیسؔ" کی تیاری کی ہے جس کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے اور دوسرا زیر طبع ہے۔

فرہنگ انیسؔ کی تیاری میں جو محنت انھیں کرنا پڑی ہوگی اس کی داد انھیں ملنا چاہیے۔ انھوں نے ایک پورے ادارے کا کام تن تنہا انجام دینے کی کوشش کی ہے جو ہر صورت میں مستحسن ہے یقین ہے کہ "فرہنگ انیسؔ" اس موضوع پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مفید نقش اول ثابت ہوگی۔"

——— ڈاکٹر نیر مسعود۔ لکھنؤ یونیورسٹی

"۔۔۔ انیسؔ صرف موضوع اور فن کے اعتبار ہی سے عظیم شاعر نہیں ہیں بلکہ ذخیرۂ الفاظ فصاحت کے اعتبار سے بھی عظیم ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ انیسؔ، نظیر اکبرآبادی اور جوشؔ ان تینوں میں کس نے سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ الفاظ کے استعمال میں جو فصاحت انیسؔ کے یہاں ملتی ہے نظیرؔ کے یہاں دور دور تک نشان نہیں ہے اور جوشؔ کے یہاں اس کا خوبصورت عکس ہے اس لیے انیسؔ کی شاعری کے ساتھ انیسؔ کے الفاظ اور محاورات کا مطالعہ ایک اہم کام ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ جناب نائب حسین نقوی نے اس مطالعے کی ابتدا کی ہے جس کی پہلی جلد "فرہنگ انیسؔ" کے نام سے میرے سامنے ہے یہ کام محنت طلب ہے اور اس کے لیے زبان دانی اور شعر فہمی کی شرط ہے فرہنگ کے سرسری مطالعہ سے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نقوی صاحب یہ کام بخوبی انجام دے سکیں گے۔ اور یہ فرہنگ اردو زبان اور شعر کے طالب علم کے لیے مفید ہوگی۔"

——— علی سردار جعفری۔ بمبئی

"۔۔۔ یہ اردو میں اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد کام ہے اقبالؔ اور غالبؔ کی تلمیحات و اشارات و الفاظ پر کچھ کام ضرور ہوا ہے مگر وہ تشنہ ہے۔ نائب حسین نقوی نے جس شرح و بسط کے ساتھ انیسؔ کے کلام کی فرہنگ ترتیب دی ہے وہ بجائے خود ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔ انیسؔ کی زبان کی وسعت و تنوع کے مطابق یہ فرہنگ بھی مبسوط اور جامع ہے۔ پہلی جلد میں تقریباً دس ہزار الفاظ محاورات اصطلاحات اور مرکبات کے معنی و مفاہیم مع استناد درج کئے گئے ہیں۔

میرے ایک استاد نے فرمایا تھا کہ اگر اردو زبان کے شعری امکانات پر ایمان لانا ہو تو انیسؔ کو پڑھو۔ انیسؔ کی شاعری اردو زبان کا قرآن ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسؔ نے جس طرح اس زبان کے بیانیہ رزمیہ، ڈرامائی اور نفسیاتی اظہارات کو تخلیقی طور پر برتا ہے اس کی

دوسری مثال نہیں۔ انیس کی قادرالکلامی کے سب ہی معترف ہیں ان کا کلام اردو نصاب کی کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے لیکن اب تک کسی نے ان کے ذخیرۂ الفاظ کی فرہنگ مرتب کرنے کی کوشش نہیں کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی ادب اور زبان کے چند اساتذہ بھی بعض معمولی مصرعوں کی تشریح میں سرگرداں رہتے ہیں۔

انیس کے یہاں اتنے اشارات ملتے ہیں کہ انھیں سمجھنے کے لیے (ان سب) متنوع اور مختلف ماخذوں کا علم ضروری ہے۔ یہ کام بغیر کسی جامع فرہنگ کے ممکن نہ تھا۔ نائب حسین نقوی نے شرح کلام انیس کے لیے یہی بنیادی اور ضروری کام سرانجام دے کر ادب کی ایک ناقابل قدر خدمت انجام دی ہے۔

انیس پر یہ کام وہی کر سکتا تھا جس کی نظر انیس کے مطبوعہ غیر مطبوعہ کلام پر گہری ہو اور ساتھ ہی انیس کے مرثیہ کے تعلق سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔ نائب حسین نے انیس پر جتنا کام کیا ہے کسی نے نہیں کیا۔ اس موضوع پر زندہ افراد میں ان سے زیادہ واقفیت کسی اور کو نہیں "فرہنگ انیس" کی ابتدا میں انھوں نے جس عنوان کے تحت انیس کے ذخیرۂ الفاظ سے بحث کی ہے وہ خود ان کی وسعت معلومات اور کام کے مبسوط ہونے کی شہادت ہے۔

نائب حسین نے ۲۵ ہزار الفاظ و مرکبات جمع کئے تھے۔ پہلی جلد میں صرف دس ہزار کا شمول ممکن ہو سکا دوسری جلد میں جو زیر طبع ہے مزید ۱۵ ہزار الفاظ و مرکبات کا احاطہ کرے گی۔ یہ سارا کام اک عمر چاہتا تھا۔ نائب حسین کے تحقیقی شغف اور عشق انیس نے اس دشوار امر کو ممکن بنادیا۔

نائب حسین نقوی کی اس ادبی خدمت کا اعتراف اپنی زبان وادب کے لیے بے پناہ امکانات اور ان امکانات پر معنی خیز و مفید تحقیق کا اعتراف ہے۔ فرہنگ انیس ناقدین، طلبا، محققین اور ماہرین لسانیات سب کے لیے یکساں طور پر مفید ہے اس لیے اس کا مطالعہ صرف انیس کی تفہیم کے لیے ہی نہیں۔ اردو زبان کو سمجھنے کے لیے لازمی ہے۔"

ـــــ ڈاکٹر وحید اختر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

"۔۔۔ آج جبکہ اردو زبان اس کے تہذیبی پس منظر سے لوگ رفتہ رفتہ دور ہوتے جارہے ہیں اردو شاعری کے اس حصہ کو سمجھنا اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونا جو تہذیبی یا مذہبی روایات سے متعلق ہے مشکل ہوتا جارہا ہے۔ اس صورتحال کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ اہم اردو شعراء کے کلام کی فرہنگ تیار کی جائیں تاکہ طالب علم اور اساتذہ اس کی روشنی میں کلام کے مطالعہ کے وقت پیش آنے والی دشواریوں پر قابو پا سکیں۔

اس سلسلہ میں پہلا قابل تعریف کارنامہ جناب نائب حسین نقوی نے "فرہنگ انیس" تیار کرکے انجام دیا ہے اس فرہنگ میں انیس کے کلام بالخصوص مرثیوں کے تمام مشکل الفاظ، محاوروں، تشبیہوں اور علامات کے مفاہیم و مطالب کو واضح کیا گیا ہے۔ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ ان آلات حرب، جنگ، جدال، لباس اور سواریوں کی وضاحت کی ہے اور انکی تصویریں دی ہیں جو آج رائج نہیں ہیں اس سے ان چیزوں کو سمجھنے میں بیحد مدد ملتی ہے۔

نائب حسین نقوی انیس کے مستند محققوں میں ہیں اور ان کا یہ کارنامہ یقیناً اردو تاریخ میں اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ فرہنگ نویسی ایک بہت اہم اور بڑا کام ہے اور بڑے کام میں سہو سے بچنا تقریباً ناممکن ہے خاص طور پر اردو زبان میں جس کے الفاظ و تشبیہات و استعارات معنوی اعتبار سے مختلف پہلو رکھتے ہیں۔ ایسی سہو اس فرہنگ میں بھی ہوئی ہے امید ہے کہ اس کی دوسری جلد میں یہ کمی نہیں رہے گی اور ان کا یہ کام دوسرے فرہنگ نویسوں اور محققوں کے لیے آگے کی راہیں ہموار کرے گا۔"

ـــــ ڈاکٹر شارب ردولوی۔ دلی یونیورسٹی دلی

اب میں اس مقالے کو محترم جناب عبادت بریلوی صاحب کے اس بیان پر ختم کرتی ہوں:

"میرانیس کی زبان اک خوشگوار سنگم ہے، چند زبانوں اور مختلف قسم کے الفاظ کا جو ہمارے دوسرے شعراء کے یہاں کمیاب ہے۔"

حاشیہ لے ڈیرجبیبہ یہ خط کرنل زیدی کو سنادو اور تم کل آجاؤ

۱۔ دس غیر مطبوعہ مراثی کی رسید انھوں نے دے دی ہے۔ تین مراثی

(بقیہ صفحہ ۲۹۴ پر)

صفحہ ۲۶۳ کا بقیہ

سامنے عقیدت سے جھک جاتے ہیں اور آنکھیں ان کے مصائب پر موتی نچھاور کرنے لگتی ہیں انیس جیسے بڑے فنکار کو اس سے بڑا خراج عقیدت اور کیا مل سکتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں جو معروضات پیش کئے گئے ان کے ثبوت میں یہاں میر انیس طاب ثراہ کے چند مرثیوں کے کچھ بند درج کئے جارہے ہیں جن سے انیس کے فن کی اہمیت اور عظمت اجاگر ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

جب رن میں سر بلند علی کا علم ہوا
فوج خدا پہ سایۂ ابر کرم ہوا
چرخ زبرجدی سے تسلیم خم ہوا
پنجے پہ سات بار تصدق حشم ہوا
دیکھا نہ تھا کبھی جو علم اس نمود کا
دونوں طرف کی فوج میں غل تھا درود کا

وہ نشان اس علم کی وہ عباس کا جلال
نخل زمرّدوں کے تلے تھا علی کا لال
پرچم پہ جان دیتی تھیں پریوں کا تھا یہ حال
غل تھا کہ دوشِ حور پہ بکھرے ہوئے ہیں بال
ہر لہر آبدار تھی کوثر کی موج سے
طوبیٰ بھی دب گیا تھا پھریرے کی اوج سے

تھا پنجتن کا نور جو پنجے میں جلوہ گر
اعمے کی پتلیوں میں تھا روشنی کا گھر
ذرے نثار کرتے تھے اٹھ اٹھ کے اپنا زر
تکتے تھے فوق سے تو ملک، تحت سے بشر
اللہ ری چمک علم بوتراب کی
تاہے نظر نبی تھی کرن آفتاب کی

بس آخر میں یہ کہنا ہے کہ میر انیس طاب ثراہ نے جس طرح اپنا تعرضی بند پیش کیا ہے وہ بھی اپنے آپ میں ایک پوری تاریخ سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری
ناطقہ بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگین ہے عبارت میری
شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری اسی دشت کی سیّاحی میں
پانچویں پشت ہے شبّیر کی مدّاحی میں

اس ثناخواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مدّاح
جدّ اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مدّاح
باپ مدّاح کا مدّاح ہے دادا مدّاح
عم ذی قدر ثناخوانوں میں یکتا مدّاح
جو عنایات الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

میر انیس طاب ثراہ کے مندرجہ باقی بند کو قلم بند کرتے ہوئے مجھے مجبوراً تحریر کرنا پڑ رہا ہے کہ میر انیس جیسی شخصیت اور ان کے اس بے مثل فن کو ان کی موجودہ نسل قائم رکھنے سے قاصر ہے اور نہ ہی کوئی موجودہ نسل میں ایسا ہوا کہ جو اعلیٰ تعلیم پر فائز ہوتا اور اس سلسلے کو نسل در نسل اور ترقی دیتا۔ میری بتصدق اہلبیت علیہم السلام سے یہی دعا ہے کہ ان کی نسل میں پھر سے علم کی دولت کی فراوانی کردے جس سے میر انیس کا ان کی نسل کے ذریعہ بھی نام روشن اور منور ہو۔ آمین۔

◇◇

سید علی احمد دانش
انیس ہاؤس کوچۂ میر انیس چوک، لکھنؤ
9839181230

مراثیٔ انیسؔ کا تتمّہ

صاحب "فیروز اللغات"، مولوی فیروز الدین صاحب لفظ "تتمہ" کے سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ:

"تتمہ۔ ت۔ تم۔ مہ (ع۔ ا۔ م۔ ذ) (۱) بقیہ۔ بچا ہوا۔ کسی چیز کا آخری حصہ (۲) ضمیمہ۔ خاتمہ۔ کتاب کا وہ زائد حصہ جو آخر میں لگا دیتے ہیں (۳) خط کا ضمیمہ (۴) مذاقاً۔ بچہ۔ جمع تتمہ جات"۔ (صفحہ ۳۴۴)

راقم نے خدائے سخن میر انیسؔ کے تمام مرثیوں کو جو مطبوعہ صورت میں ہیں اور ان قلمی نسخوں کا غائر مطالعہ کیا اور حروف تہجی کے اعتبار سے ایک طویل فہرست مرتب کی لیکن میری تلاش و جستجو بے سود ثابت ہوئی اور آخر میں یہ مناسب سمجھا کہ اس نادر مرثیے کو پردۂ اخفا میں نہ رکھ کر ان افراد کے سامنے رکھ دیا جائے جو انیسؔ اور ان کے مرثیوں کو پسند فرماتے ہیں اور ان کے کلام پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے تصنیف کئے ہوئے ابتدائی مرثیوں میں جو کہ انھوں نے فیض آباد کے قیام کے دوران نظم فرمائے کوئی ایسی خاص نشانی نظر نہیں آتی جو ان کے معاصر شعراء سے الگ ہو لیکن جب انھوں نے باقاعدہ طور پر بادشاہ امجد علی شاہ کے عہد حکومت میں لکھنؤ میں سکونت اختیار کی تو اپنے مرثیوں میں جہاں مختلف اجزائے مرثیہ کا اضافہ کیا وہیں اپنی طرز تحریر میں ایک نمایاں فرق یہ کیا کہ مرثیہ شروع کرنے سے پہلے "بسم اللہ خیر الاسماء" لکھنا شروع کر دیا اور بعض نسخوں میں مزید اضافہ کرتے ہوئے "بسم اللہ خیر الاسماء" کے نیچے "یا علی علیہ السلام مدد سے است" تحریر کیا اور یہ طریقہ انھوں نے آخر دم تک برقرار رکھا۔ مرثیہ کے زیر نظر نسخے پر جیسا کہ ان کا طریقہ تھا بہ غور ثانی کی اور بعض بند نظری کر دئے۔ باقی (۴۴) بنا کر صحیح قرار دئے۔

ہمارے ذخیرۂ مراثی میں ان کا یہ دست نویس مرثیہ بصورت مسودہ موجود ہے جس کے ہر صفحہ پر انھوں نے لفظ "تتمہ" تحریر کیا ہے گویا یہ واحد مرثیہ ایسا ہے جو ان کے تمام قلمی مرثیوں میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے وہ بھی انسان تھے۔ بیماری دکھی ہر ذی روح کے ساتھ ہے اور علالت کی مختلف کیفیتیں بھی ہوا کرتی ہیں جن میں بعض اوقات مریض اپنی صحت کی طرف سے مایوس سا ہو جاتا ہے اور خداوند عالم کے حضور دست بدعا ہوتا ہے۔ انیسؔ بھی اس کیفیت سے دوچار ہوئے اور کہا۔ ؎

گر مسیح دو جہاں کا ہوا افضال انیسؔ
اچھے یوں ہوئیں گے، جیسے کبھی بیمار نہ تھے

اور دعاؤں میں انھوں نے یہ بھی دعا فرمائی کہ۔

'جیتے جی مرثیہ کہنا مرا موقوف نہ ہو'

بارگاہِ الٰہی میں ان کی یہ دعا مستجاب ہوئی اور انتقال سے چند روز پہلے تک ان کی مرثیہ گوئی کا سلسلہ قائم رہا۔ ان کے آخری مرثیے کا مطلع ملاحظہ فرمائیے ؎

'جب اسلحۂ جنگ کو شہؑ کرتے تھے تیار'

تعداد بند کے اعتبار سے متذکرہ مرثیہ ۴۳ بندوں پر مشتمل ہے اور اس میں وہ تمام لوازمات شعری موجود ہیں جو میر انیسؔ کی

خصوصیات بیّس. پورا مرثیہ بخط مصنف ملاحظہ فرمائیں۔

۱ جب اسلحۂ جنگ کو شہ کرتے تھے تیار
روتی تھی قناتوں سے لگی بیبیاں جگر افگار
جب سنتی تھی حضرت نے جو انشا کئے اشعار
دل ٹکڑے ہوا جاتا تھا سن سن کے یہ گفتار
دکھیوں کی مصیبت میں کمر توڑتے ہیں آپ
ہیں ایسے ہی بے بس جو ہمیں چھوڑتے ہیں آپ

۲ دن بھر تو سہی بچوں نے سورج کی تمازت
ہے رات کو اب آتش خندق کی حرارت
بس ہوتا تو کب جھیلنے دیتی یہ مصیبت
ذات آپ کی ہے ابر کرم آیۂ رحمت
کچھ کہہ نہیں سکتی ہوں شہ جن و بشر سے
پوچھے کوئی اس درد کو زہرا کے پسر سے

۳ حضرت نے کہا شکر خدا خوب ہے زینب
جو مرضیٔ حق ہے وہی مرغوب ہے زینب
امت کی شفاعت مجھے مطلوب ہے زینب
تسلیم و رضا کا یہی اسلوب ہے زینب
کل صبح کو ہووے گی جدائی تن و سر میں
کچھ فرق نہیں مخبر صادق کی خبر میں

۴ اس تذکرہ میں آگیا صغرا کا جو مذکور
رونے لگے اس وقت شہ بیکس و مجبور
تھا سینہ و دل درد و غم و رنج سے معمور
نامہ کیا اک سید مظلوم نے مسطور
ہنگام رقم اشک بہے دیدۂ تر سے
خط شاہ نے تحریر کیا خون جگر سے

۵ صغرا کو لکھا پہلے کہ اے جان پدر آہ
ہم پھنس گئے اک دشت جفا خیز میں ناگاہ
تم دیکھتی ہو گی مرے آنے کی بہت راہ
پر میری مصیبت کا ہے افسانہ جانکاہ
ہفتم سے حرم میرے گرفتار محن ہیں
پیاسے شب ہشتم سے مرے تشنہ دہن ہیں

۶ بے جرم و خطا نرغۂ اعدا میں گھرا ہوں
چھٹنے کا نہیں دام مصیبت میں پھنسا ہوں
تکلیف میں ہوں جب سے مدینہ سے چلا ہوں
مظلوم ہوں بے وجہ گرفتار بلا ہوں
دی ان کے مہلت نہ مجھے دیدۂ تر نے
مکتوب شب قتل یہ لکھا ہے پدر نے

۷ شب نصف گزاری ہے عبادت میں مری جاں
افسوس کہ کچھ ہو نہ سکی طاعت یزداں
ہنگام سحر ہو گا مرے قتل کا ساماں
کٹ جائے گا تیغوں سے محمد کا گلستاں
واللہ نہیں اور کسی بات کی حسرت
پر دل میں رہی تیری ملاقات کی حسرت

۸ دیتے کہیں دم لینے کی صورت جو بداختر
اور بیٹھنے دیتا کہیں یہ چرخ ستم گر
جاتے ترے لینے کو مقرر علی اکبر
اور اب تو وہ سب درہم و برہم ہوا دفتر
آمادۂ مرگ آج ہر اک ماہ لقا ہے
کل خنجر خوں خوار ہے اور سب کا گلا ہے

۹ واللہ ستایا ہے بہت اہل جفا نے
کل جائیں گے ہم شکل نبی برچھیاں کھانے
اور ہوں گے قلم تیغ سے عباس کے شانے
ہوتا ہے وہی امر جو چاہا ہے خدا نے
جن سب نے بلایا تھا مجھے قول و قسم سے
سر کاٹنے آئے ہیں وہی تیغ ستم سے

۱۰ ہر چند تھی مجھ کو نہ گوارا تری فرقت
لیکن نہ ملی چرخ ستم گار سے مہلت
اب وصل پدر حشر پہ ٹھہرا چکی قسمت
ہے تجھ سے دم مرگ یہ بابا کی وصیت

ہاتھوں سے نہ زہرا کا چلن دیجیو صغرا
جب پانی پیو یاد ہمیں کیجیو صغرا

۱۱

ام سلمیٰ کو یہ لکھا با دلِ پرغم
اے زوجۂ محبوبِ خدا ثانیٔ مریم
ہے لشکرِ کفار لبِ نہر فراہم
اور جلتی ہوئی ریت پہ اترے ہوئے ہیں ہم
اب ہاتھ اٹھاؤ خلفِ شاہِ نجف سے
غافل نہ کبھی ہوجیو صغرا کی طرف سے

۱۲

ہوگی خطِ صغرا سے عیاں ساری کہانی
اقربا کو پہونچی ہے مری تشنہ دہانی
جو گزری ہے سن لیجیو عابد کی زبانی
ہے میری شہادت کی یہی خاک نشانی
افضالِ الٰہی سے بنا کام ہمارا
آغاز سے بہتر ہوا انجام ہمارا

۱۳

خط میں نے کیا ابنِ حنفیہ کو یہ تحریر
صحرائے مصیبت میں ہمیں لا چکی تقدیر
گذرا ہے جو تم پہ وہ بیاں کرتا ہے شبیر
دیکھا تھا جو کچھ خواب یہی اس کی ہے تعبیر
گو نزع کی حالت ہے شہِ تشنہ دہن کی
پر یاد نہیں دل سے گئی اہلِ وطن کی

۱۴

یارانِ وطن کو یہ لکھا با دلِ ناشاد
تم سب کی رہی تا بہ دمِ مرگ مجھے یاد
اب کل سرِ شبیر ہے اور خنجرِ فولاد
روضے پہ محمد کے کرو جا کے یہ فریاد
پردیس میں حضرت کا نواسہ گیا مارا
شبیر کئی روز کا پیاسا گیا مارا

۱۵

کبرا کے دیا ہاتھ میں وہ نامۂ پردرد
اور بھرنے لگے یاد میں صغرا کے دمِ سرد
تھے یاس کے عالم میں رخِ اہلِ حرم زرد
شدت سے ہوا چلتی تھی اور اڑ رہی تھی گرد

آئے جو نظر بال پریشان بہن کے
چہرے پہ بہے اشک شہِ تشنہ دہن کے

۱۶

اتنے میں ہوئے صبح کے آثار نمودار
اور سجدۂ طاعت سے اٹھے سیدِ ابرار
اردو[1] میں پڑی دھوم سواری ہوئی تیار
تھے منتظرِ حکم رفیقانِ وفادار
اٹھ اٹھ کے مصلوں سے نمازی لگے آنے
اصطبل سے دروازے پہ تازی لگے آنے

۱۷

مجمع درِ دولت پہ ہوا فوجِ خدا کا
ڈیوڑھی کی طرف دھیان لگا تھا رفقا کا
تھا رتبۂ عالی جو امامِ دوسرا کا
غل عرش پہ تھا آمدِ شاہِ شہدا کا
دل غازیوں کے شوقِ شہادت سے بھرے تھے
امداد کو موجود فرشتوں کے پرے تھے

۱۸

راہواروں پہ تنتے تھے جواں تیغوں کو تولے
ترکش کے دہن تھے قدر اندازوں کے کھولے
عباس یہ تیغوں کی طرف دیکھ کے بولے
رخصت جسے ہونا ہے عزیزوں سے وہ ہولے
فردوس میں اب چلنے کی تدبیر ٹھنی ہے
جب شہ گئے میداں میں تو پھر تیغ زنی ہے

۱۹

چہرے پہ دلیروں کے شرافت کے سب آثار
اک ایک جواں مرد خوش اطوار وفادار
عابد کوئی زاہد تھا کوئی اور کوئی ابرار
سر دینے کے مشتاق شہادت کے طلبگار
آنکھیں قدمِ شہ کے تلے فرش کئے تھے
کیا دیدۂ حق بیں انھیں خالق نے دئے تھے

۲۰

ہر چند کئی روز سے پایا تھا نہ پانی
پر لب پہ نہ تھا تذکرۂ تشنہ دہانی

---

[1] یہاں میر انیس نے لفظ اردو بہ معنی لشکر کہا ہے۔

کرتے تھے دعا حق سے بصد اشک فشانی
دنیا میں رہے حیدر کرار کا جانی
ہمت دے کہ اعدا سے جہاد آج کریں ہم
پہلے پسر فاطمہ زہرا سے مریں ہم

۲۱

عمامہ سروں پر عربی جسم میں پوشاک
منہ چاند سے اور خط سیہ گرد رخ پاک
کیا فہم رسا رکھتے تھے وہ صاحب ادراک
عشق تھا کہ نثار خلف سیّد لولاک
تقدیر فضا خلد کی دکھلاتی تھی ان کو
احسنت کی گردوں سے صدا آتی تھی ان کو

۲۲

حوریں انھیں فردوس سے کرتی ہیں اشارے
یہ باغ تمہارا ہے یہ ہیں قصر تمہارے
قسمت تمہیں لائی ہے کوثر کے کنارے
سب فدیۂ شبیرؑ ہیں اللہ کے پیارے
تم پر نظر رحمت و عنایت ہے خدا کی
سید کے مددگار ہو رحمت ہے خدا کی

۲۳

محبوب الٰہی تمہیں دیتے ہیں دعائیں
اور فاطمہ تم لوگوں کی لیتی ہیں بلائیں
کہتے ہیں علی جلد یہ پیاسے کہیں آئیں
ہم ساغر کوثر انھیں بھر بھر کے پلائیں
شبیر کے عاشق ہیں یہ پیارے ہیں ہمارے
وہ چاند ہمارا ہے یہ تارے ہیں ہمارے

۲۴

مقتل کو بالوں سے ہے زہرا نے بہارا
ہے روضۂ فردوس کو رضواں نے سنوارا
یہ مرگ مبارک ہو خوشا حال تمہارا
بس تم ہو اور اب گلشن جنت کا نظارا
جس پر نہ زوال آئے وہ خورشید ہو تم تو
مرنا یہ نہیں زندۂ جاوید ہو تم تو

۲۴

باہر تو پرا باندھے تھے وہ صاحب توقیر
پوشاک پہنتے تھے ادھر خیمہ میں شبیرؑ
باندھی جو کمر سے اسد اللہ کی شمشیر
بیتابی میں غش کھا کے گری شاہ کی ہمشیر
پہلو سے نہ حضرت کے سرکتی تھی سکینہ
لپٹی ہوئی دامن سے بلکتی تھی سکینہ

۲۵

ہمشیر کو حضرت نے زمیں پر سے اٹھایا
سمجھایا دلاسا دیا چھاتی سے لگایا
بانو کی طرف دیکھ کے دل شہ کا بھر آیا
لپٹا کے گلے سے یہ سکینہ کو سنایا
پانی تیرے پینے کے لیے لائیں گی بی بی
اب رن کو ہمیں جانے دو پھر آئیں گے بی بی

۲۶

ازبسکہ جدائی نہ تھی بیٹی کی گوارا
رونے لگی جس دم اسے گودی سے اتارا
دروازے تک آیا ید اللہ کا پیارا
بڑھ کر در دولت سے یہ اقبال پکارا
ہو جاؤ خبردار برآمد ہوئے آقا
اے غازیو ہشیار برآمد ہوئے آقا

۲۷

ناگاہ در خیمہ ہوا مطلع انوار
خم ہو گئے مجرے کو رفیقان وفادار
تھامے علی اکبر نے رکاب شہ ابرار
گھوڑے پہ چڑھا لخت دل احمد مختار
کس شان سے گردان کے دامان قبا کو
عباس نے کھولا علم فوج خدا کو

۲۸

جب معرکۂ جنگ میں آئے شہ والا
تھا چہرۂ روشن سے کئی کوس اجالا
خوبی میں ہر اک عضو کا انداز نرالا
اک سرو گلستاں سے دو بالا قد و بالا

آنکھیں تھیں لہو لولٹ تیغ زنی سے
۲۹؎ یاقوت سے لب خشک تھے تشنہ دہنی سے

جس وقت مقابل ہوئیں دونوں صف لشکر
تھرائی زمیں چوب لگی طبل و غبار پر
جب دیکھتے تھے رن کی طرف آنکھ اٹھا کر
تلواریں چمک جاتی تھیں یا نیزہ و خنجر
ناگاہ ہوا شور کہ تیر آئے ادھر سے
۳۰؎ تلواریں ادھر بھی کھنچیں پیاسوں کی کمر سے

اللہ ری انصار شہہ دیں کی لڑائی
لاکھوں تھے مگر فوج ستم تاب نہ لائی
ہر وار میں ہوتی تھی سر و تن میں جدائی
ایک خون کی ندی تھی لب نہر بہائی
لڑتے تھے یہ الفت میں امام دو سرا کی
۳۱؎ ہر غول میں غل تھا کہ دہائی ہے خدا کی

جب ہو چکے انصار بھی قربان سر شاہ
میداں میں اتارے ہوئے دلبند ید اللہ
ازبسکہ وہ سب بھوکے بھی اور پیاسے بھی تھے آہ
کٹوا کے سر ایک ایک نے فردوس کی لی راہ
مارا گیا رہتی پہ کوئی ہاتھ کٹا کر
۳۲؎ بیجاں ہوا میداں میں کوئی برچھیاں کھا کر

سب مارے گئے رہ گئے تنہا شہ شاہاں
عباس، نہ قاسم، نہ علی اکبر ذیشاں
لاشوں پہ کھڑے کہتے تھے با دیدۂ گریاں
لو صاحبو! ہم جاتے ہیں اللہ نگہباں
کس وقت میں افسوس اجل آئی ہماری
۳۳؎ لاکھوں سے تو جنگ اور یہ تنہائی ہماری

جا سا حل دریا پہ یہ رو رو کے پکارے
ہم جیتے تھے عباس بھروسے پہ تمہارے
تم مر گئے اور لگ گئے ہم گور کنارے
میرے دل مجروح پہ اب چلتے ہیں آرے
تم روئے نہ بھائی کو، میں رویا تمہیں بھائی
۳۴؎ پیاسوں نے مرے ہاتھ سے کھویا تمہیں بھائی

پانی کے نہ لانے کی رہی تم کو تو حسرت
اور ہم کو یہ افسوس ہے دی کیوں تمہیں رخصت
اب اٹھ کے خبر لو مری اے صاحب ہمت
ہے وقت نماز اور نہیں ملتی نہیں مہلت
فرزند نہیں کوئی، برادر نہیں کوئی
۳۵؎ سچ ہے کہ برے وقت کا یاور نہیں کوئی

خیمہ میں تلاطم ہے سنو بہنوں کی فریاد
وہ روتے ہیں اور ہنستا ہے یہ فرقۂ جلاد
اطفال کھڑے ڈیوڑھی پہ کرتے ہیں تمہیں یاد
کون ان سے کہے نہر پہ جو ہوئی بیداد
منہ اپنا سکینہ کو نہ دکھلائے گا شبیرؑ
۳۶؎ کٹوا کے گلا اب نہیں مر جائے گا شبیرؑ

کہتے تھے کبھی اے مرے غم خوار برادر
سقائے حرم بیکس و ناچار برادر
مظلوم علم دار وفادار برادر
ہم مرتبۂ جعفر طیار برادر
میداں سے بڑھے اہل ستم آتے ہیں روکو
۳۷؎ نکلے ہوئے ڈیوڑھی سے حرم آتے ہیں روکو

شہ لاش علم دار پہ کرتے تھے یہ گفتار
اعدا نے کیا شور کہ اے سید ابرار
بیکس ہوئے، بےبس ہوئے اب ڈال دو ہتھیار
ہے بیعت حاکم سے عبث آپ کو انکار
لب تشنہ ہو فاقہ سے ہو بیتاب و تواں ہو
۳۸؎ وہ بات مناسب ہے تمہیں جس میں اماں ہو

روتے تھے جھکائے ہوئے سر شاہ سرافراز
ناگاہ پڑی کان میں ہاتف کی یہ آواز
اے فخر شجاعان عرب صاحب اعجاز
اب ضربت حیدر کے دکھاوے انھیں انداز

قبضے میں تیرے تیغ شہنشاہ نجف ہے
یہ برسر باطل ہیں (........) ہے ۳۹

آئے شہ بے کس صف اعدا کے مقابل
کس حسن و فصاحت سے جتایا حق و باطل
سمجھے نہ تو کہنے لگے یوں سرورِ عادل
سید کے مسافر کے تمہیں قتل سے حاصل
دولت نہیں رکھتا ہوں جو زر ہاتھ لگے گا
ہاں بیکس و مظلوم ہوں سر ہات لگے گا ۴۰

اعدا نے کہا سچ ہے کہاں جنگ کی قدرت
فرمایا کہ واللہ وہی اب بھی ہے قدرت
تم سے نہ ہٹے گا پسر شاہ ولایت
بسم اللہ اگر دیکھنی ہے پیاسے کی طاقت
وہاں برچھیاں لے لے کے بڑھی فوج ستم کی
یاں شاہ نے تیغ اسد اللہ علم کی ۴۱

تنہا پہ چلے تیر بھی تلواریں بھی پیہم
بیٹھے صف (....) پہ شہنشاہ دو عالم
جو سر پہ چڑھا ایک کو لینے نہ دیا دم
ہر وار میں ہوتی تھیں صفیں درہم برہم
للکار کے میدان میں جاں بازوں کو مارا
ثابت نہ ہوا کب، قدر اندازوں کو مارا ۴۲

کس سے برش اوس کی ہو سکتی ہے تحریر
ٹکڑے تھیں کمانیں نظر آتے تھے قلم تیر
پڑ جاتی تھی جس شامی پہ اک ضربت شبیرؑ
دو ہوتے تھے خود و سپر و نیزہ و شمشیر
چار آئینہ والے نہ فقط دنگ ہوئے تھے
پہلے سے زرہ پوش بھی چورنگ ہوئے تھے ۴۳

گھوڑوں سے نمودار سواروں کو گرایا
سردار جو تھے پاؤں رگڑتے انھیں پایا
دریا کو جو روکے تھے لہو ان کا بہایا
یوں غیض میں کہتا تھا ید اللہ کا جایا
دریا تو ہے قابو میں مگر پیاس کہاں ہے
بتلاؤ کوئی قاتل عباس کہاں ہے

میر انیس نے اپنے اس مرثیے کو مذکورہ بیت پر تمام کر دیا ہے، مقطع نہیں لگایا۔ وہ اکثر مقطع مجلس پڑھنے سے پہلے لگا لیا کرتے تھے اور کبھی کبھی دو دو مقطعے نظم کر کے لکھ دیا کرتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ ان کی زبان اور الفاظ کا در و بست مقطع کا محتاج نہیں۔

◇◇

صفحہ ۳۹۷ کا بقیہ

اس کے علاوہ متعدد شخصی اشاریے بھی مرتب کئے ہیں جیسے مرزا غالبؔ، میر تقی میرؔ، علامہ اقبالؔ، منشی نولکشور، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، فراقؔ گورکھپوری، ویریندر پرساد سکسینہ، عمر انصاری، عابد سہیل، مسعود حسن رضوی ادیب، عبد الماجد دریابادی وغیرہ۔ مذکورہ بالا اشاریوں کے علاوہ بھی کئی مختلف قلم کاروں کے اشاریے زیرِ ترتیب ہیں۔ وہ اس وقت ہندوستان کے اردو مصنفین کے ایڈریس کی ڈائرکٹری بھی ترتیب دے رہے ہیں۔

اشاریہ اردو مرثیہ اور میر انیس انھوں نے کئی ماہ کی محنت کے بعد اور خاص کر ہماری فرمائش پر ترتیب دیا ہے نیا دور سے ان کی محبت کا یہ عالم ہے کہ وہ ہندوستان میں ہر جگہ کے قلم کاروں اور خاص کر ریسرچ اسکالرز کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں

ان کو نیا دور کی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا بہر حال امید ہے کہ قارئین کو اشاریہ اردو مرثیہ اور میر انیس پسند آئے گا اور خاص طور سے محققین اس سے مستفید ہوں گے۔

◇◇

چیدہ
و
چُنیدَہ

شاہد کمال
۵۰/۶۸۱ نزد سینٹ جانس انٹر کالج مفتی گنج لکھنؤ
7905478241

میر انیسؔ کے نعتیہ کلام

زبان انسانی ساجیات کی قوت اظہار کا سب سے طاقتور وسیلہ ہے اس کے بغیر اس کائنات کے نظام کی تقویم اس کے مرموزات کی تفہیم و تعبیر اور اس کے ادراکات و انکشافات انسان کے لیے ایک ناگزیر عمل ہے۔ سماج کے اجتماعی شعور کے لائحۂ عمل کی تدوین و ترتیب زبان کے ذریعہ ہی عمل پذیر ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی بھی زبان ہو وہ اپنے زمانے کے تغیرات کے ساتھ اس زبان کے ساختیاتی زاویہ میں بھی تدریجی طور سے تبدیلی واقع ہوتی ہے لیکن زبان کے اساسی انداز سرنوشت میں کسی طرح کا تغیر نہیں ہوتا لیکن ایک بات واضح ہے کہ زمانے کے مرحلہ وار انقلاب پسند نامیاتی رجحان کے تحت زبان کی اصلاحات میں تبدیلی ضرور واقع ہوتی ہے اور بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ بہت سی اصطلاحات اور محاورات کے ساتھ ساتھ لفظیں بھی اپنے نئے نئے معنی استوار کرتی رہتی ہیں۔ اس لیے سائنس اور ٹکنالوجی کے اس دور میں بھی ہماری زبان اپنے عصری تقاضوں کے ساتھ پیش رفت کر رہی ہے اور بہت سی سائنسی و ٹکنالوجی اصطلاحات کو خود کے لیے وضع کر چکی ہے۔ یہی اسکی کامیابی کی دلیل ہے اور جو زبان اپنے بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ اپنے اندر بدلاؤ کی صلاحیت نہیں رکھتی اس زبان کا مستقبل ہمیشہ معرض خطر میں رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر بہت سی زبانوں نے جنم لیا لیکن وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ آج تاریخی باقیات کا ایک حصہ بن کر رہ گئیں اس کی خاص وجہ یہی تھی کہ اس زبان میں زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

لیکن ہماری اردو زبان کا معاملہ قدرے مختلف ہے چونکہ اردو زبان ایک وسعت پذیر زبان ہے اور اس زبان میں عہد بعہد اپنے اندر جذب و قبول کی کیفیت پائی جاتی رہی ہے اور اس جدید سائنس و ٹکنالوجی کے زمانے میں بھی اپنی جدید سے جدید تر اصطلاحات، تراکیب اور نئی نئی لفظیات کے ساتھ اس زمانے کی برق روی کے ساتھ شانہ بشانہ ہم قدم دکھائی دے رہی ہے اس کی یہی خوبی اس زبان کے مستقل مزاج اور خوش آئند مستقبل کی بشارت ہے۔ اردو زبان کا ادبی کینوس بہت وسیع ہے جس میں ہر طرح کے رنگ کی آمیزش پائی جاتی ہے اور یہ زبان بلا تفریق ہر مسلک و مذہب اور قوم و ملت کی نمائندگی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کرتی ہے۔ اس کے ادبی اثاثہ میں ہر طرح کے جواہر پارے موجود ہیں جس کی افادیت اور معنویت میں آفاقی عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس زبان کے اجتماعی ادبی ذخائر میں منجملہ اصناف سخن کی اپنی ایک الگ شناخت ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے اساسی موضوعات کی نمائندگی کرتی ہے۔ اردو زبان میں جہاں دیگر اصناف سخن اپنی منفرد پہچان رکھتی ہے اس میں رثائی ادب ایک ایسی

صنف سخن ہے جس میں اردو ادب کی بیشتر اصناف کا عکس دکھائی دیتا ہے چونکہ میرا موضوع محض مرثیہ نہیں ہے اس لیے میں اس موضوع پر مزید تفصیلی گفتگو کرنے سے انحراف کرتا ہوں اس لیے مجھے محض میر انیسؔ کے مرثیہ میں پائے جانے والے نعتیہ عناصر پر گفتگو کرنا مقصود ہے وہ بھی ایک اختصاص کے ساتھ۔

لہٰذا میر انیسؔ کے کلام میں پائے جانے والے نعتیہ کلام پر کچھ ضبط تحریر کرنے سے پہلے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے قارئین کی خدمت میں یہ بات عرض کرتے چلیں کہ اصل میں اردو زبان ہے کیا اور اس میں نعت گوئی کا رجحان کیسے پیدا ہوا۔ اصل میں نعت کے مبادیات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم اردو کی معرض وجود میں آنے کے اسباب وعلل پر بھی تھوڑا توجہ دیں۔ ایسا کرنے سے ہمیں اردو ادب میں "نعت" جیسی صنف سخن کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ہندوستان ابتدا ہی سے کثیر اللسانی ملک رہا ہے جس میں سیکڑوں رنگا رنگ کی زبانیں مروج عام تھیں۔ ہندوستان پر آرین کے تسلط سے قبل یہاں پر مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں جیسے "تامل، اوڑیا، تلگو وغیرہ تھی۔ لیکن ہندوستان پر آریائی قبیلوں کے تسلط سے یہاں پر سنسکرت جیسی زبان کو فروغ ہوا لیکن سنسکرت خواص کی زبان تھی لہٰذا مختلف زبانوں کے اختلاط سے ایک جدید زبان نے جنم لیا جو "پراکرت زبان کے نام سے متعارف ہوئی۔

چھٹی صدی عیسوی تک "پراکرت" زبان بھی علاقائی زبانوں سے مختلم ہوئی اور ان میں سے پانچ بڑی زبانیں پیدا ہوئیں "سورسینی، مگدھی، پالی، جینی، مہاراشٹری۔ ان زبانوں نے اپنی نشوونما کا تعین کیا لیکن ان زبانوں میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان سورسینی، اور برج بھاشا اہم تھی چونکہ اس کے فروغ اور نشوونما کا جغرافیائی علاقہ سندھ سے بہار، لاہور سے مالوہ تک پھیلا ہوا تھا اور ادھر بنگال سے پنجاب سندھ، کشمیر، گجرات، راجپوتانہ اور شمالی ہندو نیپال سے لے کر مہاراشٹر تک اس زبان کا دائرہ استوار ہو چکا تھا اس کا تفصیلی تذکرہ نیچے دئے گئے حوالے سے مزید دریافت کر سکتے ہیں۔

(دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل جلد ۵ صفحہ ۳۵۱)

مذکورہ زبانیں ۷۰۰ سے ۱۰۰۰ء تک یہ زبان عوام کے معاشرتی و سیاسی مذہبی و ملّی اساطیری و نیم اساطیری اور روز مرّہ کی ترجمانی کرتی رہیں انھیں زبانوں کے باہمی اختلاط سے شورسینی روپ سے اپ بھرنس بھاشا کی تقدیم ہوئی اور یہی اپ بھرنس بھاشا آرائی زبان بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے عوام کی ترجمان بنی اور انھیں دو زبانوں کے درمیان سے ایک جدید زبان نے اپنے نین ونقش سنوارے اور اپنی ہیئت کی قبائیں تراشیں اور ایک نئی شکل وصورت کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی جسے آج اردو زبان کہا جاتا ہے جس کا تفصیلی تذکرہ اپنی کتاب "سدھ ہیم چندر شبد انوشاسن میں تفصیل کے ساتھ گجرات کے ایک جینی بزرگ عالم جین ہیم چندر جی، نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

ہندوستان میں اسلام کی آمد سے قبل اردو زبان اپنے تدریجی مراحل سے گزر رہی تھی لیکن جب ہندوستان میں اسلام کا سورج باضابطہ طلوع ہوا تو اس کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی ایک انقلابی تبدیلی اندرونی طور سے ہوئی اور اس زبان نے اپنے پیر پسارنے شروع کر دیے اس کے فروغ میں صوفیائے کرام کا ایک اہم تعاون رہا ہے جیسا کہ ملک محمد جائسی علیہ الرحمہ نے اپنی تصنیف "اکھروتی" میں کیا ہے۔ وہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"وقولہم نکند اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلّم نکردہ
زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص
نبودہ لیس بہر ملک کہ بودہ زبان آں ملک را
بکار بردہ اند وگمان نہ کنند کہ ہیچ اولیاء اللہ

بزبان ہندی تکلّم نہ کردہ زیراکہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملتہ والدین قدس اللہ سرہٗ (حضرت خواجہ گنج شکر) در زبان ہندی و پنجابی مصطفیٰ از اشعار نظم فرمودہ چنانچہ در مردم مشہور اند اشعار اندو ہرہ وسورہ امثال آں نظم نمودہ ہمچناں ہر یکے از اولیا بدیں لسان تکلّم می فرمودند تاکہ عہد خلافت ایشاں محقق مدقق رسید و ولے دریں زباں بسیارے از مصنفات از رسائل و مطولات تصنیف فرمودہ یکے از مصنفات دے اکھروتی است۔"

(اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام)

اردو زبان کی ترویج میں صوفیا کا اہم کارنامہ رہا ہے جن کی خدمات سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ تصوّف اور طریقت کے تمام سلاسل اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم سے متعلق سیرت کے مکمل ماخذ چاہے وہ منثور ہو یا منظوم اس کا زیادہ تر حصہ عربی زبان اور فارسی زبان میں ہی دستیاب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تعتیاتی موضوعات کا ارتباط وانسلاک اور اس کا سارا خام مال انھیں دو زبانوں میں وافر مقدار میں موجود تھا یہی وجہ ہے کہ جب ہم نعت کی بات کرتے ہیں تو نعت کی تمام تر موضوعاتی، ہیئتی، تمثیلاتی، عربی اور فارسی زبان سے ہی معکوس نظر آتی ہیں۔ ہندوستان جیسے زرخیز ملک میں ہمارے جو صوفیائے کرام گزرے ہیں وہ اردو اور عربی میں مہارت رکھتے تھے لیکن عوام تک اپنے خیالات کی رسائی کے لیے انھوں نے عوام کی ہی زبان کا استعمال کیا۔ سید میراں جی شمس العشاق نے عربی اور فارسی زبان سے ہٹ کر دکنی اردو میں نعت کہنے کا تجربہ کیا اور کامیاب رہا۔ ان کی مشہور کتاب ”شہادت التحقیق“ میں موجود ان کے نعتیہ اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

ہیں عربی بول کیسرے
اور فارس سے بھو تیرے
یہ ہندی بولوں سب
ان ارتوں کے سبب
یہ بھاکا بھلسو بولی
پن اس کا بھاوت کھولی
یوں گرمکہ پند پایا
تو ایسے بول چلایا
دے عربی بول نہ جانے
نہ فارسی پچھانے
یہ ان کو بچیت ریئت
بن معنی میں یہ نقول
دیا
جیسے مغز میٹھا لاگے
تو کیوں من اس تھی بھاگے
یتول اس میں ارت پیچ
سب قرآن کرے پیچ
وہ مغز معنی لیو
سب چھال چھوڑ دیو
یا وہ دیکھے چھارا
اس ماٹی کا پیارا
نا مائی اس کو ہان
وہ راکھے سمیٹ آن
یہ چھان سونا لیوے
اور بعضے نا کے دیوے
یتوں بھاکا ماٹی جانوں
نر معنی دل میں آنوں
تو جس کو بھاوے جوڑ
نا جسی یہ گن چھوڑ
ہے کڑوان کیسر اہیرا
گھوڑا اوپر پڑیا سہیرا

کوئی سجان بھاگوں پاوے
تو کیوں نا لیہہ اچاوے
گھر بھاگا چھوڑ دیجئے
جن جن معنی لیجئے

اردو زبان کی سب سے پہلی منظوم کتاب "ملا داود" کی مثنوی "چندائن" ہے۔ جس کی ادبی و لسانی حیثیت کا اعتراف کیا گیا ہے "ملا داود" شمالی ہند کے ایک معروف قریہ "ڈلمئو" کے رہنے والے تھے جو موجودہ وقت میں رائے بریلی میں واقع ہے۔ یہ کتاب اودھی زبان میں لکھی گئی ہے چونکہ لکھنؤ اور اس کے اطراف و اکناف میں واقع تمام علاقوں کی زبان قدرے اختلاف کے ساتھ اردو ہی کہی جاتی ہے "ملا داود" کی مثنوی "چندائن" فخر الدین نظامی کی مشہور مثنوی "کدم راؤ اور پدم راؤ" کی ہی لسانی طرز پر لکھی گئی ہے جس کی لسانیاتی اساس عربی اور فارسی زبان کے بجائے سنسکرت اور "پراکرت" اور دیگر علاقائی زبانوں کی آمیزش سے تیار کی گئی ہے اس میں اسی زبان کا استعمال کیا گیا ہے جس زبان میں ملک محمد جائسی نے "پدماوت" لکھی ہے اور اس کے حوالے سے مولوی کریم الدین نے اپنی مشہور کتاب "طبقات الشعراء" میں پدماوت کی لسانی بنیاد کو اردو زبان ہی قرار دیا ہے۔

ملا داود کی مثنوی "چندائن" میں اردو نعت گوئی کے اولین نقش پائے جاتے ہیں۔ میں مثال کے لیے اس مذکورہ مثنوی کے چند اشعار یہاں پر ضرور نقل کرنا چاہتا ہوں تاکہ اردو نعت کی ابتدائی ہیئت و مضامین اور اس کے معنوی ترقع کا درست اندازہ لگایا جا سکے بطور امثال اشعار حاضر خدمت ہیں۔

پرشو اک سرجس اجیارا
ناؤ محمد جگت پیارا
جہہ لگ سمے پرتھمی میری
ادتہ ناؤں منادی پھیری
جہہ جہوا دہو ناؤں نہ لیجا
در سر کاٹ اگن مکھ دیجا
دو سر ٹھاؤں ولی یوں کینہا
وچن سنائی پنتھ کے دینا
پاپ بن کی تری کالی یوں برسے تہار
ولی لکھا سب ماگوں دہر کے ہم بھار

(ملا داود چندائن صفحہ ۵-۶ بند نمبر ۶)

دکن میں بھی اردو کے ابتدائی عہد میں جو شعراء گذرے ہیں ان کے یہاں بھی کثرت کے ساتھ نعتیہ اشعار کے نقوش پائے جاتے ہیں دکن کے پہلے شاعر خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے شعری سرمایہ میں نعتیہ کلام موجود ہیں مثال کے لیے ان کے چند اشعار یہاں پر نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اے محمد ہجلو جم جم جلوہ تیرا
ذات تجلی ہوبگی سین سیو نہ سیرا
واحد اپنی آپ تھا اپیں آپ نجھایا
بر کا جلوے کا رخ الف میم ہو آیا
عشقوں جلوہ دیتے کو کاف نون بسایا پرکٹھ

اردو زبان و ادب کے ابتدائی عہد میں پائی جانے والی دیگر اصناف سخن کے مقابل مثنویوں میں سب سے زیادہ نعتیہ اشعار پائے جاتے ہیں۔ اردو ادب کی مشہور ترین مثنویوں میں نعتیہ اشعار کے آثار آج بھی موجود ہیں ۹۰۹ھ میں شاہ اشرف بیابانی کی مشہور مثنوی "نوسرہار" میں اکیس ابیات پر مشتمل نعتیہ کلام موجود ہے جس کا انداز سخن بہت ہی نرالا ہے جس کو پڑھنے کے بعد ایک عجیب جذب و کیفیت کی وجدانی حالت روح پر طاری ہونے لگتی ہے۔ شاہ اشرف بیابانی کی ایک اور مشہور تصنیف "لازم المبتدی" بھی ہے جس میں نعتیہ اشعار کثرت سے موجود ہیں اور شاہ اشرف بیابانی نے اپنے روزمرہ کے اعتبار سے اشعار تخلیق کئے ہیں اور خاص کر جہاں پر نعتیہ اشعار ہیں

اس میں خاص کر یہ اہتمام کیا ہے کہ انھوں نے قرآن شریف کی آیات واحادیث وروایات اور سیرت حضور اکرمؐ کو بڑے ہنرمندی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ شاہ اشرف بیابانی کے ایک معاصر شاعر جو غیر معروف ہیں ان کا نام کتابوں میں خوب محمد چشتی گجراتی بتایا گیا ہے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے ۹۸۶ھ میں شیخ کمال محمد کے اقوال "معارف محمدیہ" کو منظوم کیا ہے اور اس کا نام انھوں نے "خوب ترنگ" رکھا۔ اس مثنوی میں بھی نعتیہ اشعار کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان کی زبان میں کافی سلاست پائی جاتی ہے جو "از دل خیزد بر دل ریزد" کی بہترین مثال ہے میں یہاں ان کے چند نعتیہ اشعار ضرور نقل کروں گا۔

جو سا آرسی وحدت جان
جسم محمد سے پہچان
اک عکس اوس ماں جو ہوئے
قطب محمد کا ہے سوئے
ایک عکس پھر ایک عکس جو پائے
یہی ابوالارواح کہہ لائے۔

لیکن نعتیہ شاعری کے حوالے سے گیارہویں صدی عیسوی کو نعت گوئی کا زریں عہد کہا جاسکتا ہے ۱۰۰۱ سے ۱۱۰۰ھ میں اردو ادب کے بڑے نامور شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے اردو شعریات کے لیے ایک اہم کارنامہ انجام دیا جس سے صرف نظر قطعی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ وہ عہد بابائے شاعری محمد قلی قطب شاہ کا تھا اور ان کے معاصرین شعرا میں مولانا وجہی، غواصی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اردو ادب میں ملا وجہی کی مشہور مثنوی "قطب مشتری" آج بھی خاصی شہرت رکھتی ہے اس پوری مثنوی میں ساٹھ (۶۰) ابیات پر مشتمل نعتیہ کلام کا ایک نذرانہ موجود ہے جس میں (۲۶) ابیات، نعت کے مروجہ مضامین کے متعلق ہیں اور چوبیس (۲۴) ابیات نعت کے خاص مضمون "معراج النبی" سے تعلق رکھتے ہیں جسے بڑی فنی مہارتوں اور زبان کی شائستگی اور سلاست کا خیال رکھتے ہوئے ان ابیات کو نظم کیا گیا ہے۔ میں یہاں پر اس مثنوی کے صرف دو شعر پیش کرتا ہوں۔

محمد نبی ناؤں تیرا ہے
عرش کے اوپر ناؤں تیرا ہے
کہ چودہ فلک کا توں سلطان ہے
علی سا ترے گھر میں پردھان ہے

ملا وجہی حضور کریمؐ سے انتہائی عقیدت و مودت رکھتے تھے جس کا احساس ان کے اشعار کی روحانی و معنوی کیفیت انگیز حالت سے کیا جاسکتا ہے۔ اردو ادب میں یہ ایک ایسا شاعر ہے جو نعت گو شاعر کی حیثیت سے جس نے غزل میں نعت گوئی کو فروغ دیا انھوں نے غزلیہ نعتیں بھی خوب لکھی ہیں اور بہتر سے بہتر لکھنے کی کوشش بھی کی ہے اور اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

اردو ادب کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر جسے لوگ قلی قطب شاہ کہتے ہیں۔ انھوں نے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ نعتیہ کلام پر بھی کافی توجہ دی ہے لہٰذا نعت گوئی کے حوالے سے بھی انھیں انفرادیت حاصل ہے۔ ان کے دیوان میں پانچ نعتیہ غزلیں بھی موجود ہیں۔ ان کی غزلیہ نعت کے دو شعر حاضر ہیں۔

دیا بندے کو حق نبی کا خطاب
حکم دے دیا نور جوں آفتاب
چاند سورج روشنی پایا تمہارے نور سے
آب کوثر کو شرف ٹھنڈک کے پانی پور تھے

اردو شاعری میں نعت گوئی کا رجحان ابتدائے عہد ہی سے تھا جس کے نقوش آج بھی تاریخ میں موجود ہیں۔ اس لحاظ سے اردو شاعری میں نعت گوئی کا سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے جیسے جیسے یہ زبان اپنے ابتدائی مراحل طے کرتی گئی اسی تدریج و تواتر کے ساتھ اس زبان میں

میں نعت گوئی کا رجحان عام ہوتا گیا۔ اردو کے ابتدائی زمانے سے موجودہ دور تک یہ سلسلہ باضابطہ اپنی پوری جلالت و تمکنت کے ساتھ جاری و ساری ہے لیکن نعت گوئی کے میدان میں محدود چند شعرا ہیں جنھیں دیگر اصناف سخن کے ساتھ نعت گوئی میں بھی کافی شہرت ملی جس میں ایک بڑا معتبر و مستند نام میر ببر علی انیسؔ کا بھی ہے۔ حالانکہ میر انیسؔ کی شہرت و مقبولیت مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے ہوئی۔ اس کے باوجود انھوں نے اپنے مرثیوں میں کثرت کے ساتھ نعتیہ کلام کہا ہے جسے معرض بحث لایا جانا چاہئے اس لیے کہ ان کے نعتیہ کلام کا انداز بہت ہی منفرد ہے میر انیسؔ نے مرثیہ کہنے کے لیے ایک خاص ہیئت کا استعمال کیا جس کی ایجاد و ترویج میر ضمیرؔ اور سوداؔ وغیرہ نے کی تھی جسے مسدس کہتے ہیں۔ میر انیسؔ نے مرثیہ کی ہیئت میں کچھ نعتیں بھی لکھیں جس کا تذکرہ آگے چل کر کیا جائے گا لیکن ان کے نعتیہ کلام پر روشنی ڈالنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ نعت کے اس موضوع پر ایک سرسری گفتگو کروں جسے میر انیسؔ نے اپنا موضوع سخن قرار دیا ہے۔ میر انیسؔ کے نعتیہ کلام میں وہ تمام تر خوبیاں پائی جاتی ہیں جو نعت کے لیے اہم تسلیم کی جاتی ہیں۔ انھوں نے اپنے نعتیہ کلام میں حضور اکرمؐ کی زندگی کے کسی پہلو کو تشنہ مفہوم نہیں رکھا میر انیسؔ نے حضور اکرمؐ کے جملہ ظاہری و باطنی محاسن کو بڑے عارفانہ انداز میں نظم فرمایا ہے جسے پڑھنے کے بعد جناب رسولؐ خدا سے ان کی روحانی قربت اور ان کے عرفانیاتی پہلو کے بلند مدارج کا بھرپور احساس ہوتا ہے۔ میں یہاں پر میر انیسؔ کے ادبی کوائف اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرنے سے شعوری طور پر انحراف کر رہا ہوں چونکہ مضمون کی طوالت اس بات کی متقاضی نہیں ہے لہٰذا میں ان کے نعتیہ کلام کا اجمالی تعارف پیش کروں گا جو مسدس کی ہیئت میں ضبط تحریر کئے گئے ہیں۔ اس نعتیہ کلام کے ابتدائی تین بند ملاحظہ فرمائیں۔

فخر ملک و اشرف آدم ہے محمد
اکلیل سر عرش معظم ہے محمد
حقا کہ خداوند دو عالم ہے محمد
آخر ہے مگر سب سے مقدم ہے محمد
ایسا کوئی محرم نہیں اسرار احد کا
حال اس سے ہے پوشیدہ ازل کا نہ ابد کا

- - - - - - - -

مختار زمیں باعث افلاک نبیؐ ہے
والا گہر قلزم لولاک نبیؐ ہے
مصباح حریم حرم پاک نبیؐ ہے
شیرازہ مجموعہ ادراک نبیؐ ہے
عالم میں وہ آیا تھا پہ دل سوئے خدا تھا
حق اس کا رضا جو وہ رضا جوئے خدا تھا

- - - - - - - -

آدم ہے وجود شہ لولاک سے آدم
عالم سب اسی شاہ کی ہستی سے ہے عالم
سر رشتۂ مہر اس کا اگر ہوتا نہ محکم
تو ہوتے نہ اضداد عناصر کبھی باہم
کیا کیا کہوں کیا کیا ہے عنایات محمد
ہے باعث ایجاد جہاں ذات محمدؐ

یہ نعتیہ کلام جواہر انیسؔ کے نام سے ترتیب دیا گیا ہے جس میں کل ۱۲ بند ہیں جس کی تدوین (صادق علی دلاوری) نے فرمائی ہے۔

اس نعتیہ کلام کا مطلع اور اس سے مربوط دونوں بند میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ و ارفع و بلند مدارج کا تذکرہ کیا گیا ہے اور اس کا رداں کائنات رنگ و بو کا سرخیل حضرت محمدؐ ہیں۔ وہ تمام مخلوقات خدا میں سب سے افضل و بالاتر ہیں۔ اور یہی علت تکوین کے منبع و مخرج

ہیں۔ ان کے وجود کے بغیر کسی چیز کا وجود اور تصوّر لایعنی ہے اور خدائے قادر و مطلق نے انھیں ارض و سماوات کے تمام تر سربستہ رموزات اور شہود و غیاب کے تمام تر حجابات ان کی ذات پر منکشف کر دیے ہیں یہی وہ ذات ہے جو آدم و عالم کی تخلیق پر مقدم ہے۔ یہی بساط کائنات کے ادراک و آگہی کا نکتۂ ارتکاز ہیں جن کی جنبش لب کے مضراب تبسم سے آبگینۂ ہستی کی آب و تاب کی جولانی اس کائنات کے پیچ و خم کو استوار کرتی ہوئی نظر آرہی ہے جس کے لب و لعلیں سے مس ہونے والے احراف و الفاظ وحی الٰہی کا درجہ رکھتے ہیں جب یہ کلام کرتے ہیں تو قرآن جیسی مقدس کتاب کا نزول ہوتا ہے۔

اس مذکورہ نعتیہ مسدس کے آخری دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

جو تیرا محب ہے ہمیں اس سے ہے محبت
جو تیرا عدو ہے ہمیں اس سے ہے عداوت
دی ہم نے تجھے سارے رسولوں پہ فضیلت
ہر ایک کی امت سے ہے بہتر تری امت
نائب کسی مرسل کا نہیں تیرے وصی کا
بیٹی تجھے دی فاطمہ سی خویش علی سا

....

سبطین وہ بخشے تجھے جو ہم کو ہیں پیارے
ہم ان کے رضا جو وہ رضا جو ہیں ہمارے
ہیں عرش معلیٰ کے وہ تابندہ ستارے
بخشائیں گے امت کے تری جرم یہ سارے
جو مرتبے تیرے ہیں وہ اوروں کے کہاں ہیں
تو ختم رسل ہے وہ شفیع دو جہاں ہیں

اس نعتیہ مسدس کا اختتام میر انیس نے دعائیہ بند پر کیا ہے اور اس میں خاص کر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو امت خیر سے متصف کیا ہے اور حضور اکرم سے یہ التجا گذاری کر رہے ہیں کہ ہم آپ کی امت میں سے ہیں لیکن ہمارے اعمال ایسے نہیں کہ ہم روز حشر کسی توقع کی امید رکھیں سوائے اس کی کہ آپ ہماری بخشش کے لیے واحد ذریعہ ہیں۔

میر انیس کے نعتیہ مسدس کے کچھ اور بند حاضر خدمت کرنا چاہتا ہوں اس نعتیہ مسدس میں حضور اکرم کی ولادت اور ان کی معراج کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس مسدس کا مطلع اور ایک بند ملاحظہ کریں۔

واللہ عجب شان شہنشاہِ رُسُل ہے
اس گلشن ایجاد کا پہلا وہی گل ہے
اس شاہ کے اوصاف کا کونین میں غل ہے
سب جزو کل اجزا ہیں اسی کا وہی کل ہے
ہر چند کہ ہے وہ خلف آدم و حوّا
پر حق نے کیا ہے شرف آدم حوّا

....

اس شاہ سے کونین میں بہتر نہیں کوئی
بہتر کا تو کیا ذکر ہے ہمسر نہیں کوئی
حق یہ ہے کہ ایسا تو پیمبر نہیں کوئی
جرار بہادر نہیں، صفدر نہیں کوئی
ادنیٰ سا یہ رتبہ ہے جسے ذکر کیا ہے
بوذر کو شرف اس کی غلامی سے ملا ہے

اس نعتیہ مسدس میں کل ۳۴ بند ہیں جس کی ترتیب و تدوین کا کام محترمہ تلمیذ فاطمہ برنی پاکستان (کراچی) نے فرمائی ہے میں اس نعتیہ مسدس کے بیشتر بند سے قطع نظر کرتے ہوئے محض اس کے مطلع کا معنوی تجزیہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ قارئین اس مسدس کے تمام معنوی تلازمات کا اندازہ اس کے مطلع کے بند سے ہی لگالیں کہ اس کا معنوی بین السطور کتنی تہہ داری رکھتا ہے۔

اس نعتیہ مسدس کے مطلع کا پہلا مصرعہ ملاحظہ کریں۔

" واللہ عجب شان شہنشاہ رسل ہے

اس مرثیہ کے مطلع کا پہلا مصرعہ کا آہنگ بہت پُر زور ہے جس کی قرأت میں ایک عجیب کیفیت کا احساس ہوتا ہے اور اس مطلع کے ہر مصرع میں استعاراتی تلمیحات کا بھرپور استعمال ہوا ہے مثلاً اس بند کے پہلے مصرعہ میں رسول خدا کی شان و جلالت اور عظمت و رفعت کا ذکر ہے۔ ایک انفرادی خوبی کے ساتھ کہ میر انیسؔ لفظ واللہ کے تاکیدی استعمال سے اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ حضور کی فضیلت ان کی اکتسابی فیض سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ کے فیضان خاص کی وجہ سے ہے اور لفظ ''واللہ'' شرعی اعتبار سے ایک ایسی قسم ہے جس کا استعمال کوئی شخص اگر جھوٹ کے لیے کرے تو اس پر شرعی اعتبار سے کفّارہ واجب ہو جاتا ہے لہٰذا میر انیسؔ نے ''واللہ'' کے استعمال سے ہر طرح کے تردد و اشکال کی امکانی گنجائش کا پہلے ہی سدباب کر دیا ہے تاکہ اس کے معنوی ادراک میں کسی طرح کی قباحت کا امکان باقی نہ رہے اور اس سے یہ بات بھی اپنے قارئین پر واضح کر دی کہ اللہ کے اس حبیب کا مرتبہ تمام رسولان ماسلف سے زیادہ ہے کیونکہ یہ سید الاوصیا اور تمام نبیوں کے سردار بھی ہیں۔

اس مطلع کا دوسرا مصرعہ

''اس گلشن ایجاد کا پہلا وہی گُل ہے''

اس مصرعہ کے لفظی تلازمات اور اس کے معنوی ترفع پر غور فرمائیں کہ میر انیسؔ نے کتنی خوبصورتی کے ساتھ اس رمز کو دانشگاف کرنے کی کوشش کی ہے کہ پروردگار عالم نے اس کائنات رنگ و بو کی تخلیق صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر کی ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے۔ لولاک لما خلقت الأفلاک اے میرے حبیب اگر تجھے پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں ان افلاک کو پیدا نہ کرتا'' اور اس مصرع کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ میر انیسؔ اس مصرع میں ''اس حدیث قدسی'' کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ اول ما خلق اللہ نوری ''کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے میرے نور کو خلق کیا ہے''۔ یعنی جب یہ ارض و سماوات لوح و قلم، انسان و جنات، چرند و پرند، جمادات و نباتات، حور و قصور، کوثر و سلسبیل ملک و ملکوت کو خلق نہیں کیا گیا تھا اس سے کہیں پہلے اللہ نے نور محمدی کو تخلیق کیا تھا۔ یہ نور اللہ کی عندیت میں تھا اور اپنے خالق کی تسبیح و تحمید و تمجید کرتا رہا جب اللہ نے اس گلشن کائنات کو بنایا تو سب سے پہلے ''گل محمدی'' کی خوشبو سے اس کائنات کی مشام جاں کو معطر و منور کیا۔

اس بند کا تیسرا مصرعہ

''اس شاہ کے اوصاف کا کونین میں غُل ہے''

اس مصرعہ کا براہ راست تعلق اوپر کے دونوں مصرعوں سے ارتباط خاص رکھتا ہے اس میں خاص کر میر انیس نے لفظ ''شاہ'' کا استعمال حضور گرامی قدر کی ذات بابرکت کے لیے کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ذات محمدی ہی ایک ایسی ذات ہے جس کے ظہور کا مبہم اور ان کے اوصاف و خوبیوں کا تذکرہ ان کی آمد سے پہلے ہی اس دنیا میں بھیجے جانے والے نبیوں کا ورد زبان تھا اور آسمان میں بزم ملکوت کی بزم کی رونق تھا۔

اس بند کا چوتھا مصرعہ

سب جزو و کُل اجزائے ہیں اسی کا وہی گل ہے''

اس مصرعہ کی ساخت پر غور کریں یہ مصرعہ اپنے ماقبل کے مصرعوں سے معنوی طور پر انضباط رکھنے کے باوجود ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور فنی اعتبار سے استخوان بندی کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ اس مصرعہ میں دو اہم لفظ ہیں ایک ''جزو'' دوسرا ''کل'' ان دونوں لفظوں کے اتصال سے ایک بڑے معنی کی تخلیق کا عمل انجام پذیر ہو رہا ہے یعنی یہ ساری کائنات اور اس کائنات میں موجود تمام اشیا ایک ''جزو'' کی حیثیت رکھتی ہیں اور منطقی نقطۂ نظر سے ہر جزو کے لیے ایک کل کا ہونا ضروری

ہوتا ہے۔ اس مصرعہ میں اسی فلسفہ کی طرف اشارہ ہے کہ اس کائنات میں ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم "کل" کی حیثیت رکھتی ہے اور جب اس کل کے اجزاء کو منتشر کیا گیا تو سارے کونین کی خلقت ہوئی یعنی اگر اس کائنات سے ذات محمدیؐ کو ہٹا دیا جائے تو یہ دنیا ایک بے معنی شے کی حیثیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوگی لہٰذا اس دنیا کے قیام کے لیے ذات محمدؐ کا ہونا ضروری ہے۔

اس بند کی ہیئت ملاحظہ فرمائیں۔

ہر چند کہ ہے وہ خلف آدم و حوّا
پر حق نے کیا ہے شرف آدم و حوّا

مطلع کے اس بند میں یہ بات بالکل واضح کردی ہے کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اس دنیا میں سب سے پہلے اللہ کی طرف نبی بنا کر مبعوث کئے گئے جب انسانوں کا کوئی وجود نہیں تھا اور رسولؐ خدا کو ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں میں سب سے آخر میں بھیجا گیا جو ہمارے نبی آخرالزماں "خلف آدم" ہیں یعنی جناب آدم کے بعد تشریف لائے۔ لیکن اس کے باوجود جناب آدم و حوا کے لیے ہمارے نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم شرف منزلت اور باعث افتخار ہیں۔ چونکہ یہ تمام نبیوں کے سردار ہیں اور روز محشر تمام رسولوں کے کار رسالت کی گواہی دینے والے ہیں۔ اس مسدس کے سارے بند کی اگر توضیح و تشریح کی جائے تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائے گا لہٰذا مضمون کی طوالت کے پیش نظر میں مسدس کے اس بند پر اپنی بات کا اختتام چاہتا ہوں۔

جب آئے جہاں میں قدم احمد مختار
تاثیر گئی سحر کی کاہن ہوئے بیکار
اوندھے ہوئے بت خوف سے لرزاں ہوئے کفار
ہر جائے تشہد کی صدا آتی تھی ہر بار
یہ معجزہ مابین سماوات ہے مشہور
کسریٰ کا محل گر پڑا یہ بات ہے مشہور ◇

صفحہ ۳۵۷ کا بقیہ

شمالی ہند کی پیداوار ہے لیکن اردو کے ارتقاء میں شمال کے علاوہ دکن کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ اردو زبان کی دوسری اصناف سخن کی طرح اردو رباعی گوئی کی ابتدا بھی دکن میں ہوئی البتہ شمالی ہند کے مقابلے میں دکن میں رباعی کم اور بہت کم کہی گئی ہیں۔

جس وقت لکھنؤ میں آتش و ناسخ اردو شاعری کی محفلوں میں غزل کا جادو جگا رہے تھے انیس اور دبیر عزاخانوں میں مرثیے کی دلفروز شمعیں روشن کر رہے تھے۔ آتش و ناسخ کے بعد لکھنؤ میں غزل کا چراغ جھلملانے لگا مگر مرثیے کے چراغ کی لو کچھ اور تیز ہو گئی۔ آتش اور ناسخ کے بعد لکھنؤ میں کوئی نامور غزل گو نہیں رہا اور مرثیہ گوئی کے عروج کو قابل ذکر موقع مل گیا۔ ساتھ ہی شاہان اودھ کی سرپرستی نے اس موقع کو چار چاند لگا دئے اور مرثیوں پر مرثیے تصنیف ہونے لگے۔

میر انیس کے مرثیے بھی شہرتوں کو زندگی دے رہے تھے ساتھ ہی رباعیاں بھی وجود میں آرہی تھیں۔ میر انیس کی رباعیاں فکر و فن کی کچھ ایسی شان رکھتی ہیں کہ اگر انیس مرثیے نہ بھی کہتے ان کی قدر آوری کے لیے کسی اعتبار سے کم نہیں۔

میر انیس کی رباعیاں ان کی زندگی میں ہی قبول عام کے کے درجے میں آگئی تھیں کہا جاتا ہے کہ ان کی رباعیوں کی قبولیت اور شہرت میں ان کا طرز اور ان کی آواز کا سوز و گداز بھی خاصا دخیل رہا ہے۔

میر انیس کے ایک بڑے رباعی گو شاعر ہونے میں شاید ان کے مخالف کو بھی کوئی کلام نہیں۔ میرا خیال ہے کہ میر انیس اپنے مرثیوں سے الگ اپنی رباعیوں کی سج دھج سے اردو شعر و ادب میں زندہ رہیں گے۔

◇◇

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
کناڈا

میر انیسؔ کی منقبت

میر انیس کی ایک خاص منقبت حضرت علی کی شان میں مخمس کی شکل میں ہے۔ یہ منقبت ۹ بند یعنی ۴۵ مصرعوں پر مشتمل ہے جن میں صرف مقطعے کے بند کے تین مصرعے اردو میں ہیں باقی تمام منقبت فارسی میں ہے مقطعے کے بند سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منقبت انیس کی آخری عمر کی تصنیف ہو گی جو بیماری کی حالت میں لکھی گئی ہے۔

انیس ان چند بندوں کا صلہ ہے گلشن جنت
نہ گھبرا اس مرض سے بعد ہے آزار کے راحت
نئی طاقت بھی دیں گے ان کو ہے ہر طرح کی قدرت
علی فرحت، علی نصرت علی شوکت، علی حشمت
علی حکمت علی صحت علی دارو علی درماں

مقطعے میں راحت، طاقت اور قدرت کی نسبت علی سے منسوب۔ فرحت، نصرت، شوکت اور حشمت لایا گیا ہے اسی طرح مرض کے دور کرنے کی نسبت سے حکمت، صحت دارو درماں یعنی دوا اور علاج کا لفظ دکھایا گیا ہے۔ انیس الفاظ کے انتخاب، ان کا تناسب در وبست اور نشست کے رموز سے واقف تھے۔ اردو شعر و ادب کا شاید ہی کوئی دوسرا فنکار اس جہت سے میر انیس کا ہم پلّہ ہو۔

حافظ کے دیوان میں حضرت علی کی شان میں ایک ۴۳ اشعار کا قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے۔ مقدریکہ ز آثار صنع کرد اظہار
سپہر و مہر و مہ سال و ماہ و لیل و نہار

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی صناعی قدرت سے تخلیقی آثار بنائے ہیں۔ آسمان، سورج، چاند، سال مہینے شب اور روز۔ حافظ کی اس منقبت میں فضائل علی کے ذکر کے ساتھ مناجاتی لہجہ بھی نظر آتا ہے جس میں فرشتوں، نبیوں، اماموں، مصحفوں کا واسطہ بھی ملتا ہے جیسے۔

بحق قوت جبریل و صور اسرافیل
حق یوسف و یعقوب و یحییٰ لقماں
عشق دین محمد بخون پاک حسین
بحق جملہ قرآں بہ مصحف ابراہیم

قصیدے کے آخر میں جو تین شعر ہیں اس کا ترجمہ کر کے ہم یہاں اشعار پیش کریں گے جس سے حافظ کا لہجہ ظاہر ہے اے حافظ تو دشمنوں کے ساتھ نہ بیٹھ بلکہ تولا کر اور آٹھ اور چار (یعنی بارہ اماموں) کے طفیل سے اپنی نجات طلب کر۔ وہ بدکردار، منحوس اور بے اصل ہے جو بادشاہ جہاں حضرت علی کی تعریف کرنا قبول نہیں کرتا (حافظ) منافق کی پیروی چھوڑ اس کا تو نام لینے سے ہزار بار استغفار پڑھ۔

بدشمناں منیش حافظ تولا کن
نجات خویش طلب کن بجان ہشت و چہار

- - - - -

حرام زادہ و شوم و بد فعل بے بنیاد
مدح شاہ جہاں کے کجا کند اقرار

مطابعت بمنافق چو می کنی بگذر
زیادہ گفتن ناشن ہزار استغفار

اس مناجاتی قصیدے کا ہم اس لیے ذکر کر رہے ہیں کہ اس میں آٹھ دس اشعار میں حضرت علی کے فضائل جو بیان کئے گئے میر انیس نے دوسری بحر میں مخمس یہی طرز بیان رکھا ہے یہاں ہم حافظ کے دو شعر مثال کے طور پر پیش کر کے میر انیس کی منقبت کا رخ کرتے ہیں۔

علی علیم و علی عالم و علی اعلم
علی حکیم و علی حاکم و علی گفتار
علی سلیم و علی سالم و علی مسلم
علی قسیم قصور و علی ست قاسم نارؐ

میر انیس کی منقبت اگرچہ فارسی میں ہے لیکن حضرت علی کے نام کے ساتھ جو لفظ یا الفاظ جوڑے گئے ہیں اس کو سمجھنا عام اردو کے قاری کے لیے دشوار نہیں۔ اس منقبت میں حضرت علی کا نام ایک سو پچاس (۱۵۰) بار تکرار ہوا ہے اور اسی طرح ۱۵۰ بار حضرت علی کے فضائل، شمائل، خصائل اور ان سے مربوط کمالات کا ذکر ہوا ہے جن میں سے ہر ایک بذات خود اپنی اپنی جگہ ایک مستقل عنوان بن سکتا ہے۔ مثلاً۔

علی مولا (حدیث من کنت مولا فهذا علی مولا کی طرف اشارا ہے
علی قرآن (حدیث انا نقطہ تحت الباء کی طرف علامت ہے۔
علی نور (حدیث اول ما خلق اللہ نوری کا اشارہ ہے۔
علی فتح، علی نصرت، علی صفدر، علی شیر صف میداں وغیرہ اشارے۔ بدر، احد، خندق اور خیبر وغیرہ کے غزوات میں علی دلاور اور ان کی فتح سے منسوب ہیں۔

اس منقبت میں انیس کو بہت سے حضرت علی کی سیرت کے نمایاں پہلوؤں کو دو لفظ میں بیان کرنا تھا۔ اس لیے یہاں علم بیان کی تشبیہات، استعارات، مجاز مرسل، کنایات کے علاوہ تلمیحات اصطلاحات، علامات، اشارات اور رمز و ایما کے نازک اور بلیغ خیالات کا ایجاز اور اختصار بڑی خوش سلیقگی اور شگفتگی کے ساتھ نظر آتا ہے۔

علی ایماں، علی نعت، علی مسجد، علی منبر، علی مامن، علی مومن علی قاطع، علی برہاں، علی ہادی، علی مرشد، علی اعلیٰ، علی آقا وغیرہ وغیرہ کسی نہ کسی طرح سے علامت نگاری اور معنی آفرینی کی اسناد ہیں بعض مصرعوں میں الفاظ کا انتخاب اور ان کی نشست کا اہتمام رعایت لفظی اور صنعت مراعاۃ النظیر کے زمرہ میں ہوتا ہے۔ ذیل کے مصرع میں درع، جوشن یعنی زرہ بکتر جو خود اور تلوار کے ساتھ باندھی گئی ہے۔ ع

علی درع، علی خود و علی تیغ و علی جوشن

فیض، خیرات، سخاوت اور بخشش کو ایک مصرع میں دیکھئے

علی فیض علی جود و علی بذل و علی باذل

نوح، کشتی، دریا اور ساحل کی باہم ہم کناری دیکھئے۔

علی نوح و علی کشتی، علی دریا، علی ساحل

ذیل کے شعر میں رعایت لفظی کے ساتھ رعایت معنوی اور تناسب لفظی و معنوی کا امتزاج انیس کی ایجاز بیانی میں معجز بیانی کی حسن آفرینی دکھاتا ہے۔

علی آقا، علی مولا، علی سید، علی سرور
علی کعبہ، علی قبلہ، علی مسجد، علی منبر

بعض مصرعوں میں ہم رنگ، ہم وزن اور ہم آہنگ الفاظ اس طرح سنگ سنگ جڑے ہیں کہ یہ آہنگ، خاص ترنگ اور ڈھنگ رکھتا ہے جیسے ان مصرعوں میں۔

علی شافع، علی نافع، علی رافع، علی واقع
علی واصل، علی فاضل علی شامل علی قابل

یہاں مرصع سازی کے علاوہ صنعت اشتقاق اور صنعت تجنیس کا بھی زور بیان شامل ہے۔ انیس کی صنعت کاری عمدی یا قصدی نہیں بلکہ یہ ان کی خامہ نگاری کی معمولی سی کرشمہ سازی ہے کہ خود صنعتیں نوک قلم سے ڈھلتی جاتی ہیں۔ نہ جانے کتنی ایسی نادر نادر دریافت صنعتیں ہیں جن کے گلشن انیس نے اپنی اقلیم سخن میں چھوڑے ہیں۔ صحراؤں، جنگلوں میں کتنے خوشنا پھول ہیں جن کے نام نہیں

میرانیس نے منقبت میں اپنے ممدوح مولا علی کی سیرت میں وہ تمام عناصر جمع کر دئے جو انسانی اسلامی سماجی قدروں کے روشن اور مستند حوالے ہیں یہاں انیس نے ان قدروں کو حضرت علی سے نسبت دے کر انھیں قابل قدر بنایا ہے۔ یعنی قدروں نے علی اعلا قدر سے قدر کی قدرت حاصل کی۔

علی کامل، علی فاضل، علی عادل، علی قابل، علی واصل، علی فاضل علی رافع، علی جامع، علی مرتجع، علی مامن، علی مومن، علی والا علی ملجا، علی غفراں علی ایماں علی برہاں، علی فرقاں، علی قرآں علی احساں، علی سرور، علی گوہر، علی منبر، علی حاکم، علی عالم، علی شاید علی قائد علی حکمت علی صحت، علی دارو، علی درماں اور یقیناً علی رحمت علی نعمت، علی فرحت، علی نصرت، علی حشمت اور علی جنت۔

انیس نے فضائل حضرت علی کو نئے رنگ و ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ امام امین اور شریف کی دستار بندی دو دو لفظوں کے ساتھ دیکھئے۔

امام مشرق و مغرب شریف یثرب و بطحا
امین وحی پیغمبر امام مسجد اقصیٰ

قرآن کا امانت دار، قبلۂ اول کا امام مدینہ و مکہ کا والی مشرقین اور مغربین کا مقتدا حضرت علی کو بتا کر معراج اور صاحب معراج کے نام لیے بغیر پورا واقعہ ایک مصرعہ میں پیش کر کے اس کے رمز و رموز سے باخبر علی کو اجاگر کر دیتے ہیں۔

علیم و عالم اسرار سبحٰنَ الذی اسریٰ

میرانیس نے کئی مقامات پر اپنے کلام میں قرآنی آیات، احادیث اور عربی فقروں کو خوبصورتی کے ساتھ سلک شعر میں پرو دیا ہے۔ انیس ان ادق خارجی زبان کے لفظوں کو ایسے الفاظ سے جوڑ دیتے ہیں کہ ان کی غیر مانوسی ثقالت اور تلفظ کی دشواری حل ہو جاتی ہے۔ اوپر کے مصرعہ کو ہر وہ شخص جو اردو فارسی عربی سے واقف ہے صحیح تلفظ سے پڑھ سکتا ہے اسی کو الفاظ کا دروبست اور لسانی تقاضہ کہتے ہیں۔

اس مصرعہ میں انیس آیت کے اشارے سے معراج کا ذکر کر کے واقعہ معراج میں جو رمز و رموز پوشیدہ ہیں اس کا باخبر حضرت علی کو بتاتے ہیں پھر اس کے بعد دو مصرعوں میں منزلت علی اور انفرادیت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

علی عالی، علی عالی علی والا علی اعلیٰ
علی جامع علی فارق علی ادنیٰ علی فرقاں

پہلے مصرعہ میں عالی مرتبت قدریں علی کی جامعیت کی مانند ہیں۔ ادنیٰ کا وجود معراج قوسین کے فاصلے سے ہے۔ جو قرآن میں ثبت ہے۔

مخمس در منقبت حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

علی فخر بنی آدم علی سردار انس و جاں
علی سرور، علی صفدر، علی شیر صف میداں
علی ہادی، علی ایماں، علی لطف و علی احساں
علی حکمت، علی شافی، علی دارو علی درماں
علی جنت، علی نعمت، علی رحمت، علی غفراں

علی واصل، علی فاصل، علی شامل، علی قابل
علی فیض و علی جود و، علی بذل و علی باذل
علی نوح و علی کشتی، علی دریا، علی ساحل
علی عالم، علی عادل، علی فاضل، علی کامل
علی افضل علی مفضل، علی لطف و علی احساں

علی آقا، علی مولا، علی سید، علی سرور
علی کعبہ علی قبلہ، علی مسجد، علی منبر
علی تارک، علی افسر، علی زینت علی زیور
علی نور و علی انور، علی در و علی گوہر
علی ساقی، علی کوثر، علی مالک، علی رضواں

علی بحر و علی معدن، علی ابر و علی گلشن
علی فتح و علی نصرت، علی آرام جان و تن
علی درع علی خود و علی تیغ و علی جوشن
علی محسن علی احسن، علی خازن علی مخزن
علی مامن علی مومن، علی آہن علی ایماں

(بقیہ صفحہ ۲۹۴ پر)

وقار ناصری
شیش محل حسین آباد لکھنؤ
8172845795

انیس کے سلام: ایک جائزہ

رثائی ادب میں سلام کی صنف ان اصناف شعر میں ہے جو اپنے مخصوص رویوں کی بنا پر مرثیے و قصائد سے جداگانہ طرز احساس رکھتی ہے۔ ایک صنف کے اعتبار سے سلام کا عربی میں وجود نہیں۔ فارسی میں کچھ سلام مل جاتے ہیں لیکن ان کا تذکرہ فارسی ادب میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ امداد امام اثر نے "کاشف الحقائق" میں فارسی سلاموں کا ذکر کیا ہے۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب نے "تاریخ مرثیہ گوئی ابتدائی دور۔ ایران میں عزاداری اور مرثیہ" میں تیموری عہد کے ایک مرثیہ گو سلیمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"میرے کتب خانہ میں فارسی مرثیوں کا ایک بہت خوش خط مجموعہ ہے جس کے ہر صفحہ پر طلائی جدولیں کھینچی ہوئی ہیں اس میں ایک سلام اور تین مرثیے سلیمی کے بھی ہیں یہ سب نظمیں غزل یا قصیدے کی شکل میں ہیں"

اصل میں سلام اور دیگر رثائی اصناف کا ارتقا اردو میں ہوا سلام کی صنف صرف اردو میں پھلی پھولی۔ اس صنف کو اردو نے کچھ اس طرح اپنایا کہ اس کا شمار رثائی ادب کی ایک اہم صنف کے طور پر ہونے لگا۔ سلام کے تشکیلی مزاج میں مذہب اور اعتقاد بنیادی حیثیت رکھتے ہیں کربلا، واقعات کربلا اور مصائب کے حوالوں کے بغیر اس کا تصور ممکن نہیں لیکن اس میں وہ دوسرے مضامین بھی نظم کئے جاتے رہے ہیں جو حمد و نعت و منقبت وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سلام کے متعلق امداد امام اثر کا قول ہے۔

"سلام میں غزل کی طرح اعلیٰ درجے کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہیں مگر ان میں بھی غزلیت کا رنگ پیدا نہیں ہونے دیتے۔ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہئے سلام گوئی کا لطف یہی ہے کہ شوخی، رنگینی اور طبیعت داری کے ساتھ غزل سرائی سے جدا نظر آتا ہے"

اور "سلام میں واقعہ کربلا، رحلت رسول اور ذکر مصائب فاطمہ و ائمہ کا بیان ہوتا ہے اور اخلاقی و تمدنی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی زینت مقصود ہے منظوم کئے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین کبھی غزلوں میں باندھے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ سلام کے بعض اشعار ایسے دیکھے جاتے ہیں کہ اگر غزلوں میں داخل کر دئے جائیں تو بے موقع یا بے محل نہ ہوں گے" (کاشف الحقائق)

امداد امام اثر نے سلام کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ سلام کے تشکیلی مزاج میں وہ کون سے عناصر ہیں جن کو اہمیت حاصل ہے شروع کے سلاموں میں ایک اعتقادی فضا ملتی ہے۔ دھیرے دھیرے اس میں ادبی عناصر کی آمیزش ہوئی اور ان "واردات قلبیہ" اور "معاملات ذہنیہ" کے اثرات رونما ہوئے جن کی طرف

امداد امام اثر نے اشارا کیا ہے۔

اگرچہ ابتدائی دور کے مرثیوں اور سلاموں میں ادبی عناصر کی کمی تھی مگر کلام میں تاثیر کے جزو کا ہونا ضروری تھا۔ کامیاب مرثیہ کے لیے یہ خصوصیت ضروری تھی کہ دل پر چوٹ لگے اور آنکھ سے آنسو رواں ہو جائیں۔ دکن کے مراثی میں ایسے اشعار جا بجا ملتے ہیں۔

اکبری کا جب یو مرثیہ بولے ۔۔۔ سب سینہ کے کیواڑیاں کھولے

گو ہرا شک رات دن رولے ۔۔۔ جب سوں جاری ہوئیں ہائے افسوس

مرثیہ لوگوں کے سینے کے دروازے کھول دیتا ہے۔ اس سے دل پر چوٹ لگتی ہے جس سے آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آتا ہے۔

کہتا ہے عارف شہاں کا ماتم حسینو کے غم سے دو جگ ہے برہم

لگے ہے دل پر یوں کٹاری خدا کے سوں لے خدا کے لوگو

زیادہ تر سلام و مرثیے پرانی روش میں لکھے جاتے رہے اور یہ روش میر و سودا کے زمانے تک جاری رہی۔ اس زمانے میں سودا ایک ناقد کی حیثیت سے نمایاں رہے جنھوں نے پہلے پہل اپنے ہم عصر میر محمد تقی گھاسی کے سلام۔

اے نبی کے باطناً رستے کے والی السلام

ظاہراً ان سے بھی ہوا کُ تو رع عالی السلام

اور ان کے مرثیے پر تنقید کر کے سلام و مرثیے میں ادبی محاسن کی اہمیت پر زور دیا۔

ابتدائی دور کے سلام ایام محرم کے موقع پر پڑھنے کے لیے لکھے گئے شعرا ہر سال محرم میں حصول ثواب کی خاطر ایک سلام ضرور کہا کرتے تھے۔ مگر ان سلاموں کو علیحدہ صنف کے طور پر کوئی شناخت نہیں ملی تھی۔ انھیں ایک حد تک مرثیہ ہی سمجھا جاتا ہے۔ دھیرے دھیرے سلام اور مرثیے کے معیار مقرر ہوئے ہیئت کے فرق نے ایک اور واضح خط کھینچ دیا پہلے کے سلاموں میں سلام، السلام، درود و سلام، فاتحہ وغیرہ الفاظ کا التزام اور سلامی مجرئی جیسے الفاظ تخاطب کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ انیس کے بعض سلاموں میں بھی یہ تخاطب ملتا ہے۔ لیکن بعد کو یہ تخاطب غیر ضروری ہو گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ سلام کی صنف جو انداز اختیار کرتی رہی اس کی یہ چند مثالیں ہیں۔

نظامی برہانپور کے رہنے والے تھے۔ ان کا سب سے اہم کارنامہ مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے۔ نظامی نے ایک سلام میں امام حسین کا سراپا انوکھے انداز میں پیش کیا ہے اور آنے والے دور کے شعراء کے لیے اس راستے کی رہنمائی کی ہے جس کے آثار بعد کے مرثیوں اور سلاموں میں نمودار ہوئے۔

حسن تاج شاہاں سلام علیک ۔۔۔ حسین ماہ تاباں سلام علیک

پیشانی حسین کی جو والشمس ہے ۔۔۔ بھواں مد فرقاں سلام علیک

مبارک دو لب سورۂ المائدہ ۔۔۔ دو لشدید دنداں سلام علیک

وہ نصر من اللہ و فتح قریب ۔۔۔ شہنشہ کی باہاں سلام علیک

حسین کا سینہ سورہ الفاتحہ ۔۔۔ دو قد آل عمراں سلام علیک

نظامی قیامت کا کچھ ڈر نہ کر ۔۔۔ حسین شاہ سلطاں سلام علیک

ولی غزل گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں ان کے سلاموں کے یہ چند اشعار ہیں۔

ہر رنگ میں دیکھتا ہوں چراغ کے نیرنگ

ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ

ہو دستگیر مجھے یا علی ولی اللہ

کہ اس فلک نے کیا ہے کماں مجھ کو تنگ

خدا نے اس کو دیا مرکب ایک دلدل نام

گیا جو دریا کو ایک پل میں لاکھ بار الانگ

....

اس نور مصطفےٰ پر بولو سلام، یاراں

محبوب مرتضیٰ پر بولو سلام، یاراں

اس پاک باد سایر، حیدر کے دل ربا پر

اس لعل بے بہا پر بولو سلام یاراں

یوں جی وکی فدا کر، اس شاہ کربلا پر

اس لائق ثنا پر، بولو سلام، یاراں

نواب مرزا کلب علی خاں یمین اودھ کے حکمراں نواب

سعادت علی خاں کے فرزند اور شاہ غازی الدین حیدر کے حقیقی بھائی تھے۔ شعروشاعری کا شوق تھا اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے یہ ان کے سلام کے چند اشعار ہیں۔

قتل امام خامس آل عبا کے بعد
تا اربعین سرخ تھا دیوار و در کا رنگ
یثرب ہوا خراب شہادت سے شاہ کی
کیا پوچھتے ہو مومنو اجڑے نگر کا رنگ
یا شاہ کربلا یہ تمنا یقین کی ہے
محشر میں ہو سفید رخ نوحہ گر کا رنگ

سلطان عالیہ سلطان بادشاہ اودھ نصیرالدین حیدر کی بیگم ملکہ زمانیہ کی بیٹی اور نواب کیواں جاہ کی بہن تھیں سلطان ان کے شوہر ممتاز الدولہ مرزا دبیر کے شاگرد تھے۔ سلطان عالیہ کے سلام مجرئی کہتے تھے۔ الفاد یہ خنداں ہوکر، پر میر یونس نے بھی سلام کہا اس پر جو قضیہ ہوا اس کی گونج مدتوں سنائی دی سلطان عالیہ سلطان کے اس مشہور سلام کے یہ چند اشعار ہیں۔

مجرئی کہتے تھے الفار یہ خنداں ہو کر
عید قرباں کی کرو شاہ پہ قرباں ہو کر
لب و دنداں پہ سر شاہ کے دیکھی جو چھڑی
بیبیاں رہ گئیں انگشت بدنداں ہو کر
لائے جبریل جو محضر تو یہ زہرا نے کہا
قتل شبیر پہ میں مہر کروں ماں ہو کر
جو گدا بیٹھ گیا شاہ نجف کے در پر
در دولت سے اٹھا پھر وہ سلیماں ہو کر
اب ہمارے لیے لبیک ہوئی اے سلطاں
کربلا ہند سے جاتے ہیں خراساں ہو کر

فقیر محمد خاں گویا شاہ نصیرالدین حیدر کے زمانے کی مشہور شخصیت تھے۔ وزیر اودھ مرزا آغا میر کے نہایت قریب تھے شاعری میں ناسخ کے شاگرد تھے۔ اہل بیت سے عقیدت رکھتے تھے ان کے سلام کے یہ چند اشعار ہیں۔

لازم ہے مجرئی کو اطاعت حسینؑ کی
مغفور پہلے ہوگی جماعت حسینؑ کی
روتے تھے زار زار پیمبر بہشت میں
کرتے تھے یاد جبکہ مصیبت حسینؑ کی
گویا کو یہ کہیں کہ ہمارا ہے یہ محب
ہو روز حشر اتنی عنایت حسینؑ کی

مرزا سخاوت علی بیگ ضیا حاتم علی مہر کے فرزند تھے۔ حاتم علی مہر ناسخ کے شاگرد تھے۔ ضیا مرزا دبیر کے شاگرد تھے یہ ان کے اشعار ہیں۔

مجرئی بیک دوش ہے منبر سے اتر کر
معدوم ہو ا بار گنہ سر سے اتر کر
ہر غم ہے سلامی غم سرور سے اتر کر
ہیں سارے گہر اشک کے گوہر سے اتر کر

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں شہید ہونے والے صحافی مولوی محمد باقر کے فرزند محمد حسین آزاد جو ذوق کے شاگرد تھے۔ ان کے سلام کا یہ رنگ ہے۔

مجرئی نہ کیوں خوں سے ہو چشم تر آلودہ
ہوویں جو سکینہ کے خوں سے گہر آلودہ
یوں خوں سے سر سرور تھا نیزہ پہ آلودہ
جس طرح شفق ہو جہرہ سحر آلودہ
مجرئی غم شہ میں دل غم سے کر آلودہ
تا اشک جگر گوں سے ہو چشم تر آلودہ
کیا ظلم ہے پانی سے ہوں بحر و بر آلودہ
پر ہوں نہ لب شاہ جن و بشر آلودہ
آزاد غم شہ میں گردوں میں جگر خوں ہے
آتا جو شفق میں ہے شام سحر آلودہ

ادبی پہلو کے بغیر ادب اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا۔ یعنی ادب کے لیے اس کا ادبی پہلو ایک ایسا شناخت نامہ ہے جو اس کے معیار و اعتبار کو ہمیشہ برقرار رکھتا ہے۔ نظم و نثر کی ہر وہ صنف

کہ جس میں زبان و بیان، تہذیب و معاشرت، قدروں روایتوں
اور معتقدات کا احساس، حسن و خیر و صداقت کے ساتھ فکر و
دانش کے نئے نئے مفاہیم تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے
اسے ادب کہا جاتا ہے۔ رثائی ادب کی تمام اصناف جس میں
سلام کی صنف بھی شامل ہے یہ سارے مرحلے تو اس وقت
سے طے ہونے شروع ہوئے جب سے یہ صنف بہ طور صنف
مستحکم ہوتی چلی گئی لیکن مذہبی رویوں سے گہری وابستگی کی
بنا پر صرف اس صنف کو نہیں بلکہ تمام رثائی ادب کو ادب کے دائرہ
سے خارج کرنے کا تماشا برسوں سے جاری رہا ہے۔ گویا سلاموں
کی مذہبی شناخت اس کی سب سے بڑی خامی ہے۔ حالانکہ تمام
دنیا میں جہاں بھی شاعری کی ابتدا ہوئی اس کا اولین احساس
اور اس کی پہلی ترجمانی مذہبی مناجات اور دعائیہ منظومات کے
ذریعہ اظہار کا وسیلہ بنی ہے اور پھر وہ سارا ادب جس پر
رثائی ادب کی تہمت نہیں ہے اس میں بھی زیادہ تر تلمیحات
علامات و استعارات تو وہی ہیں جو اس رونے رلانے والے
ادب سے مخصوص ہیں۔

عہد تاریک سے تمدن کی طرف بڑھتے ہوئے فرد اور
اس کے سماج پر مذہب کا جتنا اثر ہے اسے چاہے کوئی کتنا
فرسودہ عقائد اور خیالات کا مجموعہ کہے مگر اس حقیقت سے کوئی
انکار نہیں کر سکتا کہ مذہب وہ پہلی اور آخری درسگاہ ہے جو
انسان کو خیر و صداقت کی تلاش و جستجو کی طرف رہنمائی کرتی ہے
دنیا کے تمام مذاہب چاہے ان کی ابتدا کسی دور میں ہوئی ہو
اسی تلاش و جستجو کے میدان عمل ہیں۔ یہ کائنات کے ہزار
پہلوؤں کو سمجھنے کا وہ ذریعہ ہیں جو قدیم انسانوں سے لیکر
عہد حاضر کے انسانوں تک کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود
رہے ہیں۔ ایک بہتر انسان کا تصور ہی اصل مذہب ہے
اور اس کی حقیقت خود وہ انسان ہے جس کے بغیر اس دنیا
کا تصور نہیں جس میں وہ موجود ہے۔

رثائی ادب اسی بہتر انسان کا رزمیہ ہے جو کبھی مدینے کی
طرف ہجرت کرتا ہے کبھی در خیبر پر نظر آتا ہے اور کبھی دشت
ماریہ میں تین دن کی تشنگی میں زیر خنجر عصر کا سجدہ کرکے نوک
نیزہ پر قرآن کی تلاوت کرتا ہوا بازار کوفہ و شام سے گزرتا رہتا ہے
یہ مسلسل سفر ہے جو لفظ و حرف کی صورت میں اس وقت سے
جاری ہے جب سے اردو میں مرثیے، سلام اور نوحے سے
مذہبی ادب کا آغاز ہوا۔ سلام میں مرثیوں جیسی تفصیل نہیں اس
کا اختصار ہی اس کی خوبی ہے۔ دو مصرعوں میں بات کہنے کا
ڈھنگ جو غزل کی خصوصیت اور اس کا سب سے بڑا وصف ہے
وہی خصوصیت اور وہی وصف سلام کا بھی حسن ہے۔ اگرچہ
ابتدائی سلاموں کا انداز خاصا روایتی تھا۔ ان میں ادبی چاشنی
کم پائی جاتی تھی لیکن مصطفےٰ خاں یکرنگ کی طرح بعض سلام
نگار اس کے ادبی محاسن پر بھی نظر رکھتے تھے۔ یکرنگ کے سلام
کے یہ تین شعر سبھی تذکرہ نگاروں نے نقل کئے ہیں۔

زخمی برنگ گل ہیں شہیدان کربلا
گلزار کی خط ہے بیابان کربلا
کھانے چلا ہے زخم ستم ظالموں کے ہاتھ
دھو ہاتھ زندگی سیتی، مہمان کربلا
اندھیر ہے جہاں کہ اب شامیوں کے ہاتھ
ہے سر بریدہ شمع شبستان کربلا

سودا و میر تک آتے آتے سلام کے ادبی رنگ نمایاں ہو چلے
تھے۔ سودا کے بعض مطلع یہ ہیں۔

ادب سے بھیجے ہے تجھ پر ترا غلام سلام
قبول ہو تری خدمت میں یا امام سلام

میں بھیجتا ہوں تجھے فاطمہؑ کے لال سلام
علیؑ کے باغ کے اے سرو نونہال سلام

کہے ہیں ساکن جنت بزیب و زین سلام
تری جناب میں یا حضرت حسینؑ سلام

میر تقی میرؔ کے لہجہ میں بھی ترقی نظر آتی ہے۔

اے بدخشانِ نبیؐ کے لالِ احمر السلام
وے گلستانِ علیؑ کے لالۂ تر السلام
اے گلِ خوش رنگ گلزارِ شہادت السلام
تیری مظلومی کی سب دیں گے شہادت السلام
ساقیٔ کوثر کے پیارے السلام
تشنہ لب سید ہمارے السلام

قائمؔ چاندپوری کا یہ انداز ہے۔

اے صبا کہیو امام ابن پیمبرؐ کو سلام
داورِ دنیا و دیں شبیرؑ و شبرؑ کو سلام

قلم نے لوح پہ جس دم نبی کا نام لکھا
صلوٰۃ ثبت کی، ساتھ اس کے اور سلام لکھا

نہ مہرباں کے پڑھے بن قبول ہوں قائمؔ
اگرچہ ملک گہر کے تھے یہ تمام سلام

دکن، عظیم آباد، دلی، لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر جہاں جہاں شعراء موجود تھے سلام کی صنف میں ترقی ہوتی گئی رنگینؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، ظہیرؔ دہلوی مولوی محمد باقرؔ دہلوی، داغؔ جیسے صاحب طرز شعراء نے سلام کہے۔

مدام جھک کے یہ کرتا فلک ہے جس کو سلام
وہی امام ہے کیسا، امام ابن امام

مصحفیؔ

سلام اس پہ کہ جس نے قدم جدھر رکھا
تو آسماں نے بھی ادھر زمیں پہ سر رکھا

جرأتؔ

سلام اس پہ اگر بادشاہ کہیں اس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو غالبؔ

سلامی! لٹ گئی تقدیر شہ پہ رونے والوں کی
یہ آنکھیں جنت الماوی کی ہیں مہریں قبالوں کی

ظہیرؔ دہلوی

اے سلامی! صبر سبط مصطفےٰؐ پر ختم ہے
ظلم و کیں، مجرائی شمر بے حیا پر ختم ہے

باندھا کمر کو شہ نے شہادت کے واسطے
اے مجرئی شفاعت امامت کے واسطے

بہادر شاہ ظفرؔ

ان کو مجرا ہے جو زیر آسماں بیٹھے ہوئے
بھوکے پیاسے، بے وطن بے خانماں بیٹھے ہوئے

داغؔ دہلوی

لکھنؤ میں مرثیے کے ساتھ ساتھ سلام کی روایت کو ایک نیا طرز احساس ملا۔ نوابین اودھ کی سرپرستی اور اس سے زیادہ اہل لکھنؤ کے انہماک نے اس روایت کو پروان چڑھایا اظہار عقیدت نے یہاں سلاموں کی ایک ایسی دنیا آباد کی جو شاید کہیں نہیں تھی۔ احسانؔ و گداؔ، ضمیرؔ و خلیقؔ، فصیحؔ و دلگیرؔ کے سلام ہوں یا انیسؔ و دبیرؔ کے سلام۔ یہ سارے کے سارے سلام رسول اور آل رسول سے والہانہ عقیدت کے ترجمان ہی نہیں بلکہ ان میں اخلاقیات کے وہ تمام پہلو موجود ہیں جو انسانی تہذیب کا سرچشمہ ہیں۔ ان کا بنیادی رنگ چاہے جتنا رثائی رہا ہو لیکن ان میں ادبی عنصر اور شعری محاسن کے رنگ بھی نمایاں ہوتے رہے۔ ضمیرؔ، دلگیرؔ، دبیرؔ اور دوسرے لکھنوی شعراء کے سلاموں میں روایتی انداز کے باوجود خوش آئند تبدیلیوں کا احساس ہوتا ہے۔

مجرئی! شہ نے کہا میں جو نہ بے سر ہوتا
حشر کو تاج شفاعت نہ مرے سر ہوتا

شاہ کہتے تھے اگر تیر نہ لگتا دل پر
دیکھتے تم کہ جواں کیا علیؑ اکبر ہوتا

شاہ فرماتے تھے کچھ چیز نہیں آبِ فرات
ہم لٹا دیتے اگر چشمۂ کوثر ہوتا
ضمیرؔ

اے سلامی وطن شاہ تو کچھ دور نہ تھا
ایک شبیر کو پھر جانا ہی منظور نہ تھا
سر کھلے بلوے میں لے جائیں کسی کے ناموس
پیش ازیں ملک عرب میں کبھی دستور نہ تھا
اور خاصان خدا پر بھی قیامت گزری
پر سوا شہ کے کوئی درد میں مسرور نہ تھا
دلگیرؔ

ہے عکس گیسوئے رخ اکبر کہاں کہاں
سنبل کہاں کہاں ہے گلِ تر کہاں کہاں
کوفے میں کربلا میں بقیعہ میں، طوس میں
مدفون ہوئے بتول کے دلبر کہاں کہاں
گل میں، شفق میں، لعل میں، خورشید صبح میں
ہے رنگ خون کشتۂ خنجر کہاں کہاں
فرق عدو میں سینے میں، جوشن میں، زین میں
در آئی ذوالفقار دو پیکر کہاں کہاں
دبیرؔ

انیس کے لیے مرثیہ یا سلام کہنا کوئی نیا واقعہ نہیں تھا پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں، کے ساتھ یہ تو وہ سلسلہ تھا جس پر انیس کو فخر تھا۔ پردادا ضاحک سے شبیر کی مداحی کی جو ابتدا ہوئی وہ تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی رہی۔ اس کے اولیں نقوش ضاحک کے قصائد، مناقب اور سلام میں اس طور پر ملتے ہیں۔

شاہ اہل کرم سلام علیک
یا امام امم سلام علیک
اے شہ عالی نسب تم پر صلوٰۃ و سلام
خسرو والا حسب تم پر صلوٰۃ و سلام

شرق سے لے تا بہ غرب اور جنوب و شمال
بھیجیں عجم اور عرب تم پر صلوٰۃ و سلام
مالک ملک عرب والیٔ مصر و حلب
ترک و حبش بولیں سب تم پر صلوٰۃ و سلام
دل سے سدا یہ غلام تم کو کہے ہے سلام
بھیجے ہے ہر روز و شب تم پر صلوٰۃ و سلام

کربلا کے قتیل تم پر سلام
راہِ حق کی دلیل تم پہ سلام
تشنۂ دشتِ کربلا ہو تم
ساقی سلسبیل تم پہ سلام
تین دن تشنہ رہ کے تم نے کیا
خون اپنا سبیل تم پہ سلام
صبر ایوب تم سے اخذ کیا
یہ ہے صبر جمیل تم پہ سلام
عرض کرتا ہے یہ غلام حسین
ہو نہ ہرگز ذلیل تم پہ سلام

میر حسن اپنی مثنویوں خاص کر سحر البیان کی سحر بیانی کے سبب تاریخ ادب اردو میں بڑی شہرت رکھتے ہیں ان کے کلیات میں چند مرثیے و سلام موجود ہیں۔ میر حسن کے سلاموں کا یہ انداز ہے۔

اے بے دلوں کے دلبر و دلدار السلام
اے بے سروں کے سرور و سردار السلام
بھٹکے ہوؤں کے راہ نما تم ہو یا حسینؑ
غربت زدوں کے مونس و غمخوار السلام
کیا تیرے بعد دکھ میں پڑے سارے اہلبیت
اے بے کسوں کے قافلہ سالار السلام
کیا کہہ سکے حسن تیرے اوصاف یا حسینؑ
اے دشت کربلا کے گرفتار السلام

....

مری جاکے بندگی اے صبا تو ادب سے کہہ اس امام کو
صفیں باندھ باندھ کے جن و انس کھڑے ہیں جس کے سلام کو
وہ امام جس کا وہ پرزے تن رہا خاک و خون میں بے کفن
نہ لحد، نہ تختہ نہ گورکن نہ تو وارث ایک ہے نام کو
وہ مسافر سفر بلا کہ پیاسا جس کا گلا کٹا
مری کورنش تو کہہ صبا اسی تشنہ کام امام کو
کہ وہ دو جہاں کا امام ہے کرم اس کا خلق یہ عام ہے
یہ حسن اسی کا غلام ہے وہ نواز دے گا غلام کو

انیسؔ کے والد میر مستحسن خلیقؔ جن کی زبان کے خود انیس معترف تھے۔ ان کی شہرت ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے ہے ان کے سلاموں کا ایک مجموعہ تھا جو غزلوں کے دیوان کی طرح ردیف وار مرتب کیا گیا تھا مگر وہ نایاب ہے۔ خلیق کے سلاموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں واقعاتِ کربلا کے علاوہ اور دوسرے موضوعات کم ہی نظر آتے ہیں۔ خلیق کے سلاموں کا خاص مقصد رونا رلانا ہے۔

سلام کرکے جو شبیر کو چلا عباسؑ
حرم پکارے ارادہ یہ کیا کیا عباسؑ
میداں میں جب تیر سے مارے گئے اصغرؑ
تا دیر حسینؑ اس کو پکارے گئے اصغرؑ
صغریٰ یہی کہتی تھی کہ شبیر گھر آوے
یارب مرے بابا کی شتابی خبر آوے
آگے اس بین کے سننے کی نہیں تاب خلیقؔ
کوئی مضمون نہیں درد سے تیرا خالی

ہو شور و بکا کیوں نہ خلیقؔ اہلِ عزا میں
فقرہ ہے ہر اک شعر میں تیرے تو اثر کا

کیا سلام آج پڑھا تو نے یہ احوال خلیقؔ
کون سی بیت تھی دل سب کا جو تڑپا نہ گئی

واجد علی شاہ اخترؔ نے خلیق کے سلاموں کی گریہ خیزی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غزل کے ایک مقطع میں یہ مضمون نکالا ہے۔

حاسد حسد سے روئے جو اخترؔ تو کیا عجب
رتبہ ملے غزل کو سلام خلیقؔ کا

خلیق کا ایک سلام ایسا بھی ہے جو گریہ خیز مضامین تک محدود نہیں بلکہ اس میں عبرت و موعظت وغیرہ کے سنجیدہ مضامین بھی شامل ہو گئے ہیں۔ غالباً یہ آخری عمر کا سلام ہے۔ خلیقؔ کے سلاموں کے حوالے میں عموماً اسی کو درج کیا جاتا ہے۔

مجروئ طبع کند ہے لطف بیاں گیا
دنداں گئے کہ جوہر تیغ زباں گیا
لے کر قدِ خمیدہ کو اپنے کہاں پھریں
گوشہ ہی پھر ہے خوب جو زورِ کماں گیا
خالی پڑی ہیں شہر میں کیا کیا عمارتیں
یاں کس مکیں کے ساتھ بتاؤ مکاں گیا
جھک جھک گئیں بہشت میں طوبیٰ کی ڈالیاں
جس وقت رن میں فوج خدا کا نشاں گیا
فضلِ خدا جو ہو تو نہیں کچھ بہشت دور
دیکھو نصیب حر کہ کہاں سے کہاں گیا
زینب اسیرِ غم رہیں دنیا میں تا بہ مرگ
نہ زخم دل گئے نہ رسن کا نشاں گیا
گزری بہارِ عمر خلیقؔ اب کہیں گے سب
باغ جہاں سے بلبل ہندوستاں گیا

انیسؔ کے زمانے میں لکھنؤ لفظ و حرف کی نزاکتوں لہجہ کی حلاوتوں اور معنی آفرینی کی رنگینیوں سے معمور تھا۔ مصحفیؔ و انشاءؔ، ضمیرؔ و دبیرؔ، ناسخؔ و آتشؔ اور ان جیسے دوسرے باکمالوں کی شاعری ایک مثال بن چکی تھی۔ انیسؔ کے لیے ان سب کے درمیان ایک نئی راہ نکالنا اور نئی زمین

تلاش کرنا آسان نہیں تھا لیکن انھوں نے اپنے سخن کے جوہر سے نہ صرف وہ زمین تلاش کی بلکہ اس کے مضامین نو کے پھولوں سے کچھ اس طرح بھر دیا۔

دمِ تحریر گل ریزی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پر
صریر کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے

انیس کے لیے حسین اور کربلا وہ مرکز ہے جہاں ایک فرد اور اس کی مظلومیت میں پورا انسانی سماج سمٹ آیا ہے یہ زندگی کا وہ استعارہ ہے جو انسان کو عزت نفس کی خاطر موت کو ہنسی ہنسی گلے لگانے کی جرأت عطا کرتا ہے۔ یہ حسین اور ان کے جاں نثاروں کی قربانیوں سے عبارت حسن و خیر کی صداقتوں سے سجا ہوا ایک مقتل ہے۔ اس مقتل اور ان حسین مرقعوں کو انیس کی نگاہ سے دیکھئے اور یہ دیکھئے کہ انیس نے ان مرقعوں سے کیا کیا رنگ حاصل کئے ہیں۔

گذر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا
مگر حسین سے صابر کو اضطراب نہ تھا
فراقِ شاہ میں صغراؑ کو نیند کیا آتی
وہ شب تھی کون سی جو دل میں اضطراب نہ تھا

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

خیال ہم سفری زلف شہ کا سودا واہ
چمن میں کیا مجھے سنبل پہ پیچ و تاب آیا
برہنہ سر ہوئے وا نصیب وا قسمت
کہ اپنے سائے سے جن کو سدا حجاب آیا
لحد میں دھیان جو تھا فاطمہ کے پھولوں کا
اڑھائی چادر گل جب مجھے تو خواب آیا

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شبیہہ امام زماں کھینچتے ہیں
تصور میں تصویر جاں کھینچتے ہیں
جگہ سولی ہے مزاروں کی خاطر
زمیں پر شہ دیں نشاں کھینچتے ہیں

جھائیاں چاند کے منہ پر، رخ خورشید ہے زرد
کس سے تشبیہہ میں دوں شاہ کے رخساروں کو

کمال فقر بھی شایاں ہے پاک بینوں کو
یہ خاک تخت ہے ہم بوریا نشینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو
لحد میں دیکھئے ان کو نصیب ہو کہ نہ ہو
کہ خاک چھان کے پایا ہے جن زمینوں کو
جہاں سے اٹھ گئے جو لوگ پھر نہیں ملتے
کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں اب ہم نشینوں کو

۔۔۔۔۔۔۔۔

کیا پاک موج بحر سے طوفاں سے کیا خطرہ
کشتی مری حسین سے ہے ناخدا کے ساتھ
ہمراہ آہ سرد ہیں اشک گرم بھی
باراں کا لطف خوب ہے ٹھنڈی ہوا کے ساتھ

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کھانے کو رزق، رہنے کو گھر اور لحد کو جا
دنیا میں ایک جان کو کیا کیا نہ چاہیے
مرقد چراغ داغ سے روشن ہے انیس
شب کو اکیلے گھر میں اندھیرا نہ چاہیے

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

حرم روئے کہا جب آسماں کو دیکھ کر شہ نے
علی اکبر اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے
زمین کربلا پر فاطمہ کے پھول بکھرے ہیں
شہیدوں کی یہ خوشبو ہے کہ سب جنگل مہکتا ہے

خیال آ گیا دنیا کی بے ثباتی کا
چلے جہاں سے جو اصغر تو مسکرا کے چلے
انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ
چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

کبھی نہ دوں عرقِ روئے شاہ سے نسبت
ہزار طرح سے چھینٹے جو دے گلاب مجھے
غمِ حسینؑ میں نڈی چڑھی یہ اشکوں کی
کہ آسماں نظر آنے لگا حباب مجھے

....

جز خدا جھکتے نہیں ہم بادشاہ کے سامنے
ہاتھ پھیلائے تو نگ کیا گدا کے سامنے
قلب میں داغوں کے گل دامن میں اشکوں کے گہر
ہم یہ ہدیہ لے کے جائیں گے خدا کے سامنے

....

گل حدیقۂ زہرا نے آبرو دے کر
کلی سے پھول کیا پھول سے گلاب مجھے
رخ حسین سے دعوائے ہمسری کیا خوب
دکھائے زلف تو چہرے پہ آفتاب مجھے

انیس کے سلاموں کا ایک بڑا حصہ روایتی ہے ان کا حزنیہ لہجہ انھیں ان سلاموں سے جدا کرتا ہے جن میں اخلاقیات کے علاوہ دوسرے رجحانات نظر آتے ہیں۔ یہ روایتی سلام ان غم ناک لمحوں کی یاد دلاتے ہیں جو کربلا کے مصائب کا مرثیہ ہیں انیس ان مصائب کو بیان نہ کرتے یہ کبھی ممکن نہ تھا کیونکہ وہ جو کچھ تھے اسی غم حسین کی بدولت تھے۔ اسی غم نے انھیں اس زمین سخن کے آسماں تک پہنچا دیا تھا جسے دیکھ کر وہ کہہ سکے:

مری داد دے اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

ان سلاموں میں بھی انیس کا مخصوص اسلوب اور وہ لہجہ رہتا ہے جس کے لیے وہ جانے جاتے ہیں۔

آب خنجر سے گلا جب شاہ کا تر ہو گیا
پانی پانی اے سلامی! غم سے کوثر ہو گیا
کہتی تھی بانو مری قسمت کی گردش دیکھنا
گھٹنیوں چلنے نہ پایا قتل اصغر ہو گیا

اس طرح سر شہیدوں کے تھے شہ کے سر کے ساتھ
جس طرح ہوویں ماہ سے اختر جدا جدا
ہنگام ذبح ہر رگ گردن نے شاہ کی
شکر خدا کیا نہ خنجر جدا جدا

گھیرے رہے شہ والا ستم کے نیزوں میں
نہ آفتاب ہوا دوپہر گہن سے جدا
وطن میں پھر کے سفر سے نہ جیتے جی آئے
عجب گھڑی تھی کہ اکبر ہوئے بہن سے جدا

سر تھے نیزوں پہ سلامی! اسر شبیر کے ساتھ
بیبیاں قید میں تھیں زینب دلگیر کے ساتھ
سن کے غش آ گیا صغریٰ کو کسی نے جو کہا
روتے آتے ہیں حرم عابد دلگیر کے ساتھ

لکھا ہے سر حسین کا روتا تھا طشت میں
بیدادیوں کو جب سر بازار لے گئے
روئیں گے ہم لپٹ کے مزار حسین سے
گر شہ کے در پہ طالع بیدار لے گئے

جان عباس لگی تن سے کنارا کرنے
بہہ گیا مشک کا جس دم لب ساحل پانی
بیبیاں، بچوں کا منہ تکتی تھیں جب کہتے تھے شاہ
اس سفر میں نہ ملے گا کہیں منزل پانی

آج کی صبح بھی کم شام مصیبت سے نہیں
پھاڑ ڈالوں جو گریبان سحر ہاتھ لگے
چل تو اب یاں سے سوئے روضۂ شبیر انیس
اس کا گھر خلد میں ہے جس کے وہ در ہاتھ لگے

لحد میں دیکھیو داغ غم حسینؑ کی ضو
زوال جس کو نہیں ہے وہ آفتاب ہے یہ
سکینہؑ چونک کے روئی تو بانو کہنے لگی
کہاں حسین میں بیٹی! خیال و خواب ہے یہ

- - - - - -

عباسؑ حر سے کہتے تھے دیکھ اپنا مرتبہ
ہیں ترے سر کو زانو پہ سرور لیے ہوئے
نیزے پہ تھا جو دھوپ میں سبط نبی کا سر
سورج مکھی تھا مہر منور لیے ہوئے

- - - - - -

رونے والوں سے کہیں گے یہ ملک حشر کے دن
فرد اعمال سے تم لوگوں کے عصیاں نکلے
آج ہر قطرے کا ہے کوثر و فردوس صلہ
جن کو تم سمجھے تھے آنسو در غلطاں نکلے

- - - - - - - -

خار صحرا نہ ہوئے تھے شرف اندوز ہنوز
پہلے عابد کی قدم بوسی کو چھالے آئے
درد عصیاں کی دوا کچھ نہیں درکار انیسؔ
کربلا یاں سے گئے خاکِ شفا لے آئے

انیسؔ کے سلاموں میں حمد و نعت و منقبت سے متعلق اشعار کے علاوہ زندگی و موت، فنا و بقا اور دیگر موضوعات سے متعلق اشعار بھی ملتے ہیں۔ ایسے اشعار بھی موجود ہیں جن میں ذاتی مسائل کا ذکر ہے ان میں زمانے کی ناقدری، اپنوں کی بے رخی، دوستوں کی بے وفائی، مخالفین کی نکتہ چینی اور خاص احباب کے خلوص و مروت کا تذکرہ ہے۔ ذاتی اشعار میں وہ اشعار بھی آجاتے ہیں جن میں انیسؔ نے اپنے فن مرثیہ گوئی معترضین اور اپنی بیماری کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے وہ ان کم رتبہ معاصرین کے بھی شاکی ہیں جو ان کے مضامین کو توڑ مروڑ کر استعمال کرتے ہیں۔ انھیں یہ دیکھ کر دکھ ہوتا ہے کہ ان مضمونوں کا قتل ہو رہا ہے وہ بھی ان کے سامنے وہ اس جسارت کو دیکھ کر حیران رہتے ہیں۔ ان سب کے باوجود مضامین نو اور خوب سے خوب تر کی تلاش برابر جاری رہتی ہے کاواک سے کاواک مضمونوں کو انیس اس طرح شعری سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں انھوں نے جس شعر نو کو اپنی شاعری کا سرنامہ قرار دیا اسے کبھی بیک نہیں ہونے دیا۔

انیسؔ کی زندگی کے آخری دنوں میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ اس جنگ کے نتیجہ میں دنیا پلٹ گئی۔ نہ صرف جمی جمائی زندگی تلپٹ ہو گئی بلکہ ''ملک نظم'' میں بھی ایک انقلاب آ گیا۔ اس دور کے سلاموں میں اس کی کھنک موجود ہے۔

حمد و نعت و منقبت اور دیگر مضامین کی یہ چند مثالیں ہیں جو انیس کے سلاموں سے لی گئی ہیں۔

حمد:

اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا
اسی کی شان نظر آگئی جدھر دیکھا
اس کا ادائے شکر ہو کس طرح اے انیسؔ
جس نے اٹھا کے خاک سے انساں بنا دیا

نعت:

سحر کو اٹھ کے زباں سے یہ کام لیتے ہیں
خدا کے بعد محمدؐ کا نام لیتے ہیں
یوں نور تھا رسولؐ کا آدم کے صلب میں
ہوتی ہے جس طرح سے خبر مبتدا کے ساتھ

معراج:

زہے رسولؐ، زہے قرب اور خوشا معراج
وہاں گئے کہ فرشتہ بھی باریاب نہ تھا
گئے پہنے نعلین واں مصطفٰےؐ
فرشتے کا جس جا گزارا نہیں

منقبت :

علی کو حق نے اتارا تو عین کعبے میں
کھلی جو آنکھ تو پہلے خدا کا گھر دیکھا
علی کے رتبۂ اعلیٰ کو کوئی کیا جانے
خدا کے بعد رسالت مآب سمجھے ہیں

توکل :

ایک کشکول توکل، ایک نقد جاں پاس ہے۔
ہیں غنی دل کے، کوئی دام و درم رکھتے نہیں

خودداری :

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب، ہم واں قدم رکھتے نہیں

پیری و شباب :

نہ جانے برق کی چشمک تھی یا شرر کی چمک
ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

انیس کے سلاموں میں ایسے بہت سے شعر ہیں جن سے ان کے شعری رجحان اور زندگی کے بعض گوشوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان اشعار میں گویا ان کی زندگی کا ہر ورق اپنے نشان چھوڑ گیا ہے۔

شاعری :

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا
مری داد دے اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

اٹھ گیا جو شعر تو پڑھ کر انیس
تو طبیعت کی روانی دیکھ لی

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

ایسا سلام نظم کیا تو نے اے انیس
جو اہل فہم اس کو سنے، وہ اچھل پڑے

کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروس سخن کو سنوارا نہیں

سرقہ :

الٹ کے سب مرے مضموں پڑھے مرے آگے
مزا تو جب ہے کہ اس پر مجھے حجاب آیا

حریفانہ چشمک :

صبا نے کے جا میرے پھولوں کی بو
دماغ عدو بھی معطر کیے

بے انصافی :

نیک بد ٹھہرے، برے اچھے ہوئے
منصفوں کی قدر دانی دیکھ لی

انیس اب تو ہلال و بدر کو یکساں سمجھتے ہیں
رہی ہے منصفوں میں قدر یہ صاحب کمالوں کی

عزیزوں کی بے رخی :

کیں جن پہ ریاضتیں وہی گل
کانٹے مرے حق میں بو رہے ہیں

تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے
کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے

بیماری :

سوکھ کر کانٹا ہوا ہوں اے انیس
پھر بھی دشمن کی نظر میں خار ہوں

گر مسیح دو جہاں کا ہوا افضال انیس
اچھے یوں ہوویں گے جیسے کبھی بیمار نہ تھے

۱۸۵۷ کی تباہی و بربادی

ورق الٹ گیا دنیا کا یک بیک کیوں چرخ
یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا

انیس کے سلاموں کے مطالعہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ انھوں نے سلام کی صنف کو محض خصوصی مقتدرات تک محدود نہیں رکھا بلکہ کربلا کے پس منظر میں اس انسان کی بھی تلاش کی جو شجاعت، عفت، عدل اور دانش کے اعلیٰ صفات رکھتا ہے۔ انھیں امام حسین کی صورت و سیرت میں وہ انسان نظر آیا۔ یہ آفاقی کردار تمام انسانی رشتوں کے لیے وہ مثالی کردار ہے جو تہذیب کے ہر موڑ پر موجود ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے زیادہ تر سلاموں میں مصائب کی پرچھائیاں ابھرتی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے یہ سلام ایک آبلہ پا مسافر کا سفر نامہ ہیں جو پلکوں سے راستہ بناتا آنسوؤں کے چراغ جلاتا کربلا کے سفر پر نکلا ہے۔ اس کے ہونٹوں سے ہر دم ہی فریاد سنائی دیتی ہے۔

رہا نہ کوئی بہتر میں ظہر تک باقی
حسین رہ گئے سب کا رواں روانہ ہوا

انیس کے شعری اسلوب کا تجزیہ کرنے والوں نے عموماً خوبیٔ زبان، چستی، بندش، بلند پروازیٔ مضامین، رنگینیٔ طبیعت اور تغزل کی باتیں کی ہیں۔ اس تجزیے کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن انیس جس "شعر نو" کی بات کرتے ہیں اس میں "عروس سخن کو سنوارنے" "تصویر رنگیں بیاں کھینچنے" اور مضامین نو، جیسے وہ دوسرے مرحلے بھی ہیں جو متوجہ کرتے ہیں۔ انیس نے ان کا ذکر یوں ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان کے ذریعہ "شعر نو" کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس "شعر نو" کو سمجھنے کے لیے اس عہد اور اس کی شاعری کے مقدمات کو سمجھنا پڑے گا جس میں انیس موجود تھے۔ اس عہد میں خود کو نمایاں کرنا ان کے فن کی سب سے بڑی آزمائش تھی۔ خاندانی ورثے اور فطری شعری وجدان کے باوجود وہ ان مشکلات سے باخبر تھے جو ان کے سامنے تھیں۔ آخر انھوں نے وہ راستہ تلاش کر ہی لیا جو ان کے محسوسات کی تکمیل کر سکتا تھا۔ اس کے لیے انھوں نے وہ تخلیقی زبان وضع کی جو ان کے فطری میلانات و تجربات سے ہم آہنگ ہو اور جو لفظ ہو وہ معنی سے اس طرح پیوست ہو کہ ان کے ربط سے علامات و استعارات کے نئے نئے افق دریافت ہو سکیں۔ انیس کی تخلیقی زبان ہی دراصل اس "شعر نو" کی تفسیر ہے۔ اس کے بغیر اس "شعر نو" کی تعریف ممکن نہیں۔ جس کے لیے انھوں نے کہا ہے۔

اٹھ گیا لو شعر نو پڑھ کر انیس
لو طبیعت کی روانی دیکھ لی

◇◇

رباعیاں

جو مرتبہ احمد کے وصی کا دیکھا
ہم نے یہ رتبہ کسی کا نہیں دیکھا
کہتے ہیں نبیؐ جب ہوئی معراج مجھے
پہنچا جو وہاں ہاتھ علی کا دیکھا

کیا ذکر ہے کیا آہ و بکا ہر سو ہے
اک ایک عزادار شہ خوش خو ہے
یارب! یہ رہے باغ خزاں سے محفوظ
جب تک کہ چمن میں گل ہے گل میں بو ہے

◇

رئیس الشاکری
کلیتہ اللغۃ العربیہ ندوہ۔ لکھنؤ
9336329990

میر انیسؔ کی رُباعیاں

اس سچائی میں کسی کو اختلاف کا یارا نہیں کہ شعر و ادب میں رباعی مختصر ترین اور جامع لیکن بڑی کٹھور صنف سخن ہے۔ احسن مارہروی نے "کلیات ولی" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس صنف سخن کی ابتدا ۲۵۱ھ میں ہوئی ہے۔

رباعی کی ایجاد کے باب میں اہل علم کا بڑا اختلاف سہی لیکن سچ یہ ہے کہ رباعی ہر اعتبار سے ایران زادی ہے۔ رباعی کی ایجاد کے سلسلے میں مشہور روایتوں کی تقاہت تجزیے کی روشنی میں اپنی راہ کھوٹی کر لیتی ہے۔ یعقوب بن لیث صفاری کے بیٹے کا کھیل ہو یا رودکی کے نام سے اس کے عہد کی افسانہ طرازی روایت کی کسوٹی پر ساری طبع سازیاں بے جان ہو کے رہ جاتی ہیں۔ مشہور محقق پروفیسر محمود اختر شیرانی نے ان کہانیوں کی زوردار دلیلوں کے ساتھ مخالفت ہی نہیں بلکہ اس طرح تردید کی ہے کہ سچ تقریباً بے نقاب ہو جاتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ رباعی کی صنف اتفاقی یا شخصی ایجاد ہرگز نہیں۔ رباعی تو قدیم چہار بیتی کی انتہائی خوبصورت اور ترقی یافتہ شکل ہے جو بحر ہزج مربع اخرم و اخرب میں رباعی گویوں کے قلم سے وجود میں آئی ہے۔ عروج اسلام سے پہلے ایران میں "ترانہ" کے نام سے بھی یہ صنف سخن رائج تھی جس نے آگے بڑھ کر "رباعی" کا نام اختیار کر لیا ہے۔ رباعی کو "دو بیتی" بھی کہا گیا ہے۔

رباعی کے ارتقاء میں ہمارے صوفیائے کرام اور بزرگان دین نے زبردست حصہ لیا ہے۔ اخلاقیات، تزکیہ نفس اور روحانیت کے ساتھ عاشقانہ مضامین کے سچے موتی سے رباعی کا دامن اس طرح بھر دیا کہ علم و حکمت اور فکر و نظر سے اس کا دامن چھلک پڑا۔

اردو رباعی گوئی نے فارسی رباعی گوئی سے اپنا چراغ جلایا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ فارسی رباعی کے ایوان ہی میں اردو رباعی پلی بڑھی اور جوان ہوئی لیکن یہ بھی نہیں کہ اردو رباعی فارسی رباعی کا چربہ ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو رباعی کی رگوں میں فارسی خون کی گردش نے اس کے رنگ روپ کو اسی طرح نکھارا کہ آنکھ والوں کے لیے وہ مرکز نگاہ بن گئی۔ ان سچائیوں کے باوجود یہ بھی کہنا پڑے گا کہ اردو رباعی کی دیکھ ریکھ ہندوستان والوں نے خود کی اور ایسی غذا فراہم کی ہے کہ اردو رباعی بھی دنیا کے بڑے سے بڑے ادب سے آنکھ ملانے کے قابل ہو گئی۔ رباعی انتہائی مختصر صنف سخن ہونے کے باوجود انوکھی شان رکھتی ہے۔ رباعی غزل کا تو یہ شکن حسن بھی رکھتی ہے اور نظم کے رنگ و آہنگ سے بھی آشنا ہے۔ رباعی کو ایجاز و اختصار بھی آتا ہے اور نظم ہی کی طرح چار ہی مصرعوں میں اپنی بات پوری کر لینے کا سلیقہ بھی اس کی فطرت میں موجود ہے۔ گویا رباعی ایجاز و اختصار میں غزل تو اپنی تکمیل کے اعتبار سے نظم کہی جانے کے قابل ہے۔

فکر و نظر اور سنجیدہ صنف سخن ہوتے ہوئے بھی رباعی

عشقیہ شاعری میں غزل سے پیچھے نہیں ہے۔ جوشؔ اور فراقؔ کی رباعیاں اس باب میں بڑے اعتماد کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہیں۔ رباعی بڑی تراش خراش اور تجربے کا مطالبہ کرتی ہے برسہا برس کی مشق و تمرین اور بے پناہ ہنرمندیوں کے باوجود یہ صنف سخن مشکل ہی سے قابو میں آتی ہے

یاران سخن اچھی طرح جانتے ہیں
اک عمر ہے درکار رباعی کے لیے

فارسی رباعی نے تو بڑے نامور اور قابل ذکر رباعی گو اساتذہ پیدا کئے لیکن اردو رباعی بھی فارسی رباعی سے آگے نہیں تو بہت پیچھے بھی نہیں۔ محمد علی قطب شاہ سے فراقؔ تک تقریباً تمام قابل ذکر شعراء نے رباعیاں کہی ہیں جن سے اردو شعر و ادب کی دنیا روشن ہے۔ امجد حیدرآبادی نے تو رباعی ہی کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا اور جو بھی کہا رباعی ہی میں کہا ہے رشیدؔ، یگانہؔ، صفیؔ، شادؔ، رواںؔ، ثاقبؔ اور محرومؔ نے اس صنف میں قابل قدر کام کیا ہے۔ جوشؔ اور فراقؔ رباعی گو کی حیثیت سے اردو شعر و ادب میں زندہ رہیں گے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ تو اردو رباعی کے روشن ترین ستارے ہیں رباعی گوئی میں اردو شعراء نے عام طور پر بے اعتنائی کو راہ دی ہے میر انیس کے زمانے میں بھی غزل گوئی کی طرف بطور خاص شعراء کی توجہ رہی ہے کچھ شعراء قصائد و مثنویات میں لگے ہوئے تھے اور رباعی سے اعتنا برائے نام ہی رہا۔ قصیدہ اور غزل سے کچھ وقت بچا تو منہ کا مزا بدلنے کے لیے دو چار رباعیاں کہہ لیں اور بس۔ میر انیس نے بھی مستقلاً رباعیاں نہیں کہی ہیں ان کے زمانے میں مرثیہ پڑھنے سے پہلے کچھ رباعیاں پڑھنے کا رواج تھا غالباً اسی رواج کے تحت میر انیس بھی رباعیاں کہتے تھے۔ اکثر و بیشتر مجلسوں میں شرکت کے لیے گھر سے نکلتے اور چلتے چلاتے دو چار رباعیاں موزوں کر لیتے راستے میں اگر موقع نہیں ملا تو مجلس ہی میں دو چار رباعیاں موزوں کر لیتے اور رفتہ رفتہ رباعیوں کا ایک بڑا ذخیرہ ان کے بستے کی زینت بن گیا۔

میر انیس کی رباعیوں کو اردو شعر و ادب میں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے زمانے میں رباعیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ کسی شاعر کے پاس موجود نہیں تھا۔ یہی نہیں کہ ان کے یہاں رباعیوں کی اتنی بڑی مقدار ملتی ہے بلکہ فنی اعتبار سے بھی ان کی رباعیاں بہت خوبصورت اور نہایت ہی رفیع الشان ہیں اور کیفیت و کم کے حوالے سے اپنی مثال آپ ہیں۔ روانی، سلاست شگفتگی اور تازگی، لفظوں کی نشست اور تخئیل کی بلندی کے ساتھ فصاحت و بلاغت کی وہی فضا ان کی رباعیوں میں موجود ہے جو ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے سچ تو یہ ہے کہ میر انیس اور مرزا دبیر نے اردو رباعی گوئی کی لاج رکھ لی۔

اردو رباعی گوئی میں میر انیس نے ایک نئے موضوع کا اضافہ کیا ہے یعنی رثائی مضامین کا خوبصورت احترام و التزام ان کے قلم سے رثائی رباعیاں اردو شعر و ادب میں اولیت کا درجہ رکھتی ہیں میر انیس سے پہلے رثائی رباعیاں اردو شعر و ادب میں جہاں تہاں نظر تو آجاتی ہیں لیکن دال میں نمک کا بھی توازن نہیں رکھتیں مثلاً ذیل کی یہ دو رباعیاں دیکھئے۔

تلواروں سے جسم شہ دیں چور ہوا
تیروں سے بدن خانۂ زنبور ہوا
ہر چند کہ تھی کمر میں شمشیر دودم
امت کا مگر قتل نہ منظور ہوا

"تیروں سے بدن خانۂ زنبور ہونا" انیس کا شاعرانہ کمال نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ طرز کلام شاید ہی کسی شاعر کے ہاتھ لگا ہو۔ جور و جفا کی پوری تصویر نگاہوں میں رقص کرنے لگتی ہے یہ رباعی بھی اپنی مثال آپ ہے۔

مسجد میں چراغ دین خاموش ہوا
ہر سمت فغان و آہ کا جوش ہوا

پہنا ملبوس نیلگوں گردوں نے
کعبہ اسی ماتم میں سیہ پوش ہوا

میر، میر حسن کے زمانے میں رثائی رباعیوں کے نشان
تو ملتے ہیں لیکن اس موضوع پر کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔
میر انیس نے رثائی رباعیوں کو ایک نمایاں سمت دی ہے
ان کے قلم سے رباعیوں کا اردو شعر و ادب میں ایک روشن
باب ہے مرزا غالب کے حوالے سے۔
یہ دو سطریں بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"اردو زبان نے انیس اور دبیر سے بہتر مرثیہ گو
پیدا نہیں کئے، ایسے مرثیہ گو ہوئے ہیں اور نہ آئندہ
ہوں گے انیس کا مرتبہ نہایت بلند ہے" (یادگار غالب)

حیات انیس میں تو امجد اشہری کا یہ دعویٰ ہے۔

"میر انیس کے مقابلے میں دوسرے کا مرثیہ کہنا میر انیس
نہیں مرثیہ کا منہ چڑھانا ہے"

میر انیس کی رباعیوں میں تقریباً وہ تمام موضوع مل جائیں گے
جو رباعی گو شعراء نظم کرتے آئے ہیں البتہ خمریہ شاعری کے
مضامین کا ان کے یہاں نام و نشان بھی نہیں یہ بھی ان کی
رباعی گوئی کا قابل قدر اور اہم بالشان پہلو ہے۔ میر انیس کی
یہی وہ خوبیاں ہیں کہ شیخ عبدالقادر نے کہا تھا۔

"میر انیس اس جہان سے اٹھ گئے مگر ان کا نام زندہ
ہے۔ مرثیے کو ہندوستان میں میر انیس مرحوم اور ان
کے معاصرین کے زمانے میں وہ عروج حاصل ہوا جو
کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا"

میر انیس کی رباعیوں کو موضوع کے اعتبار سے کئی حصوں
میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی موضوع ان کی رباعیوں
کے روشن اور نمایاں موضوع ہیں۔ مذہبیات میں انکی رباعیاں
انوکھی شان رکھتی ہیں۔ حمد، طلب مغفرت، نعت و منقبت
معتقدات اور رثائی جذبے کے مضامین دعوت فکر و نظر کا
اہتمام کرتے ہیں جن کی ندرت، جدت، روانی، سلاست اور
بلاغت و فصاحت اپنے قاری کو بطور خاص متوجہ کرتی ہے مولانا
حالی کی زبان میں۔

"الفاظ کو خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال
کرنے کو اگر معیار کمال قرار دیا جائے تو بھی میر انیس
کو اردو شعراء میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ میر انیس
کے ہر لفظ اور ہر محاورے کے آگے اہل زبان کو
سر جھکانا پڑتا ہے اگر انیس چوتھی صدی ہجری میں
ایران میں پیدا ہوتے اور اس سوسائٹی میں پروان
چڑھتے جس میں فردوسی پلا بڑھا تھا۔ وہ ہرگز فردوسی
سے پیچھے نہ رہتے"

سخن فہمی کے لیے علم اور وسیع مطالعے کے ساتھ ذوق سلیم
نہایت اہم شے ہے یہ وہ قوت ہے جو شعر کی گیرائی اور گہرائی
تک رسائی میں بیحد معین و مددگار ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے
کہ شعر کہنے سے زیادہ مشکل کام سخن فہمی ہے۔

شعر گفتن گرچہ در سفتن بود
لیک فہمیدن بہ از گفتن بود

شعر کہنا موتی پرونا ہے لیکن شعر سمجھنا شعر کہنے سے بڑا
اور بہت بڑا کام ہے۔ میر انیس کو زندگی بھر احساس رہا
کہ ان کے مافی الضمیر کو سمجھنے والے اور ان کے شعر کی قدر
کرنے والوں کی تعداد کم اور بہت کم ہے۔ غالب کی طرح
حالی اور تفتہ جیسے شاگرد اور عبدالرحمٰن بجنوری جیسے
قدردان ان کے حصے میں نہیں آئے جو انیس کی معجز
بیانی اور ان کی شاعری کے نکتوں کی شرح کا حق ادا کرتے۔

درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

میر انیس کے شاگردوں میں نہ کوئی حالی تھا نہ
کوئی تفتہ کہ ان کے حالات کماحقہ سپرد قلم ہوتے اور کوئی
عبدالرحمٰن بجنوری بھی ان کو نہ ملا جو یہ بتاتا کہ انیس نے کتنے
بڑے المیے کو بیسویں صدی کے انسان کے سارے تجربات کا

کا ایک قابل ذکر حصہ بنا دیا۔

میر انیسؔ کی وہ رباعیاں جو حمد و ثنائے باری تعالیٰ سے علاقہ رکھتی ہیں دو طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ جن کا تعلق ذات خداوندی سے ہے ان رباعیوں میں معرفت اور واحدانیت کے رنگ ملتے ہیں دوسری جو خدائے عز و جل کی صفات سے عبارت ہیں ان رباعیوں میں خدا کی رزاقی، ستاری اور اس کے جود و کرم کا ذکر لب و لہجہ میں ایمان و یقین کی تازگی کے احساس سے اپنے قاری کو روشناس کرتی ہیں۔ مندرجہ ذیل رباعی دیکھئے جس میں "ہمہ اوست" کے روشن اشارے ہیں اور دلپذیر لفظوں میں ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر شے میں خدا ہی کے جلوے اور اسی کی کاریگری نظر آتی ہے۔

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

عرفان خداوندی کے ناقابل شمار ذریعے بالغ نگاہوں کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں۔ میر انیسؔ نے بھی دلوں کو چھو لینے والا ایک ذریعہ تلاش کیا ہے جو نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہے۔ انھوں نے انسانی جسم کی تین سو ساٹھ رگوں کو معرفت الٰہی کی راہوں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بہت ہی نیا اور اچھوتا مضمون ہے۔

سرگرم رہے نہ سرد آہیں ہیں یہی
سویا کیے حسرت کی نگاہیں ہیں یہی
یہ جسم میں ہیں جو تین سو ساٹھ رگیں
گویا تری معرفت کی راہیں ہیں یہی

انسانی جسم کی ساخت پر غور و فکر عرفان خداوندی کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔ ذیل کی رباعی میں بھرپور اظہار محبت کے ساتھ بے مائگی کا احساس جو ممدوح کی عظمتوں تک رسائی کے لیے ایمان افروز دلیل راہ ہے۔ رباعی کا نعتیہ پہلو ازدیاد محبت میں وہ نمایاں کردار رکھتا ہے کہ بے ارادہ تحسین نوک قلم بن جاتی ہے۔

ہے کون سی شادی جو ترے غم میں نہیں ہے
ہاں درد محبت ہی مگر ہم میں نہیں ہے
مجھ سے تیرے لیے ہزاروں بندے
تجھ سا میرے لیے دو عالم میں نہیں ہے

میر انیسؔ نہایت اعلیٰ خاندان کے فرد فرید تھے انھوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی شب و روز فیض آباد کے دلنواز شاعرانہ ماحول میں گزارے نجیب الطرفین شرفا اور اہل کمال کا ہجوم اور انیسؔ کی علمی ضو فشانیاں اسی ماحول میں پھلی پھولی اور پروان چڑھی۔

میر انیسؔ جب لکھنؤ آئے تو لکھنؤ میں بھی انھیں ایک خوبصورت شاعرانہ ماحول ملا جو فیض آباد کے ماحول سے کسی طرح کم نہ تھا۔ مرزا دبیر کی شاعرانہ شہرت عروج پر تھی انیسؔ نے بھی لکھنؤ میں اپنا وجود ثابت کر دیا۔

میر انیسؔ کا مزاج عزت نفس، وضعداری علوئے ہمت اور شرافت سے عبارت رہا یہ خوبیاں ان کی زندگی کا قابل ذکر حصہ ہیں اکثر و بیشتر ان کی رباعیاں ان کی ان خوبیوں سے آراستہ و پیراستہ ہیں ان کی یہ رباعیاں دیکھئے خودداری کی جو تلقین اور خواہش اس رباعی میں ہے۔ ایمان و یقین کے سرمایہ میں ایک روح پرور اضافہ ہے۔ عزت نفس اور خودداری کا تقاضا ہے کہ ہر طرف سے منہ پھیر لیا جائے اور خدا ہی سے سارا علاقہ رہے۔

عزت رہے یار و آشنا کے آگے
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے
یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں
یہ ہاتھ جب اٹھیں تو خدا کے آگے

اکثر و بیشتر بے مایہ اور کم ظرف اپنی تعریف کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن وہ لوگ جنھیں آسمانوں سے بڑائیاں ملتی ہیں وہ فروتنی اور خاکساری کو اپنا مزاج بنا لیتے ہیں علاوہ

تماخیں سر اٹھاتی نہیں جھکا لیتی ہیں۔ بلند بانگ دعوے بے مائگی کی دلیل ہوتے ہیں جنھیں مشیت نوازتی اور سرفراز کرتی ہے وہ بڑے بول سے دامن بچاتے ہیں بڑے بول بولنے والوں کو میر انیسؔ خالی ظرف قرار دیتے ہیں اور خالی ظرف آوازیں دیا کرتا ہے "تہی مغز" اور "فروتنی" پر غور کیجئے اور رباعی کی فنکاریوں کا لطف اٹھائیے۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

رزاق حقیقی کی رزاقیت کے جلوؤں کی آئینہ داریاں اور ذیل کی رباعی دیکھیں انھوں نے اس رباعی میں اپنے قاری تک یہ بات پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ اللہ ہی سب کچھ ہے وہی اوّل، وہی آخر۔ حمد و ثنا کے لائق اسی کی واحد ذات اور اسی کا دست عطا یہ شان رکھتا ہے کہ فقیر بھی محروم نہ رہے اور امیر بھی اسی سے فیض اٹھاتے ہیں۔ مچھر ہو کہ عنقا اسی کی چوکھٹ سے اپنے اپنے حصے کا رزق پاتے ہیں۔ پشہ کے ساتھ عنقا کا ذکر شاید سبب یہ ہو کہ نظر آنے والی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق اور ہمارے وہم و گمان سے پرے اگر کوئی مخلوق ہے تو اس کا بھی رازق وہی ہے۔

سائے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں
جو دام سے بھاگتا ہے وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو اس کا عاشق ہوں انیسؔ
جلتا ہے جو بے شمع وہ پروانہ ہوں

معبود حقیقی کی بندگی میں جاندار ہو یا بے جان سب مصروف ہیں جس کی ناقابل تردید دلیلیں میر انیسؔ نے ذیل کی رباعی میں فراہم کی ہیں۔ بلبل کی فغاں، پھولوں کی شاخوں کا زمین پہ سر دھرنا، سرو کا سیدھا کھڑا ہونا، قمری کی دلوں کو چھو لینے والی آواز سبھی سب تسبیح و تہلیل میں کھوئے ہوئے ہیں تغزل سے بھرپور شاعرانہ لہجے میں قیام و قعود اور رکوع و سجدہ کی جو تصویر کشی میر انیسؔ نے کی ہے داد تحسین سے بہت پرے ہے۔

بلبل تری یاد میں فغاں کرتی ہے
شاخ گل تر زمیں پہ سر دھرتی ہے
استادہ نہیں قیام میں سرو فقط
قمری بھی ترے عشق کا دم بھرتی ہے

میر انیسؔ نے اپنی رباعیوں میں زندگی اور موت کے فلسفے سے بھی بڑے کام رکھے ہیں زندگی چار دن کی ہے۔ موت برحق ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ کوئی نہیں رہا۔ مولانا روم کی زبان میں ؎

برگیتی گر کسے پائندہ بودے
ابوالقاسم محمد زندہ بودے

میر انیسؔ بھی اپنی رباعیوں میں تلقین کرتے ہیں دنیا کا حسن عارضی ہے دنیا کسی خواب سے زیادہ کچھ بھی نہیں یہ سچائی انھوں نے بڑھاپے میں اچھی طرح محسوس کی کہ بڑھاپا موت کا روشن ترین نشان ہے۔ کمزور جسم، بے نور چہرہ، اجلے بال خمیدہ کمر کے حوالے سے خوبصورت رباعیاں نظم کی ہیں۔

پیری آئی عذار بے نور ہوئے
یارانِ شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیسؔ
جو مشک سے بال تھے کافور ہوئے

اسی سلسلے کی یہ رباعی بھی دیدنی ہے۔

اب زیر قدم لحد کا باب آپہنچا
ہشیار ہو جلد چلو وقت خواب آپہنچا
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی آہ انیسؔ
ہنگام غروب آفتاب آپہنچا

اردو رباعی گوئی کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اردو شاعری کی تاریخ۔ ناقابل تردید حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان

(بقیہ ص ۴۳ پر)

سید باقر حسین
۳۲۷/۱۲۴ انیس ہاؤس چوک لکھنؤ ۳

کلامِ انیس میں صنعتِ غیر منقوط

دنیا کی کسی بھی زبان کا ادب ہو اس کے اجزائے نظم میں صنائع و بدائع ضرور شامل نظر آتے ہیں اور ان کو برتنے اور استعمال کرنے کے لیے ایک خاص سلیقے اور قدرتِ اظہار کی ضرورت ہوتی ہے عربی فارسی اور اردو زبان اور اس کا ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ایک زمانہ ایسا بھی گذرا جب ادب کی تمام اساس یہی صنائع تھے اس لیے شعرا کی توجہ مرکز بن گئے اور ان کی شاعری میں مختلف صنعتوں کو خصوصی جگہ دی جانے لگی بعض اساتذہ نے اپنی طباعی و صناعی ہی کو اصلی شاعری سمجھ لیا۔ جزئیات نگاری، بیان واقعہ جذبات نگاری جیسے باقی رہنے والے گوشے جان بوجھ کر نظر انداز کئے جانے لگے ان کی ان مساعی پر تعریف و تحسین کے بادل امنڈ امنڈ کر آئے اور سرِ مجلس ٹوٹ ٹوٹ کر برسے لیکن بعض نکتہ رس ایسے بھی تھے جو صنائع کی اس چڑھتی ہوئی ندی سے خود کو بقدرِ ضرورت ہی وابستہ رکھنے کے قائل تھے۔ وہ تخلیقی نظم میں صنعتوں کا استعمال اسی حد تک جائز اور ضروری سمجھتے تھے جس حد تک نزاکتِ خیال اس کی متحمل تھی چنانچہ میر انیس بھی اسی بات کے قائل تھے۔ وہ خود فرماتے ہیں۔

'سامعین جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہے وہی'

ان کا کہنا تھا کہ جہاں تک ممکن ہو ان صنعتوں کا استعمال اس طرح کرنا چاہئے جو ذہن سامع پر بار نہ ہو۔ ایک دن ان کے تلامذہ میں سے ایک صاحب جو مرزا دبیر کے یہاں بھی جاتے تھے میر انیس کے پاس آئے اور ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد ان سے فرمایا کہ مرزا صاحب آج کل صنعتِ غیر منقوط میں مرثیہ نظم فرما رہے ہیں انیس مسکرائے اور کہا، "گویا صنعتِ مہملہ کا استعمال کر رہے ہیں" بات آئی گئی ہو گئی جب رات کو انھوں نے نیا مرثیہ تصنیف کیا تو اس کا مطلع اول یہ قرار دیا۔

جب حضرت زینب کے پسر مر گئے دونوں

مرثیہ کے درمیان انھوں نے ان صاحب کی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس مرثیہ میں صنعت غیر منقوط میں چار بند نظم فرمائے۔ مثلاً

وہ طاہر و اطہر ہو اگر معرکہ آرا
معلوم ہو حملہ اسد اللہ کا سارا
آگاہ ہو کس طرح کہو عمر کو مارا
صمصام کا اک وار ہوا کس کو گوارا
واللہ کہ اک دم کو وہ صمصام علم ہو
ہر روح کو اس دم ہوس ملکِ عدم ہو

سردارِ امم محرمِ اسرارِ محمدؐ مہرِ اسد اللہ کا دلدارِ محمدؐ
دلدارِ دل آرام و مددگارِ محمدؐ ممدوحِ ملک مالکِ سرکارِ محمدؐ
سرور کہو اسلام کا اس مالکِ کل کو
آرام دو اک دم دلِ سردارِ رسل کو
کس کا اسد اللہ سا ہوا والدِ مرحوم حلّالِ مہم مالکِ کل طاہر و معصوم

صدر دوسرا رحمدل وسرور مہموم   آسودہ ہو ہر سالک و گمراہ وہ محروم
معصوم کا دلدار ہو سالار امم ہو
اولاد کا اس عالم وعادل کو الم ہو

اس طرح کا والا ہمم اس طرح کا سردار   اس طرح کا عالم کا مجد اور مددگار
وہ مصدر الہام اُحد محرم اسرار   وہ اصل اصول وکرم داد ورد اوار
حاصل اگر اک مرد دل آگاہ کو مارا
مارا اگر اس کو اسداللہ کو مارا

میرانیس اسی زمانے میں علیل ہو گئے انھوں نے دو مناجاتیں نظم فرمائیں جس میں یہ مناجات بہت مشہور و مقبول ہوئی ؎

مبتلائے غم دل ناشاد ہے   منحرف یہ چرخ ستم ایجاد ہے
یہ زمانہ بر سر بیداد ہے   آپ پر روشن مری روداد ہے
اب مدد کیجے دم امداد ہے
یا امیر المومنین فریاد ہے

لیکن درج ذیل مناجات خاندان کے ذخیرہ میں موجود رہی اور عام نہ ہو سکی جسے پہلی مرتبہ پیش کیا جارہا ہے۔ یہ مناجات بہ شکل مخمس در مدح حضرت علی ابن ابی طالب ہے ؎

علی فخر نبی آدم علی سردار انس و جاں   علی سرور علی صفدر علی شیر صف میداں
علی ہادی علی ایماں علی لطف و علی احساں   علی حکمت علی شافی علی داور علی درماں
علی جنت علی نعمت علی رحمت علی غفراں

علی واصل علی فاضل علی شامل علی قابل   علی فیض و علی جود و علی بذل و علی باذل
علی نوح و علی کشتی علی دریا علی ساحل   علی عالم علی عادل علی فاضل علی کامل
علی افضل علی مفضل علی لطف و علی احساں

علی آقا علی مولا علی سید علی سرور   علی کعبہ علی قبلہ علی مسجد علی منبر
علی تارک علی افسر علی زینت علی زیور   علی نور و علی انور علی درو علی گوہر
علی ساقی علی کوثر علی مالک علی رضواں

علی بحر و علی معدن علی برّ و علی گلشن   علی فتح و علی نصرت علی آرام جان و تن
علی درع علی خود و علی تیغ و علی جوشن   علی محسن علی احسن علی خازن علی مخزن
علی ایمن علی مومن علی آمن علی ایماں

علی مجز علی صادق علی بینا علی سامع   علی فائق علی ناتح علی مانع علی قانع
علی امر و علی نہی و علی حاکم علی ناقع   علی شافع علی نافع علی رافع علی واقع
علی جامع علی قاطع علی حجت علی برہاں

علی موسیٰ علی عیسیٰ علی خضر و علی یحییٰ   علی دانا علی بینا علی گوہر علی دریا
علی حاکم علی عادل علی جنت علی طوبیٰ   علی قاضی علی اقضیٰ علی مرجع علی ملجا
علی یٰسین علی طٰہٰ علی حرز و علی قرآں

علی سابق علی صادق علی ثابت علی قائد   علی اشرف علی اعلیٰ علی ناصر علی ماجد
علی کافی علی وافی علی واجد علی شاہد   علی واحد علی زاہد علی راکع علی ساجد
علی مرشد علی ہادی علی رہبر علی رہباں

امام مشرق و مغرب شریف یثرب و بطحا   امین وحی پیغمبر امام مسجد اقصیٰ
علیم عالم اسرار سبحٰن الذی اسریٰ   علی والی علی عالی علی والا علی اعلا
علی جامع علی فارق علی ادنیٰ علی فرقاں

انیس ان چند بندوں کا صلہ ہے گلشن جنت   نہ گھبرا اس مرض سے بعد ہے آزار کے رحمت
تمہیں طاقت ملی رہنگے ان کو ہے ہر طرح کی قدرت   علی فرحت علی نصرت علی شوکت علی حشمت
علی حکمت علی صحت علی داور علی درماں

حاشیہ ۱؎ متذکرہ مرثیہ جسے مرزا دبیر نظم فرما رہے تھے اس کا مطلع یہ تھا ؎   دہر علیم سرور اکرم ہوا طالع،

یہ مرثیہ جناب مہذب لکھنوی نے "ماہ کامل" کے عنوان سے اپنے قائم کردہ ادارہ انجمن "محافظ اردو" کی جانب سے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی
شعبۂ علوم مشرقیہ (عربی و فارسی) لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
9807452917

انیسؔ کے مرثیہ میں علم الاَعداد

"نو نور خدا ہوں گے عیاں نور سے جس کے"

دعبل ہند میر ببر علی انیس کے مرثیے

"یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر" (بند ۱)

میں آئے ایک بند کی بیت میں اس طرح ملتا ہے۔

"ہر جسم میں جاں آتی ہے مذکور سے جس کے
نو نور خدا ہوں گے عیاں نور سے جس کے"

(بند-۲۷)

میر انیس آخر کس ذکر عظیم، اور نور خدا، کی بات کر رہے ہیں؟ جس ذکر کے آتے اور سنتے ہی جسم میں تازگی اور جان آجاتی ہے اور اس ایک نور خدا سے "نو" اور نور پیدا ہوں گے؟ جو قاری، یا سامع کو ذہنی ورزش، تلاش جستجو اور فکر کی دعوت دیتا ہے۔

صوری طور پر "نو" کی گنتی کا استعمال کیوں ہے؟ ساتھ ہی اس سے مراد کیا ہے؟ اگر اس کا علم نہیں ہے تو یہ بیت بظاہر سامع یا قاری کو کوئی لطف نہیں دے سکتی۔ البتہ بند کے تیسرے مصرعے۔

"مخدومۂ عالم کا پسر ہوتا ہے پیدا" (بند ۲۷)

سے ایک اشارہ مخدومۂ عالم یعنی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے پسر کی ولادت باسعادت کی طرف ضرور ملتا ہے لیکن ان کے دو پسر ہیں ایک جناب امام حسن علیہ السلام اور دوسرے جناب امام حسین علیہ السلام

آخر کس پسر کی ولادت کی طرف اشارہ ہے؟ تو بند کے آخری مصرعے سے اطلاع ملے گی کہ اس "پسر" جس سے "نو" اور نور خدا یعنی پسران پیدا ہوں گے اور امام حسن جیسے پسر کے تین بیٹے جناب قاسم جناب ابوبکر اور جناب عبداللہ کربلا میں شہید ہوئے ساتھ ہی امام حسین جیسے پسر کے دو بیٹے جناب علی اکبر اور جناب علی اصغر بھی کربلا میں شہید ہوئے لیکن امام زین العابدین (علی ابن الحسین) بیماری (کیونکہ شرعی طور پر بیمار پر جہاد ساقط ہے) کی وجہ سے میدان میں نہیں گئے (جبکہ اس سے بڑے جہاد، بے مقنع و چادر رسن بستہ ماں بہنوں اور پھوپھیوں کے ساتھ ہتھکڑی، بیڑی اور گلے میں خاردار طوق کے ساتھ شام و کوفہ کے بازاروں درباروں اور قیدخانوں میں جانے کی ذمے داری کو سنبھالا جگہ جگہ واقعہ کربلا کو بتایا۔ حق و باطل کو سمجھایا اپنے ساتھ موجود مخدرات عصمت کی عظمت کو بتایا اپنے کو پہچنوایا اور دین محمدی کی حفاظت کی۔

اور امام حسین کی شہادت کے بعد امام ہوئے اس طرح امام حسین جیسے نور خدا کے بعد پہلے نور خدا امام زین العابدین ہوئے پھر اولاد در اولاد امام محمد باقر دوسرا امام جعفر صادق تیسرے۔ امام موسیٰ کاظم چوتھے امام علی رضا پانچویں، امام محمد تقی چھٹے، امام علی النقی ساتویں امام حسن عسکری آٹھویں اور امام مہدی آخر نویں نور خدا ہوئے جن کے ذکر سے روح میں تازگی اور جسم میں جان آتی ہے۔ میر انیس کہتے ہیں۔

"شمس و قمر، اور قمر ہوتا ہے پیدا
نخل چمن دیں کا ثمر ہوتا ہے پیدا

مخدومۂ عالم کا پسر ہوتا ہے پیدا
جو عرش کی ضو ہے وہ گہر ہوتا ہے پیدا
ہر جسم میں جاں آتی ہے مذکور سے جس کے
جو نور خدا ہوں گے عیاں نور سے جس کے (بند ۲۷)

اسی نور خدا کی ولادت با سعادت کی مناسبت سے جب انیس کچھ نظم کرتے ہیں تو کچھ اس طرح

مجرم ہوں کبھی ایسی خطا کی نہیں میں نے
بھولے سے بھی آپ اپنی ثنا کی نہیں میں نے
دل سے کبھی مدح امراء کی نہیں میں نے
تقلید کلام جہلا کی نہیں میں نے
نازاں ہوں محبت پہ امام ازلی کی
سادی یہ تعلّی ہے حمایت سے علی کی (بند ۲۱)

ہر چند زباں کیا مری اور کیا مری تقریر
دن رات وظیفہ ہے ثنا خوانی شبیر
منظور ہے اک باب میں دو فصل کی تحریر
مولا کی مدد کا متمنی ہے یہ دل گیر
یہ فصل نئے رنگ سے کاغذ پہ رقم ہو
اک بزم ہو شادی کی تو اک صحبت غم ہو (بند ۲۲)

شعبان کی ہے تاریخ سویم روز ولادت
اور ہے دہم ماہ عزا یوم شہادت
دونوں میں بہر حال ہے تحصیل سعادت
وہ بھی عمل خیر ہے یہ بھی ہے عبادت
مداح ہوں کیا کچھ نہیں اس گھر سے ملا ہے
کوثر ہے صلا اس کا بہشت اس کا صلا ہے (بند ۲۳)

یہ وہ نور خدا ہے جس کی ولادت ۳ شعبان المعظم کو اور شہادت ۱۰ محرم الحرام کو ہوئی۔ یہ ولادت یعنی شادی اور شہادت یعنی غم کا ساتھ ساتھ ذکر..... گویا منقبت کے ساتھ ساتھ مرثیہ بھی..... شاید اس لیے ہو کہ اس مولود کی ولادت کے موقع پر جہاں ایک طرف خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ وہیں دوسری طرف جبریل امین آپ کی شہادت کی خبر لے کر آئے تو بزم شادی صحبت غم میں تبدیل ہو گئی اور میر انیس چاہتے بھی یہی ہیں کہ۔

یہ فصل نئے رنگ سے کاغذ پہ رقم ہو
اک بزم ہو شادی کی تو ایک صحبت غم ہو (بند ۲۲)

اور جب انیس خوشیوں بھرے منقبت کے بند کہتے اور مبارکباد پیش کرتے ہیں تو کچھ اس طرح۔

یا ختم رسل گوہر مقصود مبارک
یا نور خدا رحمت معبود مبارک
یا شاہ نجف شادیٔ مولود مبارک
یا خیر النساء اختر مسعود مبارک
رونق ہو سدا نور دو بالا رہے گھر میں
اس ماہ دو ہفتہ کا اجالا رہے گھر میں (بند ۳۱)

یہاں بھی قاری و سامع کے لیے ذہنی ورزش کی ضرورت ہے کہ آخر ماہ دو ہفتہ سے کیا مراد ہے..... ذرا غور کریں۔ ہفتہ یعنی سات (۷) دن..... دو ہفتہ یعنی ۷+۷ یا ۷×۲=۱۴) چودہ دن۔ اور ماہ دو ہفتہ" یعنی دو ہفتہ کا چاند، بدر کامل یعنی جب چاند مکمل ہو جاتا ہے..... گویا اس چودھویں کے چاند کا اجالا گھروں میں باقی رہے۔ دوسری طرف رسول اکرم کے گھرانے کے کل چودہ "انوار خدا" ہیں..... لہٰذا اے خدا۔ ان چودہ انوار خدا (جن میں پانچ (۵) پنجتن پاک (محمد علی، فاطمہ، حسن اور حسین) ہیں اور باقی نو (۹) (زین العابدین، محمد باقر، جعفر صادق، موسیٰ کاظم علی رضا، محمد تقی، علی النقی، حسن عسکری اور امام مہدی (آخر) نسل امام حسین سے ہیں (یعنی ۵+۹=۱۴) کا نور ہمیشہ دلوں میں باقی رہے۔

اس نور خدا کی آمد پر ابھی خوشیاں منائی ہی جا رہی تھیں جن و ملک مبارکباد پیش کر ہی رہے تھے۔ نام رکھنے کی بات چل ہی رہی تھی کہ میر انیس اس کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ملاحظہ فرمائیں۔

بس اتنے میں نازل ہوئے جبریل خوش انجام
کی عرض کہ فرماتا ہے یہ خالق علام
پیارا ہے نہایت ہمیں زہرا کا گل اندام
یا ختم رسل ہم نے حسین اس کا رکھا نام
یہ حسن میں سردار حسینان زمن ہے
مشتق ہے تو احسان سے تصغیر حسن ہے (بند ۵۱)

ح سے یہ اشارہ کہ یہ ہے حامی امت
سمجھیں گے اسی سین کو جب سین سعادت
ی اس کی بزرگی میں ہے یٰسین کی آیت
ہے نون سے ظاہر کہ یہ ہے نور نبوت
ناجی ہے وہ اس نام کو لے گا جو دہن سے
یہ حسن میں دس حصے زیادہ ہے حسن سے (بند ۵۲)

اور امام حسین، امام حسن کے چھوٹے بھائی (تصغیر حسن) ہیں لیکن پھر بھی امام حسن سے دس حصے زیادہ بھی جیسا کہ اس مصرعے۔

" یہ حسن میں دس حصے زیادہ ہے حسن سے "

سے ظاہر ہے جبکہ خود رسول اکرمؐ کی ایک حدیث صغیرنا و کبیرنا سواء یعنی ہمارے چھوٹے اور بڑے سب برابر ہیں کی روشنی میں یہ کیسے ممکن ہے کہ امام حسینؑ، امام حسنؑ سے دس حصے زیادہ ہوں ؟ یہاں بھی ذہنی ورزش کی ضرورت ہے۔ غور کریں "حسن" یعنی

ح + س + ن = ۸ + ۶۰ + ۵۰ = ۱۱۸ (علم الاعداد کا سہارا لینے پر) میں "دس" کا اضافہ کرنے پر گویا "۱۱۸ + ۱۰ = ۱۲۸ ہوتا ہے اور "دس" کے لیے ابجد۔ ہوز میں حرف "ی" آتا ہے یعنی "ی" کا بند میں دئے حروف کی ترتیب کے حساب سے اضافہ کرنے پر۔

ح + س + ی + ن = حسین بنتا ہے۔

اور اعداد نکالنے پر ۸ + ۶۰ + ۱۰ + ۵۰ = ۱۲۸ یا "۱۱۸ + ۱۰ = ۱۲۸"

یعنی "حسن" میں حرف "ی" کا اضافہ کرنے پر نام نامی "حسین" بنتا ہے اور امام حسن کے عدد ۱۱۸ میں گنتی ۱۰ کا اضافہ کرنے پر ۱۲۸ اعداد نکل کر آتے ہیں۔ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ امام حسین اپنے بڑے بھائی امام حسن سے دس حصے کس طرح زیادہ ہیں ممکن ہے اسی ذہنی ورزش کے لیے خدائے سخن میر ببر علی انیس نے کہا ہو۔

ناجی ہے وہ اس نام کو لے گا جو دہن سے
یہ حسن میں دس حصے زیادہ ہے حسن سے
(بند ۵۲)

اور یہ ۱۲۸ عدد برابر ہوتے ہیں "دین ناجی" یا "ناجی دین" (فارسی اور اردو دونوں ترکیب کے حساب سے) کے عدد سے غور کریں۔

د + ی + ن + ن + ا + ج + ی = ۴ + ۱۰ + ۵۰ + ۵۰ + ۱ + ۳ + ۱۰ = ۱۲۸

یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر دین ناجی نہیں تو ہمارا دین کو اختیار کرنا بے فائدہ اور بے مقصد ہے شاید اسی لیے دین = ناجی کے ہوتا ہے۔ یعنی

د + ی + ن = ۴ + ۱۰ + ۵۰ = ۶۴

اور ن + ا + ج + ی = ۵۰ + ۱ + ۳ + ۱۰ = ۶۴

اور میر انیس نے کہا۔

ناجی ہے وہ اس نام کو لے گا جو دہن سے
یہ حسن میں دس حصہ زیادہ ہے حسن سے (بند ۵۲)

اس طرح کی ذہنی ورزش کو اگر میر انیس کے تخلص میں تلاش کیا جائے تو عددی لحاظ سے ملتا ہے انیس یعنی

ا + ن + ی + س = ۱ + ۵۰ + ۱۰ + ۶۰ = ۱۲۱

جو حسن اتفاق سے "یا علی" کے عدد کے ہیں۔

ی + ا + ع + ل + ی = ۱۰ + ۱ + ۷۰ + ۳۰ + ۱۰ = ۱۲۱

اور جب کلام انیس کا طائرانہ مطالعہ کیا جاتا ہے تو متعدد رباعیوں قطعات، سلاموں اور مرثیوں کی ابیات یا بندوں سے از خود ان کی مولائے کائنات علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے والہانہ عقیدت کا اندازہ ہو جاتا ہے اسی لیے آپ نے ایک رباعی میں کہا۔

گر دوستی علی میں مر جاویں گے   بگڑے ہوئے سب کام سنور جاویں گے
جس وقت کہیں گے منہ سے یا تیر خدا   جوں برق صراط سے گذر جاویں گے

"یا تیر خدا"، یعنی "یا علی" جس کے عدد برابر ہیں "انیس" کے عدد کے۔

ماخذ: انیس کے مرثیے جلد اول مرتبہ صالحہ عابد حسین ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۹۰ء

محمد عابد
۲۲۷/۱۲۳، انیس ہاؤس، چوبداری محلہ چوک، لکھنؤ

میر انیسؔ کی تضمین گوئی

مرثیہ گوئی کے میدان میں میر انیسؔ اور ان کے خاندان کے تمام افراد نے اس صنف سخن کو معراج کمال کی ان حدوں پر پہنچا دیا جس تک پہنچنا آسان کام نہیں۔ انیسؔ کے دو بھائی اور تھے جن کا ذکر مرثیہ کی دنیا میں انسؔ اور مونسؔ کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ آخر الذکر شاعر کی ولادت ۵ محرم ۱۲۲۶ھ فیض آباد کے محلہ گلاب باڑی میں ہوئی۔ خلیقؔ کے زیر سایہ تعلیم و تربیت ہوئی جو ان کے والد گرامی تھے۔

انھوں نے شاعری کی تمام اصناف مثلاً غزل، رباعی سلام، تضمین، مخمس اور مرثیہ پر طبع آزمائی کی اور اپنے والد ماجد کے علاوہ بڑے بھائی یعنی میر انیسؔ سے تا حیات اصلاح سخن فرماتے رہے۔ انھوں نے اردو مرثیہ کے ساتھ ساتھ غزل کے دامن کو ترک نہیں کیا لہٰذا آخری عمر تک وہ مجالس کے دوش بدوش اس عہد کے طرحی مشاعروں میں بھی جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ میر محسن علی محسنؔ لکھنوی نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب "سراپا سخن" تصنیف ۱۲۶۹ھ میں ان کا ذکر بحیثیت غزل گو کیا ہے۔ یہ تذکرہ عہد شاہی کی ایک یادگار ہے جس میں اس زمانے کے تمام شعراء کی غزلیں سوائے میر انیسؔ کے سب ہی موجود ہیں۔ اس تذکرے کی خصوصیت یہ ہے کہ مرتب کتاب نے ہر شاعر کو انسانی جسم کے کسی حصے کو موضوع سخن قرار دے کر غزل کہی گئی ہے جس میں زلفوں سے لیکر تلوے تک ہر شاعر کا کلام موجود ہے یہی اس کتاب کی افادیت کا باعث ہے تعداد صفحات ۲۹۲ ہے۔ جیسا کہ سطور بالا میں درج کیا گیا ہے۔ میر مونسؔ نے لاتعداد مرثیوں کے علاوہ تضمینیں بھی کہیں اور خصوصیت کلام مونسؔ بھی یہی ہے کہ انیسؔ جیسے شاعر باکمال نے انکی ستائش ان الفاظ میں فرمائی۔ وہ فرماتے ہیں۔

"..... میر نواب میں مانتا ہوں کہ میری وجہ سے تمہیں نقصان پہنچا ورنہ تم اس خاندان میں اس قابل تھے کہ جانے اور مانے جاتے۔"

بھائی کی اس تعریف کو سن کر مونسؔ نے ایک لائق بھائی کی طرح سر جھکا کر کہا...... بھیّا میں کہاں اور آپ کہاں۔ پھر دوسری باتیں ہونے لگیں۔ میر نواب مونسؔ کی زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینے نیا مرثیہ نظم کرتے اور اور نواب میر محمد حسین خاں امیرؔ لکھنوی کی محلسرا میں پڑھتے تھے۔ ان کی اس مجلس مرثیہ کو سننے کے لیے پورا شہر امنڈ آتا تھا۔ میرا موضوع اس وقت چونکہ تضمین نگاری ہے اس لیے عمداً ان کے دیگر اصناف سخن کے ذکر کو ترک کرتا ہوں۔ میر انیسؔ صاحب نے ان کے جس سلام سے متاثر ہو کر اس کی تضمین کی وہ یہ ہے۔

اے مجرئی گیا سر سرور کہاں کہاں
قرآں لیے پھرے ہیں ستمگر کہاں کہاں

اور مقطع یہ ہے

مونسؔ ترے سخن کی ہوئی شش جہت میں دھوم
تیغ زباں کے پہونچے ہیں جوہر کہاں کہاں

تضمین سلامِ مونس

چمکا خدا کے عرش کا اختر کہاں کہاں
کھایا علی کے چاند نے چکر کہاں کہاں
پہنچا سناں پہ نیّرِ اکبر کہاں کہاں
اے مجرئی گیا سرِ سرور کہاں کہاں
قرآں لیے پھرے ہیں ستمگر کہاں کہاں

یثرب میں پوچھتا تھا جو شہ سے بچشمِ تر
دل مضطرب ہے اے اسد اللہ کے پسر
کعبے سے جائیے گا کہاں، قصد ہے کدھر؟
کہتے تھے شاہ، ہے یہ سفر آخری سفر
لے جائے دیکھیں ہم کو مقدّر کہاں کہاں

بعد پدر اسیری زنداں کے دکھ اٹھائے
چھوٹے تو نابلد تھے کہیں بھاگنے نہ پائے
دا غربتا کہ پنجۂ حارث میں دونوں آئے
مسلم کے لاڈلوں کو نہ چھوڑا اجل نے ہائے
چھپتے پھرے وہ بیکس و مضطر کہاں کہاں

دیکھا حواس باختہ جب حر کی فوج کو
جانا کہ تشنگی ہے غضب حر کی فوج کو
اپنے قریب کرکے طلب حر کی فوج کو
پانی دیا امام نے سب، حر کی فوج کو
برسا سحابِ رحمتِ داور کہاں کہاں

کچھ دردِ دل کا حال سناؤ تو باپ کو
مرتے ہوئے گلے سے لگاؤ تو باپ کو
برچھی کہاں لگی ہے بتاؤ تو باپ کو
کہتے تھے رو کے شاہ دکھاؤ تو باپ کو
کھائے ہیں زخم اے علی اکبر کہاں کہاں

ہوں بے گناہ فوجِ غریباں گواہ ہے
نہ کوئی آشنا نہ کوئی خیر خواہ ہے
گرداب غم میں تیرے کرم پر نگاہ ہے
سجاد کہتے تھے مری کشتی تباہ ہے
یارو سنبھالو طوق کا لنگر کہاں کہاں

ہر ذی حیات پر ہے یہ صدمہ جہان میں
ہر عضو میں یہ درد ہے ہر استخوان میں
تن میں، رگوں میں، روح میں، لب میں، زبان میں
دل میں، جگر میں، سینۂ پر خوں میں، جان میں
ڈوبا ہے ایک غم کا یہ نشتر کہاں کہاں

جن و ملک کے دل ہیں سدا اضطرار میں
نالاں ہیں بلبلیں چمنِ روزگار میں
ماہی بھی مبتلا ہے اسی خار خار میں
افلاک میں، زمین میں، ہوا میں، بحار میں
برپا ہے ایک ماتمِ سرور کہاں کہاں

یہ رحمتیں یہ لطف و کرم کب ہے ابر میں
تسکیں ابھی عطا ہو، جو فرق آوے صبر میں
اللہ رے اختیار مصیبت میں جبر میں
دکھ میں، مرض میں، نزع میں ایذائے قبر میں
دیکھو مدد کو آتے ہیں حیدر کہاں کہاں

ہر جا چلی چھری سپہ اہلِ غدر میں
گردن میں سر میں، شانے میں پہلو میں صدر میں
بالا رہی قمر سے بھی رفعت میں، قدر میں
صفین میں، حنین میں، خیبر میں، بدر میں
چمکی علی کی تیغ دو پیکر کہاں کہاں

کوفے میں، شام میں، حبش و زنگبار میں
خوشبو گئی جزیروں میں اور کوہسار میں
یاں ہے سوادِ ہند بھلا کس قطار میں
چیں میں، ختن میں، دشتِ خطا میں تتار میں
مہکی شمیم کاکلِ سرور کہاں کہاں

نکہت وہ مشک تر کی جو تھی تار تار میں
تاروں سے پہونچی دامنِ ابر بہار میں
بادِ بہار لے کے گئی ھر دیار میں
چیں میں، ختن میں دشت خطا میں تتار میں
مہکی شمیم کاکلِ سرور کہاں کہاں

گزرے ستم جو مالک کوثر پہ دھر میں
ہے پیچ و تاب بحر کی ایک ایک لہر میں
کیوں سرخ آندھیاں نہ اٹھیں شہر شہر میں
صحرا میں، قتل گاہ میں، ریتی میں، نہر میں
ٹپکا ہے خون سبطِ پیمبرؐ کہاں کہاں

ہر دم سرِ بریدہ تھا ایذائے سخت میں
روتا تھا خون، فراقِ تنِ لخت لخت میں
پہ تھی بس قتا بھی صعوبت جو بخت میں
چوبِ سناں میں قلعے کے در میں، درخت میں
لٹکا ہے سر کا فرق مطہرؓ کہاں کہاں

تھا ماہ فاطمہؓ پس مردن بھی سیر میں
گہ اپنی انجمن میں، کبھی بزمِ غیر میں
گہ زیر کوہ، گاہ مکانِ غدیر میں
صندوق میں، تنور میں، زنداں میں، دیر میں
رکھا حسینؑ کا سرِ انور کہاں کہاں

بے پردہ شہر شہر گئے اژدھام میں
پہنچے یزید نجس کے دربار عام میں
دیکھے حدیث شک ہو جسے اس کلام میں
رستے میں دیار کوفہ میں، اقلیم شام میں
آلِ نبیؐ پھرے ہیں کھلے سر کہاں کہاں

لکھا ہے بنت فاطمہ کی سرگذشت میں
پیٹی نہ اپنا دیکھ کے سر شہ کا طشت میں
آنسو تھمے نہ تا بہ وطن باز گشت میں
شہروں میں جنگلوں میں پہاڑوں میں دشت میں
بھائی کو روئی زینبؑ مضطر کہاں کہاں

سارا زمانہ غرب سے دشمن ہے تابہ شرق
دریا پہ یہ ستم ہوں تو تڑپے مثال برق
تو رحم کر، کہ صبر و رضا میں نہ آوے فرق
بابا تو سر کٹا کے ہوئے بحر خوں میں غرق
میں کھینچتا پھروں تنِ لاغر کہاں کہاں

دیکھے نہ یہ ستے کسی مجروح کے حواس
ضربیں گلے پہ چلتی تھیں اور کچھ نہ تھا ہراس
سوکھی زباں لبوں پہ پھرا کر بہ درد و یاس
قاتل سے شاہ کہتے تھے کیوں تجھی میری پیاس
انصاف کر رکا ترا خنجر کہاں کہاں

بے دست ہے کہیں مرا عباس نامور
قاسم کہیں پڑا ہے زمیں پہ کٹا کے سر
اک سوگوار خاک اڑائے کدھر کدھر
ہیں غرق خوں کہیں تو بھتیجے، کہیں پسر
پیٹے سر اپنا جا کے یہ خواہر کہاں کہاں

ہوتی رہیں شہر شہر اسی غم کی مجلسیں
ہر جا ہیں نذرِ سرورِ عالم کی مجلسیں
کس جا نہیں ہیں ماہ محرم کی مجلسیں
گھر گھر بپا ہیں شاہ کے ماتم کی مجلسیں
جا جا کے روئے عاشق حیدر کہاں کہاں

حالِ عوام جانتے ہیں صاحبِ علوم
جو خاص ہیں اسی طرف ان سب کا ہے ہجوم
اکثر انیسؔ نے یہ کہا ہے، علی العموم
مونسؔ ترے سخن کی ہوئی شش جہت میں دھوم
تیغ زباں کے پہونچے ہیں جوہر کہاں کہاں

افسوس کہ اس شاعر نکتہ شناس، انیسؔ کی آنکھوں کا تارا جسے دنیا میر نواب مونسؔ کے نام سے جانتی پہچانتی تھی ۱۹ شوال ۱۲۹۲ھ کو لکھنؤ کے محلہ مشک گنج میں اچانک درد دل کے عارضہ میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ بعد وفات بستن چابداری محلہ

(بقیہ صفحہ ۲۵۳ پر)

علی ریحان تُوابی
نزد کوتوالی مغل پورہ مرادآباد
7897770514

میر انیسؔ کی بدیہہ گوئی

صالح اور مثبت فکر و خیال پر مبنی اور انسانی و وجدانی شعار و اقدار پر مشتمل بامقصد شاعری الہامی کیفیت اور ارتقائی حیثیت کی حامل ہوتی ہے اور اپنی رسولانہ تعلیمات اور پیغامات کے وقار و معیار کے اعتبار سے پیغمبرانہ شان و عرفان رکھتی ہے جس کی تعبیر و تفسیر مولانا روم نے اپنی مثنوی کے ایک مصرعہ شاعری جزویست از پیغمبری کے عارفانہ کلام کے ذریعہ کی ہے چونکہ ایسی عمیق و بلیغ فکر و خیال پر محیط شاعری بہت ہی معتبر اور منتخب اشخاص کو مبداء فیاض کی خاص عطا اور منبع وحی کا مخصوص عطیہ ہوتی ہے جو مرکز الہام القا سے کسب فیض کرتی ہے اس لیے ایسی شاعری الگ و حامل شعرا کو خدا سے بطور خاص منسوب و متعلق کر کے تلامیذ الرحمن کے نام و نسبت اور لقب سے متعارف کرایا گیا ہے اور ایسے ہی شعراء کے سپرد الٰہی و سرمدی ہدف اور ربانی و روحانی مقصد کی تبلیغ و تکمیل کا فریضہ بھی کیا گیا ہے ایسی ہی وجدانی و ربانی اہداف و مقاصد پر مبنی شاعری کے نقیب و امین الہامی و القائی شاعروں میں اردو شاعری میں صنف مرثیہ گوئی کے امام و پیشوا میر انیس کا بھی نام بہت نمایاں طور پر سر فہرست نظر آتا ہے۔

ایسے ربانی و روحانی شاعروں و سخنوروں کا ذہنی و روحانی ربط و تعلق چونکہ فطری طور پر مرکز الہام و القاء سے ہوتا ہے اس لیے ان کی فکر و فہم بہت پختہ و بالیدہ ہوتی ہے اور ان کا خیال و تخیل نہایت وسیع و بلیغ ہوتا ہے وہ بچپن ہی میں نہ صرف مشق سخن کا آغاز کر دیتے ہیں بلکہ اس میدان میں غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جب ہم کلام انیس کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں ہم ان کی پرگوئی و بسیار گوئی اور زود گوئی و بدیہہ گوئی کی معجز بیانی کے حوالے سے ان کی عبقری شخصیت اور معجزانہ صلاحیت کا مشاہدہ ان کے ایام طفولیت ہی سے کرتے ہیں۔ ان کی قادر الکلامی اور روشن فکری کے آثار و علامات نہ صرف ان کی زود گوئی و بدیہہ گوئی میں نظر آتے ہیں بلکہ ان کی بچکانہ شاعری اور ان کے طفلانہ کلام میں بھی اجاگر ہوتے ہیں چنانچہ ان کی زود گوئی و بدیہہ گوئی کا سلسلہ صرف پانچ سال کی کم سنی میں ان کی شاعری کی ابتدا ہی سے شروع ہو گیا تھا اور تا حیات برابر جاری رہا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سید تقی عابدی رقمطراز ہیں کہ۔

"ایک مشہور روایت یہ بھی ہے کہ میر انیس مرحوم نے بچپن میں ایک بکری پالی تھی جس کو بہت چاہتے تھے جب وہ بکری مر گئی تو بہت **ملال ہوا** اور اس کے مرنے پر یہ شعر کہا۔

افسوس کہ دنیا سے سفر کر گئی بکری
آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری

میر خلیق کو خبر ہوئی تو ہونہار بیٹے کو بلا کر مکرر اس شعر کو پڑھوایا۔ تعریف سے دل بڑھایا اور اس خوشی میں

کہ صاحبزادے نے پہلے پہل شعر کہا ہے اپنے بیگانوں میں مٹھائی تقسیم کی اور بڑی دھوم دھام سے انیس کی شاعری کی بسم اللہ ہوئی۔" [11]

میر انیس کی زود گوئی اور بدیہہ کو جب ہم ان کی کم سنی اور کم عمری کے اعتبار سے ان کی پختہ قوت فکر اور بالیدہ قدرت کلام کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ اندازہ لگاتے ہیں بالکل کوئی تکلف نہیں ہوتا کہ ان کی یہ صلاحیت خداداد بھی تھی اور طبع زاد بھی جیسا کہ بقول استاذ محترم ڈاکٹر نیر مسعود رضوی۔

"سید محمد کا بیان ہے کہ پانچ ہی برس کی عمر میں انیس کی موزونی طبع ظاہر ہونے لگی تھی وہ کھیلتے کھیلتے میں برابر موزوں فقرے کہا کرتے تھے۔"

اور اسی زمانے میں انھوں نے کئی موقعوں پر کئی شعر کہے مثلاً

افسوس کہ دنیا سے سفر کر گئی بکری
آنکھیں تو کھلی رہ گئیں اور مر گئی بکری

روز آتا ہے کہ کیوں میں نے اتارا تعویذ
تم میں کس شخص نے پایا مرا پیارا تعویذ

تم آئے مہندی کو لینے گلاب باڑی میں
مسالہ سرخ لگے گا سفید داڑھی میں [12]

میر انیس نے اپنی اس فکر کی پرواز اور اس کی سرعت رفتار کو اپنی طبع آزمائی اور سخن سرائی کے لیے گویا "بازیچۂ اطفال" کے طور پر استعمال کر کے بدیہہ گوئی کو اپنے بچپن کے کھیل کود کا بھی ایک حصہ بنا لیا تھا چنانچہ استاذ محترم ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کے مطابق۔

"اسی سلسلہ کا ایک بیان جو 'فکر بلیغ' کے مطبوعہ ایڈیشنوں میں نہیں ملتا درج ذیل ہے۔"

"میر سید محمد مرحوم فرماتے تھے کہ (انیس کی) سات برس کی عمر تھی کچھ لکھ لیتے تھے کہ ایک تکل بڑھ کر میرے گھر گرا دی اس پر لکھا ہوا تھا۔

میری تکل کو جو کوئی لوٹے سنگ آفت سے اس کا سر ٹوٹے
اس کے گھر بے سبب لڑائی ہو اس کی جورو بھی بے سبب چھوٹے

میرے والد نے پڑھ کر کہا پھینکو پھینکو۔" [13]

میر انیس کی اس قسم کی زود گوئی و بدیہہ گوئی کو بچکانہ شوخئ طبع اور طفلانہ عودت فکر نیز متجسسانہ حاضر دماغی کا نتیجہ بھی قرار دیا جس میں اس عمر کی فطری ظرافت طبعی شرارت اور تفریح طبع کا عنصر بھی کارفرما رہتا ہے جیسا کہ استاد محترم ڈاکٹر نیر مسعود کے بقول:

"ایک واقعہ مولوی سید محمد ہاشم فرنگی محلی کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔"

"ایک بار میر انیس نے کوئی شرارت کی میر خلیق ان کی تنبیہہ کرنے کے لیے ان کو تلاش کرتے ہوئے گھر میں آئے میر انیس والد کے ڈر سے مہندی کے درخت کی آڑ میں دیوار پر چڑھ گئے اس وقت سن تقریباً آٹھ یا نو سال کا تھا میر خلیق نے صحن میں آکر پکارا۔ کہاں ہے ببر علی؟ میر انیس کی والدہ خاموش رہیں۔ میر خلیق اتفاق سے اسی درخت کے نیچے تھے جہاں کہ ببر علی چڑھے ہوئے تھے درخت کی آڑ سے یہ شعر پڑھا۔

برگ حنا پہ بیٹھ کے لکھتا ہوں دل کی بات
شاید کہ رفتہ رفتہ لگے دلربا کے ہاتھ" [14]

اس سلسلے میں میر انیس کی شاعری کی تدریجی پیش رفت اور مختلف ارتقائی منزلوں کو متعدد ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے استاد محترم ڈاکٹر نیر مسعود رضوی بعض اطلاعات کی بنیاد پر ان کی شاعرانہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل کا اس طرح تجزیہ کرتے ہیں کہ

"ان اطلاعات کی روشنی میں انیس کی شخصیت کے تشکیلی مراحل اس طرح سمجھے جا سکتے ہیں۔

۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء سے قبل بچپن کی شاعری۔ جب وہ کھیل کھیل میں شعر موزوں کر لیا کرتے تھے۔" [15]

میر انیس کی زود گوئی و بدیہہ گوئی اکثر اوقات زیادہ تر مجالس و محافل کے موقع پر حالات کے پیش نظر بروقت و برمحل

گویا اتفاقی نوعیت کی ہوتی تھی۔ اور بالکل آمد کی کیفیت رکھتی تھی اور جیسے اس میں کچھ بھی غور و فکر کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی چنانچہ ڈاکٹر سید تقی عابدی کا خیال ہے کہ۔

" میر انیس جتنی توجہ مرثیہ پر دیتے تھے اتنا وقت اور وقت سلام اور رباعیات پر صرف نہیں کرتے تھے کئی رباعیات تو مجلس اور محافل میں انیس نے فی البدیہہ کہی تھیں"۔ ۶

میر انیس کی زود گوئی و بدیہہ گوئی میں عموماً بڑی موثر برجستگی و بے ساختگی پائی جاتی ہے جو ان کی مہارت شعر و سخن کے ساتھ ہی وسعت فکر و فن کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں استاد محترم ڈاکٹر نیر مسعود رضوی نے "فکر بلیغ"، (شاد عظیم آبادی) کے حوالے سے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

" شاد بتاتے ہیں کہ ایک دن وہ اور مونس ایک مشاعرے کی طرح میں غزل کہہ رہے تھے وہیں انیس سو رہے تھے کچھ دیر میں اٹھ بیٹھے اور بولے۔ آپ لوگ شعر کہہ رہے تھے اور میں سن رہا تھا مجھ بڈھے کا بھی ایک شعر سن لیجیے پھر یہ شعر پڑھا۔

خدا جہاں میں سلامت رکھے تجھے اے قبر
کہ سوئے پاؤں کو پھیلا کے اپنے گھر کی طرح ۷

میر انیس کی زود گوئی و بدیہہ گوئی سے متعلق ان کی مشق سخن کی الہامی کیفیت اور ارتقائی نوعیت کے بارے میں ان سے خوش عقیدگی کی ایک روایت بھی عام طور پر بہت مشہور تھی کہ جب شعر گوئی کے لیے ان کی طبیعت آمادہ ہوتی تھی تو خصوصاً مرثیہ نگاری کے موقع پر وہ چادر اوڑھ کر لیٹ جاتے تھے اور پھر اشعار کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس طرح وہ بولتے جاتے تھے اور کوئی شخص لکھتا جاتا تھا۔ ممکن ہے شاد عظیم آبادی کے بیان کردہ مذکورہ بالا واقعہ کی بنیاد پر خوش فہمی کی وجہ سے اس روایت کو شہرت حاصل ہو گئی ہو مگر میر انیس کے نواسے سید علی مانوس نے میر صاحب کے روزمرہ کے معمولات اور نظام الاوقات کا ذکر کرتے ہوئے اس روایت کی سخت تردید کی ہے اور بیان کیا ہے کہ۔

" مرثیہ کہنے کے وقت مکان کے جنوبی حصہ کے دوسرے دریچہ میں تخت پر بیٹھتے تھے۔ سامنے کنول روشن رہتا تھا پہلو میں کتابیں ہوتی تھیں زیادہ تر دو زانو بیٹھتے تھے جب سوچنے لگتے تو اکثر کہنیاں زانو پر ہوتی تھیں اور رخسار ہاتھوں پر مرثیہ گوئی کا مشغلہ نماز صبح کے وقت تک جاری رہتا تھا۔ میر مانوس نے کہا کہ یہ بالکل غلط ہے کہ میر انیس مرثیہ کہتے وقت چادر اوڑھ کر لیٹ جاتے تھے اور خود بولتے جاتے تھے اور کوئی شخص لکھتا جاتا تھا"۔ ۸

البتہ بعض خاموش مواقع پر اور معینہ اوقات اور مخصوص حالات میں جب فضا خوشگوار، ماحول سازگار، مزاج شگفتہ اور طبع موزوں ہو تو اس وقت ان کے ذہن کی روانی، فکر کی جولانی، تخیل کی طغیانی، طبیعت کا جوش خروش اور مضامین کی آمد آمد کی کیفیت قابل دید و شنید ہوتی تھی اور ان کی معجزانہ پرگوئی و بسیار گوئی اور اتفاقی و کرشمائی زود گوئی و بدیہہ گوئی اپنے عروج پر ہوتی تھی اور ان کا تعلی پر مبنی یہ مشہور شعر ان کے اس فخریہ دعوے پر صادق آتا تھا اور واقعی کسب فیض کی دعوت دیتا تھا کہ:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

جیسا کہ اس مکاشفاتی کیفیت کے بارے میں بقول استاد محترم ڈاکٹر نیر مسعود رضوی۔

" اشہری بتاتے ہیں کہ انیس کے مکان میں ایک حوض تھا اکثر موسم گرما میں اس میں غوطے لگاتے۔ اکثر اسی عالم خلوت میں دس دس، بیس بیس، پچاس پچاس بند کہہ ڈالتے جو ان کے لوح حافظہ پر لکھ جاتے اور جب باہر تشریف لاتے تو میر مونس یا میر نفیس یا کسی اور عزیز و شاگرد سے جو سامنے ہوتا لکھنے کا ارشاد کرتے اور مسلسل لکھوا دیتے تھے"۔ ۹

ایسے موقع پر ان کی یادداشت اتنی تیز، ذہن اتنا بیدار اور دماغ اس قدر حاضر ہوتا تھا کہ وہ بیک وقت خود بھی مشق سخن اور طبع آزمائی کرتے تھے۔ اور اپنے شاگردوں کے بھی کلام پر اصلاح دیتے جاتے تھے چنانچہ استاد محترم ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کے مطابق۔

''شاد بھی بتاتے ہیں کہ انیس گرمیوں میں روزانہ حوض میں نہاتے،، اور نہاتے وقت میر مونس و نفیس کے کلام پر اصلاح دیتے جاتے۔[۱۰]

اسی موقع کا ایک مشہور واقعہ میر انیس کی قوی یادداشت اور تیز قوت حافظہ کے حوالے سے ان کی زود گوئی و بدیہہ گوئی کے متعلق اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ میر انیس اسی حوض میں نہا رہے تھے کہ ان کے سعادت مند اور فرماں بردار بھائی میر مونس نے اپنا نو تصنیف مرثیہ اصلاح کی غرض سے میر صاحب کی خدمت میں پیش کیا میر صاحب کی طبیعت کچھ مکدر و منغض ہوگئی اور انھوں نے وہ مرثیہ پھاڑ کر حوض میں پھینک دیا۔ اس بات سے میر نفیس رنجیدہ دل اور کبیدہ خاطر ہوئے تو پورا مرثیہ فی الفور اور فی البدیہہ از سر نو اصلاح شدہ املا کرکے لکھوا دیا جیسا کہ استاد محترم ڈاکٹر نیر مسعود رضوی رقم طراز ہیں کہ

''خود انیس کے مزاج میں بھی تندی تھی... یہ واقعہ بھی کئی طرح سے بیان ہوا ہے کہ ایک بار انیس نے اپنے بھتیجے اور اطاعت گزار بھائی کا نیا مرثیہ اصلاح دینے کے بجائے حوض میں ڈبو دیا۔''[۱۱]

میر انیس کی اسی زود گوئی و بدیہہ گوئی میں میر انیس اور مرزا دبیر کے درمیان باہمی فکری و فنی چشمک اور ایسی علمی ادبی معرکہ آرائی کا بھی خاصا دخل رہا ہے چونکہ یہ دونوں ہی میدان مرثیہ نگاری کے ماہر و قادر شہسوار تھے اس لیے اکثر ان میں مقابلہ آرائی رہا کرتی تھی جس کی وجہ سے کبھی طنزاً تو کبھی مصلحتاً اور کبھی ضرورتاً وقت کی ضرورت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے میر انیس ذہنی اور فکری طور پر خود کو فی البدیہہ اشعار کہنے کے لیے ہمیشہ تیار رکھتے تھے۔

چنانچہ ایک روایت کے مطابق کسی موقع پر غالباً نواب محمود آباد کے یہاں ایک بار میر انیس اور مرزا دبیر دونوں ہی مدعو تھے اور دونوں ہی کو مرثیہ پڑھنا تھا۔ اس موقع پر پہلے مرزا دبیر نے اپنا شاندار و شاہکار مرثیہ ''آ ہوئے کعبۂ قربانی داور ہے حسین،، پڑھا جو بہت پسند کیا گیا اور اس کی ایسی دھوم مچی کہ سامعین اور خصوصاً مرزا دبیر کے حامیوں نے گویا چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ کہ مرزا صاحب کے اس مرثیہ کے بعد اب میر انیس کے لیے آج کی مرثیہ خوانی بہت امتحانی اور آزمائشی ثابت ہوگی۔ میر انیس تک جب یہ خبر پہنچی تو اگرچہ میر صاحب دوسرا مرثیہ پڑھنے والے تھے مگر اس خبر کو سن کر انھوں نے اسی وقت فی البدیہہ اور فی الفور اپنا عظیم الشان اور معرکۃ الآرا مرثیہ ''آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے،، کہہ کر پڑھا۔ یہ مرثیہ اتنا مقبول اور مشہور ہوا کہ شہروں اور دیہاتوں تک میں آج بھی یہ رقت آمیز مرثیہ مجالس میں برابر پڑھا جاتا ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے میدان میں یہ معرکہ آرائی اس قدر شدت اختیار کر گئی تھی کہ نہ صرف اس پر تنقید و تبصرہ کی محفلیں گرم رہتی تھیں اور ان میں خوب گرما گرم بحثیں ہوا کرتی تھیں بلکہ دونوں کے حامیوں کی دو حریف جماعتیں ''انیسیے،، اور ''دبیریے،، کے عنوان سے قائم ہوگئی تھیں۔ یہاں تک کہ خود یہ دونوں فریق بھی کبھی کبھی مجلسوں میں ایک دوسرے کے لیے طنزیہ اشعار کہہ کر سنایا کرتے تھے اور اس طرح ایک دوسرے کو نیچا دکھا کر اپنے حریف پر حاوی ہونے کی کوشش کرتے رہتے تھے ایسے موقعے بدیہہ گوئی کی قدرت و صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے اس سے خاطر خواہ طور پر استفادہ کرتے تھے ایسے ہی ایک موقع کی منظر کشی اور مقابلہ آرائی کی واقعہ نگاری کرتے ہوئے اشہری لکھتے ہیں کہ۔

تمام شہر لکھنؤ میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ نقادانِ سخن کے جتھے دونوں کی طرف داری میں علیحدہ علیحدہ بٹے ہوئے تھے۔ کسی ایک مجلس میں دونوں صاحبوں کا جمع ہونا اتنا مشکل تھا جو بغیر خاص تدبیر و اثر کے ناممکن تھا چنانچہ نواب مفتاح الدولہ نے واجد علی شاہ کے سامنے دونوں صاحبوں کی تعریف کر کے ایسی تقریر کی کہ جس سے بادشاہ دونوں کو ایک مجلس میں پڑھنے کا ارشاد فرمائیں اور بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔" مجلس مقرر ہوگئی دبیر انیسؔ سے پہلے مجلس میں پہونچ گئے انیسؔ نے ہر بات کی خبر پہونچنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ انھیں دبیرؔ کے پہنچنے کی اطلاع مل گئی تو اپنے جانے میں دیر لگانا شروع کی یہاں تک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت معینہ سے کچھ زیادہ وقت آگیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی مجلس تیار ہے صرف آپ کا انتظار ہے تب انیسؔ فنس پر بیٹھ کر مجلس میں پہونچے۔ مفتاح الدولہ سے کہا آپ جانِ عالم سے عرض کردیں کہ انیسؔ حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے" مجلس میں پہلے دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ انھوں نے بادشاہ کی تعریف میں ایک رباعی پڑھی پھر مرثیہ پڑھا۔ اس کے بعد میر انیسؔ کو پڑھنے کا ارشاد ہوا۔ میر صاحب کچھ نے کر نہ گئے تھے۔ میر مونسؔ سے پوچھا کچھ لائے ہو۔ انھوں نے ایک سلام اور مرثیہ پیش کیا اس کو دیکھا اور فی البدیہہ ایک مطلع تصنیف کیا۔ منبر پر جا کر حضرت علی کی مدح میں ایک رباعی پڑھی ازاں بعد (مونس) کا سلام شروع کیا جس کا وہ فی البدیہہ مطلع یہ ہے۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

سلام پڑھ کر مرثیہ پڑھا اور منبر سے اتر آئے بادشاہ نے سامنے بلا کر انیس کی تعریف کی اور میر صاحب آداب بجالا کر رخصت ہوئے۔ تمام شہر میں اس مجلس کا شہرہ ہو گیا اور مہینوں اس کا ذکر ہوتا رہا" [۱۲]

بسا اوقات میر انیس کی اس زود گوئی و بدیہہ گوئی کا موجب و محرک سامعین و شائقین کی طرف سے انیس کی مجلس سننے کے پُرخلوص ذوق و شوق کا جوش مظاہرہ بھی ہوتا تھا جس کے زیرِ اثر مجلس میں کثیر مجمع میر انیس کے انتظار میں بے چین و بیقرار رہتا تھا۔ ایسے حساس لمحات اور جذباتی اوقات میں اپنے شائقین کے مجمع کثیر اور جم غفیر کو دیکھ کر فرطِ مسرت سے مغلوب و سرشار ہو کر ان کی فکری و فنی حس بیدار ہو جاتی تھی اور پھر وہ فوراً اسی وقت کبھی مجلس سے پہلے زیرِ منبر اور کبھی مرثیے سے پہلے بالائے منبر حسبِ موقع فی البدیہہ کوئی رباعی کہہ کر سامعین کی دل جوئی و دل دہی و دلداری و عزت افزائی کے لیے پڑھ دیا کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۱۸۵۷ کے غدر نام سے بدنام ہندوستان کی تحریک آزادی کی ناکامی کے بعد کے پُرآشوب دور کے اختتام کے بعد کی ایک مجلس کا بیان کیا گیا ہو کہ

پُرآشوب کے بعد پہلی مجلس

لکھنؤ میں انیس کی پہلی مجلس کے سلسلے میں نائب حسین نقوی کے جس خط کا حوالہ آچکا ہے اسی میں ہے کہ انیسؔ نے غدر کے بعد پہلا مرثیہ نواب تحمل حسین خاں کی بارہ دری واقع کٹرہ ابو تراب خاں لکھنؤ میں جا آتا ہے۔ "تیر بیشۂ حیدر فرات پر دو پڑھا" مانوسؔ کے یہاں کی بھی اطلاع یہی ہے۔ ان کے پوتے سید محمد عباس انیس کی ایک رباعی پر یہ حاشیہ دیتے ہیں۔

"یہ رباعی انیس نے بعد غدر نواب تحمل حسین خاں کی بارہ دری واقع کٹرہ ابو تراب خاں میں پڑھی تھی یہ مجلس ایک ڈپٹی کلکٹر کی بنا کردہ تھی ہر مذہب و ملت کے لوگ شریک تھے بہت بڑا مجمع تھا اسی مجمع کو دیکھ کر یہ رباعی نظم کی۔ مفتی میر عباس صاحب بھی شریک تھے۔ مجلس میں یہ مرثیہ پڑھا گیا تھا "جاتا ہے تیر بیشۂ حیدر فرات پر" رباعی یہ ہے۔

امید کسے تھی بزم کے بھرنے کی
اللہ جزا دے اس کرم کے کرنے کی
آنکھوں کو کہاں کہاں بچھاؤں اے انیس
ملتی نہیں جا بزم میں تل دھرنے کی

بعض مواقع پر میر انیس کی زود گوئی و بدیہہ گوئی کا سبب وہ داعیہ ان کے لیے سامعین و شائقین کے بے انتہا جذبات عقیدت و ارادت، مجلس میں ان کا پرخلوص و پرجوش اشتیاق و استقبال اور ناخوشگوار موسم اور ناسازگار حالات میں بھی شدت انتظار کے ساتھ وقت کی سختی کی پروا نہ کرتے ہوئے مجلس کے لیے ان کا بے مثال عزم و استقلال بھی ہوا کرتا تھا اور ایسے میں ان کے والہانہ جذبۂ الفت و محبت سے مسحور و متاثر ہو کر میر انیس ان کی پذیرائی و بزرگواری اور حوصلہ افزائی کے لیے اظہار تشکر کے طور پر حسب موقع و محل بروقت اور فی البدیہہ کوئی مناسب رباعی تصنیف کرکے سنا دیا کرتے تھے چنانچہ حیدر عباس لکھتے ہیں کہ۔

"نواب امجد علی خاں صاحب کی بہو صاحبہ کربلا تشریف لے گئی تھیں جب زیارت سے مشرف ہو کر آئیں تو امجد علی خاں صاحب میر انیس کی خدمت میں کچھ تبرکات اور تحفے لے کر آئے اور عرض کیا کہ آپ کی بہو صاحبہ کربلا سے یہ تحفے اور تبرکات لائی ہیں۔ انیس نہایت خوش ہوئے۔ نواب امجد علی خاں صاحب نے کہا حضور وہ منت مان کر آئی ہیں کہ لکھنؤ پہنچ کر میں مجلس کروں گی اور میر صاحب کو پڑھواؤں گی۔ فرمایا کہ اچھا میں ضرور پڑھوں گا۔ مجلس کا دن مقرر ہوا۔ لوگ اشتیاق میں تڑپ رہے تھے لاکھ آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ جیٹھ بیساکھ کا زمانہ تھا دھوپ سخت پڑ رہی تھی میدان میں لنگیروں کے نیچے مجلس تھی۔ دھوپ لنگیروں سے چھن رہی تھی۔ تمام شہزادگان اور روساء و شرفا کا مجمع تھا صراحیاں پانی کی چاروں جانب مجلس میں رکھوادی تھیں پنکھے بیشمار لوگوں کے لیے تقسیم کر دئے تھے اس پر بھی لوگ گرمی سے بیتاب تھے۔ میر انیس صاحب نے آن کر یہ منظر دیکھا منبر پر تشریف لے جاکر فوراً ایک رباعی نظم فرمائی۔

دھوپ آتے ہی یاں یہ زرد ہو جاتی ہے
آندھی آتی ہے گرد ہو جاتی ہے
پنکھے آہوں کے آنسوؤں کا چھڑکاؤ
یاں گرم ہوا بھی سرد ہو جاتی ہے [۱۴]

میر انیس ایک موقع شناس اور مزاج داں اور آداب فہم شخصیت کے مالک تھے ان کی اس موقع شناسی مزاج دانی اور آداب فہمی کا تقاضا تھا کہ وہ کبھی کبھی اپنے میزبان اور بانی مجلس سے عقیدت مندی اور امتنان و تشکر کے اظہار کے لیے دعائیہ کلمات کے طور پر بھی وقت اور موقع و مقام کی مناسبت سے برمحل فی البدیہہ رباعی نظم کرکے فوراً مجلس میں مرثیے سے پہلے گویا ماحول سازی اور فضا بندی کی غرض سے پڑھ دیا کرتے تھے چنانچہ حیدرآباد کے بعض حالات کے حوالے سے وہاں کی ایک مجلس کی کہانی احسن کی زبانی ڈاکٹر نیر مسعود رضوی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

حیدرآباد کے کچھ اور حالات حسب ذیل ہیں

احسن بتاتے ہیں کہ پہلی مجلس میں انیس نے یہ دو رباعیاں فی البدیہہ تصنیف کرکے پڑھیں۔

اللہ و رسول کی امداد رہے
سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیس اعظم ایسے
یا رب آباد حیدرآباد رہے

موجود ہے جو کچھ جسے منظور ہے یاں
علم و عمل و عطا کا دستور ہے یاں
مختار الملک و بندگان عالی
رحمت رحمت پہ نور پہ نور ہے یاں [۱۵]

لیکن اس سلسلے میں اس موقع کی ان دونوں رباعیوں کے فی البدیہہ ہونے کے متعلق انکار کرکے ڈاکٹر نیر مسعود رضوی اظہار خیال کرتے ہیں کہ۔

"ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ مرثیہ گو نے مجلس میں پہنچ کر منبر پر بیٹھنے کے بعد موقع کی مناسبت سے کچھ کلام موزوں کر دیا لیکن حیدرآباد کی ان اہم مجلسوں میں اولاً شہر اور عمائد شہر کی تعریف میں کچھ پڑھنا آداب ذاکری کے عین مطابق بلکہ ضروری تھا۔

اور یہ ایسی بات نہیں تھی جو عین وقت پر انیس کے خیال میں آ ئی۔ یقین ہے کہ انیس نے یہ رباعیاں پہلے سے کہہ رکھی تھیں"[۱۶]

میر انیس کی زود گوئی و بدیہہ گوئی کا یہ سلسلہ ان کی زندگی کے آخری لمحات تک یہاں تک کہ مرض الموت کے ایام میں بھی ان کی جودتِ طبع اور جولانیٔ فکر کی تیز مہمیز کے ذریعہ پوری آب و تاب اور پورے تسلسل کے ساتھ جاری و ساری رہا اور کبھی گزارشی طور پر تو کبھی فرمائشی طور پر انھوں نے اپنی زود گوئی و بدیہہ گوئی کی روایت کو آخری عمر تک قائم رکھا چنانچہ ڈاکٹر نیر مسعود رضوی ان کے آخری دنوں کے ایک واقعہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ۔

میر انیسؔ علیل تھے۔ان کے انتقال سے کچھ دن قبل ان کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد نے کہا کہ قبلہ آپ نے آلِ رسول پر اور کربلا کے واقعات پر ہزاروں مرثیے لکھے لیکن رسول کی شان میں کچھ بھی نہیں لکھا تو میر انیس نے قدرے تامل فرما کر کہا کہ لکھو اور فی البدیہہ مندرجہ بند کہا۔

گر ہوں بیاض بل کے سب اوراق روز و شب
اور جمع روشنائی ہو شمس و قمر کی سب
ہر شاخ ہر شجر کے قلم ہوں بحکم رب
مخلوق سب ہو کاتب وصف شہ عرب
تا حشر ایک سطر ہو سطر دگر نہ ہو
اس پر بھی مبتدا ہو ولیکن خبر نہ ہو

(مراسلہ میر مصطفےٰ علی قادری۔روزنامہ سیاست حیدر آباد)[۱۷]

مآخذ

۱؎ کلیات انیس دیوان رباعیات انیس صفحہ ۳۶ تحقیق و تدوین اور تشریح ڈاکٹر سید تقی عابدی۔

۲؎ انیس (سوانح) صفحہ ۱۸۔۱۹ نیر مسعود قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

۳؎ تذکرہ بلیغ صفحہ ۲۲۲ سید علی محمد شاد عظیم آبادی نسیم بک ڈپو لکھنؤ بحوالہ انیس (سوانح) نیر مسعود

۴؎ انیس (سوانح) صفحہ ۱۹، نیر مسعود قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی (بحوالہ مضمون میر انیس کی حالاتِ زندگی)

۵؎ ایضاً صفحہ ۴۵

۶؎ کلیات انیس، دیوان رباعیات انیس صفحہ ۹۴، تحقیق، تدوین اور تشریح، ڈاکٹر سید تقی عابدی

۷؎ تذکرہ بلیغ صفحہ ۲۵۷ سید علی محمد شاد عظیم آبادی نسیم بک ڈپو لکھنؤ بحوالہ انیس (سوانح) نیر مسعود

۸؎ کلیات انیس۔دیوان رباعیات انیس صفحہ ۵۸ تحقیق تدوین اور تشریح ڈاکٹر سید تقی عابدی۔

۹؎ حیات انیس صفحہ ۴۲ سید امجد علی اشہری ترمیم شدہ ایڈیشن مطبع آگرہ اخبار آگرہ (بحوالہ انیس سوانح نیر مسعود

۱۰؎ تذکرہ بلیغ صفحہ ۲۳۸، سید محمد علی شاد عظیم آبادی۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ

۱۱؎ انیس (سوانح) صفحہ ۱۷۰ نیر مسعود قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی (بحوالہ واقعات انیسیات ادبی میراث)

۱۲؎ ایضاً صفحہ ۲۳۴۔ ۲۳۳

۱۳؎ مجموعہ رباعیات انیس صفحہ ۱۲۵، مرتبہ سید محمد عباس مطبع نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۸ء (بحوالہ انیس (سوانح) نیر مسعود

۱۴؎ دولہا صاحب عروج صفحہ ۳۹۔ ۲۸ مرتبہ نیر مسعود اردو پبلشرز لکھنؤ ۱۹۸۰ء

۱۵؎ انیس (سوانح) صفحہ ۳۶۰ نیر مسعود قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی (بحوالہ واقعات انیس سید مہدی حسن احسن لکھنوی)

۱۶؎ ایضاً صفحہ ۳۶۰۔۳۵۹

۱۷؎ ایضاً " ۴۰۱

بحوالہ مراسلہ میر مصطفےٰ علی قادری۔روزنامہ سیاست، حیدر آباد)

◇◇

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں
غوث منزل تالاب ملا ارم رام پور ۲۴۴۹۰۱
9719316703

اشاریہ اردو مرثیہ اور میر انیس

مع ضروری وضاحت

میں نے ادبی اصناف میں تحقیق، تنقید، اشاریہ، افسانہ اطفال ادب اور دیگر متعدد تخلیقات کے علاوہ تقریباً ایک سو شخصیات پر مضامین بھی لکھے ہیں یا ان کی کتابوں پر تبصرے تحریر کئے ہیں لیکن میری بڑی خواہش تھی کہ میر انیس کی مرثیہ نگاری پر بھی کچھ لکھوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میر انیس پر اتنا اور کچھ اتنے پہلوؤں سے لکھا گیا ہے کہ اس کی تفصیل جمع کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں لہٰذا میں نے اسی مشکل کام کا ارادہ اور تہیہ کیا یعنی اردو مرثیہ اور میر انیس پر لکھے گئے مضامین اور کتابوں کا اشاریہ تیار کرنا۔ یوں بھی میری کوشش رہتی ہے کہ اشاریہ کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ اسکالرز، محققین اور خاص کر طلبہ و طالبات کو ادبی تخلیقات یا ادبی کاموں سے مستفید کراؤں

اشاریہ سازی ادبی تحقیق میں ایک مشکل ترین کام ہے اور بہت زیادہ اہم بھی ہے۔ میں نے جب اردو مرثیہ اور میر انیس پر اشاریہ سازی شروع کی تو مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میر انیس پر اتنا بڑا خزانہ کتابوں اور رسائل میں بکھرا پڑا ہے۔ پیش نظر اشاریہ کئی ماہ کی محنت شاقہ کا ثمرہ اور بہترین نتیجہ ہے۔ البتہ اتنے عرصہ میں یقیناً میں کئی سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب ضرور لکھ سکتا تھا لیکن اشاریہ کی اہمیت کے پیش نظر میں نے اس کام کو ہی اولیت اور فوقیت دی تاہم یہ کام ابھی ادھورا ہے اور اس سلسلے میں بہت کچھ تحقیق کرنے کی اب بھی ضرورت ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ تحقیق میں حرف آخر کچھ نہیں ہوتا۔ اس اشاریہ کے لیے مجھے سیکڑوں کتابوں اور رسائل کے ہزاروں مضامین کو کھنگالنا پڑا بہر حال آئندہ مزید تحقیق کرکے اور جدید اضافوں کے ساتھ اسے کتابی شکل میں پیش کرنے کی کوشش ان شاء اللہ ضرور کروں گا تاکہ میر انیس پر کام کرنے والے اسکالرز کو اس سے رہنمائی، روشنی، مدد اور تحریک مل سکے۔

پیش نظر اشاریہ میں مرثیہ اور میر انیس سے متعلق ہر موضوع پر مضامین موجود ہیں۔ قابل مبارکباد و لائق تحسین ہیں وہ قلم کار اور محققین جنھوں نے اس قدر محنت کرکے ایسے بہترین مضامین لکھے اور اعلا سے اعلا کتابیں تحریر فرمائیں۔ یہاں اس اشاریہ سے متعلق کچھ امور کی وضاحت ضروری ہے تاکہ اس کو آسانی سے دیکھا اور سمجھا جاسکے۔ پہلے تو یہ کہ کسی بھی مضمون کے عنوان میں ہم نے کوئی ترمیم یا تبدیلی نہیں کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک ہی عنوان کے کئی مضامین ہیں تو قلم کاروں کے ناموں کو بھی حروف تہجی سے لگا دیا گیا ہے اور اگر ناموں میں بھی یکسانیت اور مماثلت ہے تو تاریخ اشاعت میں تقدم و تاخر کا التزام و اہتمام رکھا گیا ہے جہاں بہت زیادہ ضروری تھا وہاں بریکٹ میں وضاحت بھی پیش کر دی گئی ہے۔

پتہ نہیں کیوں اور کس مجبوری کے تحت اکثر و بیشتر رسائل نے اردو کے نمبر لکھنا ترک کر دئے ہیں جبکہ اردو کے تعلق سے ان کی اپنی منفرد شناخت اور پہچان ہے۔ ایسے ماحول میں ماہنامہ نیا دور نے کتابت کے فن اور اردو نمبروں کے اندراج کا سلسلہ

جاری رکھا ہے اس لیے ہم نے بھی اشاریہ میں ہر جگہ اردو نمبر ہی استعمال کئے ہیں یہ بات بھی ہم پوری طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جس کتاب کا جو ایڈیشن ہمیں دستیاب ہوا ہے ہم نے اسی کی سن یا تاریخ اشاعت کا اندراج کیا ہے چاہے وہ چوتھا ایڈیشن ہو یا دسواں اور چاہے اس کا پہلا ایڈیشن سو پچاس سال پہلے شائع ہوا ہو۔ سر دست یہ ہماری تحقیق کا موضوع نہیں تھا اس لیے محققین اور معترضین اس بحث میں قطعی نہ پڑیں کہ فلاں کتاب کا پہلا ایڈیشن تو اس سن میں منظر عام پر آیا تھا اس دلیل اور جستجو سے گریز بہر حال بہتر ہے کہ ہمیں کون سی سن اشاعت لکھنی چاہئے تھی۔

جو مضامین رسائل سے لیے گئے ہیں ان کے عنوان کے آگے مضمون نہیں لکھا گیا ہے کیونکہ یہ ہیڈنگ ہم اوپر دے ہی چکے ہیں۔ البتہ جو مضامین کتابوں سے لیے گئے ہیں ان کے آگے مشمولہ کتاب لکھ کر اس کتاب کا نام بھی لکھ دیا ہے ساتھ ہی مصنف کا نام بھی لکھ دیا گیا ہے اس طرح مضمون نگار اور کتاب کے مصنف دونوں کے نام ہم نے لکھ دیے ہیں۔ کتابوں کے نام کے آگے بریکٹ میں (کتاب) لکھ دیا گیا ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ یہ کسی مضمون کا عنوان نہیں بلکہ کتاب کا نام ہے۔

اشاریہ: اردو مرثیہ اور میر انیس ۱۸۷۷ء سے ۲۰۱۶ء تک لکھے گئے مضامین اور دی گئی ترتیب کتابوں پر مشتمل ہے یعنی ۱۴۰ برسوں سے میر انیس پر لکھا جاتا رہا ہے لیکن ٹھہرئے یہ ہماری ناقص اور ادھوری تحقیق ہے کیونکہ میر انیس پر تو اس سے پہلے بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ ابھی خود ہمارے پاس اور رضا لائبریری میں ہزاروں ایسے رسائل موجود ہیں جن کو ہم نہیں دیکھ سکے ہیں۔ اس لیے آئندہ اس اشاریہ میں انشاء اللہ اور اضافہ کریں گے۔

ایک وضاحت اور بھی ضروری ہے یعنی یہ کہ کچھ کتابوں اور مضامین کے عنوان میں اگرچہ اردو مرثیہ الفاظ یا میر انیس کا نام شامل نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ان کو اس لیے شامل کیا گیا ہے کہ ان میں میر انیس کا تذکرہ موجود ہے اس اشاریہ میں دو کتابیں انگریزی کی اور ایک کتاب فرانسیسی زبان کی بھی شامل ہے۔ اکثر پرانی کتابوں میں سن اشاعت یا مقام اشاعت کا اندراج نہیں ہے لیکن اس سے ان کی اہمیت اور افادیت کم نہیں ہوتی وقت ضرورت ان کتابوں کے مطالعہ سے مقام اشاعت اور سن اشاعت کا تعین کیا جا سکتا ہے جن کتابوں کے سن اشاعت اور مقام اشاعت معلوم ہو سکے وہ سب نوٹ کر دئے گئے ہیں اس اشاریہ کی سب سے قدیم کتاب 'انتخاب نقص' ۱۸۷۷ ہے۔

مضمون کا عنوان/ کتاب کا نام	قلم کار	ماہ و سال	صفحہ نمبر
آب بقا (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عبدالرؤف عشرت	لکھنؤ ۱۹۱۸	....
آب حیات (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	محمد حسین آزاد	کلکتہ ۱۹۶۷	....
آفتاب مرثیہ خوانی۔ حیدر نواب جعفری (نیا دور لکھنؤ) (ترتیب و تدوین ضمیر اختر نقوی/ نیر مسعود)	وضاحت حسین رضوی (مبصر)	نومبر ۲۰۱۳	۴۶-۴۷
ابتدائیہ، مرثیہ نگاری اور اردو میں اس کا ارتقا (انیس نمبر. ماہ نو کراچی)	فضل قدیر	۱۹۷۲	.....
ایلیڈ، اینیڈ. مہا بھارت، رامائن پیراڈائس لاسٹ شیکسپیئر اور شاہنامے کے ساتھ مراثی انیس کا تقابلہ (مشمولہ کتاب: تین شاعر)	محی الدین قادری زور	....	.....
اجداد انیس (انیس نمبر. ماہ نو کراچی)	یوسف حسین شائق	۱۹۷۲	.....
احسن کے نام خطوط بسلسلہ واقعات انیس (مخزن لاہور)	پیارے صاحب رشید/ میر علی محمد عارف	فروری ۱۹۰۶	.....
ادب پر واقعات کربلا کے اثرات (سیاست حیدرآباد)	راج بہادر گوڑ	۲۴ مارچ ۱۹۶۳	.....

ادبی تراشے: میر انیس کے کلام کا تمثیلی تجزیہ (فروغ اردو لکھنؤ	عباد احمد انصاری	اکتوبر ۱۹۶۴	.....
ادبی معرکے (انیس نمبر۔ سرفراز	مسعود حسن رضوی ادیب	فروری ۱۹۷۲	......
اردو ادب پر انیس و دبیر کے اثرات (پرواز۔ لندن)	ساحر شیوی	اگست ۲۰۰۴	۳۷-۳۹
اردو ادب میں انیس کی جگہ (مشمولہ کتاب۔ نئی قدریں)	ممتاز حسین	... .	-- --
اردو ادب میں صنف سلام کا جائزہ۔ کلام انیس کی روشنی میں نیا دور لکھنؤ۔	علی احمد دانش	دسمبر ۲۰۱۰	۲۰-۳۱
اردو ادب میں میر انیس کا مقام (مشمولہ کتاب: عالمی انیس سمینار کناڈا)	ڈیوڈ میتھیوز	۲۰۰۲	۳۱-۴۴
اردو ادب میں میر انیس کا مقام (پرواز لندن)	ڈیوڈ میتھیوز	ستمبر ۲۰۰۴	۲۹-۳۳
اردو تنقید پر ایک نظر (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	کلیم الدین احمد	- -	.. ..
اردو تنقید کا ارتقاء (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عبادت بریلوی	- -	.. ..
اردو رباعیات (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	سلام سندیلوی	نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۶۴	- -
اردو زبان اور میر انیس مرحوم (زمانہ کان پور)	علی محمد شاد	اکتوبر ۱۹۱۳	- -
اردو زبان اور میر انیس مغفور (زمانہ کان پور)	شاد عظیم آبادی	اکتوبر ۱۹۱۳	۲۰۴
اردو شاعری پر ایک نظم (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	کلیم الدین احمد	تیسرا ایڈیشن پٹنہ ۱۹۶۴	.. ..
اردو شاعری میں انیس کا درجہ (کتاب)	ناظر کاکوروی	.. ..	.. ..
اردو شاعری میں انیس کا مرتبہ (ہمایوں لاہور)	خواجہ غلام السیدین	نومبر ۱۹۵۶	.. ..
اردو شاعری میں انیس کا مقام (مشمولہ کتاب۔ تشکیل جدید)	عبدالمغنی	.. -	- -
اردو شاعری میں شخصی مرثیوں کی روایت اور جگن ناتھ آزاد سے بیس	عبدالستار دلوی	اگست ۲۰۰۴	۱۴-۱۹
اردو شاعری میں مرثیے کا مقام (سیاست حیدرآباد)	سیدہ جعفر	۲۶ اپریل ۱۹۷۱	" ..
اردو شاعری میں میر انیس کا امتیاز (مشمولہ کتاب۔ جادۂ اعتدال)	عبدالمغنی	.. ..	.. ..
اردو کی ایپک شاعری (مشمولہ کتاب۔ ادب فکر اور سماج)	راجندر ناتھ شیدا	دہلی ۱۹۷۲	.. -
اردو کی رزمیہ نظموں پر ایک نظر (مشمولہ کتاب۔ ادب فکر اور سماج	راجندر ناتھ شیدا	دہلی ۱۹۷۲	.. ..
اردو مرثیوں کی روایت (۱۶ سے ۱۹ ویں صدی کے مرثیوں کے نمونے)	مسیح الزماں	لکھنؤ ۱۹۶۹	.. -
اردو مرثیوں میں منظر نگاری (ہماری زبان دہلی)	اشفاق احمد اعظمی	۲۲-۲۸ جون ۲۰۰۳	۱
اردو مرثیوں میں ہندوستان کی تہذیب و معاشرت (نیا دور لکھنؤ	فردوس فاطمہ	اپریل ۱۹۶۶	۳۴-۴۳
اردو مرثیوں میں ہندوستانی رسمیں (صبح نو پٹنہ)	عطیہ نشاط	اپریل ۱۹۶۶	- ..
اردو مرثیوں میں ہندی الفاظ (نیا دور لکھنؤ	فردوس فاطمہ	مارچ ۱۹۶۲	۴-۸
اردو مرثیہ (جلد اول	اظہر علی فاروقی	ادارہ ادب الٰہ آباد ۱۹۵۸	.. ..
اردو مرثیہ۔ تاریخ مرثیہ (جامعہ دہلی)	سفارش حسین	جولائی ۱۹۶۵	.. ..

اردو مرثیہ (کتاب)	شارب ردولوی	1995	۔۔ ۔۔
اردو مرثیہ (نقوش لاہور)	محمد طاہر فاروقی	جون ۱۹۶۰	۔۔۔۔
اردو مرثیہ انیس سے قبل (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	محمود الحسن رضوی	فروری ۱۹۷۲	۔۔۔
اردو مرثیہ اور اردو ادب پر واقعات کربلا کے آثار (مضمون) (مشمولہ کتاب کا نام: ادبی مطالعے)	راج بہادر گوڑ	۔۔ ۔۔	۔۔۔۔
اردو مرثیہ اور اردو پریس کے اثرات (نوادر لاہور)	گوہر نوشاہی	نومبر ۲۰۰۳۔ مارچ ۲۰۰۴	۳۳-۱۹
اردو مرثیہ اور ترقی پسندی (نیا دور لکھنؤ)	عظیم امروہوی	گوشہ رثائی ادب نومبر ۲۰۱۳	۳۱-۲۶
اردو مرثیہ اور تقلید (مشمولہ کتاب کا نام۔ نئی فکریں)	محمد عقیل	۔۔	۔۔ ۔۔ ۔۔
اردو مرثیہ اور روہیل کھنڈ (رضا لائبریری جرنل)	ناشر نقوی	شمارہ نمبر ۴۔۵	۳۸۲-۳۶۵
اردو مرثیہ اور صوفیائے کرام (نیا دور لکھنؤ)	مجاور حسین رضوی	مارچ ۲۰۰۳	۹-۲
اردو مرثیہ اور صوفیائے کرام ۲۔ (نیا دور لکھنؤ)	مجاور حسین رضوی	اپریل ۲۰۰۳	۳۲-۱۱-۴
اردو مرثیہ اور صوفیائے کرام ۳۔ (نیا دور لکھنؤ)	مجاور حسین رضوی	مئی ۲۰۰۳	۱۱-۳
اردو مرثیہ اور مرزا دبیر (اس کتاب میں انیس کا بھی تذکرہ ہے)	کاظم علی خاں	لکھنؤ ۱۹۷۰	۔۔۔۔۔
اردو مرثیہ اور میر انیس (مشمولہ کتاب: تنقیدی جائزے)	کاظم علی خاں	۔۔۔۔۔	۱۲۱-۳۳
اردو مرثیہ ایک تنقیدی جائزہ (صحیفہ لاہور)	سجاد رضوی	ستمبر ۱۹۵۸	۵۷-۵۴
اردو مرثیہ ایک مطالعہ (کتاب)	ساحل احمد	الہ آباد ۱۹۹۷	۔ ۔۔۔
اردو مرثیہ کا ارتقا (ابتدا سے انیس تک)	مسیح الزماں	لکھنؤ ۱۹۶۸	۔۔۔۔۔
اردو مرثیہ کا ارتقاء (نگار کراچی)	وقار عظیم	مئی جون ۱۹۶۷	۔۔ ۔۔
اردو مرثیہ کا تعارف (کتاب)	شجاعت علی سندیلوی	لکھنؤ ۱۹۵۹	۔۔ ۔۔
اردو مرثیہ کا روایتی انداز و اسلوب (نیا دور لکھنؤ)	علی سلمان رضوی	دسمبر ۲۰۱۰	۳۵-۳۲
اردو مرثیہ کل اور آج (کتاب نما، دہلی)	سیدہ جعفر	مئی ۲۰۱۰	۱۹-۱۱
اردو مرثیہ کے پانچسو سال (کتاب)	عبدالرؤف عروج	۱۹۶۱	۔ ۔ ۔
اردو مرثیہ گوئی پر ایک نظر (مجلہ عثمانیہ حیدرآباد)	عبدالرحمٰن انصاری	۱۹۴۹	۔۔ ۔۔
اردو مرثیہ: میر انیس کے بعد (نیا دور لکھنؤ) (کتاب کے مصنف: طاہر حسین کاظمی)	آفاق فاخری (مبصر)	اپریل ۲۰۰۳	۵۳
اردو مرثیہ میں حمد الٰہی (نیا دور لکھنؤ)	عظیم امروہوی	فروری ۲۰۰۶	۲۲-۱۶
اردو مرثیہ میں گاندھی جی کا مقام (نیا دور لکھنؤ)	عبدالرشید ظہیری	گوشہ رثائی ادب نومبر ۲۰۱۳	۴۳-۴۱
اردو مرثیہ نگاری (کتاب)	ام ہانی اشرف	۱۹۹۲	۔۔ ۔۔
اردو مرثیہ نگاری پر ایک نظر (مشمولہ کتاب۔ اردو ادب میں تنقید کی اہمیت)	قیوم صادق	۔۔	۔۔ ۔۔

عنوان	مصنف	تاریخ	صفحات
اردو مرثیہ نگاری کا ارتقا (صبح نو پٹنہ)	ظاہر حسین	دسمبر ۱۹۶۹	.. .. ..
اردو مرثیہ ہیئت اور ماہیت (نیا دور لکھنؤ)	ثمینہ شوکت	مارچ ۱۹۷۰	۱۰-۱۳
اردو مرثیہ کا ارتقاء (شاعر بمبئی)	حامد حسین	اگست ۱۹۶۸	.. .. ..
اردو مرثیے کا ارتقا ابتدا سے انیس تک (کتاب)	مسیح الزماں	۱۹۶۸/۱۹۸۳	.. .. ..
اردو مرثیے کی تشکیل جدید (صحیفہ لاہور)	صفدر حسین	اپریل ۱۹۶۵	۹-۲۳
اردو مرثیے کی تہذیب (آجکل دہلی)	احمد کفیل	اپریل ۲۰۱۰	۱۳-۶۱
اردو مرثیے کی روایت (کتاب)	مسیح الزماں	۱۹۶۹	.. .. ..
اردو مرثیے کی سرگذشت: آغاز سے حال تک (کتاب)	اسد اریب	۱۹۹۲	.. .. ..
اردو مرثیے کی مقبولیت (نیا دور لکھنؤ)	جعفر رضا	رثائی ادب نمبر اکتوبر ۲۰۱۵	۱۶-۲۰
اردو مرثیے کے آخری ایام (آجکل دہلی)	نسیم امروہوی	جولائی ۱۹۸۷	۱۹-۲۱
اردو مرثیے کے بدلتے ہوئے موضوعات و اسالیب (نیا دور لکھنؤ)	علی سلطان رضوی	جنوری ۲۰۰۸	۳۴-۳۷
اردو مرثیے میں منظر نگاری (نیا دور لکھنؤ)	خواجہ مقبول احمد	نومبر ۱۹۶۳	۳۸-۴۲
اردو مرثیے میں ہندوستانی عناصر (نیا دور لکھنؤ) (کتاب کے مصنف: سید محمد عباس رضوی)	وقار ناصری (مبصر)	دسمبر ۲۰۱۵	۹۰-۹۱
اردو میں جدید مرثیہ نگاری: ایک اجمالی جائزہ (نیا دور لکھنؤ)	فضل امام رضوی	دسمبر ۲۰۱۰	۱۰-۱۸
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت -۱ (نیا دور لکھنؤ)	لئیق رضوی	مئی ۱۹۹۲	۲۸-۳۲
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت -۲ (نیا دور لکھنؤ)	لئیق رضوی	جون ۱۹۹۲	۳۷-۳۸
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت -۳ (نیا دور لکھنؤ)	لئیق رضوی	جولائی ۱۹۹۲	۳۲-۳۴
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت -۴ (نیا دور لکھنؤ)	لئیق رضوی	اگست ۱۹۹۲	۳۴-۳۷
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت -۵ (نیا دور لکھنؤ)	لئیق رضوی	اکتوبر ۱۹۹۲	۳۲-۳۳
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت -۶ (نیا دور لکھنؤ)	لئیق رضوی	نومبر ۱۹۹۲	۳۶-۳۹
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت -۷ (نیا دور لکھنؤ)	لئیق رضوی	دسمبر ۱۹۹۲	۳۸-۴۰
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت -۸ (نیا دور لکھنؤ)	لئیق رضوی	جنوری ۱۹۹۳	۴۰-۴۳
اردو میں شخصی مرثیہ کی روایت (نیا دور لکھنؤ) (کتاب کے مصنف: عابد حسین حیدری)	وقار ناصری (مبصر)	جون ۲۰۰۹	۴۳
اردو میں مرثیہ کی ابتدا اور اس کی ہیئت (نیا دور لکھنؤ)	شارب ردولوی	مئی ۱۹۵۹	۳۳-۳۷
اردو میں مرثیہ نگاری (ماہ نو کراچی)	شاہد احمد صدیقی	نومبر ۱۹۵۰	.. .. ..
ارمغان انیس (کتاب)	آغا محمد باقر	- ..	.. - ..
اساتذہ کی اصلاحیں: میر انیس بر کلام مونس (اردو اورنگ آباد)	صفدر مرزا پوری	جولائی ۱۹۲۷/جولائی ۱۹۳۰	.. ..

عنوان	مصنف	اشاعت	صفحات
اسلاف میر انیس (کتاب)	مسعود حسن رضوی ادیب	لکھنؤ ۱۹۷۰	... ...
اسلاف واخلاف میر انیس (نیا دور لکھنؤ) (کتاب کے مولف: سید محمد عباس آصف۔ مرتب علی احمد دانش)	مجاور حسین رضوی (مبصر)	اکتوبر ۲۰۰۴	۲۹ - ۳۰
اسلوبیات انیس (آجکل۔ دہلی)	گوپی چند نارنگ	فروری ۱۹۸۱	۳ - ۱۱
اصول انتقاد ادبیات (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عابد علی عابد	مجلس ترقی ادب لاہور	.. .. ..
افکار انیس (کتاب)	محمود الحسن رضوی	۱۹۷۶	.. .. ..
العلم دوماہی بمبئی مرثیہ وسلام نمبر جون ۱۹۹۳ نیا دور لکھنؤ (مرثیہ وسلام کے مرتب: علی جواد زیدی)	سبط محمد نقوی (مبصر)	اکتوبر ۱۹۹۳	۴۴ - ۴۵
المیزان (یہ کتاب موازنہ انیس ودبیر کے جواب میں لکھی گئی ہے)	چودہری نظیر الحسن فوق	۱۹۱۴	.. .. ..
انتخابات شبلی (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	سید سلیمان ندوی مرتب	معارف پریس اعظم گڑھ	.. .. ..
انتخاب احتشام حسین (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	فقیر محمد فیصل	.. ..	.. .. ..
انتخاب ادبی مراثی (نیا دور لکھنؤ)	رئیس حسین (مبصر)	نومبر ۲۰۱۴	۴۳ - ۴۴
انتخاب ادبی مراثی (نیا دور لکھنؤ) (کتاب کے مرتب مرزا محمد یوسف)	مسعود حسن رضوی (مبصر)	دسمبر ۲۰۱۲	۴۵ - ۴۷
انتخاب نذریں (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	سر راس مسعود بدایوں	۱۹۲۱	.. .. ..
انتخاب مراثی (انیس ودبیر)	رشید حسن خاں (مرتب)	مکتبہ جامعہ دہلی	.. .. ..
انتخاب نفیس۔ مرثیے (نیا دور لکھنؤ) (کتاب کے مرتب: میر نفیس پسر میر انیس)	خورشید احمد (مبصر)	اپریل ۱۹۶۵	۵۶
انتخاب نقص (اس کتاب میں انیس ودبیر کی شعری اغلاط جمع کی گئی ہیں)	عبد الغفور نساخ	۱۸۷۷	.. .. ..
انیس (انیس کے کلام کی تدریجی ترقی اور ان کے فن کے ارتقا کا جائزہ)	سفارش حسین رضوی	مکتبہ جامعہ۔ دہلی ۱۹۵۹	.. .. ..
انیس (مشمولہ کتاب کا نام: چند ممتاز شعراء)	صفی مرتضی	.. ..	.. .. ..
انیس (بچوں کے لیے کتابچہ)	محمد حسین حسان	دہلی ۱۹۶۵	.. .. ..
انیس۔ سوانح / مصنف نیر مسعود (نیا دور لکھنؤ)	وقار ناصری (مبصر)	ستمبر ۲۰۰۳	۵۰ - ۵۱
انیس۔ اردو کا بے نظیر مرثیہ گو (مشمولہ کتاب: سو بڑے لوگ	فیروز اینڈ سنس لاہور (مرتب)	۱۹۶۰	.. ..
انیس اکیسویں صدی کے مذہبی تناظر میں (عالمی میر انیس سمینار۔ کناڈا)	ہلال نقوی	۲۰۰۲	۵۷ - ۷۷
انیس اور اقبال (انیس نمبر۔ ماہ نو۔ کراچی)	وقار عظیم	۱۹۷۲	.. .. ..
انیس اور امیر کا ابتدائی اور انتہائی کلام (نگار لکھنؤ)	شوکت بلگرامی	اکتوبر ۱۹۵۱	.. .. ..
انیس اور رباعی (آجکل۔ دہلی)	شبیہ الحسن	جولائی ۱۹۷۵	۱۶ - ۲۰
انیس اور شیکسپیئر۔ انگریزی زبان میں (کتاب)	غلام امام	۱۹۵۱	.. .. ..

انیس اور شیکسپیئر: ایک موازنہ (معارف اعظم گڑھ)	ادارہ	اکتوبر ۱۹۵۱	.. .. ..
انیس اور عصر حاضر (مشمولہ کتاب: ادب میں ابہام اور اس کے مسائل)	سلیمان اطہر جاوید	..	.. .. ..
انیس اور فردوسی کا تقابلی مطالعہ (کتاب)	فدا حسین	۱۹۸۸/۱۹۹۵	.. .. ..
انیس اور مداحی شبیر (ماہ نو کراچی)	قدرت نقوی	نومبر ۱۹۶۵	.. .. ..
انیس اور مسدس (آجکل دہلی)	اکبر حیدری کشمیری	انیس نمبر جون ۱۹۷۵	۵۵-۵۱
انیس: ایک مصلح (انیس نمبر ماہ نو کراچی)	فضل قدیر	۱۹۷۲	.. ..
انیس: ایک مطالعہ (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	اعجاز حسین	فروری ۱۹۷۲	.. ..
انیس: ایک مطالعہ (مشمولہ کتاب کا نام: ادب اور ادیب)	اعجاز حسین	..	.. ..
انیس: ایک مطالعہ (نگار لکھنؤ)	اعجاز حسین	جون ۱۹۵۷	.. ..
انیس: ایک مطالعہ (مشمولہ کتاب کا نام: نقوش تنقید)	عابدی شہناز ابن حسن	..	— ..
انیس اینڈ شیکسپیئر/ مصنف سید غلام امام اثر (آجکل دہلی)	عرش ملسیانی (مبصر)	اپریل ۱۹۵۱	.. ..
انیس پر ایک سرسری نظر (زمانہ کانپور)	وصی رضا	ستمبر ۱۹۳۶	۱۲۹
انیس ترقی پسند شاعری کے پیش رو (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد فاطمی	گوشہ دبستانی ادب نومبر ۲۰۱۳	۴۴-۱۳-۱۰
انیس/ سوانح۔ مصنف نیر مسعود (سب رس حیدرآباد)	سلیمان اطہر جاوید	جون ۲۰۰۳	۹۷
انیس سے چکبست تک (ساقی کراچی)	ممتاز احمد	ستمبر ۱۹۶۲	.. ..
انیس سے قبل لکھنؤ کی مرثیہ گوئی (علی گڑھ میگزین)	سید وقار حسن	۱۹۶۱ - ۱۹۵۹	— ..
انیس: شخصیت اور فن (کتاب)	فضل امام رضوی	۱۹۸۴	— ..
انیس شناسی (کتاب)	فضل امام رضوی	۱۹۸۱	— —
انیس شناسی (نیا دور۔ کراچی)	گوپی چند نارنگ	۱۹۸۱	۲۹۰ ..
انیس شناسی اور خانوادۂ ادیب (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش	جنوری ۲۰۰۸	۲۳ - ۲۰
انیس کا بہترین شاہکار (اسلوب لاہور)	سید نذر عسکری	جولائی ۱۹۵۹	.. —
انیس کا تاریخی ماحول اور شخصیت (انیس نمبر ماہ نو کراچی)	مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی	۱۹۷۲	.. ..
انیس کا درد دولت (نیا دور لکھنؤ)	مرزا کوکب قدر	مارچ ۲۰۰۲	۱۶ - ۱۳
انیس کا شعور فن (کتاب)	حسن مثنیٰ	انعم پبلی کیشنز کراچی	.. ..
انیس کا عہد: مرثیے کا انتہائی عروج (رہنمائے دکن حیدرآباد)	ادارہ	۲۰ جنوری ۱۹۷۵	— —
انیس کا غم (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	سید عبداللہ	۱۹۷۲	— —
انیس کا غیر مطبوعہ کلام (آجکل۔ دہلی)	نائب حسین نقوی	انیس نمبر جون ۱۹۷۵	۶۱ - ۵۶
انیس کا فلسفہ حیات (آجکل دہلی)	وحید اختر	انیس نمبر جون ۱۹۷۵	۴۷ - ۴۲
انیس کا نظریۂ فن (افکار کراچی)	رشید ادیب	۳۰ مارچ ۱۹۶۹	— —

انیس کی انفرادیت (مشمولہ کتاب: تنقیدی افکار	سلیمان اطہر جاوید	-- ..	.. ..
انیس کی جذبات نگاری (آجکل۔ دہلی)	مسیح الزماں	اپریل ۱۹۶۹	۱۵ - ۲۱
انیس کی ڈرامہ نگاری (انیس نمبر۔ ماہ نو۔ کراچی)	شان الحق حقی	۱۹۶۷	.. ..
انیس کی رزمیہ شاعری (انیس نمبر۔ ماہ نو۔ کراچی)	حسنین کاظمی	۱۹۶۷	.. ..
انیس کی رزمیہ شاعری (تہذیب الاخلاق لاہور)	غلام حیدر کشمیری	جنوری۔ مارچ ۱۹۶۷	.. ..
انیس کی زبان اور فن (طلایہ حیدرآباد)	مسعود حسین خاں	دسمبر ۱۹۶۵	.. ..
انیس کی شاعری (کتاب)	شہید صفی پوری	۱۹۶۸	.. ..
انیس کی شاعری کا سماجی مقصد (مشمولہ کتاب: ادبی مطالعے)	راج بہادر گوڑ	--	.. ..
انیس کی علمیت (آجکل۔ دہلی)	اعجاز حسین	انیس نمبر جون ۱۹۷۵	۷ - ۱۰
انیس کی فکری اساس (نیا دور لکھنؤ)	جعفر رضا	نومبر ۲۰۱۲	۳ - ۹
انیس کی مرثیہ گوئی۔ اردو نظم کی تاریخ میں (شبخون۔ الہ آباد)	صدیق الرحمٰن قدوائی	جولائی ۲۰۰۴	۱۷ - ۲۰
انیس کی مرثیہ گوئی کا تہذیبی شعور (سہیل۔ کولکاتا)	سمی	نومبر۔ دسمبر ۲۰۱۶	۱۸ - ۲۱
انیس کی مرثیہ نگاری (مجلہ سیفیہ جلد اول۔ بھوپال)	ابو محمد سحر	۱۹۶۱ - ۱۹۶۲	.. ..
انیس کی مرثیہ نگاری / مصنف جعفر علی خاں اثر لکھنوی (آجکل دہلی)	عرش ملسیانی (مبصر)	اگست ۱۹۵۱	.. ..
انیس کی مرثیہ نگاری (نگار لکھنؤ)	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	مارچ جون ۱۹۵۰	.. ..
انیس کی مرثیہ نگاری (مضمون)	شبلی نعمانی	دسمبر ۱۹۶۲	.. ..
(کتاب کا نام: اردو کے کلاسیکی شعراء۔ جلد دوم) مرتب ایم حبیب خاں			
انیس کی مرثیہ نگاری (مشمولہ کتاب: اردو کے کلاسیکی شعراء۔ جلد دوم)	ضیا احمد بدایونی	..	.. ..
انیس کی مرثیہ نگاری اور ان پر چند اعتراضات کا جواب (کتاب)	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۱۹۵۱	.. ..
انیس کی مرثیہ نگاری اور فاروقی صاحب (نگار لکھنؤ)	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	اپریل، مئی ۱۹۵۰	
انیس کی معجز بیانی۔ تہذیبی جہات (عالمی میر انیس سیمینار۔ کناڈا)	گوپی چند نارنگ	۲۰۰۲	۲۱ - ۲۷
انیس کی منظر نگاری (آجکل دہلی)	صالحہ عابد حسین	انیس نمبر جون ۱۹۷۵	۱۶ - ۲۰
انیس کی منظر نگاری (مشمولہ کتاب: میر انیس سے تعارف)	صالحہ عابد حسین	نومبر ۱۹۷۵	۷۷ - ۸۸
انیس کی منظر نگاری (قندیل۔ لاہور	ممتاز علی	۲۸ اپریل ۱۹۶۳	.. ..
انیس کی وفات پر دبیر کا قطعہ تاریخ (اورینٹل کالج میگزین لاہور)	مظفر حسین ملک	جنوری ۱۹۶۴	.. ..
انیس کے ایک مرثیہ کا تجزیہ (المنتظر۔ لاہور	باقر زیدی	۲۰ رجولائی ۱۹۶۸	.. ..
انیس کے ایک مرثیہ کا تجزیہ (علی گڑھ میگزین)	باقر زیدی	۱۹۶۶ - ۱۹۶۷	.. ..

انیس کے تین بند: ایک مطالعہ (آجکل۔ دہلی)	مرزا جعفر حسین	جولائی ۱۹۷۵	۲۶۔۳۰
انیس کے دس بند (مشمولہ کتاب: ادبیات وشخصیات)	مرزا جعفر حسین	--	.. ..
انیس کے دو استعارے (آجکل۔ دہلی)	سیدہ جعفر	جنوری ۱۹۸۲	۳۔۸
انیس کے سلاموں میں اخلاقی اقدار (نیا دور لکھنؤ)	مسز عسکری جعفر	نومبر ۲۰۱۲	۱۰۔۱۱۔۱۸
انیس کے متعلق بعض غلط فہمیوں کا ازالہ (عالمی میر انیس سیمینار کناڈا)	اکبر حیدری کشمیری	۲۰۰۲	۴۶۔۵۳
انیس کے متبعین حیدرآباد میں (سیاست۔ حیدرآباد)	رشید موسوی	۲۴ جون ۱۹۶۲	.. ..
انیس کے مراثی میں نسوانی کردار۔۱ (نیا دور۔ لکھنؤ)	جاوید احمد کاظمی	جنوری ۲۰۰۷	۴۔۹
انیس کے مراثی میں نسوانی کردار۔۲ (نیا دور لکھنؤ)	جاوید احمد کاظمی	فروری ۲۰۰۷	۱۶۔۱۹
انیس کے مرثیوں کا سماجی تجزیہ (نیا دور لکھنؤ)	سید محمد عقیل	مئی ۱۹۶۴	۴۲۔۴۸
انیس کے مرثیوں کا سماجی تجزیہ (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	سید محمد عقیل	۱۹۷۲	.. ..
انیس کے مرثیوں کا سماجی تجزیہ (مشمولہ کتاب: سماجی تنقید اور تنقیدی عمل)	سید محمد عقیل	..	.. ..
انیس کے مرثیوں میں آغاز داستان (مشمولہ کتاب: عرض ہنر)	محمد حسن	..	.. ..
انیس کے مرثیوں چند رجائی پہلو (مرثیہ نمبر۔ خیاباں لکھنؤ)	وقار عظیم	اپریل مئی ۱۹۳۴	.. ..
انیس کے مرثیوں میں ہندوستانی تہذیب (نیا دور لکھنؤ)	زیب النساء خاں	مارچ ۲۰۰۳	۱۳۔۱۴
انیس کے مرثیے۔ جلد دوم/ مصنفہ: صالحہ عابد حسین	سعید شہیدی (مبصر)	۹ مارچ ۱۹۸۱ء	.. ..
انیس مرثیہ اور اسلام (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	زاہد فاروقی	۱۹۷۲	.. ..
انیس و دبیر (مشمولہ کتاب: اردو کے ادبی معرکے)	امیر حسن نورانی	..	.. ..
انیس و دبیر (سب رس۔ حیدرآباد)	تسنیم ربانی	مارچ ۱۹۳۸	.. ..
انیس و دبیر (کتاب)	محمد طاہر فاروقی	۱۹۶۱	.. ..
انیس و دبیر (ادبی معرکہ نمبر۔ فروغ اردو لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	جنوری فروری ۱۹۵۶	.. ..
انیس و دبیر کے متحد المضمون مرثیے (مضمون) (کتاب کا نام: فن تنقید اور تنقیدی مضامین/ مرتب نجم الہدیٰ)	شبلی نعمانی	..	.. ..
انیسیات۔ تحقیقی مضامین/ مصنف مسعود حسن رضوی ادیب (نیا دور لکھنؤ)	ساحر لکھنوی (مبصر)	مئی ۱۹۷۷	۴۸
اودھ میں اردو مرثیہ/ مصنف: ریاض الہاشم (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش (مبصر)	نومبر ۲۰۱۴	۴۴۔۴۵
اودھ میں جدید دور کے مرثیے کی صورتحال (نیا دور لکھنؤ)	ریاض الہاشم	جنوری ۲۰۰۹	۲۵۔۲۹
ایک شاعری اور انیس (صحیفہ لاہور)	صفدر حسین	جولائی ۱۹۶۴	۹۔۵۹

عنوان	مصنف	سنہ / مقام		
ایشیائی شاعری (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	امجد علی اشہری	۱۹۰۴	--	..
ایک غیر مطبوعہ مرثیہ (ادراک۔ گوپال پور	جمیل مظہری	شمارہ نمبر ۴	۱۸۰ -	۱۸۶
ایک مرثیہ کا علمی اور تجزیاتی مطالعہ (مشمولہ کتاب: سماجی تنقید)	سید محمد عقیل	--	--	..
باتیں ان کی یاد رہیں گی۔	محمد عبداللہ قریشی	۱۹۷۲	"	..
(انیس کی زندگی کے واقعات (انیس نمبر۔ ماہ نو)				
بازیافت (تحریر دہلی)	علی جواد زیدی	اپریل جون ۱۹۷۰	..	,,
(مکتوب افضل حسین ثابت رضوی بنام سید کرار حسین جس میں انیس و دبیر کی سادات، عمر اور تقدم شہرت کی بحث ہے)				
بزم انیس (کتاب)	رئیس امروہوی	۱۹۶۲	..	..
بزم سخن (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	علی حسن خاں	بھوپال ۱۲۹۷ھ	..	,,
بہار کے مرثیہ گو (مشمولہ کتاب: ذکر و فکر)	ذکی الحق	..	..	..
بہار میں مرثیہ نگاری (مشمولہ کتاب: قدر و نظر)	اختر اورینوی	..	--	..
بیجاپور کے چند مرثیہ گو شعراء (مشمولہ کتاب: بجھتے چراغ)	محمد اکبر الدین صدیقی	..	--	-
پروفیسر نیر مسعود کی گرانقدر تالیف، انیس کا جائزہ (فیضانِ ادب مئو)	وسیم حیدر ہاشمی	جولائی دسمبر ۲۰۱۶	۴۳ -	۹۳
پیام زندگی (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	تاجور نجیب آبادی	-	--	..
پیکر تراشی اور انیس (مخصوص مرثیہ کے حوالے سے) (نیا دور لکھنؤ)	عباس رضا نیر	دسمبر ۲۰۱۱	۲۰ -	۲۸
تاجدار مرثیہ۔ انیس (مشمولہ کتاب: حرف ادب)	شجاعت علی سندیلوی	--	..	..
تاریخ ادب اردو (اس کتاب میں میر انیس کا تذکرہ ہے	رام بابو سکسینہ	نول کشور لکھنؤ ۱۹۲۹	..	-
تاریخ ادب ہندوی و ہندوستانی (فرانسیسی / اس میں انیس کا تذکرہ ہے)	گارساں دتاسی	طبع دوم پیرس ۱۹۷۰	..	..
تاریخ صحافت اردو (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	امداد صابری	..	..	..
تاریخ عزاداری (سرفراز لکھنؤ)	مصطفیٰ حسن رضوی (مرتب)	مارچ ۱۹۶۹	۲۷۶	
تاریخ مرثیہ گوئی (کتاب)	حامد حسن قادری	دہلی ۱۹۷۳	,,	..
تاریخ نظم اردو (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	نظیر لدھیانوی	-	..	..
تاریخ نظم و نثر (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	آغا محمد باقر	..	..	--
تجزیہ، مرثیہ یادگار انیس / مصنف تقی عابدی (ہماری زبان دہلی)	اکبر حیدری کشمیری	یکم ۷ فروری ۲۰۰۳	۸	..
تجلیات (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عزیز لکھنوی	لکھنؤ ۱۹۲۵		
تحقیقی مطالعہ انیس (کتاب)	ظہیر احمد صدیقی	--	..	--
تذکرہ انیس صاحب مرحوم لکھنوی اور ان کا خاندان (کتاب)	حفیظ الدین احمد مزاج دہلوی	۱۹۰۷	,,	--
تذکرہ خوش معرکہ زیبا / مرتب مشفق خواجہ (مجلس ترقی ادب لاہور)	سعادت خان ناصر	اپریل ۱۹۷۰	-	--

تذکرہ معرکۂ سخن (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عبدالباری آسی	١٩٣٣	.. ..
تذکرۂ نادر (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	کلب حسین خاں نادر	لکھنؤ ١٢٨٣ھ	.. ..
تردید موازنہ (یہ کتاب موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں لکھی گئی)	شیخ حسن رضا	١٩٠٩	.. ..
تردید موازنہ (یہ کتاب موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں لکھی گئی)	شیخ محمد جان	١٩٠٩	.. ..
تطہیر الاوساخ (نساخ کے رسالۂ 'انتخاب نقص' کے جواب میں لکھی گئی)	مرزا محمد رضا معجز	١٨٧٩	.. ..
تعارف مرثیہ (کتاب)	شجاعت علی سندیلوی	دہلی ١٩٥٩	.. ..
تعزیے: شاہی اور عوامی (مشمولہ کتاب: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار)	مرزا جعفر حسین	ترقی اردو بیورو دہلی ١٩٨١	٣٤٠ - ٣٤٩
تفضیح (نساخ کے رسالۂ انتخاب نقص کے جواب میں لکھی گئی)	آغا علی سید	١٨٧٩	.. ..
تفہیم انیس (شبخون الٰہ آباد)	شمس الرحمٰن فاروقی	اکتوبر ٢٠٠٣	٢٧ ..
تقسیم تبرک محرم میں (مشمولہ کتاب: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	(مرزا جعفر حسین	ترقی اردو بیورو دہلی ١٩٨١	٣٦٦ - ٣٧٣
تلگو عوامی مرثیے (سیاست حیدرآباد	اودیش رانی	٢٠ ستمبر ١٩٨٠	.. ..
تنقید آب حیات (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	محمد رضا ظہیر	.. ..	.. ..
تنقیدی مقالات (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	محی الدین قادری زور	.. ..	.. ..
تین شاعر: میر تقی میر، میر انیس، ورڈس ورتھ (کتاب)	محی الدین قادری زور	حیدرآباد ١٩٢٦	.. ..
ثانی انیس۔ میر ہادی وحید (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش	گوشۂ رثائی ادب نومبر ٢٠١٣	١٨ - ٢٣
جانشین میر انیس میر نفیس (نیا دور لکھنؤ) (اس مضمون کے آخر میں میر انیس کا شجرہ بھی دیا گیا ہے)	علی احمد دانش	دسمبر ٢٠٠٩	٨ ١١
جدید اردو مرثیہ (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش	فروری ٢٠٠٧	٢٠ - ٢٣
جدید اردو مرثیہ نگاری۔ اجمالی جائزہ / از فضل امام رضوی (نیا دور لکھنؤ	تجسس اعجازی (مبصر)	نومبر ٢٠١٤	٤٢ - ٤٣
جدید مرثیہ اور میراثِ انیس (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی	محمد رضا کاظمی	١٩٧٢	.. ..
جدید مرثیے کا باقی میر ضمیر / مصنف علی جواد زیدی (نیا دور لکھنؤ	مجاور حسین رضوی (مبصر)	ستمبر ٢٠٠٠	٤١ - ٤٣
جذبات اودان کا شاعرانہ اظہار (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنو)	سید فدا حسین	فروری ١٩٧٢	.. ..
جلوس ہائے محرم و چہلم (مشمولہ کتاب۔ قدیم لکھنؤ کی آخری بہار)	مرزا جعفر حسین	ترقی اردو بیورو دہلی ١٩٨١	٣٤٩ - ٣٥٩
جلیس۔ وارث میر انیس۔ غزل کے آئینے میں (نیا دور لکھنؤ	تجسس اعجازی	اپریل نومبر ١٩٨٦	٣٤ - ٣٩
جمیل مظہری اور جدید اردو مرثیہ (نیا دور لکھنؤ)	جمال شبیر	دسمبر ٢٠٠٩	٢٨ ٣٢
جمیل مظہری کے مرثیے (نیا دور لکھنؤ)	ریاض احمد فردوسی	مارچ ٢٠٠٣	١٥ - ١٩ - ٢٠
جواہرات انیس۔ میر انیس کے ٢٥ مراثی کا انتخاب (کتاب)	امیر علی جونپوری (مرتب)	اردو پبلشرز لکھنؤ ١٩٧٢	.. ..
جواہر سخن جلد چہارم (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے	مبین کیفی	الٰہ آباد ١٩٦٩	.. ..
جوش اور نیا اردو مرثیہ (نیا دور لکھنؤ)	علی سلمان رضوی	دسمبر ٢٠٠٩	٢٦ - ٢٧

عنوان	مصنف	تاریخ	صفحات
جوشؔ کا مرثیہ۔ آوازِ حق ایک تجزیاتی مطالعہ (نیا دور لکھنؤ)	تاذیہ جعفری	گوشۂ رثائی ادب نومبر ۲۰۱۳	۲۷ - ۳۹
جہادِ حق مراثی / مصنف۔ مضطر جونپوری (نیا دور لکھنؤ)	فضل امام رضوی (مبصر)	مئی ۲۰۱۴	۴۱ - ۴۳
چہرہ۔ انیسؔ کے ایک غیر مطبوعہ مرثیہ میں سے۔ (مرثیہ نمبر۔ خیابان لکھنؤ)	ادارہ	اپریل مئی ۱۹۳۴	.. ..
حسین اور عصرِ حاضر (سیاست حیدرآباد)	مجاور حسین رضوی	۱۹؍ نومبر ۱۹۸۰	.. ..
حضرت عباس کا کردار اور انیسؔ کے مرثیے (مشمولہ کتاب: تین شاعر)	محی الدین قادری زور	..	.. ..
حضرت قاسم اور انیسؔ کی سحر نگاری (ملاپ حیدرآباد)	نور الحسن	۱۵؍ مئی ۲۰؍ مئی ۱۹۶۴	.. ..
حیاتِ انیسؔ (یہ کتاب شبلی نعمانی کی فرمائش پر لکھی گئی)	امجد علی اشہری	۱۹۰۷	.. ..
حیاتِ انیس کے چند ورق (صد سالہ یادگار انیس۔ کراچی)	مرزا محمد جعفر	۱۹۷۱	.. ..
حیاتِ مرثید (کتاب)	آغا اشہر	۱۹۹۲	.. ..
حیدرآباد کا محرم (سیاست حیدرآباد)	کے کرشنا سوامی مدیر آج	۱۷؍ مئی ۱۹۶۵	.. ..
حیدرآباد کا محرم اور قومی یک جہتی (سیاست حیدرآباد)	راحت عزمی	۱۹؍ نومبر ۱۹۸۰	.. ..
حیدرآباد میں انیسؔ کی مجلسیں (ملاپ حیدرآباد)	نور الحسن	۱۵؍ اپریل / ۴؍ مئی ۱۹۶۴	.. ..
حیدری مرثیہ گو (نیا دور لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	اسپیشل نمبر اگست ۱۹۶۳	۱۳ - ۱۹
حیدری مرثیہ گو (نیا دور لکھنؤ)	رضوان احمد خاں	دسمبر ۱۹۷۸	۳۲ - ۳۶
خاندانِ انیس کے باکمال شعراء (انیس نمبر۔ ماہِ نو کراچی)	ذوالفقار حسین	۱۹۷۲	.. ..
خاندانِ انیس کے چند نامور شعراء۔ مونسؔ نفیسؔ، وحید (افکار کراچی)	مجتبیٰ حسین	ستمبر، نومبر ۱۹۵۹	.. ..
خاندانِ شمیم کی مرثیہ گوئی / مصنف عظیم امروہوی (ایوانِ اردو۔ دہلی)	مرغوب حیدر عابدی (مبصر)	مارچ ۲۰۱۰	۵۷
خانوادۂ میر انیسؔ کی آخری شمع: میر ہاشم حسین حزیںؔ (نیا دور لکھنؤ)	علی محمد واثق	جنوری ۱۹۶۸	۳۱ - ۳۴
خدائے سخن: میر انیس (صد سالہ یادگار انیس۔ کراچی)	صابرہ سجادیانی	مارچ ۱۹۷۱	.. ..
خطباتِ نشتران۔ خطبات و تقاریر (اس کتاب میں انیسؔ کا تذکرہ ہے)	سندر نرائن	..	.. ..
خطوط بسلسلۂ انیسؔ و غالبؔ (صلائے عام۔ دہلی)	مرزا سعید الدین احمد	اکتوبر ۱۹۰۸	.. ..
خمخانۂ جاوید۔ جلد اول (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	لالہ سری رام	لاہور ۱۹۰۸	.. ..
خواتینِ کربلا: کلامِ انیسؔ کے آئینے میں (کتاب)	صالحہ عابد حسین	مکتبہ جامعہ۔ دہلی ۱۹۷۲	.. ..
دبستانِ دبیر (اس کتاب میں انیسؔ کا بھی تذکرہ ہے)	ذاکر حسین فاروقی	نسیم بکڈپو لکھنؤ۔ ۱۹۶۶	.. ..
دبستانِ عشق کی مرثیہ گوئی / مصنف: جعفر رضا (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش (مبصر)	جون ۲۰۱۴	۴۴ - ۴۵
دبیر اور ان کی مرثیہ گوئی (نیا دور لکھنؤ)	محمد نسیم الدین فریس	اپریل ۲۰۰۳	۱۹ - ۲۳

عنوان	مصنف	تاریخ	صفحات
دبیر اور موازنۂ انیس و دبیر (مشمولہ کتاب: ذکر و فکر)	گیان چند جین	..	.. ..
دبیر کی رباعی اور انیس کا شعر (مشمولہ کتاب: آئینۂ سخن)	مسعود حسن رضوی ادیب	..	.. ..
دبیر کی مرثیہ گوئی: بعض نمایاں پہلو (نیا دور لکھنؤ)	ضیاء الدین اصلاحی	مارچ ۲۰۰۶	۳-۱۰
دربار حسین (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	ثابت لکھنوی	۱۹۲۲	....
دکن کا ایک قدیم مرثیہ / مصنف شاہ برہان الدین جانم (نیا دور لکھنؤ)	رشید موسوی	جون ۱۹۶۹	۱۷-۱۸
دکن کے بعض مرثیہ گو (مشمولہ کتاب: مقالات ہاشمی)	نصیر الدین ہاشمی	..	.. ..
دکن میں مرثیہ اور عزاداری / مصنف رشید موسوی (سیاست حیدرآباد)	میر حسن (مبصر)	۱۵ مارچ ۱۹۷۱	.. ..
دیگر مرثیہ گو کا مذہب اور ہندوؤں کے اسلامی نام (نیا دور لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	جولائی ۱۹۶۲	۳-۷
دوارکا پرشاد افق کی عزائی شاعری (نیا دور لکھنؤ)	شبیہ صغریٰ	افق نمبر ستمبر ۲۰۱۴	۱۴۲-۱۴۳
دہلوی مرثیہ گو -۱ (کتاب)	علی جواد زیدی	۱۹۸۶	.. ..
دہلوی مرثیہ گو -۲ (کتاب)	علی جواد زیدی	۱۹۸۷	.. ..
دیوان رباعیات انیس: چند باتیں (نیا دور لکھنؤ)	وقار ناصری	رثائی ادب نمبر اکتوبر ۲۰۱۵	۹-۱۵-۶۳
ذخیرۂ مسعود حسن رضوی کے قلمی مرثیے (فکر و نظر علی گڑھ)	محمود حسن قیصر امروہوی	جنوری، مارچ ۲۰۰۳	۳۸-۵۳
ذوق کا ایک نایاب مرثیہ (نیا دور لکھنؤ)	نور السید اختر	جنوری ۱۹۷۴	۸،۱۰،۱۹
رام پور میں رثائی ادب کی روایت (نیا دور لکھنؤ)	محمد ارشد رضوی	مارچ ۲۰۰۶	۱۸-۲۲
رباعیات انیس (مخزن لاہور)	شیخ عبدالقادر	دسمبر ۱۹۰۶	۳۸
رام پور میں مرثیہ نگاری (رضا لائبریری جرنل)	محمد ارشد رضوی	شمارہ ۱۶-۱۷ ۲۰۰۹	۴۵-۵۹
رباعیات انیس (مصنف کتاب: سید تقی عابدی / نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش (مبصر)	نومبر ۲۰۱۳	۴۴-۴۵
رباعیات انیس کی تحقیق و تدوین (ہماری زبان دہلی)	محمد نسیم الدین فریس	۸، ۱۴ فروری ۲۰۰۴	۱
رباعیات رشید اور احوال بیری (نیا دور لکھنؤ)	علی امام زیدی گوہر لکھنوی	اپریل ۲۰۱۵	۶-۹
رد واقعات انیس (واقعات انیس از احسن لکھنوی کی اغلاط بتائی گئی ہیں)	سردار مرزا	۱۹۰۹	.. ..
رد واقعات انیس (کتاب)	نواب میرزا صاحب	لکھنؤ ۱۳۲۶ھ	.. ..
رزم نامۂ انیس (انیس کے کلام رزمیہ کا انتخاب مسلسل بیان کی شکل میں)	مسعود حسن رضوی ادیب	لکھنؤ ۱۹۵۰	.. ..
رزم نامۂ دبیر (اس کتاب میں انیس کا بھی تذکرہ ہے)	جبیر لکھنوی	..	.. ..
رزمیہ اور میر انیس (نگار لکھنؤ)	سید محمد عقیل	نومبر ۱۹۵۴	.. ..
رزمیہ شاعری اور میر انیس کا ایک مرثیہ (نیا دور لکھنؤ)	اکبر حیدری کشمیری	دسمبر ۱۹۶۶	۳۸-۴۳
روح انیس (۷ مرثیے ۱۵ سلام ۳۵ رباعیات کا انتخاب)	مسعود حسن رضوی ادیب	لکھنؤ ۱۹۳۱	.. ..
روح انیس۔ از مسعود حسن رضوی ادیب (زمانہ کانپور)	ادارہ (مبصر)	اگست ۱۹۳۳	.. ..

سانحہ کربلا: ایک درس عبرت (فکر اسلامی۔ لبیتی)	عزیز اختر کاظمی	مارچ اپریل ۲۰۰۴	۲۶ - ۲۸
سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ (کتاب)	گوپی چند نارنگ	۱۹۸۶/ ۱۹۹۱	.. ..
سہل انیس: میر انیس کے مرثیوں میں مضمر طرز سخن (عالمی انیس سمینار)	سید تقی عابدی	۲۰۰۲	۱۲۵ - ۱۵۳
سخن شعراء (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عبدالغفور نساخ	نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۱ھ	.. ..
سلام انیس پر ایک نظر (مخزن لاہور)	آغا حسین ارسطو جاہی	مارچ ۱۹۵۱	.. ..
سنان دلخراش (نساخ کے رسالے "انتخاب نقص" کا جواب)	منیر شکوہ آبادی	۱۸۷۹	.. ..
سودا کے مرثیے (نیا دور لکھنؤ)	مسیح الزماں	جنوری ۱۹۶۰	۲۷ - ۳۱
سیماب کی عزائی شاعری (نیا دور لکھنؤ)	فرحت زہرا	رثائی ادب نمبر نومبر ۲۰۱۴	۳۵ - ۳۸
شاہکار انیس (کتاب)	مسعود حسن رضوی ادیب	..	.. ..
شبلی کی موازنہ انیس و دبیر (ساقی کراچی)	محمد احسن فاروقی	مارچ ۱۹۵۴	.. ..
شبلی کی موازنہ انیس و دبیر ایک فرد پر تنقید (مشمولہ۔ اردو مشمولہ میں تنقید)	محمد احسن فاروقی	..	.. ..
شبلی۔ موازنہ کی روشنی میں (مشمولہ کتاب۔ معیار و میزان)	مسیح الزماں	..	.. ..
شعر الہند جلد دوم (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عبدالسلام ندوی	اعظم گڑھ ۱۹۲۵	.. ..
شمالی ہند میں اردو مرثیہ کا ارتقا (اصناف سخن نمبر۔ نگار لکھنؤ)	صفدر حسین	سالنامہ ۱۹۵۷	۹۵ - ۱۱۱
شمالی ہند میں اردو مرثیہ کا ارتقا (نگار لکھنؤ)	صفدر حسین	۱۹۵۷	.. ..
شمیم سخن ۱۲ مرثیے (مصنف کتاب اعظیم امروہوی/ نیا دور لکھنؤ)	رئیس حسین (مبصر)	اپریل ۲۰۱۲	۴۴ - ۴۵
شیراز ہند (جونپور) کے عقیدتمندان انیس (نیا دور لکھنؤ)	عارف حسین جونپوری	فروری ۲۰۰۸	۳۵ - ۳۶
صحیفہ تاریخ اردو (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	مخمور اکبر آبادی	آگرہ ۱۹۴۶	.. ..
صد سالہ یادگار انیس (کتاب)	ضمیر اختر نقوی (مرتب)	کراچی ۱۹۷۱	.. ..
ضمیر لکھنوی اور ان کا کلام۔ مرثیہ کے حوالے سے (نیا دور لکھنؤ)	علی جواد زیدی	مارچ ۱۹۶۴	۵ - ۱۵ - ۲۰
طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس (شاعر آگرہ)	کسری منہاس	نومبر ۱۹۴۶	.. ..
عالمی ادب اور انیس (محور کراچی)	احتشام حسین	مئی ۱۹۶۴	.. ..
عروس سخن۔ جواہرات انیس (کتاب)	بیگم سید عابد رضا ہمایوں	--	.. ..
عصر جدید اور عزائیہ شاعری (مشمولہ۔ اردو شاعری کی ہندوستانی روح)	زرینہ ثانی	۱۹۶۷	۳۱ - ۴۳
عکس زاد۔ رثائی شاعری (مصنف علی احمد دانش/ نیا دور لکھنؤ)	نیر مسعود (مبصر)	جون ۱۹۹۰	۴۶ - ۴۷
علامہ رشید ترابی کی تقریر میں انیس کا تذکرہ (صد سالہ یادگار انیس لکھنؤ)	سید محمد عابدی	مارچ ۱۹۷۱	.. ..
علی سردار جعفری اور مرثیہ نگاری (نیا دور لکھنؤ)	جاوید احمد کاملوی	دسمبر ۲۰۰۹	۳۳ - ۳۵
علی سردار جعفری کی مرثیہ نگاری (نیا دور لکھنؤ)	اکبر علی	سردار جعفری نمبر مارچ ۲۰۱۴	۵۷ - ۵۸
علی سردار جعفری کے چند مرثیے (نیا دور لکھنؤ)	حبیب نثار	جون ۲۰۰۵	۲۹ - ۳۳

عنوان	مصنف	تاریخ	صفحات
عہد حاضر کا ایک عظیم مرثیہ گو شادؔ لکھنوی مرحوم (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش	دسمبر ۱۹۷۸	۲۰ - ۳۰
فردوسیِ ہند میر انیس (کتاب)	صفدر آہ	..	.. ..
فکر انیس (کتاب)	مرتضیٰ حسین فاضل	۱۹۶۹	.. ..
فکر انیس (کتاب)	منظور علی علوی	..	.. ..
فکر انیس از منظور علی علوی (شہاب لاہور)	ادارہ (مبصر)	۹ر جون ۱۹۶۳	.. ..
فن کی جانچ: اردو میں مرثیہ نگاری کا جائزہ (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	سیدہ جعفر	فروری ۱۹۷۲	.. ..
قدیم اردو اور سانحہ کربلا (رہنمائے دکن حیدرآباد)	محمد چراغ علی	۱۲ر جون ۱۹۶۳	.. ..
قرآن اور حسین (مولف کتاب۔ عظیم امروہوی / نیا دور لکھنؤ)	عارف حسین (مبصر)	جنوری ۲۰۰۹	۴۵
کارنامہ انیس (کتاب)	صفدر حسین	۱۹۶۹	.. ..
کاشف الحقائق (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	امداد امام اثر	۱۸۹۷	.. ..
کچھ مشاہیر کے بارے میں: میر انیس (صحیفہ لاہور)	نائب حسین نقوی	جولائی ۱۹۶۵	۱۱۶
کربلا کی باتیں (مصنف کتاب: مرتضیٰ حسین / نیا دور لکھنؤ)	ریحان حسن (مبصر)	جنوری ۲۰۰۸	۴۵ - ۴۶
کربلا میں امام کی آواز (سیاست حیدرآباد)	مجاور حسین رضوی	۱۷ر اکتوبر ۱۹۸۳	.. ..
کردار اور افسانہ (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عبد القادر سروری	۱۹۲۶	.. ..
کلام انیس۔ اصلاح انیس (نیا دور۔ لکھنؤ)	علی احمد دانش	مئی ۲۰۰۱	۲۷ - ۳۶
کلام انیس اور اخلاقی قدریں (مشمولہ کتاب۔ میر انیس سے تعارف)	صالحہ عابد حسین	نومبر ۱۹۷۵	۸۹ - ۱۰۴
کلام انیس کا ایک پہلو (رہنمائے دکن حیدرآباد)	سیدہ جعفر	۲۱ر دسمبر ۱۹۸۲	.. ..
کلام انیس کی اشاعتوں میں غلطیاں (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	یوسف حسین شائق	۱۹۷۲	.. ..
کلام انیس میں آوازوں کا در و بست (آجکل۔ دہلی)	ظ انصاری	انیس نمبر جون ۱۹۷۵	۳۸ - ۴۱
کلام انیس میں آوازیں (صبح نو پٹنہ)	تقی احمد ارشاد	اگست ۱۹۵۹	.. ..
کلام انیس میں پیکر تراشی کا نظام (نیا دور لکھنؤ)	ابو الکلام قاسمی	مئی ۱۹۹۸	۱۳ - ۱۹ - ۲۰
کلام انیس میں پیکر تراشی کا نظام (فکر و نظر علی گڑھ)	ابو الکلام قاسمی	دسمبر ۲۰۰۴	۷ - ۱۸
کلام انیس میں تصوف کی چاشنی (صبح نو پٹنہ)	تقی احمد ارشاد	نومبر دسمبر ۱۹۷۲	.. ..
کلام انیس میں تغزل (نیا دور لکھنؤ)	سخی حسن نقوی	جولائی ۱۹۷۲	.. ..
کلام انیس میں خاک (نیا دور لکھنؤ)	محمد حسن کمال	گوشہ رثائی ادب نومبر ۲۰۱۳	۳۲ - ۳۵
کلام انیس میں عناصر چہارگانہ (عالمی میر انیس سیمینار، کناڈا)	انیس اشفاق	۲۰۰۲	۹۴ - ۱۲۲
کلام انیس میں ہندوستان (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش	اگست ۱۹۹۲	۲۱ - ۲۴
کلام انیس میں ہندوستانی تہذیب (مشمولہ کتاب: میر انیس سے تعارف)	صالحہ عابد حسین	نومبر ۱۹۷۵	۲۹ - ۴۴

کلید گنجینۂ انیس (انیس نمبر ماہ نو کراچی)	ضمیر اختر نقوی	۱۹۷۲	.. ..
کمال انیس (کتاب)	حامد حسن قادری	۱۹۴۴	.. ..
گزشتہ لکھنؤ (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عبدالحلیم شرر	..	.. ..
گل رعنا (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	عبدالحئی	اعظم گڑھ ۱۹۲۴	.. ..
گلستان سخن (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	مرزا قادر بخش صابر	نولکشور ۱۲۷۱ھ	.. ..
لکھنؤ کا دبستان شاعری (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	ابواللیث صدیقی	اردو مرکز لاہور ۱۹۴۱	.. ..
لکھنؤ کا رثائی ادب اور میر خلیق کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ (نیا دور لکھنؤ	اکبر حیدری کشمیری	اودھ نمبر اول فروری ۱۹۹۴	۶۷-۷۲
مجالس مرثیہ خوانی (مشمولہ کتاب: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار)	مرزا جعفر حسین	ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۱	۲۸۶-۳۲۱
مجالس و خواندگی (مشمولہ کتاب: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار)	مرزا جعفر حسین	ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۱	۲۵۹-۳۶۶
مجموعہ مراثی کا نایاب مخطوطہ (ایوان اردو۔ دہلی)	عبدالحق	جون ۲۰۱۴	۵-۸
محرم و چہلم (مشمولہ کتاب: قدیم لکھنؤ کی آخری بہار)	مرزا جعفر حسین	ترقی اردو بیورو۔ دہلی ۱۹۸۱	۲۲۳-۳۴۰
محمد شاکر ناجی کے مرثیے (نیا دور لکھنؤ)	علی جواد زیدی	جنوری ۱۹۷۱	۳-۸
مختصر تاریخ اردو ادب (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	اعجاز حسین	۱۹۵۶	.. -
مختصر تاریخ مرثیہ گوئی (کتاب)	علی عباس حسینی	..	.. ..
مذہب اور شاعری (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	اعجاز حسین	۱۹۵۵	.. -
مذہب پر انیس کے مرثیے کا اثر (مشمولہ کتاب تین شاعر)	محی الدین قادری زور	..	.. -
مراۃ الشعرا (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	محمد یحییٰ تنہا	۱۹۴۵	.. ..
مراثی انیس (کتاب)	سید علی حیدر نظم طباطبائی	۱۹۲۹	.. ..
مراثی انیس (اردو۔ اورنگ آباد)	نظام الدین حسین نظامی	اکتوبر ۱۹۲۱	.. ..
مراثی انیس از مولوی سید علی حیدر نظم طباطبائی (زمانہ کانپور)	ادارہ (مبصر)	جنوری ۱۹۳۰	.. -
مراثی انیس اور صبح عاشور (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	وزیر آغا	۱۹۷۲	.. ..
مراثی انیس اور ماحولیاتی تنقید (نیا دور لکھنؤ)	مولا بخش	دسمبر ۲۰۱۱	۱۰-۱۸-۳۴
مراثی انیس: ایک کلاسیک (آجکل پشاور)	انور خواجہ	۱۹۶۳	.. ..
مراثی انیس کا انگریزی ترجمہ (پرواز لندن)	رضا امام	ستمبر ۲۰۰۴	۲۳-۲۷
مراثی انیس کا تجزیاتی مطالعہ (کتاب)	سید تقی حسن نقوی	کراچی ۱۹۹۱	.. ..
مراثی انیس کی پذیرائی دیگر زبانوں میں (نیا دور لکھنؤ)	رئیس حسین	گوشہ رثائی ادب نومبر ۲۰۱۳	۱۴-۱۷
مراثی انیس کی خصوصیات۔ (مشمولہ کتاب: مضامین ہفت رنگ)	آفتاب اختر	.. ..	.. ..
مراثی انیس کی عصری معنویت (نیا دور لکھنؤ)	علی حیدر رضوی	اپریل مئی ۲۰۰۴	۲۰-۲۴

مضمون	مصنف	تاریخ	صفحات
مراثی انیس میں آویزش کی نوعیت (آجکل دہلی)	محمد حسن	انیس نمبر۔ جون ۱۹۷۵	۲۱-۲۴
مراثی انیس میں آویزش کی نوعیت (شمولہ کتاب: عرض ہنر)	محمد حسن	..	.. ..
مراثی انیس میں جذباتی تاویل (کتاب)	سلام سندیلوی	۱۹۷۱	.. ..
مراثی انیس میں جلوۂ حسن (نیا دور لکھنؤ)	مجاور حسین رضوی	فروری ۲۰۱۴	۳-۱۰
مراثی انیس میں خاندانی زندگی کی جھلکیاں (شمولہ: انیس سے تعارف)	صالحہ عابد حسین	نومبر ۱۹۷۵	۴۵-۷۶
مراثی انیس میں دردانگیزی (ادب لطیف لاہور)	صفی حیدر دانش	فروری مارچ ۱۹۵۳	.. ..
مراثی انیس میں دریا کے رنگ (نیا دور لکھنؤ)	انیس اشفاق	مئی ۲۰۰۶	۸-۱۵-۲۴
مراثی انیس میں ڈرامائی عناصر (شمولہ کتاب: ارمغان ادب)	اخلاق حسین عارف	..	.. ..
مراثی انیس میں ڈرامائی عنصر (کتاب)	شارب ردولوی	۱۹۵۹	
مراثی انیس میں ڈرامائی عنصر (مصنف، شارب ردولوی/نیا دور لکھنؤ)	ادارہ (مبصر)	۲۶ جنوری۔ فروری ۱۹۶۱	۸۰
مراثی انیس میں رزمیہ عناصر (نیا دور لکھنؤ)	حسن مثنیٰ	فروری ۲۰۰۶	۱۶-۲۲
مراثی انیس میں شاعرانہ فن کاری (تحقیقی مقالہ/پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ)	زہرہ افضل	۱۹۸۱	.. ..
مراثی انیس میں عربی نقوش (ہماری زبان دہلی)	نشاط احمد	۸-۱۴ دسمبر ۲۰۰۴	۲
مراثی انیس میں محاوروں کا سفر (ایوان اردو۔ دہلی)	امام مرتضیٰ	نومبر ۲۰۰۲	۳۹-۴۳
مراثی انیس میں مناظر قدرت (کتاب)	سید منتظر جعفری	۱۹۸۸	.. ..
مراثی انیس میں منظر نگاری (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	ناظر حسین زیدی	۱۹۷۲	.. ..
مراثی انیس میں ہندوستانیت (آجکل دہلی)	گوپی چند نارنگ	انیس نمبر جون ۱۹۷۱	۲۵-۲۹
مراثی انیس میں ہندوستانی مشترکہ تہذیب وآداب کی نشاندہی (نیا دور لکھنؤ)	ایس ایم عباس	دسمبر ۲۰۰۹	۱۳-۱۸
مراثی ریختہ: شمالی ہند کی قدیم ترین اردو نظمیں (تحریر۔ دہلی)	مسعود حسن رضوی ادیب	اپریل جون ۱۹۷۱	.. ..
مراثی ظہور (مصنف ظہور الحق/مرتب متین عبادی/نیا دور لکھنؤ)	شاذیہ بانو (مبصر)	جنوری ۲۰۰۹	۴۶
مراثی عشق میں ڈرامائی عناصر (آجکل۔ دہلی)	جعفر رضا	اکتوبر ۱۹۶۷	۲۲-۲۴
مراثی عظیم ایک تعارف (مصنف عظیم امروہوی/نیا دور لکھنؤ)	علی ظہیر نقوی (مبصر)	نومبر ۲۰۱۴	۴۵-۴۶
مراثی کا لافانی نسوانی کردار: حضرت بی بی زینب (نیا دور لکھنؤ)	مجاور حسین رضوی	دسمبر ۲۰۱۱	۳-۸
مرثیوں کی منظر نگاری (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	سلام سندیلوی	فروری ۱۹۷۲	.. ..
مرثیہ۔ ادراک گوپال پور	تقی احمد ارشاد	شمارہ نمبر ۴	۱۸۷-۱۹۲
مرثیہ۔ از آدم تا ایں دم (آجکل دہلی)	عظیم امروہوی	ستمبر ۱۹۸۲	۶-۱۴
مرثیہ انیس اور اصلاح انیس (کتاب)	مہذب۔ لکھنوی	..	.. ..
مرثیہ اور اردو ادب (زمانہ کانپور)	اویس احمد ادیب	فروری ۱۹۳۴	۹۲

مرثیہ اور اس کا اثر (تاریخ ادب اردو نمبر۔ مشرب)	اعجاز حسین	..	.. ..
مرثیہ اور انیس (مشمولہ کتاب: میر انیس سے تعارف)	صالحہ عابد حسین	نومبر ۱۹۷۵	۲۳ - ۲۸
مرثیہ اور ایپک (صحیفہ لاہور)	سجاد رضوی	جون ۱۹۵۸	۵۹ - ۷۶
مرثیہ اور حضرت انیس (زمانہ کانپور)	ظہیر الدین علوی	دسمبر ۱۹۳۷	۲۵۰
مرثیہ اور میر انیس (نقوش لاہور)	افضال حسین جعفری	دسمبر ۱۹۷۰	.. ..
مرثیہ اور میر انیس (کتاب)	محمد احسن فاروقی	۱۹۶۴	.. ..
مرثیہ اور میر انیس (نگار کراچی)	محمد احسن فاروقی	نومبر۔ دسمبر ۱۹۶۷	.. ..
مرثیہ بعد انیس (نگار لکھنؤ)	صفدر حسین	جولائی دسمبر ۱۹۴۳	.. ..
مرثیہ بعد انیس بہار میں (تحقیقی مقالہ پٹنہ یونیورسٹی پٹنہ)	سید افضل حسن	۱۹۷۳	.. ..
مرثیہ خوانی کا فن (کتاب)	نیر مسعود	۱۹۹۰	- ..
مرثیہ در احوال حضرت عباس (از عیشی۔ ایک تجزیہ (نیا دور لکھنؤ)	شمیمہ رضوی	دسمبر ۱۹۹۵	۳۲ - ۳۴
مرثیہ شناسی (کتاب)	حیدر علی	۱۹۸۴	.. ..
مرثیہ شناسی (مصنف سید علی حیدر / نیا دور لکھنؤ	علی احمد دانش (مبصر)	فروری ۲۰۰۸	۴۶ - ۴۷
مرثیہ کا تدریجی ارتقا اور اس میں میر انیس کا مقام (اسد۔ لاہور)	محمد سلطان سلیم پوری	جولائی ۱۹۵۹	.. ..
مرثیہ کا موضوع اور انیس (انیس نمبر سرفراز لکھنؤ)	شہید صفی پوری	فروری ۱۹۷۲	.. ..
مرثیہ کی تاریخ (کتاب)	حامد حسن قادری	آگرہ ۱۹۶۹	.. ..
مرثیہ کی تاریخ: ایک تاثر (نیا دور لکھنؤ)	حسن عباس فطرت	ثنائی ادب نمبر اکتوبر ۲۰۱۵	۷ - ۸
مرثیہ کی تدریجی ترقی (مشمولہ کتاب: تنقیدیں)	اویس احمد ادیب	..	.. ..
مرثیہ کی خواندگی کا فن (نیا دور لکھنؤ)	مرزا شفیق حسین شفق	مارچ ۲۰۰۳	۱۴- ۲۰- ۵۴
مرثیہ کی شعریات (ایوان اردو۔ دہلی)	قدوس جاوید	اپریل ۲۰۱۰	۳۷ - ۴۰
مرثیہ گوئی کا ابتدائی دور (زمانہ۔ کانپور)	عبد الرؤف عشرت لکھنوی	دسمبر ۱۹۳۱	۳۳۷
مرثیہ گوئی کا فن (کتاب)	نیر مسعود	۱۹۹۰	.. ..
مرثیہ مونس مع اصلاح میر انیس (اردو۔ اورنگ آباد)	کشن پرشاد کول	اپریل ۱۹۳۰	.. ..
مرثیہ: نظم کی اصناف میں جدید مرثیہ (کتاب)	عاشور کاظمی	۱۹۹۶	.. ..
مرثیہ نگاری۔ انیس و دبیر سے پہلے (انجام کراچی)	عبد الرؤف عروج	۱۲ مئی ۱۹۶۵	.. ..
مرثیہ نگاری اور انیس (ساقی کراچی)	محمد احسن فاروقی	دسمبر ۱۹۷۱	.. ..
مرثیہ نگاری اور انیس کا تخلیقی رویہ (نیا دور لکھنؤ)	ایس ایم عباس	جنوری ۲۰۰۹	۱۸ - ۲۲
مرثیہ نگاری اور میر انیس (کتاب)	محمد احسن فاروقی	۱۹۵۱	.. ..

مرثیے اور ہندوستان کے مسلمان (مشمولہ کتاب تین شاعر)	محی الدین قادری زور	..	--
مرثیے کا ارتقا جوش کے بعد (نیا دور لکھنؤ)	سید علی احمد دانش	رثائی ادب نمبر اکتوبر ۲۰۱۵	۲۸-۵۵
مرثیے کی تفہیم۔ کچھ نئے زاویے (نیا دور لکھنؤ)	مجاور حسین رضوی	گوشہ رثائی ادب نومبر ۲۰۱۳	۹۰۸-۳۵
مرثیے کی جمالیات (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد فاطمی	رثائی ادب نمبر نومبر ۲۰۱۴	۹-۱۴
مرثیے کی طرز جدید اور ضمیر لکھنوی (نیا دور لکھنؤ)	علی جواد زیدی	اسپیشل نمبر ۲۶ جنوری ۱۹۶۴	۱۳-۲۱
مرثیے کی ہیئت (آجکل دہلی)	علی جواد زیدی	(انیس نمبر جون ۱۹۷۵	۱۱-۱۵
مرثیے میں سیرت نگاری (نوادر لاہور)	شرافت عباس	ستمبر ۲۰۰۴ مارچ ۲۰۰۵	۱۰۷-۱۱۱
مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی لبعض نمایاں پہلو (نیا دور لکھنؤ)	ضیاء الدین اصلاحی	فروری ۲۰۰۶	۳-۱۲
مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری (کتاب)	شبیر احمد صدیقی	..	-- --
مرزا دبیر کے غیر مطبوعہ مرثیے تعداد ۳۵ (نیا دور)	اکبر حیدری کشمیری	جولائی ۱۹۹۳	۱۶-۳۵
مرگ انیس (معاصر پٹنہ)	قاضی عبدالودود	۱۹۵۱	-- --
مسکین مرثیہ گو (آجکل دہلی)	مسعود حسن رضوی ادیب	مئی ۱۹۶۷	۴-۱۰
مشاطۂ سخن: میر انیس (کتاب)	صفدر مرزا پوری	۱۹۲۸	-- --
مطالعۂ انیس (کتاب)	شجاعت علی سندیلوی	..	-- --
مطالعہ انیس کے چند مقدمات (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	وحید اختر	فروری ۱۹۷۲	-- --
مطالعہ انیس کے چند مقدمات (مشمولہ کتاب: فلسفہ اور ادبی تنقید)	وحید اختر	..	-- --
مطلع انوار (کتاب)	خیرات احمد	۱۹۲۳	-- --
معرکۂ انیس و دبیر (مشمولہ کتاب: اردو کے ادبی معرکے)	امیر حسن نورانی	نسیم بکڈپو لکھنؤ ۱۹۶۹	۱۱۵-۱۲۳
معرکۂ انیس و دبیر (کتاب نما دہلی)	نیر مسعود	اگست ۱۹۷۷	۸۴-۸۷
مقدمۂ شعر و شاعری (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	الطاف حسین حالی	۱۸۹۳	-- --
منتخب مراثی انیس (نیا دور کراچی)	مرتضی حسین فاضل	شمارہ نمبر ۶۹-۷۰	۳۸۸-۳۸۹
منشی نول کشور اور میر انیس: رثائی ادب کی روشنی میں۔ (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش	نولکشور نمبر۔ نومبر دسمبر ۱۹۸۰	۱۵۵-۱۵۸
موازنۂ انیس و دبیر (کتاب)	شبلی نعمانی	۱۹۰۷	-- --
موازنہ انیس و دبیر (شبلی نمبر۔ ادیب علی گڑھ)	احتشام حسین	ستمبر ۱۹۶۰	۱۰۲-۱۰۶
موازنہ انیس و دبیر (کتاب)	اعجاز حسین جارچوی	۱۹۳۳	-- --
مرثیہ یا رزمیہ (شاعر بمبئی)	شوکت سبزواری	سالنامہ ۱۹۵۰	-- --
مطالعۂ انیس (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ	احتشام حسین	فروری ۱۹۷۳	-- --
موازنہ انیس و دبیر (تحریک دہلی)	امیر حسن نورانی	فروری ۱۹۷۴	۱۹

موازنہ انیس و دبیر (نصاب ادیب ادیب علی گڑھ)	تنویر احمد	اگست ۱۹۶۲	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (نیا دور لکھنؤ)	جمال آرا نظامی	ستمبر ۱۹۸۲	۳۴-۳۳
موازنہ انیس و دبیر (جامعہ دہلی)	رشید حسن خاں	نومبر ۱۹۶۹	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (کتاب)	رشید حسن خاں (مرتب)	مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۸۹	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (مشمولہ کتاب موازنے)	شرقی خالدی	..	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (نیا دور لکھنؤ) (کتاب کی تحقیق و تدوین مجاور حسین رضوی سید علی حیدر)	شمس تبریز خاں (مبصر)	دسمبر ۲۰۱۰	۴۵
موازنہ انیس و دبیر (دکن ریویو حیدرآباد)	ظفر علی خاں	اگست ۱۹۰۸	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (کتاب)	عابد علی خاں (مرتب)	۱۹۶۴	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (کتاب)	فضل امام رضوی	۱۹۹۸	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (کتاب)	مسیح الزماں (مرتب)	۱۹۷۷	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (مشمولہ کتاب: معیار و میزان، تعبیر، تشریح، تنقید)	مسیح الزماں	..	.. ..
موازنہ انیس و دبیر (زمانہ کانپور)	نقاد لکھنوی (مبصر)	مئی ۱۹۰۸	.. ..
موازنہ انیس و دبیر اور اردو ناقدین (سیفیہ کالج میگزین بھوپال)	سید ظہور الاسلام	۱۹۷۲	.. ..
موازنہ انیس و دبیر ایک تجزیہ (آجکل دہلی)	اشفاق احمد اعظمی	دسمبر ۲۰۰۳	۷-۳
موازنہ انیس و دبیر پر ایک نظر (خاور ڈھاکہ)	آفتاب احمد صدیقی	مئی ۱۹۵۲	.. ..
موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی مطالعہ (کتاب)	ظہور الاسلام	۱۹۸۶	.. ..
موازنہ انیس و دبیر مولفہ شبلی مع تعارف رشید حسن خاں (جامعہ دہلی)	ادارہ (مبصر)	نومبر دسمبر ۱۹۶۹	.. ..
موازنہ انیس و شیکسپیئر (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	غلام امام	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میر انیس (مشمولہ کتاب منتخب سوانح اور خاکہ۔ (مرتب: نجم الدین نقوی)	امجد علی اشہری	..	.. ..
میر انیس (نصاب نمبر۔ ادیب علی گڑھ)	تنویر احمد	اگست ۱۹۶۲	.. ..
میر انیس (شہاب حیدرآباد)	سعیدہ خانم	اپریل ۱۹۴۰	.. ..
میر انیس (کتاب)	سفارش حسین رضوی	..	.. ..
میر انیس (انیس نمبر سرفراز لکھنؤ)	شاد عظیم آبادی	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میر انیس (جام نو سکھر)	شاد عظیم آبادی	جلد ۲۔ شمارہ ۱-۲	.. ..
میر انیس (مشمولہ کتاب: مخزن ادب)	شیخ عبدالقادر	..	.. ..
میر انیس (مخزن لاہور)	شیخ عبدالقادر	اگست ۱۹۰۶	۵۰
میر انیس (مخزن کا ۲۵ سالہ انتخاب۔ لاہور)	شیخ عبدالقادر	..	۲۴۱-۲۳۹

میر انیس (جامعہ دہلی)	صالحہ عابد حسین	دسمبر ۱۹۶۰	.. ..
میر انیس (مشمولہ کتاب: میر انیس سے تعارف)	صالحہ عابد حسین	نومبر ۱۹۷۵	۱۳-۲۲
میر انیس (کتاب)	کلیم احمد	۱۹۸۸	.. ..
میر انیس (سب رس۔ حیدر آباد)	محمد اعظم	جنوری ۱۹۴۷	.. ..
میر انیس (کتاب)	محمد حسین حسان	دہلی ۱۹۶۵	.. ..
میر انیس (آجکل دہلی)	محمد حیدر اسد	یکم دسمبر ۱۹۴۵	۳۶-۳۷
میر انیس (مشمولہ کتاب نقوش ادب)	مرلقا اعجاز		۱۷۱-۱۷۵
میر انیس (کتاب)	نادم سیتاپوری	۱۹۷۱	.. ..
میر انیس (صحیفہ لاہور)	نائب حسین نقوی	جولائی ۱۹۶۵	.. ..
میر انیس: اپنی نظر میں (آجکل دہلی)	عظیم امروہوی	دسمبر ۲۰۰۴	۱۰-۱۴
میر انیس اور ادب اطفال (نیا دور لکھنؤ)	مجاور حسین رضوی	مارچ ۲۰۰۴	۳-۷، ۱۶
میر انیس اور ان کا فن (مشمولہ کتاب۔ ادب فکر اور سماج)	راجندر ناتھ شیدا	..	.. ..
میر انیس اور ان کی مرثیہ گوئی (امروز لاہور)	مائل نقوی	یکم جولائی ۱۹۶۲	.. ..
میر انیس اور ان کے اخلاف کے مرثیے (کتاب)	جعفر حسین خاں جونپوری	۱۹۸۵	.. ..
میر انیس اور ایپک سیلیبلیٹی (ساقی کراچی)	محمد احسن فاروقی	دسمبر ۱۹۶۳	.. ..
میر انیس اور تلسی داس (آجکل دہلی)	مجیب رضوی	جولائی ۱۹۷۵	۳۱-۳۴
میر انیس اور دنیا کے رزم نگار (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	امیر امام حر	۱۹۷۲	.. ..
میر انیس اور کردار نگاری (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	مسیح الزماں	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میر انیس اور مرثیہ نگاری (حریت کراچی)	نور الحسن	۲۹ مارچ ۱۹۶۹	.. ..
میر انیس اور واقعہ نگاری (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	عبد السلام ندوی	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میر انیس اور ہم (مخزن لاہور)	سید مہدی حسن احسن لکھنوی	فروری ۱۹۱۲	۴۷
میر انیس اور ہم (مخزن لاہور)	علمدار حسین واسطی	نومبر ۱۹۱۰	.. ..
میر انیس اور ہم (مخزن لاہور)	علمدار حسین واسطی	مئی ۱۹۱۱	۳۴
میر انیس ایک عظیم شاعر (انیس نمبر۔ ماہ نو۔ کراچی)	سلیمان پاشا	۱۹۷۲	.. ..
میر انیس۔ ایک مختصر تعارف (آجکل دہلی)	مسعود حسن رضوی ادیب	انیس نمبر جون ۱۹۷۵	۴-۶
میر انیس ایک مرثیہ خوان کی نظر میں (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	حسن زیدی	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میر انیس۔ ایک مطالعہ (صد سالہ یادگار انیس۔ کراچی)	ضمیر اختر نقوی	مارچ ۱۹۷۱	.. ..
میر انیس بحیثیت ایک رزمیہ شاعر (کتاب)	اکبر حیدری کشمیری	۱۹۶۵	.. ..
میر انیس بحیثیت ماہر نفسیات (ارشاد۔ کراچی)	عائشہ امام	مئی ۱۹۶۴	.. ..

میرانیس پر بہترین کتاب (ایوان اردو دہلی)	سید جعفر رضا	نومبر ۲۰۰۲	۲۵-۲۷
میرانیس حیدرآباد میں (نیا دور لکھنؤ)	رشید موسوی	جنوری ۱۹۶۳	۲۲-۲۴
میرانیس حیدرآباد میں (عالمی میرانیس سیمنار کناڈا)	رشید موسوی	۲۰۰۲	۱۹۱-۲۰۵
میرانیس حیدرآباد میں (سیاست۔ حیدرآباد)	سید محمد علی شہرت بلگرامی	۱۳ جون ۱۹۶۲	.. ..
میرانیس کا امتیاز (مشمولہ کتاب نقد شعر)	قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی	..	.. ..
میرانیس کا ایک مرثیہ۔ جب قطع کی مسافت شب... (نیا دور لکھنؤ)	اختر علی تلہری	دسمبر ۱۹۶۵	۱۱-۱۶
میرانیس کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	نائب حسین نقوی	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کا ایک مرثیہ۔ شمشاد بوستان رسالت... (نیا دور لکھنؤ)	اکبر حیدری کشمیری	دسمبر ۱۹۷۷	۷-۱۹
میرانیس کا تصور شعر (نیا دور لکھنؤ)	ابوالکلام قاسمی	اپریل ۲۰۰۳	۱۲-۱۸
میرانیس کا زندگی نامہ (عالمی میرانیس سیمنار کناڈا)	نیر مسعود	۲۰۰۲	۱۵۷-۱۸۲
میرانیس کا سفر دکن (ہمایوں لاہور)	آغا حسین ارسطو جاہی	نومبر ۱۹۴۰	.. ..
میرانیس کا غیر مطبوعہ کلام (نیا دور لکھنؤ)	اکبر حیدری کشمیری	مارچ ۱۹۷۳	۱۱-۱۷
میرانیس کا منسوخ شدہ کلام (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش	جون ۱۹۸۷	۳۲-۳۶
میرانیس کا نظریۂ فقر (فکر و نظر علی گڑھ)	محمد کمال الدین حسین ہمدانی	اکتوبر دسمبر ۲۰۰۳	۴۸-۵۶
میرانیس کا نودریافت کلام (نیا دور لکھنؤ)	علی احمد دانش	جون ۱۹۷۹	۹-۱۹
میرانیس۔ کچھ غیر معروف حالات (آجکل دہلی)	نیر مسعود	جولائی ۱۹۷۹	۱۲-۱۸
میرانیس۔ کل اور آج (نیا دور لکھنؤ)	علقمہ شبلی	اکتوبر ۱۹۸۳	۲۲-۲۴
میرانیس کی اخلاقیات (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	انور سدید	۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کی اقلیم سخن (کتاب)	انور سدید	۱۹۸۶	- -
میرانیس کی تاریخی مجلسیں (صبح نو پٹنہ)	امجد علی اشہری	جون ۱۹۶۴	.. ..
میرانیس کی خصوصیات شاعری (سب رس۔ حیدرآباد)	اندرجیت دت امرتسری	فروری ۱۹۶۸	.. -
میرانیس کی دہلویت (نیا دور کراچی)	انور سدید	شمارہ ۵۵-۵۶	۲۷۶-۲۸۴
میرانیس کی رباعیات (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	فرمان فتح پوری	۱۹۷۲	- ..
میرانیس کی رزمیہ شاعری (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	اکبر حیدری کشمیری	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کی سیرت (ادب لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	جنوری ۱۹۱۳	.. ..
میرانیس کی سیرت (انیس نمبر ماہ نو۔ کراچی)	مسعود حسن رضوی ادیب	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کی شاعری (انیس نمبر سرفراز لکھنؤ)	امداد امام اثر	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کی شاعری (دور جدید لکھنؤ)	خواجہ غلام السیدین	۱۹۵۳	- ..
میرانیس کی شاعری (مشمولہ کتاب: روح تنقید حصہ دوم)	محی الدین قادری زور	..	.. ..

میرانیس کی شاعری (العلم کراچی)	ناظر انصاری	جنوری مارچ ۱۹۶۸	.. ..
میرانیس کی شاعری میں فصاحت و بلاغت (انیس نمبر سرفراز لکھنؤ)	شبلی نعمانی	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کی شخصیت و مزاجی کیفیت (نیادور لکھنؤ)	نیر مسعود	دسمبر ۱۹۷۸	۴ - ۶
میرانیس کی عروضی و صوتی خصوصیات (انیس نمبر سرفراز لکھنؤ)	محمد احسن فاروقی	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کی علمی استعداد (آجکل دہلی)	مسعود حسن رضوی ادیب	جولائی ۱۹۷۵	۶ - ۱۲
میرانیس کی غزل (نیادور کراچی)	انور سدید	شمارہ نمبر ۶۱-۶۲	۲۷۳ - ۲۸۳
میرانیس کی غزل اور حقیقت حال (زمانہ کانپور)	ارشاد فاطمی	اکتوبر ۱۹۴۰	۲۶۰
میرانیس کی غزل گوئی (آجکل دہلی)	مسعود حسن رضوی ادیب	جون ۱۹۷۱	۷ - ۱۱
میرانیس کی مرثیہ خوانی (جامعہ۔ دہلی)	محمد کمال الدین حسین ہمدانی	جنوری۔ مارچ ۲۰۰۲	۵۳
میرانیس کی مرثیہ نگاری (خاتون دکن حیدرآباد)	ابن سعید	اگست ستمبر ۱۹۶۷	.. ..
میرانیس کی مرثیہ نگاری کا تجزیاتی مطالعہ (فیضان ادب مئو)	آصف علی صفوی	جنوری جون ۲۰۱۶	۳۲ - ۳۵
میرانیس کی نفسیاتی غلطیاں (زمانہ کانپور)	مظفر برنی	اپریل ۱۹۴۴	۱۹۹
میرانیس کی نودریافت رباعیاں (نیادور لکھنؤ)	علی احمد دانش	اگست ۲۰۰۳	۴۱-۴۲-۵۶
میرانیس کی نودریافت غزلیں (نیادور لکھنؤ)	علی احمد دانش	مئی جون ۲۰۱۲	۳۱ - ۳۴
میرانیس کے ایک گمنام شاگرد عطا فیض آبادی (نیادور لکھنؤ)	علی احمد دانش	اپریل ۱۹۸۲	۲۸ - ۳۵
میرانیس کے ایک مرثیہ کا خاکہ (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	جعفر علی خاں اثر لکھنوی	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کے حالات زندگی (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	فروری ۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کے حالات زندگی ایک تحقیقی مطالعہ (انیس نمبر۔ ماہ نو کراچی)	ضمیر اختر نقوی	۱۹۷۲	.. ..
میرانیس کے ذوق شعری کی منفرد حیثیت (عالمی میرانیس سمینار کناڈا)	سید مشکور حسین یاد	۲۰۰۲	۸۱ - ۹۲
میرانیس کے سفر حیدرآباد کا روزنامچہ (نیادور لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	ستمبر ۱۹۷۱	۳ - ۸
میرانیس کے غیر مطبوعہ اشعار (اردو۔ دہلی)	قاضی عبدالودود	اپریل ۱۹۳۸	.. ..
میرانیس کے کچھ چشم دید حالات (ادب، لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	نومبر ۱۹۳۱	.. ..
میرانیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال (زمانہ کانپور)	مسعود حسن رضوی ادیب	مئی ۱۹۲۸	۲۸۵
میرانیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال۔ مباحثہ (زمانہ کانپور)	مسعود حسن رضوی ادیب	جنوری ۱۹۳۰	۵۰
میرانیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال۔ مباحثہ (زمانہ کانپور)	نقاد لکھنوی	جنوری ۱۹۳۰	۴۷
میرانیس کے کلام میں صنعتوں کا استعمال (زمانہ کانپور)	نقاد الہ آبادی	جنوری ۱۹۳۱	.. ..
میرانیس کے مرثیوں میں تصویر کشی کا فن (عالمی میرانیس سمینار کناڈا)	شارب ردولوی	۲۰۰۲	.. ..
میرانیس کے مرثیے رزمیۂ المیہ (مشمولہ کتاب۔ تحقیق و انتقاد)	اکبر حیدری کشمیری	..	.. ..
میرانیس کی علمی استعداد (انیس نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	فروری ۱۹۷۲	.. ..

میر انیس کے مرثیے کے چند بند (محرم نمبر۔ سرفراز لکھنؤ)	ادارہ	مارچ ۱۹۶۹	۶۷-۶۸
میر انیس کے نادر خطوط (آجکل۔ دہلی)	مسعود حسن رضوی ادیب	فروری ۱۹۷۳	۲۹-۳۳
میر انیس مغفور (زمانہ کانپور)	نوبت رائے نظر لکھنوی	فروری ۱۹۰۸	۸۷
میر انیس۔ مہد سے لحد تک (نیادور لکھنؤ)	کاظم علی خاں	فروری ۲۰۰۷	۲- ۶
میر انیس۔ نادر معلومات (نیادور لکھنؤ)	علی احمد دانش	جنوری ۱۹۹۰	۸- ۱۶
میر ببر علی انیس (آجکل۔ دہلی)	اظہار ملیح آبادی	فروری ۱۹۵۱	۵۲-۵۳
میر ببر علی انیس (ادیب الٰہ آباد)	اعجاز لکھنوی	فروری۔ جون ۱۹۱۲	- -
میر ببر علی انیس (نئی روشنی کراچی)	ریاست حسین بدایونی	۱۶ ستمبر ۱۹۷۱	.. ..
میر ببر علی انیس (مشمولہ کتاب: موازنے)	شرقی خالدی	..	.. ..
میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعرا (کتاب)	محمود فاروقی	۱۹۵۶	- -
میر خلیق لکھنوی اور ان کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ۔ ہجر شہ (نیادور لکھنؤ)	سلیمان حسین	جون ۱۹۶۶	۲۹ - ۳۴
میر عشق کا ایک شاہکار مرثیہ (نیادور لکھنؤ)	مجاور حسین رضوی	رثائی ادب نمبر نومبر ۲۰۱۴	۵ - ۸
میر کی مرثیہ نگاری (مشمولہ کتاب اردو شاعری کی ہندوستانی روح)	زرینہ ثانی	۱۹۶۷	۴۵ - ۵۴
میر کے مرثیے۔ اردو مرثیہ نگاری کی مختصر تاریخ اور میر (زمانہ کانپور)	وقار عظیم	مارچ ۱۹۳۴	۱۴۴
میر مونس (نیادور لکھنؤ)	ارشاد احمد خان بیاروی	دسمبر ۲۰۰۹	۲۶-۳۹
میر مونس اور حیات دبیر (کتاب)	سید محمد عبدالرسول شاکی	۱۹۲۱	.. ..
میر مونس حیات اور شاعری (مصنف محسن رضا عابدی/ نیادور لکھنؤ	نسرین رضوی (مبصر)	نومبر ۲۰۱۳	۴۵ - ۴۶
نانک مرثیہ گو۔ ایک حیرت انگیز شخصیت (نیادور لکھنؤ)	مسعود حسن رضوی ادیب	جون ۱۹۷۴	۴ - ۶
تذکرۂ انیس (مصنف: اصغر نقوی/ سیاست حیدر آباد	سید محمد (مبصر)	۲۹ مارچ ۱۹۷۱	.. ..
نفس اللغۃ۔ اصلاح کی روایت اور انیس (نیادور لکھنؤ (نفس اللغۃ۔ شاگرد ناسخ میر علی اوسط اشک کی لغت کا نام ہے)	وقار ناصری	جولائی ۲۰۰۸	۱۲- ۱۶-۴۲
نقد انیس (کتاب)	اسد اریب	۱۹۶۷	.. ..
نوائے انیس (کتاب)	محمد احسن فاروقی	۱۹۶۵	.. ..
نیا مرثیہ ہیئت اور فارم کے مسائل (نیادور لکھنؤ)	عادل فراز	رثائی ادب نمبر اکتوبر ۲۰۱۵	۲۴ - ۲۷
واجد علی شاہ کی مرثیہ نگاری (ایوان اردو۔ دہلی)	ارشاد نیازی	جولائی ۲۰۱۰	۲۵ - ۲۸
واقعات انیس (کتاب)	میر مہدی حسن احسن لکھنوی	۱۹۰۸	.. -
واقعات انیس (مصنف احسن لکھنوی/ اصلاح سخن لاہور)	ادارہ (مبصر)	اپریل ۱۹۰۹	۱ - ۱۰

واقعات انیسؔ کی نسبت کچھ خیالات (معیار لکھنؤ)	محمد ابوالبقا جونپوری	اپریل ١٩١١	.. ..
واقعاتِ کربلا مسلسل (کتاب) (انیسؔ کے مرثیوں کی مدد سے واقعات کربلا ترتیب دئے گئے ہیں)	منظور علی علوی	١٩١۵	.. ..
واقعہ کربلا (سیاست حیدرآباد)	شہید یار جنگ	١٣ر جون ١٩٦٢	.. ..
واقعہ کربلا سے اخلاقی سبق (حسین نمبر۔ اسلامی دنیا بدایوں)	نظامی بدایونی	مارچ اپریل ١٩٢٨	٣٤ . ٣٦
ہسٹری آف اردو لٹریچر۔ انگریزی۔ (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	گراہم بیلی	..	.. ..
ہسٹری آف اردو لٹریچر انگریزی۔ (اس کتاب میں انیس کا تذکرہ ہے)	محمد صادق	آکسفورڈ۔ لندن	.. ..
ہمارے انیسؔ۔ شخصیت اور فن (کتاب)	صالحہ عابد حسین	١٩٨٠	.. ..
ہندوستان میں عزاداری کا قدیم مرکز: دکن (ذبح عظیم نمبر۔ الواعظ لکھنؤ)	اسحاق حسین عابدی	اگست ستمبر ١٩٨٨	١۵ - ١٦
ہندوستانی شعریات کی روشنی میں اردو مرثیہ کا مطالعہ (نیا دور لکھنؤ) (کتاب کے مصنف علی ذہین نقوی امروہوی)	حسن عباس فطرت (مبصر)	اکتوبر ٢٠١۵	۵٩ - ٦١
یادگار انیسؔ (کتاب)	امیر احمد علوی	١٩٢۵	.. ..
یادگار انیسؔ (صد سالہ یادگار انیسؔ۔ کراچی)	منظر حسین کاظمی	مارچ ١٩٧١	.. ..
یادگار انیسؔ (مشمولہ کتاب: آہنگ ادب)	ناظر انصاری	..	.. ..

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کا ایک تعارف بطور اشاریہ نگار۔ ایڈیٹر نیا دور

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں کا شمار ملک کے ان ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے ادب کی مختلف اصناف میں خدمات انجام دی ہیں۔ ادب کے نئے نئے گوشوں میں ان کا تحقیقی اور تخلیقی عمل سرگرمی سے جاری ہے۔ ان کی خاص پہچان افسانہ نگاری، ادب اطفال اور اشاریہ سازی میں ہے بلکہ اشاریہ سازی میں ان کی خدمات کی وجہ سے ان کو موجودہ وقت میں 'ماہر اشاریات' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اشاریہ سازی میں ان کا پہلا اور سب سے بڑا کام اشاریہ نیا دور ہے یہ اشاریہ ١٩۵۵ء سے ٢٠٠١ تک کے ۵٦١ شماروں پر مشتمل ہے اور ٢٠٠٩ میں رام پور رضا لائبریری سے دو جلدوں میں A4 سائز میں ١٦٦٤ صفحات پر شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے نیا دور کا ٢٠٠٢ سے ٢٠١٦ تک کا اشاریہ بھی مکمل کر لیا ہے جس کی اشاعت انشاء اللہ جلد متوقع ہے۔

ڈاکٹر محمد اطہر مسعود خاں نے اشاریہ نیا دور کے علاوہ تذکرہ شعرائے اتر پردیش، اشاریہ رضا لائبریری جرنل (شمارہ نمبر ١ تا ٢٠) اشاریہ، اردو افسانہ، اشاریہ اردو غزل، اشاریہ مطبوعات رضا لائبریری (١٩٢٨ تا ٢٠١١) اشاریہ تذکرہ ارباب اردو، اشاریہ نثر نگاران اردو ١٩٤٧ سے موجودہ وقت کے ناولوں اور افسانوی مجموعوں کا اشاریہ بھی بنایا ہے۔

(بقیہ صفحہ ٣٢ پر)

تنویر سرِ راہِ سخن میر انیسؔ
ہر موڑ پہ ہمراہِ سخن میر انیسؔ
الفاظ بھی سربستہ بصد حسن و ادب
لاریب شہنشاہِ سخن میر انیسؔ

ہر دور کا تابندہ اشارہ ہیں انیسؔ
ضوبار و دل آویز کنایہ ہیں انیسؔ
محسوس کیا مگر نہ چھو پائے کبھی
تشبیہہ سے بڑھ کے استعارہ ہیں انیسؔ

کیا ان کے یہاں جاہ و حشم لگتا ہے
توصیف میں کوتاہ قلم لگتا ہے
فطرت کا تراشا ہوا شہکار انیس
خورشید ادب کہتے تو کم لگتا ہے

اس درجہ بلندی پہ کھڑے میر انیسؔ
دیکھنے سے دکھائی نہ پڑے میر انیسؔ
جس عمر کا کردار زباں بھی ویسی
ہیں شیکسپیئر سے بھی بڑے میر انیسؔ

معلوم نہیں جن کو فصاحت کیا ہے
اسلوبِ بیاں لفظوں کی طاقت کیا ہے
وہ پڑھ کے انیسؔ لکھنوی کو دیکھیں ہے
سمجھیں گے کہ اظہار کی قدرت کیا ہے
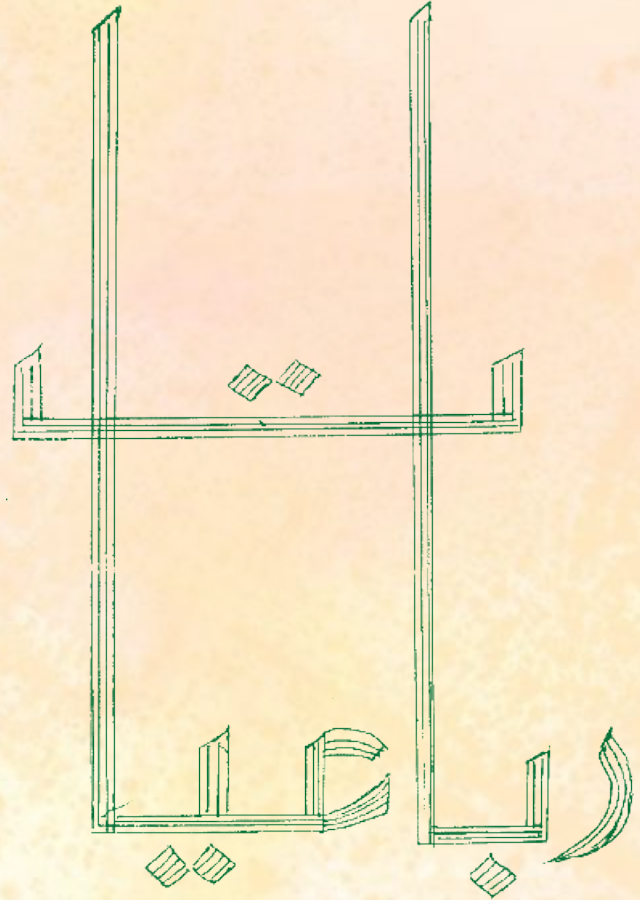
افکار رسا کہ بر زبانِ اردو
کس طرح سمیٹے ہیں جہانِ اردو
اے میر انیسؔ آپ ہی سے تو ہے
جگ مگ کرتا یہ آسمانِ اردو

چلنے کی خبر نفس نفس ملتی ہے
رس گھولتی آوازِ جرس ملتی ہے
خود فکرِ رواں انیسؔ تک پہنچے گی
کچھ ایسی زباں پہ دسترس ملتی ہے

کم ہی یہاں ملتا ہے کسی فن کو ثبات
اربابِ سخن کرتے ہیں محنت دن رات
تخلیقِ انیسؔ جب پڑھی ہے تم نے
محسوس کیا بہتے ہوئے آبِ حیات

معلوم بھی ہے عشق کی پرواز ہے یہ
بے چین غم و درد کی آواز ہے یہ
دراصل کلام آپ کا اے میر انیسؔ
اک لفظ اگر کہیں، تو اعجاز ہے یہ

اچھا تھا کہ بات ارتقا کی کرتے
اور بحث بھی کچھ حرف و نوا کی کرتے
پھر نامِ انیسؔ روشنی میں آتا
تدبیر کوئی ایسی دعا کی کرتے

رباب رشیدی
۱۲۶ تاناری خانہ پوسٹ امین آباد
لکھنؤ ۱۸-
9335018112
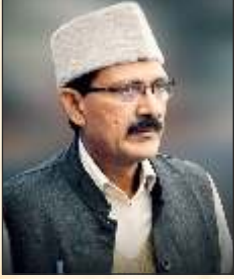
زندگی نامہ میر انیسؔ

مرتبہ۔ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

نام : میر ببر علی

تخلص : انیسؔ

والد : سید مستحسن خلیقؔ

پیدائش : ۱۸۰۲ء / ۱۲۱۹ھ

قیام : محلہ گلاب باڑی فیض آباد

ابتدائی تعلیم: مولوی نجف علی فیض آبادی۔ اور مولوی حیدر علی لکھنوی سے حاصل کی

غدر کے بعد سفر: پٹنہ، بنارس، بارہ بنکی، کانپور، الٰہ آباد، حیدرآباد

شاعری کی ابتدا: بہ عمر چودہ سال غزل گوئی سے

شادی : بہ عمر ۱۹ سال۔ مولوی سید احمد علی صاحب شاگرد سید دلدار علی صاحب (غفراں مآبؒ) کی دختر سیدہ فاطمہ بیگم سے ہوئی۔ ان کی وفات ۱۲۹۴ھ میں ہوئی انیسؔ کے برابر دفن ہوئیں۔

اولادیں : تین بیٹے۔ میر خورشید علی نفیسؔ، میر عسکری رئیسؔ، میر محمد سلیس۔ تین بیٹیاں۔ مہدی بیگم، عباسی بیگم، آغائی بیگم۔

لکھنؤ میں سکونت: مختلف محلوں میں رہے۔ غالباً ۹ مکانات بدلے۔

آخری قیام گاہ: محلہ آئینہ سازان، سبزی منڈی، چوہدری محلہ کوچہ میر انیسؔ (یہ ایک محلہ کا نام ہے) شاہی زمانے میں اسے محلہ آئینہ سازان اور سبزی منڈی کہا جاتا تھا۔ انیسؔ کے گھر کے قریب ہی سبزیاں اور دوا بنانے کے لیے پتیاں فروخت ہوتی تھیں۔

تعداد مراثی: گھروں کی تبدیلیوں اور غدر ۱۸۵۷ء میں بے سروسامانی کی حالت میں نہ معلوم کتنا کلام تلف ہوا یہاں تک کہ بیگم گنج والے مکان سے مرثیے بھی چوری ہوئے جس کا انھیں بڑا قلق تھا۔ بنارس میں زر نقد جو عظیم آباد پٹنہ سے مجلس پڑھ لکھنؤ لا رہے تھے چوری ہوگیا۔

وفات و مدفن : ۱۰ر دسمبر ۱۸۷۴ء / ۲۹ر شوال ۱۲۹۱ھ کو چوب داری محلہ چوک لکھنؤ میں ہوئی اور اپنے بنوائے ہوئے مقبرے (قبرستان) میں اپنی بہن پیاری بیگم کے پہلو میں دفن ہوئے۔

مرزا سلامت علی صاحب دبیرؔ اعلی اللہ مقامہ نے مصرع مادۂ تاریخی نکالا۔

آسماں بے ماہ کامل، سدرہ بے روح الامیں
طور سینا، بے کلیم اللہ و منبر بے انیسؔ

۱۸۷۴ء — ۱۲۹۱ ہجری

اردو پڑھئے اردو لکھئے اردو سیکھئے